بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

احسنُ الخالقین

(جلد اوّل)

تین ابواب پر منحصر تخلیقِ کائنات

سَنُرِیۡھِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِھِمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَھُمۡ اَنَّہُ الۡحَقُّ ؕ اَوَ لَمۡ یَکۡفِ بِرَبِّکَ اَنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَھِیۡدٌ (حٰم السجدہ:۵۳)

ترجمہ:۔

ہم آفاق وانفس میں انہیں اپنی نشانیاں دکھائیں گے جس سے اُن پر یہ حقیقت کھل جائے گی کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور دینِ اسلام من جانب اللہ ہے کیا تمہارے رب کا ہر چیز پر گواہ ہونا کافی نہیں ہے (حٰم السجدہ : ۵۳)

تالیف وتصنیف از۔ طاہر بابا قادری عفی اللہ عنہ

www.haqeeqatulhaqaiq.com

احسنُ الخالقین

(جلد اوّل)

بار اول۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔1000

تاریخ طبع۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔2025

احسنُ الخالقین

(جلد اوّل)

وَ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ طِیۡنٍ ۚ (۱۲) ثُمَّ جَعَلۡنٰهُ نُطۡفَةً فِیۡ قَرَارٍ مَّكِیۡنٍ ۪ (۱۳) ثُمَّ خَلَقۡنَا النُّطۡفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقۡنَا الۡعَلَقَةَ مُضۡغَةً فَخَلَقۡنَا الۡمُضۡغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوۡنَا الۡعِظٰمَ لَحۡمًا ۟ ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِیۡنَ ؕ (مومنون:۱۴)

ترجمہ:۔

''اور بلاشبہ ہم نے انسان کو (سلالۃ) چنی ہوئی مٹی سے بنایا (۱۲) پھر اسے (انسانی نطفہ کو) ایک مضبوط ٹھہراؤ (رحم مادر) میں پانی کی بوند کیا۔ پھر ہم نے اس نطفہ کو جونک (علقہ) کی شکل کیا پھر اس خون کی پھٹک کو گوشت کا لوتھڑا گھوڑے سے مشابہ بنایا' پھر گوشت کی بوٹی کو ہڈیاں بنایا پھر ان ہڈیوں پر گوشت چڑھایا پھر اسے انسانی صورت میں اٹھان دی (یعنی انسان کی شکل وصورت بنائی اس میں روح ڈالی اسے سمع وبصر اور نطق عطا فرمائی) پس اللہ کیا ہی برکت والا بہترین خالق ہے'' (مومنون:۱۲تا۱۴)

فہرست مضامین

نمبر صفحات

دیباچہ	۱
پیش لفظ	۴
قوم مسلم کی زبوں حالی	۶
تعارف علم	۷
(باب اوّل)	۱۸
منکرین خدا (کفار وملحدین) دھریت پر ایک مأخذ مباحثہ	۱۸
قرآنی اطلاعات پر ملحدین کی غیر یقینی	۳۳
شبہاتِ منکرین کے ردّ میں منطقی جواب	۳۳
طوفانِ نوحؑ	۳۶
طوفانِ نوحؑ کی گزرگاہ کے بارے دیگر روایات	۳۷
بعد از طوفانِ نوحؑ صرف آلِ نوحؑ باقی ہے	۳۹
پانی کا خون ہونا اور مینڈکوں کی بارش	۴۱
کھٹملوں اور جوؤں وغیرہ کا عذاب	۴۲
فرشتے	۴۳
ہلاکت کائنات (کرّہ ارض)	۴۶
حقانیت قرآن پر منطقی دلائل	۴۹
قرآنی پیشگوئیاں	۵۰

فہرست مضامین نمبر صفحات

آفاق	۵۱
تکوین کائنات	۵۱
آغازِ تخلیق کائنات اور مدارجِ ستہ	۵۲
ابتدائی عناصرِ حیات	۵۳
کرۂ ارض کی تخمیناً عمر	۵۵
آغازِ حیات (خلیہ)	۵۵
تخلیق کائنات کی حیرت انگیزیاں	۵۸
ارتعاش جواہر	۶۰
خزائنِ زمین	۶۴
ماضی کے متلاشیانِ فطرت	۶۶
سمندر اور خزائنِ ارضی	۶۷
روشنی	۷۲
ایثر یعنی ایتھر (جُو)	۷۳
رنگ اور ایثر	۷۵
الوان والسنۃ (رنگ اور زبانیں)	۷۶
اختلافِ السنۃ (مختلف زبانیں)	۷۷
زبانیں (آریائی اور سامی)	۷۷
اختلافِ الوان (مختلف رنگ)	۷۸

فہرست مضامین	نمبر صفحات

حیوانوں میں رنگوں کی حکمت	۸۰
عالم نباتات	۸۶
نائیٹروجن	۸۸
نرومادہ	۹۱
نباتات کی ترکیبِ روئیدگی	۹۳
نظامِ افلاک	۹۷
مطالعۂ افلاک	۹۹
آفتاب	۱۰۰
قمر	۱۰۱
کواکب	۱۰۳
دُمدار ستارے	۱۰۵
شہاب	۱۰۵
بُعدِ نجوم	۱۰۶
عالم حیوانات	۱۱۰
اقسامِ حیوانات (اونٹ)	۱۱۰
خوردبینی اجرام	۱۱۲
جانوروں میں خود اعتمادی	۱۱۳

فہرست مضامین | نمبر صفحات

حشرات الارض	۱۱۵
چیونٹی	۱۱۵
عمل تولید و تربیتِ نمل و کاشتکاری	۱۱۶
عجائباتِ نمل	۱۱۷
عنکبوت (مکڑی)	۱۱۸
اقسامِ عنکبوت (مکڑی کی قسمیں)	۱۱۹
نحل (شہد کی مکھی)	۱۲۱
اقسامِ شہد	۱۲۳
شہد اور موم	۱۲۴
نحل کی آنکھیں	۱۲۵
ڈنک	۱۲۵
مچھر	۱۲۶
مکھی	۱۲۸
انفس	۱۳۰
جسم انسانی پر ایک نگاہ	۱۳۰
جسم انسانی ایک مملکت	۱۳۱
جسم انسانی ایک نرالہ شہر	۱۳۲
انسان میں حیوانی عناصر	۱۳۳

فہرست مضامین	نمبر صفحات

انسانی آنکھ	۱۳۴
انسانی کان	۱۳۶
انسانی پیدائش	۱۳۶
انسانی ناک	۱۳۷
انسانی جلد	۱۳۸
انسانی غذا	۱۳۹
حیاتیہ (وٹامن)	۱۴۰
انسانی جگر	۱۴۱
انسانی تنفس	۱۴۲
انسانی دل	۱۴۳
خون میں سفید ذرات	۱۴۴
انسانی دماغ	۱۴۴
آیاتِ محکمات ومتشابہات	۱۴۷
اُمّ الکتاب	۱۵۱
فرعون کی لاش کو محفوظ رکھنا	۱۵۴
روم کی شکست	۱۵۷
مسلمانوں کو حکومت کی پیشگوئی	۱۵۹

فہرست مضامین

نمبر صفحات

ابوجہل کو چوٹی سے پکڑ کر گھسیٹنا	۱۶۱
ابولہب اور اسکی بیوی کے بارے پیش گوئی	۱۶۳
ہلاکتِ ابولہب	۱۶۵
ہلاکتِ اُمِ جمیل	۱۶۵
حفاظتِ قرآن کا وعدہ	۱۶۶
قرآن کی فصاحت و بلاغت	۱۷۰
قرآن اور صاحب قرآن کے بارے نامور غیر مسلموں کی آراً	۱۷۲
اختتامی الفاظ باب اوّل (اہمیتِ اسلامی تلوار)	۱۷۸
(باب دوئم) اقوام ماضی کے احوال	۱۸۰
ماضی کے عقائد تخلیق وارتقاء	۱۸۰
قدیم ماضی کے حالات وتغیرات	۱۸۲
پتھر، دھات اور لوہے کے زمانے	۱۸۶
اُموی زرعی نظام	۱۸۸
اَبوی زرعی نظام	۱۹۳
انسان اور دیوتا	۱۹۶
جزیرۃ العرب کے مأخذ	۱۹۹
تمدّنِ عرب	۲۰۲
تاریخ ہند کے مأخذ	۲۰۸

فہرست مضامین	نمبر صفحات

مہا آتما گوتم بدھ	۲۱۲
اشوک	۲۱۵
یدھشٹر سے پرتھوی راج	۲۱۶
آریاؤں سے مسلمانوں تک کے مذاہب	۲۱۸
برصغیر میں مسلمانوں کی آمد	۲۱۹
محمد بن قاسم تا بہادر شاہ ظفر	۲۲۳
بابلی تہذیب	۲۲۶
اہل بابل کا عقیدۂ تخلیق	۲۲۷
کنعان (سرزمین انبیاء)	۲۲۹
کنعانی فرسودہ عقائد اور رسوم ورواجات	۲۳۰
کنعانی زوال	۲۳۷
بنی اسرائیل کے مأخذات	۲۳۸
قدیم مصر کے مأخذات	۲۴۳
(باب سوئم) تذکرۃ الانبیاء	۲۵۶
ابتدائے نسل انسانی	۲۵۶
نبی رسول اور پیغمبر میں فرق	۲۵۸
ہر قوم کیلئے بعثتِ رُسل	۲۵۹
درجاتِ انبیاء ورُسل	۲۶۰

فہرست مضامین

نمبر صفحات

انبیاء ورُسل کے بارے غیر اسلامی تصور	۲۶۲
بوالبشر سیدنا حضرت آدم علیہ السلام	۲۶۷
غایت پیدائش آدمؑ	۲۶۹
ہابیل اور قابیل	۲۷۷
حضرت شیث علیہ السلام	۲۸۳
بت پرستی کی ابتداء	۲۸۴
حضرت ادریس علیہ السلام	۲۸۵
عطائے نبوّت	۲۸۶
حضرت نوح علیہ السلام	۲۸۹
غایت بعثت نوحؑ	۲۹۲
آل واولادِ نوحؑ	۲۹۸
حضرت ھود علیہ السلام	۳۰۰
حضرت لقمانؒ بمعہ چند وصایائے لقمانؒ	۳۰۶
حضرت صالح علیہ السلام	۳۱۰
حضرت ابراہیم علیہ السلام	۳۱۷
نمرود	۳۲۰
واقعہ آتشِ نمرود	۳۲۴
ہجرتِ ابراہیمؑ	۳۲۸

فہرست مضامین	نمبر صفحات
عظیم قربانی	۳۲۸
حضرت اسمٰعیل علیہ السلام	۳۳۲
حضرت لوط علیہ السلام	۳۳۸
حضرت اسحٰق علیہ السلام	۳۴۴
حضرت یعقوب (اسرائیل) علیہ السلام	۳۴۸
حضرت یوسف علیہ السلام	۳۵۲
حضرت ایوب علیہ السلام	۳۶۵
حضرت شعیب علیہ السلام	۳۶۹
حضرت موسیٰ علیہ السلام	۳۷۶
حضرت ھارون علیہ السلام	۴۰۱
حضرت خضر علیہ السلام	۴۰۷
حضرت یوشع علیہ السلام	۴۱۳
قانونِ سبت	۴۱۵
بلعم بن باعور (ایک عابد)	۴۱۸
تابوتِ سکینہ	۴۲۱
حضرت حزقیل علیہ السلام	۴۲۴
حضرت الیاس علیہ السلام	۴۲۷
حضرت الیسع علیہ السلام	۴۳۰

فہرست مضامین

نمبر صفحات

حضرت شموئیل علیہ السلام	۴۳۴
حضرت طالوتؒ	۴۳۷
حضرت داؤد علیہ السلام	۴۴۵
حضرت سلیمان علیہ السلام	۴۵۰
حضرت یونس علیہ السلام	۴۵۹
حضرت عزیر علیہ السلام	۴۶۷
ابن اللہ قرار دینے کی وجہ تسمیہ	۴۶۹
حضرت زکریا علیہ السلام	۴۷۲
حضرت یحییٰ علیہ السلام	۴۸۱
حضرت ذوالکفل علیہ السلام	۴۸۵
حضرت مریم علیہا السلام	۴۸۸
حضرت ذوالقرنین علیہ السلام	۴۹۷
یاجوج وماجوج (ایک مخلوق)	۵۰۶
حضرت عیسیٰ علیہ السلام	۵۱۲
عیسائی فرقے اور انکے عقائد	۵۲۹
اناجیل	۵۳۱
حضرت مسیح عیسیٰؑ کا مختصر شباہت نامہ	۵۳۸
عہدِ سلاطین کے انبیاء عظام	۵۴۰

فہرست مضامین نمبر صفحات

حضرت حنظلہ علیہ السلام	۵۴۰
حضرت یسعیاً علیہ السلام	۵۴۲
حضرت ھوسع علیہ السلام	۵۴۲
حضرت عاموس علیہ السلام	۵۴۲
حضرت میکاہ مورشی علیہ السلام	۵۴۲
حضرت صفنیاً علیہ السلام	۵۴۲
حضرت یرمیاہ علیہ السلام	۵۴۲
حضرت دانیال علیہ السلام	۵۴۳
حضرت عزراً علیہ السلام	۵۴۳
حضرت عبدیاہ علیہ السلام	۵۴۳
حضرت ناحوم القدشی علیہ السلام	۵۴۳
حضرت یوائل علیہ السلام	۵۴۴
حضرت ملاکی علیہ السلام	۵۴۴
حضرت حجی علیہ السلام	۵۴۴
حضرت کالوت علیہ السلام	۵۴۴

دیباچہ

زیرِ نظر کتاب کے حوالہ سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ خیال تو ایک عرصہ سے دِل پر دستک دیتا تھا کہ انبیاء و پیغمبرانِ عظام کی کرہ ارض پر عہد بہ عہد تشریف آوری کا خاکہ ترتیب دوں اور یہ کہ زمین کے کس کس حصہ نے انکی قدم بوسی کا شرف پایا۔ انکی اُمم پر انکی تعلیمات کے کیا کیا اثرات مرتب ہوئے اور کس حد تک باقی رہے۔ ابتدائی انسان کے افکار و اسلوب کو سمجھنے کی خواہش بھی اس مضمون پر تحقیقی نظر ڈالنے پر اکساتی تھی مگر تاخیریوں ہوئی کہ سابقہ تہذیبوں کے اصل تمدن اور حقیقی ماحول کو سمجھنے کے وسائل بھی محدود تھے۔ پھر آسمانی کتب اور قرآنی اطلاعات پر ہماری نظر پڑتی بھی ہے تو ہماری کوتاہ بینی اور کم علمی اس میں حائل ہے۔ کچھ دوست الہامی اطلاعات پر ایمان لانے پر یوں رضامند نہیں کہ اپنی فلسفیانہ نکتہ وری کے زعم میں کسی ان دیکھی ہستی پر ایمان لانا انکے نزدیک غیر منطقی اور احمقانہ فعل ٹھہرا ہے۔ دراصل ہم نے اس ہستی مسطور کو تلاش کرنے کی سعی ہی نہ کی جو جابجا اپنی نشانیاں دکھا کر خود تک پہنچنے کی راہ دیتا اور عرفانِ حق پا لینے کی دعوت دے رہا ہے' مگر ہم حرماں نصیب اسے چُھو لینے کے کھیل میں شامل ہی کہاں ہوئے۔

کتاب ھٰذا میں ہم ماضی کی اقوام کے عقائد تخلیق وارتقاء پر مختصر بحث کریں گے جس کا مقصد عقیدۂ تخلیق وارتقاء کے بارے انسانی ذہن کی تبدیلیوں کی نشاندہی کرنا اور یہ واضح کرنا ہے کہ گرچہ عقائد وِجدان کی ودیعت نہ ہوں' گو پرانی اقوام نے مظاہر قدرت کے بغور مطالعہ سے اپنے نظریات مرتب نہ کئے ہوں' آفرینش کی ابتدائی داستانیں بھی گرچہ افزائشِ فصل کے تہواروں' رسموں اور رہسوں کا جزو ہوں مگر یہ غور نہ کرنا مجرمانہ غفلت ہوگی کہ انکے عقائد میں پائی جانے والی بنیادی باتوں اور آسمانی اطلاعات میں یک گونا یکسانیت کیونکر پائی جاتی ہے۔ یعنی ماضی بعید میں زمین و آسمان کا آپس میں جڑا ہونا' خدا تعالیٰ کا اپنے مقربین انبیاً و اولیاً (غیر مذہبوں کے دیوی دیوتاؤں) کو اپنی مخلوق کی بھلائی پر متعین فرمانا' انکے ذریعہ اپنا تعارف کروانا' اور سرکش نافرمانوں کو بُروئے انصاف انکے کئے کی سزا دینا وغیرہ۔

میرے نزدیک اسکی وجہ عہد بہ عہد آنے والے انبیاء و پیغمبران کی وہ الہامی اطلاعات ہیں، جو اگرچہ لوگوں کی زبانی ایک دوسرے کو ترسیل ہوتے ہوئے گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ متفرق ہوتی چلی گئیں اور اصل حقائق داستانوں میں ادلتے بدلتے رہنے کی بناء پر کچھ کے کچھ ہوتے گئے۔ گو کہ مختلف ادوار میں خالق کائنات کو مختلف ناموں سے پکارا گیا اور اسکے بارے انسانی نظریات میں تبدیلیاں بھی وقوع پزیر ہوئیں۔ اسکی قوت و قدرت اسکی مخلوقات کے ساتھ منسوب کر کے من گھڑت خداؤں کا وجود بھی قائم کر لیا گیا۔ تاہم خواہ کوئی حق تعالیٰ کو اپنی زبان میں اِیل کہہ کر پکارتا رہا ہو یا کسی نے اسے یہواہ کہا ہو، کسی نے ہر کہا ہو، بھگوان یا اوم کہا ہو یا کوئی اسے گاڈ یا اللہ کہہ کر پکارتا ہو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہ سب نام خدائے واحد ہی کے ہیں۔ تاہم مذاہبِ حقہ میں لاکھ بگاڑ اور لوگوں کے مبتلائے شرک ہو جانے کے باوجود ماضی کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبران کی بنیادی تعلیم انکے ذہنوں سے بالکل معدوم بھی نہ ہو سکی۔

اقوامِ ماضی کے بے سروپا عقائد و نظریات اور جہالت آمیز حکایات کا ذکر اگرچہ آپ کو عجیب لگے گا مگر دلچسپی سے خالی بھی نہیں۔ عذابِ الٰہی (اور کچھ دوستوں کے نزدیک اتفاقی حادثات) کی شکار مدفون بستیوں کی کھدائیوں میں دستیاب ہونیوالی تختیوں کی تحریروں، پتھروں پر کندہ نوشتوں، اور محلّات و عبادت گاہوں کے در و دیوار پر دیوی دیوتاؤں کے نقوش و کندہ عبارات سے اُن کے عقائد اور ماحولیات پر جو روشنی پڑ سکی اور انکی داستانوں سے انکی تہذیب و ادب کے جو اہم پہلو ہمارے سامنے آ سکے، انکا مثبت اندازِ فکر میں جائزہ لیا جانا ضروری تھا جو دانستہ یا نادانستہ نہیں لیا گیا۔ شاید اسکی وجہ یہ رہی ہو کہ کچھ احباب بدقسمتی سے ایسی فکری تبدیلیوں اور مذاہب کے بارے عقائد کو انسان کی عادتِ ثانیہ اور ماضی سے چلے آتے فرسودہ رسوم و رواج کا نام دیکر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ کسی دین و مذہب کو قبول کرنا، خالق کائنات نامی کسی ہستی پر ایمان لانا، یا کسی اَبدی و اُخروی زندگی کا یقین کرنا وغیرہ بھی ایسے ہی فرسودہ رواجات کا شکار ہونا ہے۔ جبکہ علم و دانش تو وہ نور ہے جو سود و زیاں، اصل و نقل اور بہتر و کمتر کو صاف واضح کر دینے کا باعث ہے۔

مگر افسوس کہ اپنے تئیں کچھ مفکرین نے نہ تو فکرِ راست پر نگاہ کی نہ انکی دانشمندی نے انکی کچھ مدد کی کہ وہ کارہائے قدرت کی صناعی سے کم از کم صانع کے عرفان وشناخت کی حد تک پہنچ پاتے۔انہوں نے ایسی تبدیلیوں پر تو بانگ دھل شور مچایا جو گمراہی کی پیداوار تھیں مگر انہیں ایسے حقائق کی نشاندہی کرنے کی توفیق نہ ہوئی جو انبیائے سابقین کی اصل تعلیمات تھیں۔قرآن کی بہت سی مشترک باتیں جو کسی دور میں نا قابل قبول اور صرف ایمان کی حد تک ہی یقین کی جاسکتی تھیں آج کے سائنسی دور میں منطقی وعقلی طور پر بھی قابل تسلیم ثابت ہوچکی ہیں۔اسلئے میں آفاق اور انفس پر روشنی ڈال کر ایسے حقائق کی نقاب کشائی کرنے کی کوشش کرونگا۔امید ہے متلاشیان حقیقت کیلئے یہ کاوش راہنما ثابت ہوگی۔

حقائق کی کھوج وتلاش کسی حقیقت کی نقاب کشائی کیلئے کس قدر اہم ہوتی ہے اس سے کوئی ذی عقل انکار کی جرأت نہیں کرسکتا البتہ اس کیلئے نورِ علم کی ضرورت ہے۔خوش قسمتی سے وسائل حصول علم ماضی کی نسبت آج ہماری بہتر دسترس میں ہیں۔البتہ سوال یہ ہے کس ذریعہ علم سے حقیقت کی تہہ تک پہنچا جائے کہ وہ قابل اعتبار بھی ہو۔یقیناً اس کیلئے کوئی محکم تقریر یا ایسی مستند تحریر میسر آنا ضروری ہے جس میں جھوٹ وفریب کا خدشہ تو کجا سہو ونسیان کا بھی احتمال نہ ہو۔میری نظر میں ایسا قابل اعتبار وقابل اعتماد ذریعہ صرف الہامی کتب ہی ہوسکتی ہیں جن میں کسی خطا کا خدشہ ناممکنات میں سے ہے۔بطورِ خاص ''قرآن'' جس کی حفاظت کا ذمہ خود اسکے نازل فرمانے والے نے اٹھا رکھا ہے۔

چونکہ کچھ دوست الہامی کتب وآسمانی صحائف کے نازل فرمانے والی کسی ہستی ہی کے منکر ہیں تو انکی نظر میں ایسی کتب کی حقانیت وسچائی پر بھی اعتبار کیونکر ہوگا۔چنانچہ ضروری ہے کہ سب سے پہلے قرآن کی حقانیت وسچائی پر چند منطقی دلائل پیش کروں تاکہ دوستوں کو اس کتاب کے حق وسچ' خطاونسیان سے پاک اور بھروسہ مند ہونے کا یقین میسر آسکے اور یہی اس کتاب کا مقصد ہے۔

از۔مؤلف مورخہ ۲۰۲۵ء

پیش لفظ

زیر نظر کتاب مرتب کرنے کی غایت تو یہ تھی کہ ماضی کی سابقہ اقوام پر خالقِ کائنات کا اپنے متعدد نمائندگان کو مبعوث فرمانے کا مقصد سمجھ آسکے۔ نیز فلسفہ و منطق کے گرد طواف کرتے رہنے والے خالق کائنات کے وجود ہی سے منکر دوستوں کو پھر سے دعوت فکر دی جائے کہ وہ نافرمان اقوام کے ہلاکت خیز اور عبرت ناک انجام سے نصیحت حاصل کر کے حقائق پر غور کریں اور اپنے گمراہانہ افکار پر نظر ثانی کر سکیں۔ مگر حیران ہوں کہ آخر کس منہ سے اغیار کو دعوت دی جائے جبکہ ہمارا اپنا حال باعث شرم اور قابل نظر ثانی ہو۔

برصغیر پاک و ہند میں (نام کے) مسلمان کی آج جو حالت ہے کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ ہمارے اعمال و افکار جو نہج اختیار کر چکے ہیں انکا اصل تعلیماتِ اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ہم انگنت بے راہرویوں اور گمراہیوں کا شکار ہو کر آج جن حالات کو پہنچ چکے ہیں وہ دراصل قرآن سے بے بہری کا ہی شاخسانہ ہے۔ اسلام کے نام پر حاصل کی گئی مملکت ''پاکستان'' کیا اسلامی تصور و تصویر کی عکاس ہے؟ جہاں جھوٹ فریب اور دھوکہ دہی عام ہو، سونے سے لیکر مٹی تک خالص میسر نہ ہو، کسی شئے کا معیار یا وزن پورا نہ ہو، کسی کی جان و مال کو کوئی تحفظ نہ ہو، دن دیہاڑے راہ چلتے کوئی بھی بدفطرت کسی کا مال اسلحہ کے زور پر چھین لیتا ہو، طرّہ یہ کہ کسی تھانہ کچہری میں شنوائی نہ ہونے کے یقین اور مزید نقصان کے خدشہ میں صبر کر لینا لٹنے والے کی مجبوری بن کر رہ گیا ہو، جہاں خواتین اور بچیوں کا اپنی تعلیم یا دیگر ضروریات کیلئے گھر سے نکلنا اور عزت کے ساتھ واپس لوٹ آنا ایک مہم سر کرنے کے مترادف ٹھہر چکا ہو، ایسے معاشرہ و ماحول کے حامل کسی ملک کو اسلامی کہنا کیا دین اسلام سے شرمناک مذاق نہیں۔

اسلام تو امن و آشتی، انصاف اور ایثار کا درس دیتا ہے۔ اسکے برعکس آج اس ''اسلامی'' مملکت میں کون یا کونسا ادارہ اپنے فرائض دیانتداری سے نبھا رہا ہے۔ ناجائز تو کجا جائز کاموں کیلئے بھی لوگ رشوت دینے پر عاجز و مجبور ہیں۔ ہم جس خدا کو ماننے کے دعویدار ہیں ہم نے بھلا اسے کیا مانا۔ جس ذیشان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہونے کے دعویدار ہیں انکے فرامین پر ہمارا کیا عمل ہے۔ کیا ہمارے

محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت لینے اور دینے سے منع نہیں فرمایا' بددیانتی سے باز رہنے کی تعلیم نہیں دی' ضرورت مندوں کی مدد کرنے' بیماروں کی دواوعلاج کرنے اور خیرات وایثار کی ترغیب نہیں دی۔ اسکے برعکس لوگوں کے اموال ناجائز وناحق دھوکہ فریب یادھونس دھمکی کے ذریعے لوٹنے والے کس منہ سے خود کو مسلمان کہلواتے ہیں۔ غور کریں کہ ہمارے جس ہمدرد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری بخشش کیلئے ساری ساری رات قیام میں اپنے پاؤں ورم آلود کروالئے' رکوع وسجود میں کثرتِ گریا کے باعث اپنی آنکھیں ورم آلود کروالیں' ہم نے انکی محبت کا انہیں کیا صلہ دیا؟ انکا کیا احترام کیا؟۔

کیا ہم اپنے اسلاف کے طریق سے بھی بے بہرہ ہو چکے ہیں۔ کیا ہمیں یاد نہیں کہ اسلامی مملکت کی باگ ڈور ہاتھ میں لینے والے خلفائے راشدین کی تصویر کیا ہے؟ ان میں سے جو بھی اس دنیا سے گیا گرچہ مقروض ہو کر گیا' عوام کو لوٹ کر بنائی گئی جائیدادیں اپنی اولادوں کو دیکر نہ گیا' مگر اپنے خدا کے حضور سرخ رُو ہو کر گیا۔ سگی اولاد نے بھی اگر جرم کیا تو انہوں نے اسلامی شرع کے مطابق سلوک کیا۔ اپنے بیٹے پر حد جاری ہوئی تو اپنے ہاتھوں سزا دی یہانتک کہ دورانِ سزا بیٹا مر گیا' مگر انہوں نے قانونِ شریعت کو مرنے نہ دیا۔ اسکے برعکس ہمیں بدقماشوں اور ظالموں کی سفارشیں کرنے میں عار ہی محسوس نہیں ہوتی۔ ہمارے لیڈران' ہمارے مفاد پرست علماؤ مشائخ یا پھر ہمارے تھانوں' کچہریوں' عدالتوں اور دیگر محکموں میں کون سا ادارہ ایسا ہے جسے اسلامی مملکت کے موافق قرار دیا جاسکتا ہے۔

ہم مسلمان اپنا اسلامی قانون رکھتے ہوئے بھی اسے عائد کرنے میں گزشتہ نصف صدی سے مصلحات کا شکار ہیں۔ کیا انصاف زور وزبردستی سے کچھ حاصل کرنیکا نام ہے۔ جہاں گواہیاں خریدی اور بیچی جاتی ہوں' جہاں منصفین کی اکثریت بغیر رشوت ایک قدم تک اٹھانے پر آمادہ نہ ہو' اس معاشرہ کو اسلامی کہنا تو بذات خود ایک ظلم ہے۔ انصاف کی لڑائی تو ظلم کے خلاف اور مظلوم کے حق کیلئے لڑی جاتی ہے۔ مگر یہاں جیت صرف قوت ورکی' مکار کی یا انصاف خرید لینے والے دولت مند کی ہی ہوتی ہے۔ ملک بدنام ہو یا اسلام کی شان پر بٹہ لگے ہمیں اس سے سروکار ہی نہیں۔ صد حیف! کہ پھر بھی ہم مسلمان ہیں اور پھر بھی ہماری مملکت اسلامی ہی ہے۔

شاید ہم نے کلیساؤں' مندروں اور گرودواروں پر بم پھینکنے کا نام اسلام سے محبت رکھ لیا ہے۔

ہمارے نزدیک جنت میں داخل ہونے کا شارٹ کٹ راستہ ایک دوسرے کی امام بارگاہوں اور مسجدوں کو بموں سے اڑانا ٹھہر گیا ہے۔ آخر ہم فساد اور جہاد میں کب تمیز کریں گے۔ ہم نمازیں تو بڑے ذوق وشوق سے ادا کرتے ہیں مگر کوئی یہ تک نہیں سوچتا کہ آخر نماز ہمیں بے حیائی اور برائی سے روکتی کیوں نہیں؟ اگر ایمان کی کوئی رمق باقی رہ گئی ہو تو بتائیں کہ کیا کوئی ہمارے کرتوت دیکھ کر ہمیں مسلمان کہہ سکتا ہے' یا ہم اپنی موجودہ تباہ شدہ اخلاقی حالت کو اسلامی کہہ سکتے ہیں۔ یقیناً نہیں۔ تو پھر یہ خالی خولی دعویٰ ہائے اسلام کس لئے؟ کیا اسلام کے منہ پر کالک تھوپنے اور اِس سچے دین کو پوری دنیا میں بدنام کرنے کیلئے۔ غور کریں تو بخوبی اندازہ ہو جائیگا کہ ہم (دانستہ یا نادانستہ) وہی کچھ کر رہے ہیں جو اسلام دشمن قوتیں ہم سے کروانا چاہتی ہیں' جو شاخسانہ ہے ہمارے منافیٔ اسلام عقائد واعمال کا' اور ردّعمل ہے ناراضگیٔ پروردگار کا۔ صد حیف ہماری حالت وحقیقت پر کہ ہم حق بات قبول کرنا تو کجا' سننا بھی گوارہ نہیں کرتے۔ ہمیں ہماری تصویر دکھانے اور ہمارے مسخ شدہ چہروں کے سامنے آئینہ رکھنے والا آج ہمارے لئے ناقابل برداشت اور ناپسندیدہ شخصیت ٹھہر چکا ہے۔ کیا اب بھی ہم اپنے سودوزیاں پر نظرثانی کر کے تباہی وبربادی کی طرف لے جانے والے راستہ سے واپس مڑ سکتے ہیں؟ اسے اپنے مقسوم پر مت چھوڑیں۔ یاد رہے یہ میدانِ عمل میں نکل کھڑے ہونے' تائب باللہ ہونے اور اتباعِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلما کو اپنا لینے پر موقوف ہے اور یقیناً اس کیلئے سب سے پہلے ہمیں خود کو بدلنے کی ضرورت ہے۔

قومِ مسلم کی زبوں حالی

اوّل تو قوم مسلم نے اپنی کتاب کی قدر ہی نہ کی دوسرے بسبب جہالت قرآن کو سمجھنے سے قاصر رہی۔ آج مسلمان فکرِ فردا سے محروم اور اپنے اسلاف کے چلن سے لاعلم و بے پرواہ ہو چکا ہے۔ قرآن نے مسلمانوں کے جن چنگاریاں اڑاتے گھوڑوں کی قسم کھائی تھی آج انکے وہ گھوڑے گدھوں سے بھی گئے گزرے ہو چکے ہیں۔ ہمارے علماء وصوفیاء نے دنیا کو لرزا دینے والے مسلم کے سامنے گزشتہ صدی سے وہ وہ بولیاں بولیں' عجز وتواضع اور انکسار کی جگہ سَلفی اخلاق کا وہ تباہ کن درس دیا کہ اس سیل تند رو کی طغیانیاں سکونِ مرگ میں تبدیل ہو گئیں اور مسلمان کی طوفانی رفتار، لغزشِ پیرا میں بدل گئی۔ جو سبق

بطورِ خاص مسلمان کو دیا گیا تھا کہ اس پر عمل پیرا ہو کر دنیا پر حکمرانی کریں اور خدا کا پیغام لوگوں کو پہنچائیں وہ اس سے لاتعلق ہو کر ہنوز ذلت و رسوائی کے اتھاہ کنوؤں میں گرتے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف دیگر اقوامِ عالم ہمارا ہی قرآنی سبق سیکھ کر برق و باد کو مسخر کر کے برشکالی بادلوں کی طرح کرّہ ارض پر چھا رہی ہیں؛ جن کے بارودی اسلحہ کی پُر ہیبت گھن گرج سے پہاڑ لرز رہے ہیں اور انکی شمشیر خارا شگاف سے قہرمانانِ گیتی رعشہ براندام ہیں۔ جبکہ دوسری طرف بے عمل صوفی زدہ مسلمان گوسفندانہ عجز و مسکینی کا پیکر بنا ہوا ہے۔ یہاں صوفی سے میری مراد متصوفین اولیاء اللہ قطعی نہیں۔ میں اہل ویدانت، علم و عمل سے عاری یوگیوں، ملاؤں، جعلی تعویز فروش پیروں اور بھنگ چرس جیسے نشوں کے شکار رہبانیت کے علم برداروں کی زوال پذیر سوچ کے خلاف بات کر رہا ہوں اور " لا رهبانية فى الاسلام " اس پر گواہ ہے۔

تعارف علم

عرف عام میں علم ان معلومات کے حصول کا نام ہے جو ہماری دنیوی اور اخروی زندگیوں میں ہمارے یوں کام آئے کہ ہم ہر نقص و نقصان سے محفوظ رہ سکیں اور زیادہ سے زیادہ نفع اور کامیابی حاصل کر سکیں۔ "علم آدم الاسماء کلها" سے ثابت ہے کہ بنی نوع انسان کو ہر طرح کا علم اور ہر شئے کے ناموں سے مطلع فرمایا گیا۔ دینی علوم کے حصول کے ذرائع بھی میسر ہیں اور دنیاوی تعلیم بھی عام ہے۔ اب اقوام عالم کی اہلیت و قابلیت پر انحصار ہے کہ وہ تحصیل علم میں کس حد تک ترقی کر سکتی اور کامیابی حاصل کر سکتی ہیں۔ وہ علم جو الہامی ہے اور جسے تصوف کی زبان میں لدنی کہا جاتا ہے، اس خاص علم سے پروردگارِ عالم صرف اپنے مخصوص بندوں کو نوازتا ہے کہ وہ حقائق سے مطلع ہو کر اسکی مخلوق کی راہنمائی کا فریضہ انجام دے سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ علم ہر کسی پر عام نہیں اور چاہتے ہوئے بھی کوئی اپنی مرضی سے اسے حاصل کرنے پر کچھ اختیار نہیں رکھتا۔ البتہ مروجہ تعلیم کے وسیع وسائل و ذرائع موجود ہیں جن سے فائدہ حاصل کرنا اور مخلوق کیلئے استعمال کرنا منشائے ایزدی کے عین مطابق ہے۔

ہر معاشرہ و مذاہب میں کچھ سر پھنچ قسم کے لوگ بھی موجود ہوا کرتے ہیں اور بدبختی کے سبب وہ

اگر جاہل ہوں تو پوری قوم کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے اور ایسی بدحواس قوم اپنی پراگندگی میں ڈوبی رہ کر اقوام عالم کی ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جاتی اور ترقی یافتہ اقوام کی دست نگر ہو جایا کرتی ہے۔

دکھ سے کہنا پڑ رہا ہے کہ قوم مسلم میں موجود ایسے جہلاء سے مسلمانانِ پاک و ہند کو بہت ذلت آمیز خسارہ کا سامنا کرنا پڑا۔ ہمارا ''ملا'' ہر دور میں مسلمان کی تعلیمی ترقی میں حائل رہا اور مسلسل بدکتا اور دبکتا رہا کہ مسلمان بچے بچیاں انگریزی تعلیم حاصل کر کے کہیں فرنگی ہی نہ ہو جائیں۔ فلسفہ' سائنس' جغرافیہ اور ریاضی جو کہ مسلمان کی میراث تھیں' موجودہ صدی کے نام نہاد علماء و مولویان نے مسلمان بچوں کو ان سے محروم کر ڈالا اور انہیں جنت و حور و قصور کے حصول کے لالچ میں الجھائے رکھا۔ مجھے دینی تعلیم کی اہمیت سے قطعی انکار نہیں' نہ ہی میں کسی یک طرفی کا قائل ہوں البتہ انہیں صرف قرآن زبانی حفظ کروا دینا' صوم و صلواۃ کے طریق اور فرائض و واجبات سے مطلع کر کے مطمئن ہو بیٹھنا ہرگز کافی نہیں تھا۔ حیرت ہے کہ یہ حضرات طریق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیوں نابلد ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ بدر میں قید ہوئے تعلیم یافتہ کفار و مشرکین کو اس شرط پر رہا کرنا قبول فرما لیا کہ ان میں سے جو کوئی دس مسلمانوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دے اسے قید سے رہا کر دیا جائیگا۔ غور طلب ہے کہ کیا وہ کافر قیدی دس دس صحابہ کو رموزِ قرآنیہ سے آگاہ کرنے یا شرحِ صحائح ستہ کی تعلیم دینے والے تھے۔

''عقل مند را اشارہ کافی است''

قرآن نے جا بجا تخلیق کائنات کے عجائبات پر غور و تدبر کرنے کی دعوت دی ہے جس کے ذریعہ عرفان حق پایا جا سکتا ہے۔ کیا علم سائنس' منطق و فلسفہ' ریاضی و طبعیات وغیرہ کے بغیر تخلیق کائنات کے پیچیدہ اور متحیر کر دینے والے نظام کو سمجھا جا سکتا ہے۔ بین الاقوامی زبانوں سے نابلد کسی کی گفتگو سمجھ سکتا ہے یا اپنا مدعا کسی کو بیان کر سکتا ہے۔ یقیناً نہیں۔ تو جواب دیجئے قرآن کے ایسے احکام پر عمل درآمد کیسے ہوگا جن میں تخلیق کائنات پر غور و فکر کی تاکید موجود ہے۔

ہمارے جاہل ملاؤں نے ہر دور میں قوم مسلم کی ترقی کی راہ میں روڑے اٹکائے۔ ٹرین ایجاد ہوئی تو اس کو دجال کا نام دے کر اس میں سفر کرنا حرام قرار دیدیا۔ کیونکہ احادیث میں دجال کی نشانیوں

میں ایک یہ ہے کہ وہ ایک آنکھ والا ہوگا اور اسکی وہ آنکھ اسکی پیشانی کے وسط میں ہوگی۔ لاؤڈ سپیکر ایجاد ہوا تو اسکے استعمال کو یوں منع کر دیا گیا کہ تار برقی سے اذان و قرآن گزارنا خدا کے نام کی بے حرمتی کا باعث ہے۔ ہوائی جہاز کی سہولت میسر آنے کے باوجود مدتوں مسلمان کو اس سے محروم رکھا گیا کہ جہاز سے سفر کرنا زمین پر موجود قرآن اور مساجد پر سے گزرنے کے باعث بے ادبی کا موجب ہے۔ سرسید احمد خاں نے جب مسلمان قوم کو انگریزی زبان سیکھنے کی ضرورت پر زور ڈالا تو اس پر انگریزوں کا پٹھو اور مسلمانوں کا غدار ہونے کی مہر ثبت کر دی گئی۔ آخر اس قوم کی یہ بدحواسیاں کب تک چلیں گی۔ کیا قوم مسلم کو اسکی غفلت بھری نیند سے جگانے والا خود بھی اس خواب خرگوش سے جاگا ہے یا نہیں' کوئی نہیں جانتا۔

کیا ہمارے علماؤں' رہنماؤں اور ملک کے ارباب اقتدار کو علم بھی ہے کہ اس قوم کو کس سمت لیجانا چاہئے۔ کیا ہمارے موجودہ علماء دعویٰ کر سکتے ہیں کہ وہ واقعتاً عالم ہیں یا ہمارے لیڈران ایسا کوئی دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ وہ قوم کو منازل رفیعہ سے روشناس کروا سکتے ہیں؟ میرے خیال میں نہیں' کیونکہ عالم صرف وہ نہیں جو اِستنجاء کیلئے مٹی کے ڈھیلے کی اہمیت یا وضو کے فرائض و واجبات اور نماز کی رکعتوں کی تعداد کا علم بانٹتا ہوا خود کو مبلغ اسلام گمان کر رہا ہو۔ ایسی ابتدائی معلومات تو مسلمان بچوں کو انکے گھروں ہی سے میسر آجاتی ہیں۔ علم وہ ہے جس کے ذریعہ قرآن نے عجائباتِ تخلیقات پر غور و فکر کرنے کی ذمہ داری مسلمانوں پر عائد کی تھی اور جنہیں انکے ہاتھوں چاند ستاروں کو مسخر کر دینے کی نوید دی تھی اُس علم سے آج کا مسلمان غالباً متعارف تک نہیں۔

جہاں قرآن اصول و قوانین کا ایک ضابطہ ہمیں دیتا ہے وہیں صحیفہ فطرت کی آیاتِ حیرت انگیز پر بار بار غور و فکر کرنے کا بھی حکم دے رہا ہے۔ لیکن مسلمانوں کی بدنصیبی کہ انہوں نے مظاہر فطرت اور عجائباتِ عالم کے اندر چمکتی ہوئی سچائی سے رُوگردانی اختیار کر رکھی ہے۔ حجروں میں گوشہ نشینی اسلام کی تعلیم نہیں' اوراد و وظائف سے فرداً فرداً سکون پانے کی علت کسی نشے سے زیادہ کچھ نہیں۔ یوں دراصل آپ نے صرف اپنی آخرت کے بارے سوچا جبکہ آپ پر تو پوری دنیا کو جگانے کی ذمہ داری تھی۔ وائے حسرت! کہ آپ نے عمل و حرکت پر آمادہ ہونے اور مچلتی ہوئی زندگی سے بغلگیر ہونے کی بجائے سوئی

اور سہمی ہوئی موت کے پہلو میں لیٹنا گوارا کرلیا۔آج مسلمانوں میں وہ علماء موجود نہیں جو ایک مکھی تک کی تخلیق کا مقصد بتا سکیں۔ عالم وہ ہے جس کا علم غور وفکر، تجربہ ومشاہدہ اور تجزیہ وتشریح کا نتیجہ ہو۔ مامون الرشید (عباسی خلیفہ) اسلام کے منشا سے آگاہ تھا۔اسکے دَور میں بیسیوں رصدگاہیں اجرامِ فلکی کے معائنہ کیلئے نصب تھیں۔حیوانات، طیور، جمادات اور نباتات پر چھبیس ہزار کتب تصنیف ہوچکی تھیں۔وہ گھڑیاں بنارہا تھا، انجن چلانے کی کوشش کررہا تھا، زمین کو ماپ رہا تھا اور زمین وآفتاب کا درمیانی فاصلہ معلوم کررہا تھا۔لیکن افسوس کہ ہم نے اپنے اسلاف کی راہیں چھوڑ دیں اور قرآن کو محض ریشمی جزدانوں میں لپیٹ کر احترام سے طاقوں پر رکھ چھوڑا۔ جبکہ غیر مسلم داناؤں نے ہماری ہی کتاب پر عمل پیرائی کرکے کیا مقام حاصل کرلیا یہ مطلع آفاق پر عیاں ہے۔

قرآن پر (برائے نام) مسلمانوں کا اجارہ نہیں ہے یہ تمام زمانوں تمام جہانوں اور صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو ہر دو کائنات کی زندگی کا نوشتہ ہے۔کیونکہ وہ کتاب جو انسان کو زندگی اور اسکے مظاہر سے الگ کسی ناقابل فہم سچائی کی ترغیب دیتی ہو، خالق کائنات کی تصنیف نہیں ہوسکتی۔قرآن تو فطرت کی مہیب سے مہیب اور حقیر سے حقیر چیزوں کی طرف توجہ دلا کر انسانی ذہن کو متوجہ کرتا ہوا غور وفکر اور سبق اندوزی کی ترغیب دیتا ہے اور اس قانونِ فطرت سے علی الاعلان باخبر کرتا ہے کہ ناکارہ ونافرمان اقوام کو ذلیل وپست کرکے صفحۂ ہستی سے مٹادیا جاتا ہے۔مسلمانو! یادرکھو کہ تمہاری نجات بڑی طاقتوں کو سجدے کرلینے اور اپنی ذمہ داریوں سے فرار میں نہیں، بلکہ اللہ کی طرف لوٹنے اور اسکے احکام کی تعمیل میں ہے۔

''کاش سمجھے میرا سوزِ غم پنہاں کوئی''

ہمارے علماء مساجد ومدارس میں درسِ نظامی اور دیگر دو چار کورس کرکے خطبات جمعہ میں وعظ کرکے روزی کمانے کے لائق تو ہوجاتے ہیں لیکن اقوامِ مسلم کے عروج وزوال کے بارے سوچنے کا نہ تو انکے پاس وقت ہے نہ شاید ضرورت۔وہ سطحی علم جو آپ کو رفعتِ سوچ عطا نہیں کرسکتا خودفکری سے اٹھا کر دوسروں کی محرومیوں پر ہمدردی اور تڑپ پیدا نہیں کرسکتا وہ علم عبث ناقص وبے فائدہ ہے ۔

اس وقت تک صرف اہل زمین کے تمدن، حکومت، طبائع، جغرافیہ، تاریخ اور اخلاق وغیرہ پر

آٹھ کروڑ سے زیادہ کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ ہمیں انکے نچوڑ کو لے کر آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔ مطالعہ کائنات کی اہمیت کا اندازہ اسی ایک بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن میں وضو' نماز' روزہ' زکوٰۃ' حج' نکاح وطلاق' وغیرہ کے احکام پر ڈیڑھ سو آیات ہیں اور مطالعہ کائنات سے متعلق سات سو چھپن آیات ہیں۔ مطالعہ کائنات کا حکم چونکہ اسکے خالق کی طرف سے مسلمان پر عائد ہے اسلئے ہر عذر کے باوجود اس پر غور وفکر کیلئے مسلمان کو کمر باندھ لینے اور اپنی نسلوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کی ضرورت ہے۔ جس طرح کسی فرد کا قرآن واحادیث سے اِعراض باعث ہلاکت دنیوی واخروی ہے اسی طرح ہمارا صحیفہ کائنات سے اِعراض پوری قومِ مسلم کی اجتماعی ہلاکت وبربادی پر منتج ہوتا ہے۔ قرآن کا فرمان ہے:۔

اَوَ لَمۡ یَنۡظُرُوۡا فِیۡ مَلَکُوۡتِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنۡ شَیۡءٍ ۙ وَّ اَنۡ عَسٰۤی اَنۡ یَّکُوۡنَ قَدِ اقۡتَرَبَ اَجَلُہُمۡ ۚ فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ م بَعۡدَہٗ یُؤۡمِنُوۡنَ (اعراف : ۱۸۵)

ترجمہ:۔ ''کیا یہ لوگ آسمان وزمین کی تخلیق پر غور نہیں کرتے لگتا ہے انکی موت قریب آ گئی ہے آخر یہ اور کس بات پر ایمان لائیں گے''۔ (اعراف : ۱۸۵)

سورۃ عنکبوت میں حکم خدا ملاحظہ ہو:۔

قُلۡ سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا کَیۡفَ بَدَاَ الۡخَلۡقَ .... (عنکبوت : ۲۰)

ترجمہ:۔ ''اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کو حکم دیں کہ وہ زمین میں چل پھر کر دیکھیں کہ خدا نے کس طرح آفرینش کی ابتداء کی''۔... (عنکبوت : ۲۰)

اے قومِ مسلم! کیا یہ لمحہ فکریہ نہیں کہ کس طرح ہم نے اپنا فرض منصبی پس پشت ڈال رکھا ہے' جبکہ ایسی الغرضیوں کا منطقی نتیجہ اقوام کی موت ہے۔ ہمارے قلوب سے خوفِ خدا کیوں معدوم ہوتا جا رہا ہے۔ ہماری الغرضیوں کا شاخسانہ یہ ہے کہ آج اہل مغرب لوہے' تانبے' بارُود اور دیگر خزائن ارضی سے فائدہ اٹھا کر فلکِ علم وہنر کے آفتاب بنے ہوئے ہواؤں میں اُڑ رہے ہیں' دریاؤں' سمندروں میں تیر رہے ہیں' زمین کی بعید ترین اطراف کی خبریں لمحوں میں سن رہے ہیں' آنے والے حوادثِ سماویہ یعنی

(طوفان باد باراں) کی خبریں دے رہے ہیں' سینکڑوں کلومیٹر دُور بیٹھے ہماری جغرافیائی حدود ہی کا نہیں ہمارے چلنے پھرنے اور ہمارے معمولات تک کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ ماؤں کے پیٹ میں پرورش پاتے بچے کے نر یا مادہ ہونے کی اطلاع دے رہے ہیں۔ یہ سب بھلا کیونکر ممکن ہو سکا؟ اسلئے کہ وہ صحیفہ کائنات کے مطالعہ کے بعد قوانین و آیاتِ خداوندی کو اپنی اور خلقِ خدا کی بہتری کیلئے استعمال کر رہے ہیں۔

امریکہ کی جامعہ علوم نباتات (یونیورسٹی) کے بڑے دروازے پر یہ روح افزا الفاظ لکھے ہوئے ہیں:۔

Open thou mine eyes that i may behold wonders of the creation

''اے میرے رب میری آنکھیں کھول تا کہ میں تیرے عجائباتِ تکوین کا مشاہدہ کر سکوں''

جبکہ ہم اپنے ہی قرآن کی آیات پر غور و فکر سے عاری' علم و حکمت سے محروم و پسپا ہیں۔ سورۃ فاطر میں فرمان ملاحظہ ہو کہ رب تعالیٰ کے نزدیک عالم کون ہے:۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ؕ وَ مِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ(۲۷) وَ مِنَ النَّاسِ وَ الدَّوَآبِّ وَ الْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ(فاطر:۲۷:۲۸)

ترجمہ:۔''غور کرو کہ پہاڑوں میں سیاہ و سفید و سرخ رنگ پتھروں کی تہیں موجود ہیں نیز انسانوں چوپاؤں اور مویشیوں کے مختلف رنگوں کا بھی مطالعہ کرو' اور یاد رکھو کہ اسکے بندگان میں سے صرف (انکے اسرار کو جاننے والے) علماء ہی اللہ سے ڈرتے ہیں بیشک اللہ زبردست پردہ پوش (گناہ چھپانے اور بخشنے والا) ہے''۔(فاطر:۲۷/۲۸)

فرمان بالا سے صاف عیاں ہے کہ مفید علم وہ ہے جو اسکے حامل کو خشیت الٰہی کا حامل بنا سکے۔ فرمانِ ھٰذا سے وحدۃ الشہود کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے' یعنی تخلیقاتِ عالم پر تفکر و تلاشِ فطرت پر اسکے صانع کو شناخت کرنے والے ہی اس سے مرعوب ہو سکتے ہیں اور یہ تب ہی ممکن ہے جب آپکی نگاہ اسکی قوت و قدرت اور اسکے کمالات پر یوں پڑ سکے کہ اسکی عظمتِ شان پوری توانائی سے آپ پر اثر انداز ہو سکے۔ غور رہے کہ خشیت الٰہی کو کس قدر درجہ شرف اور اعزاز دیا گیا ہے۔ عامۃ المسلمین میں یہ خوف صرف عذاب

دوزخ، عذاب قبر یا محرومیٔ جنت تک محدود ہے جبکہ اولیائے علیین اور انبیاء و پیغمبران میں یہ خشیت، ہر لحہ اس بے پرواہ کی ناراضگی کے خدشہ کے پیش نظر انکی جانوں کا وبال بنی رہتی ہے۔ مقتدر اولیائے خداوندی اسکے حضور ہمیشہ رعبِ شاہی سے سرنگوں رہتے ہیں اور حقیقی خشیت کا اصل معیار یہی ہے۔ آیاتِ متذکرہ سے واضح ہے کہ جو اسکے عرفان سے بہریاب ہو سکے وہی خشیت الٰہی کا حامل ہو سکتا ہے وگرنہ:

''دیدۂ کور کو کیا نظر آئے کیا دیکھے''۔

جس طرح شیکسپیئر، روسو، لقمان، شیخ سعدی، بوعلی سینا، اقبال یا مقتدر انبیاء و اولیا اللہ ہستیوں کی صحیح عظمت کو سمجھنے کیلئے انکے اعمال و اقوال و تصانیف کا مطالعہ ضروری ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صحیح عظمت و رفعت، کمالِ تخلیق، جمالِ تکوین، ربوبیت اور حیرت انگیز نسقِ کائنات کو سمجھنے کیلئے صحیفہ فطرت میں غور و تدبر کرنا پڑے گا کہ اس شاندار ہستی کے بارے ہمارے اذہان جھنجھوڑے جا سکیں اور اسکے عرفان و شناخت کیلئے ہمارے اذہان و قلوب عزت و محبت سے اس کا استقبال کرنے کے لائق ہو سکیں۔

اگر کسی مصنف کی تعریف اسکی تصنیف پڑھے بغیر ہو سکتی ہو۔ کسی شاعر کو اسکا کلام سنے بغیر داد دی جا سکتی ہو، کسی مغنی یا مصور کے فن سے ناشناسی کے باوجود اسے سراہا جا سکتا ہو، تو پھر تو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بھی اسے جانے بغیر ممکن ہے۔ لیکن غور طلب ہے کہ ایسی زبانی حمد و ثنا کس پیرائے یا کس وزن کی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کی حمد اور اسکا شکر تو وہ ہے جو اس کے احسانات کے پیش نظر ہمارے دل سے پیدا ہو۔ کیا ہم اسکی ربوبیت سے آگاہ ہیں۔ ہمیں اللہ تعالیٰ کے رب العالمین ہونے کا کچھ بھی اندازہ ہے۔ "الحمد للہ رب العلمین" اس پر گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تعریف اسکی ربوبیت سے متاثر ہو کر ہی کی جانی چاہیے۔ احسن الخالقین جل جلالہٗ کو صرف حقیقی حمد و ثنا ہی پسند آتی ہے۔ دنیا میں ایسی اقوام معزز و سرخ رُو ہیں جو خدا کی صحیح معنوں میں بذریعہ علم متلاشی ہیں اور اپنی کامرانیوں پر اس کی ثنا خواں اور شکر گزار بھی ہیں اور ہم ریاکاری و زبانی تعریف و شکر گزاری کی سزا، ذلت و پسماندگی اور اغیار کی محتاجگی کی صورت بھگت رہے ہیں۔ گو ہماری مساجد بظاہر نمازیوں سے بھری نظر آتی ہیں مگر میرے خالق کا شکوہ لیں:۔

وَ قَلِیۡلٌ مِّنۡ عِبَادِیَ الشَّکُوۡرُ..... (سبا:۱۳)

یعنی۔۔۔''میرے حقیقی شکر گزار بندوں کی تعداد بہت کم ہے''۔(سبا:۱۳)

یہ اس لئے کہ ہم میں اسے جاننے اور سراہنے کا مادہ ہی نہیں رہا' ایسی صورت میں اس بیمثال کی حقیقی تعریف کیونکر ممکن ہے۔مثلاً جب کوئی شخص اپنے بال بچوں یا بیوی کیلئے کوئی گھر بناتا ہے' نادر قمقمے اور عمدہ فانوس آویزاں کرتا ہے' طرح طرح کے پھل و پھول پائیں باغ میں اگاتا ہے' بہترین ڈیزائین کی اعلیٰ معیارِ تعمیر' اور بہترین نقاش سے چھتوں اور دیواروں پر نادر نقاشی کرواتا ہے گھر بھی ایسا کہ جو ہر لحاظ سے روشنی' خوبصورتی اور آسودگی کا حسین امتزاج ہو۔جس کی تعمیر میں اسکا بہت وقت اور زرِ کثیر خرچ ہوا ہو' پھر وہ احباب کو رہنے اور گھر دکھانے کیلئے بلاتا ہے۔ایسی حالت میں یہ کیسا ظلم ہوگا کہ اسکی چہیتی بیوی اور قریبی احباب میں عمارت کے جمالیاتی حسن کو پسند کرنے کی ''حس'' ہی موجود نہ ہو اور ان میں سے کوئی اس کی خوبصورتی اور اس میں میسر سہولیات کی تعریف کرنے کے قابل ہی نہ ہو، چوپاؤں کی طرح منہ اٹھائے ادھر ادھر گھومنے لگے، تو غور کریں گھر بنانے والے کے دل پر کیا گزرے گی۔

یہی حال آج کے مسلمان کا ہے کہ مالک ارض وسماء نے طارمِ فلک کو کیسے کیسے خیرہ ساز نقوش سے مزین و آراستہ کر رکھا ہے' فرشِ زمین پر پھلوں اور پھولوں کی کیا بہار جما رکھی ہے' لیکن وائے حسرت: کہ ہماری آنکھیں اس حسن و جمال سے متمتع ہونے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتیں۔ہمارے اندر وہ حس ہی دم توڑ چکی ہے جس سے عرفان حق کی امید کی جاسکتی ہو۔زمین و آسمان ہمیں اپنے خالق کی کبریائی اور جبروت کی داستانیں سنا رہے ہیں۔ہماری زمین سے کئی گنا بڑے لاتعداد کرّے فضا میں چکر کاٹ رہے ہیں اور ہماری زمین ان کرّوں کے مقابلہ میں ایک کھلونا دکھائی دیتی ہے' صرف مشتری ہماری زمین سے بارہ گنا بڑا ہے جبکہ ہمیں اپنی زمین کی ساخت وخواص کا بھی سیر حاصل علم نہیں۔مسلمان کو اب جاگ اٹھنے کی ضرورت ہے' تمام کائنات اسکے لئے باہیں پسارے انکی منتظر ہے۔سورج چاند ستارے اس کیلئے مسخر کر دیئے گئے ہیں اور ذات الٰہ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل مسلمانوں کو بن مانگے وہ کچھ عطا فرمایا ہوا ہے جسکی مسلمان خواہش کر سکتا تھا۔قرآن نے سورۃ ابراہیم میں فرمایا:۔

وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ(۳۳)

وَاٰتٰکُمْ مِّنْ کُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ط وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ط اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ کَفَّارٌ (ابراهیم :۳۳:۳۴)

ترجمہ:۔اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے سورج اور چاند مسخر کیے جو برابر چل رہے ہیں اور تمہارے لئے رات اور دن مسخر کیے (۳۳) اور تمہیں بہت کچھ منہ مانگا دیا اور اگر اللہ کی نعمتیں گنو تو انکو شمار نہ کرسکو بیشک انسان بڑا ظالم بڑا ناشکرا ہے (ابراہیم:۳۴)

آیت ھٰذٖ میں (لَکُمْ یعنی) تمہارے لئے کا لفظ پانچ مرتبہ استعمال ہوا ہے۔مطلب یہ ہے کہ یہ تمام نعمتیں مسلمانوں کیلئے تھیں اور مسلمانوں کے واسطہ سے باقی عالم انسانیت کیلئے' لیکن آج چاند' بجلی' روشنی اور ایتھر کو فرنگ نے مسخر کر رکھا ہے۔سمندروں کی مہیب لہروں پر انہوں نے قابو پا رکھا ہے۔ آبشاروں اور نہروں سے وہ لوگ دنیا کو روشنی اور طاقت پہنچا رہے ہیں اور ہم مسلمان ہوتے ہوئے بجلی کی ناپیدگی کو حیرانی و پریشانی سے متفکر دیکھتے رہتے ہیں۔یہ اسلئے کہ قانونِ فطرت کبھی تبدیل نہیں ہوتا وہ بیکار اور بے فائدہ اشیاء کو دنیا میں باقی نہیں رکھتا اور انکی جگہ ضروری اشیاء اور لوگوں کو لے آتا ہے۔

۔۔۔۔ وَ اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ ط (سورۃ الرعد:۱۷)

ترجمہ:۔۔۔''اور وہ جو لوگوں کیلئے کارآمد ہو وہ ہی زمین میں رہتا ہے'' (سورۃ الرعد:۱۷)

ہم نے خود پر ظلم کیا کہ قرآن کو سمجھا نہ اس پر عمل پیرا ہوئے جسکے منطقی ردعمل میں ھدایت سے محروم رہے۔

" وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ "..... (سورۃ بقرہ:۲۵۸)

ترجمہ:۔''اور اللہ ظلم ڈھانے والوں کو کبھی سیدھی راہ پر نہیں ڈالتا''۔۔۔(سورۃ بقرہ:۲۵۸)

آج مغربی تجربہ گاہوں میں حیوانوں کو چیر پھاڑ کر الٰہی صناعی کا مشاہدہ کیا جا رہا ہے' خداوند قدوس کی حیرت انگیز تخلیق و نظامِ آفرینش کا مطالعہ ہو رہا ہے اور مسلمان بوجہ جہالت اپنے فرضِ منصبی کو بھلائے بیٹھا ہے' طرہ یہ کہ ان علوم کو خلافِ اسلام قرار دیتا ہے۔ہم صدیوں سے اس مخبوط الحواسی کی سزا بھگت رہے ہیں اور ابھی نہ جانے کتنے قرن یہ سلسلہ اور جاری رہے گا۔جبکہ قرآن کا فرمان ہے۔

" نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ ط "..... (سورۃ حشر:۱۹)

ترجمہ:۔''یہ لوگ خدا کو بھول گئے تو ہم نے انہیں ایسا حواس باختہ کیا کہ انہیں اپنی جانوں کی بھی خبر نہ رہی''۔۔۔۔۔(حشر:۱۹)

پھر سورۃ توبہ میں ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ط وَمَا لَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ (توبہ:۱۱۶)

ترجمہ:۔''یاد رکھو کہ ارض وسما کا مالک اللہ ہی ہے' (اقوام کی) موت وزندگی اسی کے بس میں ہے اور تمہارے لئے اللہ کے بغیر کوئی دوست اور سبیل کار موجود نہیں''۔ (توبہ:۱۱۶)

میں مانتا ہوں کہ ہر کسی کیلئے متعدد علوم میں کمال حاصل کرنا سہل نہیں' کسی کھلاڑی کیلئے ریاضی کا پروفیسر بننا دشوار ہے کسی پیشہ ور گانے بجانے والے کا مفتی قرآن ہونا دشوار ہے کوئی جولاہا بھی کبھی سپہ سالار بنتے نہیں دیکھا' اسی طرح ہمارے مذہبی سکالرز کیلئے جغرافیہ کیمسٹری ریاضی جیومیٹری اور علومِ ارض وافلاک کے بارے معلومات نہ ہونے کے برابر ہونا منطقی بات ہے۔مگر کسی حال میں یہ فراموش کر دینا روا نہیں کہ انسان کو اسکے خالق نے اپنی خلافتِ ارضی کی جو خلعت عطا کر رکھی ہے' ہم اس سے الغرضی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ہم کاہلی کی بناء پر اپنے فرض اوّلیں کو پس پشت ڈال کر ہرگز بے فکر نہیں ہو سکتے۔

ہمیں اپنے ماضی اور اپنے اسلاف کے کرداروں کو مدنظر رکھنا ہوگا۔ہمیں اپنی ذمہ داریوں کو پہچاننے کی ضرورت ہے۔اپنی آئندہ نسلوں کی تربیت ان خطوط پر بھی کرنے کی ضرورت ہے کہ بحیثیت قوم مسلم ہم دنیا کیلئے مفید اور اہم ثابت ہو سکیں۔ہماری کم آگہی کا عالم یہ ہے کہ عام لوگوں کا تو ذکر ہی کیا ہمارے علمائے دین بھی نمرود' شداد اور فرعون وغیرہ کی اصل حقیقت سے ناواقف ہیں۔اکثر حضرات کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ فرعون قدیم فرماں روایانِ مصر کا اجتماعی ''لقب'' تھا کسی مخصوص بادشاہ کا نام نہ تھا۔

ہماری درسگاہوں میں مشرقی تہذیبوں کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں' مشرق کی قدیم زبانوں کا کوئی حرف شناس میسر نہیں' حالانکہ مغرب کی سبھی ممتاز درسگاہوں میں مشرق کی تہذیبوں کے باقاعدہ شعبے قائم ہیں اور مشرق کی مُردہ زبانوں کے درجنوں عالم موجود ہیں۔کیونکہ دانایانِ فرنگ نے پُرانے

کتبوں اور لوحوں کی مدد سے سومیری' عکادی' مصری' قدیم پہلوی اور مشرق کی دیگر زبانوں کی تحریروں کو نہ صرف پڑھ لیا ہے بلکہ انکی گرامر اور لغتیں بھی تیار کر لی ہیں۔ان دانشوروں کی بدولت مشرق کی پُرانی تہذیبوں کے بکثرت نوشتے جو زمین کے ملبوں تلے دفن تھے مغربی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں جس سے ان قدیم تہذیبوں کے عروج وزوال کی مستند تاریخیں بھی مرتب ہو چکی ہیں۔جبکہ علمی معیار واعتبار سے ہم دوسروں کے مقابل پرائمری سطح سے بھی اوپر نہیں اٹھ سکے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون. اللھمّ اھدنا الصراط المستقیم والنصرنا یارب العا لمین ط

دوستو:۔

اپنی فسوں حالی کے تلخ تذکرہ کے بعد اصل موضوع کی طرف واپس لوٹتا ہوں کہ اپنے لاکھ ناگفتہ بہ حالات کے باوجود دیگر ضرورت مندوں کی مدد اور ایک دوسرے کی حقیقی راہنمائی کا فرض منصبی جو تمام اولادِ آدم پر من جانب اللہ عائد بلکہ فرض ہے جو منقطع نہیں ہوسکتا۔اسلئے کہ وہ عہد انسانوں کے باپ یعنی حضرت آدم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے کیا ہوا ہے اور جسے بجالانا اچھی اولاد کی ذمہ داری ہے۔جو یہ ہے کہ عرفانِ حق تعالیٰ سب پائیں اور سب کو پہنچائیں۔اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق ارزاں فرمائے۔آمین

بابِ اوّل

منکرین خدا (یعنی کفار وملحدین)

دہریت پر ایک ماٴ خذ مباحثہ

میرے ایک دوست نے میرے درویشانہ رجحان کو دیکھتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کی موجودہ پسماندگی ودرماندگی پر آپکی بے چینی کو محسوس کیا ہے اور انکی حالت زار پر آپ کو اشکبار بھی دیکھا ہے۔لیکن کیا آپ نے کبھی ایسے لوگوں کے بارے بھی سوچا ہے جو ایک روشن دَور میں بھی جہالت کے اتھاہ اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں۔جو تکبر کو نہ صرف جائز رکھتے بلکہ ضروری قرار دیتے ہیں اور اپنے پیدا کرنے والے کی ہستی ہی کے منکر ہیں۔میں نے پوچھا کہ کیا ایسا کوئی شخص آپ کے علم میں ہے جو اس قسم کی سوچ کا حامل ہو کہ اس کا موقف سمجھا جا سکے اور اسے اپنا مقصود سمجھایا جا سکے۔اس پر انہوں نے کہا کہ ہاں میرے ملنے والوں میں ایک شخص ایسا ہے جو ایک پڑھے لکھے مذہبی خاندان کا فرد ہے وہ خود بھی اس سے پیشتر دین دار اور پرہیزگار شخص تھا مگر اس کے نظریات نہ معلوم کن وجوہ کی بنا ٴ پر متغیر ہو گئے۔میں نے اسے بلوانے کا ارادہ کیا اور یوں ایک روز وہ اُسی دوست کے ساتھ میرے پاس آ گیا۔میں نے اس کا حال واحوال دریافت کیا اور پوچھا کہ کیا آپ اپنے پیدا کرنے والے کو تسلیم نہیں کرتے۔اس نے بے جھجک اسکا اقرار کیا اور پھر اپنی روداد بیان کرنے لگا۔اس نے اپنی بات شروع کی تو مجھے جلد ہی اس بات کا احساس ہو گیا کہ اگرچہ یہ شخص بھٹکا ہوا ہے تاہم میرے مقابل ایک لائق اور سمجھدار شخص موجود ہے جو یقیناً میری بات سننے کا بھی حوصلہ رکھتا ہوگا۔چنانچہ میں ہمہ تن گوش اسکی بات سننے لگا۔

اس نے اپنی بات کا آغاز یہاں سے کیا کہ کیا آپ نے مجھے خدا کا قائل کرنے کیلئے یہاں بلایا ہے۔میں نے بھی اسی حوصلے سے جواب دیا کہ بحیثیت انسان اور اپنے رب کی مخلوق ہونے کی بناء پر اگر آپ سے ہمدردی ہے اور میں آپکی بھلائی کا خواہاں ہوں تو یقیناً مجھے آپ کی کسی غلط فہمی کو دُور کر کے آپکی مدد کرنے میں دلچسپی ہونی چاہیئے۔اس بات پر وہ ہلکا سا مسکرایا اور پھر گویا ہوا کہ میرے ماں باپ

ایک چھوڑ تین تین خداؤں کو مانتے تھے اور موروثی طور پر میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ خداوند کا وجود کہیں نہ کہیں تو ضرور ہوگا۔ شعوری عمر میں داخل ہوتے ہی مجھے خدا کو دیکھنے اور اس سے ملاقات کرنے کا شوق پیدا ہوگیا۔ میں نے اپنی اور دیگر مذاہب کی کتب کا مطالعہ شروع کر دیا' بڑی بڑی جگہ دھکے کھائے' بہت پاپڑ بیلے کہ کسی طرح وصلِ خدا میسر آ سکے۔

میں اس نتیجے پر پہنچا کہ تمام کائنات کی واحد قوت خدا ہے جو اپنی قدرت وقوت سے ہر شئے کو حرکت دیتی ہے اور کوئی شئے اسکی مرضی کے خلاف کام نہیں کر سکتی' یہاں تک کہ کوئی ذرّہ تک اسکی مرضی کے بغیر متحرک نہیں ہوسکتا۔ جب میں نے جنت کے انعامات اور انکے حصول کیلئے اہم وضروری افعال کا مطالعہ کیا اور نافرمانی پر دوزخ کی لرزہ خیز سزاؤں کے بارے پڑھا تو میرے دماغ میں ایک سوال پیدا ہوا کہ جب کوئی شئے کسی فعل کا اختیار ہی نہیں رکھتی اور کوئی کام خدا کی مرضی کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا تو پھر انسان سزاوار کیونکر ہوا اور جنت کا حق دار کیونکر ہوا۔ خدا کے وجود پر میرے ایمان کی چٹان میں یہ پہلی دراڑ تھی جسے میں جوڑنا بھی چاہتا تھا کیونکہ اپنے موروثی عقیدے کا تحفظ کرنا بھی مجھے پیدائشی طور پر ورثہ میں ملا تھا۔ چنانچہ میں فلسفیانہ نقطہ نگاہ سے خدا کی مطلق حاکمیت اور انسان کی مطلق بے بسی کے جواز تلاش کرنے لگا۔

میرے ایمان میں دوسری دراڑ یوں آئی کہ میں نے تو پڑھا تھا کہ خدا تمام کائنات اور اپنی ساری مخلوق کا روزی رساں ہے' چرند پرند سمیت اپنی تمام مخلوق کو روزی دینا اسکی ذمہ داری اور اس کا وعدہ ہے۔ مگر مجھے اپنے سامنے بھوک وافلاس سے بلکتے اور فاقوں سے تنگ آ کر مرتے ہوئے بے بہا انسان نظر آ رہے تھے' جو انسان سے کئے وعدے کی بدعہدی کی تصویر تھے۔ نیز پہلا سوال ابھی تک لاینحل تھا کہ میں ایک ایسے خدا کو کیسے کامل قوت مان لوں جو اپنی تشفی کیلئے اپنے رچائے ڈرامے کے خود ساختہ کرداروں کو سزا و جزا دینے میں فخر محسوس کرتا ہے۔

میں نے تو یہ پڑھا تھا کہ خدا انصاف کرنے والا ہے پھر جب یہ پڑھا کہ وہ جسے چاہے بخش دے اور جسے چاہے سزا دے' تو سر چکرا گیا کہ بھلا یہ کونسا انصاف ہوا۔ پھر طنزیہ لہجہ میں پوچھنے لگا کہ یہ آپکا

خدا ہے یا کوئی جابر وظالم مطلق العنان بادشاہ۔

میں ابھی کوئی جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ وہ پھر شروع ہو گیا' کہ میں تو خیر مانتا ہی نہیں اور بالفرض اگر خدا اور شیطان کے قصے کو وقتی طور پر مان لیا جائے تو کیا یہ انصاف کے مطابق ہے کہ جس فرشتے نے لاکھوں سال خدا کی عبادت کی اسے ایک حکم عدولی پر دھتکار کر شیطان بنا دیا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ تمام اچھائیوں کا خالق خدا ہے اور تمام برائیاں شیطان کی وجہ سے ہوتی ہیں' اگر یہ مان لیا جائے تو پھر لامحالہ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ شیطان بھی خدا کے برابر قوت رکھتا ہے بلکہ خدا سے بھی زیادہ قوت ور دکھائی دیتا ہے کیونکہ دنیا میں برائیاں زیادہ ہیں اور اچھائیاں کم۔ اگر خدا کی مطلق حاکمیت اور خالقیت کو مان لیں تو پھر یہ برائیوں کا مرکز شیطان آخر کس کی مخلوق ہے۔ اگر یہ کہو کہ شیطان بھی اسی کی مخلوق ہے تو پھر خدا کا یہ کہنا کہ وہ انسانوں کا دوست اور خیر خواہ ہے مجھے سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ خیر خواہی اور دوستی کس نوعیت کی ہے کہ ایک ایسی چیز کو تخلیق کر کے انسانوں پر مسلط کر دیا جو انہیں خدا کے جہنم زار تک پہنچا کر دم لینے کا دعویدار ہے۔ بقول خدا کے ماننے والوں کے شیطان تمام فسادات کی جڑ ہے اور خدا نے ہی اسے بنایا ہے' گویا دنیا میں انسان پر جتنے ظلم ہو رہے ہیں بہ الفاظِ دیگر خود خدا ہی کروا رہا ہے۔ حالانکہ حقیقت میں نہ تو خدا کا وجود ہے اور نہ ہی شیطان کا کوئی وجود۔

مجھے حیران وگم سم دیکھ کر اس نے بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے کہا! مجھے یہ بتائیں جو لوگ مختلف المذاہب گھروں میں پیدا ہو جاتے ہیں جبکہ ہر مذہب اپنے اختیار شدہ مذہب کو ہی حقیقی اور درست گردانتا ہے تو آخر ان گھروں میں پیدا ہونے والے بچوں کے نزدیک انکا موروثی مذہب یا خدا کا تصور اختیاری ہی کہاں رہا' وہ تو سراسر جبری ہے کیونکہ انکا ماحول انہیں ایسا کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ آپ لوگ ایک مذہب کو مان کر کئی دوسرے مذاہب کو تسلیم نہیں کرتے اور یہی رنگ برنگ مذاہب خدا کی عدم موجودگی کو ثابت کرتے ہیں کیونکہ اگر خدا ہوتا تو سب لوگ ایک ہی رنگ میں رنگے ہوتے جس طرح یک رنگی نسل در نسل پائی جاتی اور برقرار رہتی ہے۔

میں نے کہا کہ یہ کائنات آخر کس کی تخلیق ہے کیا تم نہیں سمجھتے کہ اس کو بنانے اور چلانے میں

کسی کا ہاتھ ہے۔ وہ فوراً بولا کہ پہلے لوگ خدا کو اس لئے مانتے تھے کہ ان کے سامنے یہ کائنات اور اس میں موجود پہاڑ، سمندر، چاند ستارے اور بے شمار چیزیں تھیں اور ان سب کو انسان اپنی پہنچ سے دُور سمجھتا تھا اس لیے وہ سمجھتا تھا کہ یہ چیزیں خدا نے بنائی ہیں۔ لیکن جیسے جیسے انسان عقل و شعور سے مالا مال ہوتا گیا وہ ان چیزوں کی حقیقت تک پہنچتا گیا۔ آخر کار اسکی کوششیں بار آور ہوئیں اور آج انسان جانتا ہے کہ سمندر پانی سے بنتے ہیں اور پانی دو گیسوں کے مجموعے سے بنتا ہے اور انکے مخصوص تناسب سے کہیں بھی بنایا جاسکتا ہے۔ پہاڑ جنہیں دیکھ کر انسان خود کو سکڑتا ہوا محسوس کرتا تھا آج جان گیا ہے کہ یہ معدنیات کے دفینے ہیں۔ آسمان جسے وہ زمین پر ایک چھت سمجھتا تھا اب جان چکا ہے کہ وہ حدِ نگاہ کے سوا کوئی چیز نہیں۔ چاند ستارے جو کل تک ناقابل تسخیر سمجھے جاتے تھے اور کچھ احمق انکی پوجا پاٹ میں لگ گئے تھے آج انسان ہی کے قدموں تلے رَوندے جا رہے ہیں۔

میں نے شاید سانس لینے کی کوشش میں مداخلت کی کہ تمہارے خیال میں انسان کو پیدا کرنے والا کون ہے؟ تو اس نے سلپ میں کیچ پکڑنے والے کی طرح فوراً میرا سوال میرے منہ سے اُچک لیا اور کہنے لگا کہ آج کا انسان جانتا ہے کہ انسان سمیت تمام مخلوق کی پیدائش قدرت کا کرشمہ نہیں، بلکہ سائنسی عمل کا نتیجہ ہے۔ کل تک تو ایک بچے کی پیدائش کو بھی قدرت کا کرشمہ سمجھا جاتا تھا جبکہ آج انسان خود مصنوعی طریقے سے بچے پیدا کر رہا ہے۔

ماضی کا انسان زمین کو آسمان تلے ایک فرش سمجھتا تھا مگر ایسا نہیں ہے آج کا انسان جان چکا ہے کہ زمین تو خود خلاء میں گھوم رہی ہے۔ یہ پھل پھول پودے سبزیاں یہ سب خدا کی دین نہیں، بلکہ خاص موسموں اور خاص بیجوں کے اختلاط کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ سب خدا کی جانب سے ہوتا تو مجھے بتائیں کہ موسم گرما کے پھل سرد موسموں میں کیوں پیدا نہیں ہوتے۔ انار کے بیج سے انگور کیوں نہیں اُگتا اور پھر اگر آپ کے نظریہ کے مطابق یہ سب کچھ خدا ہی کرتا ہے تو بھلا آدمی کو اتنے تردّد کی کیا ضرورت تھی کہ وہ بیج بوئے فصل کی حفاظت کرتا پھرے، پکنے پر اسے کاٹے اور یوں ہم وہ چیز حاصل کر سکیں۔ درحقیقت ہر چیز اپنے وقت و ماحول یعنی سائنسی اور ارتقائی مراحل سے گزر کر خود ہی تکمیل کو پہنچتی ہے اور یہ عمل جب بھی اور

جہاں بھی کیا جائے چیز معرض وجود میں آجاتی ہے۔

جبکہ سائنس اور ارتقائی مرحلے کے بغیر کسی بھی چیز کی تخلیق کا سوچنا بھی محال ہے۔اس ترقی یافتہ دَور میں ہم جیسے جینیس لوگوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ دراصل انسان اپنے ذہنوں پر چھائے ہوئے موروثی خدائی تعصب کے آئینوں کو توڑتا جا رہا ہے۔ کیونکہ وہ اس تعصب کی گرتی ہوئی دیوار کے پیچھے سائنس، ٹیکنالوجی اور علل وسبب کے لازوال رشتے دیکھ رہا ہے جس نے انسان کو تخلیق کار بنا دیا ہے اور انسان کے ذہن پر چھایا ہوا خدا کا خودساختہ خول ٹوٹتا جا رہا ہے۔انسان جوں جوں اشیاء کی ماہیت و تراکیب جانتا جا رہا ہے توں توں خدا کا خودساختہ خول پرانی کھال کی طرح اُترتا جا رہا ہے۔

میں نے پھر اپنی باری لینے کی کوشش کی کہ جس کائنات کی تم بات کر رہے ہو اور تمہارے بقول وہ خدا نے نہیں بنائی مگر نظر تو آ رہی ہے اس کا وجود تو قائم ہے، جس کا خود تم نے کئی مرتبہ ذکر کیا ہے، تو آخر تمہارے نزدیک یہ کیسے معرض وجود میں آ گئی۔ وہ کہنے لگا کائنات جیسی اب ہے پہلے ایسی نہیں تھی اور جیسی اب ہے ویسی ہمیشہ نہیں رہے گی اور اسکا بنیادی سبب ارتقاٗ ہے اور ارتقاء ہی دراصل ہر چیز کا خالق ہے۔اس کائنات کا ارتقاء ایک لامحدود مادے سے شروع ہوا تھا۔ یہاں وہ ایک لمحہ کیلئے رکا اور کہنے لگا کہ آپ پوچھو گے کہ آخر یہ مادہ کیسے خلق ہوا۔؟ میں نے برجستہ کہا کہ ظاہر ہے۔اسی اثنا میں وہ شیشے کا ایک خالی گلاس اٹھا چکا تھا مجھے دکھاتے ہوئے پوچھنے لگا کہ کیا یہ گلاس خالی ہے؟ میں نے کہا بظاہر خالی ہے مگر اس میں ہوا موجود ہے۔ یہ سنتے ہی وہ مسکرا کر کہنے لگا بس یہی مادہ کا ہے۔خالی گلاس میں ہوا کیوں ہے اس لئے کہ وہ ہر جگہ ہے اسی لئے گلاس میں بھی ہے اور یہ کائنات بھی اتنا بڑا گلاس ہے جس کی دیواریں ہمارے تخیل سے بھی ماوراء ہیں جس میں ہر جگہ مادہ موجود ہے۔جس طرح اس گلاس میں ہوا نہ میں نے بھری نہ آپ نے، اسی طرح کائنات میں بھی یہ مادہ نہ آپ نے بھرا نہ میں نے بلکہ یہ اَزل سے اس میں موجود ہے۔ میں نے پوچھا کیا تم اس مادے کو جو اَزل سے موجود ہے خالق قرار دے رہے ہو۔وہ بولا اگر آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ اس کائنات میں مادہ سمیت کچھ بھی موجود نہیں تھا تو پھر خدا کے ماننے والوں کے بقول خدا کا ازل سے موجود ہونا کیا معنی رکھے گا، اور بالفرض اگر یہ تصور کر ہی لیا جائے

کہ کائنات میں کچھ بھی نہیں تھا تو یہ (کچھ بھی نہیں) خدا کیسے بن گیا۔ اگر آپ یہ کہیں کہ وہ مادہ جو ازل سے ہے وہی خدا ہے تو اس کی تردید تو خود خدا کے ماننے والے کرتے ہیں کہ خدا کا مادی وجود ممکن نہیں۔ جب کہ میرے لئے اس بات کی کچھ بھی اہمیت نہیں۔

میں نے سوال کیا کہ اس اَزلی مادے سے کائنات کس طرح معرض وجود میں آئی تو وہ ایک دم چونک کر بولا ہاں میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا تھا کہ ہر چیز کسی خاص ماحول میں رہتی ہے اس ازلی مادے کا بھی ایک خاص ماحول تھا اور اسکا وہ ماحول مادے کے گرد کی خلاء تھی جس میں وہ مادہ پرورش پا رہا تھا۔ مسلسل پڑے رہنے سے اسکی ہیت بدلنے لگی جیسے کسی چیز کے پڑے رہنے سے اس پر اُلّی لگنا شروع ہو جاتی ہے۔ یوں اس مادے نے اپنے وجود سے باہر ارتقاء کا آغاز کیا تو مادے نے ٹوٹنا شروع کر دیا۔ مادے کی اس تقسیم کے بعد مادے کے ہر ٹکڑے نے اپنے طور پر بھی ارتقاء کا آغاز کیا۔ توڑ پھوڑ کے اسی عمل نے آخر کار زمین چاند سورج وغیرہ کو تخلیق کیا۔ ہماری زمین بھی ایک ٹکڑے کی صورت علیحدہ ہوئی اس لئے جہاں اس نے اپنے طور پر ارتقائی عمل کو جاری رکھا وہاں اس ٹکڑے کے گرد کے ماحول نے بھی اس پر بڑی تبدیلیاں پیدا کیں۔ زمین اپنے دوسرے ٹکڑوں مثلاً سورج وغیرہ نے اس پر ایسے اثرات مرتب کئے کہ یہاں مختلف کیفیات نے (جنہیں ہم موسم کہتے ہیں) جنم لیا۔ ان موسموں میں ایسا تناسب تھا جس کے باعث ساکت زندگی کا ظہور ہوا۔ اس زندگی کا آغاز پہلے غیر حیوانی صورتوں میں ہوا پھر زمین پر ایسا ماحول بنا جس کے باعث متحرک زندگی نے جنم لیا۔ اسی متحرک زندگی کے ارتقاء کے ایک خاص مقام پر انسان نے جنم لیا اور انسان کی تخلیق اس ارتقاء کا سب سے بڑا حادثہ تھا جس سے اس ایک تخلیق نے بے شمار تخلیقات کیں۔ یعنی انسان نے اپنی سوچ اور فکر کے ارتقاء سے کائنات میں نت نئی اشیاء پیدا کیں جو آج ہمارے سامنے ہیں اور پھر وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے سوال کیا کہ تم کہتے ہو کہ نہ خدا ہے نہ اس نے یہ کائنات بنائی نہ جن وانس کو خلق کیا اور تمہارے بقول تو خدا کا وجود ہی نہیں، تو جس چیز کا وجود ہی نہ ہو اس کا وہم کیونکر پیدا ہو سکتا ہے؟ کیونکہ جو چیز ہے ہی نہیں اس کا خیال بھی کیسے آئے۔

اس پر وہ کہنے لگا انسان کو کائنات میں سب سے پہلے جو علم حاصل ہوا وہ یہ تھا کہ وہ کچھ نہیں

جانتا۔ چنانچہ انسان مسلسل کائنات کی ماہیت پر غور کرنے لگا مگر جب کائنات کو اپنی ذہنی و جسمانی پہنچ سے باہر محسوس کیا تو اس نے ایک مافوق الفطرت قوت کو خدا کے روپ میں جنم دیا جس کا مقصد سوائے اپنی تشفی کے کچھ بھی نہ تھا اور یہ تشفی کیا تھی کہ ایک ایسی قوت ہم پر حاوی ہے جس نے یہ سب چاند ستارے پہاڑ سمندر دن رات وغیرہ ہم انسانوں سمیت بنائے ہیں اس لئے ہمیں اسکی اطاعت قبول کر لینی چاہیئے کہ اس کی فرمابرداری میں ہی ہماری بقاء ہے کیونکہ ہم مکمل طور پر اس کی تحویل و زد میں ہیں اور اس طرح انسان نے خدا کو ایک کامل قوت کے روپ میں جنم دیکر خود کو اسکی غلامی میں دے دیا۔

اسکی ابتدا بھی یوں ہوئی کہ کائنات میں کون سی چیز زیادہ طاقت ور ہے جسے ہم خدا مان کر اسے اپنی وفاداری کا یقین دلا سکیں اور پھر یہیں سے انسانوں کے گروہوں نے اپنی اپنی محدود عقل کے مطابق خدا کا وجود مان لیا۔ کسی نے سورج کو خدا جانا' کسی نے سانپ کو کسی نے بتوں کو کسی نے نہ دیکھی جانے والی شئے کو خدا قرار دیدیا۔ یہ وہ دَور تھا جب انسان کے وضع کردہ سب سے پہلے نظریے نے (جسے میں نظریہ وہم کہتا ہوں) ایک عالمگیر حوالے کے تحت مختلف صورتوں میں انسان کے ذہن پر قبضہ کر کے انسانی صلاحیتوں کو کچلنے کی کوشش کی۔ لیکن انسانی سرشت میں تجسّس اور تکبر تھا وہ اس شکست کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی ذہنی صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ استعمال کر کے ایک عظیم جنگ کا آغاز کیا۔ اسی عظیم انسانی جدوجہد کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔ آج انسان کائنات کی تخلیق کا سبب جانتا ہے وہ ہر چیلنج کا جواب دے رہا ہے اور خدا کے تعصب سے آزاد ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ عنقریب انسان اس نظریہ وہم کو باطل قرار دیکر اپنی عظیم فتح کا اعلان کر دیگا۔ انسان یقیناً عظیم ہے۔ یہ نعرہ بلند کرتے ہوئے وہ بڑا پُر جوش دکھائی دے رہا تھا جیسے خود اس عظیم انسانی فتح کا سپہ سالار رہو۔

وہ خاموش ہوا تو میں نے اپنی بات شروع کرنے سے قبل اس سے دریافت کیا کہ آیا اس ضمن میں تمہیں کچھ اور بھی کہنا ہے یا میں کچھ کہوں۔ اس نے کہا جی ضرور آپ اپنی بات کر سکتے ہیں' تو میں اس سے مخاطب ہوا کہ:۔ تمہارے دلائل گو کہ بہت مضبوط ہیں اور میں انہیں کسی مذہبی حوالے سے جھٹلانا نہیں چاہتا۔ کیونکہ ایسا کرنے سے تم اسے تسلیم نہیں کرو گے کیونکہ تم کسی مذہب کو قبول ہی نہیں کرتے۔ البتہ میں

خدا کی صفات کی وحدت کے حوالے سے بات کرنا چاہتا تھا تا کہ خدا کی عالمگیر اکائی سامنے آسکے مگر تم چونکہ سرے سے خدا ہی کے منکر ہو اسلئے میں تم سے خدائی وجود کے حوالے سے بات کروں گا۔ جس کا مقصد خدا کو لازماً ثابت کرنا نہیں بلکہ خدا کے تصور کے گرد تمہارے ابہام کو ختم کرنا ہے۔

تم نے بات کی تھی کہ عدم کے گرد دُھند ہے جس میں کچھ بھی نہیں۔ درحقیقت ہمیں یہ جاننے کی جستجو کرنی چاہئے تھی کہ آیا خدا کے تصور کے گرد انسانی خیالات کی گرد ہے یا یہ عدم کے گرِد دھند ہے جس میں کچھ بھی نہیں۔ دراصل تم نے خدا کے ہونے یا نہ ہونے کے اندیشوں کو ذہن میں محفوظ کر رکھا ہے جسے تذبذب کی حالت کہتے ہیں۔ تذبذب ایک ناقص کیفیت ہے اسلئے سیدھے سیدھے یا تو کسی بات کو تسلیم کرلو یا یکسر ردّ کردو۔ کچھ وقت کیلئے ہو تو یہ کیفیت ایک عمدہ تحقیقی عمل ہے اور انسان کو کسی شئے کے ہونے یا نہ ہونے کے اندیشوں میں غیر جانبدار رہ کر اس کی تحقیق کرنی چاہیے مگر ذہنی پسماندگی کے باعث کسی چیز پر اَڑ جانا خواہ وہ حقیقت ہو یا وہم' کہ اسے ثابت کرنے کو اپنی انا کا مسئلہ بنالینا ہماری ذہنی پرواز کو منجمد کر دیتا ہے۔ یوں مدتوں تذبذب میں پڑے رہنا اور کسی نتیجے تک پہنچ ہی نہ پانا' سمندر کے بیچ خود کو ڈوب مرنے تک کیلئے چھوڑ دینے کے مترادف ہے کہ انسان کنارے تک پہنچنے کا فیصلہ ہی نہ کر پائے اور وقت گزر جائے۔ اس سے میری مراد ہرگز یہ نہیں کہ میں تمہیں خدا کے وجود کو تسلیم کر لینے کی بات کر رہا ہوں۔ میں جو بات بھی کروں گا وہ تمہاری ہی کہی ہوئی باتوں کے حوالے سے ہونگی۔ جس کا مقصد تمہاری اُن باتوں کی وضاحت کرنا ہے جو غلط فہمی یا ناقص العلمی کی پیداوار ہو سکتی ہیں۔

دیکھو تم نے خدا کے عدم وجود پر پہلی دلیل اسکی صفات میں تضاد کی دی ہے۔ اس میں اہم بات یہ ہے کہ تم صفات میں تضاد کے باعث خدا کے منکر ہو گئے۔ لیکن تم یہ کیسے فراموش کر سکتے ہو کہ جس رازق کے وعدۂ رزق رسانی کے اختلاف کی بناء پر تم اسکے عدم وجود کے نتیجہ تک جا پہنچے' اس مبینہ وعدہ خلافی کی بناء پر (معاذ اللہ) اس وعدہ خلاف کا وجود تو عدم نہیں ہو جاتا۔ پھر تمہارا یہ کہنا کہ مذاہب میں تعدد بھی خدا کا وجود نہ ہونے پر دلیل ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ خدا کا وجود پہلے ہے اور مذاہب بہت بعد کی پیداوار ہیں' تو بھلا مذاہب کی بہتات' خدا کے عدم وجود پر ثبوت کیونکر ہوا۔ اگر ہم کسی اَن دیکھے شخص کے

متعلق ایک رائے قائم کر لیتے ہیں قطعہ نظر صحیح یا غلط کے' بہر طور اس شخص کا وجود تو عدم نہیں ہو جاتا۔ اس کا وجود ضرور ہوگا اگر چہ ہم اسکی صورت وتصویر قائم کرنے سے قاصر ہونگے۔ کیونکہ کسی شئے کی صورت متعین کرنے کیلئے اسے یا اس جیسی کسی شئے کو کبھی نہ کبھی دیکھا ہونا لازم آتا ہے۔ بعیں صورت ہم اُس پوشیدہ ہستی کا ڈھانچہ یا صورت کبھی قائم نہیں کر سکتے۔ لیکن ہم خدا کے وجود پر امکان کی راہیں تو بند نہیں کر سکتے۔ نہ ہی خدا ہمارے ذہن میں کسی خاص شکل کا پابند ہے کہ ایسا ہوگا تو ٹھیک اور ایسا نہ ہوگا تو پھر ہوگا ہی نہیں۔ وہ جو ایٹر کی مثل ہر جگہ اور ہر شئے میں سمایا ہوا ہے' نور سے لے کر پتھر تک کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

تم نے خدا کی عدم موجودگی پر دلائل دیتے ہوئے خدا اور شیطان کی جو کہانی سنائی ہے جب تمہارا خدا اور شیطان کے وجود پر یقین ہی نہیں تو پھر یہ کہانی خدا کے عدم وجود پر دلیل کیسے بن سکتی ہے۔ وہ فوراً بولا کہ یہ بات تو میں نے خدا کو ماننے والوں کے حوالے سے کی تھی۔ میں نے کہا چلو یوں ہی سہی لیکن تم اس سچائی کو کیسے جھٹلا سکتے ہو کہ عدم پر امکان کی بات کرنا بھی تو عدم کی حقیقت کی طرف سفر ہوتا ہے اور پھر یہ بات بھی بعید از قیاس تو ہر گز نہیں کہ خدا نے کائنات کو خود ہی تخلیق کیا ہو۔ پھر جو بات تم نے شیطان کے حوالے سے کی ہے اسے بھی سمجھ لو۔

دیکھو! جس طرح کسی بھی عمل کی اہمیت اسکے متضاد عمل سے پہچانی جاتی ہے' جس طرح کسی شخص کے پختہ کردار کی اہمیت کا اندازہ اُسی وقت ہوتا ہے جب اسے بدکرداری کے مواقع بھی ملے ہوں۔ اسلئے میں سمجھتا ہوں کہ شیطان کی تخلیق اتنی ہی ضروری تھی جتنی کہ خدا کی طرف دعوت دینے والے پیغمبروں کی' اور شیطان کی تخلیق کائنات کی تخلیق کے ساتھ اسی طرح ضروری تھی جس طرح کچھ افسانوی کرداروں کی ایک دوسرے کے ساتھ ہوتی ہے۔ جس طرح کھیل میں ایک جیت جاتا ہے اور دوسرا ہار جاتا ہے تو جیتنے والا اس لئے جیتا کہ اسکے مقابل دوسرا ہار گیا ہے اور ہارنے والے کی یہ منطق یا سوچ قطعی درست نہیں کہ ہار کا وجود ہی کیوں تھا۔ کھیل کی تو اہمیت ہی ہار اور جیت کے نتائج سے ہے۔ جب انسان کے نزدیک متضاد عوامل کے بغیر ہر کار بے کار اور ادھورا ہے تو خدا جیسا خالق اپنی تخلیق میں شیطان کے کردار کو صرفِ نظر کیونکر کر سکتا تھا۔ غور کیا جائے تو شیطان کا وجود اتنا ہی ضروری تھا جتنا خود خدا کا اپنا

وجود۔ یادرہے اس کائنات کی تمام دلچسپیاں شیطان کی تخلیق کے بعد بلکہ اس کا کردار اُسے سونپے جانے کے بعد ہی شروع ہوئیں۔

جو بات تم نے پیدائشی حادثوں کی بابت کی اور موروثی مذاہب کا ذمہ دار خدا کو ٹھہرایا ہے مجھے اس سے اوّل اختلاف تو یہ ہے کہ جب تم خدا کو مانتے ہی نہیں تو پھر اسکا ذمہ دار خدا کو کیونکر ٹھہرا سکتے ہو۔ دوسرے اگر تم کسی مذہبی گھرانے میں پیدا ہونے والے کو محض اس لئے ردّ کرتے ہو کہ وہ مذہب اس کا اختیاری نہیں تو اشتراکیوں کے گھر پیدا ہونے والے مُلحدوں کے نظریات کے بارے بھی وہی صورت لاگو ہونی چاہئے اور خدا کے وجود کو تسلیم نہ کرنے والے موروثیوں کو بھی تلاشِ حقائق کی ضرورت واہمیت کو صرفِ نظر نہیں کیا جانا چاہئے۔

دراصل تمہارا یہ نظریہ سرے سے ناقص العلمی پر مبنی ہے کیونکہ خدا تمام مخلوق اور تمام بندوں کا خدا ہے نہ کہ کسی خاص مذہب کا۔ کون سا مذہب کیا اہمیت رکھتا ہے یہ مسئلہ بعد کا ہے پہلے تو یہ دیکھنا اہم ہے کہ خاص حالات و واقعات کے تحت تشکیل پانے والے مذاہب کی بحث میں خدا کے وجود کی اہمیت میں تو خسارہ نہیں ہو رہا۔ کیونکہ خدا نے پہلے اپنی مخلوق کو پیدا کیا اور مذہبوں کا ظہور کہیں بعد جا کر ہوا۔

تم نے خدا کو مان لینے کا جواز یہ دیا ہے کہ اُس دَور میں جبکہ انسان نے سوچنے کا باقاعدہ آغاز بھی نہیں کیا تھا' اپنی لاعلمی اور ناداری کے باعث خدا کو کسی قوت کے رُوپ میں تخلیق کر لیا۔ جبکہ تمہارا یہ فلسفہ نہایت حیرت انگیز ہے کہ ایک ایسے دَور میں جبکہ انسان نے سوچنے کا باقاعدہ آغاز بھی نہیں کیا تھا' ایسی کمزور فکری حالت میں اسکی پہلی سوچ ہی خدا کی تخلیق کے بارے تھی اور تمہارے بقول بعد میں تو انسان علل وسبب کے رشتوں کو جاننے لگا تھا اسلیئے اسکی سوچ میں کئی بیرونی عناصر بھی شامل ہو گئے تھے۔ لہٰذا میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ ''خدا'' جو کہ سمجھنے کے حوالے سے ایک پیچیدہ ترین فعل ہے۔ یوں یہ انتہائی غور طلب مسئلہ ہے کہ ایسی کمزور اور خام ترین فکری حالت میں انسان نے ایک پیچیدہ ترین سوچ کا آغاز کیسے کیا؟ اس کا اصولی مطلب یہ نکلتا ہے کہ اُس وقت انسان کی سوچ سب سے زیادہ اپنے سے بالا کسی قوت سے متاثر ہوئی تھی جس کے باعث انسان نے سوچنا سمجھنا شروع کیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آج

انسان جس مقام پر بھی کھڑا ہے وہ اس کی سوچ کے سفر کا کرشمہ ہے لہٰذا ہم اُس قوت کو قطعی نظر انداز نہیں کر سکتے جس قوت نے انسان کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ہم بلا جھجک اس قوت کو خدا کہہ سکتے ہیں جس نے انسان کو تخلیق کرنے سے پہلے ہی اس میں بے اندازہ خوبیاں ودیعت کر دیں۔ زمین و آسمان چاند ستارے پہاڑ وغیرہ انسانی سوچ کا صرف محرک تھے انسانی سوچ نہیں تھے کیونکہ یہ چیزیں انسان کی تخلیق سے بہت پہلے خلق ہو چکی تھیں۔ انسان بعد میں پیدا ہوا پھر ان اشیاء کے مرہون انسان کو سوچ کی راہ دکھائی اور اشیاء کے ناموں کا تعارف بہم پہنچایا۔ البتہ تم نے کائنات کے علوم پر انسانی دسترس اور ترقی کا ذکر کیا وہ بلاشبہ قابل تحسین ہے لیکن انسان میں پائی جانے والی یہ سب خوبیاں جس نے انسان میں ودیعت کر رکھی تھیں اُس قوت کو تسلیم نہ کرنا بھی تو صریح ناانصافی ہے۔ یوں بھی ہر کوئی جانتا ہے اور تمہیں بھی یہ تسلیم کرنے میں عار نہ ہونی چاہئے کہ موجودہ ترقی یافتہ مشینی و سائنسی دَور میں بھی انسان قدرت کے بہت کم رازوں کو سلجھا سکا ہے' جن کے سلجھانے میں اس نے جانے کتنے کروڑوں برس بتا دیئے اور بقایا کو سلجھانے میں کتنا عرصہ درکار ہے کوئی نہیں جانتا۔

انسان اپنی بے بہا ترقی کے باوجود ابھی تک محدود اور انہی وسائل سے کام لے رہا ہے جو اسکو قدرت نے مہیّا کر رکھے ہیں۔ تم دعویٰ کرتے ہو کہ وہ مصنوعی طریقے سے بچے پیدا کر رہا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک مکھی' پھول کی ایک پنکھڑی' مٹی یا پتھر کا ایک ذرّہ تک تخلیق کرنے پر قدرت نہیں رکھتا۔ وہ اِدھر اُدھر کی اشیاء کے امتزاج سے نئی اختراعات تو کر سکتا ہے کسی شئے کو خلق کرنے کی قدرت سوائے خدا کسی کو بھی حاصل نہیں۔ تم شاید ایجاد کرنے کو تخلیق کرنا قرار دے رہے ہو جبکہ ایجاد اور خلق میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ میں کہنا یہ چاہ رہا ہوں کہ انسان کا یہ معلوم کر لینا کہ سیب میں فولاد پایا جاتا ہے کوئی بڑی بات نہیں' وہ فولاد حاصل بھی کر سکتا ہے اس سے بہت سی مصنوعات بھی بنا سکتا ہے' موجودہ سیب کی مختلف اقسام بھی پیدا کر سکتا ہے مگر سیب خلق کرنا قیامت تک اسکے لئے کارِ دارد ہے۔

انسان اگر خدا کو تسلیم نہیں کرتا تب بھی تعجب کی کوئی بات نہیں کیوں کہ وہ اپنی ہر ترقی کے باوجود کم علم و جاہل ہے۔ جو بیچارہ ابھی تک اپنے بارے میں بھی نہیں جان سکا وہ خدا کے بارے کیا جانے

گا اور جسے جانے گا نہیں اسے مانے گا بھی کیا؟

انسان تخلیق کائنات کی ابتدأ کے بارے ابھی تک مفروضات سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ بیچارہ کبھی نظریہ ارتقاء پیش کرتا ہے تو کبھی نظریۂ آدم کا جھنڈا لہرانے لگتا ہے۔ کبھی وہ زندگی کو رُوح کے پُر اسرار فلسفے سے تعبیر کرتا ہے تو کبھی خلیات کی اجزائے ترکیبی کا نام دیکر مطمئن ہو رہتا ہے۔ تم انسان عظیم ہے کا نعرہ لگا کر بیشک خوش ہوتے رہو مگر حقیقت یہ ہے کہ تمہارا عظیم انسان خود اپنے بارے بھی حتمی حقیقت جاننے میں تایوم ناکام اور آئندہ بھی ناکام ہے۔

رہا تمہارے بنیادی سوال کا جواب جس سے کہ تمہارے ایمان میں دراڑ آ گئی تھی تو خدا کے رزّاق ہونے میں قطعی شک نہیں۔ اسرارِ خداوندی کو پالینا بچوں کا کھیل نہیں۔ خدا کو ماننے والوں کا ایمان ہے کہ خدا چاہتا تو پلک جھپکنے میں زمین و آسمان خلق کر سکتا تھا مگر اس نے اس دنیا کو دنیا ہی کے اصول وضوابط کے تحت تخلیق کیا۔ ان اصولوں میں اسباب وعلل کی اہمیت بنیادی چیز ہے۔ معاشیات کے جو اصول وقوانین مذاہب وضع کرتے اور روزگار کی سعی کی ترغیب دیتے ہیں جب کوئی ان سے اعراض کا مرتکب ہوتا ہے تو لامحالہ اُسے اس کا خمیازہ بھی بھگتنا ہوتا ہے۔ بسا اوقات کسی ظلم کی پاداش میں رزق کی فراوانی بطورِ سزا معطل ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات لوگ امتحان میں مبتلا کر دیئے جاتے ہیں۔ نیز دیگر بہت سے ایسے علل ہیں جن کی بناء پر بظاہر ناگوار حالات سے بھی سابقہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کا مقصد یہ تو ہرگز نہیں کہ انسان اپنے پیدا کرنے والے کی شان میں اختلافی جرثومے پالنے لگے۔ اس کے برعکس یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ کس طرح جن وانس سمیت اسکی تمام مخلوق رزق ونعمت سے بہرہ ور ہے۔ رازق نے رِزق کے بنیادی وسائل کس مہربانی کے ساتھ ارزاں کر رکھے ہیں کہ بارش اور پہاڑی ندی نالوں سے کھیتیوں کو قوت ور پانی کی ترسیل کس قرینہ سے جاری ہے' کہ خود کرنے بیٹھو تو بے بہا خرچ کرنے پر بھی وہ نتائج وفوائد میسر نہ آئیں۔ کیا یہ بات قرین انصاف ہے کہ اپنا ایک کنبہ تک نہ پال سکنے والا کوئی فرد' کائنات بھر کے چرند پرند درند اور جن وانس کو پالنے والے رازِق پر اعتراض کرے۔؟

بقول تمہارے انسان نے بہت ترقی کی اور بہت کچھ معلوم کر لیا ہے' تو ذرا رب کی رزّاقی و

رحمت کے حوالہ سے جو علم انسان کو حاصل ہوا اس پر ہی نظر ڈالو کہ پانی کو ابالنے کیلئے سو (۱۰۰) درجہ حرارت کی ضرورت ہوتی ہے اور صرف سو گرام پانی کو گیس میں تبدیل کرنے کیلئے ۶۳۶ درجۂ حرارت درکار ہے۔ خدا کی نوازش دیکھو کہ ہر روز سمندر کا کروڑوں ٹن پانی ہماری کوشش کے بغیر گیس میں تبدیل ہو رہا ہے جو بادلوں کی صورت ہماری زمینوں کو سیراب کرنے کا باعث ہے۔ جدید تحقیق ہے کہ صرف سو مربع میل رقبے کو سیراب کرنے کیلئے جس قدر بخارات کی ضرورت ہوتی ہے وہ پانچ لاکھ ٹن کوئلہ جلانے سے ہی پیدا ہو سکتے ہیں اور ہندو پاکستان پر صرف دس منٹ بارش برسانے کیلئے نوے کھرب ٹن کوئلہ درکار ہوگا جسکی قیمت پانچ سو پچاس کھرب روپیہ بنتی ہے اور یہ رقم حکومت کی سالانہ آمدنی سے چالیس ہزار گنا زیادہ ہے۔ انصاف سے کہو کیا تم رزّاقی کے معنوں سے بھی آشنا ہو۔؟

تم نے کائنات کی تخلیق کا اوّلین ارتقائی سبب' وہ لامحدود مادہ بتایا جو کائنات میں ازل سے موجود تھا' ایک بڑا مسئلہ کھڑا کرتا ہے۔ ایک طرف تم کہتے ہو کہ مادہ ازل سے کائنات میں موجود تھا اور دوسری طرف یہ بھی کہتے ہو کہ مادہ کائنات کی تخلیق کا اوّلین محرک بنا۔ تمہارا یہ فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جسے تم ازلی مادہ کہہ رہے ہو وہ صانع گری کا محض ایک جزؤ ہے۔ تم نے شیشے کے جس بہت بڑے گلاس کی مثال دی ہے کہ اسے کائنات تصور کریں اور اس میں ہوا کی طرح مادہ کی موجودگی تسلیم کرلیں۔ میرے عزیز تمہارا بہت بڑا گلاس خواہ کتنا بھی بڑا کیوں نہ ہو کہیں نہ کہیں موجود اسکی دیواریں اس کو محدود کر رہی ہیں' جس میں تمہارا لامحدود مادہ سمایا ہوا تھا۔ تمہارا یہ نظریہ بھی میری سمجھ سے ماورئ ہے۔ بالفرض ہم تمہارے مادے اور کائنات کی حقیقت کو الگ الگ تسلیم کرلیں تو پھر یہ مفروضہ غلط ثابت ہوگا کہ کائنات کی تخلیق ایک ارتقاء کے باعث ہوئی تھی۔ یوں یہ مادہ ایک فالتو سی شئے بن کر رہ جائیگا جس نے کچھ بھی نہیں کیا۔

اپنی باتوں میں تم نے کہا ہے کہ ایک وقت آئیگا جب انسان اس نظریۂ وہم کو باطل قرار دے دیگا۔ یعنی تم اس بات کے معترف ہو کہ ابھی انسان نے اس نظریہ وہم کو باطل قرار نہیں دیا' گویا تم خدا کو وہم کی چھوٹی ترین شکل میں ہی سہی مانتے ضرور ہو۔ کیونکہ تمہارے ذہن میں اِس خطرے کی گھنٹی بج رہی

ہے کہ کہیں اِس وہم کو باطل قرار دینے تک خدا کا وجود ظاہر ہی نہ ہو جائے۔

تمہیں ماننا پڑے گا کہ ایک کام خواہ کتنا ہی یقینی کیوں نہ ہو جب تک ہو نہ جائے اپنے دامن میں ہاں اور نہیں کے دونوں پہلو چھپائے رکھتا ہے' کیونکہ نہ مانی ہوئی بات بھی ماننے کی ہی ایک کمزور سی صورت ہے۔تم نے خود کہا کہ خدا کا اوّلین ظہور انسان کی کم عقلی کے باعث ہوا کہ انسان اپنے ذہن کو سکون میں رکھنا چاہتا تھا اسلئے اس نے خدا کو تخلیق کیا۔تم بتاؤ کیا یہی صورت خدا کو نہ ماننے والوں کی بھی نہیں ہے' کہ جب تم نے خدا کی بتائی گئی یا سنی گئی صفات میں اور حقیقت میں تضاد کا مشاہدہ کیا تو یہ تضاد تمہارے موروثی عقیدے سے ٹکرایا جس سے تمہارا ذہن انتشار کا شکار ہو گیا اور تم نے اس سے نجات کیلئے بہت مطالعہ اور بہت کوشش کی مگر ہمت ہار بیٹھے اور ہمت ہارنے کے نتیجے میں خدا کے وجود سے منکر ہو گئے۔یوں انسان نے عقل کی کمی کی وجہ سے خدا کے وجود کو تخلیق کیا اور تمہاری عقل کی زیادتی نے خدا کے وجود کو عدم قرار دیدیا۔غور کیا جائے تو ان دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں کیونکہ یہ دونوں حالتیں نظریات کی انتہا پسندی کی پیداوار ہیں۔جبکہ حقیقت ان دونوں صورتوں کے درمیان پوشیدہ ہے۔

خدا کے وجود پر دلائل کے سلسلے میں انسان کے اخذ کردہ تمام فلسفے میں اور اشیاء کی تخلیق میں ہستی اور نیستی کے فلسفے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔جسکے تحت تمام فلاسفر اور سائینس دان اس بات پر متفق ہیں کہ ''جو چیز موجود ہے یا کبھی تھی یا آئندہ کبھی ہوگی'' یہ سب اسلئے ہے کہ ایسا سب ہونے کے امکانات تھے اور ہیں۔جس کے باعث کوئی چیز کسی خاص وقت میں ظاہر ہو جاتی ہے۔یوں کسی چیز کا ظاہر ہونا کوئی معجزہ یا جادو نہیں ہے بلکہ اس کام کے ہونے کے امکانات کی دلیل ہے اور'' جو چیز نہ تو موجود ہے نہ کبھی تھی اور نہ کبھی ہوگی'' تو اس کے سیدھے معنی یہ ہیں کہ اسکے ہونے کے امکانات موجود نہیں ہیں اور نہ کبھی تھے۔یہ بھی سچ ہے کہ ہستی اور نیستی ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔اِن دونوں حوالوں سے خدا کی ایک حقیقت بنتی ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ جو چیز صدیوں سے زیر بحث ہو اوّلاً تو وہ ہستی ہے اور اگر ہستی نہیں تو وہ کسی بھی صورت نیستی پھر بھی نہیں اور ان دونوں صورتوں میں وہ ہستی کے قریب تر ہے۔ اگرچہ یہ کائنات ہستی سے ایک روز نیست ہونے والی ہے مگر اس کائنات کا خالق نیستی و نقص سے مبرّا اور

پاک ہے۔اس پر وہ مجھ سے اجازت لیتا ہوا یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا کہ آپکے دلائل ابھی تک میرے ذہن پر کچھ اس طرح مسلط ہیں کہ میں ان کے چنگل سے آزاد ہو کر آپکی باتوں کے تردیدی پہلو تلاش نہیں کر پایا۔ مجھے خدا کے عدم وجود پر مزید دلائل تلاش کرنے کیلئے دقیق مطالعہ اور گہرے مشاہدے کی ضرورت پڑے گی اور یہ کہتا ہوا مجھ سے ہاتھ ملائے بغیر بیرونی دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

(مأخذ ''خدا کی تلاش'' از۔آغا نوید)

البتہ اسے جاتا دیکھ کر میں سوچ رہا تھا' شاید ایسی ہی ضد کو دہریت کہتے ہیں۔

قرآنی اطلاعات پر ملحدین کی غیر یقینی

قرآنِ مقدس کی تاریخی اطلاعات کے متعلق کچھ ملحدین کا کہنا ہے کہ:۔

(۱) سیلابِ نوحؑ میں تمام دنیا کا ڈوب جانا مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔

(۲) حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں مصر پر مینڈکوں کی بارش، نیز چشموں کنوؤں اور دریاؤں کے پانی کا خون بن جانا محض ایک افسانہ ہے۔

(۳) بحرِ قلزم کا پھٹنا۔

(۴) آسمان سے پتھر برسنا۔

(۵) اہل ایمان کی مدد کیلئے فرشتوں کا اترنا۔

(۶) بعض بستیوں کا کسی چنگھاڑ سے تباہ و ہلاک ہو جانا۔

وغیرہ اور اس نوع کی دیگر تصریحات ایسی داستانیں ہیں جن کی تائید کہیں سے نہیں ہوتی۔

شبہاتِ منکرین کے ردّ میں منطقی جوابات

آیئے دیکھیں کہ متذکرہ بالا تنقید کرنے والوں کے اعتراضات میں کچھ وزن ہے بھی یا نہیں۔ جبکہ اس حقیقت سے سب ہی رُوشناس ہیں کہ ایسے قیاسات محض جہالت و نفاق کی پیداوار ہیں۔

پہلے میں ''مینوئل ولیکووسکی'' کی اہم فاضلانہ تصنیف (WORLDS IN COLLISION) سے کچھ اقتباسات آپکی نظر میں لانا چاہتا ہوں۔ یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ موصوف قرآن سے واقف و آشنا نہیں تھے البتہ وہ اپنی آزادانہ تحقیق و تلاش کے نتیجے میں اُن حقائق تک جا پہنچے جن کا ذکر قرآن اور بعض پرانے صحائف میں موجود تھا۔ بہ الفاظِ دیگر تاریخ نے نادانستگی میں الہامی روایات کی تصدیق کر دی۔

منکرین کا کہنا کہ سیلابِ نوحؑ میں تمام دنیا کا ڈوب جانا مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ جبکہ پرانی چینی روایات میں مذکور ہے کہ شہنشاہ یاہُو کے زمانے میں اتنا بڑا طوفان آیا جس میں پہاڑ تک ڈوب گئے پانی چین کی سرزمین میں داخل ہو گیا اور صحرا سمندر میں تبدیل ہو گئے۔ یاہُو، زمانہ قبل از تاریخ کا ایک چینی شہنشاہ تھا جس نے اپنے علماء سے موسموں اور سمتوں کا تعین کروایا، نیا کیلنڈر بنوایا اور ایک قانون وضع

کیا جو چین کی ایک قدیم کتاب THE SHUKING میں محفوظ ہے۔ (کولیون صفحہ ۱۰۸)

چین کے اسی شہنشاہ یاہُو کے آخری زمانہ میں ایک مرتبہ سورج دس دن تک لگاتار چمکتا رہا' درختوں کو آگ لگ گئی اور پھر سارا ملک پہاڑوں سمیت پانی میں ڈوب گیا۔ بادشاہ نے نو برس تک میدانی علاقوں سے پانی نکالنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ یاہُو کی وفات کے بعد شوکنگ تخت نشین ہوا جس نے پانی نکالنے کا کام یاہُو کے بیٹے یُو کے سپرد کر دیا جس نے ایسی قابلیت سے یہ فرض پورا کیا کہ شوکنگ کے بعد لوگوں نے یُو کو اپنا بادشاہ بنالیا۔ اس کا خاندان دیر تک برسر اقتدار رہا اور یُو ہی کے نام سے حکومت کرتا رہا۔ [The Shuking 1879]

جنوبی امریکہ کی ریاست ''پیرو'' کی تاریخ کے مطابق ایک مرتبہ سمندر کی چنگھاڑتی ہوئی لہریں خشکی کی طرف چڑھ آئیں جس سے زمین کی ہیئت وصورت بدل گئی۔ بحوالہ [Die Flutsagen p-15]

ٹیکساس کے شمال میں واقع امریکن ریاست ''اوکلاہوما'' کے رہنے والے ریڈ انڈین کا کہنا ہے کہ ایک دفعہ زمین پر تاریکی چھا گئی کافی دنوں بعد شمال میں روشنی نظر آئی جو دراصل سمندر کی کوہ پیکر موجیں تھیں جو لحہ بہ لحہ قریب آرہی تھیں۔ (مانچسٹر اینڈ ماری ۱۹۳۸ء صفحہ ۲۷۷)

پرانے عہدنامے کی عبرانی تفسیر ''ہدرش'' میں بحر قلزم کے اس راستہ کے متعلق جہاں سے بنی اسرائیل گزرے تھے' لکھا ہے کہ سمندر کا پانی راستے کے دونوں جانب سولہ سو فٹ اونچی دیوار بن کر کھڑا ہوگیا تھا اور دور دور سے دنیا اسے دیکھ رہی تھی۔ [Ginzberg degends-111 p-22]

۱۶۰۰ء میں جب ہسپانوی امریکہ پہنچے تو ''یقطان'' یعنی مایا قوم کے مساکن نے بتایا کہ انکے آباؤ اجداد مشرق سے آئے تھے اور خدا نے انکے لئے سمندر کو پھاڑ کر بارہ راستے بنادیئے تھے۔ اگر یہ روایت درست ہو تو پھر یقطان کے باشندوں کو آلِ یہود تسلیم کرنا پڑے گا۔ [W.Gates1937 p-18]

تبت کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایک مرتبہ ایک دُمدار ستارہ زمین کے قریب سے گزرا جس سے سمندر میں اتنی بلند لہریں اُٹھیں کہ تبت کی سطح مرتفع ڈوب گئی۔ [James Legger]

ماہرین اسٹرالوجسٹ کی ایک تحقیق ہے جسے لالنڈے نامی مصنف نے اپنی مایۂ ناز تصنیف

[Abredged astronomie] میں تحریر کیا ہے کہ بہت سی اقوام میں کسی نہ کسی تباہ کن سیلاب کی روایت ملتی ہے' یہ سیلاب یا تو چاند کی کشش سے (جوار بھاٹے کی طرح) اٹھتے ہیں یا کوئی دُمدار ستارہ زمین کے قریب آ کر پانی کو اپنی طرف کھینچتا ہے یا کچھ دیر کیلئے زمین کی رفتار سست پڑ جاتی ہے اور پانی قطبین کی طرف بھاگ نکلتا ہے۔ ماہرین کا یہ قیاس بھی ہے کہ اگر ایک دُمدار ستارے کا سر زمین جتنا ہو اور وہ زمین سے تیرہ ہزار دو سو نوے میل دُور بلندی پر سے گزر رہا ہو تو سمندر سے تیرا ہزار فٹ بلند لہریں اٹھیں گی۔

افلاطون لکھتا ہے کہ کسی زمانے میں امریکہ اور افریقہ باہم متصل تھے۔ درمیان میں سمندر (اٹلانٹک) نہیں تھا البتہ یہ خطہ اطلانطس کہلاتا تھا۔ یہ ایک طاقتور ریاست تھی جس میں افریقہ کا شمالی ساحل مراکش سے مصر تک اور جنوبی یورپ جبرالٹر سے اٹلی تک شامل تھا۔ اس پر ۱۹۲۶ء تک سترہ سو کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ ایک رات اس پر پانی چڑھ آیا اور یہ سارا خطہ گہرے پانی میں ڈوب گیا۔ دوسری عالمی جنگ سے پہلے ماہرین آثار قدیمہ کی ایک جماعت اطلانطس کی تلاش میں نکلی لیکن جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے واپس لوٹ گئی۔[Timus p-24]

یونان کی تاریخ میں دو بڑے سیلابوں کا ذکر ملتا ہے ایک ڈکالین کے نام سے مشہور ہے اور دوسرا اگیگس کہلاتا ہے۔ آگستین فلسفی (۳۵۴ء--۴۳۰ء) کا خیال ہے ڈکالین کا سیلاب خروج کے وقت آیا تھا اور طوفانِ اگیگس پہلے آ چکا تھا جو کہ ساری دنیا پر آیا تھا۔

اشبیلیہ کے مؤرخ اسیڈور پادری (۵۷۰ء-۶۳۶ء) کی تحقیق بھی یہی ہے۔ ڈکالین یونان کا ایک دیوتا تھا جسکے بارے کہاوت مشہور ہے کہ جب دنیا ایک عظیم سیلاب کی لپیٹ میں آ گئی تو اس نے ایک کشتی بنائی اور اپنی بیوی سمیت سوار ہو کر بچ گیا۔ اگیگس یونانی مائتھالوجی میں سورج کا بیٹا ہے یہ اٹلی کے ایک خطے کا بادشاہ تھا۔ تیسری صدی میلادی کا ایک مؤرخ سولینس لکھتا ہے کہ اگیگس کے طوفان کے بعد تقریباً نو دنوں تک رات چھائی رہی۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ طوفان کے ساتھ کئی آتش فشاں پہاڑوں کے ایک ساتھ پھٹ پڑنے کی وجہ سے فضا دھوئیں سے بھر گئی تھی اور کئی روز اندھیرا چھایا رہا تھا۔[برطانیکا]

طوفانِ نوح:۔

اِن چند مشہور سیلابوں اور طوفانوں کی مختصر روداد کے بعد طوفانِ نوح کا ذکر قرآنی حوالہ سے سورۃ ھود میں یوں ہے:۔

.....

وَ اُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ(۳۶) وَ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْیُنِنَا وَ وَحْیِنَا وَ لَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ(۳۷) وَ یَصْنَعُ الْفُلْكَ ۫ وَ كُلَّمَا مَرَّ عَلَیْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ؕ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ (۳۸) فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ یَّاْتِیْهِ عَذَابٌ یُّخْزِیْهِ وَ یَحِلُّ عَلَیْهِ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ(۳۹) حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِیْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْهِ الْقَوْلُ وَ مَنْ اٰمَنَ ؕ وَ مَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلٌ(۴۰) وَ قَالَ ارْكَبُوْا فِیْهَا بِاسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ(۴۱) وَ هِیَ تَجْرِیْ بِهِمْ فِیْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۫ وَ نَادٰی نُوْحُ ابْنَهٗ وَ كَانَ فِیْ مَعْزِلٍ یّٰبُنَیَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَ لَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِیْنَ(۴۲) قَالَ سَاٰوِیْۤ اِلٰی جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَ حَالَ بَیْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِیْنَ(۴۳) وَ قِیْلَ یٰۤاَرْضُ ابْلَعِیْ مَآءَكِ وَ یٰسَمَآءُ اَقْلِعِیْ وَ غِیْضَ الْمَآءُ وَ قُضِیَ الْاَمْرُ وَ اسْتَوَتْ عَلَی الْجُوْدِیِّ وَ قِیْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ (ھود:۴۴)

ترجمہ:۔

''اور نوحؑ کو وحی کی کہ تمہاری قوم سے جو مسلمان ہو چکے انکے علاوہ کوئی اور ایمان نہ لائے گا تو اس پر غم نہ کھا جو کچھ وہ کرتے ہیں (۳۶) اور ہمارے سامنے ہمارے کہنے کے مطابق کشتی بناؤ اور ظالموں کے بارے (ترس کھا کر) مجھ سے بات نہ کرنا وہ ضرور غرق کیے جائیں گے (۳۷) اور نوح کے کشتی بنانے

کے دوران جب اس قوم کے سردار وہاں سے گزرتے تو اس پر ہنستے' فرمایا اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ایک وقت ہم تم پر ہنسیں گے جیسا تم ہم پر ہنس رہے ہو (۳۸) تو اب جان لوگے کہ وہ عذاب رسوا کن کس پر آتا ہے اور وہ عذاب (آخرت) کس پر اترتا ہے جو ہمیشہ رہنے والا ہے (۳۹) یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آیا اور تنور اُبلا' ہم نے (نوحؑ کو) فرمایا ہر جنس کا جوڑا نر و مادہ کشتی میں سوار کر لے اور جن کے بارے بات پڑ چکی انکے علاوہ اپنے گھر والوں اور باقی مسلمانوں کو بھی سوار کر لے' اور تھوڑے ہی تھے جو اس پر ایمان لائے تھے (۴۰) پھر نوحؑ نے کہا آؤ سب اس پر سوار ہو جاؤ کہ اس کا چلنا اور رُکنا اللہ کے نام سے ہوگا بیشک میرا رب ضرور بخشنے والا مہربان ہے (۴۱) جب کشتی کوہ پیکر موجوں کو چیرتی جا رہی تھی تو نوحؑ نے اپنے بیٹے (کنعان) کو جو الگ کھڑا تھا کہا اے میرے بیٹے ہمارے ساتھ سوار ہو جا اور کافروں کے ساتھ نہ ہو (۴۲) وہ کہنے لگا میں کسی پہاڑ کی پناہ لیتا ہوں وہ مجھے پانی سے بچا لے گا تو نوحؑ نے فرمایا آج اللہ کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں سوائے خود اس کے کہ جس پر وہ رحم فرمائے اور اسی دوران ایک ایسی موج آڑے آئی کہ وہ غرق ہونے والوں میں رہ گیا (۴۳) اور حکم فرمایا گیا کہ اے زمین اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان تھم جا اور پانی خشک کر دیا گیا اور کام تمام ہوا اور کشتی کوہِ جودی آرمینیا پر ٹھہری اور فرمایا گیا کہ بے انصاف لوگ دُور ہوں'' (ھود:۳۶/۴۴)

طوفانِ نوحؑ کی گزرگاہ کے بارے دیگر روایات

جرمنی کے ایک محقق نے ثابت کیا ہے کہ قدیم زمانے میں افریقہ اور امریکہ باہم ملے ہوئے تھے اور یہ درمیانی خطہ ''اطلانطیس'' کہلاتا تھا۔ ایک شدید زلزلے کے باعث درمیانی خطہ ڈوب گیا اور ہر دو برِّ اعظم علیحدہ علیحدہ ہو گئے۔ اپنے نظریہ پر محقق تین دلائل پیش کرتا ہے۔

(۱) افریقہ کے مغربی ساحل اور امریکہ کے مشرقی ساحل کے نباتات بالکل ملتے جُلتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی وقت یہ دونوں خطّے ایک ہی تھے۔

(۲) اہرام مصر کی طرح میکسیکو سے بھی اہراموں کے آثار اور باقیہ برآمد ہوئے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ ان دونوں خطّوں میں کسی وقت ایک ہی قوم آباد تھی' جس کا تمدّن اور فن تعمیر ایک تھا۔

(۳) ہر دو ممالک کے پُرانے برتن اور مجسمے بھی انکی ہم رنگی و ہم مذاقی پر شاہد ہیں۔

اس محقق کا خیال ہے کہ طوفانِ نوح اطلانطیس میں آیا تھا اور یہ طوفان کسی زلزلے کا نتیجہ تھا۔ جبکہ بعض دیگر محققین کا خیال یہ ہے کہ یہ طوفان لیموریا میں آیا تھا۔ لیموریا خشکی کا وہ قطعہ تھا جو جنوبی افریقہ اور عرب کو باہم ملاتا تھا اور ڈوب چکا ہے۔ ایک اور مورّخ کی رائے یہ ہے کہ یہ طوفان عراق کے شمال میں فرات کی طغیانی کی وجہ سے آیا تھا اور ایک بہت بڑا شہر ''اُر'' جو ۳۵۰۰ ق م میں بہت ترقی پذیر تھا' تباہ ہو گیا تھا۔ یہ نظریہ کچھ صحیح معلوم ہوتا اور قرآنی متن سے ملتا جلتا ہے۔ نیز ''تاریخ ملل قدیمہ'' کا ایک واقعہ بھی اس کی تصدیق کرتا ہے جس میں درج ہے کہ:۔

> '' کالڈیہ کی سلطنت میں بعل نامی ایک دیوتا کو انسانوں پر غصہ آیا تو اس نے شاہِ کالڈیہ ''کیسوتھرس'' کو طوفان آنے کی خبر دی اور حکم دیا کہ کشتی بنا کر ہر جنس کا جوڑا کشتی میں رکھ لے' پھر بارش شروع ہو گئی یہاں تک کہ اردگرد کے علاقے پانی میں ڈوب گئے اور کشتی آرمینیہ کے پہاڑ کے ساتھ جا لگی''۔

قرآن میں حضرت نوحؑ کو بھی حکم ہوا تھا کہ کشتی بناؤ' دوسرے ہر جنس کا جوڑا کشتی میں رکھ لو اور کشتی کا ٹھہرنا جودی پہاڑ پر بیان فرمایا گیا ہے جبکہ جودی پہاڑ شام اور آرمینیہ کی سرحد پر واقع ہے۔

''تاریخ ملل قدیمہ'' کا قصہ قرآن کے عین مطابق ہے فرق صرف اتنا ہے کہ قرآن میں صاحبِ کشتی کا نام نوحؑ اور وہاں کسوتھرس دیا ہوا ہے۔ چونکہ ناموں کی صورت مختلف زبانوں میں بدل بھی جاتی ہے' جیسے ہم حضرت مسیحؑ کو عیسیٰؑ اور انگریز جیسس اور کرائسٹ کہتے ہیں' حضرت یحییٰؑ کو یوحنا پکارتے ہیں۔ ممکن ہے قدیم زمانے کا کسوتھرس عربی میں نوح کے نام سے پکارا جاتا ہو۔ اِن دونوں بیانوں سے بہرحال یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ طوفانِ نوحؑ عراق اور اسکے شمالی حصوں میں آیا تھا۔

اب بھی اگر کوئی حقائق کو تسلیم کرنے میں ہچکچاتا ہے تو اسے جان رکھنا چاہیے کہ خالق تعالیٰ کا سب سے بڑا معجزہ خود یہ کائنات ہے۔ اگر نگارستانِ گیتی کی یہ خرد افروز نیرنگیاں کسی کج فہم کیلئے سامانِ تشفی نہیں ہو سکتیں تو پھر دریائے نیل کا پھٹنا' لاٹھی کا سانپ بننا' فرشتوں کا مادی صورت میں متمثل ہونا بھی

مفید نہیں ہوسکتا۔ نہ ہی عذاب وطوفان کسی ایسے ضدی کیلئے باعث عبرت ہوسکتے ہیں۔

بعد از طوفانِ نوحؑ صرف آلِ نوحؑ باقی ہے

ماہرین نسلِ انسانی اس بات پر متفق ہیں کہ طوفانِ نوحؑ کے بعد صرف آلِ نوحؑ سے انسانی سلسلہ جاری ہوا' وگرنہ باقی تمام نسلیں ختم ہوگئی تھیں۔ مغرب کا ایک محقق لکھتا ہے:۔

,,NOAH ON ACCOUNT OF HIS ---------

''نوحؑ راستبازی کی وجہ سے اُس طوفان سے محفوظ رہا جس نے خود نوحؑ اُن کی اولاد اور انکے بیٹوں کی بیویوں اور تمام جانداروں کے سوا باقی سب کو ختم کر دیا تھا''۔ (نیو کیلسٹن انسائیکلو پیڈیا۔ لنڈن ۱۹۶۹ء جلد ۱۴ ص ۴۴۰۳)

بک آف نالج سے ایک نوٹ ملاحظہ کریں:۔ بحوالہ: (بک آف نالج ''نوح'' جلد ۵ صفحہ ۴۸۶)

,,THE GOD SENT RAIN UNTIL ALL THE EARTH EVEN TO

THE HIGHEST MOUNTAIN WAS DEEP UNDER-------

'' ساری زمین بلند پہاڑوں سمیت پانی میں ڈوب گئی اور تمام زندہ اشیاء نوحؑ اور اسکے ساتھیوں تین بیٹوں اور بہوؤں کے علاوہ سب ہلاک ہوگئے''۔

مشہور مستشرق ایچ۔ آر۔ گب لکھتا ہے:۔

''طوفان میں سب کچھ غرق ہوگیا سوائے اُن لوگوں کے' جنہیں نوح نے کشتی میں سوار کرلیا تھا اور جانوروں کا ایک ایک جوڑا بھی بچ گیا تھا''۔ (شارٹر انسائیکلو پیڈیا۔ لنڈن ۱۹۱۳ صفحہ ۴۳۰)

کولمبیا انسائیکلو پیڈیا سے ایک اقتباس:۔

NOAH WAS THE BUILDER OF THE ARK THAT SAVED

HUMAN AND ANIMAL LIFE----------

کولمبیا انسائیکلو پیڈیا ایک مشہور اور با اعتبار کولیکشن ہے جس کا ایک بیان ملاحظہ ہو:۔

''نوحؑ اُس کشتی کا معمار تھا جس نے انسانی اور حیوانی زندگی کو طوفان سے بچالیا تھا' نوح کے

تین بیٹے سام حام اور یافث نوعِ انسان کے باپ ہیں' (کولمبیا انسائیکلوپیڈیا ص ۱۲۲۹)

(قتادہ بن عامہ بصری کا قول بھی اس سے مطابقت رکھتا ہے کہ)

''تمام لوگ حضرت نوحؑ کی اولاد ہیں'' (تفسیر ابن کبیر۔ سورۃ الصافات)

سوال اٹھتا ہے کہ حضرت نوحؑ کے ایمان لائے ساتھی بھی تو کشتی میں سوار تھے کیا ان کی نسلیں زمین میں نہیں پھیلیں تو اس ضمن میں ابن عباسؓ نے فرمایا ہے ''جب نوحؑ کشتی سے باہر آئے تو اسکے بیٹوں اور گھر کی عورتوں کے سوا دیگر تمام ساتھی رفتہ رفتہ مر گئے''۔

(علامہ طحطاوی اور صاحبِ جلالین قصہ نوحؑ کے سلسلے میں لکھتے ہیں)

''تمام انسان نوحؑ کی نسل سے ہیں۔ نوحؑ کے تین بیٹوں میں سے سام عربوں' ایرانیوں اور رومیوں کا جدّ اعلیٰ تھا۔ حام' سیاہ فام اقوام وقبائل کا باپ اور یافث بحیرہ خزر کے ترکوں اہل یورپ اور یاجوج ماجوج کا مورثِ اوّل تھا''۔ (تفسیر الصّٰفّٰت آیت:۷۷)

حکمائے مغرب جو بات آج کہہ رہے ہیں وہ قرآنِ مقدس نے سورۃ الصّٰفّٰت میں ساڑھے چودہ صدی قبل فرمادی تھی اور کسی محقق کو آج تک اس کی تردید کی ہمت نہیں پڑی:۔

وَ لَقَدْ نَادٰنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ (صلے ۷۵) وَ نَجَّيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ (صلے ۷۶) وَ جَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبَاقِيْنَ (صلے ۷۷)

ترجمہ:۔ بے شک نوحؑ نے ہم کو پکارا اور ہم نے عمدہ طریقے سے اس کا جواب دیا (الصّٰفّٰت:۷۵) ہم نے اسے اور اسکے گھر والوں کو ایک بڑی مصیبت سے بچالیا (الصّٰفّٰت:۷۶) اور زمین میں صرف اُسی کی اولاد کو باقی رکھا (الصّٰفّٰت:۷۷)

جو دوست ابھی تک طوفانوں' زلزلوں' پتھروں کی بارش یا بستیاں اٹھا کر پٹخ دینے جیسے عذابوں کے منکر اور انہیں من گھڑت کہانیاں قرار دیتے ہیں انہیں چاہئے کہ ضد کی ہلاکت خیزی سے بچیں کہ ایسے عذابوں کا باعث یہی ضد ہی تو ہے۔ بہرحال طوفانِ نوحؑ کے مضمون کو مختصر کرتا ہوں کہ:

تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۸۰) اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ (لا ۸۱) (سورۃ:واقعہ)

''یہ قرآن پروردگارِ عالم کا نازل شدہ ہے (۸۰) کیا تم اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے گریز کر رہے ہو (۸۱)''

پانی کا خون ہونا اور مینڈکوں کی بارش

منکرین کا یہ کہنا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں مصر پر مینڈکوں کی بارش، نیز چشموں کنوؤں اور دریاؤں کے پانی کا خون بن جانا محض ایک افسانہ ہے۔

اس بات پر تاریخی شہادت موجود ہے کہ دو ہزار قبل از مسیحؑ میں ہماری زمین ایک زبردست اُفتاد سے دوچار ہوئی تھی۔ ایک دُمدار ستارہ جو نظامِ شمسی میں شامل تھا، زمین کی طرف بڑھا، اس کی دم سے سرخ رنگ کی گیس نکل رہی تھی۔ وہ بحیرۂ قلزم کے اوپر سے گزر کر مصر کی طرف گیا۔ جس سے سمندر، کنوؤں، جھیلوں اور گھڑوں کا پانی سرخ ہو گیا۔ چوتھی صدی میلادی کا تاریخ دان ''سرولیس'' لکھتا ہے:۔

''اُس غبار کی وجہ سے زمین کا رنگ خون کی طرح سرخ ہو گیا تھا'' (ورلڈز اِن کولیژن)

میکسیکو کے ایک قبیلے ''مایا'' کی تاریخ قوانچی بتاتی ہے کہ ایک دفعہ امریکہ میں زلزلے آئے زمین ڈولنے لگی سورج کی حرکت میں بے قاعدگی پیدا ہو گئی اور دریاؤں کا پانی سرخ ہو گیا۔ مصر کا ایک فاضل ''اپوؤر'' اس واقعہ کا عینی شاہد ہے وہ اس عذاب پر ماتم کرتا ہوا لکھتا ہے:

''دریاؤں کا پانی خون بن چکا ہے۔ سارا ملک گرفتارِ عذاب ہے لوگ پانی کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ ساحل پر خالص پانی کیلئے گڑھے کھودرہے ہیں۔ ہر طرف تباہی ہی تباہی نظر آتی ہے۔ سرخ غبار سے انسانوں اور مویشیوں کے جسموں پر پھوڑے نکل آئے ہیں اور سب کے سب خارش میں مبتلا ہیں''۔

تھریس (یونان کا پہاڑی حصہ) جو خونی کے نام سے مشہور ہے۔ اپالوڈورس جو یونانی ضمیات کا ماہر تھا لکھتا ہے کہ:

ایک دفعہ دو دیوتاؤں زیوس اور تائفون میں جنگ ہو گئی۔ زیوس نے تائفون پر بجلی کا ایک خوفناک شرارہ پھینکا جس سے تائفون کی رَگ کٹ گئی اور اسکے لہو سے تھریس کے پہاڑ سرخ ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ مصر کا ایک شہر بھی سرخ ہو گیا تھا۔ (کیسلو انسائیکلوپیڈیا آف لٹریچر)

بابل کی ضمیاتی کہانیوں میں قتل ہونے والے راکشس یا دیوتا کا نام تیامت دیا ہوا ہے نیز لکھا ہے کہ اس کے لہو سے دنیا سرخ ہوگئی تھی۔ اس بات پر عرصے سے بحث ہو رہی ہے کہ بحیرۂ قلزم کا نام بحیرۂ احمر (سرخ سمندر) کیوں پڑ گیا۔ بعض نے توجیہ پیش کی کہ اس پر اڑنے والے پرندوں کا رنگ سرخ تھا نیز اسکے ساحلی پہاڑوں کا رنگ سرخی مائل تھا۔ یہ ایک بودی توجیہ ہے درحقیقت جب اُس دُمدار ستارے کی وجہ سے اس کا پانی سرخ ہوگیا تو یہ بحیرۂ احمر کہلانے لگا۔ اٹلی کے ایک نقاش رافیل (۱۴۸۳-۱۵۳۰ء) نے حضرت موسیٰؑ کی گزرگاہ بنائی تو سمندر کا رنگ سُرخ دکھایا۔ خون باری کے کچھ واقعات خروج کے بعد بھی رُونما ہوئے تھے جن کا ذکر مشہور رومن ادیب و مورّخ پلینی (۲۳-۷۹ء) اور بابل کے بعض تاریخ نگاروں نے کیا ہے کہ یہ سرخی دُمدار ستاروں اور شہابوں سے نکلی تھی جو قطبین کی برف پر بہت نمایاں تھی۔

کھٹملوں اور جوؤں وغیرہ کا عذاب

حشرات الارض کا عذاب بن کر پھیل جانا' ٹڈی دل کا عذاب بن کر ٹوٹ پڑنا مینڈکوں کا خطۂ زمین پر بارش کی طرح آسمان سے گرنا وہ حقائق ہیں جن پر تاریخ گواہ ہے پھر اگر قرآن بھی اسکی گواہی دیتا اور ایسے عذابوں سے عبرت حاصل کرنے کی دعوت دیتا ہے تو اس میں اچنبھے کی کیا بات ہے۔ صرف ایمان سے محرومی اور جہالت کا شاخسانہ ہے کہ ایسے حقائق کو ہضم کرنے میں دشواری کا سامنا ہے۔ عذاب مصر کے متعلق توریت کہتی ہے:۔

''اللہ نے مصر پر ایسی مکھیاں بھیجیں جو انسانوں کو کھا جاتی تھیں نیز ایسے مینڈک بھیجے جو ہر چیز کو تباہ کر دیتے۔ درختوں' پودوں اور فصلوں کو ٹڈی دَل چاٹ گیا اور ہر گھر جوؤں سے بھر گیا''۔

حشرات کا عذاب نہ صرف مصر پر نازل ہوا بلکہ بعض دیگر ممالک بھی اس کا شکار ہوئے' ایران کی ایک مذہبی کتاب ''بنداہس'' میں مذکور ہے کہ بہت قدیم زمانے میں اَہرمن آسمان پر گیا وہاں سے سانپ بن کر زمین پر لپکا پھر اس نے مکھی بن کر اپنے پَر ساری زمین پر پھیلا دیئے۔ سورج کی روشنی رُک گئی اور

گہری تاریکی چھا گئی۔ پھر اس نے لاتعداد سانپ، بچھو، کھٹمل وغیرہ زمین پر چھوڑ دیئے اور دنیا چیخ اٹھی۔

ریمسس دوم (فرعونِ موسیٰؑ) کے زمانے میں جنوبی سمندر کے جزائر میں رہنے والے لوگوں کا کہنا ہے کہ ایک دفعہ بادل زمین کے قریب آ گئے تھے، ساتھ ہی کہیں سے اتنی بڑی بڑی مکھیاں پل پڑیں کہ اُن کے پَروں سے بادلوں کے ٹکڑے اُڑ گئے۔ فراعین مصر کے تین دَور ہوئے ہر دَور تقریباً بارہ سو سال پر مشتمل تھا۔ درمیانی دَور کے اختتام پر مصری علَم پر مکھی کی تصویر ہوا کرتی تھی۔

کہتے ہیں بہت قدیم زمانے میں وینس (زہرہ) اپنی گزرگاہ کو چھوڑ کر زمین کے قریب سے گزرا جس کی گیس سے زمین پر زہریلے حشرات پھیل گئے اور آج تک بھی جب گرمیوں میں صحرا کی جانب سے بادِ سموم آتی ہے تو ہر طرف حشرات نمودار ہو جاتے ہیں۔

کنعان میں بعل نامی بُت کی پرستش ہوتی تھی۔ کنعانی اسے مکھیوں کا خدا کہتے تھے جیسے وسطی برازیل میں زہرہ کو ریت کی مکھی کہا جاتا تھا۔ کسی زمانے میں مصر پر بھی اسی قسم کا عذاب نازل ہوا تھا اور اہل مصر جوؤں، کھٹملوں اور مینڈکوں کے سیلاب سے چیخ اُٹھے تھے۔

دہریوں کے نزدیک فرشتوں کا اہل ایمان کی مدد کرنا، خدا کے حکم پر بستیوں کو اٹھا کر پٹخ دینا، پتھروں کی بارش یا چنگھاڑ وغیرہ سے نافرمانوں کو تباہ و ہلاک کر دینے اور اس قسم کی دیگر تصریحات ایسی داستانیں ہیں جنکی تائید کہیں سے نہیں ہوتی۔ اس ضمن میں یا تو واقعی انکی معلومات محدود ہیں یا پھر انہوں نے وہی ''میں نہ مانوں والا'' قاعدہ کلیہ مضبوطی سے کانٹھ باندھ رکھا ہے جسے ضد کہتے ہیں۔

فرشتے

فرشتے کائنات کی مہیب توانائیاں ہیں جو خیال وفکر اور ارادوں تک کو اپنے کنٹرول میں کر سکتے ہیں۔ ان مخفی توانائیوں نے ہر زمانے میں اللہ کے نیک بندگان کی مدد کی اور آج بھی کرتے ہیں بشرطیکہ مدد چاہنے والے نیک نیّات کے حامل اور تقویٰ و تقدس کی صفات سے آراستہ ہوں۔ کائنات میں ان فرشتوں کا کردار اتنا اہم ہے کہ ان پر ایمان لائے بغیر ہمارا نظامِ عقائد مکمل نہیں ہوتا۔

اگر ہم غور کریں کہ اعمال و نتائج کا درمیانی سلسلۂ اسباب کون فراہم کرتا ہے۔ ظالم کا ظلم جب

حد سے بڑھ جاتا ہے تو ایسے راشی و انصاف فروشوں کی بربادی کا انتظام کون کرتا ہے۔ آسمانوں کے لاتعداد کرّوں کو اپنے اپنے مداروں پر کون چلاتا ہے۔ بہاروں خزاؤں برساتوں کو وقت پر کون لاتا ہے۔ پھولوں میں رنگ پھلوں میں رس کون بھرتا ہے تو جواب میں ہم یہی کہیں گے کہ یہ سب افعالِ قدرت ہیں جو اپنے مالک و خالق کے حکم کے مطابق یہ مخفی کارکن انجام دیتے ہیں جنہیں ہم فرشتے کہتے ہیں۔ قرآن نے انہیں دو ناموں سے یاد کیا ہے یعنی ملائکہ اور روح۔

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنۡۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَ مِنۡ خَلۡفِهٖ يَحۡفَظُوۡنَهٗ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰهِ ..... (رعد:۱۱)

ترجمہ:۔ اللہ کے بدلی والے محافظ انسان کے آگے پیچھے رہ کر اللہ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے ہیں (رعد:۱۱)

آیت بالا میں ''بدلی والے'' فرشتوں سے مراد ہے کہ یہ فرشتے دن میں دو مرتبہ تبدیل ہوتے ہیں۔ بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے کہ ''تم میں فرشتے نوبت پے آتے ہیں۔ رات اور دن میں اور فجر و عصر کے وقت جمع ہوتے ہیں نئے فرشتے رہ جاتے ہیں اور جو فرشتے رہ چکے ہیں وہ چلے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سے دریافت کرتا ہے کہ تم نے میرے بندے کو کس حال میں چھوڑا' وہ عرض کرتے ہیں کہ نماز پڑھتے پایا اور نماز پڑھتے چھوڑا''۔ فرشتوں کا مدد کرنا غزوۂ بدر میں ایک ہزار فرشتوں سے مسلمانوں کی مدد کرنے سے ثابت بھی ہو چکا ہے۔ نیز غزوۂ خندق کے وقت جب تقریباً پندرہ ہزار کفار' مدینہ منوّرہ پر حملہ آور ہو گئے تو سخت آندھی چل پڑی جسے قرآن نے یوں بیان فرمایا:۔

اِذۡ جَآءَتۡكُمۡ جُنُوۡدٌ فَاَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ رِيۡحًا وَّ جُنُوۡدًا لَّمۡ تَرَوۡهَا ...(احزاب:۹)

ترجمہ:۔ جب تم پر کچھ لشکر چڑھ آئے (قریش' غطفان اور یہودی قبائل قریظہ اور نضیر کے) تو ہم نے اُن پر سخت آندھی چلائی نیز (تمہاری مدد کیلئے فرشتوں کے) ایسے لشکر نازل کیے جنہیں تم نہیں دیکھ سکتے تھے۔۔۔(احزاب:۹)

اللہ تعالیٰ ''روح'' سے بھی اپنے نیک بندوں کی مدد فرماتا ہے۔ یہ فرشتوں سے الگ بھی کوئی توانائی ہے۔ ممکن ہے انبیاء و اولیاء کی ارواح' قیدِ بدن سے آزاد ہونے کے بعد روح کی توانائی میں بدل

جاتی ہوں اور لوگوں کی مدد کرتی ہوں۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش اور معجزات میں آپکی مدد ایک مقدس روح سے ہوئی تھی۔ سورۃ البقرہ میں فرمان ہے۔

وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ.....(بقرہ:۲۵۳)

ترجمہ:۔ ہم نے عیسیٰؑ کو کھلے نشانات و معجزات دیئے اور ایک پاکیزہ روح سے اسکی مدد کی۔۔۔۔۔(بقرۃ:۲۵۳)

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ (نحل: ۲)

ترجمہ:۔ اللہ فرشتوں کو رُوح کے ساتھ اپنے جس بندے پر چاہے اپنے حکم سے نازل کرتا ہے(نحل: ۲)

اللہ تعالیٰ کا احسان عظیم ہے کہ اس نے لاتعداد فرشتے ہماری خدمت پر لگا رکھے ہیں۔ کوئی ہواؤں اور گھٹاؤں پر مقرر ہے تو کوئی ہماری حفاظت و حاجت روائی پر مامور ہے۔ مددگاروں کی یہ فوج نہ ہوتی تو انسان بے بس ہو کر رہ جاتا اور کچھ بھی نہ کر سکتا۔ اس احسان کے دو پہلو ہیں' اوّل یہ کہ اُس نے فرشتوں سے ہماری مدد فرمائی دوسرے یہ کہ ہمیں اس مدد کی خبر دی۔

عصرِ رواں میں ہماری درسگاہوں سے ایسے نوجوان نکل رہے ہیں جو ماورائے حجاب کچھ بھی نہیں دیکھتے۔ جن کی فکر سطحی' دانش ناقص اور نظر کوتاہ ہے جو خدا تک کے وجود کے منکر ہیں۔ یہ لوگ اندھیرا پھیلا رہے اور زندگی کی الجھنوں میں اضافہ کر رہے ہیں' اور ایمان کی غیر موجودگی میں یہ محرومی ایک فطری بات ہے۔

میں اپنے ان نوجوانوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا دنیا بھر میں کہیں کوئی ایسا شخص موجود ہے جو کبھی کسی مدرسہ یا سکول تک نہ گیا ہو، دنیا بھر میں کوئی شخص اس کا معلم ہونے کا دعویٰ تک نہ کر سکے اور ایسا شخص حیات کے محجوب پہلوؤں سے حجابات اٹھاتا ہو' آفاق کے عجیب و غریب اور ناقابل یقین حقائق پر بحث کرتا ہو' اور نظامِ کائنات کے پُر اسرار زاویوں سے یوں باخبر ہو کہ فرشتوں کی حقیقت

اور ان کے اعمال و فرائض پر کمال وثوق و اعتماد سے بحث کرتا ہو؟ یقیناً نہیں اور اگر واقعی نہیں' تو پھر کھلے دل سے اعتراف کیجئے کہ یہ کلام خالق کائنات رحمٰن و رحیم کی طرف سے نازل شدہ اور حرف بہ حرف مبنی بر حقیقت ہے جس کا نام قرآن ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے امّی رکھنے میں بھی مصلحت پروردگار کارفرما ہے۔ فرمان ہے:۔

وَ مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ(۴۸) بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَ مَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ (عنکبوت: ۴۹)

ترجمہ:۔ نزولِ قرآن سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو کوئی تحریر پڑھ سکتے تھے اور نہ لکھ سکتے تھے' اگر ایسا ہوتا تو باطل پسند آپ پر شک کرتے (عنکبوت:۴۸) قرآن کی روشن صداقتیں ایمان بن کر اہلِ علم کے سینوں میں راہ پا چکی ہیں اور اُن سے کوئی ظالم (جاہل) ہی انکار کر سکتا ہے (عنکبوت-۴۹)

ہلاکتِ کائنات (کرّہ ارض)

اب رہی ملحدین کے اس استفسار کی وضاحت کہ عذابوں سے بستیوں کا اجڑنا' پتھروں کا برسنا اور قوموں کا ہلاک و نابود ہونا وغیرہ (جن کی تائید کہیں سے نہیں ہوتی)۔ اس ضمن میں عرض ہے کہ تخریب و تعمیر کا تصوّر تمام اقوام و ملل کے ہاں ملتا ہے۔ سلطنتِ رومہ کا ایک مؤرّخ ''ویرّ د'' (۱۱۶-۲۷ ق م) لکھتا ہے کہ اٹلی کے ایک علاقے ایٹریا کی قدیم تاریخ میں کائنات کے سات مرتبہ فنا ہونے اور پھر پیدا ہونے کا ذکر ہے۔ تیسری صدی میلادی کا ایک قلمکار ''سینسورینس'' جو ویرّ د کی تحریرات کا جامع بھی تھا' کہتا ہے کہ اٹلی کے لوگ ستارہ شناسی میں ماہر تھے اور وہ بعض آسمانی علامات سے قبل از وقت کائنات کی تباہی کا پتہ چلا لیتے تھے۔ اس قسم کی دیگر روایات یونانیوں کے ہاں بھی ملتی ہیں۔

ارسطو کا کہنا ہے کہ کائنات ایک دفعہ پانی سے تباہ ہوتی ہے اور دوسری دفعہ آگ سے۔ یونان

کے ایک فلسفی ہرقلیطس (۵۴۰-۴۷۵ق م) کا خیال یہ ہے کہ دنیا ہر دس ہزار آٹھ سو سال بعد تباہ ہو جاتی ہے۔ یونان کا ایک اور حکیم اِرسٹارکس (۲۲۰-۱۴۳ق م) کہتا ہے کہ ۲۴۸۴ سال میں دنیا دو مرتبہ تباہ ہوئی ایک دفعہ پانی اور دوسری دفعہ آگ سے۔ زینو فلسفی (۳۴۰-۲۷۰ق م) کے پیرو جوسٹائیکس کے نام سے مشہور ہیں کہتے ہیں کہ دنیا بار بار آگ سے تباہ ہوتی اور پھر پیدا ہوتی ہے۔ یونان کا ایک یہودی فلسفی ''فیلو'' بھی اُن کا ہمنوا ہے۔ ایک اور یونانی فلسفی ہیسڈ (۸۰۰ق م) لکھتا ہے کہ اس سے پہلے دُنیا چار مرتبہ تباہ ہو چکی ہے اور معرکہ ٹرائے کا تعلق چوتھی بار سے تھا۔

میکسیکو کی متعدد تواریخ میں ہے کہ موجودہ زمین و آسمان پانچویں ہیں اس سے قبل چار مرتبہ کائنات تباہ ہو چکی ہے۔ خلیج بنگال کے ساحل تبت اور ہندوستان کے بعض حلقوں میں چار تباہ شدہ دُنیاؤں کا تصوّر ملتا ہے۔ بدھوں کی ایک کتاب وِسودھی مگّا میں لکھا ہے کہ دنیا سات مرتبہ تباہ ہوگی۔ یہ تباہی آگ' سیلاب یا آندھی سے ہوگی۔ ''اَوستا'' بھی سات تباہیوں کی قائل ہے۔ اہل چین کنفوشس تک تباہ شدہ دنیاؤں کی تعداد دس بتاتے ہیں۔ ہر تباہی میں دریا اپنی گزرگاہوں سے اچھل کر باہر آجاتے' پہاڑ پھٹ پڑتے اور تمام جاندار ہلاک ہو جاتے ہیں۔

کیا اب بھی اس حقیقت میں کوئی شک باقی ہے کہ کائنات کو بار بار تباہی سے دوچار کرنے والا خدا تمام دنیا کو ایک مرتبہ پھر تباہ کرے گا جس کا نام قیامت ہے اور جو پوری کائنات کی آخری تباہی ہوگی۔ اس ضمن میں قرآن کا یہ فرمان بھی دیکھ لیں جس میں پوری کائنات کی آخری تباہی کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے۔ (سورۃ:الحاقہ)

فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۙ (۱۳) وَّ حُمِلَتِ الْاَرْضُ وَ الْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۙ (۱۴) فَیَوْمَىٕذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۙ (۱۵) وَ انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِیَ یَوْمَىٕذٍ وَّاهِیَةٌ ۙ (۱۶) وَّ الْمَلَكُ عَلٰۤی اَرْجَآىِٕهَا ؕ وَ یَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ یَوْمَىٕذٍ ثَمٰنِیَةٌ ؕ (۱۷) (سورۃ:الحاقہ)

ترجمہ:۔ پھر جب یک لخت صُور پھونک دیا جائے (الحاقہ:۱۳) اور زمین اور پہاڑ اٹھا کر دفعۃً چورہ کر دیئے جائیں (الحاقہ:۱۴) اس دن واقع ہو جائیگی جسکا ہونا طے ہے (الحاقہ:۱۵)

اورآسمان ڈھیلا ہوکر پھٹ جائیگا (الحاقہ :۱۶) اور ملائکہ (جن کا قیام آسمانوں پر ہے) اس کے کناروں پر کھڑے ہونگے اور اس دن تمہارے رب کا عرش آٹھ فرشتے اٹھائے ہونگے (الحاقہ :۱۷)

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ (۱) یَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَ تَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَ تَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَ مَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِیْدٌ (۲) (سورۃ:الحج)

ترجمہ:۔اے لوگو اپنے رب سے ڈرو بیشک قیامت کا زلزلہ بڑی سخت چیز ہے (الحج/۱) جس دن تم اسے دیکھو گے ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے کو بھول جائیگی اور ہر حاملہ اپنا حمل ڈال دیگی اور تم لوگوں کو دیکھو گے جیسے نشہ میں ہیں حالانکہ وہ نشے میں نہ ہوں گے مگر یہ کہ اللہ کا عذاب بہت شدید ہے (الحج: ۲)

حقانیت قرآن پر منطقی دلائل

آج سے یک صدی قبل تک بروزِ قیامت پہاڑوں کے روئی کے گالوں کی طرح اڑنے کے قرآنی تصور کو قائم کیا جانا سہل نہ تھا اور صرف ایمان کی حد تک اس کا یقین یا گمان کیا جا سکتا تھا مگر آج اس کو سمجھنا کسی کیلئے کچھ بھی دشوار نہیں کہ بارود کی معمولی سی مقدار پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر کے فضاء میں بکھیر ڈالنے کو کافی ہے۔

اگرچہ فرعون کی لاش کو عبرت کیلئے محفوظ رکھنے کی آیت کے نزول کے وقت فرعون کو غرقِ سمندر ہوئے صدیاں گزر چکی تھیں اور اسکی لاش کا وجود انسانی آنکھ سے روپوش تھا جس بناء پر طویل عرصہ تک طنز و تشنیع کے ترش و تراز تیر اہل ایمان پر برسائے جاتے رہے۔ یہاں تک کے جس نبی برحق صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ کلام نازل ہوا تھا انکے آخری سانس لے چکنے کے سینکڑوں سال بعد تک بھی فرعون کی لاش کی برآمدگی کے کوئی آثار نمایاں نہ ہوئے۔ ایمان سے محروموں نے اس بات کو قرآن کے (معاذ اللہ) مہمل و بے اعتبار ہونے کا خوب شور مچایا' مگر یہی بات اُس وقت قرآن کے حقیقی کلام الٰہی ہونے کا غیر متردّد ثبوت ٹھہر گئی' جب آخری فرعون' ریمسس ۔۲ کی لاش برآمد ہوئی اور ایکس توپوں کی سلامی کے بعد مصر کے عجائب خانہ میں عبرت کیلئے رکھ دی گئی۔

نیز کائنات کا محیر العقول ارتقائی نظام اور تسخیر فلکیات و سیارگان' جس کی اطلاع قرآن ساڑھے چودہ سو سال قبل دے چکا ہے' آج اپنے صانع کی بے مثلی' اسکے پیغمبران اور کتب سماویہ کے سچے ہونے کی گواہی دے رہا ہے۔ قرآن کی پیشگوئیاں ایسے واقعات کے متعلق ہیں جن کی علامات تک کہیں موجود نہیں تھیں اور جن کے متعلق قبل از وقت کوئی اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا۔ ایمان ایک ایسا خزانہ ہے جو یقین کی دولت اور ذاتِ خالق پر اعتماد فراہم کر سکتا ہے۔ جس سے ہم مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے تمام نقصانات سے محفوظ رہ سکتے اور تمام فوائد سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

قرآنی پیشگوئیاں

قرآنِ حکیم کی اِن بشارات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اوّل وہ جو ابھی تک ظہور پذیر نہیں ہوئیں اور دوم وہ جو پوری ہو کر سچ ثابت ہو چکی ہیں۔

اوّل:۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔وہ جو ابھی تک وقوع پذیر نہیں ہوئیں مثلاً:۔

۱۔ یاجوج ماجوج اور دجّال کا ظہور۔

۲۔ دابۃ الارض کا خروج۔

۳۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا نزول۔

۴۔ قیامت کا وقوع پذیر ہونا وغیرہ۔

دوم:۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔وہ جو پوری ہو چکیں ہیں مثلاً:۔

۱۔ آفاقی دقائق جو تحقیق کے نتیجہ میں عیاں ہوئے۔

۲۔ فرعون کی لاش کو عبرت کیلئے محفوظ رکھنا۔

۳۔ رُوم کی فتح۔

۴۔ مسلمانوں کو حکومت کی بشارت۔

۵۔ ابوجہل کی تباہی و ہلاکت۔

۶۔ ابولہب کے ہاتھ بیکار اور ہلاکت' نیز اسکی بیوی کے گلے میں مونجھ کی رسی۔

۷۔ قرآن کی حفاظت اور تدوین کا وعدہ۔

تو آئیں آفاق اور انفس پر غور کریں کہ ان میں ہی وہ اسرار و بھید الٰہیہ موجود ہیں جن سے خدا تعالیٰ کی شناخت اور اسکے کلام کی سچائی دریافت ہو سکتی ہے۔

آفاق

ہم اب تک ظاہر ہو چکی بشارات پر ہی بحث کریں گے کہ ایمانوں میں زیادت کا باعث اور نہ ماننے والوں کیلئے اِتمامِ حجت ہیں۔ امید ہے اس بحث سے اپنے پیدا کرنے والے کے منکر (ملحدین) اپنے نفع ونقصان کو پہچان کر کوئی مثبت فیصلہ کرنے کی حالت میں ہو سکیں گے۔

مزید وضاحات کیلئے ہمیں ماضی کی اقوام کے عقائد ورواجات اور انکے احوال کا بھی سرسری جائزہ لینا ہوگا تا کہ حقائق (اپنی اصلیت ترصورت میں) ہم پر آشکار ہو سکیں اور ہم اس پوشیدہ ہستی کا عرفان پانے کے لائق ہو سکیں۔ تاہم پہلے تخلیق کائنات پر غور کریں اور اسکے ارتقاء وقیام کی بنیادی اور اصولی باتوں کا مطالعہ کریں تو اس صانع کا محیر العقول نظام یقیناً آپ کو دنگ کر دیگا۔

تکوین کائنات

علمائے ہیت دان آج اس بات پر یقین اور باہم اتفاق رکھتے ہیں کہ ابتدائے آفرینش میں زمین (کرّہ ارض) سورج ہی کا ایک حصہ تھی جو کسی طور اس سے جدا ہوگئی۔ وہ اس قدر شعلہ جوالہ اور دہکتی آگ کا گولہ تھی جسے ٹھنڈا ہونے میں بیس لاکھ سال کا عرصہ لگا۔ علمائے فطرت کا یہ خیال بھی انکی تحقیق اور تجربات کا نچوڑ ہے کہ کائنات اپنی ابتداء میں ہر طرف دھویں سے اٹی پڑی تھی جو دراصل وہ ترکیبی عناصر تھے جن سے آسمانوں اور ایتھر وغیرہ کی تعمیر ہوئی تھی۔ آفتاب ودیگر کواکب کی تعمیر کے بعد ایک بہت بڑا ستارہ سورج کے قریب سے گزرا تو کشش کی شدت کے باعث ایک ٹکڑا سورج سے جدا ہو کر گھومتے ہوئے قریباً ساڑھے نو کروڑ میل دور جا پڑا' جو ہنوز گھوم رہا اور ہنوز اندر سے گرم ہے جس کا نام زمین ہے۔

اگر ہم زمین کے اندر اترنا شروع کریں تو ہر تیس میٹر کی گہرائی میں درجہ حرارت ایک درجہ بڑھتا جائیگا۔ تین سو میٹر کی گہرائی میں درجہ حرارت دس ہوگا اور یوں تیس ہزار کے عمق میں ایک ہزار تک پہنچ جائیگا۔ آتش فشانی کے رُونما ہونے کی وجوہات میں سے ایک وجہ زمین کا اندرونی درجہ حرارت بھی ہے۔

جب زمین سورج سے الگ ہوئی تھی اس وقت اس کا درجہ حرارت دس ہزار سے اوپر تھا۔ بیس لاکھ سال بعد ہماری زمین (جس کے قشر کی موٹائی ایک ہزار ترانوے گز ہے) باہر کی سطح سے بتدریج ٹھنڈی ہوئی جس کا یہ عمل تا حال جاری ہے۔

آغازِ تخلیق کائنات اور مدارجِ ستہ

آج کا دور سائنسی ترقی کا دور کہلایا جا سکتا ہے۔ فلاسفران و ہیت دانوں کی انتھک محنت اور مسلسل تجربات نے ثابت کیا کہ اس کائنات کو اپنے چھ ارتقائی مدارج سے گزرنا پڑا جبکہ قرآن نے بہت پہلے سے اس کائنات کو چھ روز میں بنانے کا اعلان کر رکھا ہے۔

اعداد کی تین قسمیں ہیں اوّل زائد دوسری ناقص اور تیسری کامل۔ عددِ زائد میں اعدادِ ضرب کا مجموعہ اصل سے زائد ہوتا ہے۔ عددِ ناقص میں اعدادِ ضرب کا مجموعہ اصل سے کم ہوتا ہے اور عددِ کامل میں اعدادِ ضرب کا مجموعہ اصل کے برابر ہوتا ہے۔ اعدادِ کاملہ اکیس لاکھ تک صرف چھ ہیں یعنی عددِ کامل چھ جستوں میں اکیس لاکھ تک جا پہنچتا ہے۔ اسی طرح جب کائنات چھ زمانوں سے گزر چکی تو دنیا میں کم و بیش اکیس لاکھ قسم کے نباتات حیوانات و جمادات پیدا ہو گئے اور یہ تمام انواع چھ کے عدد کی طرح ہر لحاظ سے مکمل تھیں۔ یاد رہے اعدادِ کاملہ دس سنکھ تک صرف سترہ ہیں۔

ماہرین علمائے فطرت کا کہنا ہے کہ درجہ اُولا میں معدنیات کی تکوین ہوئی جو ابتدا میں دخانی صورت میں ہر جانب پریشان تھے۔ درجہ ثانیہ میں طوفان اور زلازل کے باعث پہاڑ تعمیر ہوئے اور تیسری حالت میں نباتات کا آغاز ہوا۔ جب زمین سورج سے علیحدہ ہوئی تھی تو نہایت گرم تھی معادن گیس بن کر آسمان کی جانب اٹھتے اور سرد فضاؤں میں پہنچ کر خنک ہو کر دوبارہ زمین پر ٹپک پڑتے اور بار بار ایسا عمل طویل عرصہ تک جاری رہا۔ جس سے زمین کا قشر سرد پڑنے لگا تو یہ دھاتیں بھی منجمد ہونے لگیں۔ سب سے پہلے سونا سرد ہوا پھر تانبا اور آخر میں سکہ منجمد ہوا۔ زلازل کے باعث یہ معادن زمین کی تہوں میں اتر گئے اور کئی مقامات پر پتھریلی زمین نے ابھر کر پہاڑوں کی شکل و صورت اختیار کر لی اور گہرے حصے پانی بھر جانے کے باعث سمندر بن گئے۔ مندرجہ بالا وضاحت اور محققین کی جاں گسل تحقیق

وتجربات بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انہیں معلوم ہو گیا کہ کائنات کو ارتقاء کے چھ درجوں سے گزرنا پڑا۔

ابتدائی عناصرِ حیات

(۱) عناصر ترکیبی دخان کی صورت میں نمودار ہوئے۔

(۲) ان عناصر سے اجرام سماوی پیدا ہوئے۔

(۳) آفتاب سے قرۂ ارض جدا ہوا۔

(۴) بخارات کا اٹھنا' ٹھنڈا ہو کر پانی بن کر ٹپکنا' زمین کا ٹھنڈا ہونا اور زلازل سے پہاڑوں اور سمندروں کا تعمیر ہونا۔

(۵) سمندروں کے اسی پانی کی بدولت نباتات کا ظہور ہوا۔

(۶) پھر حشرات وحیوانات کی تخلیق ہوئی جن کی ارتقائی صورت انسان ہے۔

گویا آسمان کو دو عصروں اور کائنات ارضی کو چار عصروں میں مکمل کیا گیا۔ مغربی علمائے جدید کی یہ تحقیق سینکڑوں برسوں کی جانگسل محنت اور مختلف علوم پر دسترس کے بعد ماضی قریب میں اس نتیجہ پر پہنچ سکی جبکہ قرآن نے (حٰم السجدہ میں) آج سے ساڑھے چودہ سو سال قبل فرما دیا تھا۔

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۚ (۹) وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بٰرَكَ فِیْهَا وَ قَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ (۱۰) ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ وَ هِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَ لِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَاۤ اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ (۱۱) فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ اَوْحٰی فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ؕ وَ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ ۖۗ وَ حِفْظًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ (۱۲) (حٰم السجدہ)

ترجمہ:۔ (اے نبی آپ انہیں فرما دیں کہ) کیا تم اس ہستی (خدا تعالیٰ) کے قوانین کو توڑتے ہو جس نے دو یوم میں زمین بنائی اور (دیگر افعال واشیاء کو) اسکے ہمسر ٹھہراتے ہو (حالانکہ صرف اور صرف اکیلا) وہ سارے جہاں کا رب ہے۔ (یعنی اسے بنانے چلانے اور اسکی

تربیت کرنے والا صرف وہی ہے) (۹) اور اس (زمین) پر لنگر ڈالے (یعنی پہاڑ کھڑے کئے اور سمندر بنائے) اور اس میں (زمین و پہاڑوں میں) برکت (یعنی روئیدگی نباتات وغیرہ) رکھی اور اس میں بسنے والوں کی روزیاں مقرر کیں۔ یہ تمام عمل چار یوم میں تکمیل پا گیا پوچھنے والوں کو یہ ٹھیک جواب ہے (۱۰) پھر آسمان کی طرف قصد فرمایا اور وہ دھواں تھا۔ پھر زمین و آسمان کو حکم دیا کہ وہ خوشی سے یا نا چاہتے ہوئے بھی حاضر ہوں' دونوں نے عرض کی ہم رغبت کیساتھ حاضر ہوئے (۱۱) تو آسمان کو دو دنوں میں پورے سات کر دیا اور ہر آسمان کو اس سے متعلقہ کاموں کے احکام بھیجے اور ہم نے نیچے کے آسمان کو چراغوں (ستاروں) سے آراستہ کیا اور (شیاطین مسترقہ سے) نگہبانی کیلئے یہ (نظام کائنات کی تخلیق اور اس کا استقرار) اس عزت والے (اور) علم والے کا ٹھہرایا ہوا ہے (۱۲) حٰم السجدہ

سورۃ الاعراف آیت ۵۴ میں بھی قرآن نے یوں خطاب فرمایا:۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ قف (الاعراف:۵۴)

ترجمہ:۔ بیشک تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمان اور زمین چھ روز میں بنائے پھر عرش پر استوا فرمایا (الاعراف:۵۴)

گویا یہ کائنات چھ روز میں تخلیق ہوئی۔ زمین پہاڑ سمندر اور نباتات وغیرہ چار یوم میں اور آسمان دو دن میں خلق فرمائے گئے۔ قرآن کا یہ بیان ایمان سے محروم احباب کو اس حقیقت کی طرف غور کرنے کی دعوت دیتا ہے کہ جب دنیاوی علوم سے حاصل شدہ آج کی انسانی تحقیق پر یقین کر لیا جاتا ہے تو قرآن کی سچائی پر یقین نہ کرنے کا جواز کہاں باقی رہا۔ نیز کسی کے نزدیک اگر موجودہ انسانی تحقیق اور تخمینے (CALCULATIONS) بھی مشکوک ہوں تو انسان کا چاند پر کامیابی سے اترنا ایسے شکوک کو رفع کر دیتا ہے۔

کرّہ ارض کی تخمیناً عمر

موجودہ علماء وماہرین کائنات کے مطابق کائنات میں کم وبیش تیس کروڑ زمینیں گردش کر رہی ہیں۔اس نظریئے کی بنیاد اس مشاہدے پر رکھی گئی ہے کہ فضا میں شموس کی تعداد دس کروڑ ہے اور ہر سورج کے گرد کم وبیش تین زمینیں گھوم رہی ہیں۔زمین کے بارے لارڈ کلون کے نزدیک زمین کی عمر دو کروڑ سال ہے جبکہ پروفیسر جولی کے نزدیک زمین نو کروڑ سال پرانی ہے۔لارڈ کلون نے اس نظریئے کی بنیاد زمین کی مختلف بیرونی حالتوں اور اندرونی درجہ حرارت پر رکھی ہے۔اسی کا نظریہ ہے کہ زمین کا بیرونی قشر بیس لاکھ سال میں ٹھنڈا ہوا تھا۔

بعض علمائے طبقات الارض کا خیال ہے کہ زمین کے اندرونی تہوں میں ریڈیم کی مقدار بہت زیادہ ہے جو حرارت پیدا کرتا ہے جس بناء پر زمین اندر سے گرم ہے۔لیکن لارڈ کلون اس نظریئے کے ساتھ متفق نہیں چنانچہ انہوں نے ایک خط ۱۹۰۶ء میں تحریر کیا اور جو ''برٹش ویکلی'' میں شائع ہوا' لکھتے ہیں کہ ''یہ بات قطعاً ناقابل یقین ہے کہ سورج اور زمین ریڈیم کی وجہ سے گرمی وروشنی دے رہے ہیں''۔

پروفیسر جولی کی تحقیق ہے کہ آغاز آفرینش میں جب سمندر بنے تو انکا پانی میٹھا تھا مگر بتدریج برساتی نالوں اور دریاؤں کے ساتھ سوڈے کی مقدار سمندروں میں آتی رہی جس سے سمندروں کا پانی نمکین ہوتا گیا۔انکی تحقیق یہ ہے کہ دنیا کے تمام دریا اور نالے سمندروں میں ہر سال سولہ کروڑ ٹن نمک کا اضافہ کرتے ہیں اور اِس وقت سمندروں کے نمک کا مجموعی وزن چودہ ہزار کھرب ٹن ہے جس کے جمع ہونے پر نو کروڑ برس ہوئے اور انکے نزدیک یہی زمین کی عمر ہے۔

آغازِ حیات (خلیہ)

متعدد ماہرین کے تجربات وتحقیق اور حیوانات ونباتات کا خوردبینی معائنہ کرنے کے بعد یہ حقیقت بے نقاب ہو چکی ہے کہ تمام حیوانات ونباتات خلیوں (cells) سے بنے ہیں ان میں بعض واحد الخلیہ ہیں اور بعض کثیر الخلایا۔یہ خلیے سمندر کے ایک جھلی دار مادے نخز مایہ سے تیار ہوئے تھے جو سمندر

کے ساحلوں پر ملتا ہے۔ سب سے پہلے اس نخز مایہ سے ایمیبا (amoeba) بنا جو ایک واحد الخلیہ جانور ہے اور جو کیچڑ میں ملتا ہے۔ اسکے بعد تو سینکڑوں ہزاروں لاکھوں اور کروڑوں خلیوں والے جانور وجود میں آئے جن میں حیوانات بھی شامل ہیں اور یہ بھی طے ہے کہ انسان حیوانات کے بعد ہے۔ موجودہ تحقیق و تجربات تو آج کی بات ہیں جبکہ قرآن نے ساڑھے چودہ سو سال قبل جو فرمایا اس پر غور کریں:۔

اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ (الصافات:۱۱)

ترجمہ:۔ ''بیشک ہم نے انہیں لیس دار کیچڑ (ساحلی دلدل) سے پیدا کیا''۔ (الصافات:۱۱)

حیوانات کا موجودہ تنوع اسی واحد الخلیہ مخلوق کے ارتقاء و استعمار کا نتیجہ ہے۔ پھر فرمایا:۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً ۚ (النساء :۱)

ترجمہ:۔ ''اے لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں واحد الخلیہ سے پیدا کیا اور اسی سے اسکی مادہ نکالی (آدم کی زوجہ کو آدم کی ایک پسلی سے تخلیق فرمایا) اور ان دونوں سے بہت سے مرد و عورت پھیلا دیئے۔ (النساء/آیت:۱)

واحد الخلیہ مخلوق (ایمیبا) مندرجہ ذیل مدارج سے گزر کر تکوین آدم پر منتہی ہوئی۔

۱۔ پہلے ان خلیوں سے نباتات بنے۔

۲۔ پھر حیوانی نباتات بنے یعنی ایسے نباتات جن میں حرکتِ معدہ اور بعض حیوانی اعضاء تو موجود تھے لیکن وہ دیکھنے سونگھنے اور سننے سے محروم تھے۔

۳۔ پھر رینگنے والے کیڑے پیدا ہوئے۔

۴۔ اسکے بعد اصداف اور جونکیں وجود میں آئیں۔

۵۔ پھر سرطان البحر نے جنم لیا اور ساحل پر بچھو نظر آنے لگے۔

۶۔ اسکے بعد مچھلیوں، مگرمچھوں اور دیگر حیواناتِ آبی کا دور آیا۔

۷۔ پھر زندگی خشکی پر آئی تو کیڑوں مکوڑوں پرندوں اور چوپاؤں کے بعد انسانی تخلیق عمل میں آئی۔

گویا زندگی پانی کی پیداوار ہے جو پہلے ایک خلیہ تھی پھر اسفنجیہ پھر شعاعیہ اور پھر بلامیہ بنی

اسکے بعد حشرات، دیدان، عنا کب، طیور اور حیواناتِ سفلی وعلوی کی منازل سے گزر کر انسانی عظمتوں تک جا پہنچی۔ رحم مادر میں بالکل وہی عناصر موجود ہیں جو سمندر میں ملتے ہیں اور درجہ حرارت بھی وہی ہے۔ ماہرین تولید نے ہزار ہا تجارب ومشاہدات کے بعد یہ ایمان افروز اعلان کیا کہ جس طرح آغاز میں زندگی مختلف مدارج سے ہوتی ہوئی منزل انسانیت تک پہنچی تھی۔

اسی طرح کا ایک سلسلہ ماں کے پیٹ میں بھی کارفرما ہے۔ رحم مادر میں نطفہ پہلے ایک خلیہ ہوتا ہے پھر چند مدارج سے گزر کر جونک بنتا ہے پھر مینڈک کی شکل اختیار کر لیتا ہے پھر پرندوں جیسی چونچ سی نظر آنے لگتی ہے اسکے بعد چوپاؤں کی صورت بدلتا ہے چوتھے ماہ میں سر اور بازو کے علاوہ ایک چھوٹی سی دم نکلتی ہے جو پانچویں مہینے میں ختم ہو جاتی ہے چھٹے مہینے میں نر و مادہ کی تمیز ہوتی ہے آٹھویں میں آنکھیں کھلتی اور سر پر بال اگ آتے ہیں۔ انسان کا بچہ دراصل ان تمام مناظر سے گزرتا ہے جن سے زندگی کو آغازِ آفرینش سے گزرنا پڑا تھا۔ ابتدائی مراحل میں انسانی بچہ دیگر حیوانات کے بچوں سے متمیز نہیں کیا جا سکتا۔

ہم ماہرین تولید کی تحقیق کو اس پیرائے میں بھی دیکھیں کہ ایمیبا کیچڑ میں جنم لیتا ہے یعنی وہ پانی اور مٹی کا بچہ یا نچوڑ ہوتا ہے جسے عربی زبان میں (سلالہ) کہتے ہیں۔ پھر یہ جونک کی صورت اختیار کرتا ہے جسے عربی زبان میں (علق) کہتے ہیں۔ پھر رحم مادر میں چوپائے گھوڑے کی سی صورت اختیار کر لیتا ہے جسے عربی زبان میں (مضغۃ) یعنی بازوئے اسپ کہا جاتا ہے۔ آخر میں اسے انسانی صورت مل جاتی ہے۔

یہ تو رہی آج کی تحقیق اور قرآن (سورۃ المومنون میں) ساڑھے چودہ سو سال پہلے فرما چکا ہے:۔

وَ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ طِیۡنٍ ۚ (۱۲) ثُمَّ جَعَلۡنٰهُ نُطۡفَةً فِیۡ قَرَارٍ مَّكِیۡنٍ ۖ (۱۳) ثُمَّ خَلَقۡنَا النُّطۡفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقۡنَا الۡعَلَقَةَ مُضۡغَةً فَخَلَقۡنَا الۡمُضۡغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوۡنَا الۡعِظٰمَ لَحۡمًا ۟ ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِیۡنَ ؕ (مومنون: ۱۴)

ترجمہ:۔''اور بلاشبہ ہم نے انسان کو (سلالۃ) چنی ہوئی مٹی سے بنایا (۱۲) پھر اسے (انسانی نطفہ کو) ایک مضبوط ٹھہراؤ (رحم مادر) میں پانی کی بوند کیا۔ پھر ہم نے اس نطفہ کو جونک (علقہ) کی شکل کیا پھر اس خون کی پھنک کو گوشت کا لوتھڑا گھوڑے سے مشابہ بنایا' پھر گوشت کی بوٹی کو ہڈیاں بنایا پھر ان ہڈیوں پر گوشت چڑھایا پھر اسے انسانی صورت میں اٹھان دی (یعنی انسان کی شکل وصورت بنائی اس میں روح ڈالی اسے سمع وبصر اور نطق عطا فرمائی) پس اللہ کیا ہی برکت والا بہترین خالق ہے'' (مومنون:۱۲تا۱۴)

کیا اب بھی تخلیق انسان کا سہرا سوائے اسکے خالق کے کسی کو دیا جاسکتا ہے۔ یقیناً نہیں' کیونکہ ایسے ٹھوس دلائل کو رد کرنا کسی باشعور کیلئے سہل نہیں۔

انسان اشرف المخلوقات اسلئے ہے کہ اسے شناختِ خدا کیلئے پیدا فرمایا گیا۔ ان میں بعض اگر وحشی ہیں تو بعض عقلاء اولیاء وانبیاء بھی ہیں۔ بعض جہالت کے سبب بیکار و نادار ہیں تو کچھ لائق وفائق لوگ نادر علوم کے ذریعہ چاند ستاروں پر کمندیں ڈالنے' عجائباتِ کائنات اور اسکے بنانے والے کی کھوج و تلاش میں سرگرداں بھی ہیں۔ کبھی وہ زمانہ تھا کہ علمائے شرق وغرب کو اللہ کی ہستی سے متعلق بہت سے شبہات ہوا کرتے تھے۔ علم اس قدر ناقص تھا کہ جہالت ومعرفت کی سرحدیں باہم ملی ہوئی تھیں۔ آج علمائے مشرق تو اپنا فرض بھلائے مست بیٹھے ہیں تاہم علمائے مغرب کی تلاش وتحقیق نے عروسِ فطرت کے بہت سے خدوخال عیاں کر دیئے ہیں۔ لگتا ہے عنقریب انسان کا گستاخ ہاتھ دامن قدس تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیگا اور یہی منشائے ذوالجلال بھی ہے۔ وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنتَهَىٰ (النجم:۴۲)

ترجمہ:۔اور بیشک تمہاری آخری منزل خیامِ قدس تک رسائی ہے۔ (النجم :۴۲)

تخلیق کائنات کی حیرت انگیزیاں

علمائے ہیئت کا خیال ہے کہ شروع میں انسان کی پیدائش خط استوا کے قریب ساحلِ سمندر پر ہوئی تھی۔ انسانی رحم نے نہ صرف اس حرارت کو محفوظ رکھا بلکہ وہ تمام عناصر بھی یہاں موجود ہیں جو سمندروں میں ملتے ہیں۔ کائنات کا ہر منظر''لالہ وصحرا تا آسمانی تاروں تک،، ذرّات برقیہ سے تعمیر ہوا۔

اگر ہم خوردبین سے پانی کا معائنہ کریں تو ہمیں چھوٹے چھوٹے ذرّات نظر آئیں گے جن کا قطر ایک انچ کا کوئی کروڑواں حصہ ہوگا۔ گو کہ یہ آبی ذرّہ خاکی ذرّے سے بہت چھوٹا ہوتا ہے لیکن وہ بھی کئی ہزار جواہر سے مرکب ہوتا ہے' پھر ہر جوہر منفیہ وثباتیہ کا مجموعہ ہوتا ہے۔ مائیکروب سے ہزار گنا چھوٹے یہ ذرّات دراصل وہ اینٹیں (ATOMS) ہیں جن سے ایوان فطرت تیار ہوا۔ اس مہیب کائنات کا ہر منظر ان ہی بے مقدار ذرّات سے بنا۔ سائنس کا یہ موجودہ انکشاف توحید پر بہت بڑی دلیل ہے۔

فرض کیجئے ایک انسان زمین کا پیٹ چیر کر میلوں اندر گھس جاتا ہے اور وہاں سے کسی نرالی دھات کا ایک ٹکڑا نکال لاتا ہے' پھر بحرالکاہل کی گہرائیوں میں غوطہ لگا کر میلوں نیچے سے کوئی خول نکال لاتا ہے' اس کے بعد آسمان کی نیلی فضاؤں میں کھربہا میل دُور جا کر کسی مدہم تارے یا چاند کا کوئی کنکر توڑ لاتا اور خوردبین کے نیچے رکھ کر ہر تین کا معائنہ کرتا ہے تو اسکی حیرت کی انتہا نہیں رہتی کہ ان تینوں کے اجزائے ترکیبی وہی ذرّات برقیہ ہیں جو ذرّۂ غبار' پھول کی پنکھڑی' قطرۂ شبنم اور زہرہ ومشتری تک میں یکساں پائے جاتے ہیں۔ فوق العرش سے تحت الثریٰ تک عناصر تکوینی کی یہ وحدت بھی وحدت خالق تعالیٰ کا ایک ناقابل تردید اعلان ہے۔

ان خشت ہائے ہستی (ATOMS) کی متعدد قسمیں ہیں۔ جواہر آبی' جواہر آکسیجن' جواہر آہنی اور جواہر کاربنی وغیرہ۔ پانی کا خوردترین قطرہ آکسیجن کے ایک جوہر اور ہائیڈروجن کے دو جواہر سے ملکر سالمہ آبی (MOLECULE) کہلاتا ہے۔ بعض اشیاء کے سالمے کم یا زیادہ جواہر سے بھی مرکب ہوتے ہیں جن کی تعداد سینکڑوں تک ہوسکتی ہے۔ پانی میں آکسیجن کا ایک جوہر ہائیڈروجن کے دو جواہر کو تھام سکتا ہے' نمک میں سوڈے کا ایک جوہر کلورین کے صرف ایک جوہر کو قابو میں کرسکتا ہے لیکن کلورائیڈ آف گولڈ میں سونے کا ایک جوہر کلورین کے تین جواہر کو تھام سکتا ہے۔

یہ جواہر مختلف مقادیر میں مل کر مختلف اشیاء تیار کرتے ہیں ہر ملاپ کسی قدرتی وکیمیائی ترکیب ہی کا نتیجہ ہوتا ہے جس کا یقینی علم ابھی تک حاصل نہیں۔ البتہ عام نظریہ یہی ہے کہ بعض میں مثبت اور بعض میں منفی برقیہ موجود ہے۔ چونکہ مثبت بجلی منفی بجلی کو اپنی سمت کھینچتی ہے جس سے جواہر ایک دوسرے سے مل

جاتے ہیں۔ اگر دو جوہروں میں ایک ہی قسم کی بجلی یعنی مثبت یا منفی ہو تو وہ ایک دوسرے سے دور بھاگتے ہیں۔ ہائیڈروجن کے جوہر میں اللہ نے مثبت اور آکسیجن کے جوہر میں منفی بجلی رکھ دی جس سے وہ ایک دوسرے کی طرف کھنچ رہے ہیں اور پانی تمام عالم کیلئے مدارِ حیات بن رہا ہے۔

ارتعاش جواہر

علمائے فطرت نے مسلسل مشاہدات کے بعد اعلان کیا ہے کہ تمام جواہر میں باوجود اتصال کے انفصال بھی ہے اور حرکت بھی۔ تمام جواہر ایک مسلسل ارتعاش کی حالت میں رہتے ہیں جس سے کچھ حرارت بھی پیدا ہوتی ہے۔ جب پٹری سے ریل گزرتی ہے تو ارتعاشِ ذرّات کی وجہ سے پٹری گرم ہو جاتی ہے۔ یہ ارتعاشِ حرکت کا نتیجہ ہے اور حرکت اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ جواہر باوجود اتصال کے ایک دوسرے سے علیحدہ ہوں۔ بعض اشیاء مثلاً لکڑی کے جواہر میں ارتعاش کم ہوتا ہے اسلئے وہ سرد اجسام کہلاتے ہیں۔ اگر ہم لوہے کو تیز آگ میں رکھ کر گرم کرتے جائیں تو ہجوم ارتعاش واضطراب کی وجہ سے جواہر اپنی اتصالی گرفت کو ڈھیلا کر دیں گے اور لوہا اپنی جسامت میں پھیل جائیگا' مزید حرارت کے بعد جواہر ایک دوسرے سے جدا ہو کر آہن کو سیال کی صورت دیدیں گے۔ اگر چھ ہزار درجہ کی حرارت پہنچائی جائے تو یہ آہنی سیال گیسی صورت میں تبدیل ہو جائیگا۔ یہیں سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ہر جسم میں مسام موجود ہیں ورنہ جواہر متحرک نہ ہو سکتے' یہاں تک کہ پہاڑ تک متحرک ہیں۔ پہاڑوں کی یہ حرکت ایک تو حرکتِ زمین کی وجہ سے ہے دوسرے اُن منفیوں کی وجہ سے جن سے پہاڑوں کی ترکیب ہوئی۔ ماہرین فطرت کا یہ اعلان تو آج کی بات ہے مگر قرآن نے قریباً ساڑھے چودہ سو سال قبل فرمایا:۔

وَ تَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّ هِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ؕ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ؕ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ (نمل: ۸۸)

ترجمہ:۔ ''اور تو پہاڑوں کو دیکھ کر خیال کرے گا کہ وہ جامد ہیں حالانکہ وہ بادلوں کی چال چل رہے ہونگے۔ یہ اللہ ہی کا کام ہے جس نے ہر شئے حکمت سے بنائی۔ بیشک وہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو''۔ (نمل:۸۸)

کائنات میں جو تنوع دکھائی دیتا ہے وہ بھی جواہر میں منفیوں کی کمی بیشی اور اختلافِ نظام کے باعث ہے۔ کسی جوہر میں منفیے وسط میں تو کسی کے کناروں کے پاس ہیں۔ پھر تعداد میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہی اختلافِ نظام و تعداد تنوع مناظر کا سبب ہے۔ مثلاً ہائیڈروجن کے جوہر میں صرف ایک منفیہ ہوتا ہے آکسیجن کے جوہر میں آٹھ منفیے ہوتے ہیں اور کیلشیم کے جوہر میں بیس منفیے ہوتے ہیں اور انکے وسط میں برقِ مثبت کا مرکز ہے۔ ایک مغربی عالم ہیئت نے جب ان جواہر کے نظام اور مشینری کو دیکھا تو حیرت سے پکار اٹھا۔

,,It is wonder that man's brain reels before the infinitely great things of the universe on the one hand and the infitely small things of nature on the other..

''ایک طرف تو انسانی عقل قدرت کی بڑی بڑی مہیب ایجادات کو دیکھ کر لرز اٹھی ہے اور دوسری طرف باریک ترین ذرّات کا اعجاز دیکھ کر تحیّر میں کھو جاتی ہے''۔

قران نے ہمیں ان خوردبینی اجزائے تکوین کی طرف یوں متوجہ کیا ہے:۔

وَ مَا تَكُوْنُ فِیْ شَاْنٍ وَّ مَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّ لَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَ مَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَ لَا فِی السَّمَآءِ وَ لَاۤ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَ لَاۤ اَكْبَرَ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ

(یونس:۶۱)

ترجمہ:۔''ارض و سماء کا کوئی ذرّہ (جوہر) ذرّے سے بھی چھوٹا (منفیہ) یا بڑا (سالمہ) تیرے رب کی نگاہ سے اوجھل نہیں بلکہ اسکی روشن کتاب میں موجود ہے''۔(یونس:۶۱)

کچھ لوگ معترض ہو سکتے ہیں کہ ترجمہ میں منفیہ یا سالمہ کہاں سے آ گیا' تو اس ضمن میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ اگر اصغر و اکبر سے مراد منفیہ و سالمیہ نہ لئے جائیں تو ساری آیت ایک چیستان بن کر رہ جاتی ہے' چونکہ اللہ علام الغیوب جانتا تھا کہ عنقریب علمائے فطرت ذرّے کی یہ اقسام دریافت کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اسلئے وحی میں اس آخری کتاب کی عظمت تسلیم کرانے کیلئے اللہ نے چھوٹا ہو یا

بڑا فرما کر اقسام ذرّات کا بھی ذکر فرما دیا۔ قرآن حکیم کے الہامی ہونے پر اس سے بڑی دلیل کیا ہوگی کہ اس میں ساڑھے چودہ سو سال قبل ایک ایسی چیز کا ذکر موجود ہے جس کا علم ایک طاقت ور خوردبین کے بغیر حاصل ہی نہیں ہوسکتا اور خوردبین تو کل کی ایجاد ہے۔ علمائے فطرت عجائباتِ قدرت پر غور وفکر کر کے الہام کے قریب جا پہنچتے۔ خوردبین کے بغیر نظر نہ آنے والے ذرّات کا سالہا سال تک مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کے بعد آخر کار لارڈ کلون چلّا اٹھا اور بیساختہ گواہی دینے لگا۔

It is impossible to conceive either the beginning or the continuance of life without an overruling creative power. overpowering strong proofs of benevolent and intelligent design are to be found around us, teaching that all living things depend on one everlasting creator and ruler.

''یہ خیال سراسر باطل ہے کہ کائنات کا آغاز یا تسلسل بغیر کسی خالق کے ہوسکتا ہے۔ ہمارے گرد پھیلے فطرت کے حیرت انگیز مناظر جن سے تکمیل و رحمت برستی ہے' الٰہی تخلیق و تعمیر پر مبہوت کن دلائل ہیں جن سے صاف عیاں ہے کہ وجود کائنات کا انحصار ایک حی و قیوم فرماں روا کی مشیّت پر ہے''۔

متذکرہ بالا تمام تحقیقات جو علوم سائنس و آلات جدید کے ذریعہ انسان حاصل کر سکا اور تا حال حقائق پوشیدہ کی تلاش و جستجو میں ہے اب قرآن کی رہنمائی پر مائل دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ قرآن دو بڑے حصوں میں ضیاء پاش ہے۔ ایک قوانین مستحکم کی وہ آیات جو شریعت کے قیام کا ذریعہ ہیں اور دوسری وہ آیات جو دراصل قدرت الٰہیہ کے مخفی اسرار پر غور وفکر کرنے اور انہیں کھوج نکالنے پر ہی عیاں ہوسکتی ہیں۔ جیسا کہ:۔

الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۚ (یوسف: ۱)

ترجمہ:۔''قرآن کے مندرجات کتابِ مبین کی آیات ہیں''۔ (یوسف/۱)

دیگر بہت سی جگہوں پر صحیفۂ کائنات کے مختلف مناظر کو بھی بارہا آیات سے تعبیر فرمایا گیا۔ جیسے:۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی

الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ (سورۃ:ال عمران)

ترجمہ:۔''اس میں کوئی شک نہیں کہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے بدلنے میں عقلمندوں کیلئے (شناختِ خدا کی) نشانیاں موجود ہیں''۔ (آل عمران/۱۹۰)

یعنی صانع قدیم، علیم وحکیم اور ہر شئے پر قادر ہستی کے وجود پر دلالت کرنے والی آیات تو جا بجا موجود ہیں مگر صرف ان کیلئے جن کی عقل کدورت سے پاک اور عجائباتِ تخلیق کو اعتبار واستدلال کی نظر سے دیکھنے کی اہلیت ہو۔ سورۃ بقرہ میں فرمان ہے:۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَاخْتِلٰفِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّ تَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (البقرہ:۱۶۴)

ترجمہ:۔ بیشک ارض وسماء کی تخلیق میں، اختلاف لیل ونہار میں، انسانوں کیلئے سمندروں میں تیرنے والی مفید کشتیوں میں اور وہ جو اللہ نے آسمان سے پانی اتار کر مردہ زمین کو جلایا اور زمین میں تمام جانور پھیلائے اور ہواؤں کی گردش کے نظام میں اور بادلوں کو زمین وآسمان کے بیچ حکم باندھنے میں (ان سب میں اللہ کی حکمت وقدرت کو شناخت کر لینے کیلئے) عقل مندوں کیلئے آیات (نشانیاں) ہیں۔ (البقرۃ/۱۶۴)

قرآن اور صحیفۂ کائنات ہر دو بظاہر بے ترتیب دکھائی پڑتے ہیں جیسا کہ قرآن حکیم میں ربطِ آیات وسورۃ مفسرین کیلئے ہمیشہ ایک معمہ بنا رہا اور دوسری طرف کائنات کی ظاہری بے ترتیبی بھی عیاں ہے کہ سیاروں اور ستاروں کی بظاہر بکھری ہوئی محفل، سلسلہ کوہستان تک بلند وپست موٹی چھوٹی چوٹیاں، انسانی دنیا میں الوان وطبائع اور رنگ ونسلوں کا اختلاف، اقلیم اشجار میں بظاہر بے نظمی اور حیوانات وحشرات کی بے آہنگی وغیرہ جو طلبائے کائنات کو ہمیشہ پریشاں کرتی رہی ہے۔ اگرچہ ہر دو بظاہر بے ترتیب ہیں مگر دراصل ایک زبردست نظم کے حامل اور انسانی دسترس سے باہر ہیں۔ جس طرح اسرارِ قرآنی انسانی فہم سے بالا ہیں اسی طرح صحیفہ فطرت باوجود عیاں وسامنے ہونے کے ازبس ادق ہے۔

یعنی جس طرح دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا عالم، قرآن کی ایک آیت تک نہیں بنا سکتا اسی طرح کوئی بڑے سے بڑا ماہر نباتات یا سائنس دان ایک پتے یا ذرّے تک کی تخلیق سے عاجز ہے۔ علمائے مغرب افعالِ الٰہی (تخلیق کائنات) کے مطالعہ پر عمریں اور نسلیں صرف کر چکے ہیں مگر ان کی ہر کوشش انہیں پیام درماندگی دے رہی ہے اور وہ قدم قدم اس اعلان پر مجبور ہیں۔

''معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد''

تو آیئے مخلوقاتِ عالم کے کچھ ششدر کر دینے والے زاویوں پر نظر ڈالتے چلیں کہ انکے مبدأ نے انہیں کن کن کمالات سے مربوط و مزین کر رکھا ہے۔ میں نے کتاب ھٰذا میں انہیں عالم کائنات، عالم نباتات، عالم حیوانات و معدنیات اور عالم حشرات کے عنوانات تلے زیر بحث لانا ضروری سمجھا ہے، تاکہ کائنات محض اتفاقیہ طور پر نمودار ہو جانے کا نظریہ رکھنے والے احباب اپنے مہمل نظریات پر نظر ثانی کر کے انصاف کر سکیں کہ موجودہ کائنات واقعی کسی اتفاقی حادثہ کی بناء پر وجود پا گئی یا اسے بنانے اور چلانے میں کسی قوت و حکیم کا بھی کچھ عمل دخل ہے۔

خزائنِ زمین

انسان کو بحیثیت خلیفۃ اللہ فی الارض جن اشیاء کا علم ہونا ضروری ہے انکا تو احاطہ بھی نہیں کیا جا سکتا البتہ کچھ اہم اشیاء کا ذکر کرتا چلوں جس سے آپ ششدر رہ جائیں گے کہ اس صانع نے کس بے نیازی سے اپنے احسن الخالقین ہونے کا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔

مقامِ حیرت ہے کہ ہم (خلیفۂ ارضی) اپنے فرشِ زمین کی ماہیت تک سے بھی واقف نہیں، کیا ہمیں معلوم ہے کہ زمین کن عناصر سے تیار ہوئی کس کے سہارے قائم ہے، اسکے بطون میں کیا کچھ ہے اور اس پر پانی کہاں سے آ گیا۔ ہمیں شاید اس سے سروکار ہی نہیں۔ خزائنِ زمین میں سے ایک بیش قیمت شئے فولاد بھی ہے جس سے تیار شدہ اشیاء مثلاً جہازوں، طیاروں، توپوں، ٹینکوں وغیرہ کی ہیبت سے آج دنیا لرز رہی ہے اور وہ قومیں کس قدر ضعیف و ذلیل ہیں جو علم سے بیگانہ ہیں۔ آج سے ساڑھے چودہ سو سال قبل ایک امّی (فداہ امی و ابی) صلی اللہ علیہ وسلم نے فاران کی چوٹیوں سے مسلمانانِ عالم کو یہ

پیغامِ حق سنایا تھا۔

وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ (الحدید:۲۵)

ترجمہ:۔ ''ہم نے فولاد اتارا جس میں زبردست ہیبت اور دنیا کیلئے بیشمار فائدے ہیں''۔(الحدید:۲۵)

لیکن مسلمانوں نے اس طرف توجہ ہی نہ دی اور ذلت ورسوائی کے جہنم میں دھکیل دیئے گئے۔ آج بھی اگر ہم قرآن کے درس ھدایت پر عمل پیرا ہو جائیں تو ہمارا موجودہ ضعف اور انحطاط عروج میں بدل سکتا ہے۔فی الحقیقت رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے عطا فرمائے گئے فرامین وہ دستور العمل ہیں جن پر کاربند ہونے کا لازمی نتیجہ زندگی' قوت وحشمت' تسخیر بحر وبرّ اور تمکن فی الارض ہے۔جنہیں دیگر اقوام نے اپنا کر اس انمٹ سچائی کا ثبوت بھی فراہم کیا۔ یہ امر قابل غور ہے کہ قرآن حکیم میں فقہی آیات عموماً سوالات کے جواب میں نازل ہوئیں اور مطالعہ کائنات پر نہایت تاکیدی اوامر نازل ہوئے جن سے اِعراض کی سزا قومی اور ملّی ہلاکت تعبیر کی گئی ہے۔قرآن میں خالق تعالیٰ نے بارہا اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم سے اعلان کروایا۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ط.....(یونس:۱۰۱)

ترجمہ:۔آپ انہیں زمین وآسمان پر نظر ڈالنے کا حکم فرمائیں۔۔۔۔۔(یونس:۱۰۱)

نظر ڈالنے سے مراد بس اچٹتی ہوئی ایک آدھ نظر آسمان وزمین پر ڈال کر حکم خدا سے بری ہو جانا نہیں۔نظر کے لغوی معنی ہیں دیکھنا' غور کرنا' سوچنا سمجھنا' معائنہ کرنا۔تو گویا ہمیں نظام کائنات پر غور کرنا اور اسکے تمام پہلوؤں کا معائنہ کرنا ہے جو اپنے اندر توحید کے انگنت دلائل سموئے ہوئے ہیں۔یہ بھی حقیقت ہے کہ آنکھ کا دائرہ بصارت از بس محدود ہے۔اسلئے ہمیں ان آلات وذرائع کا استعمال کرنا لازم آتا ہے جن سے ہم زمین وآسمان کے سینہ کو چیر کر رازہائے قدرت دریافت کرنے کے لائق ہو سکیں۔یاد رہے زمین کے خزانوں کو استعمال کئے بغیر کوئی قوم چند یوم بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔زمین اور اس کے خزائن کے بارے اگلے مضمون کے بعد تفصیلاً عرض کرونگا۔انشاءاللہ

ماضی کے متلاشیانِ فطرت

ماضی میں جن لائق لوگوں نے اپنی زندگیاں حصولِ تعلیم اور رازہائے فطرت کی تحقیق وتلاش میں صرف کر کے نسل انسانی کیلئے نہایت مفید اشیاء ایجاد کیں اور عجائبات تکوین کے اسرار سے پردے اٹھائے، جس سے نہ صرف انسان کو بے بہا سہولیات میسر آئیں بلکہ اس کائنات کے خالق کا ایک ایسا نادر تعارف بھی میسر آ گیا جو اس شاندار احسن الخالقین پر ایمان ویقین کیلئے ایک ضروری چیز تھا۔ کوئی شک نہیں کہ نسلِ انسانی پر ان کا یہ ایک احسان الگ سے ہے۔ ہر چند کہ ان معزز حضرات کے پاس عہد حاضر کے آلات ووسائل موجود نہ تھے تاہم ان میں سے بعض کے نتائجِ غور وفکر کو آج بھی درست تسلیم کیا جاتا ہے۔

۱۔ تھیلز نے (۶۰۰ ق م) میں زمین کو پانی پر تیرتی ہوئی ٹکیہ کا خیال پیش کیا تھا۔

۲۔ انکزیمنڈر کے نزدیک زمین فضا میں معلق تھی۔

۳۔ فیثاغورث کے ہاں تمام کائنات زمین کے اردگرد گھوم رہی تھی۔

۴۔ اینکاغورث (۴۶۰ ق م) پہلا عالم ہے جس نے چاند کی روشنی کو مستعار کہا تھا۔

۵۔ ہرکلائڈیس (۳۸۸ ق م) پہلا عالم ہے جس نے زمین کو متحرک مان کر کہا تھا کہ اس کا ایک چکر چوبیس گھنٹوں میں پورا ہوتا ہے۔

۶۔ ارسٹارکس نے بھی زمین کو متحرک تسلیم کیا تھا اور آفتاب کو مرکزی نقطہ مان کر تمام کائنات کو اسکے گرد گھما دیا تھا۔ اس نے چاند اور سورج کا حجم اور طول وعرض دریافت کیا تھا اور زمین وآفتاب کا درمیانی فاصلہ ماپا تھا۔ گرچہ اسکے نتائج آج قابل اعتبار نہیں رہے۔

۷۔ ایراٹوستھنیس (۲۷۶ ق م) نے زمین کا قطر دریافت کیا تھا۔

۸۔ ہپیری ہس نے سال کی لمبائی معلوم کی تھی اسکے دریافت کردہ سال اور ہمارے سال میں محض چھ منٹ کا فرق ہے۔

۹۔ ہیرو نے (۱۰۰ء) میں سٹیم انجن اور پمپ ایجاد کیا تھا۔ (جارج اسٹیفن سن بعد کی بات ہے۔)
۱۰۔ لیوسی پس اور ویمقراطیس (۴۶۰ ق م) نے اعلان کیا تھا کہ ہر چیز کی ترکیب اجزائے لایتجزی سے ہوئی ہے۔
۱۱۔ ہیرو (۱۱۶ ق م) نے اپنی کتاب ریسر سٹیکل میں انکشاف کیا کہ گندے جوہڑوں میں بظاہر دکھائی نہ دینے والے چھوٹے چھوٹے کیڑے پرورش پا رہے ہیں جو امراض پیدا کرتے ہیں۔ گویا نظریۂ جراثیم اسی عالم کی تحقیق کا نتیجہ ہے۔
۱۲۔ اہل روم آلۂ جرثقل اور محراب کے موجد ہیں۔
۱۳۔ جولیس سیزر (مشہور شہنشاہِ روم) نے کیلنڈر درست کیا تھا۔
۱۴۔ کاپرنیکس نے آفتاب کو مرکز دنیا تسلیم کیا تھا۔
۱۵۔ تھائیکو نے پھر زمین کو مرکز مان کر تمام اجرامِ سماوی کو اس کے گرد گھومنے کا نظریہ پیش کیا۔ نیز اعلان کیا کہ زمین و آفتاب کا فاصلہ ساڑھے نو کروڑ میل ہے۔

سمندر اور خزائنِ ارضی

کرّہ ارض کے سات حصوں میں سے پانچ پر پانی ہے اور صرف دو حصے خشک ہیں۔ دنیا کے مشرق میں بحر الکاہل ہے اور مغرب میں بحر اقیانوس۔ یہ شمال اور جنوب میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور انکے وسط میں خشکی کا قطعہ ہے۔ یہ سمندر میلوں گہرے ہیں تاہم دنیا کے بڑے بڑے شہر سمندروں کے ساحلوں پر آباد ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ کرّہ ارض کے گول ہونے کے باوجود ان سمندروں کا پانی باہر نہیں نکلتا اور یہ شہر غرق ہونے سے محفوظ ہیں۔ اسلئے کہ یہ نظام ایک زبردست کا قائم فرمایا ہوا ہے اور جب تک اسے حکم نہ ملے اسے خشکی پر چڑھ دوڑنے کی مجال نہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ سمندروں کا پانی کھاری ہے اور بادل کا پانی میٹھا' جبکہ بادل بھی سمندر ہی سے بنتے ہیں اور ارب ہاٹن پانی کی دنیا بادل بن کر فضا میں تیر رہی ہے۔ زمین پر کھاری پانی اور ہوا میں

موجود میٹھے پانی میں ایک غیر محسوس پردہ حائل ہے کہ آب شور آب شیریں کو متاثر نہیں کر سکتا۔ نہ صرف یہی بلکہ زمین پر بھی بہت سی جگہوں پر ساتھ ساتھ بہتے دریاؤں کا الگ الگ ہونا ثابت ہے جو ایک دوسرے سے اختلاط نہیں کرتے۔ اس بارے قرآن کا فرمان ہے:۔

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ (۱۹) بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ (۲۰) (سورۃ:الرحمٰن)

ترجمہ:۔ اللہ نے دو سمندر بہائے جو دیکھنے میں ملے ہوئے ہیں (الرحمٰن:۱۹)

انکے بیچ ایک پردہ ہے کہ ایک دوسرے پر بڑھ نہیں سکتے (الرحمٰن:۲۰)

اللہ تعالیٰ نے ہم پر بہت بڑا احسان فرمایا کہ زمین کی پاکیزہ معدنی تہوں میں شیریں و شفاف پانی کے ذخائر دریاؤں اور چشموں کی طرح بہائے ہوئے ہیں کہ ہمیں ہر مقام پر لذیذ و مصفّا پانی دستیاب ہو رہا ہے جو کہ ہر ذی روح کی زندگی کا جزوِ اعظم ہے۔ سمندروں سے تمازتِ آفتاب کے باعث پانی کا بخارات بن کر اٹھنا دراصل ایک نظامِ فلٹریشن ہے کہ آبی بخارات ہر آلودگی سے جدا ہو کر اوپر اٹھتے اور فضا میں پہنچ کر بادو باراں کی صورت زمین پر ٹپک پڑتے ہیں اور پانی زمین کی تہوں میں اتر جاتا ہے۔ علمائے آب نے اندازہ لگایا ہے کہ ہر سال سمندروں سے چودہ فٹ پانی بادلوں کی صورت تبخیر ہوتا ہے۔

جس طرح انسانی نر و مادہ کے امتزاج سے کبھی نر اور کبھی مادہ پیدا ہوتے ہیں اسی طرح ابتدائی جرثومہ کے تضاعف سے سمندری دلدل میں مادہ و نر کی تکوین ہوئی۔ رفتہ رفتہ سمندر میں مرجانوں (پتھروں) مچھلیوں اور جونکوں کا طوفان آ گیا۔ پھر زندگی نے خشکی پر قدم رکھا اور حشرات الارض و چوپائے وغیرہ زمین پر پھلنے پھولنے لگے۔

فطرت کے حکمائے جدید نے ثابت کیا ہے کہ تکوین کائنات سے پہلے فضا میں دھواں ہی دھواں تھا اس دھوئیں (یعنی ذرّات برقیہ) میں زمین و آسمان اور آب و باد بننے کی صلاحیت موجود تھی۔ یہاں سے گویا تخلیق کائنات کا آغاز ہونے والا تھا' جسے قرآن نے یوں بیان فرمایا:۔

ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَ هِيَ دُخَانٌ..... (حٰمٓ السجدہ:۱۱)

ترجمہ:۔ ''پھر اللہ نے آسمانوں کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا اور ہر طرف دھواں ہی دھواں تھا''۔ (حٰمٓ السجدہ:۱۱)

قبل از تخلیق ہر جانب چھائے ہوئے دھویں کے بعد کائنات پر ایک ایسا زمانہ بھی گزرا جب ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ (سورۃ ہود آیۃ ۷ میں ہے کہ) اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا۔

ہندوؤں کی مذہبی کتاب رِگ وید باب دہم منتر ۱۲۱ میں مذکور ہے:

'' سنہرے انڈے (یعنی سچائی) سے دنیا کی تخلیق ہوئی پہلے پانی پیدا ہوا اور پانی سے نر کی تولید ہوئی پھر نر دو حصوں میں بٹ گیا اور اسی سے اس کی مادہ نکلی''۔

فطرت کے علمائے جدید کی تحقیق یہ ہے کہ:۔

''آغاز میں سمندر کے ساحل پر ایک جرثومۂ حیات نے جنم لیا تھا جو منقسم و متضاعف ہو کر نر اور مادہ کی تکوین پر منتج ہوا''۔

جبکہ قرآن نے ساڑھے چودہ سو سال قبل اعلان فرمایا جس کا حوالہ گزشتہ صفحات میں بھی پیش کیا گیا:۔

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّ خَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَ بَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّ نِسَآءً ۔۔۔۔۔(النساء :۱)

ترجمہ:''اے لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو (آغاز میں) ایک نفس واحد سے پیدا کیا اور اسی سے اسکی مادہ نکالی اور پھر اس جوڑے سے بیشمار مرد اور عورتیں پیدا کیں''۔۔۔۔۔(النساء :۱)

چنانچہ اسی دھویں (ذرّاتِ برقیہ) سے آفتاب و کواکب تیار ہوئے۔ آفتاب سے زمین نکلی جو شدت حرارت کے باعث آگ کا دہکتا ہوا گولہ تھی۔ مسلسل بارشوں سے جب قدرے ٹھنڈی ہوگئی تو پانی زمین کی ناہموار پستیوں میں جمع ہو گیا۔

دراصل زمین ابتداء میں ہموار تھی اور اس پر ہر طرف پانی ہی پانی تھا جو غالباً اسے ٹھنڈا کرنے کے ہی قدرتی عمل کا نتیجہ تھا۔ (اگر آج زمین کو پھر ہموار کر دیا جائے تو ہر مقام پر ہزاروں فٹ گہرا پانی چھا جائے۔) کچھ مدت بعد زمین کی اندرونی حرارت سے زلازل پیدا ہوئے اور زمین کے مواد اچھل کر باہر آ گئے جس سے جا بجا پہاڑ پیدا ہو گئے اور زمین کے وہ حصے بھی جو گہرے اور خالی ہو گئے تھے پانی بھر جانے کے باعث سمندروں کی صورت اختیار کر گئے۔ زمین کی ناہمواری بھی ایک رحمت الٰہیہ ہے وگرنہ

زمین انسانی وحیوانی زندگی کا گہوارہ نہ بن سکتی۔

انسان چار عناصر مٹی، آتش، ہوا، اور پانی سے مرکب ہے اور یہ اپنے خواص سے جدا نہیں ہو سکتا۔ یوں بھی ہر ذی حیات کی زندگی کا دارومدار پانی پر ہے جس کے بغیر کوئی جاندار چند یوم سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ کس قدر لائق تحسین وشکر ہے وہ ذات جس نے انسان کو پیدا کیا اور پھر کس شانِ ربوبیت سے اسکے لئے پانی کو عام فرما رکھا ہے۔ یہ اگر کمیاب ہو جائے تو اسے خرید کر استعمال کرنے کی سکت عوام وخاص کو تو کجا بادشاہوں تک کو زِچ اور درماندہ کر ڈالنے کو کافی ہے۔ ایسے عظیم الشان مہربان کو تسلیم نہ کرنا غایت درجہ کی بیوفائی ہے۔

دنیائے جن وبشر میں (1.67) فی صد لوگ اس حقیقت پر غور وتدبر سے عاری ہیں کہ اپنے پیدا کرنیوالے کو تسلیم کرنا کس قدر ضروری ہے۔ اپنے تئیں پڑھے لکھے اور جدت پسند دوستوں نے اپنی مغرور دماغی کے سبب ضد وہٹ دھرمی اختیار کر رکھی ہے مگر افسوس انہیں احساس ہی نہیں کہ انہوں نے اپنی ہٹ دھرمی کے باعث کس قدر ذلت آمیز رسوائی کا سامنا کرنا قبول کر لیا۔

کائنات بھر میں جن وانس اور فرشتوں سمیت کون ایسا بدنصیب ہوگا جو اپنے پیدا کرنے، رزق دینے اور اپنی رحمت عام فرما دینے والے کے شکر سے الغرضی کا مرتکب ہو سکتا ہو۔ کرّہ ارض پر موجود اقوامِ عالم پر نظر دوڑائیں کہ مذہب ہند میں خدا کی بندگی موجود ہے، یہودی المذہب خدا تعالیٰ کی ہستی پر ایمان و یقین کے حامل ہیں، عیسائیوں میں خداوند قدوس کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ امریکہ جیسی بڑی طاقت نے اپنی کرنسی تک پر یہ اعلان اشتہار بنا کر چھاپ رکھا ہے کہ وہ خدا پر اعتماد رکھتے ہیں۔ سلطنت روس میں (جو دہریت کا گڑھ سمجھی جاتی ہے) لاکھوں کی تعداد میں خوشبخت لوگ اپنی آنکھیں کھول چکے اور اُس ہستیٔ پوشیدہ پر ایمان لا رہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا دنیا کے کھرب ہا لوگ کسی غلط فہمی کا شکار ہیں؟ قطعی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لائی یہ اکثریت ایک دو فیصد لوگوں کو ہوش کے ناخن لینے اور اپنے فاسد نظریات پر نظر ثانی کی دعوت دے رہی ہے۔ خالق کائنات نے ہم پر کیا کیا احسانات کر رکھے اور کیسی کیسی نعمتوں سے نواز

رکھا ہے اسکی انگنت نعمتوں میں سے ایک سرسری نظر ان آٹھ اہم اشیاء پر ڈالتے چلیں:۔

۱۔ **پانی** سے اشربہ وادویہ وغیرہ تیار کی جاتی ہیں جو ہماری زندگی کی اہم ضرورت ہیں۔ پانی کی ترکیب میں جو دو عناصر استعمال ہوئے یعنی ہائیڈروجن اور آکسیجن ہر دو قاتل اور مہلک گیسیں ہیں۔ پانی دو حصے ہائیڈروجن اور ایک حصہ آکسیجن کا مرکب ہے اگر اسکی مقدار کو ذرّہ بھر گھٹایا بڑھا دیا جائے تو ایک زہر تیار ہو جائیگا۔ دونوں عناصر مساوی مقدار میں جمع کر دیئے جائیں تب بھی ایک مہلک مرکب بنے گا۔ ان دونوں گیسوں کے مختلف اوزان سے لاکھوں مرکبات تیار ہو سکتے ہیں اور ہر مرکب زہر ہلاہل ہوگا۔ لیکن جب دو حصے ہائیڈروجن اور ایک حصہ آکسیجن کو ترتیب دی جائے تو ان دو زہروں سے پانی تیار ہوگا جو تمام عالم کا مدارِ حیات ہے۔ کیا اب بھی اس قادرِ مطلق کے حکیم اور مقادیر کے عالم ہونے میں شبہ باقی ہے۔

اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ..... (قمر:۴۹) یعنی ''بیشک ہم نے ہر چیز کو معین مقدار سے پیدا کیا ہے''۔

۲۔ **زمین** سے انہار نکالنا' معادن نکالنا' طبقات الارض کی چھان بین کرنا' پٹرول اور کوئلہ جیسی دیگر اشیاء برآمد کرنا مستعمل ہے۔

۳۔ **ہوا** کے بارے معلومات کا حصول اور اسکا تجزیہ کرنا' ہوا میں اڑنے اور اسکی طاقت کو دیگر فوائد کیلئے استعمال کرنے کا علم عام فرما رکھا ہے۔

۴۔ **آگ** بے بہا کاموں میں مستعمل ہے جیسے لوہے کو پگھلا کر لاتعداد مصنوعات تیار کی جارہی ہیں۔

۵۔ **نبات** کا تجزیہ کر کے خواصِ نباتات معلوم کرنا اور اس سے انسانی وحیوانی خوراک کے معیار و مقدار کو بڑھانے کا اہتمام کرنا مستعمل ہے۔

۶۔ **حیوانات**' جو ہماری زندگی کا اہم جزو ہیں انکی اچھی نسلیں پالنا' سواری اور بار برداری میں استعمال کرنا' خوراک کیلئے ان سے گوشت حاصل کرنا اور انکے چمڑہ کو رنگ کر استعمال کرنا وغیرہ۔

۷۔ **اجسام الناس** سے علم الاعضاء' علم طب اور تشریح الافعال وغیرہ دریافت کرنا۔

۸۔ **نفوس**' جو علم العبادات' شاعری اور موسیقی وغیرہ سے متعلق ہیں۔

گویا کائنات کا ہر منظر عجائبات کی ایک دنیا پہلو میں لئے بیٹھا اپنے اپنے کام میں مصروف ہے ہر ذرّہ قوت جبروت کا پیام سنا رہا ہے اور ہر پتا بقاء وصلاحیت کی حیات انگیزی کا سبق دے رہا ہے۔

روشنی

روشنی اُن لہروں کے احساس کا نام ہے جو منفیوں کے چار سو ملین چکر فی سیکنڈ سے پیدا ہوں۔ سورج سے پیدا شدہ لہروں میں تیس فی صد امواجِ نور اور ستر فی صد امواج حرارت ہوتی ہیں۔ البتہ خالق کائنات نے جگنو کی روشنی میں حرارت مفقود کر رکھی ہے۔ جگنو کی دُم صرف امواجِ نور اٹھاتی ہے جن میں امواجِ حرارت شامل نہیں ہوتیں۔

روشنی ایک مہیب طاقت ہے جو کرنوں کا زینہ لگا کر آسمان سے اتر رہی ہے۔ اگر ہم اس روشنی کو جمع کر سکیں جو ٹینس کے ایک میدان میں صرف ایک دن میں پڑتی ہے تو اس قوت سے دو سو گھوڑوں کی طاقت (H.P) کا ایک انجن عرصہ دراز تک چلایا جا سکتا ہے۔

علماء و محققین کا کہنا ہے کہ ایک انچ بھر فضا میں سے وہ تمام شعائیں گزر رہی ہیں جو پانی، گھاس، عمارات اور شمس و قمر وغیرہ سے نکل کر ہر طرف پھیل رہی ہیں، اگر اُن کو خوردبین سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُس ایک انچ بھر جگہ میں سے کروڑوں اجرامِ فلکی کی شعاعیں بھی ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی گزر رہی ہیں۔ قطبی ستارے کی ضعیف ترین شعاع بھی آفتاب کی طاقت ور موجِ نور کو چیر کر جا رہی ہے اور ایک بہت بڑے ریلوے جنکشن کا نظام اس انچ بھر فضائی نظام کے مقابل ہیچ نظر آتا ہے۔

ہم اپنے گھروں اور کارخانوں میں بجلی استعمال کرتے ہیں جس کا منبعٔ اوّلیں آفتاب ہے۔ یورپ کے ماہرین طبیعات نے اندازہ لگایا ہے کہ تمام دنیا میں ہر سال صرف ایک سو گرام وزن کی بجلی خرچ ہوتی ہے جس کے پیدا کرنے پر چوون کروڑ روپیہ لاگت آتی ہے۔ دوسری طرف جو روشنی سورج سے صرف ایک دن میں زمین پر آتی ہے اس کا وزن ۴۴۸۰ من ہے۔ بجلی کی قیمت کے حساب سے اس روشنی کی قیمت پندرہ سنکھ (۱۵۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰) ڈالر بنتی ہے۔ خالق سبحانہ تعالیٰ کا لطف عمیم دیکھیں کہ ہم بلا معاوضہ طاقت کے اس بے پناہ خزانے سے کس طرح متمتع ہو رہے ہیں۔ علمائے مغرب کا خیال

ہے کہ آفتاب ہمیں دس ارب سال تک مزید روشنی دیتا رہے گا۔

اپنے خالق کو نہ ماننے والے دوستو:۔ ''(آخر) تم اللہ کی کن کن نعمتوں کا انکار کرو گے''۔(سورۃ الرحمٰن:۱۳)

ایثر یعنی ایتھر (جوُ)

ایثر دراصل ازل سے کائنات میں موجود ہے لیکن علمائے فطرت کو ماضی قریب میں اس کا پتہ چلا' ریڈیو' ٹیلی ویژن وغیرہ معجزاتِ ایثر ہی ہیں۔ تموّجِ ایثری کی بدولت ہم ہزار ہا کلومیٹر دور کی باتیں چشم زدن میں بے تار و بے سلسلہ سن رہے ہیں۔ یہاں قدرتاً ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ایثر اپنے پیدا کرنے والے کے دائرہ اختیار کے اندر ہے یا باہر؟ ظاہر ہے کہ کوئی شئے کسی بنانے والے کے دائرہ اختیار سے باہر قطعی نہیں ہو سکتی اور اسکے اختیار کے اندر ہے تو لازماً کائنات کی ہر وہ آہٹ' آواز وغیرہ جو ایثر میں جنبش پیدا کر سکتی ہے اللہ جل شانہ سے پنہاں نہیں رہ سکتی۔ گویا نظریۂ امواج ایثری کے محققین نے ہمیں یقین دلا دیا کہ:۔ان اللہ سمیع بصیر (اللہ دیکھتا اور سنتا ہے)۔

امپیریل کالج آف سائنس (لندن) کے ایک پروفیسر مسٹر ولیم ایک دفعہ انسانی کان کی ساخت پر غور کر رہے تھے۔ الٰہی صناعی کے حیرت انگیز کمالات سے مرعوب ہو کر چلاّ اٹھے کہ:۔

,,He who planted ears shall he not hear?.

''جس خدا نے کان ایجاد کئے ہیں کیا وہ خود صفت سمع سے محروم ہو سکتا ہے''۔

صریح خلافِ عقل ہے کہ ہم اس نظام کے بنانے اور چلانے والے کے سمیع و بصیر ہونے میں شک کریں بلکہ فرمان قرآن ہے:۔ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ. ...(سورۃ ق:۱۶) (اور جان رکھو کہ وہ تمہارے دلوں میں گزرنے والے وسوسوں تک سے واقف ہے)۔

تالاب کے پرسکون پانی میں ایک کنکر پھینکیں تو پانی میں لہریں پیدا ہو جائیں گی' پانی وہیں رہیگا مگر لہریں تالاب کے کناروں تک جا پہنچیں گی۔ دوسرے لفظوں میں پانی انتقالِ امواج کا وسیلہ بنتا ہے۔ اسی طرح ایثر بھی ہماری متعدد خدمات انجام دیتا ہے وہ ایک سرعت رفتار قاصد ہے جو ہمارے پیغامات آناً فاناً ہزار ہا کلومیٹر کی مسافت تک پہنچا رہا ہے نیز عمل بصارت ایثر ہی کی بدولت وقوع پذیر

ہورہا ہے۔ یہ قانون قدرت ہے کہ ایک جسم دوسرے جسم پر کسی درمیانی واسطہ کے بغیر عمل پذیر نہیں ہوسکتا' اندھیری رات میں جہاز ران دُور سے کسی مینار کی روشنی کو دیکھتا ہے تو دراصل اسکے اور روشنی کے درمیان ایک واسطہ موجود ہے جو روشنی کی لہروں کو اس ملاح تک پہنچا رہا ہے۔ اسی درمیانی واسطے کا نام ایثر ہے۔

مینار کی روشنی تسلسل سے ایثر میں لہریں پیدا کرتی رہتی ہے اور یہ لہریں دیکھنے والے کے پردہ چشم سے ٹکراتی ہیں تو دماغ اسے دیکھ لیتا ہے۔ اسی طرح آفتاب ایثر میں ہیجان پیدا کرتا ہے اور یہ ہیجان ہمارے دماغوں تک پہنچ کر ہمیں روشنی وحرارت کا احساس دلاتا ہے۔ مقناطیس کچھ فاصلہ سے لوہے کی سوئی کو اپنی جانب کھینچ لیتا ہے۔ سوئی اور مقناطیس کے درمیان کوئی واسطہ لازم ہے اور اسی کا نام ایثر ہے۔

صحیفہ فطرت کے ایک روسی فاضل کی تحقیق کے مطابق ''ایثر دراصل ریڈیائی لہروں کا بادلوں کی طرح چھایا اور کائنات بھر میں پھیلا ہوا نظام ہے جسکے ذرّات گیس سے بھی زیادہ کوئی چیز ہیں اور جس کے اجزاء تمام اجسام میں داخل اور آر پار ہیں''۔

ہالینڈ کے ایک پروفیسر مسٹر ہوئی جنس نے آج سے تین صدی قبل وجودِ ایثر کا اعلان کیا تھا' کچھ مدت بعد لندن کے ایک فاضل ڈاکٹر تھامس ینگ نے بھی اس مسئلہ پر روشنی ڈالی مگر اس وقت بھی کسی نے توجہ نہ کی۔ کچھ عرصہ بعد علمائے فطرت اس طرف متوجہ ہوئے تو اس مخفی نظام کو کھنگالا گیا اور نتیجہ ریڈیو کی ایجاد کی شکل میں برآمد ہوا۔ ایثر کی ہر لہر ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار کلومیٹر سے زیادہ مسافت طے کرتی ہے۔ یہ ایثری لہریں منفیوں کی گردش سے پیدا ہوتی ہیں اور حالات متفرقہ میں رنگوں کا احساس پیدا کرتی ہیں۔ مثبت بجلی' کششِ زمین' روح جن وانس اور ایثر وہ اسرار ہیں جس کا علم انسان کو تا حال میسر نہیں ہوا۔ ابھی تک علمائے فطرت صرف اس نتیجہ تک پہنچ پائے ہیں کہ یہ ایک لطیف سا بے رنگ بادل ہے جو تمام کائنات میں عرش سے تحت الثرٰی تک پھیلا ہوا' ہر شئے میں اور ہر جگہ موجود ہے۔ اس میں کوئی خلا یا وزن موجود نہیں اور نہ ہی پیدا کیا جاسکتا ہے۔

جب امواجِ ایثری کسی جسم پر پڑتی ہیں تو اسکے منفیوں میں ہیجان پیدا کردیتی ہیں اسی ہیجان کے احساس کا نام بصارت ہے۔ یاد رہے کہ امواجِ نور کے منفیے اس جسم سے ٹکرا کر خود تو ساکن ہوجاتے

ہیں مگر اس جسم کے منفیوں میں ہیجان اٹھا دیتے ہیں۔ بعض اجسام ایسے بھی ہیں جن میں سے یہ امواج یوں پار گزر جاتی ہیں کہ ان کے منفیوں میں کوئی ہیجان نہیں اٹھتا' یا بہت کم اٹھتا ہے۔ دراصل جن اجسام کے منفیے طاقتور ہوں تو وہ مقابلہ کرتے ہیں اور ایثر مرتعش ہو جاتا ہے اور اگر منفیے کمزور ہوں تو کھسک جاتے اور امواجِ ایثری پار گزر جاتی ہیں' ایسے اجسام عرفِ عام میں شفاف کہلاتے ہیں۔ چونکہ ہر جسم کے منفیے کچھ نہ کچھ مقابلہ تو کرتے ہیں اسلئے کوئی چیز مکمل طور پر شفاف نہیں کہلا سکتی۔ یہاں تک کہ بعض علمائے فطرت تو ہوا کو بھی شفاف تسلیم نہیں کرتے۔

رنگ اور ایثر

محققین فطرت کا کہنا ہے کہ ایثر میں منفیاتِ نور سات قسم کی لہریں پیدا کر رہے ہیں اور بذات خود رنگ بھی سات ہی ہیں۔ اگر یہ تمام لہریں کسی جسم میں جذب ہو جائیں تو وہ سیاہ نظر آئے گی۔ اگر تمام منعکس ہو کر ہماری نگاہ تک پہنچیں تو وہ سفید دکھائی دے گی۔ اگر چھ قسم کی لہریں جذب ہو جائیں اور مثلاً نیلے رنگ کا احساس پیدا کرنے والی لہریں جذب نہ ہو پائیں تو نیلی نظر آئیگی۔

یاد رہے کہ ہر لہر صرف اپنے رنگ کے منفیوں کو متحرک کرے گی جو زرد رنگ کا احساس پیدا کرتے ہیں اور باقی لہریں چپ چاپ جذب ہو جائیں گی۔ اگر آج سورج میں سے سرخ رنگ نکال دیا جائے تو دنیا بھر میں کوئی چیز سرخ نظر نہ آئے۔ اگر ہم سرخ رنگ کے کسی پھول کو سیماب کے تبخیری لیمپ کی روشنی میں دیکھیں تو وہ سیاہ نظر آئیگا اس لئے کہ اس لیمپ کی روشنی میں سرخ رنگ کا احساس پیدا کرنے والی امواج موجود نہیں ہوتیں۔ آنکھ کے پردے ریٹینا (Ratina) کے درمیان ایک نشیب سا ہے جس پر چھوٹے چھوٹے ابھار ہیں۔ ان ابھاروں میں مختلف رنگوں کے احساس کی استعداد موجود ہے اور لطف یہ کہ ہر رنگ کے احساس کیلئے ایک علیحدہ ابھار ہے۔

زمین سے پچیس میل اوپر طبقہ اوزون ہے جو سورج کی بعض مہلک شعاؤں کو وہیں روک لیتا ہے پھر اس سے بھی پچیس میل اوپر ایک اور طبقہ ہے جو ایتھر یعنی ایثر کی لہروں کو زمین کی طرف منعکس کرتا ہے اگر یہ طبقہ نہ ہوتا تو ہم لاسلکی پیغامات قطعی نہ سن سکتے۔ میرے خیال میں کوئی ذی شعور ایسا گمان

قطعی نہیں کرسکتا ہے کہ ایٹر بھی کسی حادثہ کی بناء پر اتفاقاً وقوع پذیر ہوکر ہمیں متمتع کر رہا ہے۔

الوان والسنۃ (رنگ وزبانیں)

عناصر ترکیبی (ہائیڈروجن، نائٹروجن، آکسیجن، کورونیم، اورونیم، سوڈیم وغیرہ جن کی تعداد ۲۹ تک پہنچ چکی ہے) کا مستقر ایٹر ہی ہے۔ جس طرح ہمارے خطبوں یا مکالموں سے ہوا میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی، اسی طرح کائنات کی تخلیق سے مخازنِ ایٹر پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ عناصر حروفِ ابجد کی طرح ہیں۔ حروف سے علوم وفنون نکلے اور عناصر سے لوح فطرت پر بے شمار غزلیات وقصائد لکھے گئے۔

گفتگو کیا چیز ہے؟ ہوائی تموج، یعنی ہوا میں گرہ لگانا۔ اسی تموج سے ہزار ہا علوم وفنون خطبات اور اشعار پیدا ہوئے، اسی تموج کا نام موسیقی ہے اور اسی تموج سے دنیا میں سینکڑوں سیاسی و اخلاقی انقلابات رُونما ہوئے۔ اگر ہوا سے تموج خارج کر دیا جائے تو کوئل کے نغمے چڑیوں کی چہچہاہٹ اور عنادل کے زمزمے ختم ہوجائیں۔ مگر ہم اپنی لاعلمی کے سبب غور وفکر سے عاری ہیں۔ قرآن نے فرمایا:

وَ مِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ وَ اَلْوَانِکُمْ ط اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ (الروم:۲۲)

ترجمہ:۔ ''اور زمین وآسمان کی تخلیق میں اور تمہارے رنگوں اور تمہاری زبانوں میں اختلاف، الٰہی آیات میں سے ہیں، بیشک علمائے فطرت کیلئے ان مناظر میں (اسکی قدرت وتوحید کی) نشانیاں موجود ہیں''۔ (الروم:۲۲)

عربی زبان کے حروفِ ابجد اٹھائیس ہیں جن میں سے چودہ مقطعات قرآنی الٓمٓ، یٰسٓ، طٰہٰ وغیرہ میں استعمال ہوئے۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ کائنات کی آدھی رونق حروف یعنی علوم وفنون سے ہے اور آدھی عناصر سے۔ جس طرح ہوائی تموّج سے دنیا کی چار ہزار زبانیں پیدا ہوچکی ہیں اسی طرح ابتدائی عناصر سے کائنات کے مختلف مناظر وجود میں آئے۔ لالہ زار اور دیگر دل کش مناظر اشعارِ فطرت ہیں، مہیب کوہستان، چنگھاڑتے ہوئے سمندر اور گرجتے ہوئے بادل عناصر رزم ہیں اور شورِ زمین، آبِ تلخ وشجر زقوم عناصر ہجو ہیں۔

آیت مذکور (زیر بحث) میں اختلاف السنہ مطالعہ علوم وفنون کی طرف اور اختلافِ الوانکم

معائنہ عناصر کی طرف دعوت دیتا ہے۔

اختلافِ السنۃ (مختلف زبانیں)

یک زبانی کی نسبت متعدد و مختلف زبانوں سے علوم میں بے شمار ترقی ہوئی' زبان کی تمام شاخوں میں اس قدر لٹریچر پیدا ہوا کہ قدسیان فلک کو ایک مرتبہ پھر انسانی عظمت کا اعتراف کرنا پڑا ہوگا۔ باوجود ایک فرد واحد (آدمؑ) کی اولاد ہونے کے لوگوں کا رنگ و نسل میں بٹے ہونا بلا جواز نہیں۔ اس میں قدرت کے بہت سے بھید پوشیدہ ہیں جن پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرونگا۔ فی الحال اختلافِ زبان پر بات کرتے چلیں کہ مختلف زبانوں سے نہ صرف علم میں اضافہ ہوا بلکہ ایک انسان کی وقعت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ وہ مختلف زبانوں کا عالم ہے۔

ایک شخص مختلف زبانوں کے مطالعہ سے دوسروں کے افکار کو سمجھنے اور اپنے نظریات کو سمجھا سکنے کی اہلیت کا حامل ہو جاتا ہے۔ وگرنہ کسی غیر زبان غیر ملکی سے لاکھ ہمدردی و کوشش کے باوجود آپ اسے نظریۂ اسلام بھی ترسیل نہیں کر سکتے۔ چونکہ وہ بھی آپ کی زبان سمجھنے سے قاصر ہے اس لئے آپ کے فصیح مقالہ جات اور دلائل اس کیلئے بیکار ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

زبانیں

آریائی اور سامی موجودہ دور کی بڑی بڑی دو زبانیں ہیں۔ جن کی شاخیں درجِ ذیل ہیں۔

''آریائی'' زبان کی شاخیں یہ ہیں:۔

انگریزی' یونانی' لاطینی' نزدیجی' ایسلانڈی' سویڈی' ڈنمارکی' جرمنی' ولندیزی'

آرمینوی' بلغاروی' بوہیموی' بولونوی' روسی' ہندی' فارسی' سنسکرت وغیرہ۔

فارسی زبان کی مزید بہت سی شاخیں ہیں۔

جیسے طفراہی' سیوندی' شیرازی اور گابری وغیرہ۔

اسی طرح ہندوستانی زبان کی بھی بہت سی شاخیں ہیں۔

جیسے مہاراشٹری، جینا، ماگدھی، سورسینی، ابابرہمسا، بہاری، بنگالی، ماروا ڑی، آسامی، نیپالی، برمی، تامل، تلنگو، پنجابی، سندھی، پشتو، کشمیری، اردو وغیرہ۔

لاطینی زبان کی بھی شاخیں ہیں۔ جیسے فرانسیسی، ہسپانوی، پرتگالی اور رومانوی وغیرہ۔

سامی (دوسری بڑی زبان)

یہ دوسری بڑی زبان ہے جسکی شاخیں عربی، بابلی، آشوری، حمیری، آرامی اور فینقی وغیرہ ہیں۔

اس وقت دنیا میں تقریباً چار ہزار زبانیں بولی جاتی ہیں۔ یورپ میں پانچ سو ستاسی ایشیا میں نوسو سینتیس، افریقہ میں دوسو چھتر، امریکہ میں سولہ سو چوبیس اور ہندوستان میں تقریباً چار سو زبانیں بولی جارہی ہیں جن کا میزان تین ہزار آٹھ سو چوبیس زبانیں بنتا ہے۔

اختلافِ الوان (مختلف رنگ)

اختلاف الوان یعنی رنگوں کا مختلف ہونا بھی بلا جواز نہیں، خواہ اختلافِ الوان جن وانس سے متعلق ہو یا حیوانات ونباتات وجمادات وغیرہ سے۔ یہ قاعدہ کلیہ ہمیشہ یاد رہے کہ خالق کائنات کا کوئی بھی کام کبھی بلا جواز یا بلا مصلحت نہیں ہوتا۔ آیت زیر بحث میں ذکرِ الوان کو اختلاف السنۃ کے بعد لانا اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ مطالعہ کائنات حصولِ علم کے بعد شروع ہوتا ہے۔ یعنی اگر ہمیں اسکے کمالاتِ پوشیدہ تک رسائی حاصل کرنا ہے تو جان رکھیئے کہ یہ کسی جاہل کی بساط سے باہر ہے اور علوم وفنونِ متعلقہ کا زادِ راہ لئے بغیر یہ سفر بے سود ہوگا۔

انسانی رنگوں میں اختلاف یعنی کسی کا رنگ گورا کسی کا کالا اور کسی کا گندمی ہونا حیران کن ہے جبکہ انسان کی اصل ایک ہے۔ نہ صرف یک رنگی بلکہ شکل وشباہت میں بھی تلون ہے، ناموں کا اختلاف بھی عیاں ہے، ارب کھرب ہا انسان پیدا ہوکر مر چکے اور آئندہ بھی جانے کتنے انگنت لوگ پیدا ہونے والے ہیں مگر خالق تعالیٰ کی عجیب شان ہے کہ کسی انسان کے انگشتِ دست کی لکیریں کبھی یکساں نہیں ہوئیں اور نہ ہی آئندہ ہونگی۔ بنا اختلاف الوان اگر ہر انسان یک رنگ و یک صورت ہوتا تو ایک دوسرے

کو پہچاننا کارِدارد ہوتا۔ سبھی یک نام ہوتے تو کون کس کو پکار رہا ہے یا کون کس کی بات کر رہا ہے کسی کو خبر ہی نہ ہو پاتی اور انسان بیشمار پیچیدگیوں کا شکار رہتا۔ نہ صرف انسان بلکہ حیوانات اور چرند و پرند تک کا یہی حال ہوتا۔

رنگ ازمنہ تاریخ سے پہلے کی ایجاد ہے۔ آثارِ قدیمہ سے پتھروں، دیواروں اور ہڈیوں وغیرہ پر بنائی گئی بہت سی ایسی رنگین تصاویر ملی ہیں جو ہزارہا برس پرانی ہیں۔ حصولِ رنگ کیلئے انکے وسائل کیا تھے اس سے قطع نظر ہم ماضی قریب سے رنگوں کی تاریخ پر نظر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سرخ رنگ ایک پودے میڈر (Madder) سے حاصل کیا جاتا تھا۔ پہلے یہ کام ترک کیا کرتے تھے مگر اٹھارویں صدی کے آغاز میں یورپ نے بھی یہ ہنر سیکھ لیا۔ ۱۸۹۴ء میں پکرک ایسڈ کو زرد رنگ کیلئے استعمال کیا جانے لگا جسے مسٹر دلف نے انڈیگو نائٹرک ایسڈ سے تیار کیا تھا۔ ۱۸۶۵ء میں کونین کا تجربہ کرتے کرتے مسٹر درگوئن نے سرخ رنگ کا مواد پالیا اور اس کا نام میگنیٹ رکھا۔ کچھ عرصہ قبل رنگ نباتات یعنی پتوں اور جڑوں سے حاصل کیا جاتا تھا بعد میں کیمیائی طریقوں سے تیار ہونے لگا۔ ۱۸۵۰ء میں مسٹر پیڑگریس نے معلوم کرلیا کہ امونیا کے مرکبات میں نائٹروجن کا ایک جوہر ہائیڈروجن کے تین جوہروں کا بدل ہوسکتا ہے کہ اس مرکب میں کاربولک ایسڈ اور اینیلین ملا کر مختلف رنگ تیار ہو سکتے ہیں جن سے ریشم، لکڑی اور چمڑے وغیرہ کو رنگ دیا جاسکتا ہے۔ ۱۸۸۴ء سے پہلے ان مواد کو استعمال کرتے وقت المونیم و دیگر مرکبات سے مدد لی جاتی تھی لیکن اُسی سال مسٹر باٹیگر نے ایک ایسا مادہ دریافت کیا جس سے کسی دوسرے مرکب کی مدد کے بغیر اشیاء کو رنگا جاسکتا تھا۔ نارنجی رنگ انڈیگو اور برومین کا ہی مرکب ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں رنگ اصداف وغیرہ سے حاصل کئے جاتے تھے اور اب تک دو ہزار سے زائد موادِ رنگ ایجاد ہو چکے ہیں۔ رنگ محض جاذبیت نظر ہی کیلئے نہیں بلکہ قدرت نے رنگوں کے اختلاف سے باقاعدہ ایک نظام قائم فرما رکھا ہے۔

حیوانات میں رنگوں کی حکمت

جس خالق نے حیوانات و دیگر مخلوق کو پیدا کیا اسے انکی صحت و زندگیوں کی حفاظت کا بھی انتظام کرنا تھا۔ چنانچہ گیدڑ لومڑی خرگوش، ہرن، تیتر و بٹیر وغیرہ کو ہم رنگِ زمین بنادیا تا کہ اعداء سے محفوظ رہ سکیں۔ اگر انہیں خاکستری رنگ کی بجائے سبز یا سرخ رنگ بنادیا جاتا تو شکاری جانوروں کو یہ رنگ دور ہی سے نظر آجاتا اور یہ بہت جلد نہنگِ اجل کا لقمہ بن کر ختم ہوجاتے۔ خرگوش جو ہمارے گھروں میں رہتے ہیں انکی نگرانی انسانوں کے سپرد ہوتی ہے اسلئے وہ سفید ہوتے ہیں۔ بعض شکاری جانور مثلاً بھیڑیے اور باز وغیرہ بھی خاکستری ہوتے ہیں تا کہ شکار انہیں دور ہی سے دیکھ کر بھاگ نہ جائیں اور یہ بھوکوں نہ مرجائیں۔

'' وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا'' ۔۔۔۔۔(ہود:٦)

ترجمہ:۔''اور زمین پر کوئی (جاندار) ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمہ کرم پر نہ ہو'' (ہود:٦)

افریقہ کے جنگلوں میں شیر بہت تعداد میں پائے جاتے ہیں اور ابلق گدھے بھی کافی ہوتے ہیں جنہیں شیر دور ہی سے دیکھ کر انکا شکار کر کے اپنی آتش شکم کو بجھا پاتے ہیں اور انکی سیر شکمی کے باعث بہت سے مفید جانور شیر کا شکار ہونے سے محفوظ رہتے ہیں۔ گائے بیل، گھوڑے، کتے اور بلیوں کے رنگ میں اس لئے تنوع ہوتا ہے کہ یہ جانور بھی انسانی پناہ میں رہتے ہیں اور انہیں ہم رنگِ زمین بننے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انسان انکی حفاظت کرتا ہے اور یہ اپنے مختلف رنگوں کے باعث انسان کے تنوع پسند ذوق کیلئے تسکین وسامان راحت بہم پہنچاتے ہیں۔ ماحصل یہ کہ جو حیوانات انسانی پناہ میں رہتے ہیں اللہ نے انہیں قدرتی اسبابِ حفاظت سے محروم کر دیا اور جو جانور جنگل میں رہتے ہیں انہیں خاکستری رنگ دیا کہ دُور سے نظر نہ آسکیں۔ ہرن کو تیز ٹانگیں دیں کہ اپنے بچاؤ میں آندھی کو بھی پیچھے چھوڑ جائے اور دبلا پن دیا کہ تیز دوڑنے میں جلد ہانپ نہ جائے۔

اس میں بھی ہمارے لئے سبق موجود ہے کہ اللہ ان کا بھی ہوتا ہے جن کا کوئی نہیں ہوتا۔ جو قومیں اپنی حفاظت اغیار کے سپرد کر کے غلامی کی زندگی سے سمجھوتا کر لیتی ہیں وہ انسانی پناہ (غلامی) میں رہنے والے جانوروں کی مانند اونٹ کی طرح بے ڈول، بھینسے کی طرح بھدی، گدھے کی طرح ذلیل اور بلی کی طرح حریص بن کر رہ جاتی ہیں۔ دوسری طرف ایک آزاد قوم شیر کی طرح مہیب، ہرن کی طرح

چست وچالاک اور عقاب کی طرح تیز نظر و تیز رفتار ہوتی ہے۔

؎ قہاری و جباری و قدوسی و جبروت یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلماں (علامہ اقبالؒ)

گرم ممالک کے باسیوں میں رنگ کی سیاہی ایک رحمت ہے۔ جس طرح آنکھوں کو دھوپ کی تمازت سے بچانے کیلئے سبز یا نیلگوں چشمہ استعمال کیا جاتا ہے اسی طرح کسی جسم کی چمڑی کا رنگ کالا ہونا اسکے جسم کے خلیوں کو محفوظ رکھنے کا باعث ہے۔ اسلئے کہ یہ سورج کی گرم اور تیز شعاعوں کو جلد جذب کر کے جلد ہی باہر نکال دیتا ہے اور جسم کو نقصان نہیں پہنچتا۔ قدرتی امر ہے کہ دھوپ میں کام کرنے والوں کی رنگت حسب ضرورت سیاہ ہو جاتی ہے تا کہ وہ آفتاب کے آتشیں تیروں کے نقصانات سے محفوظ رہیں۔

علمائے فطرت کا خیال ہے کہ تمام کالے جانور اور پرندے وغیرہ خط استوأ کے اردگرد پیدا ہوئے تھے جن کی سیاہ رنگت تیز دھوپ سے بچنے کیلئے تھی۔ یہیں سے انکی نسلیں دیگر خطوں میں پہنچیں مگر رنگ کالا ہی رہا۔ حتیٰ کہ یورپ میں پائے جانے والے کوّے، کوئل وغیرہ وہاں بھی کالے ہی رہتے ہیں جیسا کہ افریقی سیاہ فام یورپین سرد علاقوں میں جا بسنے کے باوجود سیاہ ہی رہتے ہیں۔ بالوں کی کالی رنگت کا بڑھاپے میں سفید ہو جانا بایں وجہ ہے کہ بالوں کی جڑوں میں ایک رنگ دِہ مادہ ہوتا ہے جو بڑھاپے میں (یا کسی بیماری کے باعث) بتدریج ختم ہو جاتا ہے اور اسکی جگہ ہوا لے لیتی ہے، اسلئے بتدریج بال بھی سفید ہو جاتے ہیں۔ دفتروں میں کام کرنے والے کلرکوں اور دیگر سایہ نشینوں کے بال بھی جلد سفید ہو جاتے ہیں اس لئے کہ نظامِ قدرت ان کے بالوں کو سیاہ رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

غور طلب ہے کہ کیا قدرتِ الٰہیہ کے مقرر کردہ نظام ہائے مختلفہ کو اتفاقیہ یا حادثاتی وقوع پذیری سے موسوم کیا جا سکتا ہے؟ عقلاً اس کا جواب نفی ہی میں ہوگا۔

بہر حال بلحاظ رنگ انسانوں کی دو قسمیں ہیں سفید اور غیر سفید۔ سفید اقوام کی جلد میں سرخ رنگ دینے والا مادہ ہوتا ہے جسے کرومو جن کہتے ہیں اور دیگر اقوام میں سیاہ رنگ دینے والا مادہ ہوتا ہے جسے فرمنٹ کہا جاتا ہے۔ زیبرے کے بعض حصوں میں فرمنٹ ہوتا ہے اور بعض میں صرف ہوا، یوں وہ

ابلق ہوجاتا ہے۔فرمنٹ میں ہائیڈروجن پیراکسائڈ ملانے سے اسے سرخ' زرد اور براؤن بنایا جاسکتا ہے۔ یہ کیمیائی عمل نباتات وحیوانات میں سدا جاری رہتا ہے اسی لئے بعض حیوانات کے رنگوں میں حسب عمر تغیر وقوع پذیر ہوتا رہتا ہے۔

رنگ دِہ مادہ صرف روشنی میں پیدا ہوتا ہے اسلئے غاروں میں رہنے والے پروٹیس نامی جانور کا رنگ سفید رہتا ہے۔ البتہ سمندروں کی گہرائیوں میں رہنے والے جانور اور مچھلیاں بھی مختلف رنگوں کی حامل ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ سمندر کے اندر بعض مچھلیاں ایسی ہیں جن کے سروں پر روشنی کی مشعلیں سی موجود ہیں نیز موتیوں اور مرجانوں کی روشنی بھی سمندروں میں موجود ہے اور یہ مقدار کرومو جن اور فریگمنٹ کو متحرک کرنے کیلئے کافی ہوتی ہے۔ گرگٹ کچھ حشرات اور مچھلیاں ایسی بھی دریافت ہوئی ہیں جن کا رنگ عموماً بدلتا رہتا ہے جس کی وجہ ان میں ایسی خاصیت کی موجودگی ہے جو ڈر' شرم' غم' مسرت وغیرہ جیسے خواص کو جلد متحرک کردینے کا باعث ہے۔ یہ کیفیات رنگ دینے والے مادے میں ایک ہیجان اٹھادیتی ہیں جس سے فوری طور پر رنگ کا ایک سیلاب پہلے رنگ کی جگہ لے لیتا ہے۔

دوستو یہ کائنات معجزاتِ تخلیق کا عظیم الشان نگارخانہ ہے جس کا ہر منظر عقلِ انسانی کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ خالقِ کائنات کے ایسے جامع نظام کو بھی اگر کسی اتفاق یا حادثے کا نتیجہ قرار دیدیا جائے تو یہ بہت دکھ اور زیاں کاری کا باعث ہوگا۔ یہ تو ایک ایسا ادبستان ہے جہاں آیاتِ الٰہی کا عملی درس مسلسل جاری ہے۔ یہ کوہ و دریا' یہ ابر باراں' یہ لیل ونہار صحیفۂ فطرت کے وہ اَوراق ہیں جن پر عظمتِ انسانی کے اسرار درج ہیں۔ کاش ہم میں سے بھی کوئی اِن اسرار کی پردہ کشائی کی ہمت رکھتا ہو۔ وہ اقوام جنہوں نے آیات ارض وسماء پر دھیان دیا' تمام عالم انکی دانشمندی کا شاہد اور انکی ایجادات سے متمتع ہورہا ہے اور وہ اقوام کس قدر ذلیل و پست ہیں جو اِن اسرار و آیات سے روگرداں ہیں۔ سورۃ الجاثیہ (۳ تا ۸) میں احسن الخالقین کی اس تنبیہ پر غور کریں کہ ہوشمندوں کیلئے باعث عبرت ہے:۔

اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (۳) وَ فِیْ خَلْقِکُمْ وَ مَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّۃٍ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ (۴) وَاخْتِلٰفِ الَّیْلِ وَ النَّھَارِ وَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ

مِنۡ رِّزۡقٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَ تَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ اٰیٰتٌ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ(۵) تِلۡکَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتۡلُوۡهَا عَلَیۡکَ بِالۡحَقِّ ۚ فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۢ بَعۡدَ اللّٰهِ وَ اٰیٰتِهٖ یُؤۡمِنُوۡنَ(۶) وَیۡلٌ لِّکُلِّ اَفَّاکٍ اَثِیۡمٍ ۙ(۷) یَّسۡمَعُ اٰیٰتِ اللّٰهِ تُتۡلٰی عَلَیۡهِ ثُمَّ یُصِرُّ مُسۡتَکۡبِرًا کَاَنۡ لَّمۡ یَسۡمَعۡهَا ۚ فَبَشِّرۡهُ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ(۸) سورۃ الجاثیہ:۳تا۸

ترجمہ:۔''اس میں کوئی کلام نہیں کہ (عجائباتِ خلق) زمین وآسمان میں ایمان لانے والوں کیلئے (اللہ تعالیٰ کی قدرت اور وحدانیت پر دلالت کرنے والی بیشمار) نشانیاں موجود ہیں (۳) اور تمہاری تخلیق میں بھی (کہ نطفہ کو خون بناتا' خون کو بستہ کرتا' خونِ بستہ کو ہڈیاں اور گوشت پارہ کرتا' یہاں تک کہ پورا انسان بنا دیتا ہے نیز) حیوانات کی فراوانی میں بھی یقین کرنے والوں کیلئے نشانیاں ہیں (۴) اور لیل ونہار کی تبدیلیوں (یعنی انکے گھٹنے بڑھنے اور دن ورات کے ادلنے بدلنے) میں اور جو آسمان سے روزی کا سبب مینہ اتارا تو زمین مردہ کو زندہ کردینے والے قطراتِ باراں میں اور ہواؤں کے رُخ بدل کر چلنے میں عقل (سے کام لینے) والوں کیلئے (اسکے خالق ہونے پر دلائل دیتی) نشانیاں موجود ہیں (۵) یہ اللہ کی وہ آیات (قرآنی) ہیں جو ہم تمہیں صحیح صحیح سنا رہے ہیں اگر یہ لوگ اللہ کے فرامین اور (متذکرہ بالا) ان نشانیوں سے بھی مطمئن نہیں ہوتے تو آخر پھر اور کون سے دلائل ہیں جن کی بناء پر وہ اللہ پر ایمان لائیں گے (۶) ایسے ہر بدکار جھوٹے پر لعنت ہو (۷) جو ہماری ان آیات کو سن کر (سنی اَن سنی کرتا ہوا) غرور اور ضد پر جما رہتا ہے جیسے کچھ سنا ہی نہیں' آپ ایسے (ہٹ دھرم ضدی) کو دردناک عذاب کی بشارت دیدیں''(۸) (سورۂ جاثیہ:۳تا۸)

نہ صرف خلقِ جن وبشر ہی اس احسن الخالقین کا حیران کن کرشمہ ہے بلکہ اس کائنات کی ہر ہر شئے اس قدر متحیر وششدر کردینے والی ہے کہ بڑے بڑے صاحبِ دماغ ہزاروں سال سے اس مبہوط کن کارخانۂ قدرت کی باریکیوں کی کھوج میں حیران وسرگرداں ہیں۔ نیز اسرارِ الٰہیہ کے رُخ سے مزید حجابات ہٹانے میں ہنوز کتنا عرصہ درکار ہے کوئی نہیں کہہ سکتا۔ تاہم عالم نباتات' عالم حیوانات' عالم فلکیات' عالم معدنیات' عالم حشرات الارض اور خلقِ زمین وآسمان کے مقتدر نظام کے بارے اب تک جو

حیرت انگیز اور محیّر العقول معلومات میسر آ چکی ہیں، وہ قلوب میں کسی عظیم الشان ہستی کی جستجوئے تلاش ضرور پیدا کرتی ہیں کہ آخر وہ کون ہے جو چپ چاپ بے لوث ہم پر احسانات کی بارش مسلسل برساتا چلا جا رہا ہے اور معاوضہ میں کچھ بھی طلب نہیں کرتا اور یہ ہمارے ظروف اور مرضی پر چھوڑ دیتا ہے کہ ہم ایسے کریم محسن کے کس حد تک شکر گزار ہو پاتے ہیں یا اپنی سیاہ بختی کے سبب معذور و محروم رہ جاتے ہیں۔

ماہرین علمائے نباتات کی پوری پوری زندگیاں تحقیق و تلاش میں صرف ہونے، انکی انتھک محنت اور زیرکانہ مشاہدات و تجربات سے جو معلومات مہیا ہوئیں اور انہوں نے اصولِ نباتات کو جیسا منظم پایا، اس پر غور کریں تو ایسا مکمل و اکمل نظام قائم کرنے والے کے عظیم الشان ہونے پر انگنت شواہد و دلائل چیخ چیخ کر اعلان کر رہے ہیں کہ ہے کوئی صاحب عقل جو ہمیں دیکھ کر ہمارے خالق کی قوت و قدرت کا اندازہ لگائے، ہے کوئی دیدہ ور جو ہمارے منتظم و مقتدر کو ڈھونڈ نکالنے کی سعی کرے۔ پروردگار عالم نے اس بے مہار انسان کیلئے کیا کیا نعمتیں پیدا نہ فرمائیں، ادھر توجہ دلانے کیلئے سورۃ انعام میں فرمایا:۔

وَ هُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیۡءٍ فَاَخۡرَجۡنَا مِنۡهُ خَضِرًا نُّخۡرِجُ مِنۡهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَ مِنَ النَّخۡلِ مِنۡ طَلۡعِهَا قِنۡوَانٌ دَانِیَةٌ وَّ جَنّٰتٍ مِّنۡ اَعۡنَابٍ وَّ الزَّیۡتُوۡنَ وَ الرُّمَّانَ مُشۡتَبِهًا وَّ غَیۡرَ مُتَشَابِهٍ ؕ اُنۡظُرُوۡۤا اِلٰی ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثۡمَرَ وَ یَنۡعِهٖ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكُمۡ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ (انعام: ۹۹)

ترجمہ:۔ ”اور وہی ہے جس نے آسمان سے بارش برسا کر ہر اُگنے والی چیز نکالی۔ سبز رنگ پودے پیدا کر کے ان سے خوشے نکالے جس میں سے دانے نکالتے ہیں ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے اور کھجور کے گابھے سے پاس پاس گچھے (لگائے جن تک تمہاری رسائی ہو سکتی ہے)۔ اس نے مختلف اور مماثل قسم کے انگور، زیتون اور اناروں کے باغات پیدا فرمائے۔ پھلوں کے لگنے اور پکنے پر غور کرو، اس میں ایمان لانے والوں کیلئے (اسکی خالقیت و ربوبیت پر دلالت

کرتی) نشانیاں موجود ہیں" (انعام:۹۹)

اسی آیت میں بارش ونباتات کے ذکر کے بعد یہ حکم دیا جانا بطورِ خاص غور طلب ہے کہ:۔

اُنْظُرُوْٓا اِلٰی ثَمَرِہٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَ یَنْعِہٖ اِنَّ فِیْ ذٰلِکُمْ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ.....

(یعنی پھل کے لگنے اور پکنے پر غور کرو اس نظام میں ایمان لانے والوں کیلئے نشانیاں اور اسباق معجزات موجود ہیں)

تو آیئے کہ ہم نباتات واثمار کے خیرہ عقل نظام پر بھی نظر ڈالتے چلیں۔

اگلا مذکور عالم نباتات سے متعلق ہے۔

عالم نباتات

غذا ہر ذی روح کی زندگی برقرار رکھنے کیلئے ضروری ہے۔ جس طرح جانور گھاس اور پودے وغیرہ کھاتے ہیں اسی طرح گھاس اور پودوں کو زمین سے غذا حاصل کرنا ہوتی ہے۔ پودوں کی غذا نائٹروجن، پوٹاس، چونا اور ہائیڈروجن وغیرہ ہے اور یہ عناصر انہیں درختوں کے پتوں، چوپاؤں کے گوبر، خون، ہڈیوں اور بالوں وغیرہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ موسمِ خزاں بھی رب العالمین کی ایک بہت بڑی رحمت ہے کہ پت جھڑ میں زمین پر گرنے والے یہ پتے زمین کی غذا و زرخیزی کا سبب ہیں، وگرنہ اس قدر وسیع و عریض زمین میں کھاد ڈالنا ہمارے لئے سہل بلکہ ہماری قوت میں نہ تھا۔ پھر پانی کی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے یہ نظام مقرر فرمایا کہ دریاؤں سمندروں کے پانی کو تمازتِ سورج سے بھاپ بنا کر اٹھاتا اور ضرورت مند زمین پر گراتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت ملاحظہ کیجئے کہ ہوائیں خلیج بنگال سے کروڑوں ٹن پانی اٹھا کر سینکڑوں کلومیٹر دُور دُور تک یوں برسا دیتی ہیں کہ مردہ زمین میں جوشِ نمو انگڑائیاں لینے لگتا ہے اور ہر طرف پھل و پھول کے گلزار کھل اٹھتے ہیں۔

اس نظام کو سورۃ الفاطر آیت ۹ میں یوں بیان فرمایا گیا:۔

وَ اللّٰهُ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰی بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَحْیَیْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ (الفاطر: ۹)

ترجمہ:۔ ''اللہ وہ ہے جو ہواؤں کو سمندروں کی طرف بھیجتا ہے جہاں سے یہ آبی بخارات کو ہانک لاتی ہیں، اسی طرح ہم مردہ بستیوں کو سیراب کیا کرتے ہیں'' (الفاطر: ۹)

پودوں کی جڑوں میں خوردبینی حیوانات (بکٹیریا) کی ایک دنیا آباد ہے جن کا عمل کیمیائی ہوتا ہے۔ ان کی غذا نائیٹروجن ہے جسے کھا کر یہ اسی کا ایک رس سا خارج کرتے ہیں جس میں نائیٹروجن کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے جو کہ نباتات کی زندگی کا جزوِ اعظم ہے۔ اگر یہ بکٹیریا نہ ہوتا تو آج زمین پر کہیں کوئی درخت پھول پتا وغیرہ دکھائی نہ دیتا۔ بکٹیریا کی کئی قسمیں ہیں جن کے کاموں میں قدرے

اختلاف ہوتا ہے مگر مقصد سب کا ایک ہی ہے یعنی نباتات کی تخلیق و تکمیل۔ بلند و پست زمینوں میں بہ لحاظِ ضرورت انکی تعداد مختلف ہوتی ہے جنہیں تین انواع میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) بکٹیریا

(۲) پروٹوزوآ

(۳) سینجی۔

زمین کے ہر ایکڑ رقبہ میں ان بکٹیریوں کا کام روزانہ بارہ آدمیوں کی محنت کے برابر ہوتا ہے' بہ الفاظ دیگر اگر سو ایکڑ کھیت میں دس کسان ہل چلا رہے ہوں تو بارہ سو مزدوروں کا ایک مخفی لشکر بھی وہاں کام کر رہا ہوتا ہے۔ انصاف سے کہیں کہ کھیتی باڑی میں انسان کا کتنا حصہ ہے۔

سورۃ واقعہ میں استفسار فرمایا گیا اس پر غور کریں:۔

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ (۶۳) ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ (۶۴) لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ (۶۵)

ترجمہ:۔"(اے زرعیٔ ماہرین تم نے اس حقیقت پر کبھی غور کیا کہ) تم جو کچھ بوتے ہو (۶۳) وہ کھیتیاں تم اگاتے ہو یا ہم (۶۴) اگر ہم چاہیں (تو ایک بکٹیریا ہی کا عمل معطل کر کے) تمہاری لہلہاتی ہوئی کھیتیوں کو خشک چورا کر ڈالیں (الواقعہ: ۶۳ تا ۶۵)

حقیقت بھی یہی ہے کہ صرف ہل چلا کر بیج بو دینا پانی اور کھاد ڈال دینا کسی شئے کو اگانے کی علت نہیں اور یہ صرف طریق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام نظام و کمال اسکی ربوبیت سے مربوط و منظم اور اس کی مرضی پر منحصر ہے۔ زمین کی برودگی' نامیاتی مادوں کا معمول' انسان دوست کیڑوں اور بکٹیریا کا نظام آخر کس کی ایماء پر سرگرم عمل ہے۔ پھر اسکے شکر سے محرومی اور نافرمانی چہ معنی دارد؟۔

کیونکہ یہ ایک انمٹ حقیقت ہے کہ رب کائنات کے علاوہ کائنات بھر میں کوئی ایک تنکا پتّا یا ذرّہ تک تخلیق کرنے پر قادر نہیں۔ وہی ہے اگر چاہے تو مردہ زمین کو حیات بخش کر اجناس و پھل کے انبار لگا دے اور چاہے تو لہلہاتے ہوئے کھیت کھلیان پل بھر میں بھسم کر ڈالے۔

نائیٹروجن

نائٹروجن اس مربوط نظام ہی کا حصہ ہے کہ کھاد جہاں پودوں کی غذا ہے وہیں اِن خورد بینی بکٹیریا فوج کا مدارِ حیات بھی ہے۔ حیوانی فضلہ (گوبر وغیرہ) پودوں کی بہترین غذا ہے مگر یہ عموماً ضائع ہوجاتی ہے کچھ جلادی جاتی ہے اور کچھ نالیوں میں بہہ جاتی ہے۔ نائٹروجن میسر آجائے تو زمین کی زرخیزی میں اضافہ کا باعث ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ نائٹروجن ایک وحشی عنصر ہے جو کسی دوسرے عنصر سے آمیزش پسند نہیں کرتا۔

جنوبی امریکہ کے ساحلوں پر سمندری پرندوں کے پَر کثرت سے جھڑتے رہتے اور کئی باراں سے وہیں جمع ہوتے رہتے ہیں۔ زمین کے یہ حصے نائٹروجن کی کان سمجھے جاتے ہیں نیز ہوا میں بھی قدرت نے بے شمار نائٹروجن رکھی ہے۔ محققین کا کہنا ہے کہ فضاء کے ہر مربع کلومیٹر میں دو کروڑ ٹن نائٹروجن پائی جاتی ہے مگر تاحال اس وسیع خزانۂ قدرت سے استفادہ کیلئے ہم کسی طرح کے آلات ایجاد نہیں کر سکے۔ تاہم قدرت نے اس کا انتظام یہ کر رکھا ہے کہ جب بادلوں میں بجلی چمکتی ہے تو اردگرد کی آکسیجن نائٹروجن میں تبدیل ہوجاتی ہے اور بارش کے قطرے اس ذخیرۂ انمول کو لے کر زمین پر اتر پڑتے ہیں۔

۱۷۸۱ء میں ایک عالمِ فطرت مسٹر کیونڈش نے دعویٰ کیا اور ثابت بھی کیا کہ اگر آکسیجن اور ہوا کو برقایا جائے تو نائٹروجن پیدا ہوگی جس میں کچھ مقدار کھاد (الکلی) کی بھی موجود ہوگی۔ نائٹروجن دنیائے نباتات کی غذا ہے اور نباتات ہماری خوراک ہے۔ بہ الفاظِ دیگر سیاہ گھٹاؤں میں چمکتی بجلی کا ہر تبسم انسانی دنیا کیلئے پیغام حیات ہے۔ آسمانی بجلی کی لہریں ہوا سے گزرتی ہوئی جب زمین کو چُھوتی ہیں تو مریل و بیمار زمین کی نس نس میں عناصر حیات دوڑنے لگتے ہیں اور زمین حمل و تولید کیلئے پھر سے تیار ہوجاتی ہے۔ انصاف سے کہو اصل میں کھیتی باڑی کون کرتا ہے وہ یا ہم یا تم؟

یوں تو بادلوں کو ہوا کے ذریعہ ہی ادھر سے ادھر سفر کرایہ جاتا ہے تاہم جب فضا میں مکمل سکون

ہوتا ہے تو ہوا تھمی ہوئی ہوتی ہے ایسی صورت میں بادلوں کو کھینچنے کا کام آسمانی بجلی سے لیا جاتا ہے۔ایک وقت تھا کہ لوگ اسے قہرِ الٰہی سمجھا کرتے تھے اور قدیم آریئے تو اسے ایک ہولناک دیوتا سمجھ کر اسکی پوجا کیا کرتے تھے' ان جاہلوں کو بھی کیا معلوم تھا کہ اللہ کی ہر مخلوق رحمت' اس کا ہر فعل رحمت اور وہ خود سراپا رحمت ہے۔اسکی تمام مخلوق تو اشرف المخلوقات کی خدمت کیلئے ہے نہ کہ پوجے جانے کے لائق۔ سورۃ الروم میں ہے:۔

وَ مِنْ اٰیٰتِہٖ یُرِیْکُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ یُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَیُحْیٖ بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (الروم:۲۴)

ترجمہ:۔''اور یہ بھی اسکی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہیں بجلی دکھاتا ہے ڈراتی اور امید دلاتی اور آسمان سے پانی (بارش) برساتا ہے جس سے مردہ زمین کو زندہ کرتا ہے' بیشک اس میں (بھی) صاحب عقل لوگوں کیلئے (جو سوچیں اور قدرتِ الٰہی پر غور کریں تو اپنے محسن کو شناخت کرنے کیلئے) نشانیاں ہیں'' (الروم:۲۴)

یعنی بجلی کی کڑک و چمک سے ہم میں بیم و رجاء کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔بجلی کی دل دہلا دینے والی کڑک اور اسکے ممکنہ نقصان کا اندیشہ بھی ہوتا ہے اور بارش سے زمین کے نمو پانے سے رزق میں فراوانی کی امید بھی ہوتی ہے۔ یہ نظام اللہ تعالیٰ کے معجزاتِ تخلیق میں سے ہے کہ وہ کس طرح بجلی کی چمک سے پانی میں نائٹروجن شامل فرما کر بیجان ہو چکی زمین کو از سرِ نو حیات عطا فرماتا ہے' اور ابر و برق کے اس نظام میں غور و فکر کرنے والے داناؤں کیلئے اسکی قدرت و ہیبت کو شناخت کرنا چنداں مشکل نہیں۔

نائٹروجن بارود سازی میں بھی مستعمل ہے اندازہ ہے کہ اس مد میں ہر سال ایک ارب ٹن نائٹروجن صرف ہوتی ہے۔پہلی جنگ عظیم کے آغاز میں جرمنوں نے جنوبی امریکہ میں واقع چلی کی نائٹروجنی کانوں پر قبضہ کر لیا تھا تو اتحادیوں کو کئی ماہ تک سخت پریشانی سے سابقہ رہا۔جرمنی کے ایک مشہور عالم فطرت ہیبر (Haber) نے عملِ کیمیائی سے ہائیڈروجن اور نائٹروجن تیار کرنے کیلئے لیونا روک میں ایک بہت وسیع کارخانہ لگایا جس کی تعمیر میں پچاس لاکھ پونڈ صرف ہوئے۔جس میں ڈیڑھ سو ماہرین

کیمیا' اڑھائی سو صناع اور گیارہ ہزار مزدور کام کرتے ہیں اور ہر روز نو ہزار ٹن کوئلہ جلتا ہے۔

اچھی زمین کیلئے چار چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ چکنی مٹی' ریت' چونا اور کھاد۔ ان میں کوئی چیز انفراداً مفید نہیں لیکن یہ سب مل کر اکسیر ثابت ہوتی ہیں' چونے کے بغیر زمین ''دق'' میں مبتلا ہو جاتی ہے لیکن چونا ضرورت سے زیادہ ہو جائے تو زمین سے فولاد ختم ہو جاتا اور زمین بے جان ہو جاتی ہے۔ چکنی مٹی بھاری اور ٹھنڈی ہوتی ہے جبکہ ریت بھوکی اور خشک' البتہ ان کے امتزاج سے نہایت عمدہ زمین تیار ہوتی ہے جسے ''میرا'' کہتے ہیں۔ چکنی مٹی نمی کو دیر تک روکے رکھتی ہے اور ریت زمین کے بھاری پن کو دُور کر کے اس قابل بنا دیتی ہے کہ زمین میں موجود گیسیں پودوں کی جڑوں تک بہ آسانی پہنچ سکیں۔ اگر زمین چکنی اور سخت ہو تو نہ تو یہ گیسیں پودوں کی جڑوں تک بہ آسانی پہنچ سکیں اور نہ ہی نرم و نازک پودے آسانی سے باہر نکل سکیں۔

زمین کو چونے کے علاوہ سلفیورک ایسڈ' فاسفورک ایسڈ' نائٹرک ایسڈ اور پوٹاش کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ عناصر (معدنیات) عموماً پہاڑوں میں ہوتے ہیں۔ اگر ہم خود ان چیزوں کی تلاش میں نکلتے اور کدال لیکر فرہاد کی طرح پہاڑوں کو کھودتے پھرتے تو اس کیلئے صدیاں درکار ہوتیں اور پھر بھی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلتا۔ خالق کائنات نے اپنی رحمت سے اس مشکل کا یہ انتظام کیا کہ پہاڑوں پر برف جمع کر دی جو پگھلتی ہے تو پانی پہاڑی شگافوں میں اتر جاتا اور چشموں سے پھوٹ نکلتا ہے تو معدنیات ملا ہوا یہ پانی پوٹاش اور سلفر وغیرہ کی ایک دنیا ہمراہ لے آتا ہے اور یہ چشمے دریاؤں نہروں میں بٹتے ہوئے ہمارے کھیت کھلیانوں تک پہنچتے ہیں۔ یوں ہماری اہم ضرورت قدرتی طور پوری ہو جاتی ہے۔

سورۃ الزمر میں فرمان ہے:۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَکَہٗ یَنَابِیْعَ فِی الْاَرْضِ ثُمَّ یُخْرِجُ بِہٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُہٗ...(الزمر/ ۲۱)

ترجمہ:۔ ''کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ نے فضائی بلندیوں سے (بارش برسا کر) پانی اتارا' جو زمین کی درزوں میں داخل ہو کر چشموں کی صورت باہر نکلا اور اس معدنی عناصر ملے پانی سے

رنگ برنگی کھیتیاں نمودار ہوئیں''۔۔۔۔(زمر/۲۱)

نَر اور مادہ

احسن الخالقین کے اس نظام پر نظر ڈالنے کے بعد اسکے ایک اور اہم نظام کی طرف بھی نظر ڈالیں جو کسی شئے کی تولید کیلئے نر و مادہ کے ملاپ سے مشروط کیا گیا ہے۔ جیسے فرمان ہے کہ ''ہم نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا بنایا''۔ جن و بشر، حیوانات و نباتات کی افزائش و بہتاتِ لاتعداد نر و مادہ کے اسی امتزاج کا نتیجہ ہے۔ حضرت آدمؑ کو بغیر نر و مادہ خلق فرمانا یا حضرت عیسیٰؑ کی بغیر نر پیدائش سے قطع نظر کہ واقعاتِ مذکورہ معجزاتِ الٰہیہ کی مد سے ہیں وگرنہ کسی شئے کو معرضِ وجود میں لانے کے قانونِ الٰہیہ کو پھلانگنے کے تجربات ہنوز محتاجِ اصولِ الٰہیہ ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے۔ ٹیوب بیبیز (Tub Babies) کی انسانی کوششوں کی بنیاد بھی نر سیمنز پر موقوف ہے۔ کیونکہ اعلان خالق تعالیٰ ہے کہ تم اپنی لاکھ کوششوں کے باوجود نہ تو قرآن کی مثل ایک آیت تک بنانے پر قادر ہو نہ ہی کسی شئے کو خلق کر سکتے ہو سو اس ضمن میں ہر کوشش وقت کا زیاں ثابت ہوگی۔

احسن الخالقین کے اس نظام کو بھی دیکھیں کہ ہر پھول دو حصوں یعنی نر اور مادہ میں بٹا ہوتا ہے۔ جب تک مادہ نر سے حاملہ نہ ہو وہ کبھی پھل یا بیج پیدا نہیں کر سکتی۔ پھول کے نر حصّے میں ایک غبار سا ہوتا ہے جسے انگریزی میں پولن (Pollen) اور اردو میں مادہ منویہ کہا جاتا ہے اور دوسرے یعنی حصّۂ مؤنث پر چھوٹے چھوٹے بال ہوتے ہیں، جب مادہ منویہ کا کوئی ذرّہ ان بالوں پر گرتا یا چھوتا ہے تو یہ بال اسے پھانس لیتے ہیں اور یوں مادہ حاملہ ہو جاتی ہے۔ ہیزل جیسے کچھ پودوں میں نر اور مادہ پھول الگ الگ لیکن ساتھ ساتھ ہوتے ہیں نر پھول نیچے کی جانب جھکا ہوتا ہے اور مادہ کا پھول نر کے نیچے اوپر کی جانب اٹھا ہوا ہوتا ہے تا کہ جب نر کا مادہ منویہ گرے تو مادہ محروم نہ رہے۔ بعض ایسے پودے بھی ہیں جن کے نر و مادہ الگ الگ اور ایک دوسرے سے دُور دُور ہوتے ہیں۔ اس کیلئے یہ نظام مقرر ہے کہ نر کا غبار مادہ تک پہنچانے کا کام شہد کی مکھیاں بھنورے اور تتلیاں سرانجام دیتی ہیں۔ ان پودوں کے ساتھ نہایت متاثر کن

پھول لگتے ہیں جن کی خوشبو اور رنگت' ان بھنوروں اور مکھیوں کو اپنی جانب کھینچتے ہیں جب یہ نر پر بیٹھتی ہیں تو انکی ٹانگوں اور پروں سے غبارِ منویہ چمٹ جاتا ہے اور پھر جب مادہ پھولوں پر بیٹھتی ہیں تو اس غبار کا کچھ نہ کچھ حصہ وہیں رہ جاتا ہے جس سے یہ پھول حاملہ ہو جاتے ہیں۔ بعض درخت یا پودے ایسے بھی ہیں جن میں مکھیوں کیلئے کشش (Attraction) موجود نہیں ہوتی اس لئے یہ کام ہوا سے لیا جاتا ہے کہ ہوا نر درختوں کا غبار اڑا کر مادہ تک پہنچا دیتی ہے۔ چونکہ ہواؤں کا رُخ بدلتا رہتا ہے اس لئے ایسے درختوں پر غبارِ منویہ کثیر تعداد میں پیدا ہوتا ہے تا کہ ہر طرف کے مادہ درختوں تک بھی پہنچ جائے اور ضائع ہونے کے باوجود سب کیلئے کچھ نہ کچھ بچ رہے۔

پہاڑی اشجار (چیڑ دیودار وغیرہ) خوبصورتی کے علاوہ ہماری معاشرت کا جزوِ اعظم ہیں۔ اگر پہاڑوں پر ایسی ہوائیں نہ چلتیں تو مادہ پھول حاملہ نہ ہو پاتے اور نتیجہ میں بیج تیار نہ ہوتے۔ یوں ہرے بھرے جاذب نظر یہ پہاڑ بھدے اور ڈراؤنے دکھائی دیتے اور کھانے کو دوڑتے۔ بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہوا کا یہ وسیع و عریض کرّہ اشرف المخلوقات کی خدمت میں کس انہماک سے سرگرم عمل ہے۔

سورۃ الحجر/۲۲ میں ہے:۔ ''وَ اَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ''

ترجمہ:۔ ''ہم نے ہوائیں بھیجیں جو (غبارِ منویہ سے) لدی ہوئی تھیں''۔

مغربی علمائے نباتات نے صدیوں کی تلاش و جستجو' محنت شاقہ اور انگنت تجربات کے بعد ماضی قریب میں نباتات کے نر و مادہ ہونے کا نظریہ قائم کیا جسے دورِ جدید کا نظریہ قرار دیا جاتا ہے۔ حقانیت قرآن اور اسکے کلام الٰہی ہونے کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ جہالت کے ایک تاریک ترین دور میں رسول اللہ فدا ابی و امی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آج سے ساڑھے چودہ سو سال قبل ببانگ دہل اعلان فرمایا تھا:۔

وَ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ (الذٰریٰت / ۴۹)

ترجمہ:۔ ''اور ہم نے ہر چیز سے نر و مادہ جوڑے نکالے تا کہ تم توجہ کرو'' (الذٰریٰت / ۴۹)

اسی ضمن میں ایک مقام پر قرآن نے فرمایا:۔

وَ تَرَی الْاَرْضَ ھَامِدَۃً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْھَا الْمَآءَ اھْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَ اَنْۢبَتَتْ مِنْ کُلِّ زَوْجٍۭ بَھِیْجٍ (الحج:۵)

ترجمہ۔تم زمین کو دیکھتے ہو کہ پیاسی ہوتی ہے پھر جب ہم بارش برساتے ہیں تو خوش ہوتی ہے اسکے قوائے نمو بیدار ہو جاتے ہیں اور وہ ہر قسم کے درختوں کے جوڑے اگانے لگ پڑتی ہے'' (الحج:۵)

علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی صاحب نے اپنی کتاب (تذکرہ) میں ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ کچھ عرصہ قبل میں نے اپنے ایک ہندو پروفیسر دوست سے (جس کی ساری زندگی نباتات کی چھان بین میں بسر ہوئی تھی) ذکر کیا کہ پودوں میں نر و مادہ کا ذکر ہماری مذہبی کتاب قرآن میں موجود ہے تو وہ بے یقینی سے سر ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔

(How it could be possible the Quran is such an old book)

''یہ کیونکر ممکن ہے قرآن تو ایک پرانی کتاب ہے جبکہ یہ نظریہ بالکل جدید ہے''۔جب میں نے پکھتال کے انگریزی ترجمے سے آیت بالا کا ترجمہ نکال کر اسے دکھایا تو کچھ سوچتا ہوا کہنے لگا ''اگر مجھے اطمینان ہو گیا کہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اور پکھتال کا ترجمہ بھی درست ہے تو میں قرآن کی صداقت کا علیٰ روس الاشہاد اعلان کرونگا اور آپکے عربی رسول کی مدح و تمجید سے مجھے کوئی خیال نہیں روک سکے گا''۔

نباتات کی ترکیبِ روئیدگی

علمائے نباتات نے دعویٰ کیا ہے کہ بہ لحاظ روئیدگی پودوں کی دو قسمیں ہیں۔پہلی وہ جن کے بیج میں سے دو پتے نکلتے ہیں دوسری قسم جن سے صرف ایک پتا نکلتا ہے۔یہ ابتدائی دو پتے پودے کی غذا کا خزانہ لئے ہوتے ہیں جب پودا جڑ پکڑ جائے تو یہ پتے سوکھ جاتے ہیں نیز زمین پر بہت سی ایسی جڑی بوٹیاں پائی جاتی ہیں جن کے بیج خشخاش سے بھی بیس گنا چھوٹے ہوتے ہیں مگر قدرت نے ان باریک بیجوں میں بھی چار اشیاء چھپا رکھی ہیں۔

(۱) دو جڑے ہوئے پتے۔(۲) ایک ڈوڈی جو جڑ بن کر زمین میں پیوست ہوتی ہے۔

(۳) ایک گرہ جو ڈنڈی بن کر زمین سے باہر نکلتی ہے۔(۴) جڑ پکڑنے سے پہلے چند ایام کی غذا۔

غور کریں کہ یہ ننھا سا بیج کس قدر پیچیدہ مشین ہے اور کمالِ تخلیق ملاحظہ ہو کہ ایک باریک ذرّہ

سا بیج پورا درخت دامن میں لئے بیٹھا ہے۔ جب ایک چھوٹا سا بیج ایک تناور درخت بننے کی استعداد رکھتا ہے تو اندازہ لگائیں کہ انسان اگر چاہے تو کیا کچھ نہیں بن سکتا۔

پودوں کے اجزائے تکوینی ''بناتیہ'' کہلاتے ہیں۔ یہ بناتیہ کہیں پتے بن رہا ہے اور کہیں ٹہنیاں کہیں رنگ اور کہیں خوشبو' کہیں پھول تو کہیں پھل۔ یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ چند بناتیے سازش کر کے پھول کی جگہ پھل تیار کر دیں یا کیلے کے درخت کے ساتھ کھجور آم یا امرود وغیرہ لگاتے پھریں۔ کیونکہ یہ اپنے خالق کے اصول وقواعد سے کبھی سرتابی نہیں کر سکتے۔ بناتیوں کی ترکیب خلیوں سے مرتب ہوتی ہے اور ہر خلیے کی بیرونی دیوار آکسیجن' ہائیڈروجن اور کاربن کے مرکب سے تیار ہوتی ہے۔ جڑ کے آخری کنارے کی نوک پر سخت خلیے کی ایک ٹوپی سی چڑھی ہوتی ہے جو سخت چٹانوں تک کو چیر کر نکل جاتی ہے۔

ہر پودے میں ایک رنگ دہ مادہ ہوتا ہے جسے کلوروفل (Chlorophyll) کہتے ہیں۔ یہ سورج کی روشنی سے تیار ہوتا ہے جس کی بدولت پودوں کو سبز رنگ ملتا ہے۔ اس کی ایک اور خصوصیت ہے کہ فضا سے کاربن لے کر اسے شکر و نشاستہ میں تبدیل کر دیتا ہے۔

پودے کو نشو نما کیلئے نمی' ہوا گرمی اور چند عناصر مثلاً فاسفورس' پوٹاش اور نائٹروجن وغیرہ درکار ہوتے ہیں جن کی کچھ مقدار پانی میں بھی حل ہوتی ہے جنہیں پودا جڑوں سے جذب کرتا ہے چونکہ پانی میں انکی مقدار وافر نہیں ہوتی اس لئے پودوں کو پانی کی زیادہ مقدار کی ضرورت ہوتی ہے۔ ماہرین کا یہ بھی کہنا ہے کہ پودے پانی سے ان عناصر کو اپنی زندگی کا حصہ بنا لیتے اور اضافی پانی کو بذریعہ تبخیر باہر نکال دیتے ہیں۔

تخمیناً ایک ایکڑ زمین میں پھولوں کے پودے ایک سال میں دو ہزار ٹن پانی تبخیر سے خارج کرتے ہیں۔ دوسری طرف جڑیں پانی کی ضروری مقدار زمین کی گہرائیوں سے چُوس کر پورے درخت کی آخری چوٹیوں تک پہنچا رہی ہیں جو قدرت کے پانی کی سطح کو برابر رکھنے یعنی سطحی دباؤ (Surface Tension) کے قانون کے مطابق ہے۔

درختوں کے ساتھ بے شمار پتے بھی محض خوبصورتی کیلئے نہیں بلکہ قدرت نے ہر پتے میں

چھوٹے چھوٹے مسام رکھے ہیں جن کے ذریعہ پودا سانس لیتا ہے۔ حیوانات کی پیدا شدہ زہر (یعنی کاربن) کو نباتات آکسیجن سمیت اندر لیجاتے اور کاربن کو جزوِ حیات بنا کر آکسیجن کو خارج کر دیتے ہیں۔ یہ مسام رات ہوتے ہی بند ہو جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اگر کسی درخت کو سورج کی روشنی سے دیر تک محروم رکھا جائے تو وہ تنفس گھٹ جانے کی بنا پر مر جاتا ہے۔ قطب شمالی و جنوبی کے نزدیک موجود پودوں کی مشینری قدرت نے متفرق رکھی ہے اس لئے ان پر طویل راتوں کا کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔

جن درختوں کو حرارتِ آفتاب کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے انکو پتلے پتے دیئے گئے تا کہ زیادہ حرارت جذب کر سکیں اور بعض جنہیں زیادہ حرارت کی ضرورت نہیں ہوتی انہیں موٹے بھدّے پتے دیئے گئے۔ بعض پتوں پر کانٹے ہوتے ہیں اور بعض پتے زہر سا خارج کرتے ہیں تا کہ ضرر رساں کیڑوں سے اپنا دفاع کر سکیں۔

غور کریں کہ قدرت نے نباتات کو زندہ و برقرار رکھنے کیلئے کیا اکمل و انسب انتظام کر رکھا ہے۔ آج اگر خالق کائنات صرف سطحی قانون کے دباؤ کو معطل کر دے تو تمام نباتات سوکھ جائیں اور زندگی کا کہیں نشان تک باقی نہ رہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ (الانعام: ۱۰۲)

''یہ ہے اللہ تمہارا پالنے والا جس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں ہر شئے کی تخلیق کرنے والا وہی ہے پس اسی کی عبادت کرو اور وہ ہر چیز پر نگران ہے'' (انعام: ۱۰۲)

گذشتہ صفحات میں بیان ہو چکا ہے کہ بیج میں دو گرہیں سی ہوتی ہیں ایک ڈنڈی بن کر باہر نکلتی ہے اور دوسری جڑ بن کر زمین میں پیوست ہوتی جاتی ہے آپ بیج کو کسی شکل میں دبائیں جڑ والی گرہ اوپر کر دیں اور دوسری نیچے کر دیں نتیجہ وہی ہوگا کہ جڑ نیچے جائیگی اور ڈنڈی اوپر نکلے گی۔ آخر کیوں؟ اس لئے کہ یہ نظام ایک زبردست کا مقرر فرمایا ہوا ہے۔ اس ضمن میں فرمان قرآن قابل توجہ ہے۔

'' وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ ۚ وَ لَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَ هُوَ الْعَلِيُّ

الْعَظِیْمُ" .....(بقرۃ/۲۵۵)

ترجمہ:۔اور اس (اللہ) کا تختِ سلطنت ارض وسما کو احاطہ کیے ہوئے ہے اور انکی نگرانی کرنا اسے بوجھل نہیں اور وہ بلند و برتر بڑی عظمت والا ہے (بقرۃ/۲۵۵)

پودے جب بڑے ہوجاتے ہیں تو ان میں توانائی کے سبب ایک حسین سا تغیر آجاتا ہے۔ وہی بنا تیے جو ابتک شاخ و برگ بن رہے تھے پھول و پھل بننے لگتے ہیں۔غنچے پھول اور پھول بیج بننے کی تیاری میں مصروف عمل ہوجاتے ہیں' کیونکہ افزائش نسل کا جذبہ حیوانات و نباتات میں بھی شد و مد سے پایا جاتا ہے۔بیج نباتات کے انڈے ہیں اسلئے قدرت نے انکی حفاظت کا نہایت عمدہ نظام قائم کر رکھا ہے۔انہیں غلافوں میں بند کر کے رکھا گیا' کسی کو سخت چھلکے میں تو کسی کو نرم چھلکے میں۔پھلوں کے اوپر بھی چھلکوں کی حفاظتی تہہ چڑھی ہوتی ہے کہ جلد خراب نہ ہو پائیں۔گریپ فروٹ کا سائز بڑا ہے تو اسکے پھل پر ایک موٹی فومی تہہ بھی موجود ہے کہ گرے تو پھل کو چوٹ نہ آئے۔

وہ اجناس اور پھل جو انسان کی غذا ہیں انہیں نسبتاً معمولی چھلکوں میں رکھا گیا کہ اسکے ''لاڈلے'' انسان کو مغزیا پھل نکالنے میں دقت نہ ہو۔بعض مفید پھلوں مثلاً مالٹا سنگترہ سیب وغیرہ میں بیج چونکہ کم ہوتے ہیں اس لئے انہیں ذائقے کے لحاظ سے تلخ و ترش بنادیا کہ انسان انہیں کھا نہ جائے اور ان پھلوں کی نسل کا خاتمہ نہ ہوجائے۔بعض بیج جو ہماری روزانہ کی غذا میں مستعمل ہیں ان کو با افراط پیدا فرمایا کہ انسانی استعمال کے بعد بھی کچھ نہ کچھ بچ رہیں۔مالٹے سنگترے انار وغیرہ جیسے پھلوں کے چھلکے بھی اس قدر کڑوے ہوتے ہیں کہ کسی جانور کو منہ مارنے کی ہمت نہیں ہوتی۔

اخروٹ بادام وغیرہ جیسے میوہ جات چونکہ اونچے پہاڑوں پر پیدا ہوتے ہیں جہاں برف وغیرہ کی وجہ سے میدانی جانور نہیں پہنچ سکتے اور یہاں صرف گلہری یا چوہوں کا ہی خطرہ ہوتا ہے اس لئے انکے چھلکے سخت بنادیئے تا کہ چوہوں وغیرہ سے محفوظ رہیں۔چھلکے سخت رکھنے میں ایک رمز یہ بھی ہے کہ یہ میوہ جات صرف پہاڑی علاقوں تک ہی محدود نہ رہیں بلکہ دور دراز علاقوں کے لوگوں تک بھی حفاظت سے پہنچ سکیں۔

قدرت کا کمالِ صناعی دیکھئے کہ زمین وہی ہے درخت وہی ہے اسکو غذا پہنچانے والی شاخیں بھی وہی ہیں مگر انار کے دانے میٹھے ہیں جبکہ دانوں سے چمٹا ہوا چھلکا سخت کڑوا ہے' یوں لگتا ہے چھلکوں اور دانوں کے لئے کارخانے میں دو علیحدہ علیحدہ شعبے کام کر رہے ہیں۔

قدرت نے ہماری غذا کی فراہمی وحفاظت کا کیا حیران کن انتظام کر رکھا ہے۔ نباتات کی دنیا میں موجود ہر ہر درخت' ہر ہر پودے میں ربوبیت کی کس قدر نشانیاں اور اسباق موجود ہیں کاش کوئی توجہ کرے کہ اس میں کتنا تنوع ہے۔ لاکھوں پودے ہیں ہر پودے کی ہیئت الگ' خاصیت الگ' پھل الگ انکے ذائقے الگ جب کہ ایک ہی زمین اور ایک ہی ماحول میں پرورش پا رہے ہیں مگر کہیں کوئی غلطی نہیں' بدنظمی نہیں' غفلت یا تربیت سے تساہل نہیں۔ آؤ اس احسن الخالقین کی حمد وثنا کے زمزمے گائیں جس نے ہماری دنیا کو حسن و جمال کا مرکز بنایا اور اسے پھل وگلزار سے سجایا۔

سورۃ اعلیٰ میں فرمایا گیا:۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلَی (۱) الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی (۲) وَ الَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی (۳) وَ الَّذِیْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی (۴) ..... (سورۃ:اعلیٰ)

ترجمہ:۔ اپنے رب کی حمد وثنا کرو جس نے کائنات میں ہر چیز کو پیدا کر کے ایک خاص دستور العمل کے نباہنے پر مقرر فرمایا اور جس نے (چوپاؤں کیلئے چراگاہیں اور مرغزار بنا کر ان میں سے) چارہ نکالا۔۔۔۔۔(اعلیٰ ۱تا۴)

نظامِ افلاک

نئی دُوربینوں کی ایجاد سے پہلے فلک بین ''اُصطرلاب'' سے کام لیتے تھے یہ اپنے زمانہ کی ایک نایاب چھوٹی سی دُوربین تھی جسے یونان کے ایک ستارہ شناس ''اپالوئیس'' (۲۴۰ ق م) نے ایجاد کیا تھا۔ وہ اس سے ستاروں کی گردشیں' مسافتیں' شب و روز کا طول ناپنے اور ان کے مقام متعین کرنے کا اندازہ وعلم حاصل کرنے کا کام لیتا تھا۔

مسلمانوں میں اس کا استعمال چوتھی صدی ھجری میں شروع ہوا جو مسلمانوں کی وساطت سے

یورپ پہنچا' جہاں سب سے پہلے اسے پوپ سلوسٹر (۹۳۰ء۔۱۰۰۳ء) نے استعمال کیا۔عصر رواں کی پہلی جدید دُوربین ہالینڈ کے ایک منجّم ''جان لیپر شے'' نے بنائی۔

اسکے بعد ۱۶۷۲ء کو'' آئزک نیوٹن'' (۱۶۴۲ء۔۱۷۲۷ء) نے بھی ایک دُوربین تیار کی۔ پھر انگلستان سے ایک ستارہ ابھرا جس کا نام تھا''سر فریڈرک ولیم ہرشل''(۱۷۳۵ء۔۱۸۲۲ء) جس نے یکے بعد دیگرے کئی دُوربینیں تیار کیں جس سے بیسویں صدی تک یہ فن کمال کو پہنچ گیا۔

امریکی شعبہ فلکیات نے کوہِ ولسن پر ایک سوانچ شیشے والی دُوربین نصب کی اور ۱۹۴۸ء میں کیلیفورنیا یونیورسٹی نے کوہِ پیلومر کی چوٹی پر ایک ایسی دُوربین نصب کی جس کے شیشے کا قطر دوسوانچ تھا۔ اس سے آسمانوں کی لامحدود وسعتیں نظر کے سامنے آگئیں اور انسان نے وہ کچھ دیکھا جو اب تک چشم آدم سے پنہاں تھا۔انسان نے دیکھا کہ:۔

(۱) ہماری کہکشاں کا قطر ایک لاکھ نوری سال ہے۔سورج اسکے ایک کنارے پر واقع ہے۔مرکزِ کہکشاں سے تیس ہزار نوری سال دُور سورج اپنے مرکز کے گرد پانچ لاکھ چالیس ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھوم رہا ہے۔

(نوری سال کا حساب خود لگائیے کہ روشنی ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل سفر کرتی ہے وہ ایک دن میں کتنا سفر کریگی اور ایک سال میں کہاں تک پہنچے گی کہ اس کا نوری سال پورا ہو۔)

(۲) ہماری کہکشاں کے علاوہ ایک ارب کہکشائیں اور بھی ہیں۔ان میں سے سورج کی قریب ترین کہکشاں دس لاکھ نوری سال کی مسافت پر ہے اور بعید ترین والی پندرہ کروڑ نوری سال کی مسافت پر۔

(۳) ہر کہکشاں میں ایک سو ارب ستارے ہیں۔

(۴) ہماری کہکشاں سے قریب ترین کہکشاں بیس لاکھ نوری سال کی مسافت پر واقع ہے۔ہم اپنی آنکھوں سے صرف چار کہکشائیں دیکھ سکتے ہیں بقیہ کہکشائیں بڑی دُوربین سے نظر آتی ہیں۔

(۵) ہماری کہکشاں انیس دیگر کہکشاؤں سے مل کر ایک گروپ بناتی ہے اور اس گروپ کا قطر پچاس لاکھ

نوری سال ہے۔

(۶) ماہرین فلکیات اور ستارہ شناس علماً کی تفصیلی رپورٹ میں اس بات پر سب کا اتفاق پایا گیا ہے کہ یہ تمام کہکشائیں ہم سے نیز ایک دوسرے سے دُور جارہی ہیں اور آسمانوں میں زبردست توسیع ہورہی ہے۔ رپورٹ میں توسیع کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ کہکشاؤں کے ایک دوسرے سے دُور ہٹنے سے جو جگہ خالی ہوتی ہے اس میں نئی کہکشائیں بن جاتی ہیں۔

All the galaxies are away from us and from each other.....this suggests that the whole universe is expanding.....

بحوالہ (چلڈرن انسائیکلوپیڈیا لنڈن ۱۹۷۵ء پیج ۱۲۳)

غور طلب ہے کہ آج سے ساڑھے چودہ صدی پیشتر جبکہ عربوں کے پاس فلک بینی کا کوئی آلہ موجود نہ تھا قرآن نے ایک ایسی بات فرمادی جس کا انکشاف ۱۹۴۸ء کے بعد کوہِ پیلومر پر نصب دُوربین نے کیا کہ ''یہ کائنات پھیل رہی ہے''۔

وَ السَّمَآءَ بَنَیۡنٰهَا بِاَیۡدٍ وَّ اِنَّا لَمُوۡسِعُوۡنَ (الذّٰریٰت/۴۷)

ترجمہ:۔''ہم نے آسمان کو اپنے ہاتھوں سے بنایا اور ہم اس میں توسیع کرتے رہیں گے'' (الذّٰریٰت/۴۷)

دوستو: قرآن کے وحی الٰہی ہونے پر اس سے بڑی شہادت کیا ہوسکتی ہے؟

مطالعہ افلاک

آسمانوں کے متعلق تازہ تحقیق یہ ہے کہ فضا میں کئی شفاف دیواریں موجود ہیں۔ ایک دیوار ایسی ہے جو کاسمک شعاؤں کو روکتی ہے۔ کاسمک شعاؤں میں دس ارب وولٹ کی بجلی ہوتی ہے اگر یہ شعائیں اس دیوار کو چیر کر نیچے آجائیں تو زندگی آناً فاناً ختم ہوجائے۔ ایک دیوار ایسی ہے جو ایتھر کی لہروں کو روک کر زمین کی طرف لوٹا دیتی ہے اور اسی بدولت ہم ریڈیو سے آواز سن سکتے ہیں۔ ایک اور دیوار فضا

کے کروڑوں آفتابوں کی حرارت کو روکتی ہے۔ اگر ہم زمین سے خلاء میں سو میل سے اُوپر جائیں اور ٹھنڈے پرت سے اُوپر حرارت کے پرت میں داخل ہو جائیں اور ہمارے ہاتھ میں پانی کا گلاس ہو تو وہ کھولنے لگ جائیگا۔ ان دیواروں کی بدولت کہکشانی آفتابوں کی حرارت اور مبرّق شعاعوں سے کرّۂ ارض محفوظ ہے۔

آسمان ہم سے بہت دُور ہے اور اس کے متعلق ہمارا علم ناقص و نامکمل ہے لیکن جو کچھ علمائے ہیئت نے معلوم کیا اس کی تفصیل یہ ہے کہ ظاہری آنکھوں سے ہمیں آسمان کے سات طبقے نظر آتے ہیں۔ پہلے طبقے میں صرف چار بڑے بڑے ستارے ہیں۔ طبقۂ دوم میں ستائیس ہیں' سوم میں تہتر' چہارم میں ایک سو انانوے' پنجم میں چھ سو پچاس' ششم میں دو ہزار دو سو اور ساتویں طبقے میں تین ہزار سے زیادہ ستارے ہیں۔ یہ ستارے غالباً وہ ہیں جو ہمیں نظر آتے ہیں۔ البتہ دُوربین کی مدد سے ہیئت دان اب تک تقریباً بیس کروڑ ستارے دیکھ چکے ہیں۔ اس ضمن میں قرآن نے فرمایا:۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَ مَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ (مومنون:۱۷)

ترجمہ:۔ ہم نے تمہارے اوپر سات گزرگاہیں بنائیں اور ہم تخلیق سے غافل نہیں ہیں (مومنون:۱۷)

اگر ہم آفتاب کے زیادہ قریب ہوتے تو گرمی سے جھلس جاتے اور زیادہ دُور ہوتے تو ٹھٹھر کر مرجاتے۔ احسن الخالقین نے ہمیں ایک مخصوص فاصلے پہ رکھا ہوا ہے تاکہ ہر دو طرح کے زیاں سے محفوظ رہیں۔ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غَافِلِيْنَ:۔ (اور ہم اپنی مخلوق سے غافل نہیں)

آفتاب

علمائے مغرب کا خیال ہے کہ سورج اپنی جگہ پر گھوم رہا ہے' ہیئت دانوں نے دُوربین سے سورج میں چند داغوں کا بھی مشاہدہ کیا ہے' جن کا مقام بدلتا رہتا ہے۔ یہ تبدیلی غالباً سورج کے گھومنے کی وجہ سے ہے وگرنہ داغ اپنی جگہ پر ہی موجود ہیں۔ چونکہ سورج ایک ماہ میں اپنا طواف پورا کرتا ہے اس لئے سولہویں اور اکیسویں تاریخ کو یہ داغ نظر نہیں آتے اور چھبیسویں کو پھر دکھائی دینے لگتے ہیں۔ لیکن قرآن حکیم سورج کے اس طرح کھڑے رہتے ہوئے گھومنے کے نظریہ کو باطل ثابت کرتا ہے۔ انسانی علم

اس پہلو میں اس قدر ناقص ہے کہ باوجود کوشش کے الہام کا ساتھ نہیں دے سکا اور اسے درست حقائق تک پہنچنے میں مزید وقت درکار ہے۔ موجودہ علمائے نجوم میں صرف ''ہرشل'' ایک ایسا عالم ہے جس نے سُورج کو متحرک تسلیم کیا ہے۔ تاہم علم وہنر پر دسترس بڑھتے بڑھتے ایک زمانہ وہ بھی آئیگا جب انسانی تحقیق وجستجو ربانی الہامات کی تصدیق کرے گی۔ قرآن نے آفتاب وماہتاب کو متحرک قرار دیا اور فرمایا:۔

وَ الشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ؕ (یٰس:۳۸)

ترجمہ:۔ سورج اپنے ایک مستقر کی طرف محوِ حرکت ہے یہ حکم ہے زبردست جاننے والے کا۔۔۔۔(یٰس:۳۸)

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ یُکَوِّرُ الَّیْلَ عَلَی النَّهَارِ وَ یُکَوِّرُ النَّهَارَ عَلَی الَّیْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ اَلَا هُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفَّارُ (الزمر:۵)

ترجمہ:۔ اللہ نے زمین وآسمان کو پیدا کیا' رات کو دن میں اور دن کو رات میں تبدیل کیا اور آفتاب وماہتاب کو کام میں لگایا یہ تمام ایک ٹھہرائی میعاد تک چلتے رہیں گے' جان رکھو وہی صاحب عزت بخشنے والا ہے (الزمر:۵)

کس قدر واضح اعلان ہے حرکت آفتاب وماہتاب کا۔ نہ صرف یہی بلکہ کرّہ ارض بھی متحرک ہے۔ علمائے مغرب نے زمین کو متحرک مانا ہے اور مشرق میں زمین ساکن تسلیم کی جاتی ہے جبکہ زمین کے متحرک ہونے پر قرآن حکیم میں کئی آیات موجود ہیں مثلاً سورۃ طٰہٰ کی ۵۳ نمبر آیۃ میں زمین کو گہوارا قرار دیا گیا ہے۔

قمر

چاند کا قُطر اکیس سو ساٹھ (۲۱۶۰) میل اور زمین کا سات ہزار نوسو اسی (۷۹۸۰) میل ہے۔ چاند زمین سے ساڑھے تیرہ گنا چھوٹا ہے۔ چاند تیز رفتاری سے زمین کے گرد گھومتا ہے اور حیران کن نظام ہے کہ وہ ایک تیز گھومنے والی زمین کے اردگرد اس صفائی سے گھوم رہا ہے کہ نہ تو زمین سے اور

نہ ہی کسی اور ستارے سے ٹکراتا ہے۔ چاند کی تیز رفتاری کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اپنا ایک چکر ستائیس (۲۷) دن میں پورا کر لیتا ہے جبکہ زمین تین سو پینسٹھ اعشاریہ چار دن میں اپنا چکر مکمل کرتی ہے۔ چاند گرہن اس لئے ہوتا ہے کہ زمین سورج اور چاند کے بیچ آجاتی ہے اور یہ دونوں کے متحرک ہونے کا بین ثبوت ہے۔

چاند ہم سے دو لاکھ چالیس ہزار میل دُور ہے اگر چہ انسان کے قدم اس پر پڑ چکے ہیں تاہم چاند کی اندرونی دنیا کا ہمیں پورا علم حاصل نہیں۔ ہیئت دانوں نے اتنا ضرور معلوم کر لیا ہے کہ چاند میں پہاڑ موجود ہیں جو قدیم زمانے کے آتش فشاں ہیں اور جن کا لاوا سرد ہو کر منجمد ہو چکا ہے۔ چاند کے اندر ہوا موجود نہیں نہ کہیں پانی ملتا ہے یہ ایک خشک بیابان ہے اس لئے رہائش کے قابل نہیں۔ علمائے نجوم نے ثابت کیا ہے کہ چاند میں کشش ثقل زمین کی نسبت چھ گنا کم ہے کیونکہ یہ زمین سے بہت چھوٹا اور کم وزن ہے۔ چاند کی دنیا میں ہاتھ کی گھڑی کا احساس تک نہ ہوگا لیکن اگر ہم اس گھڑی کو باندھے ہوئے کسی ایسے کرّے پر چلے جائیں جو زمین سے لاکھ گنا بڑا ہو تو اسی معمولی گھڑی کا وزن ڈیڑھ سو من ہو جائیگا اور ہم خود بھی چلنے سے عاری ہو جائیں گے اور گھڑی کے بوجھ سے پس جائیں گے۔

اُس دانا و مہربان احسن الخالقین کی رحمت دیکھیں کہ ہماری زمین نہ تو اتنی وزنی ہے کہ پاؤں تک اٹھانا دشوار اور پانی کا گلاس پندرہ کلو وزنی ہو جائے اور نہ اتنی ہلکی کہ معمولی آندھی سے مکانات تک اُڑ جائیں اور آندھی رکنے پر ہم اڑ گئے ہوئے اپنے بچوں کو دُور دُور تک ڈھونڈتے پھریں۔ سورۃ قمر: ۴۹ میں ہے ''ہم نے ہر چیز کو اندازے سے پیدا کیا ہے''۔ علمائے ہیئت نے ثابت کیا تخلیق زمین و آسمان میں غور و فکر کرنے کے احکام بلاوجہ نہیں، یہی وہ اسباق ہیں جن کے مطالعہ کی بار بار تاکید کی گئی ہے کہ تیز رفتاری سے کشش ثقل میں فرق آجاتا ہے۔ زمین کی موجودہ رفتار اگر بڑھ جائے تو اشیاء کا وزن گھٹ جائے اور ہم لوہے کے منوں وزنی گاڈروں کو بھی باندھ باندھ کر رکھنے پر مجبور ہو جائیں۔ ہوا کو جس قدر سبک بنا دیا گیا ہے اسکے وزن میں اضافہ ہو جائے تو ہمیں چلنا پھرنا اور سانس لینا دوبھر ہو جائے۔

''بیشک ارض و سماء میں اہل ایمان کیلئے (اسکی قدرتِ کاملہ کی) نشانیاں موجود ہیں'' (جاثیہ: ۳)

کواکب

''زہرہ'':: ستارہ ہماری زمین جتنا بڑا ہے' سورج سے روشنی حاصل کرتا ہے اسکی شکل چاند جیسی ہے اور چاند ہی کی طرح گھٹتا بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ سورج کے گرد ایک چکر دوسو پچپن ۲۵۵ یوم میں پورا کرتا ہے۔

''عطارد'':: ستارہ سورج سے تین کروڑ ستر لاکھ میل دُور ہے لیکن ہمیں سورج سے قریب نظر آتا ہے اور سورج سے روشنی حاصل کرتا ہے۔

''مریخ'':: ستارے کی حرکات کچھ عجیب سی ملاحظہ کی گئیں ہیں۔ جاتے جاتے رُک جاتا ہے واپس آجاتا ہے اور پھر اپنا سفر شروع کر دیتا ہے۔ اس کا ایک چکر ۶۸۶ دنوں میں ختم ہوتا ہے۔ اپنے گرد ۲۴ ساعت ۳۷ دقیقہ اور ۲۳ ثانیہ میں گھومتا ہے۔ اسکی سطح پر پانی دیکھا گیا ہے اور اسکے شمالی وجنوبی حصوں میں بڑے بڑے دھبّے نظر آتے ہیں جو کبھی بڑے اور کبھی چھوٹے دکھائی دیتے ہیں۔ علماء کا خیال ہے کہ یہ دھبّے نہیں بلکہ برف ہے جو سرما میں بڑھ جاتی اور گرما میں گھٹ جاتی ہے۔

مشتری نپٹون زحل یورانس:: یہ ستارے ہماری زمین سے بہت بڑے ہیں۔ مشتری زمین سے تیرہ سو گنا بڑا ہے جو اپنے گرد ۹ ساعت ۵۵ دقیقہ اور ۲۱ ثانیہ میں گھومتا ہے اور سُورج کے گرد ایک چکر بارہ سال میں پورا کرتا ہے اس میں گاہے گاہے بادل بھی نظر آتے ہیں۔

۱۔ زمین کا محیط چار کروڑ میٹر اور نصف قطر ۶۳۷۸۴۰۰ میٹر ہے۔ اسکی سطح اکاون کروڑ میٹر ہے اور سطح پر خشکی صرف بارہ کروڑ ساٹھ لاکھ میٹر ہے باقی پانی ہے۔

۲۔ مریخ کا حجم زمین سے چھ گنا کم ہے۔ اسکا ایک سال ۶۸۷ دنوں کا ہوتا ہے۔

۳۔ مشتری زمین سے ۱۳۰۰ گنا بڑا ہے اس کا ایک سال ہمارے بارہ سال کے برابر ہوتا ہے۔ اس کا قطر ایک کھرب چالیس ارب میٹر ہے۔

۴۔ زحل زمین سے ۷۱۸ گنا بڑا ہے' اس کا قطر نو (۹) ارب تیس کروڑ میٹر ہے۔

۵۔ یورانس کو ''ہرشل'' نے ۱۷۸۱ء میں دریافت کیا تھا۔ یہ زمین سے ۲۹ گنا بڑا ہے اور سورج سے دو

ارب میل دُور ہے۔اس کا ایک چکر چوبیس سال میں ختم ہوتا ہے۔

۶۔نیپٹون کا حجم زمین سے ۵۵ حصہ زیادہ ہے اور ایک چکر ۱۶۵ سال میں کاٹتا ہے۔

۷۔چاند کی سطح زمین سے ۱۴ گنا اور حجم اعشاریہ ۵۰ گنا کم ہے۔اس میں چالیس پہاڑ ہیں جن میں سے بعض کی بلندی ۴۸۰۰ میٹر سے زیادہ ہے۔

۸۔آفتاب زمین سے تیرہ لاکھ گنا بڑا ہے اور روشنی کا یہ عالم ہے کہ آٹھ لاکھ (کامل) چاند مل کر ہی دوپہر جتنی روشنی پیدا کر سکتے ہیں۔پھر بھی ہمارے سورج کی روشنی ایک اور آفتاب کی روشنی سے (جو ہم سے ایک سو پچاس کھرب میل دُور ہے) آٹھ لاکھ گنا کم ہے۔

اللہ تعالیٰ کی پُر ہیبت و باعظمت دنیا (اور اسکے قیامِ نظم) پر غور کریں کہ شموس و اقمار کی بھرمار کا کیا عالم ہے پھر بھی کس حیرت انگیز نظم سے اپنے اپنے مداروں پر گھوم رہے ہیں کہ کہیں کوئی بدنظمی نہیں کہیں کوئی تصادم نہیں کوئی کھلبلی نہیں۔سورۃ حج میں انسان کی تسلی کی خاطر فرمان ہوا:۔

وَ یُمۡسِکُ السَّمَآءَ اَنۡ تَقَعَ عَلَی الۡاَرۡضِ اِلَّا بِاِذۡنِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بِالنَّاسِ لَرَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ (حج / ۶۵)

ترجمہ:۔ اللہ نے آسمان کو یوں تھام رکھا کہ وہ بلاحکم زمین پر نہیں گر سکتا بیشک وہ لوگوں پر بڑی مہربان الامہربان ہے (حج/۶۵)

لَا الشَّمۡسُ یَنۡۢبَغِیۡ لَہَاۤ اَنۡ تُدۡرِکَ الۡقَمَرَ وَ لَا الَّیۡلُ سَابِقُ النَّہَارِ ؕ وَ کُلٌّ فِیۡ فَلَکٍ یَّسۡبَحُوۡنَ (یٰس: ۴۰)

ترجمہ:۔ نہ تو سورج چاند کی رفتار میں رکاوٹ پیدا کر سکتا ہے اور نہ لیل و نہار کے سلسلے میں کوئی بدنظمی موجود ہے۔یہ تمام شموس و اقمار نہایت باقاعدگی سے فضا میں تیر رہے ہیں۔(یٰس:۴۰)

یہ آیاتِ قرآنیہ انسان کی توجہ مبذول کروانے کیلئے ہیں کہ وہ ان سے نصیحت پکڑے اور کامیابی کی منازل سے رُوشناس ہو جائے جو اُس مہربان کی اپنی مخلوق سے محبت کی آئینہ دار ہیں۔

دُم دار ستارے

دُم دار ستارے کھربہا تعداد میں آسمان پر موجود ہیں ان کی حرکات کے بارے ہیئت دان ابھی تک تذبذب میں مبتلا ہیں کیونکہ کبھی یہ سورج سے دُور ہٹ جاتے ہیں کبھی قریب آ کر گھومنے لگتے ہیں۔ انکی رفتار سورج کے قریب دوسو میل فی ثانیہ تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ ستارے کسی شفاف مادے سے بنے ہوئے ہیں کیونکہ نظر ان سے گزر کر اُن ستاروں کو بھی دیکھ لیتی ہے جو اُن کی آڑ میں چھپے ہوتے ہیں۔ ان کی دکھائی دینے والی دُم اصل میں اُن ستاروں کے ماہ تکوینی کے بخارات ہیں جو تپش آفتاب سے نکلتے ہیں۔ جوں ہی یہ سورج سے دُور ہٹتے ہیں تو دُم غائب ہو جاتی ہے۔

شہاب

یہ چھوٹا سا بے نور ستارہ ہے اس میں سورج سے روشنی حاصل کرنے کی استعداد نہیں ہوتی۔ جب یہ چلتے چلتے یا پھینکے جانے پر زمین کے قریب آ جاتا ہے تو کشش ثقل کے باعث زمین اسے اپنی طرف کھینچتی ہے نتیجہ میں اسکی رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے اور کرّۂ ہوا میں موجود خاکی ذرّات سے رگڑ کھا کر گرم ہوتا ہوا مشتعل ہو کر جلنے لگتا ہے پھر گیسی صورت میں تبدیل ہو کر ہوا میں گم ہو جاتا ہے۔ شہابی ستارے بہت چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں جو صرف گرتے وقت نظر آتے ہیں' گرتے وقت انکی رفتار بارہ ہزار میل فی دقیقہ تک بھی ہو جاتی ہے۔ یعنی عام بندوق کی گولی سے سو گنا زیادہ اور اس رفتار سے یہ زمین کے گرد صرف اڑھائی گھنٹے میں چکر کاٹ سکتے ہیں۔ سورۃ ملک میں اس رمز کی وضاحت آ رہی ہے۔

غور کریں' اگر شہابیوں کی رفتار کم ہوتی تو ہم پر دن رات پتھروں کی بارش ہوتی رہتی اس لئے کہ سینکڑوں شہاب روزانہ ٹوٹ کر گرتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا کمالِ کرم ہے کہ ہمیں اس مصیبت سے محفوظ رکھا ہوا ہے اور ہمیں اس مہربانی کا احساس تک نہیں ہوتا۔

اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یُّرْسِلَ عَلَیْکُمْ حَاصِبًا ؕ فَسَتَعْلَمُوْنَ کَیْفَ نَذِیْرِ

(الملک:۱۷)

ترجمہ:۔تم اُس سے نڈر ہو گئے ہو جو آسمان پر ہے اگر وہ تم پر پتھر برسانا شروع کر دے تو تمہیں معلوم ہو جائے کہ عذاب سے ڈرانا کیا ہوتا ہے (الملک:۱۷)

کبھی کبھی یہ شہاب زمین پر گر بھی پڑتے ہیں۔۲۱ ستمبر ۱۸۷۶ء کو ایک شہاب زمین سے ایک سو اسّی میل اوپر پھٹا تو اسکے ٹکڑے ہزار میل تک دوڑتے ہوئے شکاگو اور سینٹ لوئی کے درمیان جا کر گرے۔جس سے چھوٹے چھوٹے انگنت ستارے نکل کر کچھ فاصلے پر غائب ہو گئے۔اسکے پھٹنے سے ایک زبردست آواز بھی پیدا ہوئی جو پندرہ منٹ بعد زمین پر پہنچی۔

علومِ فلسفہ و منطق کے گرویدہ چند سر پھرے مسلمان بھی یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں کہ یہ قیامت وغیرہ مولویوں کے گھڑے ہوئے قصے ہیں۔مرنے کے بعد سوائے خاک میں خاک ہو جانے کے اور کچھ بھی نہیں۔ان جاہلوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس فضائے آسمانی میں ہماری زمین سے لاکھوں گنا بڑی بیشمار زمینیں اپنے اپنے مداروں میں گھوم رہی ہیں۔کروڑوں شموس و اقمار سامنے موجود اور لاتعداد زمینیں عدسۂ چشم سے ماوراُ سرگرم پرواز ہیں۔ہر طرف ایک مبہوت کن سلسلۂ تخلیق تا حال موجود و جاری ہے' تو جس احسن الخالقین نے یہ دنیائیں بنائیں' تم کو خلق کر کے عدم سے وجود میں لایا کیا وہ ان سب کو نابود کرنے پر قادر نہیں یا تمہیں مرے بعد اٹھانے کی قدرت سے محروم ہے؟....حیرت ہے آپ کو اپنے پیدا کرنے والے کی صناعی و تخلیق اور قوت و قدرت پر اتنا بھی اعتماد نہیں۔

بُعدِ نجوم

زمین سے ستاروں کا فاصلہ ناپنے کیلئے ہمارے سال و ماہ کے پیمانے ناکافی ہیں اسلئے علمائے ہیئت نے ''نوری سال'' کی اصطلاح وضع کی۔(نوری سال کا تعارف گزشتہ صفحات میں بھی عرض کر چکا ہوں کہ روشنی ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل سفر کرتی ہے وہ ایک دن میں کتنا سفر کریگی اور ایک سال میں کہاں تک پہنچے گی' یوں اس کا نوری سال پورا ہوگا) انسان ایک سیکنڈ میں ایک قدم چلتا ہے مگر روشنی ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل طے کرتی ہے۔یعنی روشنی کا ایک ثانیہ ہمارے ۵۳ سال کے برابر ہے۔شہاب کی رفتار گولی سے سو گنا زیادہ ہے اور روشنی کی رفتار شہاب سے دس ہزار گنا

تیز ہے۔ گویا یہ روشنی قریب ترین ستارے سے تین سال کے بعد ہم تک پہنچ سکتی ہے۔ دیکھنا چونکہ روشنی سے ہوسکتا ہے اسلئے اس ستارے کی جو حالت ہم آج دیکھ رہے ہیں وہ تین سال پہلے کی ہے۔ بہ الفاظ دیگر اگر ہم اُڑ کر اس ستارے پر جا بیٹھیں تو ہمیں زمین کے محض وہ واقعات نظر آئیں گے جو یہاں تین سال پہلے ہو چکے ہونگے۔ یعنی اگر یہ ستارہ آج مٹ کر ختم ہو جائے تو زمین سے ہمیں تین سال تک چمکتا نظر آتا رہے گا۔ تاہم بعض ستارے ایسے بھی ہیں جن کی روشنی ابتدائے عالم سے ابھی تک ہمارے ہاں نہیں پہنچی۔ بعض ستارے پیدا ہو کر مٹ بھی چکے ہیں مگر انکی روشنی کا ہیئت دانوں کو ابھی تک انتظار ہے۔

شعرائے کی روشنی نو (۹) نوری سال میں' نسر اطائر کی چودہ سال میں' نسر الواقع کی چالیس سال میں' عیوق ستارے کی بتیس سال میں اور سماک رامح کی پچاس سالِ نوری میں زمین تک پہنچتی ہے۔ بہ لحاظِ رنگ بعض ستارے سفید' بعض سنہرے' بعض سبز' بعض نیلے اور بعض سُرخ ہیں اور تقریباً اُسی مادے سے تیار ہوئے جس سے ہماری زمین بنی تھی۔ بعض ستارے سورج سے سولہ لاکھ گنا زیادہ روشن ہیں اور ان کا قطر چالیس کروڑ میل ہے۔

آسمانوں میں کس قدر مہیب دنیائیں کس توازن سے چکر کاٹ رہی اور کتنے بڑے بڑے کرّے لاکھوں میل فی گھنٹہ کی رفتار سے محوِ پرواز ہیں۔ جب ہم ان دنیاؤں پر ایک سرسری سی بھی نگاہ ڈالتے ہیں تو اپنی بے مقدار زمین اور اپنی بے مقدار سی ہستی کا ایک زبردست احساس پیدا ہوتا ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ اُس خالقِ ارض وسماء کو انسانوں سے اتنی محبت' کہ وہ انسانی ھدایت کیلئے اس قدر پیغمبر اور کس قدر راہنماؤں رہبر بھیجتا رہا۔ اِدھر انسان کو دیکھو کہ اِن دنیاؤں کے آگے اسکی ہستی ایک حقیر کیڑے سے زیادہ نہیں' نافرمانی و بدعملی میں پاؤں سے چوٹی تک ڈوبا ہوا ہے پھر بھی خدا کا پیارا اور لاڈلا ہونے کے گھمنڈ کا شکار ہے۔ در بدر مانگتا پھرتا ہے لیکن جنت کے ٹھیکیدار ہونے کے پندھار کا حامل ہے۔ اندرونی و بیرونی گندگیوں سے اٹا پڑا یہ انسان مسکنت و ذلّت کا مجسمہ بن چکا ہے لیکن تقدّس و پاکبازی کا دعویٰ ہانکتا ہے۔ ایسے انسان کو کیا معلوم کہ جس صاحب عظمت و جبروت کے ہاں فضاؤں میں زمین جیسی کروڑہا دنیائیں گھومتی پھر رہی ہیں وہاں ایک نافرمان انسان جیسے کسی کیڑے کی حیثیت ہی کیا ہے۔ پھر

یہ نشہ کیوں؟ یہ ضد اور غرور و پندار کیسا۔؟

اے نادان! یاد رکھ کہ تیرے ماننے یا نہ ماننے سے اسکی شانِ والا میں رائی کے کروڑویں حصے برابر بھی کمی واقع نہیں ہوتی اور فراموش نہ کر کہ ضدی بد بخت ہی خسارہ میں رہنے والے ہیں۔اس کائنات میں ظاہر و موجود یہ صحرا و پہاڑ یہ لاتعداد مخلوقاتِ ارضی و سماوی یہ خلأ میں مستعمل اُس کا مخفی نظام کوئی کھیل تماشا نہیں' بلکہ جن و بشر کیلئے غور و فکر اور نصیحت و عبرت کی آیات ہیں جس سے کائنات کا ذرّہ ذرّہ اٹا پڑا ہے۔جیسا کہ سورۃ دخان میں فرمان ہے:۔

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ (دخان:۳۸)

ترجمہ:۔ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ انکے درمیان ہے محض کھیل تماشے کیلئے پیدا نہیں کیا (دخان:۳۸)

اب میں مضمونِ فلکیات کو ان الفاظ کے ساتھ بند کرتا ہوں کہ ہماری زمین سے لاکھوں گنا بڑے کروڑوں کرّے فضا میں چکر کاٹ رہے ہیں۔اس بارے میں ہمارا علم تا حال بہت محدود ہے اور اِن دنیاؤں کے اسرار و سربستہ راز دریافت کرنے میں انسان کو ابھی اور کتنی صدیاں درکار ہیں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔تاہم ہم اُس قہار و جبار کی قدرت و سلطنت پر ناز کرتے ہیں۔

مبیّنہ تفصیلات کے بعد بھی اگر ہمارے اذہان اُس احسن الخالقین کے جلال و عظمت سے متأثر نہ ہوئے ہوں تو یہ ہمارے اندر کسی ہولناک خامی کی نشاندہی ہے۔خدا کو ہم مانتے ہی نہیں کہ اس سے مدد طلب کریں' پس اپنی سیاہ بختی پر ماتم کرنے کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ کار نہیں۔

مجھے اس بات کا دکھ الگ ہے جہاں ایک طرف انسان خالق کائنات کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں وہاں انسان ہی نے سینکڑوں خداؤں کو اپنے ہاتھوں جنم بھی دے ڈالا۔صائبین نے سورج کو خدا تسلیم کیا۔زرتشتوں نے موسیٰ علیہ السلام کی طرح آگ میں الٰہی تجلیاں دیکھیں۔صوفیائے کرام کو ہر پھول ایک گلستاں نظر آیا۔شیدایانِ ویدانت یوگیوں اور ملنگوں نے ہر ذرّے میں صحرا کا تماشہ دیکھا۔الغرض اس حسین دنیا میں ہر سُو انوار و تجلّیات کے وہ وہ حیرت انگیز مناظر موجود ہیں کہ ہر چیز پر مظہرِ خدا ہونے کا

دھوکہ لگتا ہے اور انسان ایسے دھوکے کھانے کا شوقین رہا ہے۔

انسان زمانۂ ماضی سے ایسی الجھنوں کا شکار چلا آ رہا ہے اور پے در پے پیغمبران کے مبعوث فرمائے جانے کا مقصد بھی ایسی گمراہیوں سے اسے محتاط و متنبہ کرنا تھا۔ یوں بھی بچے تو ہر چیز کو دیکھ کر اسے پانے کی ضد کرتے ہیں۔ نافع اور مضر تو ان کے متولیوں کو دیکھنا ہوتا ہے کہ بچوں کیلئے کون سی چیز درست و مفید ہے اور کون سی نہیں۔ اسی طرح اگر ہماری انگلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں نہ ہوتی تو ہم بھی نادان بچوں کی طرح ہر چیز کی پرستش پر اُتر آتے۔ تمام پیغمبران نے بہ بانگِ دہل یہ اعلان کیا تھا کہ دیکھو کہیں ان مناظر میں الجھ کر گمراہی کا شکار نہ ہو جانا۔ تمہارا معبود صرف وہ قادر و برتر ہے جو اِن کھلونوں کا خالق ہے اور یہ تمام مناظر تمہارے غلام و مطیع ہیں نہ کہ معبود و مسجود۔

کچھ لوگوں کی جانب سے گائے کو ماتا قرار دینا' ناگ کو دیوتا کا درجہ دیدینا' یا ہاتھی کو بھگوان تصور کر لینا جیسے عقائد یقیناً گمراہی کی پیداوار ہیں جو کہ چاند سورج ستارہ فرشتہ اور آتش پرستی کی طرح صریحاً شرکیہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق (بمعہ فرشتگان' درند' چرند و پرند' ہوا اور باراں وغیرہ تو سب) انسان کی خدمت پر مقرر ہے اور اگر بیچارہ ناقص العقل انسان اپنے خالق کو پس پشت چھوڑ کر اپنے ہی خدمت گزاروں کی پوجا پاٹ میں لگ جائے تو نہایت حیرت کی بات ہے۔ تو آیئے دیکھیں کہ حیوانات کو عطا فرمائے گئے خصائل و خواص کیا ہیں اور یہ انسان کی خدمت پر کیونکر مقرر ہیں۔

عالم حیوانات

اقسام حیوانات

اونٹ:۔ اونٹ ایک ریگستانی جانور ہے جہاں دُور دُور تک پانی دکھائی نہیں دیتا۔ سطح زمین ایسی کہ چلتے ہوئے کوئی بھی نوکیلی چیز آسانی سے اس میں دھنس جائے۔ خالق تعالیٰ کی حکمت وقدرت ملاحظہ ہو کہ اونٹ کو گول چوڑے پاؤں دیئے تا کہ ریت میں دھنسنے سے محفوظ رہیں۔ اس کو لمبی ٹانگیں عطا کیں کہ تھوڑی بہت اگر ریت میں چبھ بھی جائیں تو اس کو تھکاوٹ نہ ہو اور اسکی رفتار میں کمی نہ آئے۔ لمبی گردن دی تا کہ زمین اور درختوں ہر دو جگہ سے اپنی غذا با آسانی حاصل کر سکے۔ اسکی کوہان کو پانی اور چربی کا سٹور اور اتنی مقدار جمع رکھنے کے قابل بنایا کہ چار ہفتوں تک بے آب وخوراک سفر کر سکے۔ بلکہ ایسے کسی سفر میں شتر بان بھی بے توشہ ہو جائے تو ناقہ کا دودھ پی سکے۔ اونٹ کی غذا بھی تمام وہ جنگلی پودے درخت اور ایسی جھاڑیاں رکھیں جنہیں دوسرے جانور عموماً چھوتے بھی نہیں۔ اسے سخت مُنہ دیا کہ بیابانوں میں جنگلی کیکر تک چبا سکے۔ بھاری بوجھ اٹھانے کی طاقت دی کہ صحراؤں میں سامانِ تجارت کی نقل وحمل آسانی سے کر سکے۔ کوہان کے پاس شتر بان کے بیٹھنے کی جگہ بنادی کہ شتر بان کو پیدل ریت میں چلنا نہ پڑے۔

طبعًا اونٹ کو مطیع وفرمانبردار بنادیا کہ انسان صحیح معنوں میں اس سے استفادہ کر سکے۔ اس میں ایک خاصیت یہ رکھی کہ ریگستانی بے نشان راہوں میں کسی راستہ کا ایک دفعہ سفر کر لے تو اسے برسوں یاد رکھتا ہے خواہ نشانِ راہ مٹ چکا ہو۔ اونٹ کے اِنہی عجائبات کے بارے قرآن نے فرمایا:۔

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ (الغاشیہ:۱۷)

''کیا تم دیکھتے نہیں کہ اونٹ کو کیسا بنایا گیا''۔ (غاشیہ:۱۷)

عام معمول ہے کہ بھڑ کے قریب جاؤ تو ڈنک لگاتی ہے' چوہے کو ہاتھ میں پکڑو تو کاٹتا ہے' بھیڑیے پر سواری ممکن نہیں' حالانکہ گھوڑے سے کہیں چھوٹا ہوتا ہے اسی طرح اونٹ کسی وقت باغی ہو جائے تو دشمن کو گھٹنوں کے نیچے رگید ڈالتا ہے۔ دیگر پالتو جانوروں کا بھی یہی حال ہے۔ کتا' گائے' بیل بھینسا وغیرہ بھی سرکش ہو جائیں تو گھروں کو آناً فاناً تہس نہس کر ڈالتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی یہ کس قدر مہربانی ہے کہ اونٹ گھوڑے بیل بھینس اور ہاتھی جیسے شہ زور قوی ہیکل حیوان ہمارے اشارۂ نگاہ کے مطابق کام میں جُتے ہوئے ہیں۔ ہمارے بوجھ اٹھا رہے ہیں بطور سواری صحراؤں ریگستانوں میں لئے پھرتے ہیں اور اُف تک نہیں کرتے۔

پھر گائے اور بھینسیں تو گویا دودھ کی مشینیں ہیں چاندی کی طرح شفاف دودھ کی نہریں تھنوں سے جاری ہیں۔ کیا یہ سب ہماری علمیت یا کاری گری کی بناء پر ہو رہا ہے یا یہ نظام بھی اتفاقاً اور حادثاتی طور پر وقوع پذیر ہو گیا ہے؟۔ اس ضمن میں قرآن نے سورۃ یٰس میں فرمایا:۔

اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اَنَّا خَلَقۡنَا لَهُمۡ مِّمَّا عَمِلَتۡ اَیۡدِیۡنَاۤ اَنۡعَامًا فَهُمۡ لَهَا مٰلِكُوۡنَ (۷۱) وَ ذَلَّلۡنٰهَا لَهُمۡ فَمِنۡهَا رَكُوۡبُهُمۡ وَ مِنۡهَا یَاۡكُلُوۡنَ (۷۲) وَ لَهُمۡ فِیۡهَا مَنَافِعُ وَ مَشَارِبُ ؕ اَفَلَا یَشۡكُرُوۡنَ (یٰس: ۷۳)

ترجمہ:۔ کیا دیکھتے نہیں کہ حیوانات ہم نے پیدا کئے لیکن مالک یہ بنے ہوئے ہیں ہم نے (اونٹ گھوڑے ہاتھی گائے بھینس وغیرہ جیسے) چوپاؤں کو انکا یوں مطیع کر دیا کہ وہ انہیں سواری میں اور کھانے میں استعمال کرتے ہیں اور ان چوپاؤں (کے بالوں' چمڑوں' ہڈیوں اور گوبر وغیرہ) میں کس قدر فوائد اور پینے کیلئے دودھ مہیا کرتے ہیں' کیا وہ اب بھی ناشکرے رہیں گے (یٰس: ۷۱ تا ۷۳)

یوں تو حیوانات کی لاتعداد مختلف اقسام ہیں' ماہرین علوم نے وحوش و طیور سمیت حشرات الارض کو بھی حیوانات کی مد میں شامل کیا ہے جن کا فرداً فرداً ذکر بہت سی ضخیم کتب کا متقاضی ہے۔ چنانچہ بخوفِ طوالت چند اہم نقاط پر نظر دوڑاتے ہوئے مضمون ھٰذا کو مختصر کرونگا۔

حشراتی حیوانات میں سے بعض ایسے ہیں جن میں صرف لمس کی حس ہے۔ مثلاً اصداف' دلدلی جراثیم اور بطونِ حیوانات کے کیڑے۔ بعض میں صرف ذوق اور لمس ہے جیسے پھلوں اور پھولوں پر پلنے والے کیڑے۔ بعض حشرات میں تین حواس ہیں لمس' ذوق اور شمّ (سونگھنا) مثلاً وہ حیوانات جو سمندروں کی گہرائی یا تاریک مقامات پر پلتے ہیں۔ بعض میں چار حواس ہیں اور صرف بصر سے محروم ہیں مثلاً تاریک غاروں میں بسنے والے حیوانات جو روشنی نہ ہونے کی بنا پر دیکھنے سے بے نصیب رہتے ہیں۔ پانچوں خواص (حواسِ خمسہ) رکھنے والے حیوانات سے تو سبھی واقف ہیں۔ قدرت کا کمالِ انصاف یہ ہے کہ کسرِ خواص کے حاملین تمام جانور بھی اپنی تخلیق میں مکمل ہیں۔

خوردبینی اجرام (protozoa)

یہ حیوانات صرف ایک خُلیہ سے بنے ہیں اور سب سے پہلے یہی عالمِ وجود میں آئے تھے۔ اِن جانوروں کے خول اُن پہاڑوں سے دستیاب ہوئے ہیں جو لاکھوں سال پانی کے نیچے رہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ یہ ابتدائی کیڑے موجودہ ارتقاً یافتہ انواع کے آباؤ اجداد تھے۔ بہت سے پتھر خصوصاً چونے کے پتھر ان ہی جانوروں سے تیار ہوئے۔ اہرامِ مصر پر ان جانوروں کی کئی انچ موٹی تہیں ملتی ہیں۔ ملیریا وغیرہ امراض ان ہی اجرام کی بدولت پیدا ہوتے ہیں۔ بہت چھوٹے خوردبینی اجرام اپنی نسل کی حفاظت مختلف طریقوں سے کرتے ہیں۔ سب سے بڑا طریقہ ایک گھنٹے میں لاکھوں بچوں کی پیدائش ہے۔ جیسے ہیضہ کا جرثومہ ایک دن میں کئی کروڑ بچے پیدا کرتا ہے تاکہ تباہی کے بعد بھی کچھ نہ کچھ بچ رہیں۔

مچھروں کی طرح یہ بھی سبزیوں کے نیچے اور گندے پانی کے جوہڑوں میں پناہ لیتے ہیں۔ بعض حیوانات چلتے نہیں لوٹتے ہیں۔ بعض سرکتے ہیں جیسے اصداف' بعض پیٹ کے بل رینگتے ہیں جیسے سانپ' بعض دوڑتے ہیں مثلاً چوہا' بعض دو پروں سے اُڑتے ہیں بعض چار پروں سے مثلاً ٹڈی۔ بعض کے دو پاؤں ہوتے ہیں بعض کے چار بعض کے چھ یا آٹھ یہاں تک کہ ہزار پاؤں والے جانور بھی موجود ہیں۔ نہ صرف یہ حیوانات وحشرات بلکہ تمام جانور و جاندار مخلوق پانی ہی سے پیدا ہوئی اور انکی

زندگیاں بھی پانی کے بغیر تلف ہیں۔قدرت عظمیٰ کا کمال ہے کہ نباتات کی مانند حیوانات کی بھی لاکھوں انواع بنائیں اور ہر نوع کے افراد لامتناہی تعداد میں پیدا کئے۔ ہر نوع کا رنگ، شکل، ہیئت وغیرہ دوسری انواع سے مختلف رکھی۔کروڑہا گائے بھینسیں، گھوڑے، بکرے وغیرہ ایک ہی جگہ پلتے ہیں مگر یک رنگ و یک صورت ہونے کے باوجود انکے مالکان انہیں الگ سے یوں شناخت کر لیتے ہیں جیسے انسان اربوں کھربوں کی تعداد میں ہوتے ہوئے بھی فرداً فرداً شناخت کیا جاسکتا ہے۔سورۃ نور میں ہے:۔

وَ اللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰۤى اَرْبَعٍ ؕ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۴۵) لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ؕ وَ اللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (النور: ۴۶)

ترجمہ:۔اللہ نے ہر (جانور) چوپائے کو پانی سے پیدا کیا پھر ان میں سے بعض پیٹ کے بل چلتے ہیں بعض دو اور بعض چار پاؤں سے چلتے ہیں اللہ جو چاہے پیدا کرتا ہے وہ (اس قسم کے تنوع اور اختلاف پر اور) ہر چیز پر قادر ہے (النور: ۴۵) تحقیق ہم نے کھلی روشن واضح آیتیں نازل کیں ہیں اور یہ اللہ جس کو ھدایت دینا چاہے اسے سیدھا راستہ دکھاتا ہے (النور: ۴۶)

جانوروں میں خود اعتمادی

جنگلی جانور اپنی حفاظت خود کرتے ہیں اس لئے چست و چالاک، تیز و تند رست درّاک اور حیلہ باز ہوتے ہیں۔لیکن گائے، بھینس گدھے وغیرہ کی حفاظت کا ذمہ انسان نے لیا ہوا ہے اس لئے یہ سستی کے مارے کاہل اور بھدّے ہوتے ہیں۔ یہ کلیہ قاعدہ ہے کہ جو قومیں اپنے قواء کو استعمال نہیں کرتیں اللہ تعالیٰ ایسی اقوام کو قوائے عمل سے محروم کر دیتا ہے۔مسلمانوں کو بھی آجکل انہی حالات سے سابقہ ہے اس اندھی بہری قوم نے بھی جب قوائے مفکّرہ کا استعمال چھوڑ کر اپنی ذمہ داری اغیار پر چھوڑ دی تو اللہ تعالیٰ نے اس سے وہ قوتیں ہی چھین لیں جو دنیا کو انگنت فوائد سے مستفید کر سکتی تھیں۔

حیوانوں کی غذا چونکہ دنیا میں ہر سو پھیلی ہوئی ہے اس لئے وہ چلتے بیٹھتے اڑتے پھرتے اپنی

خوراک کی تلاش میں کامیاب رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر کسی کو وہی خصوصیات عطا کیں جن کی انہیں ضرورت تھی۔ مثلاً سپنج ایک ایسا جانور ہے جو اپنے مقام کو نہیں چھوڑتا اس لئے کہ اسکی غذا وہیں پر مہیا ہے۔ سمندری سکرٹ (Sea squirt) اپنی غذا کیلئے صرف اتنا کشٹ اٹھاتا ہے کہ اپنا منہ خول سے باہر نکالتا ہے اور بس۔ حالات کے مطابق مختلف حیوانوں کی حرکات مختلف ہیں۔ بعض دِن کو سوتے ہیں اور رات کو باہر نکلتے ہیں۔ بعض جانور (کیڑے وغیرہ) سخت سردی اور گرمی میں مکانوں کی چھتوں اور سوراخوں میں مہینوں نہاں رہتے ہیں اور مرتے نہیں۔ جوہڑوں میں رہنے والے مینڈک جوہڑ خشک ہوجانے پر زمین کی ایک تہہ سے چپک جاتے ہیں اور مہینوں بعد برسات میں باہر نکل آتے ہیں۔ مہینوں اور بسا اوقات برسوں بغیر غذا کے زندہ رہنا احسن الخالقین کا بہت بڑا معجزہ ہے۔

جن جانوروں کی غذا سہل الحصول اور زیادہ ہوتی ہے وہ موٹے اور بھدّے بن جاتے ہیں مثلاً ہاتھی، بھینسا، مینڈک وغیرہ۔ وجہ یہ ہے کہ انہیں تلاشِ غذا کیلئے دوڑ دھوپ کم کرنا پڑتی ہے اور ان کے دشمن بھی کم ہوتے ہیں۔ ہرن کی خوراک تو ہر جگہ بہ افراط ہے لیکن اسکے دشمن اس قدر زیادہ ہیں کہ معمولی سی آہٹ پر اسے میلوں بھاگنا پڑتا ہے اس لئے بیحد پھرتیلا اور چست ہوتا ہے۔ مینڈک کے دشمن خشکی پر کم رہتے ہیں اس لئے پانی کی نسبت خشکی پر اس کی رفتار بہت سست ہوتی ہے۔ خشکی پر اسے صرف کچھ سانپوں کا خطرہ ہوتا ہے اسلئے اللہ تعالیٰ نے اسے کودنے کی صلاحیت عطا فرمادی کہ رینگتے ہوئے سانپ سے اپنی حفاظت کر سکے۔ پالتو حیوانات کی اوسطاً عمریں کچھ یوں قیاس کی گئی ہیں کہ کچھوا سو سال، مچھلیاں ۱۵۰ سال، عقاب ۱۱۸ سال، کتا ۳۵ سال، گھوڑا ۴۰ سال، گائے ۲۵ سال، بلی ۴۰ سال، مرغی ۳۰ سال، بطخ ۷۵ سال، اور مگر مچھ ۴۰ سال تک زندہ رہ سکتا ہے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں دیہات میں موٹی موٹی گائیں اور بیل نظر آتے ہیں جنہیں ہندو متبرک سمجھ کر روغنی غذا کھلاتے رہتے ہیں اور اُن سے کوئی مشقت نہیں لی جاتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں چلنا تک گراں ہوجاتا ہے۔ خاندانِ عباسیہ اور ماضی قریب میں مغلیہ خاندان کے آخری فرمانروا بھی بے حد کاہل اور سست ہو چکے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں بیکار و نااہل ہوجانے کی بناء پر تخت و تاج سے ہٹا کر دنیا سے رخصت کر دیا۔

حشرات الارض

چیونٹی

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں ایک پوری سورۃ (نمل) چیونٹیوں کے نام سے نازل فرمائی ہے۔ چیونٹی کا ذکر فرما کر ہماری توجہ کس طرف دلائی گئی ہے اسے سمجھنے کیلئے ہمیں اس بے مقدار کیڑے کے اعمال پر غور کرنا ہوگا۔

شیر اپنی طاقت اور دلیری کے باعث شاہِ حیوانات کہلاتا ہے لیکن اگر عقل و دانش اور نظام چلانے کی بناء پر بادشاہ کا انتخاب کرنا ہوتا تو یقیناً چیونٹی اس عہدہ کی حق دار تھی۔ چیونٹیاں بڑی سمجھدار اور دانشمند ہوتی ہیں ۔ یہ جماعتیں بناتی ہیں' غذا کے ذخیرے جمع کرتی ہیں' معماری' بخاری' سپاہ گری' کاشتکاری اور غلام گیری کے فرائض نہایت عقل مندی سے سرانجام دیتی ہیں۔ ہر بل میں چار قسم کی چیونٹیاں ہوتی ہیں' ملک' ملکہ' مزدُور اور سپاہی۔ مزدُور تعداد میں زیادہ ہوتے ہیں اور سپاہی جسمانیت میں بڑے ہوتے ہیں۔ ملک و ملکہ دونوں کے پَر ہوتے ہیں اور ملکہ بادشاہ سے قدرے موٹی ہوتی ہے۔

حواسِ خمسہ کے علاوہ ہر چیونٹی کے چار جبڑے' انتڑیاں' دُم میں ایک چھوٹا سا ڈنک' پاس ہی زہر کی ایک تھیلی اور پہلوؤں میں سانس لینے کیلئے دو سوراخ ہوتے ہیں۔ ہوا سوراخوں سے داخل ہو کر بے شمار نالیوں میں چلی جاتی ہے ان نالیوں کا جال چیونٹی کے جسم میں اس طرح بچھا ہوتا ہے جس طرح کسی پتّے میں رگیں۔

چیونٹی کا گھر (بل) پندرہ سے بیس فٹ گہرا ہوتا ہے۔ اندر فن تعمیر کا حیرت انگیز کمال دکھائی دیتا ہے۔ سب سے نیچے کچھ کمرے' اُوپر بالا خانے' گیلریاں اور ملاقات و مشورہ کے ہال مٹی کے ستونوں پر بنے نظر آتے ہیں۔ چیونٹی کی اسی صناعی سے متاثر ہو کر حضرت سلیمانؑ نے ایک شخص کو فرمایا تھا:۔

''چیونٹی کے پاس جا اسکے اعمال کا مطالعہ کر اور دانا بن''

المانیہ کے ملک الشعرا گوئٹے نے کہا:

''محنت صبر اور استقلال سے انسان کی تکمیل ہوتی ہے اور یہ ہر تین صفات چیونٹی میں پائی جاتی ہیں''

عمل تولید و تربیتِ نمل

ملکہ بل میں اِدھر اُدھر انڈے ڈال دیتی ہے' مزدوروں کی جماعت ان انڈوں کو اکٹھا کر کے ایک محفوظ کونے میں رکھ دیتی ہے۔ ان کی تربیت پر دائیاں مقرر ہو جاتی ہیں اور جب بچے نکل آتے ہیں تو آغاز میں انہیں ہضم شدہ غذا کھلائی جاتی ہے۔ بلحاظ عمر اُن تمام بچوں کو ترتیب سے ایک قطار میں رکھ دیا جاتا ہے۔ یہ انہیں تھپکاتی' چاٹتی اور نہلاتی ہیں۔ اگر بل پر کوئی دشمن حملہ کر دے تو ان بچوں کو محفوظ مقام پر لے جاتی ہیں اور اگر بارش وغیرہ سے بھیگ جائیں تو انہیں دھوپ میں لیجا کر سکھاتی ہیں۔

کاشت کاری

چیونٹیاں بل کے قریب بعض غلّے بو دیتی ہیں جب فصل پک جاتی ہے تو اٹھا کر بل میں لیجاتی ہیں۔ بعض پودوں کا رس نکال کر لے آتی ہیں کچھ تو پی لیتی ہیں اور باقی ماندہ رس مردہ چیونٹیوں کے جسم میں بھر دیتی ہیں تا کہ بوقت ضرورت استعمال کر سکیں۔

ملکہ و ملک ہر دو بہت سست اور عیاش ہوتے ہیں' اگر دوسری (مزدور) چیونٹیاں انہیں کھانے کیلئے غذا لا کر نہ دیں تو یہ بھوک سے مر جائیں مگر خود تلاش غذا کیلئے کبھی کوشش نہ کریں۔ سپاہی چیونٹیوں کا گزارہ اپنے شکار پر ہوتا ہے۔ یہ عادت میں افریقہ کے وحشیوں سے ملتی جلتی ہیں کہ جنگ کیلئے ہر وقت تیار رہتی ہیں اور تلاشِ غذا میں کسی کی دست نگر نہیں بنتیں۔

چیونٹیاں ایک مادہ مکوڑے ''افس'' کو پکڑ لاتی ہیں کسی کیمیائی عمل سے اس کی تربیت کرتی ہیں یہانتک کہ اسکے تھنوں سے جو سرین پر بنے ہوتے ہیں دودھ بہنے لگتا ہے جسے یہ نہایت شوق سے پیتی ہیں۔ جب افس انڈے دیتی ہے تو چیونٹیاں انکی بھی پرورش کرتی ہیں۔ کچھ چھوٹے چھوٹے حشرات انکے بلوں کے پاس گھومتے دکھائی دیتے ہیں چیونٹیاں ان سے ایسے کھیلتی ہیں جیسے ہم بلیوں سے۔

عجائباتِ نمل

۱۔ چیونٹیوں کی ہزار سے زائد اقسام ہیں۔

۲۔ چیونٹیوں کی اوسطاً عمر سات سال ہوتی ہے۔

۳۔ اگر مختلف بلوں کی چیونٹیاں سیلاب وغیرہ میں پھنس جائیں تو ہر بل کی چیونٹیاں اپنے ساتھیوں کو سونگھ کر پہچان لیتی اور اٹھا کر اپنے بلوں کو چل دیتی ہیں۔

۴۔ یہ بعض حشرات کو پکڑ کر لاتی ہیں' مشورے کے بعد بچوں کو تربیت کیلئے رکھ لیتی اور بڑوں کو چھوڑ دیتی ہیں' اسلئے کہ بچے ہر سانچے میں ڈھل جاتے ہیں اور بڑے آخر تک سرکش رہتے ہیں۔

۵۔ چیونٹیاں بعض درختوں کے پتے اٹھالاتی اور انہیں بھگو کر بطورِ فرش گھر میں بچھالیتی ہیں۔

۶۔ چیونٹی اپنے وزن سے تین سو گنا زیادہ بوجھ اٹھا سکتی ہے۔

۷۔ اگر کوئی چیونٹی زخمی ہو جائے تو دوسری اپنے لعاب کو کسی کیمیائی عمل سے دھاگے کی شکل میں بدل دیتی ہے اور اس سے زخم کو سی دیتی ہے۔

۸۔ اگر کوئی چیونٹی مر جائے تو پہلے اس کا باقاعدہ جنازہ اٹھتا ہے اور پھر پوری رسوم کے ساتھ دفن کی جاتی ہے۔

۹۔ چیونٹی کی آنکھ دراصل دو سو آنکھوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ بعض حشرات ایسے بھی ہیں جن کی آنکھیں ستائیس سو آنکھوں سے مرکب ہوتی ہیں۔

۱۰۔ چیونٹیاں اپنا بل بناتے ہوئے اتنی جگہ سے تمام ریت مٹی وغیرہ باہر نکال پھینکتی ہیں جتنی جگہ انکو اپنے کمرے وغیرہ بنانے کیلئے درکار ہوتی ہے۔

آپ نے غور فرمایا ہوگا کہ خالقِ کائنات نے حشرات الارض کو کن کن خصائل سے نوازا ہے۔ ایک مہین سی مخلوق (چیونٹی) میں کیسا نظام مرتب فرما رکھا ہے کہ اسکے چھوٹے سے جسم میں کاملیت کوٹ کوٹ کر بھر رکھی ہے۔ جسم میں چھوٹی چھوٹی رگیں ہیں جن میں خون دوڑ رہا ہے۔ ایک چھوٹا سا پیٹ ہے جس میں غذا جا رہی ہے اور پورا نظام ہضم کام کر رہا ہے۔ اسکی ذہانت کے تو آپ قائل ہو ہی گئے ہونگے

گویا ایک ذہین دماغ بھی اس چھوٹے سے کیڑے میں موجود ہے۔ اللہ اکبر: یہ جسم خالق تعالیٰ نے کس طرح تیار کیا ہوگا۔ اُس شاعرِ فطرت کا تخیل کتنا نازک اور ادق ہے کہ انسانی عقل تھرتھرا جاتی ہے۔ سچ ہے کہ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور اس پر قادر ہے۔

عنکبوت (مکڑی)

سورۃ نمل کے علاوہ ایک سورۃ العنکبوت یعنی مکڑی کے نام سے بھی قرآن میں وارد ہے جب ہم حشرات کے مضمون تلے بحث کر رہے ہیں تو مکڑی کے عجائبات کے بارے نہ جاننا درست نہ ہوگا۔ اُس خالق نے مکڑی کو کیا کچھ عطا فرما رکھا ہے اس پر بھی نظر ڈالتے چلیں کہ اس احسن الخالقین کی ہر ہر تخلیق بے مثال اور حیرت کے سمندر میں گم کر دیتی ہے گرچہ کچھ لوگ اسے بھی اتفاق کا نام دیکر اس بے نیاز کی عظمت تسلیم کرنے میں پہلوتہی کر کے محروم رہنا پسند کرتے ہوں۔

مکڑی اپنا گھر جالے کی تاروں سے بناتی ہے ہر تار اصل میں چار باریک تاروں کا مجموعہ ہوتا ہے اور ہر باریک تار بھی ایک ہزار لیسی تاروں سے بنتا ہے۔ مکڑی کے جسم میں چار ہزار باریک باریک نالیاں ہوتی ہیں۔ ہر نالی سے ایک تار نکلتا ہے۔ ذرا آگے چار سوراخ ہوتے ہیں ہر سوراخ میں ایک ہزار لیسی تار داخل ہو کر ایک تار کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ دُم کے آخر میں صرف ایک نالی ہوتی ہے جس میں سے یہ چار تار گزرتے ہوئے صرف ایک تار کا دھاگہ بن جاتے ہیں۔ مکڑی لکڑی کے شہتیروں وغیرہ سے گوند نکال کر تاروں پر لگاتی ہے اور پھر ان تاروں سے ایک مضبوط گھر بناتی ہے کہ باوجود ضعیف ترین گھر ہونے کے طوفان اور تند آندھیوں میں بھی نہیں ٹوٹتا۔

مکڑی مسدّس شکل کا ایسا مکمل جالا بنتی ہے جس کا ہر ضلع اسکے نصف قطر کے برابر ہوتا ہے۔ انسان نے مسدّس شکل کا سبق اسی مہندس سے لیا تھا۔ مکڑی جالا بنتے وقت ہر تار پر پانچ چھ مرتبہ آتی جاتی ہے اور ہر بار ایک نئے تار کا اضافہ کرتی ہے اس طرح جالے کا ہر تار اس قدر مضبوط ہو جاتا ہے کہ مکڑی کے اپنے وزن سے آٹھ گنا زیادہ وزن تھام سکتا ہے۔ اس جالے سے یہ مکھیوں وغیرہ کا شکار کرتی ہے اور جب کوئی مکھی اس جالے میں پھنس جاتی ہے تو مکڑی فوراً اسے ایک زہر سا پلا کر بے ہوش کر دیتی ہے تا کہ

مکھی جالے سے آزاد ہونے کی کوشش میں جالے کو نہ توڑ ڈالے۔

مکڑی کی آٹھ آنکھیں ہوتی ہیں۔ یہ چھ ماہ تک بھوکی رہ سکتی ہے۔ ایک وقت میں دو ہزار انڈے دیتی ہے جنہیں ملائم اور سنہرے تاروں میں لپیٹ کر رکھتی ہے' یہ ضرورت کے مطابق مختلف رنگ کے تار نکال سکتی ہے۔ ہر تار ریشم کے تار سے نوے گنا کم باریک ہوتا ہے۔

اقسامِ عنکبوت (مکڑی کی قسمیں)

مکڑی کی ایک قسم جو ہڑوں کے نیچے سفید گنبد نما گھر بناتی ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے بعد پانی سے سر باہر نکالتی ہے۔ تنفس کی خاطر ایک تھیلی اسے عطا ہوئی ہے جسے ہوا سے بھر لیتی ہے اور پھر نیچے چلی جاتی ہے۔ مکڑی کی ایک اور قسم صرف پھلوں پر جالا تنتی ہے جس سے پھل کے دشمن کیڑے قریب نہیں آتے۔ مکڑی کی ایک قسم مائیگیل (MY GALE) کہلاتی ہے یہ زمین میں ایک انچ سے بھی کم نیچے ایک انچ گول گھر بناتی اور اوپر مٹی کا دروازہ لگا دیتی ہے تا کہ گھر اور باقی زمین میں تمیز نہ ہو سکے' اس گھر کے اُوپر سبزیوں کے بیج لا کر بو دیتی ہے تا کہ گھر پر سایہ رہے۔ مٹی کے اس دروازے کے نیچے سوراخ ہوتے ہیں جن میں سے پنجے ڈال کر دروازہ کھولتی اور بند کرتی ہے۔ شکار کیلئے یا کوئی دشمن حملہ کر دے تو ان ہی سوراخوں میں پنجے ڈال کر پوری طاقت سے اندر کی طرف کھینچتی ہے جس سے دروازہ بھی کھلنے سے باز رہتا ہے۔

بچوں کی حفاظت کیلئے زمین میں اندر الگ کمرے بھی بنا رکھے ہوتے ہیں کیونکہ ایک لمبی چونچ والا پرندہ مکڑی کے باہر جانے کی تاک میں رہتا ہے اور جوں ہی مکڑی باہر نکلتی ہے پرندہ فوراً وہاں پہنچ کر اپنی لمبی چونچ ان سوراخوں میں ڈال کر بچوں وغیرہ کی تلاش کرتا ہے چونکہ مکڑی اس خطرے سے پہلے ہی آگاہ ہوتی ہے اسلئے وہ انڈوں اور بچوں کیلئے پہلو میں الگ الگ کمرے تیار کر کے باہر جاتے وقت انہیں محفوظ جگہ پہنچا دیتی ہے جہاں اس پرندے کی چونچ نہیں پہنچ سکتی۔ ان حشرات کی عقل و دانش سے متاثر ہو کر ایک مغربی حکیم کہتا ہے:

,,IN THESE THINGS SO MINUTE, WHAT WISDOM IS DIPLAYED, WHAT

UNFATHOMABLE PERFECTION..

''ان بے مقدار اشیاء کی تکوین میں اللہ نے عقل و دانش، قوت تخلیق اور کمال صناعی کا کیا حیرت آفرین مظاہرہ کیا ہے''

یہ ایک حقیقت ہے کہ اعمال الٰہیہ پر غور کئے بغیر اللہ تعالیٰ کی عظمت کا صحیح تصور قائم نہیں ہو سکتا۔ مگر دکھ اور حیرت کی بات ہے کہ کچھ لوگ یہ جان کر بھی سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنے نفسوں کو دھوکہ دیتے اور اپنی ضد یا پھر اپنی بدنصیبی کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ جبکہ ایک یورپی مفکر کہتا ہے:

,,IN CONTEMPLATION OF THINGS BY STEPS WE MAY ASCEND TO GOD,.

''مظاہر تکوین پر غور کرتے کرتے ہم خدا تک پہنچ سکتے ہیں''۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ مَا تُغْنِی الْاٰیٰتُ وَ النُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ (یونس: ۱۰۱)

ترجمہ:۔ آپ انہیں زمین و آسمان کے معجزات پر غور کرنے کا حکم دیں اور غور و فکر نہ کرنے والوں کو یہ نشانیاں یا آپ کی تنبیہ کوئی فائدہ نہیں دیتی (یونس:۱۰۱)

اس آیت میں تخلیق زمین و آسمان پر غور نہ کرنے والوں کو ایمان نہ لانے والوں میں شامل فرمایا گیا ہے اور یہ بات سخت خطرے کا کھلا احساس دلاتی ہے۔ جو لوگ معجزاتِ تخلیق سے غافل رہتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی صحیح عظمت و رفعت سے آگاہ نہیں ہو سکتے اور ایک چھوٹی سی ترغیب بھی انہیں راہِ راست سے منحرف کرنے کو کافی ہوتی ہے۔ یہ آزاد منش آزاد ہوا کے ہاتھ کھلونا بن کر دولت پرستی اور حکام پرستی پر اُتر آتے ہیں اور نہایت ذلیل مقاصد کی تکمیل میں شب و روز سرگرداں رہتے ہیں اور مکڑی کی طرح انکی اوقات صرف مکھیوں کے شکار تک محدود ہو جاتی ہے۔

مَثَلُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِیَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَیْتًا ؕ وَ اِنَّ اَوْهَنَ الْبُیُوْتِ لَبَیْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ (العنکبوت:۴۱)

ترجمہ:۔ ''جو لوگ اللہ کے علاوہ دوسروں سے تعلقات گانٹھ لیتے ہیں وہ اس مکڑی کی طرح ہیں جو (مکھیوں کے شکار کیلئے) جالا تن لیتی ہے کاش کہ وہ جانتے کہ مکڑی کا گھر دنیا میں کمزور ترین گھر ہے'' (عنکبوت:۴۱)

نحل (شہد کی مکھی)

شہد کی مکھی بہت حریص ہوتی ہے ہر جگہ ہر دکان و مکان اور پھولوں سے رس چُراتی رہتی ہے۔ بعض اوقات حلوائی کی کڑاہی میں گر کر مر جاتی ہے اور کبھی انتارس اٹھالاتی ہے کہ اس اضافی بوجھ کی وجہ سے منزلِ مقصود تک پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتی ہے۔ چیونٹی کی نسبت ان میں شاہی نظام زیادہ موثر دکھائی دیتا ہے۔ ہر چھتے میں ایک ملکہ ہوتی ہے جو چھتہ تیار ہونے کے بعد اس پر اس شان سے ٹہلتی ہے کہ ساتھ ساتھ چند کنیزیں ہوتی ہیں اور ہر خانے میں منہ ڈال کر معائنہ کرتی ہے کہ آیا مکمل ہو چکا ہے یا کوئی کمی بیشی باقی ہے۔ اطمینان کرنے کے بعد انڈے دینا شروع کرتی ہے۔ اس کے انڈے تین قسم کے ہوتے ہیں ایک سے ملک' دوسری قسم سے ملکہ اور تیسری سے کارکن (مزدُور) پیدا ہوتے ہیں۔

اگر کسی حادثہ کی وجہ سے ملکہ مر جائے اور چھتے میں کوئی شہزادی بھی موجود نہ ہو تو مکھیاں کسی مزدُور زادی ہی کو ملکہ مقرر کر کے اسکو تربیت دینا شروع کر دیتی ہیں۔ اگر چھتے میں کوئی انڈہ موجود نہ ہو تو مکھیاں دل شکستہ ہو کر کھانا پینا ترک کر دیتی ہیں یہاں تک کہ چھتہ اُجڑ جاتا اور تمام مکھیاں ہلاک ہو جاتی ہیں۔ کارکن مکھیوں میں نَر اور مادہ دونوں ہوتے ہیں' نر شہد کی تلاش میں جاتے ہیں اور مادہ مکھیاں گھر کو سنبھالتی ہیں۔ یہ بات بھی دیکھنے میں آئی ہے کہ ملکہ کی موت پر مکھیوں میں ایک زبردست ہیجان پیدا ہو جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے سے نہایت بے تابی کے ساتھ گفتگو میں مصروف ہوتی ہیں۔

چھتے میں دو قسم کے خانے ہوتے ہیں کچھ چھوٹے اور کچھ بڑے۔ چھوٹے خانوں میں کارکن جنم لیتے ہیں اور بڑے خانے شاہی نسل کیلئے مخصوص ہوتے ہیں۔ سفید و نیلگوں انڈوں سے کارکن مکھیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ہر انڈے کی لمبائی ایک انچ کا بارھواں حصہ ہوتی ہے۔

ملکہ جب کسی خانے میں انڈہ دیتی ہے تو دایہ مکھی نہایت احتیاط سے اسکی تربیت کرتی ہے اور خانے پر سفید جھلی نما غلاف چڑھا دیتی ہے۔ جب بچہ جوان ہو جاتا ہے تو خانے کا منہ کھول دیتی ہے اور بچہ باہر آ جاتا ہے۔ دایہ اُسے چلنا پھرنا اور پھولوں تک جانا آنا سکھاتی ہے۔

اگر کسی وقت کوئی ایسی شہزادی پیدا ہو جائے جس کی ضرورت نہ ہو تو ملکہ اسے ڈنک لگا کر فوراً

ہلاک کر دیتی ہے۔ اگر ملکہ بوڑھی ہو کر ناکارہ ہو جائے تو کسی شہزادی کو ملکہ چن لیا جاتا ہے اور بوڑھی ملکہ کو دھکیل کر چھتے سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔ ماتحت مکھیوں کی بدسلوکی سے ملکہ دل شکستہ ہو کر بین کرتی ہے جو کئی میٹر دُور سے سنائی دیتا ہے۔ اس میں اس قدر سوز ہوتا ہے کہ ہر مکھی ملول' خاموش اور بے حرکت ہو جاتی ہے۔ جونہی یہ بین ختم ہوتا ہے مکھیاں متحرک ہوتی ہیں اور ملکہ کو ڈنک لگاتی ہیں جس سے ناکارہ ملکہ ذلت و رُسوائی میں جان دے دیتی ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ موسمِ سرما میں جب عموماً پھول جھڑ جاتے ہیں اور انکے پاس غذا کیلئے چھتے کے سوا کچھ نہیں ہوتا تو نکمی مکھیوں کی شامت آجاتی ہے۔ کارکن مکھیاں انہیں بھی ڈنک سے ہلاک کر دیتی ہیں۔

نوٹ:۔

دوستو: متذکرہ بالا تفصیل ہمیں سبق دیتی ہے کہ دنیا میں نااہل و بے ہمت اور ناکارہ اقوام کا یہی حال و انجام ہوتا ہے۔ جب تک کہ مسلمانوں میں صلاحیتِ حیات باقی تھی وہ آسٹریا' ممالک بلقان' جنوبی رُوس' نصف فرانس' سسلی' سائپرس' شام' عراق' ایران' ارض رُوم' افغانستان' ہندوستان اور بحرالکاہل کے بہت سے جزائر پر حکمران رہے اور دنیا اسلام سے رُوشناس ہوئی اور جب یہ قوم صلاحیت حیات کھو بیٹھی اس نے محنت و مشقت سے کنارہ کشی کر لی تلاش و طلب سے ہاتھ کھینچ کر جذبہ عمل سے بیگانہ ہو گئی تو خدا تعالیٰ نے انکی بنیادیں ہلا دیں اور تخت سے اٹھا کر فرش پر دے مارا۔ مگر ہم ابھی تک خیرالامم کا پندار دماغوں میں بٹھائے بیٹھے ہیں اور ہمیں احساس تک نہیں کہ ہم دوسری اقوام کے دستِ نگر ہو چکے ہیں۔ کاش اللہ تعالیٰ میری قوم کو آنکھیں عطا فرمائے کہ یہ اپنی پراگندہ حالت کا مشاہدہ کر سکے۔

وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ ۙ ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْٓا اَمْثَالَکُمْ ع (محمد:۳۸)

ترجمہ:۔ اگر تم منہ پھیرو گے تو وہ تمہارے علاوہ دوسری قوم کو لے آئے گا پھر وہ تم جیسے نہ ہونگے (محمد:۳۸)

اقسام شہد

عام طور پر لوگ صرف زرد رنگ کے شہد سے واقف ہیں لیکن ماہرین نحل کا کہنا ہے کہ سبز، سرخ اور ہلکے گلابی رنگ کے شہد بھی گاہے گاہے دیکھنے میں آتے ہیں اور وہ مختلف الذائقہ بھی ہوتے ہیں۔ شہد کی مکھیوں اور شہد کی تحقیقات پر زندگی صرف کرنے والے ایک مغربی حکیم مسٹر کیتی آرلوول (KATE. R. LOVELL) کو کسی نے سورۃ نحل کے بارے بتایا کہ مسلمانوں کی کتاب میں شہد اور مکھی کا ذکر بھی ہے۔ اس نے انگریزی مترجم قرآن حکیم سے درج ذیل آیات دیکھیں تو حیرت زدہ ہو گیا پھر جستجوئے شوق میں اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے لٹریچر کا مطالعہ کیا تو بے ساختہ کہنے لگا کہ عرب کا یہ امّی فطرت کا کتنا بڑا عالم تھا۔ چنانچہ لکھتا ہے:۔

MUHAMMAD WAS A GREAT KING, A MIGHTY CONQUERER AND VERY CLEVER AND LEARNED MAN FROM THE QURAN WE LEARN THAT HE WAS LOVER OF NATURE AND THAT HE KNEW SOMETHING OF BEES AND THE VALUE OF HONEY. HE SPEAKS OF BEES BUILDING NESTS FOR THEMSELVES AND PRODUCING HONEY OF VARIOUS COLOURS. THESE THINGS WERE NOT OBTAINED WITHOUT A CERTAIN AMOUNT OF INQUIRY AND OBSERVATION.....

''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک زبردست فرمانروا عظیم فاتح، بہت ہوشیار و باعلم تھے۔ قرآن سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ وہ فطرت کے شیدائی، مکھیوں کے اعمال کے عالم اور شہد کے افادی پہلوؤں سے آگاہ تھے۔ وہ مکھیوں کے گھر بنانے اور مختلف رنگوں کے شہد تیار کرنے کا ذکر کرتے ہیں جبکہ یہ علم تلاش و مشاہدہ کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا''۔

اس ضمن میں قرآن کریم کا فرمان ملاحظہ کریں:۔

وَ اَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا یَعْرِشُوْنَ (۶۸) ثُمَّ کُلِیْ مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُکِیْ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلًا ؕ یَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ

يَتَفَكَّرُوْنَ (نحل: ٦٩)

ترجمہ:۔ ''اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کو پیغام بھیجا کہ پہاڑوں' درختوں اور بیلوں میں اپنا گھر بنا' تمام پھلوں سے شہد حاصل کر اور اپنے رب کے دیئے ہوئے دستور العمل کو باقاعدگی سے نبھا' ذرا دیکھو تو سہی کہ اس مکھی کے پیٹ سے ایک شربت نکلتا ہے جس کے کئی رنگ ہوتے ہیں اور جس میں امراض کی شفا بھی ہے۔ مکھی کے ان اعمال میں ان لوگوں کیلئے کئی اسباق موجود ہیں جو (صحیفہ فطرت میں) غور و تفکر سے کام لیتے ہیں (نحل: ٦٨ تا ٦٩)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اُس مغربی مفکر نے جس رنگ میں پیش کیا ہے وہ ہمارے تصور میں بھی نہیں آ سکتا۔ ہماری نگاہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسی انقلاب آفریں ہستی کا تخیل بس اتنا ہی ہے کہ شفاعت سے امت کے انگنت گناہ بخشوانے والے ہیں اور ایک دفعہ دُرود پڑھنے پر دس دس نیکیاں انعام میں تقسیم کر رہے ہیں۔ مسلمان کو اپنے خول میں گم رہنے کی بجائے پوری مخلوق خدا کی خدمت کیلئے بلندیٔ افکار اپنانے اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہے۔

شہد اور موم

مکھی کا نچلہ ہونٹ یوں تو سمٹا رہتا ہے لیکن پھول سے رس نکالتے وقت پھیل جاتا ہے اور پھول کی اندرونی تہوں تک سے رس سمیٹ لیتا ہے۔ مکھی اس رس کا کچھ حصہ تو پی جاتی ہے اور کچھ غذائی نالی کے ساتھ لگی ایک تھیلی میں بھر لیتی ہے اسی دوران اس پر کیمیائی عمل شروع ہو جاتا ہے اور چھتے میں پہنچ کر یہ رس خانوں میں انڈیل دیتی ہے۔

جب مکھیاں پھولوں سے رس نکال رہی ہوتی ہیں اس وقت پھولوں کے ذراتِ منویہ (POLLON) مکھی کے پروں اور پیروں سے چمٹ جاتے ہیں یہ ذرات (جن میں میٹھا رس بھی ہوتا ہے) اُن گھریلو مکھیوں کی غذا بنتے ہیں جو چھتے سے باہر نہیں جاتیں۔ ان کے پاس رس جمع کرنے والی تھیلی بھی نہیں ہوتی' اس لئے کہ انہیں گھر بیٹھے غذا میسر آ جاتی ہے۔

شہد کی مکھیاں رس اکٹھا کرنے کے علاوہ خانے تیار کرنے کیلئے تازہ کونپلوں سے ایک قسم کا گوند

بھی نکال لاتی ہیں اور کیمیائی عمل سے موم کے خانے تیار کرتی ہیں۔ اگر شہد کی آمد بڑھ جائے اور خانے کم پڑ جائیں تو جلد اور زیادہ موم بنانے کیلئے مکھیوں کو یہ قربانی کرنی پڑتی ہے کہ درجن بھر مکھیاں ایک دوسرے کے پروں کو اگلی ٹانگوں سے مضبوطی سے تھام کر چوبیس گھنٹے کیلئے لٹک جاتی ہیں۔ اس عرصہ میں انکی موم بنانے والی تھیلیاں (جو کہ پیٹ کے نیچے ہوتی ہیں) موم سے بھر جاتی ہیں۔ تھوڑی جگہ اور تھوڑے وقت میں زیادہ خانے بنانے کیلئے مکھی چھ کونے خانے بناتی ہے جو ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔

نحل کے چار پَر ہوتے ہیں۔ اُڑتے وقت پچھلے دو پَر اگلے دو پَروں کے ساتھ چند گنڈیوں کے ذریعے پھنس کر ایک پَر کی طرح بن جاتے ہیں۔ ان پر ملائم سی پشم ہوتی ہے تا کہ بارش کے قطرے اُوپر سے بہہ جائیں اور پَر بھیگ کر وزنی نہ ہو جائیں یوں بھی پروں کے نیچے نالیوں میں ہوا بھری ہوتی ہے تا کہ پرواز میں آسانی رہے۔ گرمیوں میں جب چھتہ تپ جاتا ہے اور شہد کے بہہ جانے کا اندیشہ ہو تو چند کارکن مکھیاں پَروں سے ہوا دیکر چھتے کو ٹھنڈا کرتی ہیں۔

نحل کی آنکھیں

نحل کی پانچ آنکھیں ہوتی ہیں دو تو سر کے دائیں بائیں اور تین سر کی چوٹی پر۔ ان میں سے ہر آنکھ تین ہزار آنکھوں کا مجموعہ ہوتی ہے یعنی اس میں ہر چیز کی تین ہزار تصاویر منعکس ہوتی ہیں۔ گو کہ یہ آنکھیں انسانی آنکھوں کی طرح اِدھر اُدھر حرکت نہیں کر سکتیں یہ غالباً اس لئے ہے کہ تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے گردش کئے بغیر ہر طرف دیکھ سکتی ہیں۔

ڈنک

بھڑ ہو یا نحل جب یہ کسی جسم میں ڈنک چبھو دیتے ہیں تو ڈنک اس جسم کے اندر ہی رہ جاتا ہے مکھی یا بھڑ اڑ تو جاتی ہے مگر کچھ دیر بعد مر جاتی ہے۔ یہ اس لئے کہ آلۂ حفاظت سے محروم ہو جاتی ہے اور قدرت کے اس اٹل آئین کے مطابق (کہ جو اقوام اپنی حفاظت خود نہیں کر سکتیں وہ مٹا دی جاتی ہیں) ہلاک ہو جاتی ہے۔

دوستو: کیا طیور وحیوانات وحشرات میں ودیعت شدہ خصائل وعجائبات الٰہی معجزات نہیں؟ یقیناً ہیں۔مگر پیدائشی اندھے پن اور جہالت کا کوئی علاج نہیں۔

سورۃ یوسف کی آیت نمبر ۱۰۵ میں فرمانِ خداوندی پر توجہ درکار ہے:۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَ هُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ

(یوسف :۱۰۵)

ترجمہ:۔ارض وسماء میں معجزات کی ایک دنیا موجود ہے لیکن یہ لوگ غافلوں کی طرح مُنہ پھیر کر پاس سے گزر جاتے ہیں (یوسف:۱۰۵)

مچھر

مچھر کو اللہ تعالیٰ نے یوں تو جوہڑوں وغیرہ سے غذا میسر کر رکھی ہے لیکن مادہ مچھر انڈے دے کر کمزور ہو جاتی ہے اور تقویت کیلئے انسانی وحیوانی خون کی ضرورت پیش آتی ہے۔اس لئے بتقاضۂ ربوبیت اسے ایک نشتر وسرنج عطا کر رکھی ہے جس سے یہ اپنی ضرورت پوری کرتی ہے۔اسے خون کی ضرورت اس لئے بھی ہوتی ہے کہ بقائے نسل کیلئے زندہ رہے اور کمزوری کی وجہ سے خود ہی ہلاک نہ ہو جائے۔مچھر کے منہ کے سامنے ایک مودار نالی سی ہوتی ہے جس سے جسم میں سوراخ کر کے اندر زہریلا مواد داخل کرتا ہے جس سے خون یک لخت پانی کی طرح پتلا ہو جاتا ہے اور یہ اپنی اسی سرنج نما نالی سے خون چوس کر اُڑ جاتا ہے۔اسکے زہریلے مواد کی جلن خارش کی طرح محسوس کی جاتی ہے۔مچھر کے انڈے جوہڑوں وغیرہ میں ہوتے ہیں جن کی غذا خوردبینی حیوانات ہیں۔تنفس کیلئے انکی دُم میں ایک سوراخ ہوتا ہے اس لئے یہ انڈے جب ہوا حاصل کرنے کیلئے سطحِ آب پر آتے ہیں تو منہ پانی کے اندر ہی رکھتے ہیں اور دُم والا حصہ باہر نکال کر سانس لیتے ہیں۔جب مچھر انڈوں سے نصف باہر آجاتے ہیں تو تنفس کیلئے انکی پیٹھ پر ایک سوراخ بن جاتا ہے جس سے سانس لیتے ہیں۔ولادت کے وقت جب انڈے سطح پر آجاتے ہیں اور حرارتِ آفتاب سے انڈوں کے خول خشک ہو کر پھٹ جاتے ہیں تو مچھر باہر

آجاتے ہیں جونہی گرمی سے انکے پَر خشک ہوتے ہیں تو یہ اُڑ جاتے ہیں۔

ولادت کے وقت ہر انڈہ ایک طرف سے کھلتا ہے اگر مچھر ذرا بھی حرکت کرے تو اس خول میں پانی بھر جائے اور مچھر ہلاک ہوجائے ۔ مچھر کو یہ سب معلوم ہوتا ہے اسلئے بے حس سا ہو کر پڑا رہتا ہے۔ اگر اس دوران آندھی چل پڑے تو یہ تمام خول دفعتہً ڈوب جاتے ہیں۔ یوں ہوا کا یہ فائدہ ہے کہ ہر روز سینکڑوں من مچھروں کے بچے جھیلوں اور جوہڑوں میں غرق کر دیتی ہے ورنہ یہ حقیر سی مخلوق انسانی زندگی کو وبال بنا دیتی۔

انسان جیسی مدبّر و ذی عقل مخلوق کا مچھر سے مغلوب و زچ ہونا الٰہی کارفرمائی کا ایک عظیم الشان کرشمہ ہے۔ رات ہوتے ہی یہ تمام مخلوق کا ناک میں دم کر دیتا ہے۔ تمام بستیوں پر اسی کی حکومت ہوتی ہے۔ بادشاہ تک اس سے بچنے کا اہتمام کرنے پر مجبور ہیں۔ لوگ مچھر جالیوں کے قلعوں میں چھپ کر رات گزارنے پر عاجز ہیں۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ اس کے پاس طاقت کا ایک زبردست اوزار یعنی زہریلا پمپ موجود ہے۔ دنیا کی حاکم اقوام ایسی ہی ہوا کرتی ہیں جن کے پاس اپنوں کیلئے تریاق اور اعداء کیلئے زہر ہلاہل موجود ہو۔

کسی بڑے سے بڑے بت تراش کے لئے یہ تو ممکن ہے کہ وہ سنگ مرمر سے کسی ہاتھی، گھوڑے یا اونٹ کا مجسمہ تراش لے مگر یہ قطعاً غیر ممکن ہے کہ وہ مچھر کا مجسمہ تیار کر سکے۔ اس کی آنکھیں، سر، سونڈ، رگیں، انتڑیاں، پَر وبال وغیرہ بنانا اس فنکار کی طاقت سے باہر ہے۔ اُدھر اس احسن الخالقین کی صناعی دیکھئے کہ مچھر سے بھی کئی گنا چھوٹے حشرات خلق فرما کر انہیں ہر لحاظ سے کیسا مکمل بنا دیا کہ وہ چل پھر رہے ہیں دوڑ رہے ہیں اُڑ رہے ہیں کھا پی رہے ہیں اور انسانوں سے بڑھ کر ذہانت کا ثبوت فراہم کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی خلاقی کا کمال دیکھنا ہو تو ہیبت ناک پہاڑ دیکھنے کیا ضروری ہیں ان حقیر چیزوں کو دیکھو غور کرو اور انصاف کرو کہ اس ذات کے سوا کوئی ہے جو کسی بھی چیز کو خلق کرنے کا اہل ہو سکتا ہو۔ پھر اگر مثال دینے کیلئے خلق وتکوین کے ان شاہکاروں میں سے کسی مکھی یا مچھر کا ذکر قرآن حکیم میں آجائے تو

اس میں اچنبھے کی بات کیا ہے۔ جیسا کہ قرآن حکیم سورۃ بقرہ آیت نمبر ۲۶ میں فرمانِ عالیشان ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَ مَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ (۲۶)

ترجمہ:۔ بیشک اللہ سبحانہٗ تعالیٰ اس سے حیاء نہیں فرماتا کہ مثال سمجھانے کو کسی بھی چیز کا ذکر فرمائے مچھر ہو یا اس سے بڑھ کر، جو ایمان والے ہیں وہ (محقق) جانتے ہیں کہ یہ انکے رب کی طرف سے حق ہے اور جو کافر ہیں وہ (جاہل) کہتے ہیں اللہ کو ایسی مثالوں سے کیا مقصود ہے، اللہ اس سے بہتیروں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتیروں کو ہدایت فرماتا ہے، اور اس سے صرف ان کو ہی گمراہ کرتا ہے جو نافرمان فاسق ہیں (بقرۃ:۲۶)

مکھّی

مکھی کئی لحاظ سے مفید ہے جو دنیا کی صفائی پر متعین ہے۔ ہم انسان سطحِ زمین کو غلیظ بناتے ہیں یہ غلاظت کو چاٹ کر صاف کرتی ہے۔ جہاں غلاظت زیادہ ہو وہاں مکھی جیسے قدرت کے جاروب کش بھی زیادہ ہو جاتے ہیں۔ صاف جگہوں اور صاف کمروں میں مکھیاں نہ ہونے کے برابر ہونگی اسلئے کہ وہاں انکی ضرورت نہیں پڑتی۔ جو کام میونسپلٹی کے خاکروب نہیں کر سکتے اسے مکھّی انجام دیتی ہے۔

جس طرح خاکروب کی ذات میں ناپاکی نہیں بلکہ اسکے کام میں ہوتی ہے اسی طرح مکھّی خود کوئی بری چیز نہیں بلکہ انسانی غلاظت کو صاف کرنے کی وجہ سے اسکی ٹانگیں اور پَر وغیرہ آلودہ ہو جاتے ہیں جو بیماریوں کا باعث بن جاتے ہیں۔ مُردار کو کھانے والے سفید کیڑے بھی مکھیوں کے انڈوں سے نکلتے ہیں۔

بعض جانور انڈوں کو کچھ عرصہ تک سیتے رہتے ہیں لیکن مکھّی کو انڈوں پر بیٹھنے کی فرصت نہیں ہوتی اس لئے یہ انڈے دیکر چلتی بنتی ہے اور قدرت خود اس کے بچے نکالنے کا انتظام کرتی ہے۔ مکھّی ایک سیکنڈ میں چھ سو مرتبہ پَر مارتی اور پانچ فٹ مسافت طے کرتی ہے۔ اگر ڈر جائے تو اس کی رفتار بیس کلومیٹر

فی گھنٹہ تک پہنچ جاتی ہے۔عام طور پر ایک گھنٹے میں اٹھارہ ہزار فٹ اُڑتی ہے۔تنفس کیلئے مکھی کے پیٹ میں دوسوراخ ہوتے ہیں جو بالوں سے ڈھکے رہتے ہیں تا کہ گردوغبار اندر نہ آسکے۔اس میں سونگھنے کی طاقت بہت تیز ہوتی ہے لیکن ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ کہاں سے سونگھتی ہے۔

مکھّی چھت پر الٹی ہوکر کیسے چلتی ہے ہنوز ایک معمّہ ہے۔بعض کا خیال ہے کہ اسکی ٹانگوں میں کنڈی نما کوئی چیز ہے جسے لکڑی' مٹی یا ریت سیمنٹ وغیرہ کے مساموں میں اڑا لیتی ہے اور بعض یہ کہتے ہیں کہ اسکی ٹانگوں سے ایک ایسا مادہ نکلتا ہے جس کی بدولت یہ چھت وغیرہ سے چپکی رہتی ہے۔بعین شہد کی مکھی کی طرح اس کی بھی پانچ آنکھیں ہوتی ہیں اور ہر آنکھ چار ہزار آنکھوں سے مرکب ہوتی ہے۔ مکھّی کی عمر تقریباً ایک ماہ ہوتی ہے لیکن اسی عرصہ حیات میں یہ بے شمار انڈے دیتی ہے جس سے مکھّیوں کی تعداد میں کمی دکھائی نہیں دیتی۔علمائے فطرت نے اندازہ لگایا ہے کہ صرف ایک موسم میں مکھّی کی نسل بیس لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔قدرت کا بھی عجیب چکر دار نظام ہے' انسان پاکیزہ چیزیں کھاتا ہے اور انسان کی خارج کردہ غلاظت مکھیوں کی غذا بنتی ہے جبکہ مکھّیوں کو دوسرے حشرات وطیور کھاتے ہیں بہ الفاظِ دیگر حیوانات نباتات کو کھاتے ہیں حیوانات ونباتات انسان کی غذا ہیں اور مرنے کے بعد پھر حشرات انسان کو اپنی غذا بنا لیتے ہیں۔ایک طرف مکھّی ہمیں تمام دن ستاتی رہتی ہے نہ آرام سے سونے دیتی ہے نہ ڈھنگ سے کام کرنے دیتی ہے۔ہماری غذا کی پاکیزگی ونفاست کو آلودہ کرڈالتی ہے اور کئی قسم کی جان لیوا بیماریوں کا باعث بنتی ہے۔دوسری طرف بیچاری پَر اور کئی ہزار آنکھیں رکھتے ہوئے عنکبوت جیسے بے بس جانور کے چنگل میں پھنس جاتی ہے۔اسی طرح بعض زیادہ پڑھے لکھے مگر عقل سے محروم لوگ جانے کس مغالطہ کے چنگل میں پھنس کر ناقابل تلافی خسارہ کے شکار ہوجاتے ہیں۔وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ انسان طیارے بنا کر اگرچہ ہوا میں اُڑسکتا ہے مگر قدرت کے افعال پر قدرت نہیں رکھ سکتا۔درخت پیدا کرنا تو کجا درخت سے ٹوٹے پتّے کو واپس اسکی شاخ سے جوڑنے پر بھی قادر نہیں۔خالق تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی اشیاء میں سے کسی شئے کی تخلیق پر اختیار نہیں رکھتا اور خلق کا محکمہ صرف اُس احسن الخالقین ہی کے زیر تصرف ہے اور یہی فرق خالق اور مخلوق میں ہے۔

انفس

آفاق اور انفس دو چیزیں وہ ہیں جن میں غور کرنے پر حق تعالیٰ نے ہمیں ایسی چیزیں دکھانے کا وعدہ فرمایا ہے جس سے ہم اسکے کلام کی سچائی کی تصدیق کریں گے۔ جب اسکے پاک کلام پر ہمارا یقین محکم ہو جائے تو اسکے احسن الخالقین ہونے پر بھی یقین وایمان کا حصول سہل ہو جائیگا۔ ہم آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا تو مطالعہ کر چکے ہیں اب انفس کے بارے بھی نظر ڈال لی جائے کہ فلاح کی امید روشن اور نورِ ایمان کی شمع میں ہنوز جوت باقی ہے۔ قرآن نے سورۃ حٰم السجدہ میں فرمایا۔

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِىْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ اَوَ لَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ (حٰم السجدہ : ۵۳)

ترجمہ:۔ ہم آفاق وانفس میں انہیں اپنی نشانیاں دکھائیں گے جس سے ان پر یہ حقیقت کھل جائے گی کہ قرآن اللہ کا کلام ہے' کیا تمہارے رب کا ہر چیز پر گواہ ہونا کافی نہیں (حٰم سجدہ ۵۳)

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهٖ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِىْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ

(حٰم السجدہ : ۵۲)

آپ فرمائیں کہ اگر قرآن اللہ کی طرف سے ہے تو پھر تم اسکے منکر کیوں ہوتے ہو۔ تو اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو پرلے درجے کی ضد میں ہو (حٰم السجدہ: ۵۲)

جسم انسانی پر ایک نگاہ

انسانی بدن' الٰہی صنعت وتخلیق کا حیرت انگیز اعجاز ہے جسے دیکھ کر عقل سربسجود ہو جاتی ہے۔ ماہرین ارحام نے جنین کا ہر منزل اور ہر درجے میں تماشہ دیکھنے پر اس حقیقت سے نقاب اٹھایا ہے کہ دیگر اجسام کی طرح بدنِ انسانی کی ترکیب بھی خلیوں سے ہوتی ہے۔ آغاز میں یہ خلیہ ایک ہوتا ہے پھر دو پھر

چار اور پھر آٹھ میں متضاعف ہو کر بدن کی تشکیل کرتا ہے۔ بعض خلیے کان، بعض آنکھ، بعض ناک اور بعض دیگر اعضا کی تشکیل پر الگ الگ جُت جاتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ بعض خلیے سازش کر کے کان کی جگہ ناک اور ناک کی جگہ آنکھیں لگا ڈالیں یا پیچھے کوئی دُم چسپاں کر دیں۔ یہ اسلئے کہ ایک ہمہ بین آنکھ ان کی نگرانی کر رہی ہے جس کی قہر مانیت کے سامنے تمام کائنات سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہے۔

ایک طرف آج علم ترقی کرتے کرتے خیامِ قدس کے اسرار تک بے نقاب کرنے پر تُل چکا ہے اور دوسری طرف تعلیم یافتوں میں ایک دو فی صد انسان بدستور ایسے موجود ہیں جو اپنے پیدا کرنے والے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ ان کے نقطۂ خیال سے تکوین وتدوین کی یہ کارگاہِ جلیل کسی ناظم وآمر کے بغیر چل رہی ہے اور تخلیق کے یہ رُوح افروز خوارق خود بخود اتفاقاً سرزد ہو رہے ہیں۔

اِن عقل کے دشمنوں سے کوئی پوچھے کہ اگر یہ سب کچھ خود بخود ہو رہا ہے اور کوئی نگران آنکھ پیچھے موجود نہیں تو پھر رحم مادر میں خلیوں نے تمہیں انسانی شکل ہی کیوں دی؟ گدھا کیوں نہ بنا دیا؟ یا سر خنزیر کا اور دُم مور کی کیوں نہ لگا دی؟ اچھا خاصہ پَروں والا گدھ کیوں نہ بنا ڈالا؟ انسانی پیٹ سے آج تک کیوں کوئی بکری پیدا نہ ہوئی؟ اگر اس کا کوئی جواب آپ کے پاس نہیں تو تسلیم کیوں نہیں کرتے اور اقرار کیوں نہیں کرتے کہ:۔

هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُكُمْ فِی الْاَرْحَامِ كَیْفَ یَشَآءُ ط..... (ال عمران :٦)

ترجمہ:۔ وہی ہے جو اپنی مشیّت قاہرہ کے مطابق ماؤں کے ارحام میں جیسی چاہتا ہے تمہاری صورتیں بناتا ہے۔۔۔۔۔ (آلِ عمران:٦)

جسم انسانی ایک مملکت

انسان چار عناصر آگ، ہوا، مٹی اور پانی سے مرکب ہے جن کے خواص سے الگ نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ اس کی طبع کا بنیادی جزو ہیں۔ گویا انسانی جسم کے چار طبائع حرارت، برودت، یبوست اور رطوبت ہیں۔

چار اخلاط ہیں: صفرا، خون، بلغم، سودا۔

نو طبقات ہیں: سر، منہ، گردن، سینہ، کمر، ران، ساق (پنڈلی) اور پاؤں۔

ستون: انسان میں ۲۴۸ ہڈیاں ہیں۔

رسیاں: ۷۵۰ پٹھے ہیں۔

خزانے: دماغ، نخاع، پھیپھڑے، دل، جگر، تلی، معدہ، انتڑیاں، گردے۔

مسالک وشوارع: ۳۶۰ عروق۔

نہریں: ۳۹۰ ورِیدیں۔

دروازے: آنکھیں، کان، ناک، پستان، منہ اور شرمگاہیں۔

کھڑکیاں: انگنت مسام۔

جسم انسانی ایک نرالہ شہر

انسان کے اندر ایک شہر آباد ہے۔ مثلاً

باورچی---------- معدہ جو ایک باورچی کی طرح غذا پکا رہا ہے۔

عطّار----------کوئی عطّار جو غذا کا جوہر نکال کر جزوِ بدن بنا رہا ہے۔

حکیم----------جگر ایک طبیب کی طرح غذا میں تیزاب ملا رہا ہے۔

جاروب کش------انتڑیاں، جلد، گُردے اور پھیپھڑے غلاظتِ جسم کو باہر پھینک رہے ہیں۔

شعبدہ باز--------کوئی صنّاع، خون کو گوشت میں تبدیل کر رہا ہے۔

بَھٹہ----------ہڈیاں اینٹوں کی طرح پک کر مظبوط ہو رہی ہیں۔

جُلاہا----------کوئی بافندہ اعصاب اور جھلیاں بُن رہا ہے۔

درزی----------کوئی درزی زخموں کو سی رہا ہے

کاشت کار----------کھیت میں گھاس کی طرح کوئی بال اُگا رہا ہے۔

رنگ ساز----------کوئی صبّاغ دانتوں کو سفید، بالوں کو سیاہ اور خون کو سُرخ بنا رہا ہے۔

مصوّر----------کوئی مصوّر ماں کے پیٹ میں خوبصورت انسان تراش رہا ہے۔

جسم انسانی زمین ہے جس میں ہڈیاں پہاڑ ہیں اسکی پھنکار اسکا معادن ہے ستارے اسکی عقل وقوت متفکرہ ومتخیلہ وغیرہ ہیں' سمندر اسکا پیٹ ہے' رگیں نہریں ہیں' بال نباتات ہیں' ماتھا اور پیٹھ اسکے میدان ہیں' اس کا تنفّس ہوا ہے' صبح کی روشنی انسان کی مسکراہٹ ہے' بارش اسکا گریہ ہے' موت نیند اور جہالت ہے' حیاتِ انسانی بیداری اور علم ہے۔ موسم بہار بچپن' موسم گرما اسکی جوانی' برفباری اسکے سفید بال اور رعد وبرق انسانی غصہ ہے۔

انسان میں حیوانی عناصر

انسان میں حیوانی عنصر بھی پائے جاتے ہیں مثلاً وہ شیر کی طرح دلیر و بہادر ہے اور خرگوش کی طرح بزدل بھی۔ کوّے کی طرح ہوشیار' لومڑی کی طرح پُرکار' اُلو کی طرح خود فراموش اور بھیڑ کی طرح سادہ لوح ہے۔ ہرن کی طرح تیز خرام ہے تو کچھوے کی طرح سست رَو بھی ہے۔ اونٹ کی طرح مطیع اور چیتے کی طرح سرکش ہے۔ بلبل کی طرح گویّا کوئل کی طرح سریلا اور گدھے کی طرح بدآواز بھی ہے۔ مرغی کی طرح مفید اور چوہے کی طرح مضر ہے' مور کی طرح حسین ہے تو سانپ کی طرح بے وفا بھی۔ گدھ کی طرح بدوضع اُلو کی طرح منحوس اور ہُدہُد کی طرح مسعود بھی ہے۔ گویا انسان انگنت خواص و کیفیات کا حامل ہے۔

جسم انسانی کے ارتقائی افعال کو دیکھیں کہ بال اُگ رہے ہیں' آنسو بہہ رہے ہیں' دِل دھڑک رہا ہے' سانس چل رہی ہے' کان سن رہے ہیں' آنکھیں دیکھ رہی اور دماغ سوچ رہا ہے۔ اس کارخانے کے انجن کا نام روح ہے۔ روح آخر جسم کے کس حصے میں رہتی ہے؟ اس کا جواب ہے کہ ہر بال' ہر رگ اور ہر قطرۂ خون میں یوں موجود ہے کہ تمام جسم انسانی میں گھلی ہوئی ہے' لیکن آپ چاقو سے کسی حصہ جسم کو کاٹ یا کرید کر روح کو دیکھنا چاہیں تو آپ کو کامیابی نہیں ہوگی اور باوجود موجود ہونے کے دکھائی نہیں دیگی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کائنات کے ذرّے ذرّے میں جلوہ گر ہے مگر روح کی طرح دکھائی نہیں دیتا۔ جس طرح انسانی جسم میں روح اپنا کام کر رہی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کائناتِ ارض وسماء میں مصروفِ عمل ہے۔

انسان کو تخلیق فرما کر اسے اپنا شاہکار قرار دینا انسان کیلئے بہت بڑا اعزاز ہے۔ یقیناً انسان ایک لامتناہی کائنات اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ کائناتِ ارضی میں موجود کسی دوسرے میں انسانی ذہن کی پرواز سے مقابلہ کرنے کی تاب نہیں۔ بطورِ خاص اسکی منتہی روحانی کیفیات کی پیمائش ناممکن ہے۔ اسکا دماغ ایک پیچیدہ ترمشین ہے جسے خود انسان کیلئے بھی سمجھنا دشوار ہے۔ تاہم ابھی ہم جسمِ انسانی کے مختلف حصوں کی بات کر رہے ہیں پہلے ان پر نظر دوڑاتے چلیں۔

جب ہم گہری نیند میں ہوتے ہیں تو اچھا خاصا شور بھی ہمیں بیدار نہیں کر سکتا' لیکن کسی ماں کو بچے کی معمولی سی سرسراہٹ یا ہلکی سی آواز بیدار کر دیتی ہے۔ گھریلو کتا گھر والوں کے شور اور گاڑی کے انجن کی گڑگڑاہٹ سے بھی نہیں جاگتا مگر کسی اجنبی پاؤں کی آہٹ ہی اسے چونکا دیتی ہے۔ ہم کسی سواری میں بڑی گہری نیند سو رہے ہوتے ہیں جونہی انجن میں کوئی خرابی ہوتی ہے یک لخت تمام مسافر ہڑبڑا کر جاگ اٹھتے ہیں یہ کیوں ہے؟ اسلئے کہ انسانی دماغ کا ایک حصہ بیدار رہ کر تمام واقعات و خطرات کا مطالعہ کرتا رہتا ہے اور جونہی اسے کسی خطرے کا احساس ہوتا ہے وہ ہمیں جگا دیتا ہے۔

انسانی آنکھ

ہماری آنکھ کو دیکھ کر کیمرہ ایجاد ہوا جس طرح دنیا میں بے شمار ایجادات کسی نہ کسی شئے کے مطالعہ کے بعد ایجاد ہو سکیں۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی ''بدیع'' کی صفت سے موصوف ہے کہ وہ اُن تمام اشیاء کا خالق ہے جن کی اس سے پہلے مثال بھی موجود نہ تھی۔ اس نے ہماری آنکھ کو کیسا تخلیق فرمایا کہ آنکھ میں متحرک پُتلی موجود فرمائی جسکے درمیان ایک سوراخ ہے جس میں سے روشنی گزرتی ہے۔ روشنی اگر زیادہ ہو تو پُتلی از خود سمٹ جاتی ہے اور اگر کم ہو تو پھیل جاتی ہے۔ آنکھ کا ہر حصہ کیمرے کی پلیٹ کی طرح ہے جسے محفوظ رکھنے کیلئے ایک سخت جلد اردگرد لگا دی گئی ہے' یہیں سے تار دماغ کو جاتے ہیں۔ جب کوئی چیز آنکھ کی پُتلی کے سوراخ سے گزر کر اس حصّے پر منعکس ہوتی ہے تو ان تاروں کے ذریعے دماغ میں ایک ارتعاش پیدا ہوتا ہے جسے وہ دیکھتا ہے۔ آنکھ دراصل صرف آلۂ بصارت ہے دیکھنے کا کام دماغ کرتا ہے۔ یہ تار اگر کسی وجہ سے بیکار ہو جائیں تو آنکھ بظاہر درست دکھائی دینے کے باوجود بصارت سے محروم

ہو جاتی ہے۔انسانی آنکھ میں سات پردے ہیں۔

(۱) قرینہ:۔یہ آنکھ کے شیشوں کی حفاظت کرتا اور آنکھ کے اس حصے کا نام ہے۔

(۲) عنبیہ:۔یہ صورِ مرسومہ کو محفوظ رکھتا ہے۔

(۳) عنکبوتیہ :۔یہ آنکھ کی رطوبت کی حفاظت اور ضروری نمی کو برقرار رکھتا ہے۔

(۴) شبکیہ:۔شب کی تاریکی میں اسی سے بینائی بحال رہتی ہے۔

(۵) میثمیہ:۔میثمیہ اور نمبر چھ یعنی

(۶) اصلبہ :۔اصلبہ دونوں مل کر وریدوں کے ذریعے آنکھ کو غذا بہم پہنچاتے ہیں۔

(۷) ملتحمہ:۔یہ آنکھ کو اصلی ہیئت میں برقرار رکھتا اور ٹیلیگرافک تاروں کے بچھے جال کو مستعمل رکھتا ہے۔

عنکبوتیہ آنکھ کی رطوبت کی حفاظت کرتا ہے۔عنبیہ صورِ مرسومہ کو محفوظ رکھتا ہے۔ملتحمہ آنکھ کو اصلی ہیئت میں قائم رکھتا ہے اور وہ عصب جن میں تلغرافی (ٹیلیگرافک) تاروں کا جال بچھا ہوا ہے محسوسات کو دماغ تک پہنچاتا ہے۔پلکیں غبار اور تیز روشنی کو روکتی ہیں اور پپوٹے رومال و برش کا کام دیتے ہیں۔

آنکھوں کے لینز شیشے کی طرح شفاف ہیں ان سے گزر کر روشنی یوں ٹیڑھی ہو جاتی ہے جس طرح کوئی لاٹھی پانی میں ڈالنے پر کج نظر آتی ہے۔اگر آنکھ سے گزرنے والی شعاعیں ٹھیک مرکزِ بصارت پر ملتی رہیں تو انسان کی نظر ٹھیک رہتی ہے اور اگر کسی بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے آنکھ کے شیشے درست کام نہ کریں تو شعاعیں یا تو مرکزِ بصارت سے آگے نکل جاتی ہیں یا پیچھے رہ جاتی ہیں جس سے دُور دیکھنے یا نزدیک دیکھنے میں خرابی کا مرض لاحق ہو جاتا ہے اور چشمہ کی مدد لینا پڑتی ہے۔ایسے مریضوں کو ایسی عینکیں دی جاتی ہیں جن کے شیشے شعاعوں کو مرکزِ بصارت سے نہ تو آگے نکلنے دیں نہ پیچھے رہنے دیں۔نزدیک بین عینک کے شیشے شعاعوں کو پھیلا کر مرکزِ بصارت تک پہنچاتے ہیں اور دُور بین عینک کے شیشے شعاعوں کو سمیٹ کر مرکزِ بصارت پر ڈالتے ہیں۔آنکھ کے سات پردوں کے علاوہ آخری طبقے میں تیس لاکھ تہیں اور تین کروڑ ستون ہیں۔

انسانی کان

کان کی اندرونی دیواریں ایک بدبودار کڑوا گوند سا خارج کرتی ہیں تا کہ گرد وغبار اور کان میں گھسنے کی کوشش کرنے والے کیڑے مکوڑے یہیں پھنس کر رہ جائیں۔ اگر سوتے وقت کوئی کیڑی یا چیونٹی وغیرہ کان میں گھس جائے تو انسان کی حالت خراب ہو جاتی ہے اس لئے قدرت نے لاڈلے انسان کیلئے یہ کڑوا رس تیار کیا کہ کان میں داخل ہونے والے حشرات داخل ہوتے ہی ہلاک ہو جائیں۔

اس گوند سے ذرا آگے ایک پردہ ہے' اس کے آگے تین ہڈیاں زنجیر کی طرح ایک دُوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔ جس طرح گاڑی کے سپرنگ ہچکولوں کو برداشت کر لیتے ہیں اسی طرح یہ بلند اور کرخت آواز کو نرم کر کے اندر پہنچاتی ہیں۔ ان ہڈیوں سے آگے طبل گوش ہے جس کے پیچھے پانی ہے۔ پانی میں چھوٹے چھوٹے بال (تار) ہیں آواز طبل گوش سے ٹکرا کر ان تاروں میں لرزش پیدا کرتی ہے اور دماغ سننے کا فرض انجام دیتا ہے گویا دیکھنے کی طرح سننے کا اصل مرکز بھی دماغ ہی ہے۔ ریڈیو سیٹ کی ایجاد انسانی کان ہی کی عمدہ نقل ہے۔

طبل گوش کے پیچھے اِن تاروں کی تعداد تین ہزار ہے اور ہر تار ایک خاص آواز سن کر جداگانہ طور پر دماغ تک پہنچاتی ہے۔ گویا ہم تین ہزار آوازیں بیک وقت سن سکتے ہیں۔ آپ نے غور کیا کہ آنکھ اور کان کی مشینریاں کس قدر پیچیدہ ہیں اور خالق تعالیٰ کا نظام کتنا دقیق ہے۔ اسی لئے تو قرآنِ حکیم میں جا بجا انسانی سمع وبصر کو الٰہی صناعی پر بطورِ شہادت پیش کیا گیا ہے:۔

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا (دھر: ۲)

ترجمہ:۔ ہم نے انسان کو مرد وزن کے نطفہ کے اختلاط سے پیدا کر کے سمع وبصر سے سرفراز کیا تا کہ دیکھیں کہ انسان اِن قوٰی کو کیسے استعمال کرتا ہے (دھر:۲)

انسانی پیدائش

انسان کی پیدائش خلیہ سے ہونے کا مختصر ذکر پچھلے صفحات میں بھی مذکور ہے' یہاں اس کی ضرورت آیت متذکرہ بالا میں اختلاطِ مرد وزن کی وضاحت کیلئے ہے کہ ہر خلیہ تقسیم ہو کر بھی مکمل رہتا

ہے۔ یہ خلیہ ایک چھوٹا سا دانہ ہے جس میں ایک دھبہ ہے جو تقسیم ہونے کے بعد بھی ہر دانے میں موجود رہتا ہے۔ یہ خلیہ رحمِ مادر میں بھی موجود ہوتا ہے لیکن اس میں منقسم و متضاعف ہونے کی استعداد نطفہ پدری کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ جونہی کہ نطفہ پدری کا اس خلیہ سے اتصال ہوتا ہے یہ تقسیم در تقسیم ہو کر تعمیر جنین میں مصروف ہو جاتا ہے اور مختلف خلیے مختلف اعضاء تعمیر کرنے لگتے ہیں۔ بعض خلیے کان، بعض ناک، بعض دل وغیرہ۔ انسانی نطفہ دس عناصر سے مرکب ہوتا ہے یعنی آکسیجن، ہائیڈروجن، کاربن، اوزوت کبریت، فاسفورس، پوٹاش، میگنیشیم، چونا اور فولاد۔ ان عناصر میں عقل و حواس موجود نہیں ہوتے مگر قدرت کی صناعی دیکھیں کہ جو شئے اس سے تیار ہوتی ہے اس میں عقل و حواس موجود ہیں۔

انسانی ناک

ناک اور منہ کے درمیان ایک سقفی ہڈی کا حجاب موجود ہے۔ یہ مُرکنی ہڈی حلق میں دراصل گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جسے ٹینٹوا یا گھنڈی کہتے ہیں۔ جب ہم کوئی چیز حلق سے نیچے اتارتے ہیں تو یہ ''گھنڈی'' ناک کی راہ کو روک لیتی ہے تا کہ غذا وغیرہ کا کوئی ذرّہ ناک میں نہ گھس سکے۔ ناک کے اندر اور آس پاس چند جگہیں ایسی ہیں جنہیں ڈھول کہا جاتا ہے۔ بولتے وقت آواز جب اِن ڈھولوں سے ٹکرا کر گزرتی ہے تو گونج پیدا ہوتی ہے۔ کثرتِ گریہ کے باعث یا زُکام میں کثرتِ بلغم کے باعث یا دیگر کسی وجہ سے ماحول ماؤف ہو جائے اور ڈھول بند ہو جائیں تو آواز بھدی ہو جاتی ہے۔

سانس لیتے اور غذا حلق سے نیچے اتارتے وقت غذائی نالی ایک خودکار پٹھے کی کارکردگی کی وجہ سے بند ہو جاتی ہے تا کہ غذا سانس کی نالی میں اور ہوا غذا کی نالی میں داخل نہ ہو سکے کیونکہ اس سے بہت تکلیف پیدا ہوتی ہے۔ سانس کی نالی، ٹھوڑی کے نیچے اور غذا کی نالی اس سے کچھ پیچھے ہے۔

ہوا کی نالی کے مُنہ پر دو تار لگے ہوئے ہیں جن کے اردگرد ایک جالی ہے۔ جب ہم بولتے ہیں تو پھیپھڑوں کی ہوا اُن تاروں سے ٹکرا کر آواز میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ انکی بناوٹ اس طرح ہے کہ معمولی تنفّس سے آواز پیدا نہیں ہوتی تا کہ سانس لینے سے ہر وقت ایک شور پیدا نہ ہوتا رہے۔ مثلاً ایک سیٹی مُنہ میں لے کر آہستہ آہستہ اوپر نیچے ہوا کھینچیں تو سیٹی کی آواز نہیں نکلے گی اور اگر زور سے پھونکیں

گے تو سیٹی سے آواز پیدا ہوگی۔ یہی حال گلے کے تاروں کا ہے۔

ستار، رُباب وغیرہ جیسے سازوں کو سُر میں لانا اِسی سے اخذ کیا گیا ہے کہ اِن سازوں کے تار اگر ڈھیلے ہوں تو آواز بے سُری اور بھدی نکلے گی اور کھینچ کر سُر میں کر لئے جائیں تو آواز صاف اور بلند نکلے گی۔ اسی طرح جب گلے کے یہ تار ڈھیلے ہوں تو گویّے کی آواز موٹی اور دھیمی ہوگی اور صاف بلند آواز نکلتے وقت یہ تار تنے ہوئے ہونگے۔ اگر کوئی اونچے سروں میں زور لگا کر گا رہا ہو تو اسکے گلے کو چھو کر یاد کیجئے کر اندازہ ہو جائیگا کہ گلا تنا ہوا یا پھولا ہوا ہے۔

ناک سونگھنے اور سانس لینے کا ذریعہ ہے اس لئے ناک کے اندرونی شروع کے حصہ میں قدرت نے بال پیدا کر رکھے ہیں تا کہ مضر ذرّات سانس کے ذریعہ اندر داخل نہ ہوں۔ اس کے علاوہ جو جراثیم وغیرہ دکھائی نہ دیتے ہوں ناک انکے وجود کی اطلاع سرسراہٹ یا بدبو کے ذریعے دماغ کو کر دیتا ہے اور انسان کسی رومال یا کپڑے وغیرہ سے ناک کو ڈھانپ لیتا ہے۔

انسانی جلد

انسان کو اللہ تعالیٰ نے عمومی طور پر پانچ حواس عطا فرما رکھے ہیں جس سے انسان کسی چیز کو قیاس کرتا ہے۔ یہ حواس خمسہ دیکھنا، سننا، چکھنا، سونگھنا اور چھونا ہیں۔ قوتِ لامسہ یعنی کسی چیز کو چھو کر محسوس کرنے کا تعلق انسانی جلد سے ہے۔ جلد کا ہر حصہ تلغرافی تاروں کے ذریعے دماغ کو پیغام بھیجتا ہے اور دماغ احکام نافذ کر دیتا ہے۔

اگر ماحول میں حرارت ضرورت سے زیادہ ہو جائے جیسا کہ موسم گرما میں عموماً ہوتا ہے تو خون اور پسینے کی نالیوں کے مسام کھل جاتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ جلد جب حرارت کی زیادت کو محسوس کرتی ہے تو خودکار نظام کے تحت جسم کو تپش آفتاب سے بچانے کیلئے دماغ کو اطلاع کرتی ہے کہ اسے پانی کی ضرورت ہے۔ جس سے پسینہ جاری ہو جاتا ہے اور جسم کے اردگرد کی حرارت بخارات میں تبدیل ہو کر جسم کو ٹھنڈا رکھنے کا باعث بن جاتی ہے۔ جس سے خون کی فاضل حرارت کم ہو جاتی ہے اور جسم معتدل ہو جاتا ہے۔ موسم سرما میں پسینے کی ضرورت نہیں ہوتی اس لئے خون کی وہ نالیاں جو پسینہ لانے والی

ہیں سرد ماحول اور موسم میں بند ہو جاتی ہیں۔

انسانی غذا

انسان کو کھانے پینے سے زیادہ سانس لینے کیلئے آکسیجن کی ضرورت پڑتی ہے۔ جب آدمی آرام سے بیٹھا ہو تو ایک گھنٹے میں تقریباً پچیس ہزار مکعب سینٹی میٹر آکسیجن استعمال کرتا ہے۔ کھانے کے بعد چھتیس ہزار اور ورزش کے دوران یہ مقدار اسّی ہزار مکعب سنٹی میٹر تک پہنچ جاتی ہے۔ سرد ماحول یا موسم سرما میں جسم کو گرم رکھنے کیلئے آکسیجن کی زیادہ مقدار درکار ہوتی ہے اور اسی لئے بھوک بھی زیادہ لگتی ہے۔ ہمیں اپنی غذا میں پانچ چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۱)۔ پانی

(۲) چربی

(۳) نمک

(۴) ہائیڈروجنی آکسیجن اور کاربنی مرکبات، جنہیں کاربوہائیڈریٹ کہتے ہیں۔

(۵) نائٹروجنی مرکبات، جنہیں لحمیات یا پروٹینز کہا جاتا ہے۔

یہ غذا ہمیں گوشت، مچھلی، مکھن، دودھ، پھل سبزی، اجناس (مثلاً گندم جَو جوار مکئی اور چاول وغیرہ) اور مٹھاس جیسے کھانڈ شہد وغیرہ سے میسر آتی ہے۔ آدمی کو روزانہ تین پونڈ غذا درکار ہوتی ہے، دنیا بھر کے انسان ہر روز چھ ارب پونڈ یعنی سات کروڑ پچاس لاکھ من غذا کھاتے ہیں۔ چربی دار غذاؤں کی کاربن اور ہائیڈروجن، آکسیجن سے مل کر زیادہ حرارت پیدا کرتی ہیں۔ لحمیات کثرتِ آب کی وجہ سے کم گرم ہوتی ہیں۔ دودھ ہر لحاظ سے بہترین غذا ہے۔ ہمارے جسم میں نائٹروجن کا کچھ حصہ ناخن اور بال اگانے پر صرف ہوتا ہے اور باقی پسینے اور پیشاب وغیرہ میں مل کر خارج ہو جاتا ہے۔ بالوں پر یومیہ اعشاریہ انتیس گرام اور ناخنوں پر اعشاریہ سات گرام نائٹروجن خرچ ہوتی ہے۔ سانس کے ذریعے جس قدر نائٹروجن روزانہ خرچ ہوتی ہے اس کی تفصیل یوں ہے کہ بے کار آدمی ایک گھنٹے میں اعشاریہ صفر سات گرام، معمولی کام کرنے والا اعشاریہ ایک تین گرام اور سخت کام کرنے والا اعشاریہ دو دو گرام

نائٹروجن خارج کرتا ہے۔

بھوک کی حالت میں نائٹروجن اور چربی دونوں جلتی ہیں جبکہ محنت کرنے پر صرف چربی خرچ ہوتی ہے۔نشاستہ آرام ومحنت ہر دوصورت میں جلتا ہے اور چربی کو جلنے سے بچاتا ہے۔نشاستہ جسم سے باہر نہیں جلتا لیکن جسم میں بہت جلد جل جاتا ہے جبکہ چربی باہر تو جلد پگھلتی ہے مگر جزوِ بدن بننے کے بعد بڑی مشکل سے حل ہوتی ہے۔جسم میں حرارت' جسامت کے مطابق ہوتی ہے اسی وجہ سے لمبے اور جسیم آدمی کو بھوک زیادہ لگتی ہے۔

حیاتیہ (وٹامن)

مختلف غذاؤں میں جو وٹامن پائے جاتے ہیں نظامِ جسمانی کے اہم عناصر ہیں۔اس وقت تک ہمیں حیاتیہ کی آٹھ اقسام معلوم ہوچکی ہیں :(۱) وٹامن اے' (۲)وٹامن بی(ا)' (۳)وٹامن بی(ب)' (۴)وٹامن بی(ج)'(۵)وٹامن بی(د)'(۶)وٹامن سی'(۷)وٹامن ڈی'اور(۸)وٹامن اِی۔

۱۔ وٹامنA کی غیر موجودگی میں جسمانی نشوونما رُک جاتی ہے نیز آنکھوں کے پپوٹوں کو بیماری لاحق ہوجاتی ہے۔یہ حیاتیہ مچھلی کے تیل مکھن اور انڈوں میں بکثرت ہوتا ہے۔

۲۔ وٹامنB (ا) کی غیر موجودگی ٹانگوں کو کمزور کردیتی ہے۔

۳۔ وٹامنB(ب) کی غیر موجودگی میں ناسور کی عام شکایت رہتی ہے۔

۴۔۵ وٹامنB(ج)اور B(د) بھی جسمانی نشوونما کیلئے ضروری ہیں یہ حیاتیے پھلوں کے بیجوں انڈوں اور غلوں (اجناس) میں پائے جاتے ہیں۔

۶۔ وٹامنC یہ حیاتیہ پھلوں اور سبزیوں میں بکثرت ہوتا ہے' تازگیٔ دماغ صفائی خون اور جلد کی شادابی کیلئے ازبس مفید ہے۔

۷۔ وٹامنD کی غیر موجودگی میں ہڈیاں کمزور اور دانتوں کی پیچیدگیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔

۸۔ وٹامنE کی غیر موجودگی میں قوت رجولیت جواب دے جاتی ہے یہ حیاتیہ سبزی کے تیلوں اور پتوں میں پایا جاتا ہے۔

غذا خوش شکل اور خوشبودار ہو تو بہتر ہے وگرنہ اسے ہضم کرنے کا انتظام قدرت نے یہ کر رکھا ہے کہ حلق سے اترنے کے بعد یہ ایک تھیلی (معدہ) میں پہنچتی ہے جس کی دیواروں سے ایک ترش رس نکل کر پہلے ہی جمع ہو جاتا ہے اور غذا میں حل ہو کر اسے جزوِ بدن بناتا ہے۔ چونکہ کھانے کی خوشبو اشتہاء میں اضافے کا باعث بنتی ہے اور شامہ دماغ کو اطلاع کرتا ہے چنانچہ دماغ معدے اور منہ کے گلینڈز کو حکم نافذ کرتا ہے کہ وہ ہاضمے کے رس کو تیار کریں جسے منہ میں پانی بھر آنا بھی کہا جاتا ہے۔ غذا ہضم ہونے کے بعد ایک لمبی نالی سے ہو کر چھوٹی آنت میں سے گزرتی ہوئی بڑی آنت تک چلی جاتی ہے اور راستے میں ہر مقام پر چربی، شکر، نشاستہ و دیگر اجزائے غذا چھوڑتی آتی ہے۔ یہ اجزاء کچھ تو معدہ میں اور بقیہ انتڑیوں کی دیواروں میں جذب ہوتے ہوئے خون میں چلے جاتے ہیں اور فضلہ باہر نکل جاتا ہے۔

انسانی جگر

جگر صفرا و شکر ہر دو کا خزانہ ہے۔ جب انسانی اعضاء و اعصاب کام کر رہے ہوں تو انہیں شکر کی ضرورت ہوتی ہے جو جگر سے نکل کر بذریعہ خون مقامِ ضرورت تک جاتی ہے۔ جب غذا معدے میں پہنچتی ہے تو اس میں تین رس شامل ہو جاتے ہیں ایک معدے کی دیواروں سے خارج ہوتا ہے دوسرا جگر سے نکل کر شامل ہوتا ہے اور تیسرا ایک گلٹی (PANCREAS) سے نکلتا ہے۔

جگر سے صفرا بھی بدن کی ضرورت کے مطابق خارج ہو کر خون میں شامل ہوتا ہے البتہ کسی کو سردی زیادہ لگ جائے تو جسم کو گرم کرنے کیلئے جگر بسا اوقات اس قدر صفرا خارج کرتا ہے کہ جسم، چہرہ اور آنکھیں زرد ہو جاتے ہیں یہ ایک مرض ہے جس کا نام یرقان ہے۔ گردوں کے پاس بھی ایک گلٹی ہے جو دورانِ خون کو بڑھانے کیلئے ایک رس خارج کرتی ہے یہ اس لئے ہے کہ دورانِ خون میں کسی قسم کی رکاوٹ کو دور کرے، جس سے نبض کی رفتار مناسب رہتی ہے۔ کسی خوف یا سخت پریشانی کی حالت میں یہ گلٹی زیادہ رس خارج کرتی ہے جس سے دورانِ خون تیز ہو جاتا ہے۔ اس رس کے اجزاء: کاربن-۵۹، ہائیڈروجن ۱-۷، آکسیجن ۷-۷ ہیں۔

گردن کے پاس بھی ایک گلٹی (THYROID GLAND) ہے جو نہایت مفید رس خارج کرتی

ہے۔ اگر کسی وجہ سے یہ رس تمام جسم میں نہ پہنچ سکے تو یہ گلٹی زور لگا کر زیادہ رس نکالنے کی کوشش میں پھول بھی جاتی ہے اور گردن کے نیچے بڑے بڑے گلہڑ بن جاتے ہیں۔ یہ بیماری ان علاقوں میں عام ہوتی ہے جہاں پانی میں آیوڈین موجود نہ ہو۔ آیوڈین ہمارے جسمانی نظام کا ایک ضروری جزو ہے جس کی کمی کے باعث انسانی یاداشت کمزور اور ناقص ہو جاتی ہے۔ اگر یہ عنصر پانی میں موجود نہ ہو تو یہ کمی اس گلٹی کو پوری کرنی پڑتی ہے اور زور لگانے کے باعث پھول جاتی ہے۔ اس سے خارج ہونے والے رس میں صرف آئیوڈین ہی نہیں بلکہ یہ کاربن ۴-۲۳' ہائیڈروجن ۴-۱' نائٹروجن ۸-۱' اور آیوڈین ۴-۶۵ کا مرکب ہے۔ اگر پانی کے ایک کروڑ قطروں میں اس رس کا ایک قطرہ ٹپکا دیا جائے اور اس پانی میں مینڈک کے بچے موجود ہوں تو وہ اپنے معمول سے جلدی جوان ہو جاتے ہیں۔

انسانی تنفّس

جب ہم سانس لیتے ہیں ہوا گلے کی بڑی نالی سے گزر کر دو چھوٹی نالیوں میں داخل ہوتی ہوئی سیدھی پھیپھڑوں میں جاتی ہے۔ پھیپھڑوں اور معدے کے درمیان ایک ایسا پٹھا ہے جس پر تنفس کے وقت دباؤ پڑتا ہے اور اس دباؤ سے دھونکنی کی طرح معدہ بار بار پھولتا پچکتا ہے۔ پھیپھڑوں میں ہوا بھی موجود ہے اور خون بھی' لیکن ہر دو کے خانے جدا جدا ہیں۔ پھیپھڑوں میں ہوا کی موجودگی کے دو فائدے ہیں اوّل یہیں سے تازہ ہوا خون میں شامل ہوتی ہے دوم جب جمائی یا انگڑائی لیتے ہیں تو پھیپھڑوں پر دباؤ پڑتا ہے مگر پہلے سے موجود ہوا دباؤ کو اسی طرح غیر محسوس بنا دیتی ہے جس طرح گدّیوں کے سپرنگ ہچکولوں کو جذب کر لیتے ہیں۔ عموماً ہمیں جسم کے کسی خاص مقام کی طرف خون کو بھیجنے کیلئے پھیپھڑوں کو سکیڑنا پڑتا ہے تاکہ دماغ کو سمجھنے یا کچھ یاد کرنے میں آسانی بہم پہنچے۔ کسی آہستہ آواز' سرگوشی یا آہٹ کو سننے کی کوشش میں بھی خون کو کانوں کی طرف بھیجنا پڑتا ہے۔ ورزش وغیرہ یا دوڑنے کی حالت میں خود پھیپھڑوں کو زیادہ خون صاف کرنے کی ضرورت درپیش ہوتی ہے کیونکہ دوڑ دُھوپ میں خون میں آلودگی زیادہ پیدا ہوتی ہے جسے جلد خارج کرنے کیلئے پھیپھڑے جلدی جلدی تازہ ہوا کھینچتے اور آلودہ ہوا خارج کرنے لگتے ہیں جسے ہم ہانپنا کہتے ہیں۔

انسانی دِل

دل کے دو بڑے حصے ہیں دایاں حصہ خون کو پھیپھڑوں میں بھیجتا ہے جہاں سے صاف ہوکر بائیں حصے میں داخل ہوکر تمام جسم میں جاتا ہے۔تمام رگوں کے منہ پر چند پٹھے ہوتے ہیں جو بوقت ضرورت رگوں کا منہ بند کر لیتے اور ضرورت کے وقت کھول دیتے ہیں۔ جب کوئی دماغی کام کر رہا ہو تو دماغ کو خون کی اضافی ضرورت پڑتی ہے جبکہ پیٹ کو کم۔ایسی حالت میں پیٹ والی رگوں کے منہ بند ہو جائیں گے اور خون دماغ کی طرف چلا جائے گا۔کھانا کھانے پر معدہ کو خون کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے اس لئے دماغی عروق کا منہ بند ہو جائے گا۔

دل کا پمپ ہوا کے دباؤ سے خون کو تمام جسم میں بھیجتا ہے۔اوّل پھیپھڑوں میں صفائی کیلئے اور دوسرے خون کے سست رفتار ریلے کو تیز کرنے کیلئے۔یوں تو جسم کے ہر حصے کا خون واپسی میں سیدھا دل میں جاتا ہے لیکن انتڑیوں کا خون شکر کا ذخیرہ ہمراہ لئے پہلے جگر میں داخل ہوتا ہے اور پھر وہاں سے صاف ہونے کیلئے دل میں جاتا ہے۔

خون میں دو قسم کے ذرّات ہوتے ہیں سرخ اور سفید۔سرخ ذرّوں کو ہیموگلوبن کہتے (HAEMOGLOBIN) کہتے ہیں۔ان میں فولاد زیادہ ہوتا ہے۔اگر ان سرخ ذرّوں پر ہوا کا دباؤ ڈالا جائے تو یہ فوراً آکسیجن جذب کر لیتے ہیں اور دباؤ ہٹا لیا جائے تو آکسیجن علیحدہ ہو جاتی ہے۔اسلئے جب خون پھیپھڑوں میں آتا ہے تو ہوائی دباؤ سے آکسیجن قبول کر لیتا ہے اور جب جسم کے بعض اُن حصوں میں پہنچتا ہے جہاں آکسیجن نہیں ہوتی تو ہوا کا دباؤ کم ہو جاتا ہے اور آکسیجن علیحدہ ہو جاتی ہے۔

جب خون جسم سے پھیپھڑوں کی طرف صفائی کیلئے واپس جاتا ہے تو راستے میں سوڈے کی خاصی مقدار خون میں شامل ہو چکی ہوتی ہے کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ سرخ ذرّات اور سوڈا مل کر کاربن جذب کرتے ہیں چنانچہ واپسی پر خون کاربن کو سمیٹ کر پھیپھڑوں میں لے آتا ہے جہاں ایک کیمیائی عمل سے کاربن ڈائی اکسائڈ علیحدہ ہو کر سانس کے ذریعے باہر نکل جاتی ہے اور خون آکسیجن لے کر سوڈے سمیت واپس چلا جاتا ہے۔یہاں سوڈا راستے میں رہ جاتا ہے اور آکسیجن عروق و اعصاب میں چلی جاتی

ہے۔خون کے یہ سرخ ذرّات بڑی ہڈیوں کے گودے (مخ) میں تیار ہوتے ہیں۔ ہر ذرّہ صرف دس دن تک کیلئے کام دیتا ہے اور اس کے بعد بیکار ہو کر تلی میں گر جاتا ہے۔تلی دراصل بیکار سرخ دانوں کا گندہ ڈسٹ بن ہے۔

خون میں سفید ذرّات

خون کے سفید ذرّات مختلف قسم کے ہوتے ہیں جنہیں پلیٹ لیٹس کہتے ہیں یہ گول لمبے یا چپٹے وغیرہ کی شکل رکھتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی جسم کو مختلف قسم کے زخم وغیرہ آتے رہتے ہیں' یہ ذرّات مقام مجروح پر پہنچ کر شریانوں کے منہ میں پھنس جاتے ہیں اور اوپر تہہ در تہہ جم جاتے ہیں جس سے زخم بھر جاتا ہے۔ یہ ذرّات امراض کے جراثیموں سے باقاعدہ جنگ کرتے ہیں۔زخموں یا پھوڑوں سے جو پیپ خارج ہوتی ہے دراصل انہیں ذرّات کی لاشیں ہوتی ہیں۔

انسانی دماغ

ہمارا دماغ کھوپڑی کے مضبوط قلعے میں پانی کے اندر تیر رہا ہے تاکہ اچھل کود اور معمولی ٹکرانے سے دماغ کسی نقصان سے محفوظ رہے۔ ریڑھ کی چھلے دار ہڈی کمر کی جانب دماغ سے نکل کر پیٹھ تک جاتی ہے اسکی سینکڑوں رگیں الگ الگ جسم میں پھیلی ہوئی ہیں جن میں دوہرا نظام جاری ہے۔ جس طرح ٹیلیفون میں دو تار کا نظام ہے ایک سننے کیلئے اور دوسرا پیغام دینے کیلئے اسی طرح جسم کے ہر حصے میں پیغام بھیجنے اور لینے کیلئے علیحدہ علیحدہ تار (حساس رگیں) ہیں۔مثلاً اگر پاؤں پر کوئی کیڑا مکوڑا چڑھ آئے تو فوراً ایک تار سے دماغ کو اطلاع جاتی ہے اور دوسرے تار سے دماغ کی طرف سے ہاتھ کو حکم ملتا ہے کہ مکوڑے کو مار بھگاؤ۔

بعض حالات میں دماغ ضرورت کے مطابق عضلات و اعصاب کو خون لینے یا روکنے کا حکم بھی نافذ کرتا ہے۔مثلاً کوئی شخص ہم پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو فوراً دماغ سے مختلف اعضاء کو مختلف احکام جاری ہونگے' بھویں تن جائیں گی' نتھنے پھول جائیں گے' آنکھیں سرخ ہو جائیں گی اور دل تیز تیز دھڑکنے لگے گا تاکہ خون کی مناسب مقدار اُن تمام اعضاء تک پہنچائی جا سکے جن سے اِس وقت کام لیا جا رہا ہے۔

جسمانی دکھ جسے ہر کوئی ناپسند کرتا ہے دیکھا جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کی ایک رحمت ہے۔ یہ دراصل دماغ کے لئے ایک پیغام ہوتا ہے کہ ہوشیار ہو جایئے خطرہ سر پر آ گیا ہے۔ اگر جسمانی اذیّت نہ ہوتی تو ہر روز لاکھوں انسان بے خبری میں مر جاتے۔ فرض کریں کسی کے دماغ میں پھوڑا نکل آتا ہے یا اپینڈیکس پھٹنے کے قریب ہے مگر تکلیف کا احساس نہ ہونے کی وجہ سے دماغ کو خبر ہی نہ ہو پائے تو ایسی صورت میں مریض بلا علاج رہتے ہوئے ہلاک ہو جائیگا۔

جب ہم اچانک سانپ کی پھنکار سنتے ہیں تو کان فوری طور پر دماغ کو اطلاع دیتے ہیں اور جوابی تار سے دماغ ہمیں فوراً کود کر خطرہ سے دُور ہٹ جانے کا حکم نافذ کرتا ہے اور ہم بے اختیار اچھل کر سانپ سے دُور ہو جاتے ہیں۔ بعض چھوٹے چھوٹے پرندے سانپ کو دیکھ کر اس لئے سن ہو جاتے ہیں کہ گھبراہٹ میں انکے دل کا زیادہ تر خون دماغ کی طرف چلا جاتا ہے اور وہ بیچارے بوکھلا کر پرواز کی طاقت رکھتے ہوئے بھی لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔

انسانوں کے ساتھ بھی ایسے معاملات پیش آتے ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ یورک ایسڈ اور بعض دیگر زہروں کی وجہ سے احکام وصول کرنے والے بعض تار تباہ ہو جاتے ہیں اور خطرہ کے وقت دماغ کے احکام بعض اعضاء تک نہیں پہنچ پاتے۔ اسی لئے بعض لوگ جلد بدحواس ہو جاتے ہیں۔ چونکہ دماغ کا تعلق جسم کے تمام حصوں سے تلغرافی تاروں سے مربوط ہے اسلئے کسی حادثہ کی وجہ سے یہ تار کمر کے پاس سے کٹ جائیں تو نچلا دھڑ بے حرکت ہو جائیگا۔ اگر اُن تاروں کو نقصان پہنچ جائے جن کا تعلق چشم و گوش سے ہے تو انسان اندھا اور بہرہ ہو کر رہ جائیگا۔

دماغ کے دو حصے ہوتے ہیں اندرونی حصہ جو سفید ہے اور دوسرا بیرونی جو خاکستری رنگ کا ہوتا ہے، ہر دو حصے آپس میں وابستہ ہیں۔ بیرونی دماغ میں بہت ابھار سے نظر آتے ہیں جو دراصل محسوسات مشمومات و معقولات وغیرہ کے مرکز ہیں۔ بعض ابھار احساس بعض شم بعض تخیل بعض کتابت اور بعض ریاضی و منطق وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر کسی حادثہ سے کسی خاص ابھار کو نقصان پہنچ جائے تو وہی طاقت کم یا مفقود ہو گی بقیہ متاثر نہیں ہونگی۔ اسی وجہ سے بعض بچے کسی خاص مضمون میں دلچسپی نہیں

لے سکتے اور اس میں کمزور ہوتے ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹا دماغ سولہ اونس اور بڑے سے بڑا چونسٹھ اونس (قریباً دو کلو) کا ہوتا ہے۔

الغرض جسم انسانی ایک حیرت ناک مشین ہے جس کا ہر پرزہ اس خالق جلیل کی پرشکوہ صناعی و خلاقی کی ایک روح افزا داستان رقم کرتا ہے۔ مندرجہ بالا تمام معلومات مہیا کرنے سے آپ کو علم طب سے رُوشناس کرانا مقصود نہیں بلکہ احسن الخالقین کی شاہکاریوں سے متعارف کروانا مقصود ہے۔ انصاف سے کہیں کہ نظامِ تخلیق کے اس حیرت کدہ کو حادثہ یا اتفاق کا نام دیکر خود کو دھوکہ دینا روا ہے۔ یا پھر واقعی اپنے پیدا کرنے والے کے کمالات سے متاثر نہیں ہوئے اور ابھی تک خود کو کسی اتفاقی حادثہ کی پیداوار سمجھ رہے ہیں۔

آیاتِ محکمات و متشابہات

قرآن حکیم میں آیات کی دو قسمیں بتائی گئی ہیں' محکمات اور متشابہات۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ ان اصطلاحات کا مفہوم کیا ہے؟ ''محکمۃ'' کے لغوی معنی ہیں' فلسفہ' دانش' علم' حُکم' یقین' کلام حق اور وہ سبق جو تجربہ و تحقیق کے نتیجہ میں حاصل ہو اور سچ ثابت ہوا ہو۔ (المنجد)

آیاتِ محکمات سے مراد وہ آیات ہیں جو فیصلہ کی گئی اور دلائل سے ثابت کی گئی ہوں یعنی جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت کی تفصیل عطا فرمائی ہو جس سے وہ واضح ہو چکی ہوں اور جن پر عمل پیرائی کا لازمی نتیجہ خوشنودیٔ پروردگار کا حصول اور تمکن فی الارض بحیثیت خلیفۃ اللہ فی الارض ہو۔ یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ وہ اخروی ابدی زندگی میں بھی کامیاب و سرخ رُو ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے بار بار فرمایا کہ قانون شکن اور مجرم اقوام دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتیں اور اس سلسلے میں فرعون و نمرود' عاد و ثمود اور چند دیگر تباہ شدہ اقوام کا متعدد مرتبہ حوالہ دیا گیا ہے۔ حکومتِ ارضی نیابتِ الٰہیہ کا دوسرا نام ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک بداخلاق قوم کو کبھی اپنا نائب نہیں بناتا۔ وقتی طور پر کسی بد اطوار قوم پر کسی ظالم و جابر حاکم کا تقرر قوم کو نصیحت پکڑنے اور رُجوع باللہ ہونے کی دعوت تو ہو سکتا ہے لیکن مستقل قانون نہیں کہ ایسی اقوام تادیر قائم رہیں اور (جیسی قوم ہوگی ویسا حاکم مقرر کر دونگا) کا فرمانِ قرآن اس کے مطابق ہے۔

متشابہات کے متعلق ایک حدیث ملتی ہے جس کا ملخص یہ ہے کہ متشابہات کی تفصیل اللہ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ بعض کے نزدیک یہ حدیث ضعیف ہے۔ قطع نظر اس بات سے کہ یہ حدیث صحیح ہے یا من گھڑت' ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ بہت سی باتیں کسی عالم کیلئے محکمات ہیں اور وہی باتیں ایک لاعلم کے لئے متشابہ ہیں۔ رنگوں کا علم آنکھ والے کسی بینا کیلئے تو محکم ہے مگر نابینا کیلئے متشابہات میں سے ہے۔ اسی طرح انکشافاتِ جدیدہ سینکڑوں ایسی آیات کو محکم بنا چکے ہیں جو کل تک متشابہ تھیں۔ البتہ چند قرآنی

سورتوں کے شروع میں وہ حروف ''الٓمٓ حٰمٓ قٓ'' وغیرہ جن کا آج تک ترجمہ نہیں کیا جا سکا بلاشبہ متشابہات میں شامل ہیں۔لیکن وہ آیات جو کسی زمانہ میں تو متشابہ میں شامل رہی ہوں مگر تحقیق کے ساتھ ساتھ محکمات میں شامل ہوتی گئیں انہیں متشابہات میں سے ہی قرار دینا ہماری ناقص العلمی کی دلیل ہے۔مثلاً جب فرعون غرق ہوا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ (یونس: ۹۲)

''آج ہم تیرے بدن کو بچا کر رکھیں گے تا کہ تو آنے والی نسلوں کیلئے ایک نشان عبرت بن جائے اور بیشک بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں'' (یونس:۹۲)

یہ آیت کتنی صدیوں تک متشابہ رہی' تیرہ سو برس ہمارے مفسرین حیران رہے کہ آخر یہ ''بدن کو بچانے'' کا مطلب کیا ہے۔اس صدی کے ربعِ اوّل میں جب فرعون کی لاش برآمد ہو کر باعث عبرت ہوگئی تو متشابہ نہ رہی بلکہ محکمات میں شامل ہوگئی۔متشابہ کے لغوی معنی ہیں مخفی' مشکوک' مشکل اور غیر یقینی ہونا وغیرہ۔

نہ صرف قرآنی آیات میں بلکہ آفاقی آیات میں بھی لاکھوں حقائق ہماری نگاہوں سے مخفی یعنی متشابہ ہیں۔آج سے ڈیڑھ صدی قبل کسے معلوم تھا کہ ''ایٹر'' کیا ہے' رنگ کی حقیقت کیا ہے' عناصر کی تعداد کتنی ہے' ستاروں کی تعداد اور انکی گزرگاہوں کی کیفیت کیا ہے' یہ سب سربستہ راز تھے بہ الفاظِ دیگر یہ متشابہات تھے جنہیں انسانی تحقیق وجستجو نے محکم بنا دیا۔اس بات پر غور کیا جائے تو یہ متشابہاتِ کائنات کبھی متشابہ تھے ہی نہیں کیونکہ انکی اطلاع تو قرآن ہمیں بہت پہلے سے دے چکا تھا۔مگر ہمیں غور وفکر کی توفیق کم ہوئی اور یہ بازی علمائے مغرب لے گئے۔

مثلاً: علمائے مغرب نے انتھک تحقیق وتلاش کے بعد انکشاف کیا کہ فضائے سماوی میں کروڑوں آفتاب ومہتاب سرگرمِ سفر ہیں۔جبکہ (زاریات:۷) میں ساڑھے چودہ سو سال قبل سے موجود فرمانِ خالق تعالیٰ ہے:۔وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ''اُن بلندیوں کی قسم جن میں ستاروں کی شاہراہوں کا جال بچھا ہوا ہے''۔

علمائے فرنگ نے انکشاف کیا کہ کرّہ ارض پر ایک ایسا زمانہ بھی گزر چکا ہے جب اس میں پہاڑوں کا سلسلہ موجود نہیں تھا اور زمین کم وبیش دس ہزار فٹ گہرے پانی میں از سرتا پا ڈوبی ہوئی تھی۔ قرآن نے فرمایا:۔

" وَّ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ " (سورۃ ہود:۷)

''ایک ایسا وقت بھی گزر چکا ہے جب اللہ کا تخت پانی پر تھا''۔(سورۃ ہود:۷)

طبیعینِ یورپ نے کہا کہ پودوں میں بعض نر ہوتے ہیں اور بعض مادہ۔نر یا مادہ میں سے کسی ایک کو ختم کر دیا جائے تو نباتات کی نشوونما رُک جائے اور ساتھ ہی ساتھ زندگی کا بھی خاتمہ ہو جائے۔ جبکہ قرآن کا صدیوں پرانا اعلان ہے:۔

وَ تَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ وَ اَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيْجٍ (الحج:۵)

ترجمہ۔تم زمین کو دیکھتے ہو کہ پیاسی ہوتی ہے پھر جب ہم بارش برساتے ہیں تو خوش ہوتی ہے اسکے قوائے نمو بیدار ہو جاتے ہیں اور وہ ہر قسم کے درختوں کے جوڑے اگانے لگ پڑتی ہے'' (الحج:۵)

مشہور ماہر فلکیات سر جیمز نے اپنی چالیس سالہ زندگی کا نچوڑ بیان کرتے ہوئے کہا:۔

''میں فلکیات میں چالیس برس تک غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جس طرح ایک مصنّف کو سمجھنے کے لئے اسکی کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے اسی طرح GOD کو سمجھنے کیلئے اس کی کتابِ فطرت میں غور کرنا لازمی ہے۔ہم خالق کی محیر العقول صناعیوں میں جوں جوں غور کرتے ہیں اسکی عظمت وحکمت کے پردے اٹھتے چلے جاتے ہیں۔وہ افقِ نگاہ کے قریب آتا محسوس ہوتا ہے اور جب زیادہ قریب آجاتا ہے تو قلب ونظر اس کی بیکراں عظمتوں کے سامنے سربسجود ہو جاتے ہیں۔ہمالیہ دُور سے تو ایک چھوٹا سا ٹیلہ دکھائی دیتا ہے مگر قریب سے شیروں کے کلیجے دھڑکنے لگتے ہیں۔جہالت وہ مسافت ہے جو خدا وانسان کے درمیان حائل ہو تو خدا چھوٹا دکھائی دیتا ہے اور علم وہ نردبان ہے جو ہمیں جوارِ قدس میں پہنچا دیتا ہے۔قریب پہنچ کر ہم

اپنے خالق کے جلال وعظمت سے سہم جاتے ہیں۔اگر دوسرے لفظوں میں کہوں تو خدا سے ڈرنے کا امتیاز ایک صاحب علم کو ہی ہوسکتا ہے''۔

یہ تو تھا سر جیمز کا خیال اب اللہ تعالیٰ کی رائے ملاحظہ ہو:۔

" اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا ط " (سورۃ فاطر:۲۸)

''یاد رکھو اللہ سے اہل علم ہی ڈر سکتے ہیں''۔

ان تفاصیل کا ملخص یہ ہے کہ قرآن کی سینکڑوں آیات آج سے سو سال پہلے متشابہ تھیں لیکن اب وہ محکم بن چکی ہیں۔متشابہات دراصل وہ سربستہ حقائق ہیں جن کو صرف علم ہی بے حجاب کرسکتا ہے۔ علم سے مراد وہ علم نہیں جو ہماری بدقسمتی سے صرف وٹوانی کے ڈھیلے' حلوے اور مرغے تک محدود ہے بلکہ فطرت کا وہ بے پناہ علم جس کے انتہائی ادارے آج صرف زمین فرنگ میں ملتے ہیں۔

ہر چند کے کہ انکشافاتِ نو نے بعض آیات کو حل کر دیا ہے تاہم قرآنِ عظیم میں سینکڑوں ایسی آیات موجود ہیں جو ہنوز راز ہیں اور نہ جانے کب تک رہیں گی۔مثلاً:۔

" یَخْلُقُکُمْ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّھٰتِکُمْ خَلْقًا مِّنْ م بَعْدِ خَلْقٍ فِیْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ..... ط "

(الزمر:٦)

ترجمہ:۔''اللہ نے تمہیں ماؤں کے بطن سے پیدا کیا یہ ایک تخلیق تھی ایک اور تخلیق کے بعد تین اندھیروں میں''۔۔۔۔ (الزمر:٦)

تکوین جنین پر مشرق ومغرب کا سارا لٹریچر چھان ماریئے خط کشیدہ حصص کی تفسیر کہیں نہیں ملے گی۔اسی طرح " سَبْعَ سَمٰوٰتٍ " ہنوز عیاں نہیں ہوا۔محققین مغرب نے تا حال خلا میں صرف تین شفاف دیواریں دریافت کی ہیں' جن میں سے ایک بجلی کی لہروں کو دوسری آواز کو اور تیسری وائلٹ شعاعوں کے اس زہریلے سیلاب کو روکتی ہے' جو یہاں سے چند سو میل اوپر آتش فشانی لاوے کی طرح کھول رہا ہے۔اگر اللہ تعالیٰ ان شفاف دیواروں میں کسی شگاف کو جگہ دیدے تو سطح زمین کی زندگی صرف ایک لمحے میں ختم ہو جائے۔

جو آیات ہمیں اس وقت متشابہات معلوم ہو رہی ہیں وہ ہماری کم علمی کی بناء پر راز بنی ہوئی ہیں

جس طرح ایک ادیب کیلئے ریاضی کے انتہائی فارمولے اور کسی خشک ملّا کیلئے رموزاتِ موسیقی متشابہات ہیں اور دوسروں کیلئے محکمات' اسی طرح قرآن عظیم کے بعض حقائق ہمارے لئے متشابہات ہیں ورنہ دراصل وہ ایسے محکمات ہیں جنہیں علم کی نگاہ رسا کسی نہ کسی وقت دیکھ ہی لے گی۔ یہ راز کب حل ہونگے فی الحال کوئی نہیں جانتا۔ علم اور وسائل علم بڑھ رہے ہیں ہر روز تازہ انکشافات ہو رہے ہیں اور ایک ایسا زمانہ آ کر رہے گا جب قرآنِ عظیم کی تمام متشابہات محکمات میں بدل جائیں گی۔ کیونکہ تمام علومِ محکمات ومتشابہات تو میرے حکیم ودانا رب کے پاس ہیں جو اپنے طلب کرنے والوں کو کبھی مایوس نہیں فرماتا۔

اُم الکتاب

ہم نے اکثر آیاتِ قرآنیہ میں اُم الکتاب کا ذکر پڑھا کہ یہ بات اُم الکتاب میں تحریر ہے۔ کیا یہ ضروری نہیں کہ اُم الکتاب کی شرح پر نظر ڈال لی جائے۔ علمی دنیا سے ذرا اَخلاقی دنیا میں آیئے اور اِردگرد کے لوگوں سے پوچھئے کہ کیا واقعی جھوٹ بولنے اور حرام کھانے سے اقوام تباہ ہو جاتی ہیں؟ ہمارے معاشرے میں ہر شخص یہی جواب دیگا کہ حضرت عقل کے ناخن لو یہ کونسا فلسفہ نکال بیٹھے ہو' بھلا جھوٹ بولنے یا حرام کھانے کا کسی قوم کی فنا و بقا سے کیا تعلق؟ اب ایسے دوستوں کو کون سمجھائے کہ آدمؑ سے لے کر اب تک دنیا کی سیکڑوں ہا اقوام صرف انہی دو رذائل کی وجہ سے تباہ ہوئی ہیں۔ یہ دو برائیاں اُمہات القبائح ہیں اور اپنے جلو میں بیسیوں دیگر خبائث لاتی ہیں۔ گویا اُمّ کسی اچھائی یا برائی کی ماں ہے جس سے اطوار پیدا ہوتے ہیں اصول وقوانین جنم لیتے ہیں اور انہی پر ہمارے انجامِ نیک وبد کا انحصار ہے۔

مثلاً بطلیموس کا نظامِ فلکی غلط تھا یا صحیح' ہم نہیں جانتے۔ لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ وہ اُن تمام نظاموں کی ماں تھا جو بعد میں مرتب ہوئے۔ آج ڈارون کے نظریۂ ارتقاء میں کافی ردّوبدل کیا جا چکا ہے لیکن یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ اس کا نظریہ دیگر تمام نظریاتِ ارتقاء کا بابا آدم تھا۔ اگر ڈارون اپنا اچھوتا خیال (انسان پہلے بندر تھا) پیش نہ کرتا تو شاید دیگر محققین کی توجہ ابھی تک اس مسئلے کی طرف مبذول ہی نہ ہوئی ہوتی۔ حکیم ہیری ہس، نظریۂ سال وماہ' ویمقراطیس، نظریۂ اجزائے لایتجزیٰ اور ہرکلائیس، نظریۂ گردشِ ارض کے مفسر اوّل تھے اور انکے نظریات اِن اصنافِ علوم میں اُمہات المسائل تھے۔

قرآن حکیم میں نظریاتِ جدیدہ کے متعلق مفصّل یا مجمل اشارات ملتے ہیں جیسے:۔

(۱) نظریۂ ارتقاء

(۲) نظریۂ ذرّات (الیکٹرون، ایٹم، مالیکیول وغیرہ)

(۳) نظریۂ گردشِ ارض

(۴) نظریۂ گردش آفتاب

(۵) نظریۂ ازواجِ نباتات

(۶) نظریۂ بقائے اصلح

(۷) نظریۂ ایثر

(۸) نظریۂ حیات بعد الموت

(۹) نظریہء موت در حیات (خواب وغیرہ)

(۱۰) نظریۂ مسرت والم وغیرہ

گویا آج اگر ہرشل نے سورج کو متحرک ثابت کیا ہے تو اس نے کوئی خاص تیر نہیں چلایا۔ اس لئے کہ اِس نظریہ کا ذکر قرآن میں پہلے سے موجود تھا۔ یہی حال دوسرے محققین کا ہے لیکن انکی کاوشوں کو صرفِ نظر کیا جانا بھی زیادتی ہوگی کیونکہ بہت سے جہلاء کے ہاں متشابہات ابھی تک متشابہات ہی رہتیں اور محکمات کا درجہ حاصل نہ کرسکتیں اور انسان بیچارے کو صرف ایمان کی حد تک گزارہ کرنا پڑتا۔ لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ الہامی صحائف یا قرآن کے ذکر کردہ مسائل وتصورات ہی وہ بنیادیں تھیں جن پر بعد میں علوم متفرقہ نے سر بفلک تعمیرات کھڑی کیں۔ سطورِ بالا کا ماحصل یہ ہے کہ:

۱۔ ارتقائے علم کے ساتھ متشابہات محکمات میں تبدیل ہو رہے ہیں۔

۲۔ قرآن کے بیان کردہ حقائق وہ بنیادیں (اُم الکتاب) ہیں جن پر علوم نے محل کھڑے کئے۔

۳۔ متشابہات میں غلط تاویل کی بھی گنجائش ہوتی ہے اور اس سے بڑے فتنے اٹھائے جاسکتے ہیں۔

قرآن میں ایمانیات ومابعد الطبیعیات کے متعلق بعض ایسی آیات ملتی ہیں جنکی مختلف تاویلیں ہوسکتی ہیں۔

''خاتم النبیّین'' کی غلط تاویل نے آج تک نوے جھوٹے نبی پیدا کئے۔
آیۃ لاولی الالباب ۔۔۔۔کی غیر قرآنی تفسیر سے معتزلوں نے جنم لیا۔ یغفر الذنوب جمیعا سے مرجیۂ نے۔۔۔ولہ' الاسماء الحسنیٰ سے معلومیہ نے۔۔۔وما تشائو ن الا ان یشاء اللہ سے جبریہ نے ۔۔۔۔ومن شاء فی الیومین ۔۔۔۔کی غلط تاویل سے قدریہ نے جنم لیا اور ان فرقوں نے ہماری ملّی بنیان مرصوص میں کتنے بڑے بڑے شگاف ڈالے' مورخ سے پوچھئے۔ یہ تو عرض ہو چکا ہے کہ کائنات کی ترکیب عناصر سے ہوئی۔ اس ترکیب کی حفاظت بہت بڑا معجزہ ہے۔ ہائیڈروجن اور آکسیجن سے پانی کی ترکیب اور پھر اس ترکیب کا تحفظ ایک نہایت دقت طلب فرض ہے جسے ایک قوتِ قاہرہ بطریق احسن سرانجام دے رہی ہے۔ اگر آج یہ قوتِ قاہرہ اپنی نگرانی اٹھالے تو کائنات کا شیرازہ دفعۃً بکھر جائے عناصر تحلیل ہو کر اپنے اپنے مراکز کی طرف بھاگ جائیں اور دنیا میں صرف دخان ہی دخان باقی رہ جائے۔ کیونکہ زندگی ترکیبِ عناصر اور موت تحلیلِ عناصر کا دوسرا نام ہے اور یہ ترکیب و تحلیل مشیت ایزدی کے مطابق وقوع پذیر ہو رہی ہے۔

؎ زندگی کیا ہے' عناصر میں ظہورِ ترتیب موت کیا ہے' عناصر کا پریشاں ہونا

ان عناصر سے معین و موزوں تناسب کے ساتھ مختلف اشیاء کو پیدا کرنا ایک عالم گیر علم کے بغیر ناممکن ہے۔ کائنات کے مختلف مظاہر کا ظہور' عناصر کی کس قدر دقیق' صحیح اور احسن آمیزش سے ہوا' اسے صرف علمِ کیمیاء کا کوئی بہت بڑا ماہر ہی سمجھ سکتا ہے۔ یہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے کہ تمام نباتات و حیوانات کی ترکیب صرف آکسیجن' ہائیڈروجن' کاربن' نائیٹروجن اور چند نمکیات سے ہوئی ہے۔ اجزا صرف اتنے ہیں لیکن اختلافاتِ مقادیر سے جس قدر مرکبات تیار ہوئے اُن کا اندازہ اِس امر سے ہو سکتا ہے کہ آج تک نباتات کی تقریباً چودہ لاکھ اور حیوانات کی تین لاکھ انواع دریافت ہو چکی ہیں۔ اِن چند عناصر سے اس رنگ برنگی دنیا کی تخلیق احسن الخالقین کی خلق و صناعی کا حیرت انگیز معجزہ اور اسکی حساب دانی کا ایمان افروز ثبوت ہے۔ ساڑھے چودہ صدی قبل سے قرآن کے اسرار و رموز کا آج تک کھلتے چلے جانا کیا ہے؟

فرعون کی لاش کو محفوظ رکھنا

قرآن کے کلام اللہ ہونے پر اس سے بڑی شہادت کیا ہوگی کہ قرآن میں فرعون کے متعلق ایک ایسی پیش گوئی موجود ہے جس کا ذکر توریت وانجیل یا دیگر آسمانی صحائف میں نہیں تھا۔ یہ پیش گوئی ساڑھے تین ہزار برس کے بعد بیسویں صدی کے آغاز میں پوری ہوئی۔ اس دوران یہود ونصاریٰ اور منافقین کی طرف سے اہل قرآن کو بھانت بھانت کی بولیاں سننے کو ملتی رہیں۔ درج ذیل آیت شریفہ کو دشمنانِ اسلام نے قرآن کے (معاذ اللہ) لغو ہونے میں بطورِ حوالہ خوب خوب استعمال کیا۔ مگر جب فرمانِ خداوندی سچ ثابت ہوگیا تو یہی بات قرآن کے حتمی کلامِ الٰہی ہونے کا غیر متردد ثبوت بھی ٹھہر گئی۔ سورۃ یونس ملاحظہ کریں جس میں اس واقعہ کی وضاحت موجود ہے۔

وَ جٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَ جُنُوْدُهٗ بَغْیًا وَّ عَدْوًا ؕ حَتّٰٓی اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ(۹۰) آٰلْـٰٔنَ وَ قَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَ كُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ(۹۱) فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰیَةً ؕ وَ اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ (یونس:۹۰ تا ۹۲)

ترجمہ:۔ ''ہم بنی اسرائیل کو سمندر سے پار لے گئے اور فرعون نے خباثت وشرارت کی بنا پر اپنے لشکر سمیت اُن کا پیچھا کیا اور جب ڈوبنے لگا تو پکار اٹھا کہ میں بنی اسرائیل کے خدائے لاشریک پر ایمان لاتا اور مسلمان ہوتا ہوں (۹۰) خدا نے فرمایا اب موت کو دیکھ کر ایمان لانا کس کام کا اب تک تو تم نافرمان اور مفسد رہے ہو (۹۱) آج ہم تمہاری لاش کو بچا کر رکھیں گے تاکہ آنیوالی نسلوں کیلئے نشانِ عبرت بن جائے بیشک لوگوں کی بڑی تعداد ہماری نشانیوں سے بے خبر ہے (سورۃ یونس:۹۰تا۹۲)

عہدِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں عرب لوگ اقوامِ عالم کی تاریخ، تہذیب وتمدن، آثار وافکار اور

علوم وفنون سے مطلق آشنا نہیں تھے۔ انہیں قطعاً یہ معلوم نہ تھا کہ فرعون کتنے تھے اور وہ کب سے مصر پر حکومت کر رہے تھے۔ رہی کھدائیاں یا اُن سے کسی نوع کی معلومات تو مصر میں اِن کھدائیوں کا آغاز ہی انیسویں صدی کے اواخر میں ہوا۔ جبکہ فرعون کی لاش ۱۹۰۷ء میں ایک انگریز مفتش سر گرافٹن سمتھ کی کوششوں سے برآمد ہوگئی تھی۔ مصر کے ایک محقق و مفتش احمد بیگ (بحوالہ تفسیر القرآن از علامہ جوہر طنطاوی مصری جلد ۶ طبع مصر ۱۳۴۶ھ) لکھتے ہیں کہ:۔

''موسیٰ علیہ اسلام کے عہد میں دو فرعون تھے ریمسس دوم جس کا تعلق فراعین مصر کے اٹھیسویں خاندان سے تھا۔ اس خاندان کا بانی ریمسس اوّل تھا جس کے جانشین سیتی (SETI) اوّل نے صرف دو برس حکومت کی تھی۔ اس کے بعد ریمسس دوم تخت نشین ہوا اور ۶۷ سال تک برسر اقتدار رہا۔ حضرت موسیٰؑ کی ولادت اسی کے دَور میں ہوئی اور آپؑ چالیس سال تک اسی کے ہاں پرورش پاتے رہے۔ خروج سے ایک برس پہلے اسکی وفات ہوگئی اور اس کا بیٹا جس کا نام منفطہ (MINEPTAH) تھا' اپنے باپ ریمسس دوم کا جانشین ہوا۔ یہ حضرت موسیٰؑ کا ہم عصر اور آپ کے ساتھ ایک ہی محل میں پلا بڑھا۔ قرآن حکیم میں جس فرعون کی لاش کو برائے عبرت محفوظ رکھنے کا فرمان وارِد ہے اور جو بنی اسرائیل کا تعاقب کرتے ہوئے بحر قلزم میں غرق ہوا یہی منفطہ تھا۔ فراعین کے خاندان تقریباً ساڑھے تین ہزار سال حکمران رہے۔ غرق ہونے والے فرعون کے بارے زیادہ تر معلومات لوئس گولڈنگ کے سفرنامے IN THE STEPS (OF MOSES THE LAW GIVER) سے حاصل ہوئی ہیں اس تحقیقاتی سفرنامے کے بموجب جس فرعون کے بنی اسرائیل پر مظالم مشہور ہیں اور جس بناء پر اسے (PHARACH OF THE PERSECUTION) کہا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کو اسی فرعون کے پاس پیغمبر بنا کر مدین سے بھیجا گیا تھا جو بحر احمر (قلزم) میں غرق ہوا''۔

گولڈنگ کی کتاب اور برٹانیکا کے مضمون ''EGYPT'' دونوں میں لکھا ہے کہ تھیبز میں کھدائی کے دوران مورچری ٹیمپل سے ایک ستون ۱۸۹۶ء میں فلنڈر پیٹرک کو ملا تھا جس پر اُس فرعون نے اپنے دور کے کارنامے گنوائے تھے۔ اسی ستون سے پہلی مرتبہ مصر میں اسرائیل کے وجود کی تاریخی شہادت ملی۔ برٹانیکا کے ایک مضمون ''ممی'' میں ذکر ہے کہ ایک انگریز ماہر علم التشریح سر گریفن ایلیٹ سمتھ نے ممیوں

کو کھول کھول کر ان کے حنوط کی تحقیق شروع کی تھی اور ۴۴ ممیوں کا مشاہدہ کیا تھا۔ گولڈنگ لکھتا ہے کہ ۱۹۰۷ء میں سمتھ کو منپتہ (منفطہ/فرعونِ موسیٰؑ) کی لاش ملی۔ جب اس کی پٹیاں کھولی گئیں تو سب یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس کے جسم پر نمک کی ایک تہہ جمی ہوئی تھی جو کسی اور ممی کے جسم پر نہیں پائی گئی۔ گولڈنگ یہ بات بھی بیان کرتا ہے کہ فرعون بحیرات مرّہ (کڑوے پانی کی جھیلوں) میں غرق ہوا' جو بحرِ احمر اور بحرِ روم کے درمیان تھیں (غالباً یہ وہی جگہ ہے جہاں سے قلزم پھٹا تھا اور بنی اسرائیل اس میں سے پار اترے تھے) انہیں نہر سویز میں شامل کر دیا گیا ہے۔ آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ جزیرہ سینا کے مغربی ساحل پر ایک پہاڑی ہے جسے مقامی لوگ جبل فرعون کہتے ہیں۔ اس پہاڑی کے نیچے ایک غار میں گرم پانی کا ایک چشمہ ہے جسے لوگ حمامِ فرعون کہتے ہیں اور سینہ بسینہ روایات کی بناء پر یہ کہا جاتا ہے کہ اسی جگہ فرعون کی لاش ملی تھی۔ ساڑھے تین ہزار برس کا عرصہ معمولی نہیں ہوتا حقائق خواہ کچھ بھی ہوں اس کی لاش کا کیا ہوا' یا وہ کیسے محفوظ رہی' جس نے اسے محفوظ رکھنے کا اعلان فرمایا تھا یہ وہی جانتا ہے۔

ابو الاعلیٰ مودودی کی رائے میں بحیراتِ مُرّہ میں ڈوبنے کے بعد اس کی لاش کو پھول کر سطح سمندر پر تیرنے اور حمامِ فرعون تک پہنچنے میں کافی وقت لگا ہوگا' جس کے دوران اس کے گوشت و پوست میں سمندری پانی کا کافی نمک جذب ہو گیا ہوگا۔ یہ نمک اس کی لاش کو حنوط کرتے وقت خارج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مگر تین ہزار سال کے دوران رفتہ رفتہ یہ اس کے جسم سے خارج ہو کر ایک تہہ کی شکل میں جم گیا تھا جو پٹیاں کھولنے پر اسکے جسم پر جما ہوا پایا گیا۔ بہر حال اِس طرح تقریباً ساڑھے تین ہزار برس پرانی لاش برآمد ہوئی اور ساڑھے چودہ سو سال قبل قرآن کی پیش گوئی کرنے والی یہ آیت آخر کار سچ ثابت ہو کر محکمات میں شامل ہو گئی جو بظاہر طویل عرصہ تک متشابہات میں شمار کی جاتی رہی۔

رُوم کی شکست

اوائل اسلام ۶۱۶ء میں رُوم وایران کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور رُوم کو شکست ہوگئی۔ چونکہ قریب العقیدہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی ہمدردیاں رُوم کیساتھ تھیں کہ وہ اہلِ کتاب تھے اور قریش مکہ کی ایران کے ساتھ' اس لئے کفار نے بڑی خوشیاں منائیں اور مسلمان افسردہ سے ہوگئے۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں کہ چند سالوں میں رُوم کو فتح نصیب ہوگی اور پھر مسلمان خوش ہوں گے۔

غُلِبَتِ الرُّوْمُ (۲) فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَ هُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ (۳) فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ؕ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْۢ بَعْدُ ؕ وَ یَوْمَىٕذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ (۴)

(سورۃ: الروم)

ترجمہ:۔ رومی مغلوب ہوئے پاس کی زمین میں اور اپنی مغلوبی کے بعد عنقریب غالب ہونگے (چند (بضع) سالوں میں' اللہ ہی کا حکم ہے آگے اور پیچھے' اس دن مسلمان خوش ہوں گے (الرُوم: ۲ تا ۴)

یہ دونوں لشکر سرزمین شام کے قریب مقابل ہوئے جس میں اہل فارس غالب ہوئے کفار مکہ اس سے خوش ہوکر مسلمانوں سے کہنے لگے کہ تم بھی اہل کتاب اور نصاریٰ بھی اہل کتاب جیسے ہمارے بھائی رُومیوں پر غالب آئے اسی طرح ہماری تمہاری جنگ ہوئی تو ہم بھی تم پر غالب ہونگے۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں کہ بضع سالوں میں رُومی پھر غالب آجائیں گے اور مسلمان خوش ہوجائیں گے۔ (قرآن حکیم میں بضع سنین کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جس سے مراد تین سے نو سال کا عرصہ ہے)۔

خدا تعالیٰ کے فرامین پر ایمان والوں کا یقین نہایت پختہ ہوتا ہے چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے کفارِ مکہ میں جاکر اعلان کردیا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتادیا ہے کہ چند سالوں کے اندر اہل فارس پر رُومی غالب آجائیں گے۔ اس پر ابی بن خلف نامی کافر آپکے مقابل کھڑا ہوگیا اور سو سو اونٹ شرط

طے کرنے کا مطالبہ کیا۔ اُس وقت تک ابھی قمار کی حرمت نازل نہ ہوئی تھی اسلئے حضرت ابوبکرؓ نے بلا کسی پس وپیش یہ شرط قبول کر لی اور تین تا نو سال کی مدت طے ہوگئی۔ القصہ سات سال بعد ان آیات مبارکہ کا صدق ظاہر ہوگیا جب رُوم نے ایران کو زبردست شکست دی اور اسکی افواج ایران میں داخل ہوگئیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے شرط کے سو اونٹ ابی بن خلف کی اولاد سے وصول کئے کیونکہ ابی اس وقت تک مر چکا تھا۔ تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے پر یہ اونٹ ضرورت مندوں کو صدقہ کر دیئے گئے۔

قرآن حکیم کی شان عرفانی مدنظر رہے کہ ''اُس روز مومنین خوش ہو جائیں گے'' کے فرمان کا اشارہ بظاہر فتح رُوم کی طرف ہے لیکن اسکے ساتھ ہی مسلمانوں کا خوش ہونا یوں دو چند ہوگیا کہ عین اسی دوران معرکہ بدر بھی وقوع پذیر ہوا جس میں مسلمانوں کو اپنی پہلی ہی جنگ میں فتح نصیب ہوئی۔ بہر کیف قبل از وقت اطلاعاتِ قرآنیہ کی حرمت وسچائی ثابت ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ کتاب ارض وسماء کے خالق کی طرف سے نازل شدہ ہے دیگر کسی کا کلام نہیں۔

مسلمانوں کو حکومت کی پیشگوئی

۵ھ کو سورۃ النور اُس وقت نازل ہوئی جب ابھی چند گنے چنے لوگ ہی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ مسلمانوں کی زبوں حالی کا عالم نا قابل بیان تھا کہ اپنے گھروں سے نکلے ہوئے پانچ سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔ جن دشمنوں سے جان بچانے کیلئے ہجرت پر مجبور ہوئے انکی طرف سے خطرہ نہ صرف ہنوز موجود تھا بلکہ کفارِ مکہ کی ریشہ دوانیاں اور وقت بے وقت حملے بڑھتے جا رہے تھے۔ مسلمان ہر لحہ خوف وفکر مندی میں مبتلا جیسے تیسے زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس وقت تک نہ خیبر فتح ہوا تھا نہ مکّہ نہ حنین نہ طائف اور مسلمانوں کا اثر صرف مدینہ اور نواحِ مدینہ تک محدود تھا۔ ایسے میں سورۃ نور نازل ہوئی جس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تین بشارات سے نوازا۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ص وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ط يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا ط وَ مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (سورۃ:النور:۵۵)

ترجمہ:۔ اللہ ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور جو اچھے عمل کرنے والے ہیں وعدہ کرتا ہے کہ وہ انہیں اسی طرح حکومت دیگا جیسے اُن سے پہلی اقوام کو دی تھی اُنکے دین کو استحکام بخشے گا جو اللہ نے اُن کیلئے پسند کیا ہے اور انہیں طاقتور بنا کر انکے خوف کو امن میں بدل دیگا۔ میری عبادت کریں اور کسی کو میرا شریک نہ بنائیں اور جو اس کے بعد ناشکری کرے تو وہی لوگ بے حکم ہیں (النور:۵۵)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں یہ بشارات پوری ہونا شروع ہوگئی تھیں اور مسلمانوں کی حکومت یمن سے اُردن اور خلیج فارس سے بحیرۂ قلزم تک تقریباً آٹھ لاکھ مربع میل تک پھیل چکی تھی اور اَسّی سال بعد اسکی جنوبی سرحد ملتان اور شمال مغربی سرحد ہسپانیہ سے آگے فرانس تک پہنچ چکی تھی۔

ہجرتِ مدینہ سے فتح مکہ تک قریباً چار لاکھ لوگ بت پرستی اور سوئے اخلاق سے تائب ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے جن کی تعداد بڑھتے بڑھتے کروڑوں تک پہنچ گئی۔ مسلمانوں کی ہیبت کا یہ عالم کہ سلاطین گیتی ان کا نام سن کر کانپ اٹھتے تھے۔ آج ہماری وحدت پارہ پارہ ہو چکی ہے اور شان و شکوہ کا جنازہ نکل چکا ہے، پھر بھی دنیا میں ہماری قریباً پچاس سلطنتیں قائم ہیں۔

۶۴۲ھ میں جب فاتح مصر عمرؓ بن العاص نے مصر میں قدم رکھا تھا تو افریقہ کے برّ اعظموں میں سوائے حضرت بلالؓ کے کوئی سیاہ فام مسلمان موجود نہیں تھا۔ لیکن آج صرف سیاہ فام مسلمانوں کی تعداد تیس کروڑ سے زائد ہے۔ اسلامی سلطنتوں میں سے بیس سلطنتیں افریقہ میں ہیں۔ شمالی ساحل سے نیچے جنوب میں چاڈ، صومالیہ، نائجیریا، سینیگال، کیمرون، گنی، ماریطانیہ وغیرہ سب اسلامی ممالک ہیں۔ تمام اسلامی ممالک کا مجموعی رقبہ تقریباً ایک کروڑ چالیس لاکھ مربع میل اور آبادی سو کروڑ سے کہیں زیادہ ہے۔

نگاہِ انصاف رکھنے والے بخوبی دیکھ سکتے ہیں کہ آج سے ساڑھے چودہ سو سال قبل اہل ایمان کو عطا فرمائی گئی تینوں پیشگوئیاں کس کاملیت کے ساتھ پوری ہو چکی ہیں۔ کیا پھر بھی قرآن کی سچائی میں کسی شبہ کی گنجائش باقی ہے؟ کیا اب بھی قرآن خدا کا کلام نہیں ہے؟۔

دوستو!

حتمی حقیقت یہ ہے کے ''اللہ اپنی بات کو غلبہ و قوت سے پورا کرتا ہے لیکن بہت سے لوگ اس حقیقت سے ناآشنا ہیں''۔ (یوسف:۲۱)

ابوجہل کو چوٹی سے پکڑ کر گھسیٹنا

ہجرتِ مدینہ سے قبل مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جانی دشمن دو تھے ابوجہل اور ابولہب بن عبدالمطلب۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہِ صفا سے ندا دی کہ اللہ ایک اور لاشریک ہے۔ صرف وہی لائق پرستش ہے۔ روزِ حساب (قیامت) کو تمہیں اپنے اعمال کا جواب دینا پڑے گا۔ تو ابو لہب نے بڑے غصے سے کہا:۔ کیا تم نے صرف اس کام کیلئے ہمیں یہاں بلایا تھا؟

بات یہیں ختم نہیں ہوگئی بلکہ یہاں سے شروع ہوئی اور ابولہب نے بیس پچیس آدمیوں کی ایک جماعت تیار کی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر طرح سے ستایا کرتی' آتے جاتے پھبتیاں کستی' نماز کے وقت سیٹیاں بجاتی اور شور مچاتی تھی۔ شروع میں یوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ گھروں اور پہاڑیوں میں چھپ کر نماز پڑھتے تھے' لیکن جب مسلمانوں کی کچھ تعداد بڑھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز کیلئے کعبہ میں جانا شروع ہوگئے۔ چونکہ قریش مکہ نے کعبہ کو بت خانہ بنا رکھا تھا اس لئے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وہاں جانے سے حتی الوسع روکنے اور منع کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

ابوجہل کا حال ملاحظہ ہو کہ ایک دن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مصروف تھے ابوجہل کے کہنے پر عقبہ بن ابی معیط نے اپنی چادر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن میں ڈالی اور چادر کو بل دینے لگا یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دم گھٹنے سے آنکھیں باہر ابل پڑیں۔ اسی اثناء میں حضرت ابوبکرؓ وہاں پہنچے جنہوں نے عقبہ کو دھکیل کر پیچھے ہٹایا۔ ایک اور موقع پر یہی عقبہ ابوجہل کے اکسانے پر کہیں سے اونٹ کی اوجھڑی اٹھا لایا اور جونہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں گئے عقبہ نے اوجھڑی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت پر رکھ دی۔ پھر ابوجہل اور اسکے ساتھیوں کی طرف سے جا بجا آپکو دھمکیاں دی جانے لگیں کہ اگر آپ نماز کیلئے کعبہ میں داخل ہوئے تو ہم سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔

اس پر درجِ ذیل آیات نازل ہوئیں جن میں ابوجہل کو اسکی چوٹی سے پکڑ کر گھسیٹے جانے کی

پیش گوئی یوں فرمائی گئی تھی۔

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى (۹) عَبْدًا اِذَا صَلّٰى (۱۰) اَرَءَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰٓى (۱۱) اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى (۱۲) اَرَءَيْتَ اِنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى (۱۳) اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى (۱۴) كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ (۱۵) نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ (۱۶) فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ (۱۷) سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ (۱۸) كَلَّا لَا تُطِعْهُ وَ اسْجُدْ وَ اقْتَرِبْ (علق:۱۹)

ترجمہ:۔ کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو (ہمارے) بندے کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے کیا اس نے دیکھا کہ وہ بندہ ھدایت پر ہو اور تقویٰ کی ھدایت کرتا ہو یا یہ کہ روکنے والا جھوٹا اور سرکش ہو' کیا وہ یہ نہیں جانتا کہ اللہ دیکھ رہا ہے' اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اسے جھوٹی خطا کار چوٹی سے پکڑ کر زمین پر گھسیٹیں گے' اسے کہو کہ وہ اپنے مددگاروں کو بلائے ہم اپنے کارکنوں کو آواز دیں گے' جان رکھیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی بات ہرگز نہ سنیں اور سجدے میں گر کر ہمارا قرب حاصل کریں (سورۃ علق: ۹ تا ۱۹)

آیاتِ متذکرہ میں ایک پیشگوئی تھی کہ ''اگر ابوجہل باز نہ آیا تو ہم اسے چوٹی سے پکڑ کر زمین پر گھسیٹیں گے''۔ یہ پیش گوئی یوں پوری ہوئی کہ میدانِ بدر میں دو نوجوان لڑکوں معوذ اور معاذ نے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف سے پوچھا کہ ابوجہل کونسا ہے۔ انہوں نے اشارہ سے بتایا تو یہ جوان صفوں کو چیرتے ہوئے سیدھے ابوجہل کے پاس پہنچے اور اسے مار کر نیچے گرا دیا اور پھر گھسیٹ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک لیجانے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن ابوجہل کے بیٹے عکرمہ اور اس کے ساتھیوں نے دیکھ لیا اور اُن دونوں کو شہید کر ڈالا اور پھر لڑائی میں مصروف ہو گئے۔

کچھ دیر بعد وہاں سے عبداللہؓ بن مسعود کا گزر ہوا تو ابوجہل کی لاش پر نظر پڑی۔ آپؓ نے پہلے اسے الٹا کیا پھر اسکی گدی پر پاؤں رکھ کر اسکا سر کاٹا اور چوٹی سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں جا پہنچے۔ یوں وہ پیش گوئی بھی حرف بہ حرف پوری ہو گئی۔

ابولہب اور اسکی بیوی کے بارے پیش گوئی

ابوجہل کی بدبختی کا حال تو آپ گزشتہ صفحات میں ملاحظہ کر چکے کہ وہ کس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخیاں اور ناروا حرکاتِ ذلیل کا مرتکب رہا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرا جانی دشمن ابولہب تھا جس نے لوگوں کی ایک تعداد کو صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تنگ کرنے پر مقرر کر رکھا تھا طرّہ یہ کہ اسکی بیوی اُمِّ جمیل بھی کسی طرح اس سے کم نہ تھی۔ اس کا کام آتے جاتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ میں کانٹے بچھانا تھا۔ جب اُن دونوں کی ایذا رسانیاں حد سے بڑھ گئیں تو درجِ ذیل سورۃ (لہب) نازل ہوئی۔

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ؕ (۱) مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَ مَا كَسَبَ ؕ (۲) سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ (۳) وَّ امْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۚ (۴) فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ع (۵)

ترجمہ:۔ ''ابولہب کے دونوں ہاتھ بیکار ہو گئے اور وہ ہلاک ہو گیا' اسے اسکی دولت نہ بچا سکی' وہ عنقریب بھڑکتی آگ میں جلے گا' اور اسکی ہیزم بردار بیوی کے گلے میں مونجھ کی رسّی پڑے گی'' (لہب:۱تا۵)

یاد رہے قرآن کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ مستقبل میں جس امر کا وقوع پذیر ہونا یقینی و قطعی ہو اُس کیلئے کبھی کبھی ماضی کا صیغہ بھی استعمال کرتا ہے۔ مثلاً جیسے ''قیامت قریب آ گئی اور چاند پھٹ گیا'' (سورۃ قمر-۱) مراد یہ ہے کہ جب قیامت آئے گی تو چاند پھٹ جائیگا۔ اسی طرح سورۃ مائدہ میں خدا تعالیٰ اور عیسیٰؑ کا مکالمہ جو قیامت کے روز وقوع پذیر ہونے والا ہے ماضی کے صیغوں میں بیان ہوا۔ سورۃ مائدہ کی آیات ۱۱۶تا۱۱۹ ملاحظہ ہوں۔

وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَ اُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ق بِحَقٍّ ط وقف النبی اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَ لَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ

اَنۡتَ عَلَّامُ الۡغُیُوۡبِ(۱۱۶) مَا قُلۡتُ لَهُمۡ اِلَّا مَاۤ اَمَرۡتَنِیۡ بِهٖۤ اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیۡ وَ رَبَّكُمۡ ۚ وَ كُنۡتُ عَلَیۡهِمۡ شَهِیۡدًا مَّا دُمۡتُ فِیۡهِمۡ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّیۡتَنِیۡ كُنۡتَ اَنۡتَ الرَّقِیۡبَ عَلَیۡهِمۡ ؕ وَ اَنۡتَ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ شَهِیۡدٌ(۱۱۷) اِنۡ تُعَذِّبۡهُمۡ فَاِنَّهُمۡ عِبَادُكَ ۚ وَ اِنۡ تَغۡفِرۡ لَهُمۡ فَاِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَكِیۡمُ(۱۱۸) قَالَ اللّٰهُ هٰذَا یَوۡمُ یَنۡفَعُ الصّٰدِقِیۡنَ صِدۡقُهُمۡ ؕ لَهُمۡ جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَاۤ اَبَدًا ؕ رَضِیَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡهُ ؕ ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ(مریم :۱۱۶ تا ۱۱۹)

تراجم:۔اور جب اللہ فرمائے گا اے عیسیٰ ابن مریم کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے علاوہ دو خدا بنالو عرض کریگا تو پاک ہے مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ بات کہوں جو مجھے تیری طرف سے پہنچی ہی نہیں۔اگر میں نے ایسا کہا ہو تو جو میرے جی میں ہے تو ضرور جانتا ہوگا اور میں نہیں جانتا جو تیرے علم میں ہے بیشک تو ہی سب غیوب کا جاننے والا ہے(۱۱۶) میں نے ان سے سوائے اسکے کہ جو تو نے مجھے حکم دیا تھا کچھ نہیں کہا اور صرف یہ کہا کہ اللہ کو پوجو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے اور میں جب تک ان میں موجود تھا ان پر مطلع تھا پھر جب تو نے مجھے اٹھالیا تو بس تو ہی ان پر نگاہ رکھتا تھا اور ہر چیز تیرے سامنے حاضر ہے(۱۱۷) اگر تو ان کو عذاب کرے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انہیں بخش دے تو بیشک تو ہی غالب حکمت والا ہے(۱۱۸) اللہ نے فرمایا کہ یہ وہ دن ہے جس دن سچوں کو ان کا سچ کام آئے گا ان کیلئے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں رواں ہیں کہ ہمیشہ ہمیشہ وہاں رہیں گے اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی یہ ہے بڑی کامیابی (مائدہ:۱۱۶تا۱۱۹)

ہلاکتِ ابولہب

تسلسلِ مضمون کی طرف واپس لوٹتا ہوں کہ سورۃ لہب کے نازل ہونے کے قریباً بارہ برس بعد معرکہ بُدر پیش آیا جس میں ابولہب خود تو شامل نہ ہوا البتہ اپنی طرف سے ایک سیاہ فام غلام غزوۂ بدر میں لڑنے کیلئے بھیج دیا۔ غلام مارا گیا اور قریش کو بھی بری طرح شکست ہوئی۔ جب یہ خبر ابولہب تک پہنچی تو پہلے تو وہ ہزیان بکنے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اسکے جسم پر کوڑھ کے آثار نمودار ہونے لگے۔ اسی اثنا میں پہلے اسکے ہاتھ شل ہوئے پھر باقی اعضاء بیکار ہوتے گئے اور اسی حالت میں ہلاک ہوگیا۔

تاریخ اس پر گواہ ہے کہ اسکی لاش اس قدر مسخ اور متعفن ہوگئی کہ اسکی اولاد تک اسکے قریب نہ پھٹکی، چند روز تک لاش وہیں پڑی رہی تو تمام علاقہ تعفن سے اَٹ گیا۔ آخر کار تنگ آ کر اہل محلّہ نے حبشی غلاموں سے لاش ٹھکانے لگوانے کا انتظام کیا، جنہوں نے پہلے تو ایک گڑھا کھودا پھر دُور سے بانس نما بڑی بڑی لٹھوں سے دھکیل کر اسے گڑھے میں گرایا اور مٹی سے پاٹ دیا۔ فرمان رب العزت کس قدر سچ تھا کہ ''ابولہب کے ہاتھ بیکار ہوگئے اور وہ ہلاک ہوگیا''۔

ہلاکتِ اُمِّ جمیل

رہی اُمّ جمیل تو وہ جنگل سے لکڑیاں اور بطورِ خاص خاردار لکڑیاں لایا کرتی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گزرگاہ میں زہریلے کانٹے بکھیرا کرتی تھی۔ ایک روز اس نے ایندھن کا ایک بھاری گٹھا مونجھ کی رسی سے باندھا اور سر میں پھنسا کر پیٹھ پر اٹھالیا جیسا کہ معمول تھا۔ مگر چلتے ہوئے اسے ایسی ٹھوکر لگی کہ مونجھ کی رسی سَرک کر گلے میں آپڑی اور وزنی گٹھے کے پیچھے لڑھکنے سے اس کا دم گھٹ گیا اور تڑپ تڑپ کر وہیں مرگئی۔ یوں قرآن کی یہ پیش گوئی بھی بارہ سال بعد حرف بہ حرف پوری ہوئی کہ ''اس کے گلے میں مونجھ کی رسی ہوگی''۔ (ترجمہ مولانا محمود الحسن۔ فارسی طبع کابل صفحہ ۱۰۳۸ منزل ششم ۱۳۴۵ھ)

حفاظتِ قرآن کا وعدہ

قرآنِ حکیم کے سلسلے میں دو سوال بڑی اہمیت کے حامل ہیں اوّل یہ کہ آیاتِ قرآنیہ کو یہ ترتیب کس نے دی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کس ترتیب سے تلاوت فرماتے تھے۔؟ دوم یہ کہ مضامین قرآن میں تسلسل دکھائی نہیں دیتا۔ توحید کا ذکر چل رہا ہوتا ہے کہ اخلاق کی بات چل نکلتی ہے، درمیان میں قیامت کا ذکر آجاتا ہے تو اچانک نماز کی تاکید پر آیات آجاتی ہیں۔ ماضی کی اقوام کا تذکرہ شروع ہوا کہ لیل ونہار کا بیان چل پڑتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

جان رکھیں! یہ تنوع کسی بے توجہی کا نتیجہ ہرگز نہیں۔ سیرت کی تمام کتابیں اور احادیث اس امر پر متفق ہیں کہ جب بھی کوئی آیت نازل ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسے کسی چمڑے، چھال یا ٹھیکری اور بشرطِ میسر کاغذ پر وہیں لکھواتے، جہاں جس سورۃ میں جس خاص آیت کے ساتھ اسے رکھنا ہوتا اور اس کی اطلاع جبریلؑ امین بارگاہِ نبوی میں پیش کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ایک یہ تھا کہ جیسے جیسے قرآن نازل ہوتا جاتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسکی ترتیب اور کلام دونوں فوری ازبر ہوجاتے تھے۔ رہا قرآن کے انتشار اور بظاہر بے ربط ہونے کا تعلق، تو یقین کر لیجئے کہ مضامین قرآن میں یہ تلوّن بلا جواز ہرگز نہیں اور دیکھا جائے تو یہی اسکا حسن ہے۔

تمام کائنات کا حُسن اسی تلوّن سے عبارت ہے۔ پہاڑ اگر سب کے سب یکساں قد اور یک رنگ ہوتے تو انہیں دوسری سے تیسری دفعہ دیکھنے سے طبیعت اکتاہٹ محسوس کرنے لگتی۔ درخت، پھل و پھول اگر سب یک رنگ، یک سائز یا یک ذائقہ ہوتے تو ان میں جاذبیت کب کی دم توڑ چکی ہوتی۔ اسی طرح قرآن بھی اگر کسی عام کتاب کی طرح الگ الگ ابواب میں بندھا ہوتا، جیسے باب التوحید، باب الایمان، باب الصلوٰۃ، پھر ایک ایک کونے میں وضو، نکاح، طلاق اور جہاد وغیرہ کا ذکر ہوتا تو قرآن ایک تکنیکی سی کتاب بن کر رہ جاتا اور یقیناً اس کی دلکشی بتدریج کم ہوتے ہوئے دم توڑ جاتی۔ جب کہ اللہ

تعالیٰ نے اسکی حفاظت' اس میں لوگوں کی دلچسپی اور ذوقِ تلاوت برقرار رکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

اپنی سوچ وفکر کے متفرق ہونے کی بناء پر ہم اس قسم کے اعتراضات کا شکار رہتے ہیں۔ ہماری مثال بعین ایسی ہے کہ کسی ہرے بھرے کھیت میں ایک زمیندار اپنے بیل اور اپنے دو ماہر اقتصادیات و عالم نباتات دوستوں کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔ ان سب کی فکر مختلف ہوگی اور تمام اس کھیت کو مختلف زاویۂ نگاہ سے دیکھ رہے ہونگے۔ بیل تو صرف آزادی کا منتظر ہوگا کہ مالک کہیں ٹلے تو وہ اس لہلہاتی کھیتی سے اپنا پیٹ بھرے۔ کسی بیل کی سوچ اس سے متجاوز ہو بھی تو کیا۔؟ زمیندار اندازہ لگا رہا ہے کہ اس دفعہ کی فصل سے اس کا کتنا قرضہ بیباق ہو جائیگا۔ ماہر اقتصادیات یہ سوچ رہا ہے کہ اس سال اس ملک کی خوشحالی پر اس جیسی اچھی فصلوں کا کیا اثر مرتب ہوگا اور عالم نباتات ان پودوں کے عناصر ترکیبی' اختلافِ الوان' زمینی بکٹیریا' پتوں کی زرخیزی اور قدرت کے حیرت انگیز ارتقائی نظام ومشینری پر غور کر رہا ہوگا۔

قرآن کریم بھی کھیتی کی طرح ہے کہ صوفیاء نے اسے متصوفانہ نگاہِ زیرک سے دیکھا' تو کوئی اس کی سحر بیانی سے متاثر ہوا۔ واعظوں نے اس سے یوسف وزلیخا جیسے دلچسپ قصے اکٹھے کئے۔ ملاّ ذکرِ حور وغلمان اور شراب طہور سے یہیں مست ہو بیٹھا۔ مفتیوں نے مسائل فقہی کے ضوابط اکٹھے کئے۔ گدی نشینوں نے کوشش کر کے سجدۂ تعظیمی کے جواز اِکٹھا کئے۔ کام چور ملنگوں اور راہبوں نے ترکِ دنیا کے دلائل ڈھونڈے اور بعض جعل سازوں نے اسے جنتروں منتروں اور ٹوٹکوں کی کتاب بنا ڈالا۔ جبکہ غور وفکر کے حاملین نے اسے کائنات کا متن اور سرمایا قرار دیا۔ سورۃ الزمر کی آیت مبارکہ ملاحظہ ہو:۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ق تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ج ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَ قُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ط ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ط وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ(۲۳) (سورۃ:الزمر)

ترجمہ:۔ اللہ نے سب سے بہترین کتاب نازل فرمائی کہ اوّل سے آخر تک (حسن وخوبی میں) ایک سی ہے' دوہرے بیان والی (کہ وعدے کے ساتھ وعید اور امر کے ساتھ نہی اور اخبار کے ساتھ احکام موجود ہیں) اس (کی تلاوت)

سے (اولیاء کے) رونگٹے کھڑے ہو جاتے جو اپنے رب کی خشیت کے حامل ہیں پھر انکے قلوب اور جسم کی کھالیں یادِ خدا کی رغبت میں نرم پڑ جاتے ہیں۔ یہ اللہ کی ھدایت ہے جسے چاہے اسکی راہ دکھائے اور جسے (ضدّ و نافرمانی کے باعث) اللہ گمراہ کرے اسے کوئی راہ دکھانے والا نہیں (الزمر:۲۳)

قرآن کے بارے اللہ تعالیٰ نے تین وعدے فرمائے:۔

اوّل:۔ یہ کتاب ہم نے نازل فرمائی ہے اور ہم اسکی حفاظت بھی کریں گے۔

دوم:۔ ہم اسے خود ترتیب دیں گے اور اسکی تشریح و تفسیر کا انتظام بھی خود کریں گے۔

سوم:۔ ہم اسکے الفاظ و معانی میں وہ لذت بھر دیں گے کہ ہر روز لوگ اسکی تلاوت کریں گے اور انکا ذوق وشوق کم نہ ہوگا۔ جیسا کہ سورۃ قیامہ میں فرمان ہے:۔

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَه (۱۷) فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ج (۱۸) ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ط (۱۹) (سورۃ: قیامہ)

ترجمہ:۔ قرآن کی ترتیب و تدوین اور اس کی تلاوت کا شوق پیدا کرنا ہمارا کام ہے (۱۷) جب ہم (بذریعہ جبریلؑ امین) قرآن پڑھیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پیچھے پیچھے پڑھیں (۱۸) پھر اسکی باریکیوں کا ظاہر کرنا ہمارا کام ہے (قیامہ:۱۷تا۱۹)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی حفاظت کا اہتمام یوں فرمایا تھا کہ حضرت عائشہؓ کے ہاں ایک صندوق میں یہ تمام آیات اسی ترتیب سے محفوظ رکھی جاتیں جس طرح انہیں ترتیب دینے کا حکم ہوتا۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی قرآن اسی ترتیب سے تلاوت فرمایا کرتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے وقت صحابہ کرامؓ کی تعداد چار لاکھ کے قریب تھی یہ سب قرآن کو ترتیب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق پڑھتے اور پڑھاتے رہے۔ اُس وقت اندازاً قرآن کے حفاظ کی تعداد چالیس ہزار کے قریب تھی۔

حضرت ابوبکرؓ کے دَور خلافت میں جب حفاظ کی خاصی تعداد مسیلمہ کذاب سے لڑتے ہوئے

شہید ہوگئی تو حضرت ابوبکرؓ نے فاروقِ اعظمؓ کے مشورے سے قرآن کو کاغذ پر لکھوانے کا ارادہ کیا۔اس مقصد کیلئے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کے صدر حضرت زیدؓ بن ثابت تھے (جو وحی کے کاتبِ اعظم کہلاتے ہیں)۔انہوں نے تین سال کی محنت کے بعد ایک نسخہ تیار کیا جسے اُم المومنین حضرت حفصہؓ بنت عمرؓ بن خطاب کی تحویل میں دیدیا گیا۔پھر فاروقِ اعظمؓ کے عہد میں لوگوں نے ایک دوسرے کی مدد سے قرآن کی ایک ہزار کے قریب نقول تیار کیں اور جن نقول میں کچھ اغلاط رہ گئیں تھیں انہیں حضرت زید بن ثابت کی نگرانی میں پھر سے درست کروا کر سلطنت کے مختلف شہروں اور بستیوں میں بھجوادیا گیا' جبکہ تمام مشکوک نقول تلف کرادی گئیں۔

تمام حفاظ کرام دیگر مسلمانوں کو بھی قرآن زبانی یاد کرواتے اور خود بھی قرآن سنتے سناتے رہتے۔حضرت عمرؓ فاروق کے دَور میں ہر ماہِ رمضان میں بعد نمازِ عشاء تراویح باجماعت پڑھی جانے لگی جس میں ہزارہا مسلمان ترتیب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق شروع سے آخر تک مکمل قرآن سنا کرتے اور الحمدللہ کہ یہ سلسلہ تاحال جاری ہے' جو خدائے واحد کے توسل وفضل سے قیامت تک جاری رہے گا۔ صحیح بخاری کے شارح بدرالدین محمود بن احمد العینی (۷۶۲ھ-۸۵۵ھ) فرماتے ہیں ''جن صحابہؓ نے عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں قرآن جمع کیا تھا اُن کی تعداد بیرون از شمار ہے''۔

قرآن کی ترتیب وتدوین اور اسکی تلاوت کا شوق پیدا فرمانے سے متعلق وعدۂ رب تعالیٰ یوں پورا ہوا کہ ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ لاکھوں مسلمانوں کے دلوں میں حفظِ قرآن کا شوق پیدا فرماتا ہے۔اسی لئے موجودہ گئے گزرے زمانے میں بھی حفاظِ قرآن کی تعداد ایک محتاط اندازے کے مطابق دس لاکھ سے زیادہ ہے۔اب تک قرآن کے ستاسٹھ سے زائد زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں اور تفاسیرِ قرآن کی تعداد ساڑھے تین ہزار سے بڑھ چکی ہے اور مختلف ڈائجسٹوں کے قرآن نمبروں سے یہ تفاصیل آج بھی دستیاب ہیں۔

قرآن کی حفاظت فرمانے کے وعدہ کی وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں' کیونکہ ہر کوئی جانتا ہے کہ قرآن کے نسخوں کی تعداد جو آج کروڑہا سے زیادہ ہے' اُن میں یک لفظ وحرف کا فرق موجود نہیں۔

جبکہ قبل از قرآن نازل ہونے والی دیگر سماوی کتب کے بارے وثوق سے ایسا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ ہر چند سال بعد اُن کتب کے ایڈیشنوں میں تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ مگر قرآن کے بارے ایسا گمان بھی نہیں کیا جاسکتا جس کا ثبوت یہ ہے کہ ساڑھے چودہ سو سال گزرنے پر بھی قرآن حرف بہ حرف وہی دَورِ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق سیاق وسباق اور حروف والفاظ کے ساتھ موجود ولامتغیر ہے۔

قرآن کو مٹانے کی کوشش کرنے والے نادانوں کی حتی الوسع سرگرمیاں بھی منہ کے بل جا پڑیں اور وہ قرآن کے نسخوں کو تلف کرتے کرتے خود تلف ہوگئے۔ بیچارے کرتے بھی کیا؟ نسخے خرید کر تو تلف کر سکتے تھے لیکن لاکھوں دلوں میں محفوظ قرآن کے نسخوں کو تلف کرنا کسی کی بھی بساط سے باہر ہے۔ یوں بھی اسکے نازل فرمانے والے نے خود اسکی حفاظت کا ذمہ اٹھا رکھا ہے۔ خود قرآن اسکی اطلاع فرماتا ہے:

وَ اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ (۴۱) لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ لَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ (۴۲) (حم السجدہ: ۴۱/۴۲)

ترجمہ:۔ یہ ایک بلند پایہ کتاب ہے (حٰم السجدہ:۴۱) جس میں باطل نہ تو سامنے سے راہ پاسکتا ہے نہ پیچھے سے (کیونکہ) بڑی دانش اور صفاتِ کاملہ کے حامل نے اسے نازل فرمایا ہے (حٰم السجدہ:۴۲)

کسی منافق کی جانب سے یہ اعتراض اٹھایا جاسکتا ہے کہ دیگر کتبِ سماوی بھی تو اُسی رب کی نازل شدہ ہیں۔ تو سورۃ حجر میں درج ذیل فرمان اس کا جواب ہے:۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (حجر: ۹)

''یہ کتاب ہم نے اُتاری ہے اور یقیناً ہم ہی اسکی حفاظت کریں گے،، (حجر:۹)

قرآن کی فصاحت وبلاغت

فصاحت کیا ہے؟ اسکی وضاحت الفاظ میں ممکن نہیں۔ اگرچہ لغوی معنوں میں تیز زبانی یا خوش بیانی کو فصاحت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ فصاحت دراصل الفاظ کا حُسن ہے اور حُسن کی تعریف کیا ہے کوئی نہیں بتا سکتا۔ صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ چیز جسے دیکھنے سے فرحت حاصل ہوتی ہو وہ حسین ہے۔ ہر

وہ نظم یا نثر پارۂ فصیح ہے جسے سننے یا پڑھنے سے بے ساختہ داد زبان پر آجائے اور واہ یا آہ نکل جائے۔ یہ وصف قرآن حکیم میں بدرجۂ کمال موجود ہے۔ الفاظ کی بست، بیان کا حسن، خوبصورت استعارے، لطیف تشبیہات، حقیقت نگاری، بلندیٔ موضوع اور مترنم قافیے وہ محاسن ہیں جن سے قرآن معرّا ہے۔ کسی عربی دان قاری کے ذہن پر قرآن کے اندازِ بیان کا اثر اس قدر شدید ہوتا ہے کہ بڑے بڑے گردن کشوں کی گردنیں جھک جاتی ہیں۔

قریشِ مکہ کا ادبی ذوق اتنا بلند تھا کہ ابوجہل، ابوسفیان، ولید بن مغیرہ اور کئی دیگر حضرات چھپ چھپ کر قرآن سنا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ عتبہ بن ربیعہ نے اُن سے مخاطب ہو کر کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں بڑی تاثیر ہے۔ وہ کبھی جھوٹ بھی نہیں بولتا۔ مجھے ڈر ہے کہ تم پر اسکے خدا کا عذاب ہی نہ آ جائے۔ (درج ذیل حوالہ کی) اسی کتاب کے صفحہ ۱۶۸ پر ہے کہ ایک دفعہ ولید بن مغیرہ نے کہا: ''خدا کی قسم! محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں بڑی حلاوت، تازگی اور روشنی ہے۔ اس پر کوئی غالب نہیں آ سکتا اور مقابلہ کرنے والا پاش پاش ہو سکتا ہے''۔ (محمد رشید رضا، الوحی المحمدی اردو ترجمہ از۔ رشید احمد ارشد ۱۹۶۰ء ص ۲۰۸)

قرآن نے ساڑھے چودہ سو سال سے دنیا کو یہ چیلنج دے رکھا ہے کہ اگر یہ کسی بشر کا کلام ہے تو موضوع کی عظمت، فصاحت و بلاغت، اور تاثر کے لحاظ سے قرآن کے انداز میں ایک سورۃ ہی لکھ لاؤ۔ لیکن آج تک کوئی ایسی مثال پیش نہ کر سکا۔

کچھ لوگوں نے اپنی دانست میں فصاحت کے بڑے بڑے شاہکار پیدا کیے۔ مثلاً ابوالعلاء معری (۱۰۵۸ء) کی الفصول والغایات، جو اس نے اپنے تئیں قرآن کے جواب میں لکھی تھی، ابومحمد القاسم الحریری (۱۱۲۲ء) کی مقاماتِ حریری۔ بدیع الزماں ہمدانی (۱۰۰۸ء) کی مقاماتِ بدیعی اور متنبّیٰ۔ احمد بن حسین کوفی (۹۶۵ء) کا دیوان۔ لیکن قرآن کا جواب تو کوئی کیا بنا سکتا، اس کے قریب بھی نہ پھٹک سکا اور نہ آئندہ اس کا کوئی امکان ہے۔ قرآن کا خاص وصف یہ ہے کہ وہ ہر نوع کے مضمون کو خواہ وہ سیاسی ہو یا اخلاقی، جنسی ہو یا معاشرتی۔ اتنی محتاط، سنجیدہ، بلند و پاکیزہ زبان میں بیان کرتا ہے کہ قاری داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ قرآن کی کوئی آیت کسی عربی مقالے یا کتاب میں لکھ دیجیے وہ یوں ممتاز نظر آئے گی جیسے

ستاروں میں چاند۔ گویا قرآن کا حسن محسوس تو کیا جاسکتا ہے لیکن بیان نہیں کیا جاسکتا۔

قرآن اور صاحب قرآن کے بارے نامور غیر مسلموں کی آرا

مغرب کے تمام اہل قلم متعصب اور بے انصاف نہیں، کچھ ایسے بھی ہیں جو حق گوئی میں بیباک اور حقیقت شناس ہیں۔ قرآن کی مدح میں بے جھجک اپنے محسوسات کو بیان کرنے والوں کی تعداد تو کثیر ہے مگر میں چند ایک کا حوالہ پیش کرتا ہوں مثلاً:۔

۱- جرمنی کا شہرۂ آفاق فلسفی گوئٹے (۱۷۹۴ء-۱۸۳۲ء) کہتا ہے:۔

THE QURAN IS A WORK WITH WHOSE DULLNES THE READER IS FIRST DISGUSTED, AFTERWARDS ATTRACTED BY ITS CHARMS AND FINALLY RAVISHED BY ITS BEAUTIES.(J.D PORT; AN APOLOGY FOR MUHAMMAD AND THE QURAN. LONDON 869, Page. 67)

''قرآن ایک ایسی کتاب ہے کہ پڑھنے والا پہلے تو اکتاہٹ محسوس کرتا ہے پھر اسکی طرف کھنچنے لگتا ہے اور بالآخر اس کے محاسن کے دھارے میں بہہ نکلتا ہے''۔

۲- کارلائل (۱۷۹۵ء-۱۸۸۱ء) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح سرائی کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

THE DEEP-HEARTED SON OF THE WILDERNESS WITH HIS BEAMING BLACK EYES AND OPEN SOCIAL DEEP SOUL HAD OTHER THOUGHTS IN HIM THAN AMBITION...THE WORD OF SUCH A MAN IS A VOICE DIRECT FROM NATURE,S OWN HEART.(CARLYLE,S WORKS, VOL,VI P.225

''صحرائے عرب کا یہ دانشمند فرزند جس کی کالی آنکھوں سے روشنی کی شعاعیں نکلتی تھیں جس کی مائل بہ جلوت ذات ایک کھلی کتاب تھی۔ جو حرصِ جاہ و منصب سے کلیۃً پاک تھا اُس کی آواز

فطرت کے دل کی آواز تھی''۔

۳-جے۔ڈی۔پورٹ قرآن کے بارے کہتا ہے:۔

THE VERSES OF THE QURAN BECAME MELODIOUS AND THRILLING WHEN DESCRIBING THE EVERLASTING DELIGHTS OF PARADISE.(APOLOGY. 69).

IT IS MORE PURE THAN THE SYSTEM OF ZOROASTER, MORE LIBERAL THAN THE LAW OF MOSES AND LESS INCONSISTENT WITH REASON.(P, 86).

''جب قرآن میں نعمائے فردوس کا ذکر ہو رہا ہو تو اُس کی آیات بڑی مترنم اور سنسنی خیز ہو جاتی ہیں...قرآن کا عطا کردہ نظام زرتشتی نظام سے پاک تر موسیٰؑ کی شریعت سے آزاد تر اور عقل سے قریب تر ہے''۔

۴-امریکہ کا ایک فاضل جے۔اے۔مچن ریڈر ڈائجسٹ میں لکھتا ہے:۔

THE QURAN IS PROBABLY THE MOST OFTEN READ BOOK IN THE WORLD SURELY THE MOST OFTEN MEMORISED, WRITTEN IN AN EXALTED STYLE. POSSESSING THE ABILITY TO AROUSE ITS HEARERS TO ECSTASIES OF FAITH. ITS RHYTHMS HAVE BEEN COMPARED TO THE BEATS OF DRUMS AND TO THE ECHOES OF NATURE. (READER DIGEST, JUN PAGE 82).

''قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو غالباً سب سے زیادہ پڑھی اور یاد کی جاتی ہے۔اس کا سٹائل اتنا شاندار ہے کہ سننے والا ایمان و عرفان کی مستیوں میں کھو جاتا ہے۔اس کی موسیقی میں وہی کیف و لذت ہے جو ڈھل کی چوٹ میں ہو یا فطرت کی گونج میں''۔

کارلائل اور گوئٹے عالمی سطح پر تسلیم شدہ اور چوٹی کے مفکرین میں شمار ہوتے ہیں۔اگر انہوں

نے ایک ایسی کتاب کی تعریف کی ہے جو عرب کے ایک امّی نے پیش کی تھی تو کتاب میں یقیناً کوئی ایسی بات محسوس کی ہوگی کہ جس نے انہیں ایسا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا کہ:۔ ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز فطرت کے دل کی آواز تھی''۔

میں چند ایسے احباب کے حوالے بھی پیش کرنا چاہوں گا جو اگر چہ بہت زیادہ مشہور نہیں تاہم وہ مستشرقین میں سے ہیں۔ مستشرق اس کو کہا جاتا ہے جو مذہبی لحاظ سے خواہ غیر مسلم ہو کر سچن یا یہودی یا کوئی بے مذہب ہو مگر وہ مشرقی زبانوں' علوم اور تہذیبوں کا عالم ہو۔ چنانچہ میں ایسے دو تین مستشرقوں کی انصاف پسندانہ آرأ جو قرآن اور صاحبِ قرآن کی توصیف کی مد میں ہیں اور جو دراصل اعترافِ حقائق ہیں اور خدا جسے چاہے فراخدلی اور جرأت سے نوازے۔

ایک مستشرق کا قول جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کی مد میں ہے:۔

,,IF WE CONSIDER WHAT THE ARABS WERE BEFORE MUHAMMAD,S APPEARANCE AND WHAT THEY BECAME AFTER IT, IF WE REFLECT UPON THE ENTHUSIASM KINDLED AND KEPT ALIVE BY HIS DOCTRINE IN THE BREASTS OF MILLIONS OF THE HUMAN RACE, WE CANNOT BUT FEEL THAT TO WITH-HOLD OUR ADMIRATION FROM SO GREAT A MAN WOULD BE THE MOST FLAGRANT IN JUSTICE(J.D.PORT;- AN APOLOGY FOR MUHAMMAD. LONDON 1869, PAGE VI).

''اگر ہم یہ سوچیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل عرب کیا تھے اور بعد میں کیا بن گئے اور اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھیں کہ جو جوش و جذبہ آپ کی تعلیم نے پیدا کیا تھا' وہ کروڑوں سینوں میں آج بھی موجود ہے' تو پھر اس عظیم انسان کی تعریف نہ کرنا شدید ناانصافی ہوگی''۔

آسٹریلیا کا ایک مستشرق جو بعد ازاں ایمان لا کر مسلمان ہو گیا اور اپنا اسلامی نام محمد اسد

رکھا۔قرآن کی فعالی واثر پذیری کے بارے درجِ ذیل بیان اسکے اسلام قبول کرنے سے پہلے کا ہے۔ کیامعلوم اسکی یہی سوچ بارگاہ خداوندی میں شرف قبولیت پا گئی اور اسے دولت اسلام اور ایمان جیسے انعام سے نواز دیا گیا ہو۔/بحوالہ (کیا قرآن کا ترجمہ کیا جاسکتا ہے/جینوا/۱۹۶۴ء صفحہ۲)۔

,,THE QRAN HAS FUNDAMENTALLY AFFECTED THE RELIGIOUS, SOCIAL AND POLITICAL HISTORY OF THE WORLD ....IT SHOOK ARABIA AND MADE A NATION OUT OF ITS PERENNIALLY WARRING TRIBES WITH IN A FEW DECADES IT CUTSTEPPED CONFINES OF ARABIA AND PRODUCED THE FIRST IDEOLOGICAL SOCIETY KNOWN TO MAN....THROUGH ITS INSISTENCE ON CONCIOUSNESS AND KNOWLEDGE, IT ENGENDERED AMONG ITS FOLLOWERS A SPIRIT OF INTELLECTUAL CURIOSITY AND INDEPENDENT INQUIRY, ULTIMATELY RESULTING IN THAT SPLENDID ERA OF LEARNING SCIENTIFIC RESEARCH WHICH DISTINGUISH THE WORLD OF ISLAM AT THE HEIGHT OF ITS CULTURAL VIGOUR.....AND GAVE RISE TO THAT REVIVAL OF WESTERN CULTURE WHICH WE CALL THE RENAISSANCES...(CAN THE QURAN BE TRANSLATED)

''قرآن نے دنیا کی مذہبی' سماجی اور سیاسی تاریخ پر زبردست اثر ڈالا۔اس نے جزیرہ نمائے عرب میں ایک تہلکہ مچادیا اور آپس میں لڑتے رہنے والے قبائل کو ایک قوم بنادیا۔اسلام کے آفاقی افکار' عرب کی سرحدوں کو جلد پھلانگ گئے اور انہوں نے دنیا کی پہلی نظریاتی ملت کو جنم

دیا۔علم وشعور کے متعلق اسلام کی تاکیدی ہدایات سے اس کے پیروؤں میں ذوقِ جستجو پیدا ہوگیا اور علم وتحقیق کے اس شاندار دَور کا آغاز ہوگیا جس نے دنیائے اسلام کو تہذیب وتمدن کی انتہائی بلندیوں پر پہنچادیا تھا اور جس سے یورپ کی نشاۃِ ثانیہ کا آغاز ہوا''۔

ایک اور مستشرق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کرتا ہوا کہتا ہے:۔

MUHAMMAD SHOULD BE JUDGED AS A GREAT FORMER AND LEGISLATOR AND MUST BE ACKNOWLEDGED AS THE VERY GREATEST MAN WHOM ASIA CAN CLAIM AS ONE OF THE RAREST AND MOST TRANSEENDANT GENIUSES THE WORLD EVER PRODUCED.(J,D.PORT AN APOLOGY FOR MUHAMMAD london 1869).

''محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک عظیم مُصلح اور قانون ساز تھے۔انہیں ایشیاء کا سب سے بڑا انسان اور دنیا کا عظیم ترین نابغہ تصوّر کیجئے...اُس صادق' راست باز' امین اور بلند کردار رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دعویٰ کہ قرآن اللہ کا کلام ہے کبھی غلط نہیں ہوسکتا''۔بحوالہ (AN APOLOGY FOR MUHAMMAD)

دوستو! غیر مسلم اہل نظر دانشوروں کے جذبات اور تأثرات یہ ہیں تو عاشقان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جذباتِ پاکیزہ کا عالم کیا ہوگا۔عرب کے اُس اُمی صلی اللہ علیہ وسلم کے اُس دَور کا اندازہ کریں کہ مخالفتِ مشرکین اور مزاحمتِ شدید سے یہ حالت کہ ہجرت تک کی نوبت آ گئی۔زُہرہ گداز شدائد اور دشواریوں کی موجودگی میں برس ہا برس سے بگڑے ظالم وبت پرست لٹیروں کو راہِ ھدایت پر لانا معمولی بات نہیں تھی' کہ قتل وغارت گری' شراب نوشی' قزاقی جن کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔نو پید بچیوں کو زندہ دفن کردینے والے وحشیوں کو بالآخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تہذیب واخلاق کی اُن بلندیوں تک پہنچادیا کہ ایک دنیا نے ان پر درُود وسلام بھیجنا روا رکھ لیا اور وہ یوں لائق اعتبار ہوگئے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انکی اقتداء پر اعتماد کا اظہار فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔

" اصحا بی کاالنجوم با یھم اقتد یتم اھتد یتم"

''میرے ساتھی راہ دکھانے والے ستاروں کی مانند ہیں تم جس کی بھی اقتدا کروگے راہِ ھدایت پالوگے''

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز صحرائی قبائل تک پہنچی تو اُن کے بیشمار وفود مدینہ آنے لگے۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے انکے کردار کا مطالعہ کرتے انکی باتیں سنتے اور پھر ایمان لے آتے۔اس انقلاب کا سبب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ پاکیزہ کردار تھا جس میں صداقت' دیانت' امانت' خلوص' محبت' عدل واحسان اور ایثار کی قوت شامل تھی۔ نیز کلامِ الٰہی (قرآن) کہ دلوں میں اتر کر رُوح میں زلزلے اٹھادیتا تھا۔

قرآن کا اعلان یہ کہ کُل نوعِ انسان کا باپ ایک تھا اور بہ نسبتِ آدمؑ تمام بنی نوعِ انسان کا ایک ہی گھرانہ تھا' جسے جاہ پسند اور خودغرض قائدین نے گروہوں' قوموں اور طبقات میں تقسیم کر کے اُسکی وحدت کو پارہ پارہ کرڈالا۔اب بھی سلیم الفطرت مفکرین کی کوشش ہے کہ انسانیت کو پھر سے متحد کریں اور اس کیلئے وہ مشترک بنیادیں تلاش کررہے ہیں۔مگر اس میں (بت پرستی اور خدا کی اولاد ثابت کرنے جیسے) عقائدِ شرکیہ بنیادی رکاوٹ ہیں۔ایسے گمراہانہ عقائد کی بیخ کنی بظاہر سہل دکھائی نہیں دیتی' حالانکہ ہر کوئی جانتا ہے کہ تمام کائنات کا خالق اور لائق عبادت صرف وہی خدائے واحد ہے دوسرا کوئی نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ توحید یعنی خدائے واحد کی پرستش اتحاد کی بنیادی شرط ہے۔قرآن نے توحید پر اتنا کچھ کہا اور شرک کو اِتنا رگیدا ہے کہ اگر ہم قرآن کو کتاب التوحید کہیں تو شاید بے جا نہیں ہوگا۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لاتعداد اعجازات میں سے ایک یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ماننے والوں کے قلوب سے شرک و بت پرستی کو یوں مٹادیا کہ ساڑھے چودہ صدیاں گزرنے پر بھی واپس نہ آسکی اور نہ اسکی گنجائش باقی ہے۔اسلام نے کفر اور شرک کو بدترین گناہ اور ناقابل معافی جرائم میں شامل فرمایا ہے۔قرآن واحادیث مبارکہ میں اکثر مقامات پر جب کسی گناہ کی مذمت کیلئے اس کے معیار و وزن کا ذکر ہوا ہے تو اسے کفر وشرک کے بعد ہی کا درجہ دیا گیا ہے جس سے شرک کی قباحت وناپسندیدگی کا بخوبی اظہار ہوتا ہے اور بحمداللہ ہر مسلمان اس سے بخوبی واقف وآشنا ہے۔

اختتامی الفاظ باب اوّل (اہمیتِ اسلامی تلوار)

اسلام کو بدنام کرنے والے غیر ذمہ دار نقاد ہمیشہ یہی راگ الاپتے رہتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا۔ اوّلاً تو اسلام نے بہت مجبور ہو کر اپنے دفاع میں تلوار اٹھائی۔ پھر کوئی اس بات سے لاعلم نہیں کہ غزواۃ و اسلامی جہادات میں کیا شرائط لازم تھیں' کہ کسی عورت یا بچے کو نشانہ نہیں بنایا جائیگا۔ کسی بوڑھے شخص یا جو کوئی بھی اسلامی افواج کا مقابلہ نہ کرے اسے ایذا نہیں پہنچائی جائے گی۔ کسی کے کھیت کھلیان ویران نہیں کیے جائیں گے۔ دوستو! کیا تلوار کے استعمال کا یہ دستور و طریق دنیا کی کسی دیگر حملہ آور قوم میں مشاہدہ کیا گیا ہے؟

خدا کی نافرمان اور کاہل اقوام کی درستگی اور انکی فعالی کیلئے یوں بھی تلوار کا استعمال ضروری ہو جاتا ہے اور اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تلوار کا استعمال فرمایا ہے تو میں کہتا ہوں انہوں نے کیا غلط کیا؟۔ انصاف سے کہو کیا وہ انہیں ملک بدر کر دینے والوں اور امن معاہدوں کو بار بار توڑتے ہوئے شب خون مارنے والوں کو پھولوں کے ہار پہناتے اور اپنے ساتھیوں کو ہلاکت کی بھینٹ چڑھنے دیتے۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام عالم کے نظم و نسق اور اقوام و ملل کی بہتری و برتری کا ذمہ دار بن کر آنے والے دین اسلام نے اگر ظلم و عدوان اور جور و عصباں کو مٹانے کیلئے تلوار کا استعمال کیا تو ہرگز کچھ غلط نہیں کیا۔ آج کروڑوں بے گناہ لوگوں کو محض تجارتی منڈیوں کی چھینا جھپٹی اور نو آبادیوں کی ہوس میں تہہ تیغ کیا جا رہا ہے' جس میں نہ بچوں کی تمیز ہے نہ عورت کا لحاظ۔ گذشتہ جنگ عظیم بھی کچھ ایسے ہی ذلیل مقاصد کیلئے لڑی گئی تھی۔

کیا حال ہی میں دنیا کو اپنے تئیں ایک بڑی طاقت کے وحشی پن کا مظاہرہ دیکھنے کو نہیں ملا' کہ محض دُنیوی برتری' اور تیل کے کنوؤں کی خاطر کس قدر کشت و خون کی ہولی کھیلی گئی۔ اسلامی جہاد پر اعتراض و تنقید کرنے والوں کی ایسے مظالم کے خلاف نہ تو آواز نکلتی ہے نہ انہیں ایسے ظلم و زبردستی میں کوئی برائی دکھائی دیتی ہے۔ مگر اُن مسلمانوں کے تلوار استعمال کرنے پر کچھ لوگ بہت نعل دَر آتش ہوتے ہیں' جن کا مقصد نہ تو تیل کے چشموں کا حصول ہے نہ ربڑ کے جنگلوں کا لالچ۔

مجھے یہ تسلیم کرنے میں باک نہیں کہ اسلام نے اپنے دفاع میں اور ظالم کو اس کے کیے کی سزا دینے میں تلوار اٹھائی اور بدی کا استیصال کرنے کیلئے بے دریغ چلائی، جس کا نتیجہ اربابِ ظلم کی ہلاکت اور عدل وانصاف کے احیاء پر منتج ہوا۔

مبارک ہے وہ تلوار جو کسی بلند مقصد کیلئے اٹھائی جائے کہ جسکے نتیجے میں شر کا خاتمہ اور دنیا میں امن وآشتی کا قیام ہو جائے۔ اسی لئے فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ ''میں قیامت سے کچھ دیر پہلے تلوار دیکر بھیجا گیا ہوں''۔ سوچنے کی بات ہے کہ خدا نے انہیں وہ تلوار (معاذ اللہ) ظلم وستم ڈھانے کیلئے دی ہوگی۔

میں اس حقیقت کو روزِ روشن کی طرح عیاں دیکھ رہا ہوں اور یقیناً آپ بھی یہ حقیقت تسلیم کریں گے کہ دنیا میں حضور سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ کی عالمگیر روشنی ہنوز پھیل رہی ہے اور وہ زمانہ دُور نہیں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ''پیغامِ توحید'' عالمِ انسان کی فلاح وامن کیلئے ایک راہنما پیغام ثابت ہوگا۔ (از: مصنف احسنِ الخالقین)

----------اختتامِ (باب اوّل)----------

(بابِ دوئم)
اقوامِ ماضی کے احوال

ماضی کے عقائدِ تخلیق وارتقاء

انسان کے تخلیق وارتقاء کی کہانیاں آج قصۂ پارینہ نہیں رہیں۔البتہ تخلیق کائنات کو اتفاقاً حادثاتی شئے قرار دینے والے کچھ کج فہم اِن تباہ شدہ بستیوں کے انجامِ عبرتناک سے عبرت حاصل کرنے کی بجائے ماضی کی کچھ گمراہ اقوام کے جاہلانہ رسوم ورواج اور انکے دیومالائی قصے کہانیوں کو(جو مختلف کتبوں، تختیوں، درودیوار پر کندہ عبارات اور تصاویر سے عیاں ہوئے) اپنے نظریات کی تائید میں پیش کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔عذابِ الٰہی کا شکار ہوکر زمین میں دھنسادی گئیں یا زمین کے تختوں سمیت اٹھا کر پٹخ ڈالی گئیں بستیاں کیوں یا کس ''اتفاقیہ حادثہ'' کا شکار ہوکر ایسے بھیانک انجام کو پہنچیں،اس طرف توجہ دینے کی انہیں فرصت یا شاید ضرورت نہیں۔حالانکہ یہ بات تحقیق وتلاش کی متقاضی تھی کہ اس کائنات کا نقطۂ آغاز کیا ہے۔بطورِ خاص عالم دنیا کی ابتداء کب اور کیسے ہوئی اور اس میں بسنے والی بے بہا مخلوقات کی پیدائش آخر کس ''اتفاق یا حادثہ'' کی کارفرمائی ہے، اور کس حادثہ یا اتفاق کی بناء پر تباہی و ہلاکت کا شکار ہوئیں۔طرہ یہ کہ انسان بیچارے کی عزت یوں خاک میں ملادینے کا سہرا بھی خود انسان کے سر رہا کہ بندر کی دم گھستی چلی گئی اور بندر بتدریج انسان بن گیا۔جبکہ اس فلسفہ میں حقیقت صرف اتنی ہے کہ انسانی پیدائش کے دوران انسان ماں کے پیٹ میں ایک ماہ کیلئے اس ہیئت سے گزرتا ہے۔

ایسی صورتِ حال میں یہ سوال شدید وضاحت طلب ٹھہرتا ہے کہ کیا کسی خالق کائنات کا کوئی وجود ہے بھی یا نہیں؟اور کیا کائنات واقعی حادثاتی طور پر معرض وجود میں آگئی یا اسے تخلیق کرنے اور حیرت انگیز نظم واعتدال سے چلانے میں واقعی کوئی ہستی کارفرما ہے؟ اس سوال کے جواب میں ہمیں ایمان ویقین کے علاوہ منطقی وعقلی دلائل سے بھی کام لینا ہوگا۔کیونکہ چند لوگ ابتدائے آفرینش سے چلے آتے ہزارہا انبیأ وپیغمبران اور الہامی کتب کی اطلاعات کو محض ڈھکوسلوں یا مفروضوں سے زیادہ

اہمیت نہیں دیتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انبیاء کی بات پر بلا چون و چرا یقین کر لینا احمقوں کا کام ہے۔ اُن کے تئیں ہم عظیم فلسفہ دانوں کو اپنی عقل و خرد پر بھروسہ ہے اور ہمارے نزدیک خدا نامی کسی ہستی، کسی سماوی کلام یا کسی نبی و پیغمبر کی حیثیت انسان کی خود تراشیدہ قصے کہانیوں سے زیادہ کچھ نہیں۔

اس سوال کا جواب تلاش کرنے کیلئے ہمیں ماضی کی اقوام کے عقائد، حالات اور انکی تہذیبوں کا مطالعہ کرنا ضروری ہوگا۔ ماضی کے فرسودہ نظریات و عقائد کی چھان بین اور مطالعہ سے قبل یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ قرآن کلی طور پر اِن تمام لغویات و بیہودہ نظریات کو یک قلم ردّ کرتے ہوئے وضاحت فرما چکا ہے کہ خدا کی اولاد اور نسل ثابت کرنیوالے، خالق کی مخلوق سے رشتہ داریاں جوڑنیوالے، اور اسکی تخلیقات میں بالخصوص اسکی الوہیت میں دوسروں کو شریک کرنے والے محض جہالت کی بناء پر اس قسم کے عقائد کے حامل ہیں اور انکی خرافات بیانی سے وہ ذات پاک و بالاتر ہے۔ سورۃ الانعام میں فرمان ہے۔

وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَ خَلَقَهُمْ وَ خَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَ بَنَاتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۟ (انعام:۱۰۰)

ترجمہ: اور انہوں نے جنات کو اللہ کا شریک بنایا، حالانکہ جنات کو بھی اللہ ہی نے پیدا فرمایا ہے اور اپنی جہالت کے سبب (مشرکوں نے) اللہ کے بیٹے بیٹیاں گھڑ لیں۔ جبکہ وہ ذات پاک اور برتر ہے اس سے جو کچھ وہ بیان کرتے ہیں (انعام:۱۰۰)

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (انعام:۱۰۱)

ترجمہ:۔ وہ موجد ہے آسمانوں اور زمین کا۔ اسکا کوئی بیٹا کیونکر ہوسکتا ہے، جبکہ اسکی کوئی بیوی ہی نہیں اور اسی نے ہر چیز کو پیدا فرمایا اور وہ ہر چیز کو کلی طور پر جاننے والا ہے۔ (انعام:۱۰۱)

عرض کرتا چلوں کہ مشرکین مکہ کے عقائد کے مطابق اللہ کی تین بیٹیاں تھیں جن کے نام الآت، عزہ اور منات تھے۔ الآت سورج کی دیوی تھی اور اس کا بت طائف میں تھا۔ عزہ دراصل اناث، عشتار اور ناہید ہے۔ (جس کا تعارف آگے آئیگا) قریش اور بنی کنانہ نے اس کا بت نخلہ میں نصب کر رکھا تھا جو مکہ

کی ایک مضافاتی بستی تھی۔ مکہ اور یثرب (مدینہ) کے درمیانی وساحلی علاقے کی دیوی منات تھی۔ البتہ قریش کا نہایت بزرگ دیوتا ''ھبل'' تھا جس کا بت کعبہ کے اندر کنوئیں کے پاس نصب تھا۔

زیر مطالعہ کتاب (احسن الخالقین) میں تخلیق وارتقائے کائنات کے بارے پرانی تہذیبوں اور انکے عقائد کی معلومات کا بیشتر ذریعہ آثارِ قدیمہ اور تباہ شدہ بستیوں کی کھدائیوں سے دستیاب ہونے والی تحریروں پر مشتمل ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے پاس تو تخلیق کائنات کی ایک مکمل روداد موجود تھی لیکن آثارِ قدیمہ کی کھدائیوں سے تا حال ایسا کوئی نشان نہیں ملا' جس سے قریش یا دوسرے عرب قبائل کے عقائد تخلیق کے بارے کوئی روشنی پڑ سکے۔ پروفیسر ''حتی'' کے مطابق یہ لوگ اللہ ہی کو ہر چیز کا خالق مانتے تھے۔ کم وبیش یہود ونصاریٰ کا عقیدۂ تخلیق اور (شرکیہ جزئیات سے قطع نظر) اللہ پر ایمان' اسلامی عقیدۂ تخلیق وارتقاء سے متفرق نہیں۔ اسکی وجہ غالباً تینوں کا اہل کتاب ہونا ہے۔ رہا اقوام ماضی کے عقائد' رواجات ونظریات' تو اسکے لئے ہمیں کرّہ ارض کی مختلف اقوام کے ماحول وماٴخذات پر سرسری ہی سہی مگر نظر ڈالنے کی ضرورت لازمی ہے۔

قدیم ماضی کے حالات وتغیرات

پرانی اقوام کے عقائد ونظریات کا جائزہ لینے کیلئے انکے سماجی ومعاشرتی حالات کو ذہن میں رکھنا نہایت ضروری ہے وگرنہ ان عقائد وافکار کے اصل محرکات سمجھ نہیں آسکیں گے۔ انسانی معاشرہ کوئی جامد وساکت شئے نہیں اسلئے اس میں وقتاً فوقتاً اہم اور بنیادی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ہمیں ان تبدیلیوں کا بھی علم ہونا چاہئے کیونکہ انسان کے خیالات واحساسات پر ان تبدیلیوں کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ اسکے علاوہ ہمیں اُن اصطلاحوں اور علامتوں کے اصل مفہوم سے بھی آگاہ ہونا چاہئے جو اس زمانے میں مروّج تھیں۔ الفاظ کی شکلیں اگرچہ کم بدلتی ہیں لیکن انکے معانی اور مطالب میں عہد بہ عہد تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً دیوی دیوتا کی اصطلاح قدیم لوگ کسی اور معنی میں استعمال کرتے تھے اور ہم کسی اور معنی میں کرتے ہیں۔ جیسے ''بھگوان'' کی موجودہ اصطلاح جسکے معنی خدا یا ایشور کے ہیں' گیا ہستانی دَور کے آریہ مختلف معنی میں استعمال کیا کرتے تھے۔ بھاگ سنسکرت میں حصہ کو کہتے ہیں اور ''بھاگوان'' شکاری

قبیلے کا وہ بزرگ مرد ہوتا تھا جو شکار اور خورد ونوش کی دیگر چیزوں کو اہل قبیلہ میں برابر تقسیم کرتا تھا جو بعد ازاں بھاگوان سے بھگوان رہ گیا۔ اُس دور کے معاشرہ میں حصے بانٹنا چونکہ نہایت اہم سماجی فریضہ تصور کیا جاتا تھا اسلئے قبیلہ والے ''بھاگوان'' کے فرائض اسی شخص کے سپرد کرتے تھے جو سب سے زیادہ دیانت دار اور منصف مزاج ہوتا تھا۔ گویا اُس دَور میں انکا حقیقی رزق رساں وہی بھاگوان ہی تھا۔

جب آریاؤں کی زندگی کا انحصار شکار پر نہ رہا اور انہوں نے کھیتی باڑی اور تجارت وحرفت شروع کی اور ذاتی ملکیت کو فروغ ہوا تو بھاگوان کا یہ قدیم منصب بھی لامحالہ ختم ہوگیا۔ البتہ انصاف اور رزاقی کا وہ تصور جو لفظ بھاگوان (بھگوان) میں تھا بدستور باقی رہا۔ چنانچہ جب آریائی ذہنوں نے دیوتاؤں کی تخلیق کی تو نہ صرف ان دیوتاؤں کو بھگوان کے اوصاف سے نوازا بلکہ انہیں بھگوان کا پرانا لقب بھی لوٹا دیا۔ اس طرح بھگوان کے معنی اور مفہوم بالکل بدل گئے۔ بھگوان جو ابتداً میں عام آدمی تھا اور شکار کے حصے تقسیم کرتا تھا معاشرتی حالات میں تبدیلی کے بعد ہندوؤں کی قسمت کے فیصلے کرنے پر مامور ہوگیا۔

یہی حادثہ لفظِ قسمت کے ساتھ بھی پیش آیا۔ حصے تقسیم کرنے والے کا معزز عہدہ تو ختم ہو گیا لیکن آنے والی نسلوں میں یہ یقین باقی رہا کہ کوئی ایسی طاقت ضرور ہے جو دنیاوی نعمتوں کو انسانوں میں تقسیم کرتی ہے۔ اسی سے انکے نزدیک قسمت اور لوح تقدیر کے تصورات پھر سے اُبھر آئے جو یقیناً گزر چکے انبیاء کی تعلیمات سے انہیں میسر آئے تھے مگر وہ رزّاقِ حقیقی کی بجائے یہ اعزاز اپنے من گھڑت دیوتاؤں اور بھگوانوں کو سونپنے لگے۔

وادیٔ دجلہ وفرات کے قدیم باشندوں کے ابتداً میں کیا عقائد تھے اور ان میں عہد بہ عہد کیا تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں اور انکے ماحول وعقائد پر کیا اثرات مرتب ہوتے رہے اس سوال کا جواب آسان نہیں۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی دشواری ذرائع معلومات کی کمی ہے کیونکہ تین ہزار قبل مسیح سے پیشتر کے ایسے کوئی آثار موجود نہیں ہیں جن سے پتہ چل سکے کہ گلہ بانی اور شکاری دور سے قبل کے زمانے میں وہاں کے لوگوں کی سوچ کیا تھی۔ تحریر کی ایجاد کے بعد بھی یہ مسئلہ پوری طرح حل نہیں ہوتا۔ کیونکہ جن

لوحوں اور کتبوں سے سرزمین عراق کے قدیم باشندوں کے خیالات اَخذ کئے جا سکے وہ معلومات زیادہ تر اشور بنی پال کے کتب خانہ یا جونیفر کی کھدائی میں ملیں۔ وہ نوشتے مذہبی دعاؤں، رزمیہ داستانوں، مختلف دیوتاؤں کے قصوں، شاہی مہمات، تجارتی معاہدوں اور کاروباری حساب و کتاب پر مشتمل ہیں۔

جن چند لوحوں سے افکار و عقائد کا انداز ا ہو سکتا ہے وہ فقط ایک خاص طبقے یا گروہ کے عقائد کی عکاسی کرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ بادشاہوں کے نویسندوں اور مندر کے پروہتوں نے فقط وہی چیزیں محفوظ کی ہوں گی جو انکے عقائد کے مطابق ہوں گی۔ دوسروں کے اور خاص کر مخالفین کے خیالات کو قلم بند کرنا انکے لئے ضروری نہ تھا۔ یوں بھی وابستگانِ سلطنت اور پروہتوں کے علاوہ بہت کم لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اسی وجہ سے ان مختلف نوشتوں میں افکار و عقائد کی حد تک بڑی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ جس سے بعض محققین یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اس خطہ کے لوگوں میں دو ہزار برس کے طویل عرصہ میں کوئی تبدیلی یا ترقی نہیں ہوئی۔

بظاہر یہ بات بڑی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے لیکن وادیٔ دجلہ و فرات کے لوگوں کے خیالات میں اس دَوران درحقیقت بڑی کم تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ یہ درست ہے کہ اس مدت میں وہاں بار بار سیاسی تغیرات رُونما ہوئے۔ کبھی سلطنت بابل کے اقتدار کا پرچم بلند ہوا کبھی کسدیوں اور ایرانیوں کی یلغار کا شور مچا اور کبھی اشور کی فتوحات کا غلغلہ اٹھا۔ لیکن معاشرے کے ڈھانچے میں کوئی فرق نہ آیا، بلکہ پرانے طبقاتی رشتے اپنی جگہ بدستور قائم رہے۔ چنانچہ مندر کے پروہتوں کا تسلط ہو یا نظم و نسق کے اصول، زراعت کے طریقے ہوں یا صنعت و حرفت کے انداز، جو شروقین اور حمورابی کے عہد میں تھے وہی اشور بنی پال اور بخت نصر کے زمانے میں بھی رائج رہے۔ بہت ہوا تو سومیریوں کے ''انو'' دیوتا کی جگہ بابل کے ''مردک'' کو مل گئی یا ''انو'' کا نام شمس ہو گیا، وگرنہ پرانے رسوم و رواج اور طرزِ زندگی میں کوئی بنیادی فرق دکھائی نہیں دیا۔ فرق آنا منطقی طور پر ممکن بھی نہ تھا کیونکہ کسی معاشرے کے طرزِ زندگی اور فکری اسلوب میں تبدیلیاں اسی وقت پیدا ہو سکتی ہیں جب خود معاشرے کا وجود ان تبدیلیوں کا متقاضی ہو اور معاشرے کا وجود اسی وقت تبدیلیوں کا تقاضا کرتا ہے جب پیداوار کے پرانے اسلوب و طریق یا رشتے معاشرہ کی

ترقی کی راہ میں حائل ہونے لگیں۔ تب نئے اور پرانے خیالات آپس میں ٹکراتے ہیں۔ کارل مارکس ایک جگہ لکھتا ہے کہ :۔

''مادی تبدیلیوں کو تو سائنسی طور پر ٹھیک ٹھیک ناپا جا سکتا ہے لیکن ذہنی تبدیلیوں کا تعین آسان نہیں ہوتا اور شعور کی آویزشیں انہی ذہنی پیکروں میں نمودار ہوتی اور لڑی جاتی ہیں۔ کوئی سماجی نظام اس وقت تک معدوم نہیں ہوتا جب تک عناصر پیداوار کیلئے سماج میں ترقی کی گنجائش باقی رہتی ہے اور پیداوار کے نئے اور بہتر رشتے اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتے جب تک کہ انکے وجود کے مادی عوامل پرانے سماج کے بطن میں پوری طرح پرورش نہیں پا لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ بنی نوع انسان فقط انہی مسائل سے نبرد آزما ہوتی ہے جن کو حل کرنے کی اس میں سکت ہوتی ہے۔ دراصل اس قسم کا کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہی اس وقت ہے جب اس کے حل کیلئے مادی حالات موجود و سازگار ہوں''۔

وادیٔ دجلہ و فرات کے لوگوں کو تقریباً دو ہزار برس تک عناصر پیداوار یا ان پیداواری رشتوں کو بدلنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ وہی کانسی کے آلاتِ پیداوار اور آلاتِ جنگ جو شہری ریاستوں کے ابتدائی زمانے میں استعمال ہوتے تھے چھٹی صدی ق م میں ایرانیوں کے غلبہ کے وقت بھی وہی رائج تھے۔ نہ معاشرے کی بنیادی ساخت بدلی اور نہ خیالات و عقائد کی دنیا میں کوئی ہلچل پیدا ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ عراق کی سرزمین سے زرتشت، مانی یا مزدک کی مانند کوئی انقلابی شخصیت کبھی اُبھری اور نہ کوئی ایسی سماجی تحریک پیدا ہوئی جو پرانے توہمات اور عقائد کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی۔ یوں بھی زرتشت، مانی اور مزدک چھٹی صدی ق م کے بعد پیدا ہوئے۔

انیسویں صدی سے پیشتر انسان کے ماضی (بعید) کے بارے ہماری معلومات بہت ناقص اور محدود تھیں۔ ''عہدِ قدیم'' زمین کے سینے میں دفن تھا اور ہمیں نہ ان دفینوں کی خبر تھی نہ انکی تلاش و تحقیق کا کوئی ذریعہ موجود تھا۔ ہماری آگہی کا کل اثاثہ چند مذہبی کتابیں یا وہ لوک کہانیاں تھیں جو پرانی قوموں میں ہزاروں برس سے رائج تھیں۔ پس انہی نوشتوں اور روائتوں کی روشنی میں انسان اور اسکے قدیم

معاشرے کا اندازا لگایا جاتا تھا۔

سترھویں صدی کے اُشر نامی ایک پادری نے انجیل کی کتاب پیدائش کے مطالعہ سے یہ ثابت کیا تھا کہ ظہورِ آدمؑ کا واقعہ ۴۰۰۴ ق م میں پیش آیا تھا اور مغربی داناؤں نے اُشر کو اس کاوش پر بہت سراہا اور تعریف و توصیف سے نوازا تھا۔ لیکن انیسویں صدی میں جب سائنس نے ترقی کی اور علم الارض، علم الحیوان اور علم الافلاک جیسے نئے نئے علوم کو فروغ ہوا تو زمین اور انسانی زندگی کی عمریں متعین ہونے لگیں۔ ارتقائے حیات کے نظریے قائم ہونے لگے اور زمین کی تہوں میں مدفون ایسی چیزیں برآمد کی جانے لگیں جن سے ثابت ہو گیا کہ زندگی کے جرثومے کروڑوں برس سے زمین کی آغوش میں پرورش پا رہے ہیں۔

دانشوروں کی رائے پر متلاشیوں نے اُن معدوم جانوروں کے ڈھانچے بھی ڈھونڈ نکالے جو لاکھوں برس قبل معدوم ہو چکے تھے اور جب ۱۸۹۱ء میں پروفیسر دُوبائے کو جاوا میں قدیم انسان کی چار لاکھ برس پرانی ایک کھوپڑی دستیاب ہوئی تو پادری اُشر کا حساب بالکل ہی غلط ثابت ہوا۔ اسکے بعد ۱۹۰۷ء میں ہائیڈل برگ (جرمنی) کے مقام پر ایک انسانی جبڑا ملا جو پانچ لاکھ برس پرانا تھا۔ ۱۹۰۷ء ہی میں پیکنگ (چین) کے ایک نواحی غار میں سے (۴۵) انسانی ڈھانچے دستیاب ہوئے جو چار لاکھ برس پرانے تھے۔ چنانچہ اب تک کی تحقیق کے مطابق ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان کم از کم پانچ لاکھ سال سے اس کرّۂ ارض پر آباد ہے۔

پتھر، دھات اور لوہے کے زمانے

محققین نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ پانچ لاکھ سال کے اس عرصہ میں انسان کے آلات و اَوزار، رسوم و رواج، رہن سہن، عقائد و عادات اور فکر و فن میں وقتاً فوقتاً نمایاں تبدیلیاں واقع ہوتی رہی ہیں کیونکہ انسانی تہذیب کوئی جامد اور ساکت شئے نہیں جو کسی ایک مقام پر مستقل ٹھہری رہے، بلکہ وہ ایک تغیر پذیر اور فعال حقیقت ہے، جس نے اب تک ارتقائے حیات کے مختلف مدارج طے کئے ہیں اور یہ عمل ہنوز جاری ہے۔

ان تبدیلیوں کا باعث وہ آلات واَوزار ہیں جن کو انسان حصول معاش کی خاطر خود بناتا ہے۔ تہذیب انسانی کے مختلف ادوار کی شناخت انہی آلات واَوزار سے کی جاتی ہے۔ چنانچہ ۱۸۳۶ء میں کرسٹین ٹامسن نامی ایک فرانسیسی عالم نے آلات واَوزار کی تبدیلیوں کے پیش نظر انسانی تہذیب کے تین بنیادی اَدوار قائم کیے ہیں۔

۱۔ پتھر کا زمانہ جب کہ آلات واَوزار پتھر' لکڑی یا ہڈیوں کے ہوتے تھے۔

۲۔ دھات کا زمانہ جبکہ آلات واَوزار کانسی کے ہوتے تھے۔

۳۔ لوہے کا زمانہ جو ایک ہزار قبل مسیح کے قریب شروع ہوا اور اب تک جاری ہے۔

پتھر کا زمانہ تقریباً ۵۰۰۰ قبل مسیح تک جاری رہا جسکو زمانہ قبل از تاریخ بھی کہتے ہیں۔ علمائے آثار نے پتھر کے زمانے کو بھی تین اَدوار میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ قدیم حجری دور۔۔۔ پانچ لاکھ قبل مسیح۔۔تا۔۔۲۰ ہزار قبل مسیح

۲۔ وسطی حجری دور۔۔۔۲۰ ہزار قبل مسیح۔۔۔تا۔۔۱۲ ہزار قبل مسیح

۳۔ جدید حجری دور۔۔۔۱۲ ہزار قبل مسیح۔۔۔تا۔۔۵ ہزار قبل مسیح

لیکن کرسٹین ٹامسن نے حجری دَور سے پہلے کا وہ طویل زمانہ غالباً نظر انداز کر دیا جس میں انسان ابھی اَوزار بنانے کے فن سے نا آشنا تھا اور جنگل کے پھل پھول' جڑی بوٹیوں اور گھاس پات پر زندگی بسر کرتا تھا۔ حالانکہ حجری دَور کے لوگوں کے افکار وعقائد اپنے پیش روؤں کے تجربات سے بہت متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ البتہ اُسی دَور کے آخری حصہ میں انسان نے لکڑی اور پتھر کی مدد سے پھل توڑنے جڑیں کھودنے اور غالباً شکار کرنے کا ہنر بھی حاصل کر لیا تھا۔

ماضی بعید کے حجری دَور کے آغاز پر قبیلے کی وحدت تو برقرار رہی البتہ بتدریج عورت کی حیثیت ضمنی ہوگئی۔ یہ دَور وہ ہے جب انسان جنگلی درندوں کے شکار کیلئے پتھر کے نوکیلے ٹکڑوں کو لکڑی سے جوڑ کر بھالے اور کلہاڑے وغیرہ بنانے لگا تھا۔ شکار بڑے جان جوکھوں کا کام تھا اور اُس میں جسمانی قوت زیادہ درکار ہوتی تھی لہٰذا یہ کام مَردوں کے سپرد ہوا۔ دراصل اسی وقت تقسیمِ کار کی بنیاد پڑی۔ مرد

شکار کیا کرتے اور جو کچھ ہاتھ آتا اسے قبیلے والے آپس میں بانٹ لیا کرتے تھے اور عورتیں بدستور جڑی بوٹیاں اور خوراک کیلئے ساگ پات اور پھل وغیرہ اکٹھا کیا کرتیں۔ علاوہ ازیں عورتوں کا کام بچوں کی پرورش کرنا' قبیلے کے بوڑھوں اور بیماروں کی دیکھ بھال کرنا' جانوروں کی کھالیں صاف کر کے ان سے قبیلے والوں کی پوشاک تیار کرنا وغیرہ بھی تھا۔

اسی زمانے میں گلہ بانی بھی شروع ہوگئی کیونکہ شکاریوں کو ہر وقت تو شکار میسر نہیں ہوتا تھا البتہ کبھی کبھار جب جنگل میں گائے بھینس' بھیڑ بکری یا ہرن کے بچے ہاتھ لگتے یا کسی زخمی جانور کو زندہ پکڑنے میں کامیاب ہو جاتے تو وہ انہیں آئندہ خوراک کے طور پر پالنے لگے۔ یوں گلہ بانی کی ابتدا ہونے سے انسان کو شکار کی محتاجی اور مارا مارا پھرنے سے آزادی مل گئی نیز پینے کیلئے جانوروں کا دودھ بھی میسر ہو گیا۔ ان سہولتوں کے باوجود انسان کی صحرانوردی اور خانہ بدوشی بدستور برقرار رہی۔ یوں بھی اسے مویشیوں کے گھاس چارے وغیرہ کی تلاش کیلئے مجبوراً گیا ہستانی علاقوں کا رُخ کرنا پڑا۔ چنانچہ آریاؤں کے وہ قافلے جو پندرھویں صدی ق م میں ایران میں داخل ہوئے اور جنہوں نے سندھ کی تہذیب کو تاراج کیا' دراصل یہی گیا ہستانی لوگ تھے۔ اس دَور کے آثار دجلہ کی وادی میں سمشال' شنیدر' کریم شہر اور دوسری کئی جگہوں پر ملے ہیں۔ البتہ ان آثار میں کہیں کوئی مورتی دستیاب نہیں ہوئی جس سے گمان کیا جاتا ہے کہ اس وقت تک اس خطے کے لوگ سحر اور مذہبی تصور سے آشنا نہیں ہوئے تھے۔

اُموی زرعیؔ نظام

گلہ بانی کے بعد کھیتی باڑی کا دَور آیا۔ فن زراعت کی ایجاد کا سہرا عورت کے سر ہے کیونکہ یہ شروع ہی سے ثمر یابی اور ساگ پات وغیرہ اکٹھا کرنے پر متعین تھی اور بتدریج اسکی افزائش میں کوشاں تھی۔ زراعت جیسی اس عظیم ایجاد نے معاشرتی انقلاب کی داغ بیل ڈالی۔ انسان پہلی بار مارا مارا پھرنے کی بجائے کسی ایک جگہ زمین سے وابستہ ہوا اور اس نے سفری زندگی ترک کر کے حضری زندگی کا آغاز کیا۔ زراعت کی وجہ سے انسان اپنی خوراک خود پیدا کرنے کے قابل ہوا۔ اس سے قبیلے کے اندر عورت کو فوقیت و اہمیت میسر آ گئی' وہ چونکہ انسانوں کو جنم دینے والی اور انہیں پالنے والی حقیقت بھی تھی

چنانچہ بتدریج اسکی ذات تمام اختیارات کا سرچشمہ قرار پا گئی۔

زراعت کی ابتدا کے ساتھ دنیا میں اَموی نظام با قاعدہ رائج ہوا۔ یہ نظام مصر، عراق، یونان، ایشیائے کوچک اور وادیٔ سندھ میں صدیوں تک قائم رہا۔ حتیٰ کہ فراعنہ کے عہد تک تخت و تاج کی حقیقی مالک اور مندر کی مہا پروہت ملکہ ہی ہوتی تھی اور فرعونوں کو ملکہ کے ساتھ شادی کرنے کے طفیل ہی تاج و تخت اور اقتدار نصیب ہوتا تھا۔ اَموی نظام کی مدح میں پروفیسر ریورز نے لکھا۔

> ''یہ ایسی سماجی تنظیم ہے جس میں ہر شخص کے حقوق دوسرے کے مقابلہ میں اور پورے معاشرے کے مقابلہ میں ماں کے رشتے سے متعین ہوتے ہیں۔ معاشرہ کی حد تک اسکے فرائض اور حقوق ان رشتوں سے متعین ہوتے ہیں جو اس شخص میں اور اسکی ماں کے رشتہ داروں میں اور اس کی ماں کے سماجی حلقے میں قائم ہوتے ہیں۔ المختصر یہ کہ اَموی نظام میں قبیلے کے ہر شخص کو اُسکے حقوق اور فرائض اسکی ماں کی طرف سے ملتے تھے نا کہ باپ کی طرف سے''۔

اس قسم کا اَموی نظام اُن پسماندہ قوموں میں اب تک رائج ہے جو زراعت کے ابتدائی دَور سے آگے نہیں بڑھیں۔ مثلاً آسام میں اور مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) کے سرحدی علاقوں میں ایسی ایک پس ماندہ قوم آباد ہے جسے کھاسی کہتے ہیں۔

عراق میں سب سے پرانی مورتیاں جرمو اور حلاّف میں ملی ہیں۔ یہ مورتیاں اسی زرعی اور اَموی نظام کے دَور کی ہیں۔ یہ مورتیاں حاملہ عورتوں کی ہیں اور اُن میں پستان اور پیڑو کا اُبھار بہت نمایاں ہے۔ اسی نوع کی مورتیاں کریٹ کے جزیرہ میں اناطولیہ کے پلیٹو پر دریائے سندھ کی وادی میں یونان، مصر اور فونیقیا میں بہ کثرت دستیاب ہوئی ہیں۔ دراصل دنیا کا شاید ہی کوئی پرانا خطہ ایسا ہو جہاں سے حاملہ عورت کی مورتیاں نہ ملی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ بغداد، قاہرہ، استنبول، موہنجوداڑو، ایتھنز، روم، پیرس، ماسکو، لندن، نیویارک، برلن، پیکنگ اور ٹوکیو کے عجائب گھروں میں حاملہ عورتوں کی ایسی مورتیوں کی بہتات ہے۔

اسکی وجہ اور غرض وغایت کیا ہے؟ اسکے جواب میں عمرانیات کے عالموں کا کہنا ہے کہ ابتدائی زرعی دَور میں ایسی مورتیاں زرعی پیداوار کی افزائش کی ساحرانہ رسوم میں استعمال کی جاتی تھیں۔ کیونکہ اس دَور میں لوگوں کے نزدیک حاملہ عورت کا تخلیقی عمل اور زمین کی پیداوار ایک ہی سکہ کے دو رُخ سمجھے جاتے تھے۔ غالباً اسی بناء پر انہوں نے عورت کو مادرِ ارض کا خطاب دیکر اسکی مورتیاں گھڑ لی تھیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دَور میں انسان زراعت کے اصولوں سے شعوری طور پر آگاہ نہیں تھا۔

وادیٔ دجلہ وفرات کے قدیم باشندوں کی نظر میں پوری کائنات زندگی سے بھرپور ایک وحدت تھی۔ وہ اشیاء کو حیوانات' نباتات اور جمادات میں تقسیم کے قائل نہ تھے بلکہ موجوداتِ عالم کو یکساں فعال اور صاحب ارادہ خیال کرتے تھے۔ لہٰذا پتھر کا ٹکڑا ہو یا ریت کا ذرّہ' آندھی طوفان ہوں یا چمکتے چاند سورج ستارے' جانور ہوں یا انسان سب فعال اور صاحب ارادہ ہستیاں تھیں۔ اگر کسی راہگیر کو چلتے ہوئے ٹھوکر لگ جاتی تو وہ اس حادثہ کو یوں بیان کریگا کہ:۔

''میں چلا جارہا تھا کہ اچانک پتھر کے ایک ٹکڑے نے میرے پاؤں پر ڈس لیا''۔

دوسری پرانی قوموں کی طرح اہل عراق بھی کسی واقعے یا حادثے کا سبب تلاش کرتے وقت یہ نہیں پوچھتے تھے کہ یہ کیوں اور کیسے ہوا' بلکہ وہ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ یہ واقعہ یا حادثہ کس نے کیا۔

ماضی کے عہد طفلی میں انسان اشیاء کا تصور مجردات کی بجائے شخصی اور تصوراتی انداز میں کرتا تھا۔ جیسے اہل عراق اور مصری کشتی میں سفر کرنے کے عادی تھے تو انہوں نے خیال کیا کہ سورج دیوتا صبح سویرے اپنی کشتی پر بیٹھ کر آسمان کے نیلے سمندر میں سفر شروع کر دیتا اور شام کو بحر ظلمات میں چلا جاتا ہے جو مغرب میں ہے۔ اسکے برعکس وسطی ایشیاء کے میدانوں میں گھوڑوں پر سواری کرنے والے آریاؤں کا ماننا تھا کہ سورج دیوتا گنگا جمنی رتھ میں سوار ہاتھ میں سنہری کرنوں کا بھالہ لئے روزانہ اس شان سے سفر پر نکلتا ہے کہ اسکے گھوڑوں کے منہ سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں اور اسکی گرمی سے زمین تپ جاتی ہے۔ چنانچہ وہ شدتِ گرمی کو بیان کرتے وقت کہا کرتے آج بہت گرمی پڑ رہی ہے۔ ماضی تو درکنار ہم آج تک ماضی کے اس اسلوب سے الگ نہیں ہو سکے اور ایک طرح سے ہر شئے کو فعال قرار دیتے چلے

آرہے ہیں۔مثلاً سورج ڈوب گیا' ہوا چل رہی ہے' گرمی لگ رہی ہے' میری نماز نکلی جارہی ہے' بارش تھم گئی ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ اسلوب یوں کہ انکے نزدیک ہر واقعے کے پیچھے کوئی نہ کوئی فعال اور صاحب ارادہ شخصیت ہوتی تھی جس کے ارادہ وعمل کے بغیر نہ کوئی شئے وجود میں آسکتی تھی نہ فنا ہوسکتی تھی۔ غالباً یہ وقتاً فوقتاً تشریف لانے والے انبیاء وپیغمبران کی تعلیمات ہی سے مأخوذ نظریہ تھا جو ذاتِ کبریاء سے تو منسوب نہ رہ سکا اور بوجہ ظلم وجہالت' مخلوق کے سر سجادیا گیا۔(مؤلف)

بعین ہی پرانی قومیں عورت کے عمل تولید اور پودوں کے نامیاتی عمل کو ایک ہی طرح کی چیز سمجھتی تھیں' بہت سی پسماندہ قومیں تو ابھی تک اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ جزائر نکوبار (بحر ہند) کے باشندوں کا اعتقاد ہے کہ بجائے مرد کے عورت اگر کھیت میں بیج بوئے تو فصل زیادہ اچھی ہوتی ہے۔ جنوبی اٹلی کے کاشتکاروں کا عقیدہ ہے کہ اگر حاملہ عورت درخت لگائے یا بیج بوئے تو فصل پر خوشگوار اثر پڑتا ہے۔اس سے چند صدی پیشتر روم اور یونان کے توہم پرست لوگ اناج اور زمین کی دیوی کو حاملہ عورت کی قربانی بھی پیش کرتے رہے۔بعض پرانی قوموں میں یہ عقیدہ حد سے تجاوز کر گیا کہ تمام پودے اور درخت عورت کی فرج سے اُگتے ہیں اور اس قسم کی مورتیوں' مہروں اور تصاویر سے یہ بات بخوبی عیاں بھی ہے۔مرکندیہ پُرانوں میں پیداوار کی دیوی کا ایک خطاب یوں ہے۔

''اس کے بعد اے دیوتاؤ میں ساری دنیا کو حیات بخش سبزیوں سے نوازوں گی' یہ سبزیاں تیز بارش میں میرے جسم سے اُگیں گی۔ (آتما دیہہ سمبھولے) اور میں زمین پر سکھمبری (ہریالی پیدا کرنیوالی) کہلواؤں گی''۔

دیوی کا یہ دعویٰ علامتی یا شاعرانہ تخیل نہیں' بلکہ اسکی تصدیق ہڑپہ سے برآمد شدہ مُہریں بھی کرتی ہیں۔ یہ مُہریں قریباً ساڑھے تین ہزار سال پرانی ہیں۔ایک مُہر میں برہنہ عورت سر کے بل کھڑی ہے اسکے پاؤں پھٹے ہوئے ہیں اور فرج سے ایک پودا اُگ رہا ہے۔مُہر میں دو برہنہ شکلیں اور بھی ہیں اور درمیانی جگہ میں کوئی تحریر کندہ ہے جو کسی ساحرانہ رسم کی نقش گری ہے۔اس مُہر پر تبصرہ کرتے ہوئے سر جان مارشل لکھتا ہے کہ:۔

''جہاں تک مجھے معلوم ہے مادرِ ارض کی یہ بے مثال مورت ہے۔عورت کی فُرج سے پودے کا اُگنا اس زمانے کے لوگوں کے لئے حیرت انگیز بات نہیں تھی۔ چنانچہ اتر پردیش میں بٹیا کے مقام پر گپتا عہد کی ایک مورتی ملی۔اس مورتی میں فرج کی بجائے گردن سے کنول کا ایک پودا نکلا ہوا ہے''۔

دوسری مُہر بھی اسی قسم کی ہے۔اس میں ایک پودا زمین سے اُگ رہا ہے ایک برہنہ عورت پاس کھڑی ہے اور دوسری گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوئی اپنے دونوں ہاتھوں سے پودے کی شاخ چھو رہی ہے۔اسکے پیچھے ایک بیل کھڑا عورتوں کو غور سے دیکھ رہا ہے۔اس مُہر کی ساحرانہ نوعیت بالکل واضح ہے۔

ضمناً عرض کرتا چلوں کہ ہم مورتیوں کو دیکھ کر خیال کر سکتے ہیں کہ ماضی میں یہ مورتیاں پوجا میں استعمال کی جاتی ہونگی' مگر یہ خیال درست نہیں بلکہ یہ مورتیاں زراعت کی ساحرانہ رسوم میں استعمال ہوتی تھیں۔جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ ابتدائی انسان کسی مافوق الفطرت قوت کا شعور نہیں رکھتا تھا۔وہ تمام کائنات کو ایک وحدت تصور کرتا تھا اور سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کائنات سے پَرے کوئی ایسی ہستی بھی موجود ہے جو اس کائنات کو تخلیق کرنے اور چلانے والی ہے۔اس لئے اسے اپنی راہ میں پیدا ہونے والی رکاوٹوں اور موسموں کی ستم ظریفیوں سے مقابلہ کرنے کیلئے بظاہر دکھائی نہ دینے والی قوتوں سے کام لینے کیلئے سحر جیسی ناقص سائنس پر اعتبار کرنا پڑا۔

جب انسان نے دیوی دیوتاؤں کو خلق کیا تب بھی اسکے نزدیک ان دیوی دیوتاؤں کی حیثیت مظاہر قدرت کی شخصی تشکیل سے زیادہ نہیں تھی۔اسکے ذہن میں پرستش کا وہ مفہوم قطعی نہیں تھا جو ہمارے اذہان میں ہے۔پرستش یا عبادت کا محرک رضا جوئی کا جذبہ ہوتا ہے' یعنی انسان کسی مافوق الفطرت قوت سے امداد و اعانت کی التجاء کرتا ہے' جبکہ سحر کا محرک تسخیر قدرت کا جذبہ ہوتا ہے۔وہ اُس وقت تک اپنے دیوی دیوتاؤں کی عبادت ان معنوں میں نہیں کرتا تھا جن معنوں میں ہم خدائے واحد کی عبادت کرتے ہیں۔دراصل یہ دیوی دیوتا وغیرہ انکے قومی ہیرو اور محسن تھے جن کو انسان نے بتدریج دیوی دیوتاؤں کا مرتبہ دے دیا تھا۔

ابتدائی انسان حاملہ عورتوں کی مورتیوں کی باقاعدہ پوجا نہیں کرتا تھا اور نہ ہی پوجا کا کوئی تصور رکھتا تھا بلکہ ان مورتیوں کو زراعت کیلئے رسومِ سحر میں استعمال کرتا تھا اس بارے بحث کرتے ہوئے پروفیسر بریفالٹ اپنی کتاب ''مائیں'' میں لکھتا ہے:۔

''دنیا کی تمام غیر مہذب و پسماندہ قوموں کی نگاہ میں زراعت کے فن کا بیشتر دارومدار قوتِ سحر پر ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہنر اور جسمانی محنت سے زیادہ سحر کی قوت پر اعتماد کرتی ہیں''۔

پرانی قوموں کے زرعی رسوم و رواج اور موجودہ پسماندہ قوموں کے طرزِ معاشرت کے مطالعہ سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ جرموا اور حلاف سے نکلی مادرِ ارض کی مورتیاں بھی زرعی افزائش کی ساحرانہ رسوم میں استعمال ہوتی رہیں۔ نہ صرف یہی بلکہ لوک ناچوں اور لوک گیتوں کا تعلق بھی زراعت ہی کی کسی نہ کسی رسم سے جڑا ہے۔ بلکہ علماء کا خیال ہے کہ ناچ گانے کی ابتداء ہی زراعت کی رسموں سے ہوئی ہے اور واقعہ ہے کہ پرانی قوموں کے سبھی تہوار کھیتی باڑی ہی سے متعلق ہیں۔

اَبوی زرعی نظام

زراعت کے ابتدائی دور میں ہر جگہ اَموی نظام قائم تھا اور زراعت کی ایجاد کا سہرا بھی عورت کے سر پر سجا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ زرعی پیداوار (افزائش) کی تمام ساحرانہ رسمیں جگ ماتا اور مادر ارض (دھرتی کی ماں) کے گرد گھومتی ہیں۔ لیکن جب انسان نے بھاری اوزار اور وزنی ہل وغیرہ ایجاد کر لئے تو اَموی نظام کے زوال کا آغاز ہو گیا اور اَبوی نظام کا سورج طلوع ہوا۔ کیونکہ بیل کی مدد سے ہل جوتنے اور کاشتکاری کیلئے دیگر وزنی اوزاروں کے استعمال کیلئے جس جسمانی قوت کی ضرورت تھی وہ فقط مردوں کو حاصل تھی۔ اس نئی ایجاد کے ذریعہ کھیتی باڑی کرنے سے زرعی پیداوار کئی گنا بڑھ گئی۔ ضرورت سے فاضل غلہ سے پیداوار کے تبادلہ (تجارت) کا رواج یہیں سے پڑا۔ جوں جوں پیداوار میں اضافہ اور تجارتی لین دین بڑھتا گیا توں توں عورتوں کا زرعی اثر و نفوذ معاشرے میں کم ہوتا گیا اور بتدریج اَموی نظام کی جگہ اَبوی نظام فروغ پا گیا۔

اس سماجی انقلاب کا اثر زندگی کے دوسرے شعبوں پر بھی پڑا۔ مثلاً اَموی نظام میں سحر کی جو

رسمیں عورتیں انجام دیتی تھیں اس نظام میں تبدیلی کی وجہ سے انکا ساحرانہ کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ چند جادوگرنیاں اگرچہ اَبوی نظام میں بھی باقی تھیں مگر انکی حیثیت ثانوی سی رہ گئی۔

وادیٔ دجلہ وفرات میں اَموی نظام کی جگہ اَبوی نظام کب رائج ہوا یہ بتانا مشکل ہے البتہ یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ اَموی نظام شہری ریاستوں کے وجود میں آنے سے پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ یہ بھی ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ انسان کے ذہن نے دیوتاؤں کی تخلیق اَبوی نظام ہی کے زمانہ میں کی۔ خواہ یہ نظام گیاہستانی اور گلہ بانی کے دور کا ہو' آریاؤں کا ہو یا کانسی کی تہذیب' یعنی مصر وعراق وغیرہ کا دَور ہو۔

سوال یہ ہے کہ آخر انسانی معاشرے کو ان دیوتاؤں کی ضرورت کیوں پیش آئی اور ذہنی شعور کی کس منزل پر پہنچ کر انسانی معاشرہ نے اس ضرورت کو محسوس کیا۔ اس سوال کے جواب میں علمائے آثار قدیم لوگوں کے اندازِ فکر سے استدلال کرتے ہیں۔ چنانچہ فرینکفرٹ کے پروفیسر جیکب سن نے اپنی تصنیف ''Before Philosophy'' میں قدماً کے اندازِ فکر کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ لوگ قدرت کے تمام مظاہر کو فعال اور صاحب ارادہ شخصیتیں تصور کرتے تھے۔ انکے نزدیک بعض شخصیتیں بڑی مشفق اور مہربان تھیں جیسے زمین' سورج' چاند وغیرہ اور بعض شخصیتیں پُراسرار' جیسے پانی کی شخصیت کہ خوش ہو تو کھیتیاں لہلہائیں چراگاہیں سرسبز ہو جائیں اور ناخوش ہو تو سیلاب انسانوں فصلوں مویشیوں سب کو تباہ کر ڈالے۔ بعض شخصیتیں بہت ڈراؤنی اور نقصان دہ تھیں جیسا کہ موت اور بیماری وغیرہ۔

قدیم انسان ان شخصیتوں (دیوتاؤں) کو مافوق الفطرت یا ماورائے حقیقت نہیں سمجھتا تھا بلکہ اس نے تو ان دیوتاؤں کو انسانی شکلیں عادات اور خصلتیں بھی عطا کر دی تھیں۔ وہ خیال کرتا تھا کہ دیوی دیوتا بھی کھاتے پیتے ہیں تھکتے اور آرام کرتے ہیں۔ انسانوں ہی کی مانند ان کی شادی ہوتی اور اولاد پیدا ہوتی ہے۔ یہ دیوتا عشق کی لذتوں اور ہوس کی بے شرمیوں سے بھی آشنا ہیں ان سے نیکیاں بھی سرزد ہوتی ہیں اور برائیاں بھی۔ وہ آپس میں لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے کے خلاف سازشیں بھی کرتے ہیں۔ بیماریاں انہیں بھی ستاتی ہیں اور لافانی ہونے کے باوجود ملکۂ ظلمات کا دست دراز کبھی کبھی انہیں

موت کا مزہ بھی چکھا دیتا ہے۔

مگر بعض علمائے عمرانیات (ہربرٹ اسپنسر اور گرانٹ ایلن وغیرہ) اس نظریے کو نہیں مانتے اور دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ مظاہر قدرت کو دیوی دیوتاؤں کا رُوپ دینے کیلئے جو ذہنی شعور درکار ہوتا ہے ابتدائی انسان اس سے محروم تھا۔ وہ صرف اپنے اسلاف کا شعور رکھتا تھا اور انہی کے حقیقی یا فرضی کارناموں سے واقف تھا اور انکو یاد کرتا رہتا تھا۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ان اسلاف کی اصلی شخصیتیں روایتوں کے انبار تلے دبتی چلی گئیں۔ رفتہ رفتہ حقیقت پر خرافات کی اتنی تہیں جم گئیں کہ لوگ اسلاف کی اصل شخصیتوں کو بھول گئے البتہ ان سے منسوب کارناموں کی وجہ سے افسانوی شخصیتیں گھڑنے لگے اور آخر کار انہیں ہی دیوتا سمجھ کر انکی پرستش کرنے لگے۔ اگر کسی شخص کے کارنامے قبیلے کی حد تک محدود رہے تو وہ قبیلے کا دیوتا کہلایا۔ اگر کسی شخص کو قومی سورما کا رتبہ نصیب ہوا تو وہ بتدریج پوری قوم کا دیوتا قرار پا گیا۔

ان عالموں نے قدیم مصر' یونان' چین' رومۃ الکبریٰ اور ہندوستان کی تاریخوں سے اسلاف پرستی کی بکثرت شہادتیں پیش کی ہیں اور بتایا ہے کہ کس طرح بعض نامور بادشاہوں اور ہیروؤں کو اُنکے مرنے کے بعد دیوتا کا مرتبہ حاصل ہوا۔ مثلاً رگ وید کا سب سے بڑا دیوتا اندر اصل میں آریائی قبیلوں کا ہیرو تھا جنہوں نے وادیٔ سندھ کی تہذیب کو تاراج کیا۔ اسی طرح رام چندر جی اور کرشن مہاراج وادیٔ گنگ وجمن کے قدیم ہیرو اور قوم کے راہنما تھے جن کو بعد ازاں دیوتا کا رتبہ مل گیا۔ ہربرٹ اسپنسر تو اپنے دعوے میں یہاں تک مبالغہ کرتا ہے کہ تمام دیوی دیوتا خواہ وہ مصر کے ہوں یا چین کے' یونان' عراق' ہندوستان یا میکسیکو کے' ابتداء میں دراصل نامور اسلاف ہی تھے۔

محققین ودانائے آثار وعمرانیات نے دیوتاؤں کے ضمن میں خدائے واحد کے تصور سے بھی بحث کی ہے۔ وہ علمائے مذاہب کے اس دعوے کو تسلیم نہیں کرتے کہ ابتدائی انسان ایک خدا کو مانتا تھا اور صرف اسی کی عبادت کرتا تھا۔ یا یہ کہ شرک کی بدعتیں وحدانیت کے بعد نمودار ہوئیں اور (وحدانیت کی تبلیغ کرنے والے) پیغمبران نے آکر وحدانیت کو شرک وبت پرستی سے پاک کیا۔ وہ مانتے ہیں کہ شرک اور بت پرستی کا قلع قمع خدائے واحد پر ایمان لانے والے مذاہب نے ضرور کیا' لیکن اس بات کی کوئی

شہادت نہیں ملتی کہ ابتدائی انسان (حضرات انبیاؑ اور انکے چند پیروکاروں کے علاوہ) موحد تھا۔ انکی تحقیق کے مطابق دجلہ وفرات یا نیل کی وادی میں بسنے والی پرانی قومیں خدائے واحد کے تصور سے کبھی آشنا رہی تھیں، اسکا بھی کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔

انسان اور دیوتا

بہر حال اسلاف کی عظمتوں کے افسانوں نے دیوتا کا روپ اختیار کیا ہو یا مظاہرِ قدرت کی فعالی اور صاحب ارادہ شخصیتوں کا تصور دیوتاؤں کے پیکر میں ڈھل گیا ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ دیوی دیوتاؤں کی تخلیق ذہنِ انسانی ہی کی مرہون منت ہے۔ تخلیق کا یہ عمل کئی مدارج سے گزرا اور یہ وہی مدارج ہیں جہاں پہنچ کر انسان کی سماجی زندگی میں اہم تغیرات رُونما ہوئے۔ سر جیمس فریزر نے ان مدارج کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پہلا دَور وہ ہے جس میں سحر کو فروغ ہوا۔ اس دَور کا سب سے بڑا مسئلہ خوراک تھا۔ چنانچہ انسان خوراک کی فراہمی کیلئے اپنی جسمانی طاقت کے علاوہ اعمالِ سحر سے بھی کام لیتا تھا اور پورا قبیلہ اس میں برابر شریک ہوتا تھا۔ لیکن معاشرے میں جب تقسیم کار نے رواج پایا تو جادو منتر کے فرائض قبیلے کے سب سے تجربہ کار اور ذی فہم فرد کے سپرد کر دیئے گئے اور اسکے نان ونفقہ کی ذمہ داری قبیلہ والوں پر آ گئی۔ وہ فراہمی خوراک کی ذمہ داریوں سے آزاد ہو گیا اور اسکی ساری قوت وسارا وقت ساحرانہ عمل کو مؤثر تر بنانے پر صرف ہونے لگا۔

یہی شخص قبیلے کا طبیب بھی ہوتا تھا۔ وہ علاج معالجہ کیلئے متعدد جمادات ونباتات تلاش کرتا اور انکی تاثیرات معلوم کرتا تھا۔ موسموں کے تغیرات کا انسان سمیت حیوانات ونباتات پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے اسکا مطالعہ کرنا بھی اس جادوگر کی ذمہ داری تھی۔ قبیلہ والوں کو پورا یقین ہوتا تھا کہ ہماری شکاری مہمات اس شخص کی ساحرانہ طاقتوں کی بدولت کامیاب ہوتی ہیں۔ وہ جب چاہتا ہے آسمان سے پانی برس پڑتا ہے اور جب چاہتا ہے ہوا چلنے یا رکنے لگتی ہے۔ کسی جادوگر کے لئے ایسا تأثر دے دینا کچھ دشوار بھی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے جادو منتروں سے شکار میں زخمی ہونے والوں کو اچھا کر دیتا اور ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو بھی جوڑ دیتا ہے۔ وہی مویشیوں کی نسل بڑھا دیتا اور اناج کی زائد فصلیں اُگاتا ہے۔ چنانچہ جس شخص

میں اتنے اوصاف ہوں ظاہر ہے وہ قبیلے کا سب سے صاحب اثر اور بااختیار شخص کیونکر نہ ہوگا۔

رفتہ رفتہ جب انفرادی ملکیت نے قوت پکڑی تو ان ساحروں کی دولت اور طاقت میں مزید اضافہ ہوتا گیا وہ شاہی اختیارات ہتھیانے میں بھی کامیاب ہوگئے اور بادشاہوں کیلئے خدائی کا دعویٰ کرنا چنداں مشکل نہیں ہوتا۔ چنانچہ سر جیمس فریزر اُس دَور کی قوموں سے مثالیں پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ جنوب مشرقی افریقہ کی زِمبا قوم فقط اپنے راجہ کو دیوتا مانتی اور اسی کی پوجا کرتی تھی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ گرمی اور سردی کے موسم بھی اسی کی مرضی سے تبدیل ہوتے ہیں۔ اسی طرح وسطی افریقہ کی باگاندہ قوم کا ایمان تھا کہ انکا ساحر دیوتا نیانزا جھیل کے کنارے پہاڑوں میں رہتا ہے۔ اس دیوتا سے بادشاہ اور رعایا دونوں خوف کھاتے تھے۔ وہ چاہے تو بارش ہو اور نہ چاہے تو پانی کا ایک قطرہ بھی نصیب نہ ہو۔ اُروار قوم کا سردار بھی خود کو خدا سمجھتا تھا وہ کئی کئی دن کچھ نہ کھاتا تھا اور ڈینگ مارتا تھا کہ ''میں خدا ہوں اور خدا کو کھانے کی کیا حاجت؟ البتہ تفریحاً کبھی کبھار کچھ کھالیتا ہوں''۔ اڈا قوم کے سردار نے انگریز افسروں سے (جنہوں نے نائجیر یا پر حملہ کیا تھا) کہا ''خدا نے مجھے اپنا ہم شکل بنایا ہے اور خدائی بھی عطا کر رکھی ہے''۔

سیام کا بادشاہ بھی دیوتا کی مانند پوجا جاتا تھا۔ اسکی رعایا کو بادشاہ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ جب وہ راستوں سے گزرتا تو رعایا سربسجود ہو جاتی تھی۔ دور کیوں جائیں ابھی کل کی بات ہے کہ جاپان کے موجودہ بادشاہ ہیرو ہیٹو کو جاپانی قوم سورج کا بیٹا اور دیوتا سمجھتی تھی۔ گویا ماضی کے اثرات کا عالم ہنوز موجود ہے۔ یہاں تک کہ مسلمان قوم جو تمام مذاہب سے زیادہ وحدانیت کی تلقین کرنیوالی ہے اور ملوکیت کی بجائے جمہوریت کی علم بردار ہے۔ گزشتہ کئی صدیوں سے ہر بادشاہ کو ببانگ دُہل ظل اللہ اور ظل سبحانی کہہ کر پکارتی رہی ہے اگرچہ یہ القاب بطورِ اعزاز ہی ہوں۔

یہ تو وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ وادیٔ دجلہ وفرات کے اِن لیل، ایا، انو اور دوسرے دیوتا اصل میں (ساحر تھے یا بادشاہ) یا پھر ساحر بادشاہ تھے) جن کو لوگوں نے دیوتاؤں کا مرتبہ عطا کر دیا۔ البتہ یہ واقعہ ہے کہ دیوتاؤں کی آڑ میں انکے پروہتوں نے اپنے عقیدت مندوں کے ذہنوں اور دلوں پر کئی ہزار برس حکومت کی۔ یہ پروہت دراصل پرانے زمانہ کے ساحر ہی تھے جنہوں نے شخصی دَور میں ہر بڑے شہر میں

اپنے اپنے مرکز قائم کر لئے تھے اور پھر وہی ان شہروں کے اوّلین سیاسی سربراہ بھی ہو گئے اور بعد ازاں یہی مراکز مذہبی معبدوں میں تبدیل ہو گئے۔

عراقی دیومالا کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ دیوتاؤں کی آسمانی ریاست میں بھی سب کے مرتبے برابر نہیں تھے۔ جس طرح جمہوری ریاستوں میں بھی سب لوگ برابر نہیں ہوتے اور کوئی دولت مند تو کوئی محتاج، کوئی قوی تو کوئی کمزور، اسی طرح دیوتاؤں کے مراتب بھی انسان نے بالحاظ طاقت واثر متعین کر رکھے تھے۔ جو دیوتا جتنا طاقتور تھا انکی مجلس شوریٰ میں اُتنا ہی بااثر اور مقتدر تھا۔ ان میں سے چند ممتاز دیوتاؤں کے نام درج ذیل ہیں۔

۱۔ اَنو۔ سورج دیوتا۔ لفظی معنی ہیں آسمان کی وسعت جو زمین، سورج چاند وغیرہ کو محیط ہے۔

۲۔ اِن لیل (ایاہ)۔ جو طوفان اور ہواؤں کا دیوتا ہے اور اَنو کا بیٹا ہے۔

۳۔ اِنکی۔ زمین اور میٹھے پانی کا دیوتا۔

۴۔ نن ورتا، جنگ کا دیوتا۔

۵۔ نن ہورسک، مادرِ ارض۔

۶۔ اِنانا (عشتار) محبت اور افزائش نسل کی دیوی۔

۷۔ اِرش کی گل۔ ملکہ ظلمات، موت کی دیوی جو اِن لیل کی بہن ہے۔

۸۔ ننا (سین) چاند دیوتا۔

تخلیق کائنات کی داستانیں ہر پرانی قوم میں رائج تھیں۔ ان داستانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے دانشوروں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ قدیم انسان مظاہر قدرت کو حیرت واستعجاب سے دیکھتا تھا اور سوچتا تھا کہ انکی اصل حقیقت کیا ہے اور انہیں کس نے بنایا (پیدا) کیا ہے؟

اس سوال کے جواب میں ہر قوم نے تخلیق کائنات کے متعلق اپنی ایک داستان گھڑ لی۔ لیکن دانشوروں کی اس قیاس آرائی کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ اوّلاً تو قدیم انسان کا شعور اتنا ترقی یافتہ ہی نہ تھا کہ وہ تکوین کائنات کے باریک نقاط پر غور کرتا یا یہ سوچ سکتا کہ سورج چاند اور آسمان وزمین

کب اور کیسے وجود میں آئے۔

دوئم تاریخ شاہد ہے کہ یہ داستانیں انسان کے ذوقِ جستجو کی تسکین کیلئے وضع نہیں کی گئیں تھیں بلکہ یہ ان افزائشی رسموں کا جز وتھیں جو نوروز اور اس جیسے دیگر تہواروں کے موقعوں پر ناٹک' رہس' یا لیلا کے طور پر کھیلی اور بھجن وزمزموں کے انداز میں گائی جاتی تھیں۔ سوئم ان داستانوں میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں ان کو پڑھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان کا مظاہر قدرت کے مطالعہ سے دور کا بھی کوئی واسطہ ہے۔ چنانچہ برطانیہ کا مشہور فلسفی ''پروفیسر کارن فورڈ'' بابل اور یونان کی داستان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔

> ''تخلیق کی داستان مظاہر قدرت کے مطالعے کا نتیجہ نہیں' تاروں بھرے آسمان اور دُور دُور تک پھیلی ہوئی زمین کا مشاہدہ کرنے کے بعد کوئی دیوانہ (وہ بھی حشیش پی کر) ہی یہ نظریہ پیش کرسکتا ہے کہ زمین اور آسمان کو اژدہے کے پیٹ یا پیٹھ سے بنایا گیا ہے۔
>
> فرض کرو کہیں کوئی ایسی ڈرامائی رسم ادا کی جارہی ہو جس میں شر اور تخریب کی قوتوں کی نمائندگی ایک پروہت ادا کار اژدہے کا چہرہ لگا کر کرے اور خیر وتخلیق کی نمائندگی بادشاہ کررہا ہو جسکا مقصد قدرت اور سماج کا احیا ہو۔ ایسی صورت میں کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی بھجن یا ایسا گیت لکھا جائے جس میں دیوتاؤں کے بادشاہ اور اژدہے میں جنگ کا بیان ہو''۔

جزیرۃ العرب کے مأخذ

تاریخ اسلام کے ایک مرتّب ڈاکٹر حمید الدین کے مطابق ایشیا کے جنوب مغرب میں عرب نامی ایک بہت بڑا جزیرہ نما ہے۔ جس کے مشرق میں خلیج فارس اور بحیرۂ عمان' مغرب میں بحیرۂ قلزم' جنوب میں بحیرۂ ہند اور شمال میں ملک شام واقع ہے۔ چونکہ یہ ملک تین اطراف سے سمندر میں گھرا ہوا ہے، اسلئے اہل عرب اسے جزیرۃ العرب کے نام سے پکارتے ہیں۔ اسکا رقبہ تقریباً بارہ لاکھ مربع میل

ہے جو مختلف صوبوں اور حصوں میں منقسم ہے۔شمال میں پہاڑی علاقے کے نیچے حجاز کا مشہور صوبہ ہے جس میں دنیائے اسلام کے مقدس ترین شہر مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ واقع ہیں۔جنوب مغرب میں یمن کا صوبہ ہے۔حجاز اور یمن کے نشیبی علاقہ کو تہامہ کہتے ہیں۔یمن کے مشرقی جانب صوبہ ''حضرموت'' ہے اور اسکے ساتھ ملا ہوا صوبہ عمان ہے۔حجاز کی مشرقی حدود سے خلیج فارس تک نجد کا صحرا پھیلا ہوا ہے۔ہر صوبے کی خصوصیات ایک دوسرے سے الگ ہیں۔

عرب نام کی وجہ تسمیہ کے بارے دو آراء ہیں۔ایک رائے کے مطابق عرب کے معنی فصاحت وزبان آوری کے ہیں' چونکہ عربی لوگ فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے دیگر اقوام کو اپنا ہم پایہ اور ہم پلہ نہیں سمجھتے تھے اسلئے وہ خود کو عرب یعنی فصیح البیان اور باقی دنیا کو عجم یعنی گونگا کہتے۔دوسری رائے کے مطابق یہ نام عربہ سے ماخذ ہے جس کے معنی ریگستان وصحرا کے ہیں۔چونکہ اس ملک کا بیشتر حصہ دشت و صحرا پر مشتمل ہے اسلئے سارے ملک کو عرب کہا جانے لگا۔

عربستان کے خطہ وُسطی نجد (سرزمین بلند) کو ایک سرسبز اور شاداب جزیرہ کہنا چاہئے جس کے اردگرد پانی' پہاڑ اور ریگستان ہیں۔ڈاکٹر گستاؤلی کے مطابق جب سے انسانی تاریخ شروع ہوئی' عربستان ہمیشہ خشک' گرم اور کم زرخیز مشہور رہے' جو جنگلوں کے نیست ونابود ہو جانے کے باعث ہے۔بارش بھی یہاں شاذونادر ہی ہوتی ہے اسلئے یہاں کوئی دریا نہیں۔البتہ ندی نالے بکثرت ہیں وہ بھی برسات کے دنوں ہی میں بہتے ہیں۔

ملک عرب کی آبادی دو حصوں میں منقسم ہے ایک حضروی اور دوسرے بدوی۔حضروی وہ لوگ ہیں جو شہروں' قصبات اور دیہات میں زندگی بسر کرتے اور جنکی آبادیاں بالعموم نخلستانوں کے قریب واقع ہیں کیونکہ یہاں زراعت کیلئے تھوڑا بہت پانی مل سکتا ہے۔حضرویوں کی گزراوقات زیادہ تر کھیتی باڑی' تجارت اور دستکاری پر ہے۔جبکہ بدوی اُن خانہ بدوش قبائیلوں کو کہتے ہیں جو صحراؤں اور ریگستانوں میں رہتے ہیں۔اونٹ' گھوڑے اور بھیڑ بکریاں وغیرہ پال کر اپنا گزارہ کرتے اور اپنے رہنے کیلئے مستقل مکانات کی بجائے خیموں میں رہتے اور اپنی رہائش گاہیں تبدیل کرتے رہتے ہیں۔حضرویوں کے مقابلے میں بدوی زیادہ جفاکش' جنگجو اور آزادی پسند ہوتے ہیں۔

۵۷۰ء یعنی ظہور قدسی کے وقت تک عرب میں کوئی مرکزی حکومت قائم نہ تھی۔ سارا ملک مختلف حصوں میں بٹا ہوا تھا جن پر مختلف قبائلی سردار اور کئی خود مختار بادشاہ حکمران تھے۔ تاجداروں میں یمن، حیرہ (عراق) اور سرحدِ شام کے فرمانروا بہت مشہور تھے۔ قبیلوں کے سردار یا امیر اکثر کسی بادشاہ کے تابع ہوتے تھے لیکن اپنی اندرونی آزادی اور جذبہ حریت کو ہر حالت میں برقرار رکھتے اور یہی انکی اجتماعی زندگی کی روح تھی۔ ہر قبیلہ کا سردار اہل قبیلہ سے ہوتا۔ جمہوری اصول کے مطابق اس منصب کا اہل وہی شخص ہوسکتا تھا جسکے حامی سب سے زیادہ ہوں اور وہ اہل عرب کی فطری خصوصیات (یعنی شجاعت، علم، مہمان نوازی اور فیاضی وغیرہ) میں ممتاز ہو۔ بعض قوی قبیلے کمزور قبیلوں کو زیر کر کے ان سے خراج وصول کرتے تھے۔

صوبہ حجاز اور اسکی امارت کو خاص اہمیت حاصل تھی، کیونکہ اس میں مکہ کا تاریخی مقدس شہر آباد ہے۔ اسی شہر میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے کعبۃ اللہ کی بنیاد رکھی، جو عرب کا دینی مرکز تھا اور لوگ دور دراز علاقوں سے وہاں حج کرنے آتے تھے۔ کعبہ کے پہلے پاسبان بھی حضرت ابراہیمؑ اور انکے فرزند ارجمند حضرت اسماعیلؑ تھے۔ بعد ازاں یہ تولیت انکی اولاد میں منتقل ہوتی رہی اور خاندانِ قریش میں آئی جو آلِ اسماعیلؑ ہی کی ایک شاخ تھی۔ اس خاندان کی ایک بہت ممتاز اور مشہور شخصیت قصیٰ بن کلاب نے بہت سے قبائل کو متحد کر کے اپنی طاقت بڑھائی اور خانہ کعبہ کی تولیت سمیت مکہ کی پوری ریاست پر اپنا تسلط جمالیا۔ اسی قبیلے میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔

اہل عرب دو بڑی نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں (۱۔ قحطان یا قطورا) (۲۔ عدنان) قحطان یا قطورا دراصل یمن کے رہنے والے تھے اور انکی ایک شاخ (بنی خزاعہ) مکہ کے گردونواح میں آکر مستقل آباد ہوگئی تھی۔ یہ اپنے ایک بادشاہ (حمیر) کی نسبت سے حمیری بھی کہلواتے تھے۔ حمیریوں کی دوسری شاخ مدینہ چلی گئی جو ''اوس'' اور ''خزرج'' نامی دو مشہور قبیلوں میں بٹ گئی۔ انکی ایک تیسری شاخ عراق اور شام کے علاقوں میں جا پہنچی اور انکے بھی دو حصے ہوگئے جو بنی عدنان اور بنی کلب کہلائے۔ عدنان، حضرت اسماعیلؑ کی نسل میں سے تھے۔

یہ لوگ بھی اپنے ایک ممتاز سردار ''حضر'' کے نام پر حضری کہلانے لگے۔ انکی مختلف شاخیں

(بنی قیس، بنی بکر، بنی تغلب، بنی تمیم اور بنی قریش) سارے صوبہ حجاز میں پھیلی ہوئی تھیں۔ البتہ خانہ کعبہ کے متولی ہونے کے باعث قبیلہ قریش کو سب سے افضل سمجھا جاتا تھا۔ حمیریوں اور حضریوں کے مابین ابتدا ہی سے عداوت چلی آرہی تھی۔ اس کا سبب حمیریوں کی تمدنی برتری تھی جسکی بدولت انہوں نے حضریوں کے متعدد قبائل کو اپنا باجگزار بنا لیا تھا۔ اس غلامی سے نجات حاصل کرنے کیلئے کئی ایک خونریز لڑائیاں ہوئیں۔ جنگ وجدال کا یہ سلسلہ سال ہا سال تک جاری رہا، تا آنکہ اسلام نے اس عناد کو ختم کر کے اِن دیرینہ دشمنوں کو باہم شیر وشکر بنا دیا۔

تمدنِ عرب

سیاسی تقسیم کی طرح تہذیب وتمدن کے لحاظ سے بھی عرب مختلف حصوں میں منقسم تھے، آثارِ قدیمہ کی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ یمن کسی وقت معاشرتی لحاظ سے اوجِ کمال کو چھوتا ہوگا۔ ایران اور شام کے متصلہ علاقے بھی ترقی یافتہ تھے لیکن عرب کی اندرونی حالت نہایت ابتر تھی۔ کئی اشیاء مثلاً سکہ، چراغ، کوزہ، پاجامہ وغیرہ کیلئے انکی اپنی زبان میں الفاظ نہیں تھے۔ ایسی بہت سی چیزوں کے نام انہوں نے غیر زبانوں سے لیکر عربی لہجہ میں ڈھال لئے تھے، حالانکہ عربی زبان ادبی لحاظ سے خود کافی وسیع تھی۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ اہل عرب کی معاشرت میں ایسی چیزیں مفقود تھیں۔ وہ صنعت وحرفت سے بھی نا واقف تھے۔ علم نجوم میں البتہ کافی مہارت حاصل تھی اور طب کے بارے بھی تھوڑا بہت جانتے تھے، لیکن انسانوں کی نسبت اونٹوں کا علاج زیادہ اچھا کر لیتے تھے۔

عرب معاشرہ میں مردوں کو عورتوں پر فوقیت حاصل تھی لیکن اسکا مطلب یہ نہیں کہ سوسائٹی میں عورتوں کی قدر ومنزلت بالکل نہیں تھی۔ بیٹیوں کو زندہ دفن کر دینے کی قبیح رسم بھی سارے عرب میں رائج نہیں تھی۔ صرف بنو تمیم کے چند خاندان اسکے مرتکب تھے۔ بعض مؤرخین کی روایات کے مطابق ایسا گھناؤنا فعل بھی وہ شرم کے باعث کم اور مفلسی وناداری کے ہاتھوں مجبور ہو کر کر لیتے تھے۔

اگر چہ خانہ کعبہ عرب کا دینی مرکز تھا لیکن اہل عرب حضرت ابراہیمؑ کے پیغامِ توحید کو بھول چکے تھے۔ شرک وبت پرستی اتنی بڑھ چکی تھی کہ خانہ کعبہ بتوں سے بھرا پڑا تھا۔ کئی لوگ بتوں کو خدا نہیں بلکہ خدا تک پہنچنے کا ذریعہ گمان کرتے تھے۔ بعض لوگ چاند سورج اور دیگر اجرامِ فلکی کی پوجا کرتے تھے۔

حقائق مسخ ہو چکے ہونے کا عالم یہ تھا کہ نہ صرف اہل عرب بلکہ کرّۂ ارض کے بیشتر اور متعدد جغرافیائی مقامات پر لوگ خدا کے بارے عجیب عجیب تصورات کے حامل تھے۔ کوئی لاتعداد خداؤں کو مانتا' کسی کے نزدیک عیسائیوں کی طرح تین خدا خدائی کے اہل تھے' کوئی بلحاظِ مراتب خداؤں کے چھوٹے اور بڑے ہونیکا قائل تو کوئی سرے سے خدا نامی کسی حقیقت ہی سے انکاری تھا۔

خدا کے بارے مختلف مغالطہ آفرینیوں سے قطع نظر خدا کے وجود ہی کا انکار کرنے والا بے شعور کسی ایسی ہستی کا قائل ہی نہ تھا جو اس کارخانۂ جہان کو بنانے اور چلانے والی ہو اور اسکے نزدیک یہ کائنات محض اتفاقاً حادثاتی طور پر وجود میں آ کر نمودار ہوگئی اور ایسا ہی کوئی اتفاقی حادثہ اسے نابود کرنے کا باعث بھی ہوسکتا ہے۔ نیز اسکے نزدیک اس کائنات کو بنانے' حیرت انگیز طور پر برقرار رکھنے یا بے مثل نظم وترتیب کے ساتھ چلانے اور پھر نابود کر ڈالنے میں اللہ' اِیل یا خدا نامی کسی ہستی کا کوئی عمل دخل نہیں۔

کچھ لوگ خدا کے تو قائل تھے مگر قیامت' جنت ودوزخ اور نبوت وغیرہ کے منکر تھے۔ نہ صرف یہی بلکہ مختلف خداؤں کو ماننے والوں کے ہاں خداؤں کے بارے عجیب وغریب تصورات مروج تھے۔ لطف کی بات ہے کہ خداؤں کے معاشقوں کے قصے' خداؤں کا آپس میں قوت وری سے ایک دوسرے کو پچھاڑ کر ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنا' ایک خدا کا دوسرے خدا کو قتل کر کے اسکی خدائی چھین لینا' خداؤں کا ایک دوسرے کی عورتوں کو بھگا لیجانا یا اپنی قوتِ بازو سے زبردستی چھین لینا اور پھر ان سے انکی اولادوں کا پیدا ہونا وغیرہ جیسے بیہودہ نظریات ان لوگوں میں عام پائے جاتے تھے۔ طرّہ یہ کہ اپنے اپنے خداؤں کی بڑائی ثابت کرنے میں ایسی لغویات اور بہت سی اخلاق سوز باتیں فخریہ طور پر میلوں وغیرہ میں بیان کی جاتی تھیں۔ الغرض اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے بارے قسم قسم کی غلط فہمیاں تعلیم ابراہیمی کے باوجود نوعِ انسان کے مختلف حلقوں میں بکثرت پائی جاتی تھیں۔

ماضی کی اقوام کے عقائد اور انکی تہذیب وتمدن کے حالات کے ذکر سے قبل اہل عرب کے بارے جاری مضمون اختصاراً مکمل کرتا چلوں کہ عرب کے بدوی اور حضروی باشندوں کا معاشرہ قبائلی جمہوریت کے اصولوں پر سختی سے کاربند تھا۔ البتہ شہروں میں تجارت پیشہ لوگوں ہی کا اثر واقتدار قائم تھا۔

یثرب (مدینہ کا پرانا نام) اس اہم تجارتی راستے پر واقع ہے جو یمن سے شام کو جاتا ہے۔ حجاز میں مکہ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی کیونکہ یہ شہر وہاں کا سب سے بڑا تجارتی شہر تھا۔ مکہ میں ہر سال ایک بہت بڑا میلہ لگتا تھا جسے سوق العکاز کہتے تھے۔ مکہ کی بڑی خصوصیت وہاں پر کعبۃ اللہ کی موجودگی تھی جو عربوں کی سب سے مقدس عبادت گاہ تھی اور وہ ذی الحج کے مہینہ میں حج کی رسم منانے یہاں جمع ہوتے تھے۔

حرم کے پاسبان' زائرین سے حج کا محصول وصول کیا کرتے تھے اسی باعث کعبہ کی پاسبانی کیلئے مکہ والوں میں اکثر رسہ کشی ہوتی رہتی تھی۔ عبد مناف اور انکے بیٹے ہاشم کی دولت وثروت کا ایک سبب حرم کی پاسبانی کا عہدہ بھی تھا۔ جب عبدالمطلب بن ہاشم نے چاہِ زمزم کو (جو مدت سے ریت کے نیچے دبا پڑا تھا) کھود نکالا تو پانی کی موجودگی سے بنی ہاشم کا اثر اور بھی بڑھ گیا۔ (ابن اسحاق رسیرت الرسولؐ)

خدا کے تصور کے حوالہ سے قبل از اسلام باشندگانِ حجاز پانچ قسم کے گروہوں میں منقسم تھے۔

اوّل:۔ مشرکین جو اللہ تعالیٰ کو تو مانتے تھے مگر اسکے علاوہ دوسرے معبودوں کو بھی مانتے اور انکے بتوں کی پرستش کرتے تھے۔

دوم:۔ کفار جو اللہ تعالیٰ کی بجائے صرف اپنے قبائلی اور خاندانی دیوتاؤں ہی کی پرستش کرتے تھے۔

سوم:۔ یہودی' جو حجاز کے قدیم باشندے تو نہیں تھے' البتہ سلطنت روما نے جب فلسطین پر قبضہ کر لیا تو وہاں سے بھاگ کر یہ حجاز میں آباد ہو گئے تھے۔ یہ لوگ یمن سے شام کے تجارتی راستہ پر واقع چھوٹے چھوٹے نخلستانوں میں رہتے تھے۔ شام یہودیوں کا بہت بڑا مرکز تھا مگر وہاں پر عیسائیوں کا زور ہو جانے کی وجہ سے وہ نقل مکانی کر کے مدینہ' صنعا اور خیبر کے کچھ علاقوں میں بھی آباد ہو گئے تھے۔ ان کا پیشہ زراعت تھا' انہوں نے عربوں کی زبان اور انکی سی بود و باش اختیار کر لی تھی تاہم انکے ساتھ رہنے کے باوجود ان سے الگ تھلگ رہتے۔ وہ اپنی مقدس کتابیں بھی ہمراہ لائے تھے اور اپنے خدائے واحد یہواہ کی عبادت کرتے تھے۔ خود کے اہل کتاب ہونے پر بڑا فخر تھا اور اصنام پرست مقامیوں کو بہت حقیر سمجھتے تھے۔ یثرب پر یہودیوں کا قریباً قبضہ تھا اور بطورِ خاص انکے دو قبیلے اوس اور خزرج وہاں بڑے بااثر تھے۔

چہارم گروہ:۔ نصاریٰ کا تھا مگر یہاں انکی آبادی بہت کم تھی۔ عیسائی زیادہ تر نجران حیرہ' بنی طے اور بنی تغلب کے علاقوں میں ملتے تھے۔ یہ لوگ بھی مدت ہوئی تعلیماتِ عیسوی سے دور ہو کر شرکیہ عقائد کی

بھینٹ چڑھ چکے تھے اور خدائی تین حصوں میں منقسم ہونے کے قائل تھے۔ نیز رہبانیت کے قائل ہونے کے سبب انکے اکثر راہنما علائق دنیا سے لاتعلق دُور غاروں اور صحراؤں میں راہبانہ زندگی بسر کرتے تھے۔

پانچواں گروہ:۔ حضرت ابراہیمؑ کے دین حنیف پر قائم تھا مگر انکی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ لوگ فقط خدائے واحد (اللہ تعالیٰ) کی عبادت کرتے اور مستعمل رواج کے برخلاف دوسرے خداؤں یا بتوں کو نہیں مانتے تھے۔ بنو تمیم کا سارا قبیلہ مجوسی تھا' اس میں صرف زید بن عمرو ایک فردِ واحد تھے جو دین ابراہیمی کے پیروکار تھے۔ حجاز میں حضرت خدیجۃؓ الکبریٰ کے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموں زاد بھائی امیّہ ابن ابی السّلط البتہ اسی گروہِ حنیف میں سے تھے۔ (حتی تاریخ عرب ص ۱۰۸)

سرزمین عرب میں گو ہر قسم کے دین و مذاہب موجود تھے اور یہودیت و نصرانیت جیسے مذاہب بھی اس میں شامل تھے مگر انکی اصل صورت کچھ اس طرح مسخ ہو چکی تھی کہ کفر و شرک اور دینِ حق میں امتیاز کرنا مشکل ہو چکا تھا۔ ''توحید'' جو کہ ہر مذہبِ حقہ کا بنیادی اصول ہے اسکا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ عیسائیت تثلیث کے جھگڑوں میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ یہودیت بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بتائے راستہ سے بھٹک کر اوہام پرستی کا شکار ہو چکی تھی اور حضرت عزیرؑ کی ابنیت خدائے واحد سے منسوب کر چکی تھی۔ ایرانی زرتشت' یزداں اور اہرمن کی جداگانہ قوت وری کے قائل تھے۔ اُدھر ہندوستان پہلے ہی بت پرستی اور کفر کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ گویا بلحاظِ اخلاقی پستی کوئی بھی ایک دوسرے سے کم نہ تھا۔

حجاز میں غالب اکثریت مشرکین کی تھی جو بکثرت دیوی دیوتاؤں کی پوجا تو کیا کرتے تاہم انکا سب سے بڑا معبود اللہ تھا۔ صفا' یمن' الاُولی اور ام الجمال کے آثارِ قدیمہ سے کچھ پتھر ایسے بھی برآمد ہوئے جن پر اللہ کا نام کندہ ہے۔ ان میں سے کچھ پتھر ولادتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے پانچ سو سال قبل کے ہیں اور بعض پتھر پانچویں صدی ق م کے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عرب میں اللہ کی عبادت کا رواج موجود تھا اور یہ نام بہت مدت سے متعارف تھا۔

لفظ ''اللہ'' کے مخرج و معنی کے بارے مفسرین مختلف توضیحات پیش کرتے ہیں۔ جیسے بیضاوی کے مطابق اللہ دراصل اَل اِلٰہ ہی کا اختصار ہے۔ جو ابتداء میں اسم نکرہ کے طور پر مستعمل تھا لیکن بعد میں اسم معرفہ بن گیا۔ قرآن نے بھی مشرکین کے باطل معبودوں بتوں اور عام خداؤں کے معنوں میں اِلٰہ کی

اصطلاح استعمال کی ہے اور اسے اسم معرفہ بناتے وقت ''واحد'' کا اضافہ کر دیا ہے۔ جیسا کہ فرمان ہے۔

اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى ؕ قُلْ لَّاۤ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (انعام: ۱۹)

ترجمہ ''کیا تم (سچ مچ) گواہی دیتے ہو کہ اللہ کیساتھ اور بھی خدا ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیجئے کہ میں تو (ایسی لغو) گواہی نہیں دیتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم (حق بات) فرما دیں کہ خدا تو صرف وہ ایک ہی ہے اور میں بلاشبہ (تمہارے من گھڑت بتوں سے) بیزار ہوں جنہیں تم شریک (خدا) ٹھہراتے ہو''۔ (انعام: ۱۹)

اِلٰہ تمام سامی قوموں میں خدا کا نام تھا۔ عکادی اور کنعانی زبانوں میں اسے اِیل کہتے تھے' کنعانی نوشتوں میں اِیل کو بارہا ''کل مخلوقات کا خالق'' کہا گیا ہے۔ یہودی مذہب میں اسے یہواہ اور اِلوہم کہا گیا۔ عربوں نے اسے (قبل از اسلام بھی) اِلٰہ اور اللہ کہہ کر پکارا۔ قرآن میں اہل مکہ کی اللہ پرستی کے اشارے جا بجا ملتے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ یونس میں ہے۔

هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُكُمْ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ ۚ وَجَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّ فَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّ جَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِمْ ۙ۬ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ۬ لَىِٕنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ (یونس: ۲۲)

ترجمہ: ''وہی ہے جو تمہیں سیر کرواتا ہے خشک زمین اور سمندر میں یہاں تک کہ جب تم سوار ہوتے ہو کشتیوں میں اور وہ موافق ہوا میں مسافروں کو لیکر چلتی ہیں تو تم اس سے مسرور ہوتے ہو۔ پھر اچانک جب انہیں تند و تیز ہوا کے سبب موجیں ہر طرف سے گھیرے میں لے لیتی ہیں اور انکو احساس ہو جاتا ہے کہ وہ گھیرے میں آ چکے ہیں تو اس (خاص) وقت خالصتاً اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرتے ہوئے اس سے استدعا کرتے ہیں کہ اے اللہ اگر تو ہمیں اس طوفان سے بچا لے تو ہم تیرے شکر گزار (بندوں میں سے) ہو جائیں گے''۔ (یونس: ۲۲)

اس سے اگلی آیت میں ایسے لوگوں کو بچا لینے کے بعد انکی سرکشی کا ذکر کرتے ہوئے فرمان ہوا۔

فَلَمَّآ اَنۡجٰىهُمۡ اِذَا هُمۡ يَبۡغُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَقِّ ؕ (یونس:۲۳)

ترجمہ:''پھر جب وہ انہیں بچالیتا ہے تو وہ زمین میں ناحق سرکشی کرنے لگتے ہیں''۔یونس۲۳

اور جیسے سورۃ لقمان کی آیت نمبر۳۲ میں فرمان ہے۔

وَ اِذَا غَشِيَهُمۡ مَّوۡجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمۡ اِلَى الۡبَرِّ فَمِنۡهُمۡ مُّقۡتَصِدٌ ؕ وَ مَا يَجۡحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوۡرٍ(لقمان :۳۲)

ترجمہ:اور جب پہاڑوں جیسی موجیں انکو ڈھانپ لیتی ہیں تو اس وقت اللہ سے خالص عقیدہ کیساتھ استدعا کرتے ہیں اور جب وہ انہیں اس سے بچالیتا ہے تو ان میں سے چند ہی حق پر رہتے ہیں'اور ہماری آیتوں کا کوئی انکار نہیں کرتا مگر (ہر وہ) جو غدار اور ناشکرا ہے''۔(۳۲)

پھر سورۃ رعد کی آیت ۱۶ میں فرمان ہے۔

اَمۡ جَعَلُوۡا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوۡا كَخَلۡقِهٖ فَتَشَابَهَ الۡخَلۡقُ عَلَيۡهِمۡ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَىۡءٍ وَّ هُوَ الۡوَاحِدُ الۡقَهَّارُ (رعد:۱۶)

ترجمہ:''کیا انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسوں کو شریک بنا رکھا ہے جیسے انہوں نے کچھ تخلیق کیا ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا' کہ کچھ مشابہت پیدا ہوگئی ہو۔آپ فرمادیجئے کہ ہر چیز کا پیدا فرمانیوالا صرف اللہ ہے اور وہ ایک اکیلا سب پر غالب ہے''۔(رعد:۱۶)

اس سے صاف ثابت ہے کہ بدفطرت اور ناشکرے ہی خالق تعالیٰ کی خالقیت و ربوبیت کا انکار کرتے یا اسکے افعال میں کسی کو شریک کرتے ہیں۔عرب (بطورِ خاص اہل مکہ) جہاں وقت پڑنے پر عقیدۂ خالص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو پکارتے' وہیں وہ اللہ کی سخت قسمیں بھی کھاتے اور اسکو نذریں اور قربانیاں بھی پیش کرتے تھے۔جیسا کہ فرمان ہے۔

وَ اَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَيۡمَانِهِمۡ لَئِنۡ جَآءَتۡهُمۡ اٰيَةٌ لَّيُؤۡمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلۡ اِنَّمَا الۡاٰيٰتُ عِنۡدَ اللّٰهِ وَ مَا يُشۡعِرُكُمۡ ۙ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ (انعام:۱۰۹)

:اور بڑے پر جوش انداز میں اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر انکے پاس کوئی نشانی آگئی تو وہ ضرور ایمان لے آئیں گے۔آپ فرمادیں کہ نشانیاں تو صرف اللہ ہی کے پاس ہیں'اور آپ

(انکو) نہیں جانتے کہ انکے پاس نشانیاں آ بھی جائیں تو یہ ایمان نہیں لائیں گے (انعام:۱۰۹)

تاریخ ہند کے مأخذ

مسلمانوں کی آمد سے پہلے اس پورے ملک (ہندوستان) کا کوئی نام نہ تھا۔ ہر صوبے کا نام الگ الگ تھا اور ہر ریاست کا نام اسکی راجدھانی کے نام سے مشہور تھا۔ اہل فارس نے جب دریائے سندھ سے منسلک صوبہ پر قبضہ کیا (جسے عربی زبان میں مہران کہتے ہیں) تو اس صوبہ کا نام سندھو رکھا۔ جیسے فارس والوں نے اسے ہندھو کہہ کر پکارا۔ پرانی ایرانی زبان اور سنسکرت میں 'س' اور 'ہ' کو بدل دیا کرتے ہیں' سو سندھو کا نام یہاں کے باسیوں نے سندھو کی بجائے ہندھو کر دیا۔ اس صوبہ کی نسبت سے تمام ملک کا نام ہندھ پڑ گیا جو بعد ازاں صرف ''ہند'' رہ گیا اور وہاں کے باسی اس نام کی نسبت سے خود کو ہندو کہلوانے لگے۔

ہندوستان کی قدیم تاریخ کے مأخذات یا اصلی اسناد عموماً چار حصوں میں تقسیم کی جاتی ہیں۔ پہلا حصہ ان روایات سے متعلق ہے جو ہندوستان کے ادبیات میں جا بجا پائی جاتی ہیں۔ دوم' مورخین اور سیاحوں کی وہ کتابیں جن میں ہندوستان کے حالات کا ذکر ہے۔ سوم' آثارِ قدیمہ کی وہ شہادتیں جن میں کتبے' عمارات اور سکہ جات وغیرہ شامل ہیں۔ چوتھا حصہ' وہ کتب ہندوستان کی قدیمی اور تاریخی روایات کا سب سے اچھا مرتب ذخیرہ جو اٹھارہ پرانوں کے شاہی خاندانوں کی فہرست میں محفوظ ہے۔ ان پرانوں میں سے پانچ پرانوں مٹیا' برہمانڈ' وشنو' دایو اور بھاگوٹ میں ایسی فہرستیں پائی جاتی ہیں جن میں ''مٹیا'' سب سے زیادہ قدیم اور مستند ہے۔ سکندرِ اعظم کی فوج کشی اور اسکے افسروں کی خبروں کے شائع ہونے تک یورپ' ہندوستان سے بالکل بے خبر تھا۔ اسکے مرنے کے قریباً بیس برس بعد شام اور مصر کے بادشاہوں نے اپنے سفیر موریہ شہنشاہ کے دربار میں روانہ کئے تو انہوں نے ادھر کے حالات لکھے۔ یہ حالات رومی اور یونانی مورخین اور مصنفین کی کتب میں محفوظ ہیں جو تاریخ ہند پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔

تھینز کی تحریریں بھی بہت کارآمد ہیں' جن میں سکندر اعظم کے ہندوستان پر حملے کے واقعات بڑی تحقیق و تدقیق کے بعد جمع کئے گئے۔ جہاں تک ہندوستان کی چار سو سال قبل مسیح کی تاریخ کا تعلق

ہے یہ تحریریں تاریخی سند کا درجہ رکھتی ہیں۔ پروفیسر اپیسن کی کتاب سب سے زیادہ مشہور ہے جس میں سکندر اعظم کے حملے کے بعد کے تاریخی واقعات بالخصوص سکّوں کے حوالہ سے ہندوستان کی تاریخ کو اچھے طریقہ سے سمجھنے میں مدد ملتی ہے' باختر' ہندی' یونانی اور ہندی پارتھیا کی سلطنتوں کیلئے یہی مأخذ مصدقہ قرار دیئے جاتے ہیں۔

برصغیر ہند کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی بنی نوع انسان کی۔ راسخ الاعتقاد ہندوؤں کے خیال میں ہندوستان کی سیاسی تاریخ تین ہزار سال قبل مسیح سے بھی پہلے اس وقت شروع ہوئی جب دریائے جمنا کے کنارے کوروؤں اور پانڈوؤں کے درمیان مہابھارت کی معروف جنگ ہوئی۔

کلجگ کا زمانہ ۳۱۰۲ ق م سے شروع ہوتا ہے اور یدھشٹر کے سن اور مہابھارت جنگ کا زمانہ ایک ہی سمجھا جاتا ہے۔ بعض ہئیت دان اس واقعہ کو جنگ کے چھ سو سال بعد کا واقعہ قرار دیتے ہیں۔ ونسنٹ اے سمتھ کے بقول اگر ہندوستان کی تاریخ اس حد بندی کے لحاظ سے کہ اسکے قدیم ترین زمانے کو لیا جائے تو یہ ساتویں صدی ق م کے نصف سے شروع ہوتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب بحری تجارت کو فروغ ہوا اور غالباً اسی زمانہ میں سنسکرت رسم الخط عام ہوا۔

مولوی محمد جمیل الرحمٰن نے قدیم تاریخ ہند میں لکھا ہے:۔

> ''اس زمانے میں ملک کے بہت بڑے بڑے حصے گنجان جنگل تھے' جن میں یا تو وحشی جانور رہتے تھے یا کہیں کہیں جنگلی آدمیوں کی بستیاں دکھائی دیتی تھیں۔ شمالی ہند کے وسیع قطعات میں بے شمار ایسی قومیں بھی آباد تھیں جو صدیوں سے وہاں رہتی تھیں اور کم وبیش شائستہ تھیں جو زمانہ قبل تاریخ میں شمال مغربی سرحد کے پہاڑوں کو عبور کر کے ہندوستان میں داخل ہوئی تھیں۔ البتہ دراوڑ قومیں جو غالباً ان قوموں کے مثل ہی متمدن تھیں' کہاں سے کب اور کیسے بتدریج تمام دکن اور جنوبی ہند میں پھیل گئیں' یہ تمام باتیں تاریخ کے دبیز پردوں میں مستور ہیں۔ البتہ آریہ زبان بولنے والی ایک مضبوط قوم کی تاریخ مورخین کے آئینہ علم میں ہے جو کوہ ہندوکش اور پامیر کی سطح مرتفع کے راستے ہندوستان میں داخل ہوئی اور اس نے پنجاب اور دریائے گنگا کے بالائی میدانوں کو ایک قوی دماغ نسل سے معمور کیا''۔

ہندوستانی زبانوں کا سب سے بڑا ماہر ''گریسن'' کہتا ہے کہ رِگ وید کے ابتدائی منتر اس وقت لکھے گئے جب آریہ باہر سے آکر اس ملک میں آباد ہوئے۔ ڈاکٹر چیٹر جی اور پروفیسر شریدر بھی آریہ قوم کا قدیم وطن جنوبی روس اور دریائے گنگا کی وادی قرار دیتے ہیں۔ ان ہندو مصنفین کا بیان ہے کہ ہندوؤں کی چاروں ذاتیں برہما جی کے جسم سے پیدا ہوئیں۔ آریہ دراصل ہندوستان کے باشندے نہیں ہیں' بلکہ کسی زمانے میں پچھم کی طرف سے آکر انہوں نے آہستہ آہستہ پورے ملک کو فتح کر کے اس پر قبضہ کر لیا اور ان لوگوں کو جو پہلے سے یہاں رہتے تھے اپنا فرمانبردار بنا کر ان کا نام شودر (خدمتگار) رکھ لیا۔ کچھ مورخوں کے مطابق یہ قدیم ہندوستان ہی کے باسی تھے' کچھ کے مطابق قدیم جنگلی قبائل کے رہنے والے یہی لوگ تھے اور زنار پہنتے تھے حالانکہ یہ بات غیر درست ہے۔

طبقاتی منافقت ہر قوم میں پائی جاتی ہے لیکن ہندوؤں میں کچھ زیادہ ہی رہی ہے۔ خود کو دوسروں سے برتر و افضل سمجھنا انسانی فطرت میں داخل ہے' انسانی فطرت اور ماحول کی ایسی خامیوں اور خرابیوں کو دور کرنے کیلئے ہی انبیاؤ پیغمبران مبعوث ہوتے رہے۔ ان انبیاء نے ایسی تعلیم پیش کی جس سے انسانوں میں اخوت و مساوات کا جذبہ پیدا ہو۔ نفرت کی جگہ محبت' تکبر کی جگہ عاجزی اور چھینا جھپٹی کی جگہ ایثار و خیرات لے لے۔ اخلاقیات کا درس دینے کے علاوہ توحید الٰہی اور خالق کائنات کا تعارف تو انکی بنیادی باتوں میں سے تھا ہی۔

طوفانِ نوحؑ کے وقت انکے فرزندان میں سے ''کنعان'' نامی لڑکے نے اسلام قبول نہ کیا تھا' وہ طوفان نوح میں ہلاک ہو گیا۔ باقی تین فرزندان' جو کرّہ ارض کے مختلف حصوں میں پھیل گئے ان میں سے ''حام'' افریقہ کا جدامجد ہوا۔ ''یافث'' یورپی اقوام کی طرف نکل گیا اور انکا جدامجد ہوا۔ ''سام'' نامی فرزند ایشیا کی طرف نکلا اور ایشیائی اقوام کا جدامجد ہوا۔ سام کی تعلیماتِ توحید اپنی اولاد اور اپنی زندگی تک تو جاری رہیں' البتہ بعد ازاں مختلف ادوار میں جو پیغمبران مبعوث ہوتے رہے' اگرچہ انکی تعلیمات بھی اس سے متفرق تو ہرگز نہ تھیں مگر ہندوستان میں انکی تعلیمات کے برعکس ہٹ دھرمی کے سبب جہالت و نفرت' چھوت چھات اور عدم مساوات بتدریج بڑھتی چلی گئی۔

ہندوؤں کی سب سے بڑی کتاب رِگ وید میں مذکور ہے کہ ''برہمن لوگ برہما جی کے منہ سے'

چھتری یا کھتری لوگ انکے بازو سے، ویش انکی رانوں سے اور شودر انکے پاؤں سے نکلے تھے''۔ یوں بھی ہندوؤں کی سیاست برہمن چانکیہ کے نظریات کی رہین منت رہی ہے۔ انڈین انٹی کویری میں ہے کہ چانکیہ کا نظریہ تھا کہ ''جو بادشاہ زیادہ قوت حاصل کرلے اسے چاہیئے کہ ہمسایہ بادشاہ پر حملہ کرنے میں دیر نہ کرے۔ جو دیکھے کہ اسکی قوت بڑھ رہی ہے وہ بغیر جھجک صلح کا عہد توڑ کر دوسرے پر حملہ کردے''۔ قدیم ہندوستان کے حکمرانوں کا بھی یہی نظریہ تھا کہ طاقتور بننے کیلئے یا دوسروں کو مغلوب کرنے میں عہد شکنی ضروری ہو تو کر ڈالو۔

بیاس دیو جی نے کوروؤں، پانڈوؤں اور انکے بڑے بزرگوں کے حالات بڑی تفصیل کے ساتھ مہابھارت میں لکھے ہیں، جو دس ابواب میں قریباً ایک لاکھ اشعار پر مشتمل ہیں۔ مہابھارت میں چھیاسی ہزار اشلوک، خدا کی معرفت، دین کی حقیقت، عبادت کے قاعدوں، اور اخلاقِ عالیہ کے بارے ہیں اور باقی اشعار میں جنگ عظیم کا بیان اور سورماؤں کی بہادری کے تذکرے ہیں۔ بیاس دیو جی کا دعویٰ ہے کہ انکی پیدائش غیر معمولی طریقہ پر ہوئی۔ خود کو مافوق الفطرت ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

> ''میں جنگلوں میں جا کر ایسی ایسی کڑی ریاضتوں اور عبادتوں میں مشغول رہا کہ انسانی طاقت سے باہر ہے۔ رفتہ رفتہ مجھے بارگاہِ الٰہی کا قرب حاصل ہوا۔ آئینہ ضمیر ایسا چمکا کہ علام الغیوب کی بارگاہ سے معرفت وحقیقت کا رتبہ حاصل ہوا۔ الٰہیات، طبیعات، منطق، مناظرہ وغیرہ الغرض تمام علومِ متعارفہ وغیر متعارفہ کے دروازے مجھ پر کھل گئے۔ میں اسرارِ غیب اور حقائق ازل کا راز داں ہوا''۔

اگرچہ مقدس وید برہما سے منسوب ہیں یعنی آغاز آفرینش کے وقت سروشِ ایزدی کی آواز کے مطابق اسکی زبانِ فیض ترجمان ہی سے نکلے ہیں، لیکن انکی ترتیب اور چار حصوں میں تقسیم کا اعزاز بیاس دیو جی ہی کو حاصل ہے جس نے انہیں سام وید، رگ وید، یجر وید اور اتھر وید کے نام سے موسوم کر کے عالم دنیا میں رائج کیا۔ انہوں نے اخلاقیات اور توحید کی تعلیم دی مگر اسکے بعد کچھ ویدوں کو تحریفات کی بھینٹ بھی چڑھا دیا گیا۔

مہا آتما گوتم بدھ

گوتم بدھ کی آمد سے قبل ہندوستان کے کونے کونے میں توحید کی جگہ مختلف دیوی دیوتاؤں نے لوگوں کے دلوں میں گھر بنا لئے تھے۔ کیونکہ برہمنوں نے منتروں، شعبدوں اور اپنی چرب زبانی سے لوگوں کو مسحور کر کے اپنا مطیع کر لیا تھا۔ دراصل انکو حقائق بیان کرنے اور خدائے واحد کی طرف دعوت دینے کی نسبت خود کو سجدے کروانے کی لت پڑ چکی تھی۔ یہ نشہ ایسا بدمست کر دینے والا نشہ ہے جو نہ تو کسی بادشاہت میں ہے نہ بڑی سے بڑی دنیاوی دولت میں۔

قدیم ہندوستان کے اسی ماحول میں گوتم بدھ نے جنم لیا جو ایک کھتری شہزادہ تھا۔ ناز و نعم میں پلے بڑھے ہونے کے باوجود جب اس نے ہندوؤں اور آریوں کے مظالم مشاہدہ کئے اور اس پر اسرارِ الٰہیہ کھلے تو نوجوانی ہی میں اس نے دنیا سے کنارہ کشی کر کے باقی ساری عمر خدائے واحد کی پرستش میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ گوتم بدھ کا تصورِ الٰہی یہ تھا کہ:۔

> ''وہ جس کا نام حقیقت یا خدا ہے سب گہرائیوں سے گہری، آسمان سے بلند، ستاروں سے کہیں دور، برہما سے بہت آگے اور ازلی و ابدی ہے۔ وہ ایک ایسی طاقت ہے جو نہایت بلند اور ہمہ گیر ہے، جو ازل سے اچھائیوں کو پسند کرتی ہے کیونکہ وہ خود اچھائی ہے۔ جو کچھ ہے اسکی ذات سے ہے اور جو کچھ ہے اسی کی طرف لوٹ کر واپس جائیگا۔ اگر تم کسی کو کلہاڑی مارو گے تو وہ ہستی تمہیں معاف نہ کریگی۔ وہ کسی کی طرفداری نہیں کرتی اسکی میزانِ عدل نصب ہے اسے اختیار ہے اور جب چاہے گا ہمارے اعمال کا وزن کریگا۔ اس وقت اسکا انکشاف ہوگا کہ ہم کیا صحیح اور کیا غلط کرتے رہے۔ لیکن اس وقت کوئی ہماری مدد نہیں کریگا۔ اسکا انصاف برقرار ہے، کوئی قوت ایسی نہیں جو اس سے عظیم ہو۔ محبت اس کا آغاز ہے اور آشتی اسکا پیغام ہے۔ اسکی اطاعت ہر ایک پر واجب ہے''۔

انکی ایسی تعلیماتِ توحید کا ہندوستان پر خوشگوار اثر ہوا۔ اسکے پیروکاروں کی کثیر تعداد نے اسکے عمدہ افکار تسلیم کر لئے جس میں دیوی دیوتاؤں کی پرستش اور بت پرستی کو قبیح فعل قرار دیا گیا تھا۔ لیکن تاریخ ہند کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ وہ مذہب جس نے برصغیر کے لوگوں کو بت پرستی کی جہنم سے نکال کر

خوشحالی، مساوات، رواداری اور امن وآشتی کی جنت تک پہنچا دیا تھا' اس پر ایک وقت ایسا بھی آ گیا کہ وہ مذہب نہایت کسمپرسی کی حالت میں اس ملک سے نکال باہر کیا گیا۔

بدھ مذہب اپنی سادگی اور پاکیزہ تعلیمات کی وجہ سے بہت جلد اور غیر متوقع طور پر پھیلا جس نے برہمنوں کو ششدر کر دیا۔ برہمنیت کے ستائے ہوئے مظلوم لوگوں نے محبت کے اس پیغام کو دل کی گہرائیوں میں جگہ دی اور ''اشوک'' جیسے طاقت ور بادشاہ نے بھی اسکو مزید تقویت بخشی۔ یہ صورت حال آریوں خصوصاً برہمنوں کیلئے بہت تکلیف دہ اور انکے مفادات پر کاری ضرب تھی۔ مگر اس سیلاب کے آگے بند باندھنا سہل نہیں تھا اسلئے انہوں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ اس صورت حال سے سمجھوتہ کر لیا جائے۔ تاہم واقعات شاہد ہیں کہ وہ اندر ہی اندر پیچ وتاب کھاتے اور اس مذہب کو تباہ و برباد کرنے میں کوشاں رہے۔

اشوک کی وفات کے بعد جب اشوک کے جانشینوں میں کوئی لائق شخص باقی نہ رہا اور خاندان موریہ پر زوال آ گیا تو برہمنوں کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے اس مذہب کے خلاف منظم تحریک چلائی۔ شنکر اچاریہ نے (جو اس مذہب کا سخت دشمن تھا) جنوبی ہند کے حکمرانوں کو بدھ مذہب کے خلاف اس قدر متنفر اور مشتعل کیا کہ اس مذہب کو تباہ کرنا انکے نزدیک گویا ایک اہم فریضہ ٹھہر گیا۔

پھر اس مذہب پر اور اسکے ماننے والوں پر ایسے ایسے ظلم وستم توڑے گئے کہ ان پر قیامت گزر گئی۔ انگنت بودھوں کو تہہ تیغ کر دیا گیا' انگنت کو ملک بدر کیا گیا اور انہیں زبردستی بدھ مذہب ترک کروا کر ہندومت اختیار کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ ''ریورینڈ ڈبلوٹی ولکنس'' جیسا محتاط مورخ بھی (ڈیلی لائف اینڈ ورک ان انڈیا) میں یہ لکھنے پر مجبور ہو گیا کہ ''تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسی مثال ملے کہ کسی تحریک کو مذہبی ظلم و جبر میں اتنی کامیابی حاصل ہوئی ہو جتنی کامیابی (برہمنوں کی تحریک نے) بدھ مذہب کو ہندوستان سے دیس نکالا دینے میں حاصل کی''۔

تاریخ میں کمارلہ بھٹہ نامی ایک برہمن کا نام بھی مذکور ہے جس نے بدھ مت کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے میں نہایت سفاکانہ کوششیں کیں۔ اس کا دل بدھ مت کے خلاف جوالہ مکھی بنا ہوا تھا۔ برصغیر کے بعض حصوں میں دوبارہ ہندو راج کے قیام کے بعد بدھ مذہب اور اسکے پیروکاروں پر مظالم کے جو جو

پہاڑ توڑے گئے ان میں کمارلہ بھٹہ کا بڑا دخل تھا۔اس دور میں انکی خانقاہوں کو گرادیا گیا انکی کتب جلا ڈالی گئیں اور بدھوں کو طرح طرح کی اذیتیں دیکر ملک بدری پر مجبور کیا گیا۔ سورج بنسی اور چندر بنسی ہندو مذہب کی حمایت میں جہاں جہاں انکا بس چلتا' بدھوں کے عبادت خانوں اور خانقاہوں کو منہدم کر کے انکی جگہ ہندو مذہب کے معابد تعمیر کر لیتے۔

یہ تمام تفصیلات کانگرسی لیڈر رامیشور چندر دت کی کتاب ''قدیم ہندوستان کی تہذیب'' میں درج ہیں۔ نہ صرف یہی بلکہ تاریخ ہند کے اسی بدترین دور میں شمالی ہند کی سرزمین پر ''پشی متر'' نامی ایک برہمن نمودار ہوا جو بدھوں کی ایذا رسانی میں اپنے تمام ہم خیالوں سے سبقت لے گیا۔

مشہور مغربی مورخ ''بورو ناف'' نے اپنی تاریخ کے دیباچہ میں ''پشی متر'' کے مظالم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ'' بدھ مت کے پیروؤں پر وحشیانہ مظالم کیے گئے انکی خانقاہوں کو جلا کر راکھ کے ڈھیروں میں تبدیل کر دیا گیا اور مگدھ سے پنجاب کے علاقے تک بدھ راہبوں کا قتل عام کیا گیا۔ جو راہب پشی متر کی تلوار کی زد میں آنے سے کسی طرح بچ رہے وہ اپنی جانیں بچانے کیلئے دوسرے ممالک میں پناہ گزین ہونے پر مجبور ہو گئے۔

یہ داستان بڑی دردناک اور ہندو مذہب کے پیروکاروں خصوصاً برہمنوں کے دامن پر ایسا بدنما داغ ہے جسکی سیاہی شاید کبھی دور نہ ہو سکے گی۔ طرہ یہ کہ انہوں نے بدھوں کو بھی اپنی راہ پر ڈال لیا اور (بت تراشی و بت پرستی سے منع کرنیوالی شخصیت کے بھی) انگنت بت تراش لیے گئے۔ یوں دنیا کا یہ اہم خطہ (ہندوستان) پھر سے بت پرستی کا شکار ہو گیا اور انکے نزدیک ایشور (خدائے واحد) کی جگہ پھر سے لاتعداد خداؤں (دیوی دیوتاؤں) نے لے لی۔ بدھوں پر یہ مظالم نامعلوم کب تک جاری رہتے کہ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد شروع ہو گئی جنہوں نے اس ظلم کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

اشوک

سکندرِ اعظم کی واپسی کے وقت اسکی کوئی مقدونی فوج ہندوستان یا پنجاب کے کسی بھی صوبے میں نہ تھی۔ البتہ سلطنت کا انتظام اسکے مقرر کردہ راجہ پورس کے سپرد تھا اور ٹیکسلا کا راجہ امبھی بھی اسکا شریک کار تھا۔ فلپوس کے قتل کے بعد ہندوستان کے متعدد صوبوں میں بغاوت کے آثار دکھائی دینے لگے۔ سکندر کا خیال تھا کہ وہ دوبارہ فوج کشی کرے مگر ۳۲۳ ق م میں اسکا بھی انتقال ہوگیا۔ یہ خبر سنتے ہی تمام ہندوستانیوں نے متحد ہوکر بغاوت کردی اور مقدونیوں کے زیر اثر حکمرانوں کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ ابتدائی افراتفری اور انتشار کی خبروں کے ساتھ ہی سکندر نے کچھ مقدونی فوج ہندوستان کے چند شہروں میں بھیج بھی دی تھی اور خود تیاری کر رہا تھا کہ زندگی نے مہلت نہ دی۔

غیر ملکی قوم کے اثرات کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کرنے والا چندر گپت نامی دلیر شخص وہ تھا جس نے ایسی فوج کے خلاف اعلان جنگ کیا اور سلطنت مگدھ کے شاہی خاندان کا یہ فرد مقدونی فوجوں پر حملہ کر کے پنجاب پر فتح یاب بھی ہوگیا۔ وہ مذہباً جین تھا اس نے پچیس سال حکومت کی مگر جب بارہ سال تواتر سے قحط پڑا تو وہ تخت سے دستبردار ہوکر جین کے ''بھدرا باہو'' نامی ایک بزرگ کے ہمراہ جنوبی ہندوستان کی طرف چلا گیا اور سنیاس لیکر ریاست میسور میں سراون بلگوں کے مقام پر رہنے لگا۔

۲۹۸ ق م میں اس کا بیٹا ''بندسار اس'' تخت نشین ہوا تو ہند اور یونان میں دوستانہ سفارتی تعلقات استوار ہوگئے۔ بندسار اس اپنے اٹھائیس سالہ دور حکومت کے بعد جب شدید بیمار ہوگیا تو اسکا بیٹا اشوک وردھن ۲۷۳ ق م میں حکمران بنا۔ جبکہ اسکی تاجپوشی ۲۶۹ ق م میں ہوئی اور ۲۶۱ ق م میں اس نے کلنگ کی سلطنت کو فتح کیا۔

یہ سلطنت خلیج بنگالہ کے ساحل پر دریائے مہاندی اور گوداوری کے درمیان واقع تھی جو موریہ سلطنت کا حصہ بن گئی۔ جنگ کلنگ میں ہزاروں افراد لقمہ اجل بن گئے اس دردناک منظر کی تاب نہ لاتے ہوئے اشوک نے باقی تمام عمر جنگ نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا تو اسکا زیادہ تر وقت بدھ مذہب کی تعلیمات پر صرف ہونے لگا۔ اس نے جابجا کتبے کندہ کرائے جن پر اخلاقی عبارات لکھی جاتیں۔ نیز اس

نے اخلاقیات کو عام کرنے کا قانون بھی بنایا۔

۲۴۹ ق م میں اشوک دارالسلطنت پاٹلی پترا سے شمال میں نیپال کی طرف روانہ ہوا جہاں اس نے اس مقدس مقام کی یاترا بھی کی جہاں ایک درخت کے نیچے گوتم بدھ کو گیان حاصل ہوا تھا۔ اشوک بیک وقت تارک الدنیا بھکشو بھی تھا اور بادشاہ بھی۔ اس کے دور میں بدھ مذہب کو پھر عروج حاصل ہوا۔ اشوک کی اولاد میں سے کوئی بیٹا اس لائق نہ تھا کہ تخت وتاج کا وارث بن سکے' چنانچہ اسکے مرنے کے بعد قرعہ ڈال کر اسکے پوتے دسرتھ کو ۲۳۲ ق م میں بادشاہ بنادیا گیا۔

موریہ خاندان کی حکومت ۱۸۵ ق م میں اختتام پذیر ہوگئی۔ البتہ اشوک کی اولاد مگدھ اور دوسرے علاقوں میں کہیں کہیں حکومت کرتی رہی' جس کا آخری حکمران (ہیون سانگ کے مطابق) پورن ورمن تھا جو ساتویں صدی عیسوی میں اسکا ہمعصر تھا۔ اسکے بعد یعنی سن عیسوی کی ابتداء کے ساتھ ہی ہندوستان کی قدیم تاریخ ایک نئے دور میں شامل ہوجاتی ہے۔

چندر گپت اوّل سے کمار گپت اوّل تک یعنی ۳۲۰ء سے ۴۵۵ء تک گپت نے حکومت کی۔ پھر ۶۱۶ء تک ہن بھی قابض رہے اور ۶۴۷ء تک ہریش خاندان کی سلطنت چلتی رہی۔ اس دوران اسلام کی کرنیں برصغیر تک پہنچ چکی تھیں اور عرب تاجر اور عرب سپاہی ملتان اور سندھ کے راستے ہندوستان پر حملہ آور ہو چکے تھے۔ ۶۶۴ء میں المہلب نامی مسلمان سپہ سالار نے جب سرزمین ہند پر حملہ کیا تو یہیں سے دوقومی نظریہ کی عملی جدوجہد کا آغاز ہوگیا۔

یدھشٹر سے پرتھوی راج

یدھشٹر سے پرتھوی راج تک کے حالات کا اختصاراً ذکر کرتا چلوں کہ سنسکرت کی قدیم تاریخی کتابوں اور مہابھارت کی معتبر روایتوں کے مطابق آغاز آفرینش سے کورو پانڈو کے بزرگ ہی تمام ہندوستان پر حکومت کرتے تھے۔ سلطنت کا سررشتہ برس ہا برس تک نسل در نسل اسی خاندان کے ہاتھ میں رہا۔ یہاں تک کہ یہ سلسلہ پانڈوؤں کے دادا ''راجہ چترویریہ'' تک پہنچا۔ جب وہ عدالت وانتظام کے ساتھ فرمانروائی کرکے جہانِ فانی سے لاولد رخصت ہوا تو بقول مصنف خلاصۃ التواریخ' اسکے تخت کا وارث کوئی نہ تھا۔ امرائے دربار نے باہم مشورہ کرکے سوامی بیاس دیو جی سے (جو تمام رشیوں منیوں کے

پیشوا تھے) التجاء کی کہ وہ آنجہانی رانیوں سے قربت کریں۔اس محرم رازِ ازل نے قبول کیا تو تین رانیوں سے تین بیٹے ہوئے۔جن میں سے ایک رانی نے اس خداشناس کا چہرہ دیکھ کر آنکھیں بند کرلیں' اسلیئے اسکےبطن سے دھرت راشٹ نامی اندھا لڑکا پیدا ہوا۔دوسری رانی اس عارفِ حق شناس کا چہرہ دیکھتے ہی پیلی پڑگئی' چنانچہ اس سے جولڑکا پیدا ہوا اسکا تمام جسم زرد تھا اسکا نام پانڈر رکھا گیا جو اسی رنگ کے ہم معنی ہے۔تیسرا لڑکا چونکہ تیسری رانی سے ہوا جو کہ دراصل کنیز تھی چنانچہ حکومت منجھلے بیٹے پانڈو ملی۔

بعدازاں پانڈ کی ایک رانی کنتی کے ہاں تین بیٹے یدہسٹر' بھیم سین اور ارجن اور دوسری رانی کے پیٹ سے دو جڑواں لڑکوں نکل اور سہدیو نے جنم لیا۔راجہ پانڈ مرا تو اس کی دوسری رانی اسکے ساتھ ہی ستی ہوگئی البتہ رانی کنتی اپنے پانچوں بیٹوں کو لیکر ہستنا پور چلی آئی۔وہاں بعض لوگوں نے راجہ پانڈ کی اولاد کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔شاید اسکی ایک وجہ کنتی کے ستی نہ ہونے کی بناء پر نفرت بھی ہو۔تاہم راجہ پانڈ کے چچا بھیشم پتامہ نے ان لڑکوں کو سایہ عاطفت میں لے کر ان کی اچھی طرح پرورش کی۔لڑکوں نے بہت سے ویدا ور پران پڑھے۔یدہسٹر نیکی راست بازی خوش اخلاقی اور دانش مندی میں سب پر سبقت لے گیا۔

بھیم سین نے قوت و طاقت میں ملکہ حاصل کیا اور ارجن تیر اندازی کے فن میں ماہر ہوکر شیر دل پہلوان کہلوایا۔انکے سوتیلے بھائی نکل اور سہ دیو بھی شہسواری' فیل بانی' رتھ نشینی اور فنون حرب وسپہ سالاری میں بے نظیر تھے۔دھرتراشٹ کا بیٹا دریودھن' پانڈوؤں کے کمالات کا شہرہ سن سن کر ہر وقت حسد کی آگ میں جلتا اور انہیں نیست و نابود کرنے کی ترکیبیں سوچتا رہتا تھا۔آخر کار پانڈوؤں کو بن باس دلا کر حکومت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔مگر بعد میں انکے درمیان زبردست جنگ ہوئی جس میں پانڈوؤں کی فوج سات کھیونی اور کوروؤں کی فوج گیارہ کھیونی تھی۔اہل ہند کی اصطلاح میں ایک کھیونی میں پانچ لاکھ پینتالیس ہزار سپاہیوں کی نفری ہوتی ہے۔اس جنگ عظیم کے بارے بیاس دیو جی نے کوروؤں پانڈوؤں کے بڑے بزرگوں کے حالات باتفصیل مہابھارت میں لکھے ہیں۔بعدازاں نسخہ راج ترنگنی کے مطابق یدہشٹر سے پرتھوی راج تک ایک سو بیس ہندو راجاؤں نے چار ہزار چار سو سال فرمانروائی کی اور پھر خطہ ہندوستان کا تخت وتاج فرزندانِ توحید کے قبضہ میں چلا گیا۔

آریاؤں سے مسلمانوں تک کے مذاہب

مورخ پیام شاہجہان پوری کے مطابق قدیم تاریخ ہند کا سب سے اہم واقعہ آریوں کا اس ملک میں وُرود ہے یہ زمانہ نصف صدی ق م کا ہے۔ گو آریوں سے قبل دراوڑ، گکھڑ، بھڑ، کول، سنتھال، بھیل، گونڈ، ٹوڑ، سک، کشان، ہن اور تبتی برمن نامی قومیں بھی باہر سے ہی آکر یہاں آباد ہوئی تھیں، مگر ان میں سے دراوڑوں کے علاوہ جو تہذیب وتمدن اور شائستگی میں آریوں سے کسی طرح کم نہیں تھے، باقی کسی قوم نے اس ملک میں کوئی قابل ذکر کارنامہ سرنجام نہیں دیا۔ دراوڑوں کے بعد آریہ سب سے بڑی قوم تھی جو اس برصغیر میں داخل ہوئی اس قوم کا اصل وطن وسط ایشیا تھا۔ یہ لوگ پہلے ایران آئے اور پھر وہاں سے انکے قافلے سینکڑوں سال تک تھوڑے تھوڑے وقفے بعد یہاں آتے اور ملک کے مختلف حصوں میں آباد ہوتے رہے۔ ہندو مورخ ڈاکٹر چیٹر جی اور پروفیسر شریدر بھی آریہ قوم کا قدیم وطن جنوبی روس اور دریائے گنگا کی وادی قرار دیتے ہیں۔

رائے بہادر پیارے لال آشوب بھی ان مورخین میں شامل ہیں اور ایک غیر متعصب ہندو مصنف ہیں۔ انکے مطابق بھی آریہ اصل میں ہندوستان کے باشندے نہیں، بلکہ کسی زمانہ میں پچھم کی طرف سے آئے اور انہوں نے آہستہ آہستہ سارے ملک کو فتح کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ پھر ان لوگوں کو جو یہاں پہلے سے رہتے تھے اپنا فرمانبردار بنا کر انکا نام شودر (یعنی خدمت گار) رکھ لیا۔

ہندوستان لاتعداد اقوام و مذاہب کا گڑھ ہے۔ مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں سے قطع نظر ہندوؤں کے جو فرقے یہاں آباد تھے ان میں چاند سورج کی پوجا پاٹ کے علاوہ مختلف دیوی دیوتاؤں ناگ، گنیش و ہنومان کی پرستش کرنے والے بھی تھے اور اپنے گزرے ہوئے اوتاروں (جیسے رام چندر جی اور مختلف ماتاؤں وغیرہ) کی پرستش کرنے والے بھی۔ ان میں کچھ سنیاسی ہیں جو بدن پر بھبھوت ملتے اور سر پر جٹائیں رکھتے ہیں۔ بدن پر راکھ ملنے کے باوجود ضمیر کے آئینے کو نور معرفت سے روشن رکھتے اور جسم کی زیب وزینت کی بجائے خانہ دل کی صفائی کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ دوسرا گروہ یوگیوں (جوگیوں) کا ہے جو صاحب حال وقال فقیروں کی طرح اپنے معبود کی یاد میں غرق رہتے ہیں۔ تسخیر قلوب بلکہ جن و پری تک کو زیر فرمان رکھنا انکی عادت ہے۔ تیسرا گروہ بیراگیوں کا ہے جو بیدار دل

عابدان دنیا کے رشتوں کو توڑ کر آزادروی ووارستگی کا مسلک اختیار کر لیتے اور دن رات سجادۂ تقویٰ پر بیٹھے رہتے ہیں۔ چوتھا فرقہ اودانسی ہے۔ بابا نانک کے یہ پیروکار سکھ کہلواتے ہیں۔ گرنتھ کے اشعار خوش الحانی سے گاتے اور اپنے سننے والوں کو محظوظ کرتے ہیں۔ پانچویں صنف جتی دسریورہ کی ہے جو سخت ریاضتیں کرتے اور چالیس چالیس دن کا برت (روزہ) رکھتے ہیں۔ برسات کے چار ماہ ایک جگہ آسن جما کر بیٹھ جاتے ہیں تاکہ چلنے پھرنے میں کوئی کیڑا مکوڑا پاؤں تلے کچلا نہ جائے۔ جانداروں کو ایذا نہ دینا انکی عبادت ہے۔ البتہ وہ کسی خدا کے قائل نہیں اور ستر پوشی سے زیادہ کپڑا نہیں پہنتے۔ منہ ہاتھ نہ دھونا' ناپاک رہنا' غسل ومسواک وغیرہ سے پرہیز کرنا انکے نزدیک ریاضت وعبادت کا حصہ ہے۔ یہ تمام فرقے خود کو سادھو سنت وغیرہ کہلواتے ہیں۔ دریائے جمنا اور دریائے گنگا کی پوجا پاٹ کرنیوالے بھی یہاں موجود ہیں۔ دریائے گنگا کے سرچشمہ کے بارے کوئی نہیں جانتا' ہندوؤں کے عقیدہ کے مطابق گنگا بہشت سے اترا ہے۔ انکی پرانی پوتھیوں میں ہے کہ بہشت سے کوہ کیلاش پر اترنے کے بعد گنگا چین میں پہنچتا ہے۔

ان فرقوں کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے باشندے عقیل' خوش اطوار' خوش خوراک' شفیق' مخیّر' مہذب' وفا شعار اور حیادار ہیں۔ اس بات میں بھی شک نہیں کہ برصغیر شروع ہی سے غیر مسلموں کی فرقہ واریت کی مذہبی اقدار میں جکڑا رہا تاہم حقیقت یہ ہے کہ جب یہاں اسلام کا نعرہ گونجا اور مسلم اولیاء وعلماء شخصیات کا ورُود ہوا تو دین حنیف نے ان فرقوں کے مقابلہ میں رنگ ونسل کے امتیازات کو مٹا ڈالا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی کثیر تعداد بمعہ انکی مساجد ومزارات آج تک موجود وآباد ہیں۔

برِّصغیر میں مسلمانوں کی آمد

اہل عرب اور ہندوستان کے باشندوں کے درمیان تعلقات قبل از اسلام سے موجود چلے آتے تھے۔ عرب تاجروں کے قافلے ہندوستان اور ہندوستان کے تاجروں کے قافلے عرب آتے جاتے تھے۔ عرب و ہندوستان تعلقات کی اس قدیم تاریخ کو مدنظر رکھا جائے تو برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کا پتا چلانے میں کوئی خاص مشکل پیش نہیں آتی۔ مگر افسوس کہ تاریخ کی بیشتر کتب انگریز مصنفین کی لکھی ہوئی ہیں جن میں ہندوستان کی تاریخ عموماً سکندر اعظم کے حملہ سے برصغیر ہند کی کایا پلٹنا ظاہر کرتی ہے جس

سے ہندوستان کو علم وفن کی دولت اور تاریخ کی دنیا میں زندگی ملی۔ ایسے ہی مورخ جب برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کا تذکرہ کرتے ہیں تو چند سطروں میں عرب کی جاہل اقوام اور انکی فرسودہ رسوم ورواج کا ذکر کر کے بعثتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر آجاتے ہیں اور پھر انہیں محمود غزنوی کی فوجِ ظفر موج ہندوستان پر سترہ حملے کرنے کیلئے سر بکف ملتی ہے۔

آج کا مورخ بھی بے تحقیق کئے مسلمانوں کی تاریخ کا باب یہیں سے شروع کر دیتا ہے۔ بنظر غائر تاریخ عالم کا مطالعہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ ہادیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی نوع انسان کو محبت وشفقت اور عدل ومساوات کا وہ لافانی پیغام دیا جس سے انسان کو انسان کی غلامی سے نجات ملی۔ نفرت وحقارت کے آتش کدے سرد ہو گئے۔ امن وآشتی کے پیامبر کا یہی پیغام گھر گھر پہنچانے کیلئے مسلمان مشرق ومغرب اور شمال وجنوب میں پھیل گئے۔ وہ کسب معاش کی غرض سے تجارتی قافلوں کی صورت میں روانہ ہوئے یا سرکشوں اور مفسدوں کو سبق سکھانے کیلئے شمشیر بکف ہو کر نکلے ہوں، بہر حال انہوں نے یہ پیغام دنیا کے ایسے ایسے گوشوں تک پہنچا دیا جہاں ابھی تک تاریخ کے کسی فاتح کے قدم نہ جم سکے تھے۔ انہوں نے اپنے قول وعمل کی تطبیق سے لوگوں کو اسلام کا والہ وشیدائی بنا دیا اور اسلام کی کرنیں دنیا کے کونے کونے میں پھیل گئیں۔

ان حالات میں ہندوستان کا خطہ بھی کیونکر محروم رہ سکتا تھا۔ ''تجارت العرب قبل الاسلام'' کے مصنف نے ''تاریخ فرشتہ'' کے حوالہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ چونکہ اسلام کے اوائل میں بھی عرب تاجر بغرض تجارت ان جزیروں میں آتے جاتے تھے اسلئے سراندیپ (لنکا) کے راجہ کو اسلام اور مسلمانوں کا حال سب سے پہلے معلوم ہوا، اور وہ صحابہ کرامؓ کے دور ۴۰ھ میں مسلمان ہو گیا۔ جس نے پیغمبر اسلام کا حال سن کر ایک سمجھدار شخص کو تحقیق حال کیلئے عرب روانہ کیا جو اپنے ایک ہندو نوکر کے ہمراہ رکتے رکاتے جب مدینہ پہنچا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم وفات پا چکے تھے اور ابوبکرؓ کے بعد خلافتِ عمرؓ کے دور کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس نے حضرت عمرؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے تفصیل سے معلومات حاصل کیں مسلمانوں کے اخلاق ومعاشرت کا مشاہدہ کیا اور واپسی کیلئے چل پڑا مگر مکران (بلوچستان) کے قریب پہنچ کر مر گیا۔ البتہ اسکے ہندو نوکر نے سراندیپ پہنچ کر وہاں کے لوگوں

کو تفصیل سے مسلمانوں کے درویشانہ وفقیرانہ طور وطریق کا ذکر کیا اور انکے متواضع ومہمان نواز اور خاکسار ہونے کا نقشہ کھینچا جس سے وہ بہت متاثر ہوئے چنانچہ ان اطراف میں اور سراندیپ میں عربوں اور مسلمانوں کی پہلی نوآبادی قائم ہوگئی۔

ان اطراف میں عربوں کا دوسرا مرکز مالدیپ کا جزیرہ تھا۔ اردگرد بھی عربوں اور مقامی مسلمانوں کی آبادیاں بڑھ رہی تھیں جنہیں عرب دیبات کہتے تھے۔ان جزیروں اور آبادیوں کا مفصل حال سب سے پہلے ابن بطوطہ نے کیا کہ سلطان محمد تغلق کے زمانہ (۸۰۰ھ) میں یہ جزیرہ پورے کا پورا مسلمان آبادی پر مشتمل تھا جس میں عربوں اور دیسی مسلمانوں کی بہت سی آبادیاں تھیں اور سلطان خدیجہ نامی ایک بنگالی خاتون ان جزیروں کی ملکہ تھی۔

ابن بطوطہ کے زمانہ میں یہاں یمن وغیرہ کے بہت سے علماء اور جہازران موجود تھے جن کی زبانی اس جزیرے کے بت پرست لوگوں کے مسلمان ہونے کی یہ وجہ بیان کی گئی ہے کہ یہاں ہر ماہ سمندر سے دیو کی شکل میں ایک بلا آتی تھی جب یہاں کے لوگ اسکو دیکھتے تو ایک کنواری لڑکی کو بناؤ سنگھار کر کے اس بتخانہ میں چھوڑ آتے تھے جو اس سمندر کے کنارے پر تھا۔

اسی اثناء میں مراکو کے ایک عرب شیخ ابوالبرکات بربری مغربی جو اتفاقاً اس علاقہ میں آگئے تھے انکی دعا وبرکت سے یہ بلا انکے سروں سے ٹلی۔اس کرامت کو دیکھ کر وہاں کا راجہ شنورازہ اور تمام رعایا انکے ہاتھ پر مسلمان ہوگئی۔ابن بطوطہ کہتا ہے: کہ مسلمان ہونے والے اس راجہ نے جو مسجد وہاں بنوائی اس پر میں نے یہ کتبہ لکھا ہوا پایا۔ ''سلطان احمد شنورازہ ابوالبرکات مغربی کے ہاتھ پر مسلمان ہوا'' الغرض اس وقت سے لیکر اب تک یہ تمام جزیرے مسلمان ہیں اور ان میں بڑی تعداد مخلوط النسل عربوں کی ہے۔

روایتوں سے ثابت ہے کہ اسلام اور عربوں کا تیسرا مرکز ہندوستان کا وہ آخری کنارہ ہے جس کو ہندو پرانے زمانہ میں کیرالا (ملیبار) کہتے تھے۔عرب جغرافیہ نویسوں نے اسکی حدود گجرات کے خاتمہ سے کولم (ٹراونکور) تک بتائی ہے۔تاریخ برصغیر میں مسلمانوں کا چوتھا بڑا مرکز کارومنڈل قرار دیتی ہے جسے معبد بھی کہتے ہیں۔یہ مدراس میں ملیبار کے دوسرے ساحلی کنارہ پر آباد ہے۔ یہ جزیرہ بھی اسلام کے ابتدائی زمانہ ہی سے عرب سیاحوں اور تاجروں میں بڑی کشش رکھتا تھا۔ابن سعید مغربی نے

چھٹی صدی ھ کے آخر میں اسکا ذکر کیا اور بتایا ہے کہ یہ جزیرہ کولم کے پورب میں تین چار یوم کی مسافت کے راستہ میں دکن کی طرف جھکا ہوا ہے۔ ذکریا قزوینی ۶۸۶ ھ میں اسکا نام منڈل لکھتا ہے اور یہاں کی عود لکڑی کی تعریف کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ساحل کا یہ حصہ چند صدیوں کے بعد عربوں کے استعمال میں آیا۔ وصاف ۷۲۸ ھ اور رشید الدین مصنف جامع التواریخ ۷۱۸ ھ دونوں نے معبد یا کارومنڈل کو برصغیر میں اسلام کا چوتھا اہم مرکز قرار دیا ہے۔ یہ زمانہ ہندوستان میں فیروز شاہ خلجی کا عہد حکومت تھا۔ ان مصنفین کے مطابق معبد ہندوستان کی کلید ہے۔ ان جزیروں کے علاوہ برصغیر میں گجرات، میسر، تھانہ، کھمبایت، بمبئی، سندھ، ملتان وغیرہ بھی مسلمانوں کی توجہ کا مرکز بن چکے تھے۔ آب کوثر کے مؤلف کا بیان ہے کہ ابن بطوطہ نے آٹھویں صدی ھ میں کھمبایت سے چین کا سفر کیا تو اس نے مالابار کے ساحل پر جابجا اور معقول تعداد میں اسلامی آبادیاں دیکھیں۔ صوبہ بمبئی کے ضلع کاردار کی قدیم بندرگاہ ''ھونادر'' میں سلطان جمال الدین ایک ہندو راجہ کی طرف سے حکمران تھے اور اس شہر میں مسلمان علماء اور اسلامی مدارس موجود تھے۔ منگلور میں مسلمانوں کی آبادی چار ہزار کے لگ بھگ تھی۔ کالی کٹ کا راجہ ہندو تھا مگر سوداگروں اور تاجروں کا سردار مسلمان تھا اور بحری تجارت میں انکو بڑا دخل تھا۔

''عرب و ہند تعلقات'' میں مذکور ہے کہ یہ دوہرے تہرے تعلقات تھے جنکے سبب مسلمانوں کی ہندوستان کی طرف توجہ ہوئی۔ انہوں نے ایران کی فتح کے بعد اسکی نوآبادیات اور دیگر مقبوضات کو اپنے تصرف میں لانا ضروری سمجھا اور اس طرح مکران اور بلوچستان کے بعد جب سندھ کی سرحد انکے سامنے آئی تو انہیں اپنے تجارتی جہازوں کی حفاظت کیلئے ہندوستان کی کسی بندرگاہ کی ضرورت درپیش ہوئی۔ چنانچہ عہد فاروقی میں عرب جہازوں کے بیڑے کسی معقول بندرگاہ کے قبضہ کیلئے ہندوستان کے ساحلوں پر منڈلانے لگے۔

ممبئی کے مشہور شہر کے قریب تھانہ (تانہ) ایک چھوٹی سی بندرگاہ تھا جس پر بحرین کے گورنر کے حکم سے ۱۵ھ میں پہلا حملہ کیا۔ اسکے بعد بھروچ (بروص) پر فوج کشی کی۔ اسی زمانہ میں ایک دوسرے عرب معیرہ نے دیبل پر جو سندھ کی بندرگاہ تھی (جو ٹھٹھہ یا موجودہ کراچی کے قریب تھا) حملہ کیا۔ اس کے چند برس بعد عہد عثمانؓ میں ایک دریائی دستہ ان بندرگاہوں کی حفاظت کر کے واپس چلا گیا اور عہد علیؓ

میں ۳۹ھ سے باقاعدہ ایک عرب سردار اُن اطراف کی نگرانی کرنے لگا۔ جو ۴۲ھ میں مارا گیا۔ ۴۴ھ میں امیر معاویہؓ نے مہلب سردار کو سندھ کا نگران بنایا جو ایک مستقل عہدہ قرار پا گیا۔ ۸۶ھ میں ولید اموی جب دمشق کے شاہی تخت وتاج کا وارث بنا تو اس نے عراق، ایران، مکران و بلوچستان یعنی حکومت کے مشرقی مقبوضات کا انتظام حجاج کے سپرد کرتے ہوئے اسے اپنا نائب مقرر کیا۔

محمد بن قاسم تا بہادر شاہ ظفر

بعد ازاں جب راجہ داہر کے لٹیروں نے ایک عرب قافلہ کو لوٹ لیا تو مظلوم بچوں اور عورتوں کی چیخ و پکار پر محمد بن قاسم ۹۳ھ میں انکی مدد کیلئے سندھ پہنچا۔ اس نے تین سال کے مختصر عرصہ میں نہ صرف چھوٹے کشمیر کی سرحد ملتان سے لیکر گجھ تک قبضہ میں لے لی بلکہ اُدھر مالوہ کی سرحد تک قبضہ کر لیا اور عدل وانصاف وامن وآشتی کی حامل ایک سلطنت قائم کر دی۔ اس نے پورے سندھ میں اپنے اخلاق کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ محمد بن قاسم کی آمد سے قبل ہی برصغیر ہند میں مسلمان آ چکے تھے اور یہ خطہ اسلام کی پرنور فضاء بن رہا تھا۔ گو سلطان شہاب الدین غوری نے رائے پتھورا کا خاتمہ کر کے ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھ دی تھی، تاہم یہاں ظہورِ اسلام کی اوّلین کرنیں سلطان ناصر الدین سبکتگین کے زمانہ سے پڑنی شروع ہوئیں۔

سبکتگین ابتدا میں فرمارواے خراسان امیر نصیر سامانی کا غلام تھا۔ اس نے مصور بن نوح سے امیر الامرائی اور سپہ سالاری کے منصب پر ترقی پائی۔ بعد ازاں ابوالحق والئی بخارا کی طرف سے غزنی کا حاکم مقرر ہوا اور اسکے مرنے پر ۳۶۷ھ میں اورنگ خلافت پر جلوہ افروز ہوا۔ اس نے جہاد کی نیت سے ہندوستان پر کئی بار لشکر کشی کی۔ ان دنوں راجہ جے پال ہندوستان پر حکومت کرتا تھا۔ بٹھنڈہ اسکا پایہ تخت تھا مگر اسکے دور میں سامانہ اور پنجاب میں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی یہانتک کہ ناصر الدین سبکتگین کامیاب وکامران ہو گیا۔ اس نے ہندوستان میں اسلام کو فروغ دیا اور کئی مسجدیں بنوائیں۔

اسکے بعد اسکے چھوٹے بیٹے محمود غزنوی نے ۳۸۸ھ میں غزنی کے تخت پر جلوس کیا۔ محمود غزنوی کو اللہ تعالیٰ نے جرأت وشجاعت سے نوازا تھا اس نے بہت کم مدت میں بلخ، بخارا، سرگنج، خوارزم، ترکستان، عراق، خراسان اور نوران جیسے عظیم ممالک فتح کر لئے۔ ۳۹۱ھ میں اس کو تسخیر ہندوستان کا خیال

آیا اور سترہ حملے کئے۔ خلیفہ بغداد نے اس کی شہرت اور کارناموں پر اسے یمین الدولہ اور امین الملّت کے خطابات سے نوازا۔ اس نے ۴۲۱ھ میں وفات پائی اور تقریباً ۳۳ سال تک تخت نشین رہا۔ اسکی وفات پر اسکا بیٹا خسرو شاہ اور پھر اسکا بیٹا خسرو ملک حکومت چلاتے رہے اس طرح سبکتگین سے خسرو ملک تک سات غزنوی فرمانرواؤں نے دوسو سترہ سال تک غزنی اور پنجاب میں حکمرانی کی۔

خسرو ملک کے بعد حکومت شہاب الدین غوری کے قبضہ میں آ گئی جس کا بھائی سلطان شمس الدین المعروف غیاث الدین ''غور'' کا فرمانروا تھا۔ شہاب الدین نے بڑے بھائی کے نائب کی حیثیت سے غزنی پر لشکر کشی کی ۵۶۸ھ مطابق ۱۱۷۳ء غزنی کو فتح کر لیا اور وہیں حکومت کرنے لگا۔ پھر سلطان شہاب الدین نے ہندوستان پر آٹھ حملے کئے اور قنوج فتح کر لیا پھر غزنی واپس چلا گیا۔ اس نے بتیس سال حکمرانی کی۔ اسکے بعد اسکا غلام قطب الدین ایبک ۱۲۰۱ء لاہور پہنچا اور اس نے اپنے نام کا سکہ جاری کیا وہ پانچ سال تک ہندوستان کا حکمران رہا اس نے ۱۲۱۱ء میں چوگان کھیلتے ہوئے لاہور میں وفات پائی۔ بعد ازاں ۱۲۱۲ء میں التمش سریر آرائے سلطنت ہوا جس نے مالوہ کو تسخیر کیا اور اٹھائیس سال حکومت کی۔ اسکے بعد رکن الدین فیروز شاہ کچھ دیر تخت نشین رہا اور پھر سلطان التمش کی بیٹی رضیہ سلطانہ تخت کی وارث ہوئی جس نے ۱۲۳۶ء میں اپنے نام کا سکہ وخطبہ جاری کیا اور چار سال تک حکومت کی۔ اسکے انتقال کے بعد شمس الدین التمش کا بیٹا معز الدین بہرام شاہ فرمانروائے ہندوستان ہوا۔ پھر چنگیز خان نے لاہور اور دہلی پر حملہ کیا مگر واپس چلا گیا اور حکومت سردار علاؤ الدین مسعود شاہ کو مل گئی پھر سلطان ناصر الدین' سلطان غیاث الدین اور معز الدین کیقباد جو غوری خاندان کا گیارھواں تاجدار تھا سلطنت پر حکومت کرتا رہا۔ یوں غوریوں نے ایک سو ایک سال گیارہ ماہ تک حکومت کی۔

غوریوں کے بعد ۱۲۸۹ء میں خلجی خاندان نے ہندوستان کی سلطنت حاصل کر لی جسکا پہلا بادشاہ سلطان جلال الدین خلجی تھا۔ پھر لودھی خاندان برسر اقتدار رہا اور اسکے مختلف بادشاہ ہند پر حکومت کرتے رہے۔ ۱۵۲۶ء میں ظہیر الدین بابر نے مغلیہ دور کی بنیاد رکھی اور پھر اسکی اولاد میں ہمایوں' اکبر' جہانگیر' شاہ جہاں' اورنگزیب اور بہادر شاہ ظفر جیسے الوالعزم بادشاہ ہوئے۔ مغلیہ دور کی تاریخ دراصل ان مسلم شخصیتوں کے گرد گھومتی ہے جنہوں نے حضرت عمرؓ کے زمانہ ہی سے برصغیر میں آنے والی مسلم

شخصیات کی اقدار کا تحفظ کیا۔

ہمایوں کے عہد کے دوران کچھ عرصہ سوری خاندان نے بھی حکومت کی تاہم اورنگزیب کی رحلت کے بعد مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہو گیا اور جس وقت بہادر شاہ ظفر دہلی کا فرمانروا تھا ہندوستان میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ برصغیر کے تخت و تاج پر قبضہ کرنے کیلئے انگریز، سکھ اور دوسری غیر مسلم طاقتیں تاک میں تھیں۔ انگریز اس وقت برصغیر میں داخل ہو چکے تھے اور ہر سنہری موقع سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ ایک طرف مغل حکمران اپنی بے بسی پر آنسو بہا رہے تھے تو دوسری طرف انگریز پلاسی اور سرنگا پٹم کی فتوحات کے نشہ میں مست تھے۔ سیاست ہند کی بساط ہی پلٹ چکی تھی۔ پھر وہ بے رحم وقت بھی آیا جب مسلمان فرمانرواؤں کو دہلی کے لال قلعہ سے بھی محروم ہونا پڑا۔ انکی غفلت کوشی اور عیش پسندی نے انہیں قعر مذلت میں دھکیل دیا۔ ''ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات''

جب قرآن نے مچھر کی مثال دی تو مشرکین نے تعجب کا اظہار کیا کہ جس خدا کی بڑائی اور اِس قدر شان بیانی کی جاتی ہے وہ ایسی معمولی مثالیں کیوں بیان کرتا ہے۔ غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ معمولی مکھیوں اور مچھروں سے انسان جیسی مدبر اور ذی عقل مخلوق کا مغلوب و زچ ہو جانا بھی قدرت کا ایک عظیم کرشمہ ہے اور عیش کوشوں کیلئے سبق ہے کہ جب اقوام عیش و عشرت کا شکار ہو کر اپنے دفاع کے لائق نہیں رہتیں تو مغلوب و معتوب ہو جایا کرتی ہیں۔ رات ہوتے ہی مچھر جیسا حقیر کیڑا تمام مخلوق کا ناک میں دم کر دیتا ہے، تمام بستیوں پر اسکی گویا حکومت ہوتی ہے بادشاہ تک اس سے عاجز آ جاتے اور اس سے بچنے کیلئے مچھر دانیوں، جالیوں یا زہریلی دوائیوں کے استعمال پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

کیونکہ اسکے پاس طاقت کا اوزار اسکا زہریلا پمپ ہے اور دنیا کی حاکم ایسی ہی اقوام ہوا کرتی ہیں جن کے پاس اپنوں کی حفاظت کیلئے تریاق اور اعداً کیلئے زہر ہلاہل موجود ہو۔ کئی سو سال حکومت کرنے والے بادشاہ بھی جب اپنے دفاع کو مضبوط تر کرنے کی بجائے شعر و نغمہ اور رقص و سرود میں کھو گئے تو مکافات عمل نے انکو بھی ذلت و رسوائی میں مبتلا کر کے کسی تاریک اور داغدار ماضی کا حصہ بنا ڈالا۔

بابلی تہذیب

تہذیب بابل کے بارے مختصراً کچھ عرض کرنا ضروری ہے کہ بنوکدنصر سے قبل بابل کا شہرہ دور دور ممالک تک پھیلا ہوا تھا۔ اسکا حرفِ آغاز حمورابی تھا اور نقطہ عروج بخت نصر۔ اس میں شبہ نہیں کہ بابل کلدانیوں کے اقتدار سے قبل بھی مرجع خاص و عام تھا اور اسکی عظمت کا سکہ دور دور تک چلتا تھا لیکن اس شہر بے مثال کو ممالک کی ملکہ بخت نصر ہی نے بنایا۔ بخت نصر کے دور میں بابل کی آبادی اڑھائی لاکھ سے زیادہ تھی اور وہ دنیا کا سب سے بڑا اور سب سے پُر شکوہ شہر خیال کیا جاتا تھا۔ علم وحکمت میں بھی بابل کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی تھی اور حساب، الجبرا، طب، کیمیا اور انجم شناسی کے ہنر میں بابل کے صاحبانِ کمال اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔

وادیٔ دجلہ وفرات (موجودہ عراق) کا قدیم معاشرہ اور اسکے رسوم ورواج مدت ہوئی ختم ہو گئے، بابل کے محلات ومعابد مٹ سکنے والی چیزیں تھیں سو مٹ گئیں، لیکن علم فنا نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہ بابل ہی کی شمع علم تھی جس سے یونانی دانش کدوں کے چراغ روشن ہوئے۔ افسوس ہے کہ کلدانیوں کی فسوں طرازی اور غیب دانی کی شہرت نے صدیوں تک انکی علمی خدمات پر پردہ ڈالے رکھا اور دنیا یہی سمجھتی رہی کہ علم وتہذیب کا آفتاب سب سے پہلے یونان کے افق سے اُبھرا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یونانیوں کی سائنس، طب، مذہب، فلسفہ وغیرہ، بابل ہی کے چشمۂ فیض سے اکتساب ہے۔

اسکے یہ معنی ہرگز نہیں کہ بابلی معاشرہ توہم پرستی سے آزاد تھا یا اہل بابل کی معیشت کی بنیاد سائنسی بنیادوں پر تھی یا وہ ہوائی جہاز اور ایٹم بم بنانے کے فن سے آشنا تھے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ توہم پرستیوں کے باوجود دجلہ وفرات کے دانشوروں میں ایک سائنسی انداز ضرور موجود تھا۔

یہ درست ہے کہ وادیٔ دجلہ وفرات کے کاریگر خواہ سنار ہوں یا دستکار، معمار ہوں یا پارچہ باف یا پھر سنگ تراش، وہ اشیاء کا فقط تجرباتی علم رکھتے تھے۔ اشور بنی پال کے کتب خانے اور نیفر اشور، بابل اور اِریک کی کھدائیوں سے بکثرت ایسی لوحیں ملی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس خطہ کے پڑھے لکھے لوگوں نے (جو اگرچہ تعداد میں بہت کم تھے) اپنے تجربوں کی بناء پر چند سائنسی اصول وضع کر لئے تھے اور بعض علوم تو ایسے ہیں جن کی ایجاد کا سہرا انہی قدیم دانشوروں کے سر ہے۔ ان میں سب سے اہم حساب کا فن

تھا جسکے بغیر ہیئت و نجوم' کیمیا' طب اور دوسرے علوم کی تدوین ناممکن تھی۔

سومیر اور عکاد کے پروہت اپنے مندروں کی آمدنی اور خرچ کا باقاعدہ حساب رکھتے تھے۔ ابتداء میں تو انہوں نے اشیاء کی تصویروں سے ہندسوں کا کام لیا لیکن رفتہ رفتہ ہندسوں کی مجرد علامتیں وضع کر لی گئیں۔ البتہ انکی ترسیم اعداد (سو کی بجائے) ساٹھ پر ختم ہو جاتی تھی۔ ساٹھ کا یہی ہندسہ وزن اور پیمائش میں بھی استعمال ہوتا تھا اور وقت کو بھی ساٹھ ہی وحدتوں میں تقسیم کر لیا تھا اور آج تک ہم بھی گھنٹوں کیلئے منٹوں اور سیکنڈوں کو ساٹھ پر تقسیم کرتے آرہے ہیں۔

نیفر اور دوسرے مقامات ۱۸ ویں صدی ق م کی جو لوحیں ملی ہیں انکی تعداد قریباً تین سو کے قریب ہے ان میں سے یک صد الواح پر حساب کے مختلف مسائل اور انکے حل لکھے ہوئے ہیں اور دو صد الواح پر حساب کے مختلف جدول بنے ہیں' البتہ ان لوحوں پر صفر کی کوئی علامت نہیں ملتی۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل بابل کم از کم ۱۸ ویں صدی ق م تک صفر کے استعمال سے ناواقف تھے۔ تاہم انہوں نے قمری کیلنڈر ایجاد کر لیا تھا اور یہ زراعت پیشہ لوگوں کیلئے موسم کی تبدیلیوں سے آگاہی کیلئے ضروری بھی تھا۔

انکے زرعی مشاغل موسم کی تبدیلیوں کے پابند ہوتے ہیں۔ گرمی سردی بارش وسیلاب' بہار و خزاں کی آمد و رفت اور دِنوں کا چھوٹا بڑا ہونا وہ تغیرات ہیں جن پر زراعت کا بہت انحصار ہے۔ نیز بابلی تہذیب میں دیگر اقوام ماضی کی طرح فصلی تہواروں کا منانا بھی مذہبی فرائض میں داخل تھا' چنانچہ پروہت ان موسمی تبدیلیوں اور تیوہار کا باقاعدہ حساب رکھتے تھے۔ تحریر کی ایجاد کے بعد ان کا حساب لوحوں پر لکھا جانے لگا اس طرح کیلنڈر اور جنتری کی ایجاد ہوئی۔

اہل بابل کا عقیدۂ تخلیق

افلاطون بیان کرتا ہے کہ ایک مرتبہ ہم نے اپنے استاد سقراط کی موجودگی میں اٹلی کے مشہور فلسفی' علم نجوم اور کائنات کی ماہیت کے محقق حکیم تماؤس (جو فیثا غورث کا شاگرد تھا) سے درخواست کی کہ اے حکیم ہم کو کائنات کے رازہائے سربستہ سے آگاہ کر اور بتا کہ سورج' چاند' زمین و آسمان اور حیوان

کب اور کیسے ظہور میں آئے۔ کیا موجوداتِ عالم خود بخود عدم سے وجود میں آ گئیں یا کسی نے انکو خلق کیا۔ تماؤس نے اس موضوع پر بات شروع کی تو کئی گھنٹے تک بولتا رہا۔ ہم لوگ تو خیر مبتدی تھے سقراط جیسا منطقی بھی تماؤس کی دلیلوں سے بہت متاثر نظر آ رہا تھا۔ میں نے گھر واپس آ کر تماؤس کی تمام باتوں کو قلم بند کر لیا۔ افلاطون کی تصنیف ''تماؤس'' کو اڑھائی ہزار برس گزر چکے ہیں لیکن ابتدائے آفرینش کا مسئلہ ہنوز تحقیق طلب ہے۔ اہل خرد ابھی تک اصل حقیقت کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ مذہبی صحائف نے تخلیق کائنات کا قصہ بڑے وثوق اور اعتماد سے بیان کیا ہے' مگر لگتا ہے کہ شکی مزاج انسان کی تشفی نہیں ہوئی۔ اسے اب تک یہی محسوس ہوتا ہے کتابِ ہستی کا پہلا ورق ہنوز اسکی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

البتہ جب سائنس کو فروغ ملا اور خوردبینیں ایجاد ہوئیں' انسان نے ذرّے کا جگر چیر کر ایٹم کا راز معلوم کیا اور تحقیق و تجربے کی نگاہوں نے مادّے کی حرکت و تغیر کے قانون دریافت کر لئے تو فلسفیانہ قیاس آرائیوں کی گنجائش باقی نہ رہی۔ تاہم تکوین کائنات کے مروجہ عقیدوں میں (جزئیات سے قطع نظر) تخلیق کائنات کے بارے عقیدہ مشترک ہے۔ چنانچہ ہندوؤں' مسلمانوں' پارسیوں' یہودیوں اور نصرانیوں وغیرہ سب میں اتفاق ہے کہ کائنات کو کسی طاقت نے خلق فرمایا ہے اور یہ از خود عدم سے وجود میں نہیں آ گئی۔ اہل بابل کے علاوہ وادیٔ سندھ' مصر' اناطولیہ' یونان' شام' فلسطین اور پرانی ایرانی اقوام بھی تخلیق کی قائل تھیں لیکن انکے نزدیک تخلیق ایک مسلسل عمل تھا جو ہر سال بہار میں شروع ہوتا اور موسم سرما کے آغاز تک جاری رہتا ہے۔ تب کائنات پر تخریب اور موت کی طاقتیں غالب آ کر مُردنی پھیلا دیتی ہیں اور پھل پھول پتے سبزہ و اناج کے پودے مرجھا جاتے ہیں۔ پھر جب بہار کا موسم آتا تو یہ لوگ خوشی سے ناچتے گاتے اور میلے و تہوار مناتے۔ مگر قدیم انسان تخلیق اور تخریب کے ازلی پیکار کا محض تماشائی نہیں تھا بلکہ تخریب کے خلاف تن من سے شریک ہوتا تھا وہ اپنے ناچ گانوں' رہسوں لیلاؤں' جادو منتروں اور بھجنوں کے ذریعے تخلیق کی طاقتوں کی حمایت حاصل کرنے اور تخریب کی طاقتوں کو شکست دینے کی تدابیر اختیار کرتا رہتا تھا۔

کنعان (سرزمین انبیاء)

کنعان تین سو میل لمبی ایک پتلی سی ساحلی پٹی تھی جو شمال میں انطاکیہ سے شروع ہو کر جنوب میں غازہ پر ختم ہو جاتی تھی۔ یہ ایک مردم خیز خطہ ہے جو عراق اور مصر کے درمیان واقع تھا۔ آج کل یہ خطہ شام (سیریا)' لبنان' اُردن اور اسرائیل (فلسطین) کی ریاستوں میں منقسم ہے۔ البتہ پرانے زمانہ میں اس پورے علاقے کو کنعان کہتے تھے۔ اسکے مغرب میں بحر رُوم تھا اور مشرق میں بحر مردار اور دریائے اُردن' جو کنعان کو عرب کے ریگستان سے جدا کرتے تھے۔ ساحل سے کچھ ہٹ کر پہاڑوں کا ایک سلسلہ بھی شمال سے جنوب تک چلا گیا تھا۔ اُردن اور دوسرے دریا انہی پہاڑوں سے نکلتے ہیں۔ عہد قدیم میں کنعان کے تین حصے تھے۔ شمالی حصہ جو آجکل شام کہلاتا ہے ''یوگارت'' تہذیب کا مرکز تھا۔ اس تہذیب کے آثار بندرگاہِ لتاکیہ کے قریب راس شمراء کی مشہور کھدائیوں میں ملے ہیں۔ وہاں بہت سی الواح بھی برآمد ہوئی ہیں جن سے وہاں کے لوگوں کے عقائد اور رسوم و رواج کا پتہ چلتا ہے۔ یہ تہذیب ۱۵۰۰ ق م میں بھی زندہ تھی۔

وسطی حصہ فونیقیا (لبنان) کنعان کا سب سے سرسبز و شاداب علاقہ تھا۔ وہاں پہاڑی ندی نالوں اور چشموں کی فراوانی تھی زیتون' انگور اور انجیر وہاں کے خاص پھل تھے۔ فونیقیا کے باشندے جہاز رانی کیلئے مشہور تھے اور بحر روم کی ساری تجارت پر انکی اجارہ داری تھی۔ انکی نوآبادیاں یورپ اور افریقہ کے ساحلوں پر دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ الجبل (ببلوس) سعیدہ (سرون) سور (ٹائر) اور طرابلس الشرق کنعان کے اہم شہر تھے۔ الجبل بحر روم کے مشرقی ساحل کی سب سے بڑی بندرگاہ سمجھی جاتی تھی۔ فونیقیا (لبنان) کے جنوب میں فلسطین تھا جو تین حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ شمالی حصہ گلیلی کہلاتا تھا جس کے بارے انجیل کی کتابِ استثناء میں لکھا ہے کہ '' پانی کی ندیوں اور ایسے چشموں کا ملک ہے جو وادیوں اور پہاڑوں سے پھوٹ کر نکلتے ہیں۔ وہ ایسا ملک ہے جہاں گیہوں، جو، انگور اور انجیر اور انار کے درخت ہوتے ہیں۔ جہاں روغن دار زیتون اور شہد بھی ہے''۔ (باب ۸/)

گلیلی کے جنوب میں سامریہ (اسرائیل) تھا اور سامریہ کے جنوب میں یہوداہ کا علاقہ تھا جو فلسطین کا سب سے مقدس خطہ تھا۔ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ نے اپنی بادشاہتیں یہیں قائم کیں اور

یروشلم (بیت المقدس) کو اپنا دارالسلطنت بنایا تھا۔ کنعان دراصل نبیوں اور رسولوں کی سرزمین ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شہر ''اُر'' سے ہجرت کر کے کنعان ہی میں حیران (قریۃ العرب) کے مقام پر سکونت اختیار کی تھی اور یہیں حضرت یعقوبؑ نے یوسفؑ کی فرقت کا داغ اٹھایا تھا۔ یہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدائے واحد کی شریعت کا پیغام سنایا تھا اور حضرت دانیالؑ اسیر ہو کر بابل گئے تھے۔ یہیں حضرت ایوبؑ کے صبر کا امتحان لیا گیا اور حضرت مسیح علیہ السلام نے قم باذن اللہ کی آواز بلند فرما کر مُردوں کو زندہ فرمایا تھا اور یہیں (عیسائی عقیدہ کے مطابق) مصلوب ہو کر جی اٹھے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی تجارتی قافلوں کے ہمراہ اکثر کنعان تشریف لاتے لیجاتے رہے۔ مسلمانوں کا قبلۂ اوّل بھی اسی خطہ میں ہے۔ اسی بناء پر دنیا کے تین بڑے مذاہب (یہودیت' نصرانیت اور اسلام) اس سرزمین کو آج تک (اور غالباً آئندہ بھی) عزیز رکھتے ہیں۔

کنعانی فرسودہ عقائد اور رسوم ورواجات

نہ صرف کنعان ہی میں بلکہ سابقہ بہت سی اقوام میں نہایت عجیب وغریب رسوم ورواج عام تھے۔ اپنے تہواروں میں انکے بہت سے دیوی دیوتا (جنکا ذکر آگے آئیگا) انکی لوک کہانیوں گیتوں اور تماثیل میں سموئے ہوئے نظر آتے ہیں جس سے انکے عقائد کی نشاندہی ہوتی ہے۔

موسوی شریعت کے نفاذ سے پہلے دورِ جہالت میں کنعان کا سب سے بڑا دیوتا ''بعل'' تھا۔ یہ وہی بعل ہے جسکے بارے قرآن کہتا ہے:۔ اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّ تَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِیْنَ (۱۲۵) (سورۃ:الصّٰفّٰت) ترجمہ: کیا تم بعل کو پکارتے ہو اور سب سے بہترین خالق کو چھوڑتے ہو۔ (الصّٰفّٰت:۱۲۵) بعل کے ایک معنی آقا و مالک کے بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ بعل پورے کنعان میں افزائش فصل وزرخیزی اور بارش کا دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ یہ کسی خاص قوم یا علاقہ کے دیوتا کا نام نہیں بلکہ ہر علاقے کا اپنا اپنا الگ بعل ہوتا تھا۔

کنعانی عقیدے اور معاشرے میں بعل کو وہی حیثیت حاصل تھی جو عراق میں مرڈک اور مصر میں ازریس اور حوریس کو حاصل تھی۔ بعل کا سالانہ تہوار بھی عراق کے جشن نوروز کی مانند اپریل میں موسم بہار کی آمد پر منایا جاتا تھا۔ اس موقع پر دوسری رسموں کے علاوہ بعل کی زندگی' موت اور جی اٹھنے کی

داستانِ رزمیہ تمثیل کی شکل میں پیش کی جاتی تھیں۔ جس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ بعل کی پرستش کا رواج عرب میں بھی موجود تھا اور اہل عرب بھی بعل کو افزائش فصل کا دیوتا مانتے تھے۔ بعل' عرفِ عام میں اس اراضی کو کہتے ہیں جسکو بارش یا مصنوعی آبپاشی کی ضرورت نہ ہو اور وہ چشموں سے سیراب ہوتی اور سب سے اچھی کھجور کی فصل دیتی ہو۔

راس شمرا کی کھدائی میں جو الواح برآمد ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کنعان کا سب سے قدیم دیوتا ''ایل'' تھا' اسے ابوالایل بھی کہتے تھے۔ (حتی تاریخ عرب ص ۹۷) یہ نام دراصل اللہ تعالیٰ ہی کا نام ہے جو اِلٰہ سے مشتق ہے اور بابِ ایل (بابل) اسماع ایل (اسماعیل) ہابیل' قابیل' جبرائیل' میکائیل' اسرافیل' عزرائیل وغیرہ میں یہی ایل استعمال ہوا ہے۔

بعل سے پہلے تخلیق اور افزائش کی رسموں کے موقع پر جو ڈرامہ کھیلا جاتا تھا' راس شمرا' کی کھدائی سے برآمد ہونے والی لوحوں پر اسکی جو تمثیل کندہ ملی ہے۔ اس میں ڈرامے کا مقام اور کرداروں کے نام' اسٹیج کیلئے ھدایات اور مختلف مناظر کی تفصیلات درج ہیں۔ نیز بادشاہ' ملکہ اور امراء وعمائدین شہر کے موجود ہونے کا ذکر بھی ہے۔ جشن نوروز کے ڈرامے کا آغاز اس اعلان سے ہوتا ہے کہ اب افزائش کے ساتوں شفیق اور مہربان دیوتاؤں کی آمد ہے اور جن کا آقا ''ایل'' ہے۔ انہی کی عنایت سے سات سال تک اناج کی فراوانی رہے گی لہٰذا جی بھر کے کھاؤ اور ہر طرح کی شرابِ انگور پیو۔ (یہ خیال بھی غالباً والی مصر کے خواب کی بتائی گئی' حضرت یوسفؑ کی تعبیر سے لیا گیا)۔ چونکہ موت اور بدی کی قوتیں ہمیشہ گھات میں لگی رہتی ہیں چنانچہ دیوتا کھانے پینے اور خوشیاں منانے میں مصروف ہیں کہ موت نمودار ہوتی ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں بیوگی کا نشان ہے اور دوسرے میں سوگ کا عصاء ہے۔ دیوتا موت سے نبرد آزما ہوتے ہیں اور موت کے ٹکڑے کر ڈالتے ہیں۔

پھر دوسرا منظر شروع ہوتا ہے: آگ سے دو لڑکیاں نمودار ہوتی ہیں۔ ایل اگرچہ بوڑھا ہو چکا ہے' تاہم ان سے مباشرت کے نتیجہ میں ایل سے انکے ہاں اولاد پیدا ہوتی ہے۔ وہ دونوں دوٗ دیوتاؤں سحر اور شام (صبح وشام) کو جنم دیتی ہیں۔ سحر اور شام افزائش فصل کے دیوتا نہ تھے اسکے باوجود کنعانیوں نے ان کو افزائش کے دوسرے دیوتاؤں پر فوقیت دی۔ ڈرامہ یہیں ختم نہیں ہوجاتا بلکہ

بوڑھا ایل ان عورتوں سے دوبارہ مباشرت کرتا ہے اور اب انکے بطنوں سے سات دیوپیکر (سات دن) پیدا ہوتے ہیں۔ جن کا ایک ہونٹ زمین پر ہے اور دوسرا آسمان پر۔ انکے منہ میں پرندے اڑتے ہیں اور مچھلیاں تیرتی ہیں۔

''اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ پیغمبران کی تعلیمات کے باوجود احسن الخالقین کی ذات وصفات کو سمجھنے سے قاصر اور اسکو محض انسانی عادات وصفات پر قیاس کرتے تھے''۔ (مؤلف)

راس شمرا کی کھدائی میں جو لوحیں ملی ہیں ان سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ تاریخ کے کس دور میں ایل کی جگہ بعل نے لے لی۔ جیسے وادیٔ دجلہ اور فرات میں انو کو مرڈک کے حق میں خدائی سے دستبردار ہونا پڑا تھا اسی طرح کنعان میں ایل کو بعل کے لئے جگہ خالی کرنی پڑی ہوگی۔ البتہ کنعانی دیومالا کے مطابق ایل کی بیوی کا نام عاشطرہ (سومیری میں عشتار) تھا۔ عاشطرہ کے بطن سے ایل کی تین اولادیں ہوئیں بعل، موت اور اِناث۔ موت ایل کا چہیتا بیٹا تھا۔ ایل اور موت دونوں بعل سے سخت نفرت کرتے تھے البتہ اناث اپنے بھائی بعل کو بہت چاہتی تھی چنانچہ اس نے بعل سے شادی کر لی۔ (ممکن ہے یہ محض تمثیلی بات ہو یا اس دور میں ایسا مروج ہو)۔ (مؤلف)

بعل کو اپنی عظمت اور بزرگی منوانے کیلئے افسانوی سورماؤں کی مانند مہمات بھی سر کرنا پڑیں۔ اس کا پہلا مقابلہ ''یم'' سے ہوا جو سمندر کا دیوتا تھا۔ بعل اور یم کے معرکے اس رزمیہ تمثیل میں موجود ہیں جو جشن نوروز کے موقع پر کنعان میں کھیلی جاتی تھی۔ اس تمثیل کی ابتدا دیوتاؤں کی ضیافت سے یوں ہوتی ہے کہ ایل اپنے شاہی تخت پر بیٹھا ہے اور دیوتا اسکے گرد جمع ہیں، کہ یم کے ایلچی دربار میں حاضر ہوتے ہیں۔ دیوتا ایلچی کو دیکھتے ہی بھانپ جاتے ہیں کہ وہ کس ارادے سے آئے ہیں۔ دیوتاؤں نے جونہی ایلچیوں کو دیکھا، انہوں نے اپنے سر گھٹنوں پر رکھ لئے۔ یہاں تک کہ تخت پر بیٹھنے والے نے بھی۔ لیکن بعل نے انہیں ڈانٹا کہ تم نے اپنے سر گھٹنوں پر کیوں رکھ لئے وہ کہتے ہیں، یم کے ایلچی جو لوحیں لیکر آئے ہیں پہلے وہ پڑھ لو۔ بعل کہتا ہے دیوتاؤ: اپنے سر اُوپر کرلو یم کے ایلچیوں کو میں جواب دوں گا۔ بعل کی للکار کام آتی ہے اور دیوتا اپنے سر اوپر اٹھا لیتے ہیں۔

اگلے سین میں دکھایا گیا کہ یم کے ایلچی بڑے گستاخ ہیں وہ ایل کو نہ سلام کرتے ہیں نہ سجدہ۔ بلکہ ایل سے مطالبہ کرتے ہیں کہ تمہارا آقا ''یم'' تم کو حکم دیتا ہے کہ بعل اور اسکے ساتھیوں کو گرفتار کر کے ہمارے حوالے کردو جن کو تم نے پناہ دی ہے' تا کہ ہم اسکے طلائی خزانے کے وارث بن جائیں۔ دربار میں سناٹا چھا جاتا ہے کسی دیوتا کی ہمت نہیں ہوتی کہ منہ سے کچھ بول سکے۔ تب ایل کہتا ہے اویم' بعل تیرا غلام ہے۔ بعل ہمیشہ کیلئے تیرا غلام ہے وہ دیوتاؤں کی مانند تیری خدمت میں خراج لے کر حاضر ہوگا۔ وہ پاک بیٹوں کی مانند تیرے حضور نذرانہ پیش کریگا۔

بعل اپنے بوڑھے باپ کی بزدلی پر آگ بگولا ہو جاتا ہے اور تلوار لیکر ایلچیوں پر جھپٹتا ہے۔ مگر اسکی بیوی اناث اور اسکی ماں عشطرہ اس کا ہاتھ پکڑ لیتی اور سمجھاتی ہے کہ قاصدوں پر حملہ کرنا بری بات ہے۔ تاہم بعل ایلچیوں کے ساتھ جانے سے انکار کر دیتا ہے اور فریقین میں لڑائی کی تیاریاں ہونے لگتی ہیں۔ کوثر نامی ایک مصری صناع بعل کو دو عدد نہایت وزنی گرز بنا کر دیتا اور پیش گوئی کرتا ہے کہ تو اپنے دشمنوں کو ہلاک کریگا اور تجھے ابدی بادشاہت نصیب ہوگی۔ بالآخر بعل اور یم (سمندر کے دیوتا) کا مقابلہ ہوتا ہے اور بعل اپنے دشمن پر فتح پاتا ہے۔ جس کو یوں دکھایا گیا ہے کہ بعل کا گرز یم کی جانب اس طرح لپکا جس طرح باز شکار پر جھپٹتا ہے۔ اس نے یم کے ماتھے پر اسکی دونوں آنکھوں کے درمیانی حصے پر ضرب لگائی اور سمندر زمین کے قدموں پر گر پڑا۔

سمندر کو زیر کرنے کے بعد بعل دریائی اژدھے (لوتان) اور جنگل کے خونخوار درندوں کی طرف متوجہ ہوا' اس مہم میں اناث بھی برابر شریک رہی اور بعل کے دشمنوں کو چن چن کر ہلاک کرتی رہی۔ مگر بعل کا سب سے بڑا حریف اس کا بھائی موت تھا اور وہ اتنا طاقتور تھا کہ خود بعل بھی اس سے ڈرتا تھا۔ ایک روز بعل اپنے نئے محل میں بیٹھا عیش وعشرت میں مصروف تھا' موت کا پیغام پہنچا کہ ''تم اپنی بادشاہت میرے سپرد کردو' کیونکہ میں وہ ہوں جو دیوتاؤں پر حکومت کرتا ہوں۔ انسان اور دیوتا سب میرے تابع ہیں' میں زمین کی ہر چیز پر حاوی ہوں''۔ بعل بہت پریشان ہوا کیونکہ وہ موت سے لڑنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے اپنے دو قاصد موت کے پاس بھیجے جو ظلمات (مرنے کے بعد ارواح کے جمع ہونے کی جگہ) میں رہتا تھا۔ قاصدوں نے موت کے سامنے حاضر ہو کر کہا'' ہمارا آقا بعل جو عظیم سپاہی

ہے جو بادلوں پر سواری کرتا ہے' تجھے سلام بھیجتا اور کہتا ہے کہ میں تیرا غلام ہوں تیرا ابدی غلام۔

موت بعل کے بے چون و چرا مطیع ہونے پر بہت خوش ہوتا ہے۔ موت کی اطاعت خود موت ہے' چنانچہ دونوں قاصد ایل کے پاس جاتے اور اسے بعل کے مرنے کی خبر سناتے اور بتاتے ہیں کہ بعل کے مرنے سے ساری دنیا خشک بے آب و گیاہ بنجر ہوگئی ہے۔ گو ایل بعل کو پسند نہیں کرتا مگر وہ کائنات کی تباہی بھی نہیں دیکھ سکتا۔ وہ اپنے تخت سے نیچے اتر کر پا انداز زمین پر بیٹھ جاتا اور اپنے سر پر سوگ کی راکھ ڈالتا ہے اور اپنے بالوں میں دھول بھرتا ہے۔

جب اناث کو اپنے شوہر کے مرنے کی خبر ملتی ہے تو وہ بعل کی لاش ڈھونڈنے نکلتی ہے۔ جب شمس دیوی کی مدد سے (یعنی دن کی روشنی میں) اسے بعل کی لاش مل جاتی ہے تو اپنے گھر لاتی ہے اور بڑی شان و شوکت سے دفن کر دیتی ہے۔ مگر اسے یہ خلش برابر ستاتی رہتی ہے کہ آخر میرے شوہر کو کس نے مارا۔ ایک دن اسکی مڈبھیڑ موت سے ہوتی ہے اور جب موت بتاتا ہے کہ میں نے بعل کو ہلاک کیا ہے تو وہ آگ بگولہ ہو جاتی ہے اور وہ موت دیوتا کو پکڑ لیتی اور تلوار سے اسکا سر قلم کر دیتی ہے۔ پنکھے سے اسے پھٹکتی ہے' چکی میں گاہتی ہے اور پھر کھیت میں بو دیتی ہے۔ گویا موت کوئی اناج ہے۔

بظاہر داستان میں یہ تضاد ہے کیونکہ افزائش فصل کا دیوتا تو ''بعل'' تھا اور یہ سارے زرعی عمل اسکے ساتھ ہونے چاہئیں۔ لیکن چونکہ موت نے بعل کو ہضم کر لیا ہے لہٰذا اب وہ بعل کا نمائندہ بھی ہے۔ موت کے کھیت میں بونے کے معنی یہ ہوئے کہ اب ''بعل'' کے جی اٹھنے کا وقت قریب آ گیا ہے چنانچہ اس رزمیہ داستان (ڈرامے) میں ایل' ایک روز خواب دیکھتا ہے کہ بعل زندہ ہے۔ جسکی تحریر یوں ہے:

> ''خدائے رحیم اور خالق کائنات نے خواب دیکھا کہ آسمان سے تیل کی بارش ہو رہی ہے اور وادیوں میں شہد کی نہریں بہہ رہی ہیں اور خدائے رحیم خوش ہو کر پہلے پا انداز' پھر تخت پر بیٹھا اور اس نے ہنس کر کہا اب مجھ کو آرام کرنے دو کیونکہ بعل زندہ ہے۔ زمین کا آقا بعل زندہ ہے''۔

تب شمس دیوی دوبارہ بعل کی تلاش میں نکلتی ہے۔ وہ بعل کو پا لیتی ہے مگر اس حال میں کہ بعل نے موت کو زمین پر گرا دیا ہے (یعنی بہار کی آمد آمد ہے) لیکن موت کو کوئی ہلاک نہیں کر سکتا۔ موت بھی مضبوط ہے اور

بعل بھی مضبوط ہے۔ وہ جنگلی سانڈوں کی مانند ایک دوسرے کو زخمی کرتے ہیں۔ سانپوں کی مانند ایک دوسرے کو ڈستے اور دوڑنے والوں کی مانند ایک دوسرے کو ٹھوکریں مارتے ہیں۔ شمس دیوی بیچ بچاؤ کراتی اور موت کو خداوند ایل کے قہر وغضب سے ڈراتی ہے۔ موت ڈر کر چلا جاتا ہے اور بعل دوبارہ زندہ سلامت کنعان واپس آجاتا ہے۔ (ڈرامہ ختم)

کنعان کے ان ناٹکوں میں رمزیات یہ تھیں کہ اہل کنعان کی نظر میں بعل تخلیق اور افزائش کا پیکر تھا۔ اسکے برعکس یم (سمندر) اور موت تخریب کے پیکر تھے سمندری طوفان لہلہاتے کھیتوں اور میوہ دار درختوں کو برباد کر دیتے تھے اور جہاز رانوں کی اس قوم کو دن رات سمندر کی خوفناک موجوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا تھا۔ انہی اسباب کی بناء پر اہل کنعان سمندر کو اپنا دشمن خیال کرتے تھے۔ رہی موت تو سو وہ ایسی حقیقت تھی جس سے کسی کو انکار اور مفر ہی نہیں۔ لہٰذا بعل اور موت کی جنگ مرگ اور تیامت کی جنگ کی مانند گویا تخلیق اور تخریب کی قوتوں کی جنگ تھی۔

ہر سال خزاں کے موسم میں موت زندگی پر (بعل پر) غالب آجاتی تھی مگر ہر سال موسم بہار کی آمد پر بعل دوبارہ زندہ ہو جاتا تھا۔ یوں بعل کا زندہ ہو جانا' آمدِ بہار کی علامت بن گیا تھا۔ تخلیق اور تخریب کا یہ تصادم گویا ابدی تھا۔

تیسری صدی قبل مسیح میں جب سکندرِ اعظم کے جانشینوں نے مشرقِ قریب پر اپنا تسلط جمایا تو ان علاقوں میں یونان کے فصلی تہواروں نے فروغ پایا۔ یونانیوں کا (افزائش فصل کا) دیوتا دایونیسس تھا۔ جن لوگوں نے یونانی شاعر ہیسیڈ کا تخلیق نامہ پڑھا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ کوہِ اولمپس کے بڑے دیوتا ''زیوس'' کی داستان دراصل بابل کے زمزمۂ تخلیق ہی کا چربہ ہے اور اسکا مقصد بھی وہی تھا جو زمزمۂ بابل کا تھا۔ اسلئے انہیں ''دایونیسس'' کو ازریس' بعل اور تموز سے ہم آہنگ کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔

یونانیوں کے بعد جب پہلی صدی ق م میں جو علاقے رومۃ الکبریٰ کی سلطنت میں شامل ہوئے اور جب وہاں رومن نوآبادیاں قائم ہونے لگیں تو کنعان میں رومیوں کے تہوار بھی بڑی شان و شوکت سے منائے جانے لگے۔ رومیوں کا (افزائش فصل کا) دیوتا باخوس تھا اس کا تہوار بھی بعل کی مانند

موسم بہار ہی میں پڑتا تھا اسلئے اہل کنعان کو رومیوں کے تہواروں کو اپنانے میں کوئی جذباتی الجھن پیش نہیں آئی۔ بعلبک (لبنان) میں باخوس اور زہرہ وغیرہ کے عالیشان معبد خانوں کے کھنڈرات اب بھی موجود ہیں۔

البتہ ۳۳۰ء میں جب شہنشاہ ''قسطنطین'' نے عیسائی مذہب قبول کر کے قسطنطنیہ کو اپنا دارالسلطنت بنایا تو مقامی اور رومن سبھی دیوتا زیر عتاب آ گئے اور انکے بت (بمعہ معبد خانوں کے) مسمار کر دیئے گئے۔ ۳۷۸ء میں شہنشاہ تھیوڈوسیس نے فطرت پرستی قانوناً ممنوع قرار دیدی۔ اسکے قریباً تین سال بعد فطرت پرستوں کے تیوہار بھی بند کر دیئے گئے اور ان رسوم میں شرکت جرم قرار پا گئی۔ ۴۳۸ء میں یہ اعلان ہو گیا کہ اگر کوئی شخص کسی بت کی پرستش کرتا یا کسی مندر میں چڑھاوا پیش کرتا پایا گیا تو اسے دس سیر سونا بطور جرمانہ ادا کرنا ہوگا وگرنہ اسکی تمام جائیداد ضبط کر لی جائیگی۔

عیسائیوں کا سب سے بڑا تہوار ایسٹر تھا۔ ایسٹر کے ہفتہ میں حضرت مسیح علیہ السلام کے مصلوب ہونے پر سوگ اور انکے دوبارہ جی اٹھنے پر شادمانی کی رسمیں منائی جاتی تھیں۔ جو فطرت پرست بہار میں اپنے تہوار مناتے تھے وہ ان میں شامل ہو گئے۔ یہ رسمیں دراصل بعل اور اِزریس کی موت اور حیاتِ ثانیہ کی رسمیں تھیں، تین چار نسلوں کے بعد کسی کو یاد بھی نہ رہا کہ ایسٹر کا تہوار تو درحقیقت بعل اور اِزریس کے تہواروں کی نقل ہے۔ البتہ توریت اور انجیل میں تخلیق کی جو داستانیں بیان کی گئی ہیں وہ بابل، کنعان اور مصر کی قدیم داستانوں کا ماخذ دکھائی دیتی ہیں۔

اب سے قریباً سوا تین ہزار سال قبل دنیا کی دو بڑی قوموں آریہ اور بنی اسرائیل کو تلاشِ معاش کیلئے اپنا آبائی وطن ترک کرنا پڑا۔ ''آریہ قبیلے'' وسطی ایشیا کی چراگاہوں سے نکلے اور بلقان، ترکی، ایران اور دریائے سندھ کی وادی (ہندوستان) میں پھیل گئے۔ یہودی قبیلے عراق اور مصر سے نکلے اور کنعان کے زرخیز علاقے پر قابض ہو گئے۔

کنعان میں آباد ہونیوالے مہاجرین، پیشے کے اعتبار سے گلہ بان تھے۔ بھیڑ بکریاں پالتے اور خیموں میں رہتے تھے۔ انکو زراعت سے کوئی سروکار تھا نہ وہ شہری زندگی کے آداب سے آگاہ تھے۔ انہوں نے عورتوں اور بچوں سمیت مردوں کو بڑی سفاکی سے قتل کیا اور کنعانیوں کو اپنا غلام بنا لیا۔

کنعانی زوال

انکی خونچکاں داستانوں سے کتابِ مقدس (پرانا عہد نامہ) کے صفحات لالہ زار ہیں۔

''قومیں (یہودیوں کے خروج کی خبر) سن کر تھرا گئی ہیں اور فلسطین کے باشندوں کی جان پر آبنی ہے۔ ادوم کے رئیس حیران ہیں اور موآب کے پہلوانوں کو کپکپی لگ گئی ہے کنعانیوں کے دل پگھلے جاتے ہیں' خوف و ہراس ان پر طاری ہے۔ تیرے بازو کی عظمت کے سبب سے وہ پتھر کی طرح بے حس و حرکت ہیں''۔ (خروج باب ۱۵)

کنعان کی ایک چھوٹی سی قوم پر حملے کی داستان بڑے فخریہ انداز میں یوں بیان کی جاتی ہے۔

''انہوں نے مدیانیوں سے جنگ کی اور سب مردوں کو قتل کیا اور انہوں نے انکے علاوہ بھی عوی، رقم' صور' حور اور ربع کو بھی جو مدیان کے پانچ بادشاہ تھے جان سے مارا' اور بعور کے بیٹے بلعام کو بھی تلوار سے قتل کیا اور بنی اسرائیل نے مدیان کی عورتوں اور انکے بچوں کو اسیر کیا اور ان کے چوپائے بھیڑ بکریاں اور مال و اسباب سب کچھ لوٹ لیا اور انکی سکونت گاہوں' شہروں جن میں وہ آباد تھے اور انکی چھاؤنیوں کو آگ سے پھونک دیا' سارا مالِ غنیمت اکٹھا کیا اور سب کو اسیر کیا۔ کیا انسان اور کیا حیوان' سب کو اپنی لشکرگاہ میں لے آئے' جو دریائے اردن کے کنارے موآب کے میدانوں میں تھی''۔ (گنتی: باب ۳۱)

یہودیوں سے پیشتر بھی کنعان کو اکثر اوقات اپنی زرخیزی کی سزا ملتی رہتی تھی۔ چنانچہ کبھی بابل اور کبھی اشور کی فوجیں کنعان پر حملہ کرتیں اور کبھی مصر کی فوجیں۔ یوں کنعان کبھی مصر کے حلقۂ اثر میں ہوتا تو کبھی بابل کے۔ اسی وجہ سے کنعان میں کبھی مضبوط مرکزی ریاست قائم نہ ہو سکی۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نہ فراعنۂ مصر اس بات کو برداشت کر سکتے تھے' نہ سلاطین بابل ہی اسکی اجازت دے سکتے تھے کہ کنعان میں کوئی ایسی حکومت قائم ہو جو اُن سے ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔ چنانچہ کنعان ابتداء ہی سے چھوٹی چھوٹی بادشاہتوں میں بٹا رہا۔ یہ بادشاہتیں مصر یا بابل کی باج گزار ہوتی تھیں البتہ جب مصر یا بابل کا مرکز کمزور ہو جاتا تو یہ بادشاہتیں خراج دینا بند کر دیتیں۔

بنی اسرائیل کے مأخذات

گیارھویں صدی قبل مسیح سے ۲۵ء تک کا دور حضرت شموئیلؑ سے لیکر حضرت عیسیٰؑ تک کا زمانہ وہ (دَور) ہے جو بنی اسرائیل کی مدنی و سیاسی زندگی کے عروج و زوال کا عہد ہے۔ اگرچہ بنی اسرائیل کو حضرت سلیمانؑ کے دور میں مدنی و سیاسی اعتبار سے عروج حاصل ہوا مگر جلد ہی وہ انحطاط و زوال کا شکار ہونا شروع ہو گئے۔ مذہبی گمراہی بڑھی، رقابتوں کی خلیج محبت و یگانگت میں حائل ہوگئی، پیار کے سوتے خشک ہو گئے اور شرک والحاد کی تاریکی پھیلتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ وہ قوم جو اپنے آپ کو موحد و محبوبِ خدا کہتی تھی، جو حضرت ابراہیم خلیلؑ اللہ کی مرتبہ شناس تھی، جس کو حضرت یعقوبؑ کی نسل ہونے کا اعزاز حاصل تھا اور جو بعد ازاں اپنے آپ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیرو کار سمجھتی تھی، اپنے انبیاء کی تعلیماتِ توحید کو بھول کر کفر و شرک کی بھول بھلیوں میں کھو گئی۔ اس نے خدائے وحدہٗ لاشریک کی بجائے بعل و یسیرۃ کو اپنا خدا بنالیا اور موجودہ عیسائیوں کی مثل حضرت عزیرؑ کو خدا کا بیٹا قرار دیدیا۔ گویا سیاسی انتشار کے علاوہ انکا مذہبی انحطاط بھی شروع ہو گیا، تا آنکہ حضرت عیسیٰ روح اللہ علیہ السلام مبعوث ہوئے۔

نویں صدی قبل مسیح کا زمانہ تو بنی اسرائیل کی خانہ جنگی اور باہمی منافرت و مناقشت کے عروج کا زمانہ تھا۔ بالآخر چھٹی صدی ق م میں بنوکدنصر طوفان بن کر بابل سے اٹھا اور عذاب الٰہی بن کر بیت المقدس پر چھا گیا۔ بنی اسرائیل نے گزشتہ ایک ہزار سال میں جو کچھ تعمیر کیا تھا بنوکدنصر نے آنِ واحد میں اسے صفحہ ہستی سے مٹا دیا اور یوں بنی اسرائیل ایک مرتبہ پھر محکوم و غلام بن گئے۔ اس محکومی و غلامی سے انہیں حضرت ذوالقرنینؒ نے نجات دلائی۔ تذکرۃ الانبیاء میں انکا تفصیلاً ذکر کرونگا تاہم فی الحال تسلسل مضمون کو جاری رکھتے ہوئے چند وضاحت طلب باتیں عرض کرتا چلوں تا کہ اقوام عالم کے حالات اور ان پر بعثتِ انبیاء کے اثرات کا ترتیب وار نقشہ ہمارے سامنے آسکے۔

کنعان پر غلبہ پانے کے بعد یہودیوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی بادشاہتیں قائم کرلیں۔ جو بادشاہتیں مصر سے قریب تھیں وہ مصر کو اور جو بادشاہتیں بابل کے نزدیک تھیں وہ بابل کو خراج ادا کرنے لگیں۔ یہودیوں کے بادشاہ انکے سیاسی سربراہ ہونے کے علاوہ انکے مذہبی پیشوا بھی تھے، انہوں نے رفتہ

رفتہ کنعانیوں کی ریت ورواج اور رسموں کو اپنا لیا اور وہ کنعانی دیوتاؤں ایل اور بعل وغیرہ کی پرستش کرنے لگے اور کنعانی معاشرے کا جزو بن گئے۔

''اور وہ خداوند کو چھوڑ کر بعل اور عشتاروت کی پرستش کرنے لگے''۔(قضاۃ باب:۲:۳)

''سو بنی اسرائیل کنعانیوں، حتیوں اور اموریوں کے درمیان بس گئے اور انکی بیٹیوں سے خود نکاح کرنے اور اپنی بیٹیاں انکے بیٹوں کو دینے لگے اور انکے دیوتاؤں کی پرستش کرنے لگے''۔

''کیا تم بعل کو پکڑتے ہو اور احسن الخالقین کو چھوڑتے ہو'' (القرآن)

اس دیوتا کو وہ ریگستانوں سے اپنے ساتھ لائے تھے۔البتہ انہوں نے اپنے آبائی رب یہواہ کو ترک نہیں کیا۔انکا عقیدہ تھا کہ یہواہ ہی کی بدولت ان کو کنعانیوں پر غلبہ حاصل ہوا ہے۔یہی یہواہ کئی سو سال گزرنے کے بعد یہودیوں کا خدائے واحد قرار پایا۔کیونکہ آٹھویں صدی ق م سے پہلے کے کسی نوشتے میں یہواہ کا ذکر نہیں ملتا۔ یہاں بھی ''یہواہ'' کی ذات کنعانی معاشرہ سے نہ بچ سکی۔ چنانچہ یہودیوں نے اپنے ریگستانی دیوتا کو بہت جلد کنعانی افزائش فصل کے دیوتا بعل کا منصب دیدیا۔

''بعل کی مانند یہواہ بھی آسمان سے پانی برسانے لگا اور بجلی کی کڑک چمک بعل کی مانند یہواہ سے منسوب کردی گئی اور وہ بھی بعل کی طرح پانی میں اژدھوں کے سر کچلنے اور لویاتان کے ٹکڑے کرنے لگا'' (زبور۔۷۴)

(لویاتان دراصل کنعانیوں کا اژدھا ''لوتان'' ہے جس کو بعل نے ہلاک کیا تھا)

یہودیوں نے اپنے قربانی کے تیوہار کو بھی کنعانیوں کے موسم بہار کے فصلی تیوہار سے ملادیا اور اس تہوار کی تاریخ وہی رکھ لی جس دن کنعانی بعل کا تیوہار مناتے تھے۔قربانی کے تیوہار میں وہ فرعونِ مصر کی غلامی سے نجات دلانے والے یہواہ کیلئے ہلوان کا ذبیحہ پیش کرتے تھے جسے وہ Pesach کہتے تھے۔اسکے ساتھ اسی دن وہ جو کی روٹی کا تیوہار Massoth بھی مناتے تھے جو کنعانیوں کا افزائش فصل کا تیوہار تھا۔ان ملے جلے تیوہار کے موقع پر وہ اپنے ہیکلوں میں زبور کے زمزمے گاتے۔تواریخ کے مطابق جب ستر سال کی اسیری کے بعد یہودیوں کے سردار اور کاہن (۵۱۶ قبل مسیح) بابل سے رہا ہوکر یروشلم واپس آئے تو انھوں نے مرڈک کے ڈرامے کی نقل میں یہواہ کی تخلیقات کو بھی ڈرامائی

رسموں کے ساتھ پیش کرنا شروع کر دیا۔ یہ تمثیل روشن شناہ (جشن ناقوس) کے موقع پر کھیلی جاتی اور تہوار سات دن تک منایا جاتا تھا۔

پرانے عہدنامہ میں تخلیق کائنات کی جو روایت یہودیوں کی اسیری کے بعد کی ہے اس میں تخلیق کائنات کا عمل چھ دن تک جاری رہتا ہے اور ساتویں دن یہواہ آرام کرتا ہے۔ چنانچہ اس تہوار میں ساتویں روز حضرت سلیمانؑ کے ہیکل سے یہواہ کا تخت جلوس کی شکل میں نکلتا تھا۔ اس تہوار پر جو ڈرامے پیش کئے جاتے تھے' بہت ممکن ہے کہ تخلیق سے متعلق دوسرے قصے بھی مثلاً شیطان کا خدا کی نافرمانی کرنا' آدم وحوا کا باغ عدن میں شجر ممنوعہ چکھنا اور جنت سے نکالے جانا بھی تمثیل کے جزو ہوں کیونکہ ان قصوں کے ڈرامائی امکانات سے تو کسی کو بھی انکار نہیں ہوسکتا۔

تخلیق کائنات سے متعلق پرانے عہدنامہ میں دو روایتیں درج ہیں۔ ایک بابل کی اسیری سے پہلے ۸۰۰ ق م کی ہے اور دوسری اسیری کے بعد کی۔ اسیری سے قبل کی راویت یوں مندرج ہے۔

> ''ابتدا میں کائنات بے آب وگیاہ ویرانہ تھی یہواہ نے زمین وآسمان کو بنایا۔ یہواہ نے زمین کی مٹی سے انسان کو گڑھا اور اسکے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا۔ پھر مشرق کی طرف باغ عدن بنایا اس میں ہر قسم کے درخت تھے حتیٰ کہ شجر حیات اور نیک وبد کی پہچان کا درخت بھی۔ بیچ میں دریا تھا جو باغ سے نکل کر چار حصوں میں بٹ جاتا تھا جن کے نام جیحون' دجلہ' فرات اور فیسون تھے۔ پھر سب چرند و پرند پیدا کئے اور آدم نے انکے نام رکھے۔ پھر حوا کو آدم کی پسلی سے پیدا کیا''۔ (کتاب پیدائش باب ۲)

اسیری کے بعد کی روایت یوں ہے۔

> ''ابتداء میں کائنات ایک پر آب ویرانہ تھی۔ تب یہواہ نے چھ دن میں مندرجہ ذیل چیزیں یکے بعد دیگرے بنائیں۔ (۱) روشنی (۲) آسمان یا فضا (۳) زمین اور نباتات (۴) سورج چاند اور ستارے (۵) چرند و پرند اور دریائی جانور (۶) جانوروں کے جوڑے اور انسان (۷) خدا نے ساتویں دن آرام کیا''۔ (کتاب پیدائش باب ۱)

اسیری کے بعد کی داستان میں تخلیق کی جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں وہ غالباً پارسی مذہب سے

ماخوذ ہیں۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حکیم زرتشت کے پیرو ''کورشِ اعظم (وفات ۵۲۹ ق م) نے بابل سے یہودیوں کو غلامی سے نجات دلوائی اور انکو بہت سا سونا چاندی دیکر یروشلم بھیجا کہ وہ اپنا ہیکل دوبارہ تعمیر کریں (پرانے عہد نامہ میں ''کوروش'' کی بہت تعریف کی گئی ہے) تو یہ گمان قوی ہو جاتا ہے کہ یہودیوں نے پارسیوں کے عقائد سے متاثر ہو کر اپنی داستانِ تخلیق کو اوستا کے رنگ میں ڈھالا ہوگا۔ اوستا کی کتاب ''یشنا'' میں پارسیوں کے عقائد کا تذکرہ استفہامی انداز میں یوں ملتا ہے:۔

سورج اور ستاروں کے راستے کس نے مقرر کئے۔؟

کون ہے جس نے زمین کو قائم کر رکھا ہے اور جو بادلوں کو نیچے گرنے سے روکتا ہے۔؟

کون ہے جو پانی اور پودوں کو باقی رکھتا ہے۔؟

کس ہنرمند نے روشنیاں اور تاریکیاں بنائیں اور خواب اور بیداری کو خلق کیا۔؟

کون ہے جسکی مرضی سے صبح اور شام موجود ہیں اور باشعور انسان کو اسکے فرائض یاد دلاتے ہیں۔؟

ظاہر ہے ان سب سوالوں کا جواب ایک ہی ہے کہ ''اہورمزدا'' ہی نے جو عرش پر ہے' یہ کارنامے سرانجام دیئے۔ پارسی عقائد کے مطابق وہ ایک اور جگہ ''بنداہش'' میں لکھتا ہے کہ:

''اہورمزدا نے پہلے آسمان خلق کیا' پھر اس نے آسمان کے مسالحہ سے پانی خلق کیا پھر پانی سے زمین بنائی جو گول ہے۔ اس نے زمین کے اندر دھاتوں اور پہاڑوں کو پیدا کیا۔ چوتھے اس نے پودوں کو پیدا کیا۔ پانچویں اس نے بیل کو پیدا کیا اور چھٹے گایومرت (کیومرث) آدم کو پیدا کیا اور آدمی اور بیل کو مٹی سے پیدا کیا''۔

یہودیوں نے پارسیوں کے خدا ''اہورمزدا'' کی ان چھ تخلیقات کو چھ دن میں تقسیم کر دیا اور انہیں اپنے خدا ''یہواہ'' سے منسوب کر دیا۔ انجیل کی داستان میں جنت کا جو نقشہ ہے اسکے ماخذ کے بارے تو شبہ کی گنجائش نہیں کیونکہ اس میں عراق کے دریاؤں کا ذکر ہے اور لفظ ''عدن'' عکادی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی چراگاہ کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح شجرِ حیات اور شجرِ ممنوعہ بھی بابل کی قدیم داستانوں کے پودے ہیں جن پر ''گل گامش'' کی داستان بیان کرتے وقت تفصیل سے روشنی پڑے گی۔

آدمؑ کی تخلیق کے بارے قدیم مصریوں کا عقیدہ تھا کہ خنوم دیوتا نے انسان کو کمہار کے چاک پر

بنایا۔ عبرانی زبان میں آدم کا لفظی ترجمہ مٹی ہے اور اسکی تخلیق کیلئے مستعمل لفظ کمہار کے چاک پر برتن بنانے کے ہم معنی ہے۔ لکسر کے مقام پر ایسے دیواری نقش ملے ہیں جن میں خنوم دیوتا کمہار کے چاک پر انسان کا پُتلا بنا رہا ہے۔ چنانچہ عجب نہیں کہ مصر سے نکلتے وقت یہودی یہ عقیدہ اپنے ساتھ لائے ہوں۔ یہودی تاریخ میں ہمیں تین بڑی ہجرتوں کا سراغ ملتا ہے۔

پہلی ہجرت حضرت ابراہیمؑ کی تھی جنہوں نے پروفیسر ہک کے دعویٰ کے مطابق اٹھارویں صدی ق م میں عراق سے ہجرت کی اور اپنے قبیلے سمیت حران کے قریب آباد ہوئے۔ وادیٔ دجلہ و فرات میں اُن دنوں بڑی سیاسی ابتری پھیلی ہوئی تھی اسلئے بہت ممکن ہے کہ ابراہیمی قبیلے کی دیکھا دیکھی دوسرے سامی قبیلوں نے بھی کنعان کا رُخ کیا ہو' کیونکہ سترھویں صدی تا پندرھویں صدی قبل مسیح کی پیکانی لوحوں میں پہلی دفعہ ''جسیر د'' اقوام کی نقل مکانی کا تذکرہ بار بار آیا ہے' دراصل یہی لوگ اوّلین عبرانی تھے۔ دوسری ہجرت آرامی قبیلوں کی تھی جو خالص بدوی اور صحرانشین تھے جنکے راہنما حضرت یعقوبؑ تھے جنکا لقب اسرائیل تھا۔ انھوں نے سیکم (سامریہ) کے گردونواح میں اپنی کچھ بستیاں تعمیر کیں۔ بذریعہ ہجرت آبادکاروں کا تیسرا ریلا تیرھویں صدی قبل مسیح میں جنوب کی سمت سے آیا۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں مصر سے ہجرت کی تھی۔

قدیم یہودی ذہن عورت کو زندگی کا سرچشمہ تصور کرتا تھا' ممکن ہے یہ گمان عورت کے ''ذریعہ ولادت'' ہونے کی بناء پر ہو۔ ''حوا'' عبرانی زبان میں زندگی کو کہتے ہیں حیّ اور حیات اسی قبیل کے الفاظ ہیں' حوا کو آدم کی پسلی سے پیدا کرنے کا قدیم خیال کہاں سے آیا' اس کیلئے ہمیں نن ہورسک کی ''سومیری'' داستان کی طرف رجوع کرنا ہوگا' جو مختصراً یوں ہے۔

> ''مادرِ کائنات آٹھ قسم کے پودے پیدا کرتی ہے مگر پانی کا دیوتا ''اِنکی'' ان پودوں کو کھا جاتا ہے' اس پر نن ہورسگ' اِنکی کو شراپ دیتی ہے اور اسکے آٹھ اعضاء کو روگ لگ جاتا ہے (کیونکہ اسنے آٹھ پودے کھائے تھے) تب دیوتا' مادرِ کائنات کو درخواست (سفارش) کرتے ہیں کہ تو اِنکی کو معاف کردے''۔

چنانچہ وہ ہر بیمار عضو کو اچھا کرنے کیلئے آٹھ دیویاں پیدا کرتی ہے۔ اِنکی کے آٹھ بیمار حصوں میں ایک حصہ

پسلیوں کا بھی تھا اسکو اچھا کرنے کیلئے جو دیوی پیدا کی گئی اسکا نام 'نن تی' تھا۔ نن تی کے معنی پسلی کی خاتون کے بھی ہوتے ہیں اور سومیری زبان میں ''تی'' حیات کو بھی کہتے ہیں۔ لہٰذا نن تی کا مفہوم حیات کی خاتون بھی ہوتا ہے۔ ممکن ہے نن تی اہل کتاب یہودیوں کے عقیدے میں داخل ہو کر حوا بن گئی ہو یا اسکو آدم کی پسلی سے خلق کیا جانا یہودیوں کا سومیری اور عکادی روایتوں سے لیا گیا تصور ہو۔

عیسائیوں نے پرانے عہد نامے کی روایتوں کو اپنا لیا تھا۔ البتہ ان میں حضرت مسیح علیہ السلام سے متعلق دو روایتوں کا اضافہ کر دیا۔ ایک کنواری مریمؑ کے بطن سے عیسیٰؑ کی پیدائش کا اور دوسری حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مصلوب ہو کر جی اٹھنا اور آسمان پر چلے جانا۔ فی الحال یہ دونوں روایتیں کتابِ ھٰذا کے موضوع سے خارج ہیں' کیونکہ قرآنی وضاحت کے بعد اس پر یا مندرجہ بالا فاسد عقائد پر بحث کی ضرورت بھی نہیں۔

قدیم مصر کے مأخذات

عراق کی مانند مصر کی تاریخ بھی بہت پرانی ہے۔ اس تہذیب کو قریباً تین ہزار سال تک بہت عروج رہا اور اسکے کارنامے تمام دنیا کی توجہ کا مرکز بنے رہے۔ مصر دریائے نیل کا تحفہ ہے یہ بات حضرت یوسفؑ کے زمانہ میں بھی سچ تھی اور آج بھی سچ ہے۔ نیل کا پانی مصریوں کیلئے آب حیات سے کم نہیں۔ اس خطہ میں بارش نہیں ہوتی اسلئے لوگوں کی زندگی کا دارومدار اسی دریا پر ہے۔ وہ اسی کا پانی پیتے ہیں اور زمینوں کی آب پاشی کیلئے بھی انکا یہی واحد ذریعہ ہے۔ کیونکہ دوسرے ملکوں میں اگر کوئی دریا سوکھ جائے تو دوسرے دریا یا دیگر باجگزار ندی نالے وغیرہ یہ کمی پوری کر دیتے' مگر مصر کا ذریعہ آب صرف یہی ایک دریائے نیل ہے۔

یہ دریا یوگانڈا کی پہاڑیوں سے نکلتا ہے اور افریقہ کے لق ودق صحرائے اعظم میں ایک آبی لکیر بناتا ہوا بحر روم میں جا گرتا ہے۔ مصری سرحد میں داخل ہونے پر دریائے نیل پانچ سو میل تک ایک خشک اور اونچے پلیٹو کے درمیان سے گزرتا ہے۔ اس علاقہ میں دریا کا طاس دس تا بارہ میل سے زیادہ چوڑا نہیں ہے اسلئے یہاں کے باسی اسی تنگ وادی میں رہنے پر مجبور ہیں۔ جب دریا قاہرہ (قدیم ممفس) کے پاس

پہنچتا ہے تو پہاڑیاں دور ہٹ جاتی ہیں اور وادی بہت کشادہ ہو جاتی ہے۔ آگے بڑھ کر دریا کی کئی شاخیں بن جانے کے سبب دریا کا پانی ان شاخوں میں بٹ کر چار سو میل لمبے قوسی ڈیلٹا کو سیراب کرتا ہے۔ ڈیلٹا کا علاقہ دراصل اُس مٹی سے بنا ہے جو دریائے نیل اپنے ساتھ بہا کر لاتا تھا۔ سیاہ رنگ مٹی کا یہ ڈیلٹا جنوبی خطہ کی نسبت زیادہ زرخیز ہے۔ جب تک مصر میں متحدہ بادشاہت قائم نہیں ہوئی تھی یعنی ۳۴۰۰ ق م تک، جنوبی اور شمالی بادشاہتیں اس ڈیلٹا کی خاطر اکثر ایک دوسرے سے آمادۂ جنگ رہتی تھیں۔

ماہِ اگست میں جب وسطی افریقہ کے پہاڑوں پر بارش شروع ہوتی ہے تو دریا آہستہ آہستہ چڑھنے لگتا ہے۔ بارش کا یہ پانی یکم ستمبر کو اسوان پہنچتا ہے اور یکم اکتوبر کے قریب قاہرہ پہنچ جاتا ہے اور ان معمولات میں فرق نہیں آتا وگرنہ ملک میں قحط پڑ سکتا ہے جیسے حضرت یوسفؑ کے عہد میں ہوا تھا۔ جب سیلاب آتا ہے تو دریائے نیل کی ساحلی زمین میلوں تک پانی سے ڈھک جاتی ہے۔ دو تین ماہ بعد جب دریا اترتا ہے تو اپنے پیچھے زمین پر مٹی کی ایک موٹی زرخیز تہہ چھوڑ جاتا ہے، فلاحین اسی زمین پر کاشت کیا کرتے تھے۔ ملک کا بقیہ ستانوے فیصد علاقہ بے آب و گیاہ ریگستان ہے۔ چنانچہ آج بھی مصر کے ۹۹ فیصد باشندے دریا کے کنارے ہی آباد ہیں۔

دریائے نیل کی پابندیٔ اوقات کے باعث انسان کو تقویم سازی کا ہنر ہاتھ آیا اور اہل مصر نے ۴۲۴۱ ق م میں دنیا کی پہلی جنتری بنائی۔ اس وقت وہاں کے نجومی اپنے مشاہدے کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچے کہ ستارۂ شعرائی یمانی (SIRIUS) ہر سال طلوع آفتاب سے ذرا پہلے ٹھیک اسی روز افق پر نمودار ہوتا ہے جس دن سیلاب شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے سال کو ۳۶۵ دنوں میں تقسیم کیا اور تیس تیس دن کے بارہ مہینے مقرر کئے۔ جو پانچ روز بچ رہے انکو جشن نوروز کے لئے مختص کر دیا۔ ستارۂ شعرائی یمانی (SIRIUS) کو انہوں نے افزائش اور محبت کی دیوی ''اِزیس'' سے، دریائے نیل کے پانی کو اِزیس کے مقتول شوہر ''اُزریس'' کے لہو سے اور سیلاب کو اِزیس کے آنسوؤں سے تعبیر کیا۔

مصریوں کا نیا سال ۱۹ جولائی سے شروع ہوتا تھا کہ شعرائی یمانی کا یومِ طلوع یہی تھا اور اسی دن سیلاب شروع ہوتا تھا۔ نئے سال کی رسموں کی تفصیلات فرعون رامیسس سوئم کے معبد خانہ کی دیواروں پر اب تک موجود ہیں۔ یہ تہوار پورے مصر میں منایا جاتا تھا۔ مصری تہذیب کے سب سے قدیم

آثار وسطی خطہ میں بدری' تاسا اور غزہ کے کھنڈرات سے ملے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی بستیاں ابتداء اوّل میں اسی علاقے میں قائم ہوئیں۔ پھر جیسے جیسے آبادی کا دباؤ بڑھتا گیا لوگ دریائے نیل کے کنارے کنارے شمال کا رُخ کرتے گئے۔ ڈیلٹا کا علاقہ بہت بعد میں آباد ہوا' وہ بھی لیبیا کی جانب سے آنے والے صحرا نوردوں کی وجہ سے' جو کئی اعتبار سے جنوبی مصر کے باشندوں سے مختلف تھے۔

متحدہ بادشاہت سے قبل وادیٔ نیل کا علاقہ چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستوں میں بٹا ہوا تھا اور ہر ریاست کا اپنا الگ سربراہ ہوتا تھا۔ وہ اپنے اپنے دیوی دیوتاؤں کو (جن کی شکلیں جانوروں کی ہوتی تھیں) ٹوٹم کہتے ہیں۔ بقول فریزر' ٹوٹم (TOTEM) وہ مادی چیزیں ہیں جن کو وحشی انسان بڑے توہماتی ادب سے دیکھتا اور یہ یقین کرتا ہے کہ اس میں اور اس مخصوص شئے میں ایک دوستانہ ربط ہوتا ہے۔ مثلاً کسی پرانی قوم کا ٹوٹم طاؤس ہوتا تو کسی کا خرگوش' کسی کا گھڑیال' کسی کا بیل کسی کا باز' کسی کا ہرن اور کسی کا سانپ وغیرہ۔ ان قوموں کی شناخت انکے ٹوٹم ہی کے نشان سے ہوتی تھی اور یہی ٹوٹم انکی ذات بن جاتے تھے۔ چنانچہ مغربی پنجاب کے پرانے باشندوں سے اگر آج بھی سوال کیا جائے کہ تم کون ہو تو کوئی کہے گا کہ میں سیال ہوں یا میں ناگی ہوں وغیرہ وغیرہ۔

رفتہ رفتہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں آپس میں ضم ہوتی گئیں۔ یہ اتحاد اگر پرامن طور پر ظہور میں آتا (مثلاً ایک دوسرے سے بیاہ شادی کے ذریعے) تو ریاستی دیوتاؤں کے مابین خوشگوار تعلق پیدا ہو جاتے اور اسکے برعکس اگر ایک ریاست دوسرے کو بزورِ شمشیر فتح کرتی تو مقبوضہ ریاست کے دیوی دیوتا بھی فاتح کے معتوب قرار پاتے اور فاتح قوم ان کو نفرت و حقارت سے دیکھتی۔

مورخین کا کہنا ہے کہ ۴۰۰۰ ق م کے قریب باز اور گدھ اقوام کے لوگ بہت طاقتور ہو گئے۔ یہ لوگ وسطی مصر میں آباد تھے اور انکی ریاست کا صدر مقام عبیدوز تھا جو نہایت متبرک سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ حوریس (باز) دیوتا کا سب سے مقدس مندر وہیں تھا۔ بعض محققین کا کہنا ہے کہ حوریس دراصل باز قوم کا کوئی بادشاہ یا سورما تھا جسکو بعد ازاں دیوتا بنا دیا گیا۔ بہرحال حقیقت کچھ بھی ہو ''عبیدوز'' کے بادشاہ ناریمر مینس (NARIMER MENES) نے ۴۷۷۷ ق م میں جنوب کے سب علاقوں کو اپنی قلمرو میں شامل کر لینے کے بعد شمال کا رُخ کیا۔ ڈیلٹا میں اُن دنوں بوط (سانپ) قوم کی حکومت تھی اور انکے بادشاہ کا نام

غالباً ساتت (SATET) تھا۔ ساتت نے مینس کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی اور حوریس قوم کے ہاتھوں ہلاک ہوا۔ مینس نے ڈیلٹا پر قبضہ کرلیا اور اس طرح پہلی بار مصر میں ایک متحدہ بادشاہت قائم ہوئی۔ مینس نے عبیدوز کو خیر باد کہا اور ممفص (قاہرہ) کے مقام پر اپنا نیا دارالسلطنت بنایا۔ البتہ جب اس نے وفات پائی تو وصیت کے مطابق عبیدوز ہی میں دفن ہوا۔

ڈیلٹا کی تسخیر سے پہلے مینس کے تاج پر باز کی شکل بنی ہوتی تھی۔ متحدہ سلطنت قائم ہونے پر مصری فرماں رواؤں کے تاج پر سانپ کا اضافہ ہوگیا مگر حوریس دیوتا کی افضلیت میں کمی نہیں آئی بلکہ اسکی عظمت وشوکت پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی۔ کیونکہ پہلے وہ فقط جنوبی خطوں ہی کا مقامی دیوتا تھا اب وہ فراعنہ مصر کی پوری سلطنت کا سب سے بڑا دیوتا سمجھا جانے لگا۔ ہر فرعون کے فرمان کا آغاز حوریس کے نام سے ہونے لگا اور انھوں نے حوریس (باز) کی اولاد بلکہ ''زندہ حوریس'' کا لقب اختیار کیا۔

شمالی مصر کی تسخیر، وادیٔ نیل کی تاریخ کا نہایت اہم اور عہد آفریں واقعہ تھی۔ ظاہر ہے کہ باز قوم کو یہ کامیابی حوریس دیوتا ہی کی بدولت حاصل ہوئی تھی۔ چنانچہ حوریس کی مدح میں بکثرت بھجن، گیت اور ناٹک لکھے گئے اور اسکے کارناموں کو رہسوں اور لیلاؤں کا موضوع بنایا گیا۔ یہ ناٹک اور رہس فصلی تیوہاروں کے مواقع پر تمام ساحرانہ اور مذہبی رسموں کے ساتھ مندروں میں کھیلے جاتے تھے۔ ان ڈرامائی رسموں اور تیوہار کا جائزہ لینے سے پہلے مصر کے قدیم دیوتاؤں کا ذکر ضروری ہے کیونکہ یہ دیوتا' ان ڈراموں کے اہم کردار تھے۔ نیز فراعنہ کی شخصیات بھی مصری عقائد کا جزو تھیں اور ان ڈراموں سے اسکا گہرا تعلق تھا۔

کتاب اموات مصری دعاؤں کا مجموعہ ہے۔ یہ دعائیں امرائے سلطنت کے تابوتوں پر لکھی جاتی تھیں جو قریباً دو ہزار سے ایک ہزار سال ق م تک رائج رہیں۔ اس کتاب کے مطابق انسانوں کو قربان کرنے کی رسمیں جنائی کے آغاز کے وقت منائی جاتی تھی۔ قربانی کے فوراً بعد فرعون ہل لیکر مقدس کھیت میں اُترتا اور اسے جوتتا تھا۔ اسکے بعد قربانی کا خون کھیت میں چھڑک دیا جاتا۔ چنانچہ آثارِ قدیمہ الحبو میں دیوار پر ایک منظر منقوش ہے جس میں فرعون (رامیسس سوئم ۱۲۰۲ ق م) کھیت جوتتا دکھایا گیا ہے۔ اسی کتاب اموات سے پتہ چلتا ہے کہ فراعنہ کے اٹھارویں خاندان کے عہد میں ۱۵۸۷ ق م تا

۱۳۷۵ق م انسانوں کی جگہ جانوروں (ہرن) کی قربانی ہونے لگی تھی۔یعنی ساتت کے ساتھی ہرن کے روپ میں آتے تب انکو دیوتاؤں کے رُوبرو گرا کر ذبح کیا جاتا اور انکا خون زمین پر بہنے لگتا ہے۔جوتائی کی رات زمین انکے خون سے تر ہو جاتی ہے۔

اُزریس خواہ دیوتا رہا ہو یا انسان' البتہ مصری رسوم میں اس کا تعلق اناج کی افزائش فصل سے تھا۔روایت کے مطابق ساتت نے اسکی لاش کے ٹکڑے جگہ جگہ بکھیر دیئے تھے اور تب اسکی بیوی اِزیس نے ان ٹکڑوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اکٹھا کیا اور اپنے منتر کے زور سے اُزریس کو دوبارہ زندگی بخشی تھی۔جس طرح اناج کے بے جان بیجوں کو زمین میں بکھیرا جاتا ہے اور بظاہر موت کے بعد پودوں کی شکل میں وہ دوبارہ زندہ ہو کر زمین سے نمودار ہو جاتے ہیں۔

اُزریس کا تہوار اکتوبر میں منایا جاتا تھا۔مصر میں اُزریس کے دو نہایت متبرک معبد تھے ایک بوزائرس میں جو ڈیلٹا میں واقع تھا اور دوسرا عبیدوز میں۔عبیدوز میں زیادہ تر زور اسکی موت کی رسموں پر دیا جاتا تھا اور بوزائرس میں اسکے دوبارہ جی اٹھنے پر۔یعنی تہواروں کی رسمیں دو طرح کی ہوتی تھیں۔ایک خالص زرعی اور دوسری ڈرامائی' جس میں اُزریس کے قتل اور دوبارہ زندہ ہونے کے علاوہ اسکے بیٹے حوریس اور ساتت کی جنگ اور ساتت کے قتل کے مناظر پیش کئے جاتے تھے۔زرعی رسمیں بوائی کی رسمیں تھیں۔حوریس کی طلائی مگر کھوکھلی مورتی کو مٹی اور جوار کے دانوں سے بھر دیا جاتا تھا۔اسکے علاوہ حوریس کی اولاد کی چاروں مورتیوں کو بھی جَو کے دانوں' چودہ مصالحوں اور چودہ قسم کے قیمتی پتھروں سے بھر دیا جاتا تھا۔پھر ان پانچوں مورتیوں کو پتھر کے ایک بڑے کڑھاؤ میں رکھ کر مٹی سے ڈھانپ دیا جاتا اور جب ان میں انکھوے نکلنے لگتے تو پروہت جشن بہار کی آمد کا اعلان کر دیتا۔

کڑھاؤ کے اندر اگنے والے پودوں کو اُزریس کا باغ کہا جاتا تھا۔ایسے متعدد باغ بارھویں خاندان کے اہرام کے دروازے پر لاجون کے مقام پر ملے ہیں۔اُزریس کے چھوٹے چھوٹے ایسے باغ اُمرائے مصر کے مقبروں سے بھی برآمد ہوئے ہیں جن پر برتنوں میں جَو کے پودے اُگائے گئے تھے ان پر اُزریس کی شبیہ کھدی ہوئی ہے۔مدعا یہ تھا کہ جس طرح اُزریس کو دوبارہ زندگی ملی اسی طرح اس فوت شدہ امیر کو بھی نئی زندگی عطا ہو۔ان ڈرامائی رسموں میں چھ کردار بہت اہم ہوتے تھے۔

اُزریس:۔۔۔جسے ساتت نے قتل کیا تھا۔

اِزیس:۔۔۔ساتت کی بہن اور وفادار بیوی۔

نفتیس:۔۔۔اِزیس کی سگی بہن جس نے اِزیس کا ساتھ دیا اور اُزریس کا سوگ منایا۔

ساتت:۔۔۔بدی کا پیکر اور اُزریس کا دشمن۔

حوریس:۔۔۔اُزریس کا جواں سال بیٹا' جس نے ساتت سے باپ کا انتقام لیا۔

انوبیس:۔۔۔(گیدڑ) موت کا دیوتا۔

یونان کے مورّخ ہیروڈوٹس نے ایرانیوں کے دورِ اقتدار میں مصر کا سفر کیا تھا۔اس نے اپنی کتاب میں ان ڈرامائی رسموں کا آنکھوں دیکھا حال قلم بند کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ ''جس وقت سورج ڈوبنے لگتا ہے تو مجمع لاٹھی لے کر مندر کے دروازے پر کھڑا ہو جاتا ہے۔تب دیوتا کا جلوس ایک دوسرے مقدس مقام سے روانہ ہوتا ہے اور ہزاروں پجاری اسکے پیچھے لاٹھیاں سنبھالے بھجن گاتے چلتے رہتے ہیں۔جب جلوس مندر کے پاس پہنچتا ہے تو جو لوگ وہاں پہلے سے لاٹھیاں لئے کھڑے ہوتے ہیں۔وہ مزاحمت کرتے اور دیوتا کو مندر میں داخل ہونے سے روکتے ہیں۔تب دیوتا کے پجاری ساتھی مخالفین پر لاٹھیوں سے حملہ کر دیتے ہیں اور مقابلہ اتنا سخت ہوتا ہے کہ سچ مچ بہت سے لوگوں کے سر پھٹ جاتے ہیں''۔(تاریخ جلد دوئم رص:۱۳۱)

فرعون اخناطون (۱۳۷۵ق م تا ۱۳۵۷ق م) نے اُزریس کی پرستش حکماً بند کروادی تھی اور اطون (سورج) کی پرستش لازمی قرار دیدی تھی اس وجہ سے فراعین کے آخری دَور میں جشن نوروز کی اہمیت بہت کم ہوگئی تھی مگر اس سے قبل جشن نوروز سب سے بڑا قومی تہوار سمجھا جاتا تھا' جس میں ہر طبقہ کے لوگ شریک ہوتے تھے۔اس موقع پر سچ مچ کے دو ڈرامے کھیلے جاتے تھے۔ایک حوریس اور ساتت کی جنگ کا ڈرامہ اور دوسرا تخلیق کائنات کا ڈرامہ جو دراصل اُزریس کے شجرۂ نسب کی تشریح تھا۔

حوریس اور ساتت کے رزمیہ ڈرامے میں حوریس کا پارٹ خود فرعون ادا کرتا تھا کیونکہ وہ حوریس کا اوتار خیال کیا جاتا تھا۔اِزیس کا پارٹ فرعون کی ملکہ ادا کرتی تھی اور ساتت کا پارٹ کسی موجب قتل قیدی کو دیا جاتا تھا۔اس ڈرامہ کا انگریزی ترجمہ شائع ہو چکا ہے مگر تخلیق کائنات کا ڈرامہ

کھدائیوں میں دستیاب نہیں ہوسکا۔ البتہ اسکے بعض اجزا دوسرے مذہبی نوشتوں میں ملے ہیں۔ یہ رزمیہ ڈرامہ تمہید، تین ایکٹ اور اختتامیہ پر مشتمل تھا۔ ایک پروہت راوی کی حیثیت سے ڈرامے کے مختلف مناظر کی درمیانی کڑیاں ملاتا جاتا اور اداکار اپنے مکالموں اور جسم کی حرکتوں سے راوی کی داستان کو حقیقت کا رنگ دیتے رہتے۔ تخلیق اور تخریب کی اس جنگ میں تماشائی بھی جذباتی طور پر پورا پورا حصہ لیتے تھے اور جب فرعون، قیدی کو قتل کرتا تو مجمع جذبات سے بے قابو ہوکر قیدی پر ٹوٹ پڑتا اور اسکی لاش کی تکا بوٹی کر ڈالتا۔

تاریخ مصر کے ابتدائی دور میں اُزریس، اِزیس، حوریس، ساتت اور انوبیس کے علاوہ کسی بڑے دیوتا کا سراغ نہیں ملتا۔ نہ اطون اور رَع کا نہ مون، انوط کا نہ گیب، شو اور طفنوت کا۔ مظاہر قدرت کے یہ دیوتا دراصل زیب داستان کیلئے تخلیق کئے گئے تھے۔ ابتدائی دور میں کسی قدرتی دیوتا کا کوئی مندر بھی نہ تھا۔ البتہ آمون رَع (سورج دیوتا) خالص شاہی دیوتا تھا جو فراعنہ کے پانچویں خاندان کے دور میں وجود میں آیا۔ چنانچہ اٹھارویں خاندان (۱۵۸۷ تا ۱۳۷۵ ق م) سے پیشتر تک فرعون کے علاوہ کسی شخص کو سورج کی پرستش کی اجازت نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عام لوگ سورج دیوتا کو ناپسند کرتے اور اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ اسی بناء پر شاہی نوشتوں میں تو سورج کی صفت وثناء میں زمین وآسمان کے قلابے ملائے گئے ہیں مگر عوامی روایتوں میں سورج کی تضحیک کی گئی ہے۔ مثلاً ایک روایت میں اِزیس نے رَع کو احمق بنا کر اس سے اسم اعظم کا راز معلوم کرلیا تھا۔ دوسری روایت میں اسے اتنا بوڑھا اور بیوقوف دکھایا گیا تھا کہ ساری دنیا اس پر ہنستی تھی۔ تیسری روایت میں تو اس کی بددعا بھی کارگر نہیں ہوتی، بلکہ ''تحوت'' (THOTH) جو علم وہنر کا دیوتا ہے اپنی دانائی اور ہوشیاری سے ''رع'' کو ہرا دیتا ہے۔

۲۷۰۰ ق م کا یہ قصہ فرعون ''مرنے رع'' اور فرعون ''نیفر کارع'' کے اہرام پر کندہ شدہ منتروں کا ضمنی ٹکڑا ہے۔ ان منتروں میں اتوم (مٹی کے مثلث ٹیلے) کو مخاطب کیا گیا ہے جو ڈیلٹا کے مقدس شہر اون (HELIOPOLIS) کا دیوتا تھا اور اس شہر کے آثار قاہرہ کے مضافات میں مطاریہ کے مقام سے برآمد ہوئے ہیں جس میں درخواست کی گئی ہے کہ جس طرح تو نے دریائے نیل پر ظہور کر کے اسے دوام بخشا ہے اسی طرح ہمارے اہرام کو بھی دوام بخش جو تیرے مقدس ٹیلے کی شبیہ ہے۔ منتر یہ ہے۔

''اے اتوم: تو جو ٹیلے کی بلندی پر مقیم تھا نمودار ہوا جس طرح اون کے معبد کے مقدس پتھروں میں سے پرند نمودار ہوتے ہیں۔ تیرے تھوک سے شو پیدا ہوا تیری چھینک سے طفنوت پیدا ہوئی تو نے انکو اپنے بازوؤں میں لے لیا جو ''کا'' کے بازو تھے۔ کیونکہ تیرا ''کا'' ان میں تھا۔ پس اے اتوم: اسی طرح بادشاہ ''نیفر کارع'' کو بھی اپنے بازوؤں میں لے لے۔ اسکی عمارت کو اپنے بازوؤں میں لے لے۔ اِس اہرام کو اپنے بازوؤں میں لے لے ''کا'' کے بازوؤں کی طرح تو اس کی حفاظت کر کہ مبادا اسکو دوام کی راہ میں کوئی ضرر پہنچے۔ جسطرح تو نے شو اور طفنوت کی حفاظت کی۔ اوہیلیو پولس کے عظیم دیوتاؤ' شو طفنوت' اُزریس' اِزیس' ساتت اور نفتیس' جن کو اتوم نے پیدا کیا۔ اپنے دل کو مسرت سے کشادہ کر کے تم کبھی اتوم سے جدا نہ ہو۔ جس طرح وہ ''نیفر کارع'' کی حفاظت کرتا ہے' جس طرح وہ بادشاہ کے اہرام کی حفاظت کرتا ہے' جس طرح وہ اس عمارت کی حفاظت کرتا ہے' تمام دیوتاؤں اور مُردوں اور بادشاہ کی حفاظت کرتا ہے کہ مبادا دوام کی راہ میں اسکو کوئی ضرر پہنچے''۔

اس منتر کی رُو سے ساتت بھی ابتدا میں دیوتا تھا مگر اپنے بھائی اُزریس کو قتل کرنے کے باعث مردُود قرار پایا۔ (یہ خیال ہابیل و قابیل کے واقعہ کی ایک مسخ شدہ شکل دکھائی دیتی ہے) نیز یہ کہ اس منتر میں بھی تخلیق کا صلبی تصور عیاں ہے۔ یعنی دیوتا بھی انسانی طرز پر نر اور مادہ کے ملاپ سے پیدا ہوتے ہیں۔ پھر ہوا تھوک سے پیدا ہونے اور نمی چھینک سے پیدا ہونے کا تخیل ثابت کرتا ہے کہ تخلیق کائنات کا یہ تصور مظاہر قدرت کے مطالعہ سے پیدا نہیں ہوا بلکہ کوئی شاعرانہ یا ڈرامائی تصور ہے۔ کیونکہ کوئی ذی عقل اطلاعاتِ پیغمبران اور مشاہدۂ قدرت کے بعد ایسے نتائج اخذ نہیں کر سکتا اور نہ خالق کائنات کی ذات وصفات کو مخلوق کی عادات وصفات پر منتج کر سکتا ہے۔ اس قسم کے احمقانہ تصورات اس منتر کی ایک ملحقہ روایت سے بھی نمایاں ہوتے ہیں:۔

''ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ تب اس پر ایک انڈا یا کنول کا پھول نمودار ہوا۔ مدت تک یہ انڈا یا پھول پانی پر تیرتا رہا پھر اس میں سے انوم نکلا۔ اس کے چار اولاد ہوئیں یعنی شو طفنوت' گیب اور نوط۔ پھر شو اور طفنوت نے اپنے آپ کو گیب اور نوط کے اندر داخل کیا۔ گیب کو اپنے پاؤں

کے نیچے داب لیا اور نوط کو اونچا کر دیا۔ یوں گویا زمین و آسمان جو ابتداء میں جڑے ہوئے تھے الگ الگ ہو گئے۔ یہی گیب اور نوط اپنے بچوں اُزریس، اِزیس، ساتت اور نفتین کے والدین تھے"۔

زمین و آسمان کے جدا ہونے کے اس نظریہ کی ایک تصویر آج بھی برٹش میوزیم لندن میں مصریات کے کمرے میں آویزاں ہے، جو ہزار سال قبل مسیح میں بنائی گئی تھی۔ یہ تخیل بھی انبیاء کی تعلیمات ہی کی (ایک بگڑی ہوئی) تصویر دکھائی دیتا ہے۔ سورۃ الانبیاء کی آیت نمبر ۳۰ میں فرمان ہے۔

اَوَ لَمۡ یَرَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ کَانَتَا رَتۡقًا فَفَتَقۡنٰہُمَا ؕ وَ جَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ کُلَّ شَیۡءٍ حَیٍّ ؕ اَفَلَا یُؤۡمِنُوۡنَ (الانبیاء: ۳۰)

ترجمہ: "کیا کافروں نے یہ خیال نہ کیا کہ زمین و آسمان بند تھے۔ پس ہم نے انکو کھولا اور ہم نے پانی سے ہر جاندار شئے بنائی، کیا تب بھی وہ ایمان نہ لائیں گے"۔ (انبیاء: ۳۰)

مصر کی ایک داستانِ تخلیق کا تعلق "ممفس" (MEMPHIS) سے ہے۔ آجکل تو ممفس دریائے نیل کے دامن میں قاہرہ سے پندرہ میل جنوب میں واقع ایک چھوٹا سا قصبہ ہے لیکن اب سے چھ ہزار سال پہلے مصر کا دارالسلطنت ہونے کے باعث اس شہر کو وہی اہمیت حاصل تھی جو دورِ حمورابی میں بابل کو حاصل تھی۔ ممفس کا قدیم دیوتا پتاح (PTAH) تھا۔ یعنی پانی سے نمودار ہونے والی زمین۔ گویا پتاح انوم ہی کا دوسرا نام ہے۔ ممفس کی داستانِ تخلیق ایک پتھر پر کندہ ملی ہے۔ یہ تحریر گو سات سو سال ق م کی ہے تاہم قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ داستان کم از کم ستائیس سو سال ق م کی تصنیف ضرور ہے۔ اس میں حوریس کی رزمیہ کہانی اور اسکے شجرۂ نسب کو از سرِ نو ترتیب دیا گیا ہے تاکہ حوریس اور پتاح کا رشتہ قائم ہو جائے۔ البتہ اس داستان میں تخلیق کے عمل کو جس فلسفیانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ٹکڑا اصل داستان کے ساتھ بہت بعد میں جوڑا گیا تھا۔

اس داستان کی تمہید میں حوریس کی مدح و ثناء کی گئی ہے جو دونوں ملکوں (شمالی اور جنوبی مصر) کو خوشحالی بخشتا ہے۔ پھر شمال اور جنوب کے بادشاہ کی طول العمری کی یہ دعا مانگی گئی ہے کہ بادشاہ کو بقائے

دوام نصیب ہو'اس کے بعد حوریس اور ساتت کے درمیان نزاع کا ذکر ہے مگر اس نزاع کا نتیجہ قتل اور خونریزی کی شکل میں نہیں نکلتا بلکہ گیب (زمین کا دیوتا) اس جھگڑے کو امن وآشتی سے طے کرا دیتا ہے۔ پتھر پر کندہ داستان یوں ہے:۔

''نورتن خداوند پتاح کے سامنے حاضر ہوئے اور اس نے حوریس اور ساتت کا جھگڑا چکایا۔ اس نے ساتت کو شمال کا بادشاہ مقرر کیا اور حوریس کو جنوب کا بادشاہ مقرر کیا' جہاں اسکا باپ (اُزریس) ڈوبا تھا۔ تب گیب نے ساتت سے کہا کہ اپنے ملک کو جا۔ مگر گیب کو خیال آیا کہ میں نے ساتت کو حوریس کے برابر حصہ دیدیا ہے پس اس نے کل موروثی جائیداد حوریس کے حوالے کردی۔ یعنی اپنے پوتے کے۔ اس طرح حوریس کو پورا ملک مل گیا' دونوں ملک متحد ہو گئے اور حوریس دونوں ملکوں کا بادشاہ بن گیا اور دونوں ملکوں کا دارالسلطنت ان ملکوں کا مقامِ اتصال (ممفس) قرار پایا''۔

اسکے بعد حوریس کا شجرۂ نسب بیان ہوا ہے جس کی ابتدا پتاح تھا۔ پتاح جو عرش اعظم پر بیٹھا ہے۔ وہ نون (پانی) ہے اور اس کی بیوی نونت ہے جس نے اتوم کو جنا۔ پتاح عظیم ہے وہ نورتن کا دل اور زبان ہے۔ پتاح جس نے دیوتاؤں کو پیدا کیا۔ تب دل اور زبان اتوم کے روپ میں وجود میں آئے۔ اس نے دل میں ''کا'' پھونکا تو دل سے ''حوریس'' پتاح ہوا اور زبان سے ''ساتت'' پتاح ہوا۔ یعنی پتاح نے پہلے دل میں ارادہ کیا پھر اتوم کی تخلیق کا حکم دیا۔ اس طرح دل اور زبان کا اختیار جسم کے دوسرے تمام اعضاء پر ہو گیا۔ وہ کہتے تھے کہ پتاح تمام دیوتاؤں' تمام جانوروں' تمام رینگنے والی چیزوں اور مویشیوں میں ہے۔ وہ جو سوچتا اور جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔ تب پتاح نے اپنے دانتوں اور ہونٹوں سے شوُ اور طفنوت کو پیدا کیا۔ وہ جو کچھ آنکھوں سے دیکھتے ہیں کانوں سے سنتے ہیں اور ناک سے سونگھتے ہیں اسکی خبر دل کو پہنچاتے ہیں اور پھر دل زبان کے ذریعہ اپنے خیال کا اعلان کرتا ہے۔ اسی ضمن میں ایک تحریر ملاحظہ ہو:۔

''اس طرح دیوتاؤں کی تشکیل ہوئی اور پتاح کی نورتن مکمل ہوئی۔ دراصل دلِ حوریس نے جو

کچھ سوچا اور زبان (ساتت) کو جو حکم دیا اس سے پوری کائنات کا نظام بنا۔ پس ''کا'' کی تخلیق ہوئی اور ہمسوت روحوں کا تعین کیا گیا۔ وہ جو غذا' جو آزوقہ حیات پیدا کرتی ہیں اور ہر اسکو انصاف دیا گیا جس کا عمل پسندیدہ ہے۔ اور اس کو بے انصافی دی گئی جس کا عمل ناپسندیدہ ہے۔ اس کو زندگی دی گئی جو مطمئن ہے اور اس کو موت دی گئی جو گناہگار ہے۔ اس طرح تمام کام اور پیشے بازوؤں کی قوت اور پاؤں کی حرکت اور اعضاء کے منصب اس کے حکم کے مطابق مقرر ہوئے جسے دل نے سوچا اور زبان سے ظاہر کیا اور جب پتاح نے تمام چیزیں خلق کرلیں تو وہ مطمئن ہوگیا اور اس نے آرام کیا''۔

اسکے بعد ممفس کا ذکر یوں ہے۔

''جہاں پتاح کے مندر میں ملک کا فاضل غلہ جمع ہوتا تھا اور جہاں اُزریس پانی میں ڈوبا تھا۔ اِزیس اور نفتیس نے اسے ڈوبتے دیکھا اور وہ بے حد دلگیر ہوئیں۔ تب حوریس نے بار بار چیخ کر انہیں حکم دیا کہ تم اُزریس کو پکڑ لو اور ڈوبنے نہ دو۔ وہ اُزریس کو عین وقت پر پانی سے نکال کر خشکی میں لائیں اور وہ ابدیت کے پراسرار دیوتاؤں کے پراسرار محل میں داخل ہوگیا۔ اس کے نقش قدم پر جو افق چمکتا ہے رع کے راستوں پر۔ وہ پتاح کے درباریوں میں شامل ہوگیا اس طرح اُزریس ملک کے شمالی حصہ میں خداوند کے محل میں پہنچا اور اسکا بیٹا حوریس شمالی ملک اور جنوبی ملک کا بادشاہ ہوا''۔

مصر کی تیسری داستانِ تخلیق فراعین مصر کے اٹھارویں خاندان (۱۵۸۷ تا ۱۳۷۵ ق م) کے دَور کی ہے۔ ان دنوں مصر کا دارالسلطنت تھیبیز (THEBES) تھا جو عبیدوز کے قریب جنوب میں واقع ہے۔ تھیبیز کا بڑا دیوتا آمون رع (سورج) تھا۔ مصریوں کا عقیدہ تھا کہ آمون رع کی کشتی دن کے وقت آسمان کے سمندر میں سے گزرتی ہے اور رات کے وقت ظلمات کے سمندر میں سے۔ ظلمات کے سمندر میں ایک مہیب اژدھا ''اپوفس'' (APOPHIS) رہتا ہے جو آمون رع کا جانی دشمن ہے۔ لہٰذا آمون رع کے مندر میں ہر روز سورج ڈوبتے ہی اژدھے کو پسپا کرنیکی خاطر منتر پڑھے جاتے تھے اور رسمیں ادا کی جاتی تھیں۔ اس داستان کے منتر کے ایک جزو کا عنوان تھا ''اپوفس کی پسپائی جو رع کا دشمن ہے اور اُزریس

کا' جو زندگی وخوشحالی اور تندرستی ہے''۔ اور تاکید تھی کہ یہ منتر ہر روز آمون رع کے مندر میں جو دونوں ملکوں کے بادشاہوں کا آقا ہے پڑھا جائے۔ اسی منتر کے چھبیسویں ٹکڑے کا ایک عنوان ہے'' رع کی تخلیقات کے علم کی کتاب اور اوفس کی ہزیمت'' تاکید تھی کہ یہ الفاظ پڑھے جائیں۔

خالق کائنات کا خود اپنے آپ کو اور اپنے دیوتاؤں کو پیدا کرنے کے ضمن میں ایک عجیب و غریب بیان ملاحظہ ہو:۔

'' آقائے کل نے وجود میں آنے کے بعد کہا میں وہ ہوں جو گھپری کی شکل میں وجود میں آیا۔ جب میں وجود میں آیا تو ہستی کا وجود ہوا' اور میرے وجود میں آنے کے بعد دوسری اشیاء کا وجود آیا۔ اس سے قبل کہ آسمان کا وجود ہوتا' اس سے قبل کہ زمین کا وجود ہوتا' اس سے قبل کہ زمین کی چیزوں اور رینگنے والے جانوروں کا وجود ہوتا' میں نے بعضوں کو نون (پانی) میں بیہوشی کے عالم میں رکھا۔ اس سے قبل کہ مجھے اپنے قیام کے لئے کوئی ٹیلا ملتا' میں نے عالم تنہائی میں ہر شئے کی شکل اپنے تصور میں مقرر کی' اس سے قبل کہ میں شؤ (ہوا) کو اپنے تھوک سے پیدا کرتا اور طفنوت (نمی) کو اپنی چھینک سے پیدا کرتا۔ اس سے قبل کہ اور چیزیں وجود میں آتیں' میں نے خود اپنے دل میں منصوبہ بنایا اور بکثرت ہستیوں کے پیکر ذہن میں تیار کئے بچوں کے پیکر اور بچوں کے بچوں کے پیکر۔ چونکہ آمون رع (سورج) تنہا تھا اور اسکی بیوی نہ تھی اسلئے میں وہ تھا جس نے اپنی مٹھی کے ساتھ جفتی کھائی۔ اپنے ہاتھ سے اپنی منی نکالی۔ تب میں نے قے کی اور میرے تھوک سے شؤ بن گیا اور میری چھینک سے طفنوت بنی اور نون (پانی) نے انکی پرورش کی اور جب وہ مجھ سے دور چلے گئے تو میری آنکھ نے انکی نگہبانی کی۔ اپنے وجود کے وقت میں تنہا تھا''۔

بعد ازاں بقیہ مخلوق کو تخلیق کرنے کے بارے ایک بیان:۔

'' پھر تین دیوتا نون' شؤ اور طفنوت پیدا ہوئے۔ میں نے تمام رینگنے والی چیزیں خلق کیں اور وہ جو نرسل کی جھاڑیوں میں رہتے ہیں (پرند) تب شؤ اور طفنوت نے گیب اور نوط کو جنم دیا اور گیب اور نوط نے اُزریس' حوریس ساتت اِزیس اور نفتیس کو اپنے جسم سے پیدا کیا''۔

ان دیوتاؤں کی تخلیق کا مقصد یہ تھا کہ اپوفس اژدھے کو ہلاک کرنے میں ان سے مدد لی جائے' رَع نے انکو منتر سکھائے۔ چنانچہ اژدھا ہلاک ہوا اور اسکا نام ونشان مٹ گیا۔ منتر کی عبارت درج ذیل ہے:۔

''پس اے آمون رع جس طرح تو نے اپنے دشمن کو ہلاک اور پامال کیا ہے اسی طرح فرعون کے ہر زندہ اور مردہ دشمن کو ہلاک اور پامال کر''۔

آخر میں تاکید کی گئی ہے کہ اپوفس کی شکل ہرے رنگ سے قرطاس پر بناؤ۔ اس تصویر کو ایک صندوق میں رکھو اور اس پر اپوفس کا نام لکھو' پھر صندوق کو خوب کس کر باندھو اور آگ میں ڈال دو۔ ایسا ہر روز کرو اور راکھ پر دن میں چار بار تھوکو اور بائیں پاؤں سے کچل دو۔ صندوق کو آگ پر ڈالتے وقت چار بار یہ منتر بھی پڑھتے جاؤ ''اے اپوفس' رع نے تجھ پر فتح پائی'' اور چار بار کہو ''حوریس نے اپنے دشمن پر فتح پائی'' اور چار بار کہو ''فرعون نے اپنے دشمنوں پر فتح پائی''۔

نوٹ:۔

یہاں میں باب دوئم کا اختتام کرتا اور کتاب ھٰذا کا معزز ترین باب (سوئم) شروع کرتا ہوں جو کہ احسن الخالقین کی اُن چنیدہ ہستیوں کے ذکر سے مرصّع ہے جنہوں نے شروع تا دمِ واپسیں بندگانِ خدا کو انکے خالق سے متعارف کروایا اور اسکے وحدہ لاشریک ہونے پر گواہی دی۔ ایسی ہستیوں پر سلام!

(باب سوئم)

تذکرۃ الانبیاء

ابتدائے نسلِ انسانی

گزشتہ صفحات میں آپ نے اقوام ماضی کے فاسد رسوم وعقائد پر بنظر غائر توجہ کی ہوتو ان میں مروج گمراہانہ رسوم کی منطقی وجوہات بھی جان چکے ہونگے۔ اسکے باوجود ہمارے ذہنوں میں کئی قسم کے سوالات جنم لیتے ہیں کہ آخر انسان (جو زمین پر خالق کائنات کی نیابت کا عہدہ بھی رکھتا ہے) کیونکر ایسی گمراہیوں کا شکار رہا۔ ہم یہ بھی سوچتے ہونگے کہ انبیاء ورُسل کی ایک کثیر تعداد کے زمین پر تشریف لانے کے باوجود انسان نے اپنی نیابت کا حق کیوں ادا نہیں کیا اور کیونکر حق بندگی' خالق حقیقی کے علاوہ کسی اور کو سونپ دینے جیسی خطا کا مرتکب ہوا۔ نہ صرف اقوامِ قدیم بلکہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ بھی کیونکر شرکیہ عقائد میں مبتلا ہوئے اس جواب کی تلاش میں ہمیں انبیاء وپیغمبران کی کرّہ ارض پر تشریف آوری اور انکے حالات واقعات کا اختصاراً ہی سہی جائزہ لینا ضروری ہے تا کہ اُن وجوہ کو تلاش کیا جائے کہ کیونکر انسان جو "احسن تقویم" پر خلق فرمایا گیا اور نیابت حق سبحانہ تعالیٰ جیسے اعزاز کا حامل تھا آخر کن اسباب کی بناء پر "اسفل سافلین" کی پاتال میں جا پڑا۔

بنی نوع انسان کے جدّ امجد سیدنا حضرت آدمؑ کے پُتلا کو پروردگارِ عالم نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنانے کا شرف عطا فرمایا پھر اس میں روح نفخ فرما کر انہیں زندہ ومتحرک کر دیا۔ انہی کی ایک بائیں پسلی نکال کر "حوا،، نامی انکا جوڑا بنایا آدمؑ کو نبوت عطا فرمائی اور کرّہ ارض پر سراندیپ (جزائر غرب الہند) کی ایک پہاڑی پر اتار دیا۔ حضرت حوا کو کہاں اتارا گیا اسکے بارے آراء متفرق ہیں' تاہم مفسرین و محققین کی اکثریت کے مطابق انہیں مکۃ المکرّمہ میں جدّہ کے مقام پر اتارا گیا۔

البتہ کرّہ ارض پر ان دونوں کی پہلی ملاقات مکہ سے چند کلومیٹر دُور عرفات کے جبل الرحمۃ پر ہوئی اور زمین پر نسل انسانی کی ابتداء ہوئی۔ جزائر سراندیپ (لنکا) کے ایک پہاڑ کی چٹان پر انسانی پاؤں کا ایک نشان صدیوں سے ثبت ہے جو عرصہ قدیم سے ہندوؤں' بدھوں اور عربوں کی عقیدت کا متحدہ

مرکز رہا ہے۔ بدھ اسکو شاکیہ مونی کے پاؤں کا نشان تصور کرتے ہیں۔ ہندو اسے شِو جی کے پاؤں کا نشان سمجھ کر اسکی تعظیم بجالاتے ہیں اور مسلمان اسے حضرت آدمؑ کے قدم مبارک کا نشان قرار دیتے ہیں۔

محققین نے نشاندہی کی کہ یہ نشان شاکیہ مونی کا بھی ہے، شِو جی کا بھی اور حضرت آدمؑ کے قدم مبارک کا نقش بھی یہی ہے۔ اس لئے کہ متذکرہ تینوں نام دراصل حضرت آدمؑ ہی کے ہیں۔ عرب تاجر شروع ہی سے بغرض تجارت جب بھی ہندوستان آتے تو اسکی زیارت کیلئے سراندیپ ضرور جاتے۔

اس میں شک نہیں کہ نوع انسانی کے ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام سلسلہء انبیاء و رُسل میں پہلے نبیؑ کے مرتبہ سے معزز ہیں، جیسے اس سلسلۂ مقدسہ کے آخری نبی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم جزیرۃ العرب سمیت تمام دنیا کے مقسوم کو بدل ڈالنے کیلئے مکہ مکرمہ میں ظہور فرما ہوئے۔ ہر صحیح العقیدہ مسلمان اور ہر سچے یہودی و نصرانی کا بھی اس پر ایمان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک کوئی نبی مبعوث نہ ہوگا۔ البتہ قربِ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی حضرت مسیح موعودؑ کی زمین پر دوبارہ واپسی احادیث مبارکہ سے ثابت ہے۔

> ''حضرت عیسیٰؑ دمشق کی جامع مسجد کے مینار پر اتریں گے، امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں شامل ہو کر بطور امام الامت تمام عالم کو داخلِ اسلام کریں گے، صلیب توڑیں گے، دجال کو قتل کریں گے، آپکی گواہی پر تمام عالم بمعہ یہود و نصارا داخلِ اسلام ہو جائیں گے۔ زمین پر نزول کے بعد چالیس سال تک زندہ رہیں گے۔ اس دوران آپؑ شادی کریں گے اولاد ہوگی اور پھر انتقال فرما کر مدینہ منورہ میں میرے پہلو میں دفن ہونگے'' (حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم)

خالق تعالیٰ نے جن و انس کو تخلیق فرما کر تنہا اور بے یار و مددگار نہیں چھوڑ دیا۔ بلکہ انکی رُشد و ہدایت کیلئے اپنے مخصوص بندگان کو مقرر بھی فرمایا، تا کہ وہ لوگوں کو انکے خالق سے متعارف کروائیں اور توحید سے بھٹکے یا من گھڑت عقائد کے حاملین کی رہنمائی کا فرض نبھائیں۔ حضرت آدمؑ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیچ کتنے انبیاء و پیغمبران گزرے ہیں اس (تعداد) کی تصدیق کسی الہامی کتاب سے میسر نہیں، اسلئے انبیاء کی صحیح تعداد کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ احادیث مبارکہ میں تخمیناً ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کی تشریف آوری مذکور ہے جن میں سے تین سو تیرہ انبیاء (رسول) تھے۔ نیز احادیث قرآن

اور دیگر آسمانی کتابوں، توریت وانجیل وغیرہ سے واضح ہوتا ہے کہ ہر دَور اور ہر قوم کے لوگوں کی اصلاح و فلاح اور توحید کا پیغام دینے کیلئے انبیاء و پیغمبران تواتر سے تشریف فرما ہوتے رہے۔ ایسا بھی ہوا کہ کسی ایک ہی زمانہ میں ایک سے زیادہ پیغمبران بھی مبعوث فرمائے گئے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلاً مِّنْ قَبْلِکَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَیْکَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَیْکَ ط (المومن:۷۸)

(ترجمہ) اور تحقیق ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی بہت سے رسول بھیج چکے ہیں جن میں سے بعض کے حالات ہم نے آپ کو بتائے ہیں اور بعض کے نہیں بتائے۔ (المومن:۷۸)

نبی رسول اور پیغمبر میں فرق

یوں تو ہر کسی خبر دینے والے کو عربی زبان میں نبی اور ہر پیغام رساں کو پیغمبر کہا جاتا ہے مگر قرآن کے حوالہ سے جب ہم نبی یا رسول کی بات کرتے ہیں تو یہ مخصص الفاظ خداوند تعالیٰ کے ان مخصوص بندگان کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو بندگانِ جن وبشر کی رشد و ہدایت اور راہنمائی کیلئے انکی طرف مبعوث فرمائے گئے۔ اس حوالہ سے سوال ہے کہ پیغمبر اور نبی ورسول میں کیا فرق ہے؟ جمہور کے نزدیک نبی وہ ہے جو من جانب اللہ وحی کے ذریعے قوم کی ہدایت کیلئے مقرر کیا جائے خواہ وہ جدید شریعت اور کتاب دیکر بھیجا جائے یا سابقہ شریعت پر قوم کو توجہ دلانے کیلئے مبعوث فرمایا جائے۔ جبکہ رسول اس خاص انسان کو کہتے ہیں جو نئی کتاب اور جدید شریعت کے ساتھ کسی زمانہ یا قوم کی طرف مبعوث کیا جائے۔ بندہ کے نزدیک پیغمبر وہ ہے جو کسی سابقہ شریعت ہی کی تجدید اور قوم کے بگڑے عقائد کی درستگی کیلئے مبعوث ہوتا ہے صاحب کتاب نہیں ہوتا۔ نبی اور رسول میں میرے نزدیک کوئی خاص فرق نہیں۔ البتہ نبی یا رسول کو پیغمبر پر یہ برتری ہے کہ نبی اہل کتاب ہوتا ہے اور پیغمبر کی مانند کسی سابقہ امت پر بھی نبوت عطا فرما کر مبعوث فرمایا جاتا ہے۔ جبکہ رسول وہ ہے جو صاحب کتاب بھی ہو اور صاحب شریعت بھی کہ اپنی شریعت قوم پر یا اقوام پر عائد فرمائے۔

ہر قوم کیلئے بعثتِ رُسل

یہ حقیقت ہے کہ حضرت آدمؑ سے لے کر آنحضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم تک ہزار ہا پیغمبران تشریف لائے اور انہوں نے اپنی اپنی قوم کو توحید کا پیغام پہنچایا۔ انبیاء و رُسل کی صحیح تعداد اور انکے زمانوں کا تعین اگرچہ مشکل ہے تاہم مفسرین اور محققین کی اکثریت اس پر متفق ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار تک پیغمبران مبعوث ہوئے جن میں تین سو تیرہ انبیاء ہیں۔ ان میں سے بعض کے اسمائے گرامی اور انکے حالات قرآن میں مذکور ہیں اور کچھ کے دیگر الہامی کتب و صحائف میں، لیکن بہت سوں کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ البتہ یہ بات طے ہے کہ کوئی قوم انکی تعلیمات سے محروم نہیں رہی۔ کئی مرتبہ تو ایسا بھی ہوا کہ ایک ہی وقت میں ایک سے زائد انبیاء بھی مبعوث ہوئے اور ایک قوم کے نبی سے دوسری قومیں ناواقف رہیں۔ جیسے حضرت ہودؑ اور حضرت شعیبؑ سے یہودی ناواقف تھے اور جیسے یہود و نصاریٰ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کو صرف بادشاہ مانتے تھے مگر پیغمبر تسلیم نہیں کرتے تھے، جبکہ عرب اُن کو پیغمبر مانتے تھے۔ قرآن نے دراصل صرف ان انبیاء و پیغمبران کا تذکرہ فرمایا ہے جن سے عرب اور یہود و نصاریٰ واقف تھے انکے علاوہ متعدد انبیاء و پیغمبران کا ذکر قرآن میں نہیں اور صرف یہ اصولی بات بتادی گئی کہ ہر قوم کیلئے ایک رسول ہے۔

''وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ''

اور یقیناً ہم نے ہر قوم میں رسول بھیجا (یونس:۴۷)

اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ؕ وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر:۲۴)

اور کوئی قوم ایسی نہیں کہ جس میں ایک متنبہ کرنے اور ڈرانے والا نہ آیا ہو (فاطر:۲۴)

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ (ابراھیم:۴)

اور ہم نے ہر رسول اسکی قوم ہی کی زبان میں بھیجا کہ وہ انہیں توحید کے بارے صاف صاف بتائے (ابراہیم:۴)

جس سے ثابت ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جو انبیاء و پیغمبران کی تعلیماتِ توحید سے محروم رہی ہو۔

انبیاء نے اپنی اپنی قوم کی زبان ہی میں انکو پیغام خداوندی پہنچایا تا کہ وہ بات بخوبی سمجھ سکیں۔
جہاں یہ طے ہے کہ مختلف اقوام پر مختلف انبیاء و پیغمبران کو مبعوث فرمایا گیا وہیں ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کسی مخصوص علاقے، قوم یا کسی معین وقت کیلئے نہیں، بلکہ تمام عالمِ دنیا کیلئے قیامت تک رسولِ رحمت بنا کر مبعوث فرمائے گئے اگرچہ ظہور صحرائے عرب میں ہوا۔

درجات انبیاء ورسل

سورۃ بقرہ آیت ۲۵۳ میں فرمان ہے۔

تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ (بقرۃ:۲۵۳)

(ترجمہ) ان رسولوں کو ہم نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مرتبے عطا کئے۔ ان میں کوئی ایسا تھا جس سے خدا خود ہم کلام ہوا، کسی کو اس نے دوسری حیثیتوں سے بلند درجات عطا کئے اور آخر میں عیسیٰؑ ابن مریم کو روشن نشانیاں عطا کیں اور پاک روح سے اسکی مدد کی (بقرۃ:۲۵۳)

اس سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ انبیاء میں بھی بلحاظ مراتب درجہ بندی ضرور ہے کسی کا مرتبہ کسی بناء پر اگر زیادہ ہے تو دوسرے کا کسی اور بناء پر۔ انبیاء ورسل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ شان و شرف میں اعلیٰ ترین ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سید المرسلین اور خاتم النبیّین کے مرتبہ پر فائز ہیں۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف عالمِ جن و بشر کی رشد و ہدایت کیلئے تشریف لائے بلکہ تمام کائنات کیلئے بھی رحمت بنا کر مبعوث فرمائے گئے۔ درجات میں کمی بیشی سے کسی کی نبوت و رسالت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ انبیاء و رُسل انسان ہو کر بھی انسانوں سے ماوریٰ ہوتے ہیں اور انہیں جو خصوصیات عام انسانوں سے ممیّز و ممتاز کرتی ہیں ان میں سب سے بڑی خصوصیت خالق کائنات کا ان سے ہمہ وقت قرب ہے اور رابطۂ کلام بذریعہ وحی یا الہام ہے۔

مکالمہ الٰہ کی متعدد صورتیں ہیں ان میں ایک صورت وحی کی ہے۔ عربی لغت کے لحاظ سے وحی کے معنی ہیں اشارہ کرنا، پیغام دینا، دل میں ڈالنا، دوسروں کے خیال میں اپنا خیال ڈالنا وغیرہ۔ البتہ لغوی اعتبار سے اسکے حقیقی معنی ہیں دوسروں سے چھپا کر کسی سے چپکے چپکے بات کرنا۔

قرآن مجید میں لفظِ وحی اپنے مفہوم کے اعتبار سے انہی تین معنوں میں آیا ہے۔اوّل فطری حکم' دوم دل میں بات ڈالنا اور سوم چپکے چپکے بات کرنا۔ان میں ایک مفہوم مشترک ہے کہ بغیر زبان استعمال کئے اپنا مفہوم کسی دوسرے کو سمجھا دینا اور اگر الفاظ استعمال بھی کئے جائیں تو ایسی رازداری سے کہ دوسرا اس کو سن نہ سکے۔احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں وحی کی اور بھی صورتیں بیان ہوئی ہیں جن کو مدنظر رکھتے ہوئے حافظ ابن قیمؒ نے وحی عمد کی سات اقسام بیان کی ہیں۔

۱۔ فرشتے کا کسی شکل میں متشکل ہو کر پیغام دینا:

۲۔ فرشتے کا اپنی اصل شکل میں ظاہر ہو کر پیغام دینا:

۳۔ دل میں پھونکنا یعنی القاوالہام کرنا:

۴۔ گھنٹی کی طرح آواز کر کے مطلع کرنا:

۵۔ روبرو طریق مکالمہ:

جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر شرفِ ہمکلامی نصیب ہوا۔(جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوران معراج یہ شرف پایا)

۶۔ بلاواسطہ مکالمہ:

(رؤیاے صادقہ یعنی نیک وکاروں بطورِ خاص اولیأ وانبیاء کے خواب)

انبیاءورُسل کے بارے غیر اسلامی تصور

نبی، رسول یا خدائی فرستادہ کا تصور تو تقریباً ہر قوم میں ملتا ہے لیکن رسالت و نبوت کا اسلامی تصور ایسے غیر اسلامی تصور کو سختی سے ردّ کرتا ہے جس میں نبوت و رسالت کے بارے توازن بگڑ جائے اور حدّ اعتدال پامال ہو جائے۔ ایسے کسی غیر اسلامی تصور میں کہیں روحانی پاکیزگی یا اخلاقی بلندی دکھائی نہیں دیتی جس میں انبیاء ورُسل کی شان و عظمت کو نہ صرف سبک کیا گیا ہو، بلکہ یہودیوں کی مانند ان کی ذات اقدس پر رقیق حملے بھی کیے گئے ہوں۔

کسی گروہ نے انبیاء ورُسل کی شان میں گستاخیاں کرنا اپنا فرض منصبی ٹھہرالیا تو کسی نے انکی تکریم میں اس قدر مبالغہ آرائی سے کام لیا کہ انہیں اولادِ خدا قرار دیکر خدائی میں حصہ دار ٹھہرالیا۔ یوں ماضی قریب کے مختلف گروہ بھی ماضی کی جاہل و گمراہ اقوام کی طرح انکی تصاویر اور بت بنانے لگے۔ جبکہ اسلام نے رسالت و نبوت کا وہ تصور دیا جو ہر قسم کی افراط و تفریط سے پاک اور انبیاء کی شان و شرف کے عین موافق ہو اور انکا شاندار تعارف بہم پہنچاتا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے آلِ عمران میں ارشاد ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۚ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ

(آلِ عمران:۱۶۴)

ترجمہ: ''یقیناً اللہ نے مسلمانوں پر احسان فرمایا کہ انہی میں سے ایک رسول اُن میں مبعوث فرمایا جو اُن پر (قرآن کی) آیتیں پڑھتا اور انہیں پاک کرتا اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے حالانکہ وہ اس سے پیشتر (آلودہ شرک ہونے کے باعث) کھلی گمراہی میں تھے'' (آلِ عمران:۱۶۴)

نبوت و رسالت کے اسلامی تصور سے آشنا ہونے کیلئے اسکے غیر اسلامی تصور پر نظر ڈالنا بھی ضروری ہے۔ مثلاً یہودیوں کے نزدیک پیش گوئی کرنے والا ہر شخص نبی ہوتا ہے۔ وہ نبی کو ایک معمولی اور اپنے جیسا انسان سمجھتے ہیں جو ایک گھٹیا اور رسوا کن تصور ہے۔ یہودی اس نظریہ کے قائل ہیں کہ نبی عام لوگوں کی طرح ہر قسم کا گناہ بھی کر سکتا اور بداخلاقیوں کا مرتکب بھی ہو سکتا ہے اور اسکے باوجود بھی نبی رہتا ہے۔ اسی بناء پر یہودیوں کی مقدس کتابوں میں تحریفات کی مدد سے انبیاء ورُسل کی پاک ذوات پر ایسے

ایسے من گھڑت غلیظ الزامات لگائے گئے کہ بیان سے باہر ہیں۔ان الزامات کو پڑھ کر کوئی صحیح العقیدہ مسلمان تو کجا کسی بھی شریف النفس انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

مثلاً چند اقتباسات ملاحظہ کیلئے پیش ہیں۔(نقل کفر کفر نہ باشد) حضرت نوح علیہ السلام کے بارے انکی مذہبی مقدس کتاب سے مأخذ ایک اقتباس:۔

''اور نوح کاشت کاری کرنے لگا۔اس نے انگور کا باغ لگایا اور اسنے اسکی مئے پی اور اسے نشہ آ گیا اور وہ اپنے ڈیرے میں برہنہ ہو گیا'' (پیدائش باب ۹۔۲۰ تا ۲۵)

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے بارے ایک بیہودہ اقتباس:۔

''اور اس ملک میں کال پڑا اور ابراہام (ابراہیمؑ) مصر کو گیا کہ وہاں ٹکا رہے' کیونکہ ملک میں سخت کال تھا اور ایسا ہوا کہ جب وہ مصر میں داخل ہونے کو تھا تو اس نے اپنی بیوی سارہ سے کہا' دیکھ میں جانتا ہوں کہ تو دیکھنے میں خوبصورت عورت ہے اور یوں ہوگا کہ مصری دیکھ کر کہیں گے کہ یہ اسکی بیوی ہے' سو وہ مجھے تو مار ڈالیں گے مگر تجھے زندہ رکھ لیں گے' سو تو کہہ دینا کہ میں اسکی بہن ہوں تا کہ تیرے سبب سے میری خیر ہو اور میری جان تیرے سبب بچی رہے۔اور یوں جب ابراہام مصر میں آیا تو مصریوں نے دیکھا کہ یہ عورت بہت خوبصورت ہے اور فرعون کے امرأ نے اسے دیکھ کر فرعون کے حضور اسکی تعریف کی اور وہ عورت فرعون کے گھر پہنچا دی گئی اور اس نے اسکی خاطر ابراہام پر احسان کیا'' (پیدائش باب ۱۲۔۱۰ تا ۱۷)

حضرت لوط علیہ السلام کے بارے ایک نازیبا لن ترانی:۔

''لوط صغر سے نکل کر پہاڑ پر جا بسا اور اسکی دونوں بیٹیاں اسکے ساتھ تھیں سو اسی رات انہوں نے اپنے باپ کو مئے پلائی اور دونوں اپنے باپ سے حاملہ ہوئیں'' (پیدائش ۱۹۔۲۰ تا ۲۸)

حضرت داؤدؑ کے بارے ایک گری ہوئی حرکت ان سے منسوب کی گئی ہے کہ:۔

''اپنی فوج کے ایک افسر (اوریاؑ) کی بیوی کو نہاتے ہوئے دیکھا تو اس پر فریفتہ ہو گئے چنانچہ ایک ایسے معرکہ میں (جہاں جان جانے کا بہت احتمال تھا) اوریاؑ کو اس نیت سے شامل کیا کہ اگر مر جائے تو اسکی بیوی سے نکاح کروں۔وہ اس معرکہ میں شہید ہو گیا اور حضرت داؤدؑ نے

اسکی بیوہ سے نکاح کیا۔

پھر جب دو شخص آپس کے ایک جھگڑے میں انصاف مانگنے حضرت داؤدؑ کے پاس آئے اور ان میں سے ایک کہنے لگا کہ دیکھیں اس کے پاس ننانوے بھیڑیں ہیں اور یہ مجھ سے ایک بھیڑ مزید لینے پر مصر ہے تاکہ اسکے پاس سو بھیڑیں پوری ہو جائیں جبکہ میرے پاس صرف ایک ہی بھیڑ ہے۔اس پر حضرت داؤدؑ نے ننانوے بھیڑیں رکھنے والے کے خلاف فیصلہ دیا اور اسے زبردستی دوسرے کی بھیڑ چھیننے سے منع کیا۔

اس پر ان دونوں نے کہا ہم دراصل فرشتے ہیں اور آپکو اسی طرف متوجہ کرنے کیلئے خداوند خدا کے ہاں سے بھیجے گئے ہیں۔اس پر حضرت داؤدؑ کو اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا اور وہ اپنے خدا سے رو رو کر اور گڑگڑا کر معافی مانگنے لگے۔مگر خداوند نے معافی کیلئے یہ شرط عائد کی کہ پہلے اوریاء سے جا کر معافی طلب کرو۔جب وہ معاف کر دے تو ہی میں معاف کروں گا۔چنانچہ حضرت داؤدؑ اوریاؑ کی قبر پر گئے اس سے معافی مانگی کہ میں نے تمہاری بیوی سے نکاح کیا۔اس نے جواب دیا کہ اے خدا کے پیغمبر میں نے آپکو معاف کیا۔اس سے معافی مل جانے کے بعد وہ خداوند کے حضور بھی معافی کی استدعا کرنے لگے۔اس پر خداوند نے کہا کہ تم واپس جاؤ اور اسکو پوری بات بتا کر اس سے معافی طلب کرو۔

حضرت داؤدؑ نے دوبارہ اسکی قبر پر جا کر اسکو وضاحت سے بتایا کہ میں نے تمہیں دانستہ اس ارادہ سے ایسے خطرناک معرکہ میں شامل کر کے روانہ کیا تھا کہ اگر تم شہید ہو جاؤ تو میں تمہاری بیوہ سے نکاح کر لوں۔یہ سن کر اوریاؑ نے معافی دینے سے منع کر دیا اور کہا کہ اس کا فیصلہ خداوند کے حضور قیامت کے روز ہی ہوگا۔اس پر آپ کئی روز گریہ وزاری کرتے ہوئے اپنے رب سے معافی مانگتے رہے آخر کار خداوند کو ان پر ترس آ گیا اور خداوند نے اوریاؑ کو کہا کہ داؤدؑ کو معافی دیدے۔چنانچہ اوریاؑ نے حضرت داؤدؑ کو معاف کر دیا اور تب خداوند نے بھی داؤدؑ کو معاف کر دیا''۔

اسی طرح حضرت اسحاقؑ، حضرت موسیٰ علیہ سلام و حضرت ہارون علیہم السلام پر بھی بہت سے

غلیظ الزامات لگائے گئے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے الزامات کی تردید فرماتے ہوئے یہودیوں کو متنبہ فرمایا کہ انبیاؑ ورُسل بشر ضرور ہوتے ہیں مگر وہ عام انسانوں سے بہت ماوریٰ بھی ہوتے ہیں' انکی محبت واطاعت ہی عین ایمان ہے اور وہ الزامات سے مبرّا اور معصوم و پاکباز ہوتے ہیں۔

عیسائیوں کا تصورِ رسالت بھی انبیاء کے شایان شان نہیں۔ انہوں نے نبوت ورسالت کے مسئلہ پر اس قدر مبالغہ آرائی اور غلو سے کام لیا کہ حد اعتدال کو پامال کر ڈالا کہ کسی نبی کو خدا بنا ڈالا تو کسی کو خدا کا بیٹا۔ یہودیوں نے بھی جب بے اعتدالی کی تو حضرت عزیرؑ کو فرزند خدا قرار دیدیا' گمراہ عیسائی رسول کو بشریت سے پاک ناسوت اور لاہوت کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ انسان پیدائشی گناہگار ہے اور کوئی گناہگار کسی گناہگار کو راہِ راست پر نہیں لاسکتا' اس لئے خدا کا بیٹا اس کام کیلئے آسمان سے آنا چاہئے سوانہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا فرزند قرار دیدیا۔ مگر انکے ایسے تصور کو قرآن نے یکسر ردّ کرتے ہوئے جابجا فرمایا۔ یقیناً انہوں نے کفر کیا جو اس بات کے قائل ہیں کہ عیسیٰ ہی خدا ہے یا جنہوں نے کہا مسیح ابن مریم خدا کا بیٹا ہے اور وہ لوگ حق سے منکر ہوئے جنہوں نے کہا کہ ''خدا تین میں کا ایک ہے'' یعنی خدائی باپ' بیٹا اور روح القدس تینوں میں دائر ہے۔

ہندوؤں کے ہاں بھی پیغمبروں اور اوتاروں کو (جن کو کسی قسم کی خدائی طاقتیں یعنی معجزات و کرامات حاصل تھیں) نہ صرف خدا کا اوتار بلکہ انسان کے بھیس میں خدا سمجھا جاتا تھا۔ جیسے انہوں نے رام چندر جی کے متعلق یہ عقیدہ گھڑ لیا کہ انکے اندر وشنو (رب العالمین) نے حلول کیا ہوا تھا۔ اسی طرح شری رام کرشن جی کو بھی وشنو کا مظہر قرار دیکر ایک طرف انکی پرستش شروع کردی اور دوسری طرف انکی مذہبی کتب اور تماثیل کے مطابق یہی ہستی جنسی لذتوں اور حسین عورتوں پر مائل بہ کرم اور نہاتی ہوئی گوپیوں کے کپڑے چھپاتی نظر آتی ہے اور ان سے لطف اندوز ہونے کیلئے گوپیوں کی تعداد کے برابر جسم پیدا کرلیتی ہے۔

گوتم بدھ نے جب برہمنیت اور خداورُسل کے متعلق ہندو تصورات سے بغاوت کی اور انہیں بت پرستی سے منع کیا تو انکی تعلیمات کا خوشگوار اثر مرتب ہوا اور بت پرستی بہت حد تک دم توڑ گئی۔ مگر ہندو

قوم کی بدبختی اور گمراہی کا عالم یہ کہ بدھ کے انتقال کے بعد بدھوں پر اوّلاً تو بے حد ظلم ڈھائے انہیں بے دریغ قتل اور دیش بدر کیا' اور پھر حیرت انگیز طور پر خود ہی گوتم بدھ کی پوجا کرنے لگے اور انکے لاتعداد بت گھڑ لیے گئے۔

مشرکین عرب کا تصورِ رسالت بھی ہندوؤں' یونانیوں اور دوسری مشرک اقوام سے ملتا جلتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ انسانوں کی راہنمائی کے لئے انسانوں سے بالاتر ہستی ہونی چاہئے۔ مثلاً ملائکِ قدسی یا کوئی مافوق الفطرت ہستی۔ اسلئے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو انہوں نے حیرت زدہ ہوکر کہا کہ خدا نے بشر کو پیغامبر (رسول) بنا کر بھیجا ہے۔ (بنی سرائیل۔۹۴) ان مشرکین نے اولیائے خداوندی کے بت تراش رکھے تھے اور یہ بتوں کو نہ صرف اوتار بلکہ خدا مان کر انکی پوجا کرتے اور مرادیں پانے کیلئے دعائیں مانگا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت بھی تین سو ساٹھ بتوں کی پوجا ہوتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکے ایسے لغو عقائد سے انہیں باز رکھنے کیلئے نہ صرف بتوں کی تکذیب فرمائی بلکہ بت پرستی روکنے کیلئے بت پرستوں کے خلاف جہاد بھی کیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں پیغامِ توحید سناتے ہوئے واضح فرمایا کہ عبادت کے لائق صرف اور صرف خدائے واحد ہے جو تمام کائنات سمیت ہمارا اور تمہارا بھی خالق و مالک ہے۔ کل جِنات واولادِ آدمؑ پر لازم ہے کہ ذاتِ کبریاؑ کے ساتھ کسی کو بھی اس کی عبادت میں شامل یا شریک جاننے کی خطا کا ارتکاب قطعی نہ کرے، کیونکہ یہ ناقابل معافی جرم ہے۔

حضور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک عظیم کارنامہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت ورسالت کے غیر اسلامی تصور کو رد کیا اور انبیاؑ ورُسل کے بارے لوگوں کو وہ پاکیزہ تصور دیا جس سے انبیائے سابقین کی سیرت وکردار کے تمام پہلو آئندہ نسلوں کے لئے محترم اور محفوظ ہو گئے۔

ابوالبشر سیدنا حضرت آدم علیہ السلام

تخلیقِ انسانی کے مبدأ ہی کو نبوت جیسے مرتبہ سے نوازا جانا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ خالق کائنات نے اپنی شاہکار تخلیق (انسان) کو کسی لحہ بے یارو مددگار نہیں چھوڑا۔ جس طرح رزّاقِ حقیقی نے ہر نوپید کی غذا کا انتظام اسکی پیدائش سے بھی پہلے کر رکھا ہے اسی طرح انسان کو حیران وسرگرداں بھٹکنے سے محفوظ رکھنے اور اسکی ھدایت وراہنمائی کیلئے بعین ایسا ہی نظام قائم فرمادیا کہ اسکی پیدائش سے بھی پہلے بشر اوّل کو عہدۂ نبوت سے سرفراز فرما کر کرّہ ارض پر اتارا جن کا نام خود خالق کائنات نے آدمؑ رکھا۔ یوں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو اپنی قدرتِ کاملہ سے بہ تمام وکمال پیدا کر کے دنیائے انسانیہ کا باپ بنایا جو دنیا کے پہلے انسان اور پہلے نبی کے مرتبہ جلیلہ سے معزز ہوئے۔

بعض مفسرین نے آیات قرآنیہ میں مستعمل لفظِ آدم سے تنہا آپؑ کی ذات مراد لی ہے جبکہ علمائے جمہور کے نزدیک ان آیاتِ مبارکہ کا اطلاق تمام بنی نوع آدم پر ہوتا ہے۔ کچھ لوگ جو لفظِ آدم کا مادہ ''آدمت'' قرار دیتے ہیں وہ اس کا ترجمہ گندم گوں رنگ والا اور راہبر وراہنما کرتے ہیں اور یہ دونوں صفات حضرت آدمؑ میں موجود تھیں۔ ایک تو آپکا رنگ گندم گوں تھا اور دوسرے یہ کہ وہ بحیثیت نبی اپنی اولاد کے راہبر وراہنما بھی ہیں۔ سنسکرت میں آد پہلے کو کہتے ہیں اور من منش کا مخفف ہے' گویا لفظِ آدم سنسکرت میں بھی ''منش کے باپ'' کے معنی دیتا ہے۔ جو لوگ اس کا مادہ ادیم (زمین) کیا کرتے ہیں انکے نزدیک یہ نام اسلئے ہے کہ انکا پُتلا زمین کی مٹی سے بنایا گیا تھا اور اس بارے مقدس صحائف وکتب گواہ بھی ہیں۔ تورات مقدس میں ہے:۔

''اور خداوند خدا نے زمین کی مٹی سے انسان کو بنایا اور اسکے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا تو انسان جیتی جان ہوا''۔ (کتاب پیدائش باب ۲/ ۷)

قرآن حکیم فرماتا ہے:۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ج (الحجر:۲۶)

''اور بنایا ہم نے آدمی کو کھنکتی ہوئی مٹی سے جو اصل میں (ایک سیاہ بودار) گارا تھی'' (الحجر/۲۶)

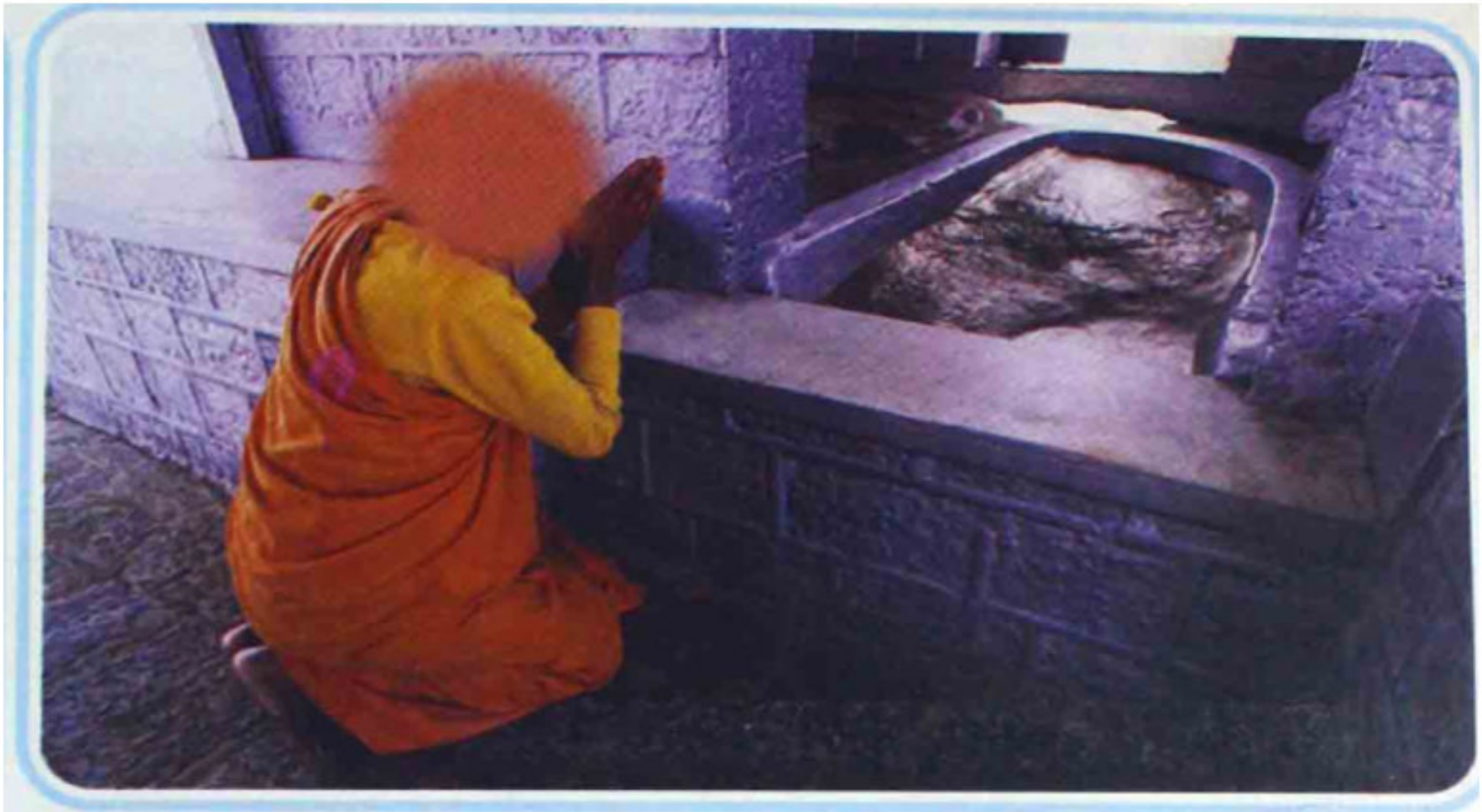

سری لنکا میں موجود حضرت آدم علیہ السلام سے منسوب قدم مبارک

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ (الرحمٰن/۱۴)

''اور بنایا آدمی کو کھنکھناتی مٹی سے جیسے ٹھیکرا'' (الرحمٰن/۱۴)

انسان کی صورتیں بنانے کے بارے قرآن میں فرمان ہے:۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ (الاعراف:۱۱)

''اور تحقیق ہم نے تم کو خلق کیا اور تمہاری صورتیں بنائیں'' (الاعراف/۱۱)

انسانی صورت انسانی شناخت کا اہم ذریعہ ہے۔ مفسرین نے صورتوں سے مراد انسانی چہروں کے نقوش بھی لئے ہیں اور مختلف رنگ و نسل، مختلف قد و قامت، مختلف کردار و افکار کی حامل اقوام کی تزئین بھی اس میں شامل کی ہے۔ انسان خواہ چھوٹے قد کا ہو یا طویل قد، کالا ہو یا گورا، طاقتور ہو یا ناتواں، نیک ہو یا گرفتارِ معصیت، شرقی ہو یا غربی الغرض کرۂ ارض کے کسی مقام کا باسی ہو ایک دوسرے سے لاکھ متفرق ہونے کے باوجود اسکی شناخت (بحیثیت انسان/ بنی آدم) دشوار نہیں ہوتی۔ ابو داؤد اور ترمذی میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی تخلیق یک مشت خاک سے (جو تمام روئے زمین کی مختلف جگہوں سے لی گئی تھی) فرمائی ہے۔ اسی وجہ سے انکی رنگ و نسل میں طرح طرح کے لوگ ہیں، گورے کالے، سانولے، بدمزاج، سخت خو، یا نرم مزاج و نیک خو وغیرہ۔ جب آدمؑ کا پتلا تیار ہو کر اس قابل ہو گیا کہ اس پر رُوح انسانی فائز کی جا سکے تو اللہ تعالیٰ نے اُس پُتلے میں رُوح پھونکی اور وہ زندہ و جاندار ہو گیا اور پھر حضرت آدمؑ سے توالد و تناسل کا سلسلہ جاری ہوا''۔

ابتدائے آفرینش میں مادرِ انس حضرت حوّا کے ہاں اولاد جلد اور جوڑا جوڑا پیدا ہوتی تھی اور ایک وقت پیدا ہونے والے نر اور مادہ جوڑے کا نکاح دوسری مرتبہ پیدا ہونے والے جوڑے کے ساتھ کر دیا جاتا تھا۔ حضرت آدمؑ کی شریعت میں اسکی اجازت تھی کیونکہ اُس وقت افزائش نسل کیلئے اس کے سوا کوئی دوسری صورت ممکن نہیں تھی۔ جنت سے اخراج کے بعد حضرت آدمؑ کو جزائر غرب الہند میں سراندیپ (سیلون/ لنکا) کی ایک پہاڑی پر اور حضرت مادرِ انسان حوّا سلام اللہ علیہا کو وادیٔ مکہ میں جدّہ

کے مقام پر اتارا گیا۔ بعد از قبولِ توبہ کرہ ارض پر دونوں میاں بیوی کی پہلی ملاقات عرفات سے چند کلو میٹر دُور جبل الرحمۃ کے مقام پر ہوئی اور یہاں سے انسان کی تولید کا سلسلہ شروع ہوا۔ مفسرین و محققین کے مطابق حضرت آدمؑ کی زبان عربی تھی مگر زمین پر اتارتے وقت دیگر نعمتوں کے ساتھ عربی زبان سلب کر کے سریانی زبان عطا فرمائی گئی۔ البتہ بعد از معافی پھر سے عربی زبان بھی عطا فرما دی گئی تھی۔

غایت پیدائش آدم

اصفیائے کاملین کے نزدیک انسان کی پیدائش کی غایت' حصولِ عرفانِ حق تعالیٰ کے سوا کچھ نہیں۔ حدیث قدسی " کُنتُ کَنزًا مَخفِیً فَاِنُ اَحبَبتَ اَنُ اَعرَفَ فَخَلَقَ الُخَلقِ "''میں ایک خفیہ خزانہ تھا پھر جب میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں یعنی میری شانِ عظمت' میری کبریائی اور کمالات کو شناخت کیا جائے تو میں نے مخلوق کو پیدا فرمایا''۔ اس پر گواہ ہے۔

> ابتدائے خلق یوں ہوئی کہ جب خود کا مشاہدہ کرنا پسند فرمایا تو معاً عکس رُوئے مبارک بصورتِ نور سامنے موجود ہوا' چونکہ پروردگار جل جلالہٗ نہایت حسین تھا سو نگاہِ جمال اس شبیہ مبارک پر پڑی۔
>
> جب اپنے علاوہ کسی اور کی موجودگی کا خیال فرمایا تو نگاہِ جلال سے مخاطب کو فرمایا کہ تو کون ہے؟ جلال کے باعث مخاطب پر ہیبت شاہی طاری ہوگئی اور جواب میں کہا کہ تیرے علاوہ کوئی (معبود) نہیں۔ اس جواب پر مالک کائنات نے خوش ہوتے ہوئے فرمایا' تو نے قابل تعریف جواب دیا تیری بھی تعریف ہوگی اور تو (میری مخلوق پر) میرا رسول ہوگا۔

یہیں سے اس مکالمہ کے دو حصے کلمہ الٰہی کے دو جزو ٹھہر گئے۔ پہلا جزو توحیدِ الٰہی کی گواہی یعنی اللہ کے علاوہ کوئی لائق عبادت نہیں اور دوسرا حصہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونیکی گواہی دینا دوسرا جزو لازم ٹھہر گیا۔ یہی قاعدہ آئندہ ہمیشہ کیلئے تمام تر انبیاء و رُسل کے اعترافِ رسالت کی گواہی پر بھی لازم ٹھہر گیا۔ اسی بناء پر (لا الٰہ الا اللہ) کا اقرار ہر نبی، پیغمبر اور رسول کے کلمہ کا پہلا جزؤ ہے اور ہر پیغمبر و کی رسالت و نبوت کا اقرار دوسرا جزؤ۔ جیسا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کے کلموں کی ترکیب میں

ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

مثلاً:۔

لا الٰہ الا اللہ آدم صفی اللہ علیہ السلام

لا الٰہ الا اللہ نوح نجی اللہ علیہ السلام

لا الٰہ الا اللہ ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام

لا الٰہ الا اللہ موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام

لا الٰہ الا اللہ عیسیٰ روح اللہ علیہ السلام

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ودیگر انبیاء ورسل کے کلمات میں انکے نام۔

قیام کلمہ کے لاکھوں سال بعد خالق کائنات نے مختلف خواص وخصائل کے حامل چار عناصر یعنی مٹی، پانی، آگ اور باد کی آمیزش سے انسان کا پُتلا بنایا جو متعدد خوبیوں سے مرصّع تھا۔ حرارتِ آتش سے سوکھ کر کھنکناتی ٹھیکری کی طرح تیار ہوگیا تو خالق کائنات نے اس میں رُوح پھونک کر اسے زندہ و متحرک کر دیا۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں وارد ہے:۔

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا (۱) اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا (۲) اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا (الدھر:۳)

''بیشک انسان پر ایک وقت وہ گزرا کہ کہیں اسکا نام بھی نہ تھا''(۱) ''بیشک ہم نے انسان کو نطفہ (ملی ہوئی منی) سے پیدا کیا تا کہ ہم اسے جانچیں، پھر اسے سنتا دیکھتا کر دیا''(۲) ''بیشک ہم نے اسے سیدھا راستہ بتایا، اب وہ حق مانتا ہے یا ناشکری کرتا ہے''(الدھر:۱تا۳)

حضرت آدمؑ کو علم لدنی سے نوازا گیا تھا قرآن حکیم میں کئی جگہ اسکی تخصیص فرمائی گئی ہے۔ بموجب آیت قرآنی'' وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا '' (البقرۃ/۳۱) ثابت ہے کہ آپؑ کو اُن تمام اشیاء کے ناموں کا علم عطا فرمایا گیا جو آپکو عارض تھیں۔ یعنی تمام دینی ودنیوی علوم وفنون کے ممکنات اور تمام اشیاء کی ماہیت وحقیقت وخاصیات انکے دل میں بلا واسطہ کلام القاء فرمادی گئیں۔ کیونکہ اس کمالِ علمی کے بغیر

خلافت ارضی اور دنیا پر حکومت ممکن نہیں تھی۔ نیابت وخلافت ارضی کے خواہشمند ملائکہ نے اپنی ہار بھی آدم کی علمی فضیلت کے قائل ہونے کے بعد تسلیم کی۔ فرشتوں کیلئے آدم کی برتری اور استحقاقِ خلافت کے اقرار کے علاوہ چارہ نہ رہا اور انہیں یہ ماننا پڑا کہ اگر ہم زمین میں خلیفہ بنائے جاتے تو کائنات کے تمام بھیدوں سے ناآشنا رہتے اور خواصِ علوم سے یکسر ناواقف ہوتے۔

بایں وجہ کہ ہم نہ تو خورد ونوش کے محتاج ہیں کہ زمین میں ودیعت شدہ رِزق وخزائن کی جستجو کرتے۔ نہ ہمیں غرق ہونے کا کوئی اندیشہ کہ کشتیاں اور جہاز ایجاد کرنے کی تگ ودَو کرتے۔ نہ بیماری کا ڈر کہ قسم قسم کی اشیائے معالجات کے خواص واثرات کی چھان بین میں پڑتے۔ یوں کیمیائی مرکبات' فوائد طبیعیات وفلکیات' طبی ایجادات' علوم نفسیات و وِجدانیات اور اسی طرح کے دیگر بیش بہاء و بیشمار علوم وفنون کے اسرار اور انکی حکمتوں سے کیونکر واقف ہو پاتے۔ بلاشبہ یہ حضرت انسان ہی کیلئے موزوں تھا کہ وہ زمین پر خدا تعالیٰ کا خلیفہ بنے اور ان تمام حقائق ومعارف اور علوم وفنون کے رازوں سے واقف ہوکر نیابت الٰہیہ کا حق ادا کر سکے۔

آدمؑ کی اِس علمی فضیلت اور پیشانی میں دمکتے نورِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام کیلئے فرشتوں کو حکم ہوا کہ خلیفۃ اللہ کو تعظیمی سجدہ بجالائیں۔ فی الفور تمام فرشتوں نے حکم کی تعمیل کی' صرف ایک ابلیس تھا جس نے حکم الٰہی سے سرتابی کی جرأت کی' جو قوم اجنہ میں سے تھا اور اسکی بغاوت وسرتابی کی وجہ اسکا یہ مؤقف تھا کہ میں آدم سے افضل ہوں اللہ تعالیٰ نے مجھے آتش سے خلق کیا ہے اور آگ بلندی و رفعت چاہتی ہے جبکہ آدم مٹی سے بنایا گیا ہے۔ اس کا یہ مؤقف غرور وتکبر کی بناء پر تھا وہ جہالت میں اس قدر اندھا ہو گیا تھا کہ اپنے خالق کے حقوق اور احترامِ خالقیت سے بھی منکر ہو گیا۔ چنانچہ حکمِ الٰہیہ سے سرتابی اور غرور وتکبر کی بناء پر آئندہ ہمیشہ کیلئے بارگاہِ عزوجل سے دھتکار دیا گیا اور رجیم ولعین اور مقہور و مردُود قرار پا گیا۔ بعد ازاں اس نے بارگاہِ ایزدی میں درخواست کی کہ میری طویل عبادات اور معلم الملکوت کا مرتبہ رکھنے کے باوجود ایک چھوٹی سی بات پر مجھے دھتکار دیا گیا' چنانچہ مجھے اس دن تک مہلت عطا کی جائے جس روز مردے قبروں سے اٹھائے جائیں۔ اسکی استدعا قبول ہوئی اور ابلیس نے قیامت تک زندگی پاتے ہی آدم سے انتقام لینے اور اس سے دشمنی کرنے کا اعلان کر دیا۔

رُوح پھونکے جانے کے بعد حضرت آدمؑ ایک عرصہ تک جنت میں تنہا زندگی بسر کرتے رہے، مگر جنت جیسی جگہ میں راحت وسکون سے زندگی گزارنے کے باوجود ایک وحشت اور خلاء محسوس کرتے تھے اور انکی طبیعت فطری تقاضہ کے مطابق کسی ساتھی اور مونس وہمدم کی جویا نظر آتی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی بائیں پسلی سے حضرت حوّا کو پیدا فرمایا۔ حضرت آدمؑ اپنا ایک ہمدم ورفیق پا کر بے حد مسرور ہوئے اور اطمینان محسوس کرنے لگے۔

یہ جنت کہاں تھی اسکے بارے بھی مفسرین کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہؒ القاسم بلخیؒ ابن قتیبہؒ اور ابومسلم اصفہانیؒ کے مطابق یہ جنت زمین پر ہی تھی اور بعض مفسرین نے اسے آسمانوں پر بتایا ہے۔ توریت شریف نے اس کا مقام زمین پر ہی بتایا ہے اور جنت کے چار دریاؤں سیحوں، جیحوں، دجلہ اور فرات کے نام بھی لئے ہیں اور لکھا ہے کہ:۔

''خداوند خدا نے مشرق کی طرف عدن میں ایک باغ لگایا اور انسان کو (جسے اس نے بنایا تھا) اس میں رکھا''۔ (کتاب پیدائش باب ۲/۱۰ تا ۱۴)

اُن دونوں کو جنت میں رہنے اور کھانے پینے کی مکمل آزادی تھی لیکن صرف ایک مخصوص درخت کا پھل کھانے سے منع کر دیا گیا تھا اور بتقاضۂ احتیاط حکم تھا کہ اس درخت کے قریب بھی نہ جائیں وگرنہ انکے گناہگار ہونے کا اندیشہ ہے۔ یہ شجر ممنوعہ کونسا تھا اسکے متعلق مفسرین کے مختلف اقوال ہیں کوئی اسے سیب گمان کرتا ہے تو کوئی اسے گندم قرار دیتا ہے مگر زیادہ تر اتفاق اس امر پر ہے کہ یہ گیہوں کا درخت تھا۔ بہرحال توریت کے مطابق یہ خیر اور شر کی تمیز کا درخت تھا۔ ابلیس کے بہکانے پر وہ پھل آدمؑ وحوّا نے کھالیا تو اس لغزش کی پاداش میں انہیں زمین پر اتار دیا گیا۔ اس ضمن میں قرآن حکیم نے ''ہبوط'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے جسکے معنی بلندی سے پستی کی طرف اترنے کے ہیں ''قَالَ اِهْبِطُوْ'' فرمایا خدا نے تم بہشت سے اتر جاؤ۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ جنت زمین پر نہیں عالم بالا پر ہی ہوگی جہاں سے حضرت آدمؑ کو کرّہ ارض پر برصغیر ہند میں سراندیپ (سیلون/لنکا) کی ایک پہاڑی پر اور حضرت حوّا کو مکہ مکرمہ سے چند کلومیٹر دور جدّہ کے مقام پر اتار دیا گیا۔ جہاں تک توریت مقدس کے بیان کا تعلق ہے تو اھبط کے معنوں میں بلندیٔ مراتب سے تنزلی بھی مراد لی جاسکتی ہے۔ جدّہ کے معنی دادی کے ہیں اسلئے

غالب گمان ہے کہ اس جگہ کا نام حضرت حوّا کی نسبت ہی سے جدّہ قرار پایا۔

حضرت آدمؑ ابلیس کے بہکانے سے خطا کر تو بیٹھے تھے مگر سخت نادم اور افسردگی کے شکار ہو گئے شرم کے باعث تین سو سال آسمان کی طرف آنکھ نہ اٹھائی ہر وقت پچھتاتے اور روتے رہتے اور خدا تعالیٰ کے حضور معافی کے خواہش مند تھے۔ بارگاہِ الرحم الراحمین میں انکی گریہ زاری اور توبہ قبول فرمالی گئی۔ پھر یہ دونوں میاں بیوی عرفات کے جبل الرحمۃ پر آپس میں ملے اور تب سے انکی اولاد کا سلسلہ تمام کرّۂ ارض پر نسل در نسل لاکھوں سال سے چلا آتا ہے اور آئندہ بھی نامعلوم کتنے عرصہ تک جاری رہیگا۔

توریت شریف کی تصریح کے مطابق حضرت آدمؑ نے زمین پر اترنے کے بعد نوسو تیس برس عمر پائی۔ آپکا رنگ گندم گوں تھا اور آپؑ نہایت طویل القامت تھے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ کے حوالہ سے آدمؑ کا قد ساٹھ ہاتھ بتایا گیا ہے۔ بعد از وصال آپکا تمکن پہلے آسمان پر ہے اور شبِ معراج حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال پہلے آسمان پر حضرت آدمؑ ہی نے کیا تھا۔

قرآنی اطلاعات کے مطابق تخلیق آدمؑ وحوّا اور دریں حالات کے بارے سورۃ البقرۃ میں تفصیل کچھ یوں ہے:۔

وَ اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِکُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَ نُقَدِّسُ لَکَ ؕ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ(۳۰) وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَی الْمَلٰٓئِکَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِئُوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ(۳۱) قَالُوْا سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ(۳۲) قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّکُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۙ وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا کُنْتُمْ تَکْتُمُوْنَ(۳۳) وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰی وَ اسْتَکْبَرَ ۫ وَ کَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ(۳۴) وَ قُلْنَا یٰٓاٰدَمُ اسْکُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُکَ الْجَنَّةَ وَ کُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَیْثُ شِئْتُمَا ۪ وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَکُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ(۳۵) فَاَزَلَّهُمَا

جدہ میں اماں حوا علیہا السلام کا مزار مبارک

الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ص وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ج وَ لَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ(۳۶) فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ط اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ(۳۷) قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ج فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ(۳۸)

(البقرۃ: ۳۰ تا ۳۸)

اور جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں تو فرشتوں نے عرض کیا کہ کیا تو ایسے کو خلافت ارضی عطا فرمانے لگا ہے جو اس میں فساد پھیلائے گا اور خونریزیاں کرے گا۔ جبکہ ہم تجھے سراہتے ہوئے تیری حمد و ثنا کرتے اور تیری تسبیح و تقدیس بیان کرتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا مجھے وہ معلوم ہے جو تم نہیں جانتے (۳۰) اور اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو تمام تر اشیاء کے نام سکھائے اور پھر ان اشیاء کو فرشتوں کے رُوبرو کر کے فرمایا اگر تم اپنے تئیں سچے ہو تو ان اشیاء کے نام بتاؤ (۳۱) اس پر وہ لاجواب ہو کر بولے تو ہر نقص سے پاک ہے اور تیرا ہر فیصلہ درست اور مصلحات کے موافق ہے۔ ہمیں واقعی کچھ علم نہیں سوائے اس کے کہ جو تو نے ہمیں سکھایا۔ بلاشبہ تو ہی سب جاننے والا اور صاحب حکمت ہے (۳۲) ہم نے آدمؑ کو فرمایا کہ اے آدمؑ ان (ملائکہ) کو سب چیزوں کے نام بتاؤ تو اس نے انہیں سب کے نام بتا دیئے تو فرشتوں کو مخاطب کر کے فرمایا میں نہ کہتا تھا کہ میں وہ سب جانتا ہوں جو کچھ آسمانوں اور زمین میں پوشیدہ ہے اور میں وہ سب جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو یا چھپاتے ہو (۳۳) اور (یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو، تو سوائے ابلیس کے سب نے سجدہ کیا۔ ابلیس نے بوجہ غرور و تکبر انکارِ حکم کیا اور وہ کافرین میں سے ہو گیا (۳۴) پھر ہم نے آدمؑ سے فرمایا اے آدم تو اور تیری بیوی جنت میں رہو اور اس میں جہاں سے چاہو بے روک ٹوک کھاؤ پیو، مگر اس پیڑ کے پھل کو کھانے کی تم دونوں کو اجازت نہیں اس لئے بتقاضۂ احتیاط اس کے قریب بھی نہ جانا مبادا کہ حد سے بڑھ جانے والوں میں سے ہو جاؤ (۳۵) تو شیطان نے انکو ورغلایا اور ایسی لغزش دی کہ وہ جس جنت میں رہتے تھے

انہیں وہاں سے بے دخل کروادیا' اور ہم نے فرمایا کہ یہاں سے نیچے اتر جاؤ یعنی جنت سے نکل کر زمین پر چلے جاؤ۔ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور اب مدتِ مقررہ (عرصۂ حیات) تک تمہارا ٹھکانہ اور برتنا کرۂ ارض پر ہے (۳۶) پھر سیکھ لیے آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمے تو اللہ نے اسکی توبہ قبول کرلی بیشک وہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان (۳۷) پھر فرمایا کہ تم سب اس جنت سے زمین پر اتر جاؤ اور پھر اگر میری طرف سے کوئی ہدایت تمہیں پہنچے تو جو کوئی میری ھدایات کی اتباع کرے تو اسے کوئی اندیشہ یا غم نہیں ہوگا (بقرۃ:۳۱:۳۸)

اس پر حضرت آدمؑ سخت شرمندگی اور افسوس کی وجہ سے نہایت پریشان رہتے لیکن ہمہ وقت اپنی سہو وخطا پر اپنے خالق سے معافی کے امیدوار رہتے۔

اس واقعہ کے بارے سورۃ طٰہٰ میں ۱۱۶ تا ۱۲۳ تک آیات میں مذکور ہے:۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَةِ اسْجُدُوْٓا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰی (۱۱۶) فَقُلْنَا یٰٓاٰدَمُ اِنَّ ھٰذَا عَدُوٌّ لَّکَ وَ لِزَوْجِکَ فَلَا یُخْرِجَنَّکُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰی (۱۱۷) اِنَّ لَکَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْھَا وَ لَا تَعْرٰی (۱۱۸) وَ اَنَّکَ لَا تَظْمَؤُا فِیْھَا وَ لَا تَضْحٰی (۱۱۹) فَوَسْوَسَ اِلَیْهِ الشَّیْطٰنُ قَالَ یٰٓاٰدَمُ ھَلْ اَدُلُّکَ عَلٰی شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْکٍ لَّا یَبْلٰی (۱۲۰) فَاَکَلَا مِنْھَا فَبَدَتْ لَھُمَا سَوْاٰتُھُمَا وَ طَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْھِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۫ وَ عَصٰٓی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی (۱۲۱) ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَیْهِ وَھَدٰی (۱۲۲) قَالَ اھْبِطَا مِنْھَا جَمِیْعًا ۚ بَعْضُکُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ ھُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَ لَا یَشْقٰی (طٰہٰ: ۱۱۶/۱۲۳)

''جب ہم نے فرشتوں سے فرمایا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب سجدہ میں گر گئے مگر ابلیس نے کہا نہ مانا (۱۱۶) تو ہم نے فرمایا کہ اے آدم بیشک یہ تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے ایسا نہ ہو کہ وہ تم دونوں کو جنت سے نکلوادے کہ پھر تو مشقت میں پڑے (۱۱۷) بیشک تیرے لئے جنت میں یہ ہے کہ نہ تو بھوکہ رہے نہ ننگا (۱۱۸) اور یہ کہ نہ تجھے پیاس تنگ کرے نہ دھوپ (۱۱۹) تو شیطان نے اسے

اس وسوسہ میں ڈال دیا اور کہنے لگا کہ یہ پیڑ (جس کا پھل کھانے سے منع کیا گیا) ہمیشہ جینے اور جنت میں رہنے کا درخت ہے اور ایسی بادشاہی کا باعث ہے جو کبھی پرانی نہ پڑے (۱۲۰) تو ان دونوں نے اس میں سے کھا لیا' اب ان دونوں کی شرم گاہیں ان پر ظاہر ہو گئیں اور جنت کے (درختوں کے) پتے اپنے اوپر چپکانے لگے آدم سے اپنے رب کے حکم میں لغزش واقع ہو گئی تو جو مطلب چاہا تھا (۱۲۱) اسکی راہ نہ پائی پھر اس کے رب نے چن لیا تو اپنی رحمت سے رجوع فرمایا اور اپنے قرب خاص کی راہ دکھائی (۱۲۲) (پھر ان سے) فرمایا تم دونوں جنت سے (زمین پر) اتر جاؤ تمہارے (میں سے) بعض بعض کے دشمن ہونگے (اے اولادِ آدم) پھر اگر تم کو میری طرف سے ھدایت (بصورت کتب و رسل) آئے تو جو میری ہدایت کا پیرو ہوا' وہ نہ بہکے اور نہ بد بخت ہو (طٰہٰ: ۱۱۶ تا ۱۲۳)

مفسرین کا کہنا ہے کہ اس درخت کا پھل کھانے سے معصومیت میں فرق پیدا ہو گیا' بول و براز کے اخراج کی بھی حاجت درپیش ہوئی نیز ماں حوا کو ماہواری خون جاری ہو گیا تھا اور یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ جنت میں اس کی گنجائش ہی کہاں اور یوں نہ ہمیشہ کی زندگی ملی اور نہ جنت سے بیدخلی منقطع ہوئی۔ بعدازاں گڑگڑا کر معافی مانگنے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ پیش کرنے پر آدمؑ کی معافی قبول فرمالی اور (اپنے قربِ خاص کی) راہ عطا فرمادی گئی۔

مفسرین نے بعض بعض کا دشمن ہے سے مراد انسان شیطان سانپ مور وغیرہ لئے ہیں۔ نیز مفسرین نے آپؑ کو معافی عطا ہونے کی ایک مخصوص وجہ بھی بیان فرمائی ہے کہ حضرت آدمؑ کو اپنی غلطی پر پچھتاتے مدت گزر گئی تو پریشانی کے عالم میں یاد آیا کہ پیدائش کے وقت جب میں نے سر اٹھایا تھا تو عرش عظیم پر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے ساتھ مُحَمَّدٌ' الرَّسُوْلُ اللّٰہِ لکھا دیکھا تھا۔ ہو نہ ہو' میرے رب کے نزدیک یہ کسی خاص صاحبِ مرتبت کا نام ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے اسم مبارک کے ساتھ عرش پر مکتوب فرما رکھا ہے۔ لہٰذا آپؑ نے اپنی دعا میں رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا الآیہ کے ساتھ "اَسْئَلُکَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ اَنْ تَغْفِرْلِیْ" بھی عرض کیا۔ ابن منذرؒ کی روایت میں ہے کہ: "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ بِجَاہِ مُحَمَّدٍ عَبْدُکَ وَکَرَامَتُہٗ عَلَیْکَ وَاَنْ تَغْفِرْ لِیْ خَطِیْئَتِیْ" یعنی یارب میں تجھ سے تیرے بندۂ خاص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جاہ و

مرتبت کے طفیل اور اُس کرامت کے صدقہ میں جو انہیں تیرے دربار میں حاصل ہے مغفرت چاہتا ہوں۔ یہ دعا کرنی تھی کہ حق سبحانہ تعالیٰ نے انکی معافی قبول فرمالی اور اس سہو کی مغفرت فرمادی گئی۔

قرآن سے واضح ہے کہ نبوت و پیغمبری اور رسالت و ولایت عطا فرمائے جانے والے مخصوص انسان اللہ تعالیٰ کی چھانٹ کر چنی گئی ہستیاں ہیں جنہیں پروردگارِ عالم نے اپنی مخلوق کی اصلاح وفلاح کی ذمہ داری سونپی اور اپنی نیابت فی الارض جیسے مرتبہ علویہ سے نوازا۔ اسی طرح جہاں اولادِ آدمؑ میں لاکھوں اولیاء وانبیاء محبوبان الٰہیہ کے اعزاز سے معزز اور چھانٹ کر چنے گئے ہیں، وہیں حضرت آدمؑ بھی بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی محبوب اور (چھانٹ کر) چنی ہوئی پسندیدہ ہستیوں میں سے ایک ہیں۔ جیسا کہ آل عمران آیۃ ۳۳ میں قرآن ناطق ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰٓی اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰھِیْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ۙ (۳۳)

''بیشک اللہ نے سارے جہان سے آدمؑ اور نوحؑ کو اور ابراہیمؑ و عمرانؑ کی آل کو چن لیا'' (آل عمران: ۳۳)

ہابیل اور قابیل

سورۃ المائدۃ کی آیت ۲۷ تا ۳۱ میں حضرت آدمؑ کے دو ابتدائی بیٹوں کا ذکر یوں آیا ہے۔

وَاتْلُ عَلَیْھِمْ نَبَاَ ابْنَیْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِھِمَا وَ لَمْ یُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقْتُلَنَّکَ ؕ قَالَ اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ (۲۷) لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَیَّ یَدَکَ لِتَقْتُلَنِیْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْکَ لِاَقْتُلَکَ ۚ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰہَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ (۲۸) اِنِّیْٓ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِیْ وَ اِثْمِکَ فَتَکُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِکَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیْنَ ۚ (۲۹) فَطَوَّعَتْ لَہٗ نَفْسُہٗ قَتْلَ اَخِیْہِ فَقَتَلَہٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ (۳۰) فَبَعَثَ اللّٰہُ غُرَابًا یَّبْحَثُ فِی الْاَرْضِ لِیُرِیَہٗ کَیْفَ یُوَارِیْ سَوْءَۃَ اَخِیْہِ ؕ قَالَ یٰوَیْلَتٰٓی اَعَجَزْتُ اَنْ اَکُوْنَ مِثْلَ ھٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِیَ سَوْءَۃَ اَخِیْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِیْنَ ۙ (مائدۃ: ۲۷ تا ۳۱)

اور انہیں آدمؑ کے دو بیٹوں کی سچی خبر پڑھ کر سناؤ جب دونوں نے اپنی اپنی نیاز پیش کی تو ایک کی قبول ہوئی اور دوسرے کی قبول نہ ہوئی۔ (جسکی قبول نہ ہوئی تھی وہ) بولا قسم ہے میں تجھے قتل

کر دونگا (جسکی قربانی قبول ہوئی تھی اس نے) کہا اللہ اسی سے (نیاز) قبول فرماتا ہے جو اس سے ڈرنے والوں میں سے ہو (۲۷) اگر تو مجھے قتل کرنے کیلئے ہاتھ بڑھائے گا تو میں (پھر بھی) تجھے قتل کرنے کیلئے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا (کیونکہ) میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو سارے جہان کا مالک ہے (۲۸) (اسلئے) میں چاہتا ہوں کہ میرا اور تیرا دونوں کا گناہ تیرے ہی پلے پڑے۔ پس یوں تو دوزخیوں میں سے ہو جائے اور بے انصافوں کی یہی سزا ہے (۲۹) تب (جسکی نیاز قبول نہ ہوئی تھی) کے نفس (امارہ) نے اپنے بھائی کو قتل کر ڈالنے کی خواہش دلائی تو (قابیل نے) اسے قتل کر دیا تو وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گیا (۳۰) تو اللہ نے ایک کوا بھیجا (جو) زمین کریدتا تھا کہ اسے اپنے بھائی کی لاش دفنانے کا طریقہ دکھائے۔ (یہ دیکھ کر وہ) بولا ہائے افسوس کہ میں اس کوے جیسا بھی (سمجھدار) نہ ہو سکا کہ میں اپنے بھائی کی لاش چھپا سکتا' تو پچھتاتا رہ گیا۔'' (مائدہ ۲۷ تا ۳۱)

علمائے سیر و اخبار کا بیان ہے کہ افزائش نسل کیلئے تولید بسرعت ہوتی تھی اور حضرت حوّا کے ہر حمل میں (جوڑا) ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوتے تھے۔ ایک حمل کے لڑکے کا دوسرے حمل کی لڑکی سے نکاح کیا جاتا تھا۔ اسی دستور کے مطابق حضرت آدمؑ نے قابیل کا نکاح لیودا (جو ہابیل کے ساتھ پیدا ہوئی تھی) سے اور ہابیل کا اقلیما سے جو قابیل کے ساتھ پیدا ہوئی تھی کرنا چاہا۔ مگر قابیل اس پر راضی نہ تھا کیونکہ اقلیما زیادہ خوبصورت تھی اسلئے اسی کی طلب پر بضد تھا۔ حضرت آدمؑ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اقلیما تیرے ساتھ پیدا ہوئی ہے اور تیری بہن ہے اسکے ساتھ تیرا نکاح درست اور حلال نہیں۔ اس پر کہنے لگا کہ یہ صرف آپکی رائے ہے اللہ نے ایسا حکم نہیں دیا۔ آپؑ نے فرمایا اچھا یوں کرو کہ دونوں بھائی اپنی اپنی قربانیاں لاؤ جس کی قربانی مقبول ہو جائے وہی اقلیما کا حق دار ہو گا۔

زمانۂ ماضی میں عرصہ دراز یہ دستور چلتا رہا کہ جو قربانی مقبول ہوتی تھی آسمان سے ایک آگ اُتر کر اسے جلا جاتی تھی۔ قابیل نے گندم کا ایک انبار اور ہابیل نے ایک بکری قربانی کیلئے میدان میں رکھ دی۔ آسمانی آگ نے ہابیل کی قربانی کو لے لیا اور قابیل کے گیہوں کو چھوڑ گئی۔ اس پر قابیل کے دل میں بغض پیدا ہو گیا جو حسد میں تبدیل ہو گیا اور وہ ہابیل کو قتل کرنے کے درپے ہو گیا۔

جب حضرت آدمؑ تعمیر کعبہ کیلئے مکہ تشریف لے گئے تو قابیل نے ہابیل سے کہا کہ میں تجھے قتل کردونگا۔ ہابیل نے کہا کیوں؟ تو جواب میں کہنے لگا اس لئے کہ تیری قربانی قبول ہوگئی اور تو اقلیما کا مستحق ٹھہرا' اس میں میری ذلت ہے۔ ہابیل نے کہا کہ قربانی کا قبول کرنا یا نہ کرنا اللہ تعالیٰ کا فعل ہے وہ متقیوں کی قربانی قبول فرماتا ہے تیری قربانی قبول نہ ہونا خود تیرے افعال اور نیت کا نتیجہ ہے (جیسے والد کی نافرمانی کرنا' حسد و رقابت کا شکار ہونا' اور قربانی قبول نہ ہونے پر خدائی فیصلہ ماننے پر راضی نہ ہونا وغیرہ) تو بتاؤ اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں اگرچہ تجھ سے قوی اور توانا ہوں مگر اللہ سے ڈرتے ہوئے ایسا قبیح فعل نہ کرونگا کہ تم کو قتل کروں۔

تاہم قابیل نے جوش حسد میں اپنے بھائی ہابیل کو مار ڈالا اور پھر والد کو جوابدہی اور اس فعل بد کی گھبراہٹ میں سخت پریشان ہوا کہ آخر اس لاش کا کیا کروں اور اسے کیونکر چھپاؤں۔ اسی وحشت اور پریشانی میں کئی روز تک متحیر و سرگرداں لاش کو پیٹھ پر اٹھائے پھرتا رہا۔

اللہ نے ایک کوا بھیجا جس نے قابیل کے سامنے اپنی چونچ سے زمین کریدنا شروع کی اور ایک مردہ کوّے کی لاش اس گڑھے میں رکھ کر چونچ سے اس پر مٹی ڈال ڈال کر اسے چھپا دیا۔ جس سے اسے اپنے بھائی کی لاش دفنانے کا طریقہ سمجھ آ گیا۔ وہ یہ دیکھ کر جھینپا اور نادم ہوا' بولا ہائے افسوس کہ میں اس کوّے جتنی عقل کا بھی مالک نہ ہوسکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپانے کی تدبیر کرسکتا۔

نوٹ:۔ متذکرہ بالا خبر دینے کا مقصد یہ ہے کہ حسد کی قباحت معلوم ہو جائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حسد کرنے والوں (یہود و نصاریٰ اور کسے دیگر) کو نصیحت حاصل ہو' جنہوں نے محض اولادِ اسمٰعیل ہونے کے باعث آپکو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ طرّہ یہ کہ آج تک آل اسمٰعیل تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔

آدمؑ کی معافی کے بارے ایک روایت ''جب حضرت آدمؑ اپنی سہو و خطا پر تین سو سال تک معافی طلب کرتے رہے اور آخر کار (اسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم عرش پر لکھا) یاد آنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ کو استعمال فرمایا اور پروردگارِ عالم نے اپنی رحیمی سے آپکی معافی قبول فرمالی تو اس ہستی کے بارے جاننے کا شوق ہوا۔ اس پر حکم ہوا کہ اے آدم ہاتھ کے انگوٹھوں کے ناخن دیکھو۔ جب حضرت آدمؑ نے ایسا کیا تو ناخنوں کے آئینوں میں شبیہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

دیکھی اور بے اختیار عقیدت ومحبت سے اپنے دونوں انگوٹھوں کو چوم لیا اور آنکھوں کی ٹھنڈک کیلئے انہیں پپوٹوں سے لگا لیا۔ حضرت آدمؑ کی اسی سنت کی ادائیگی میں مسلمانوں کی اکثریت اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک سن کر یہی عمل دہراتی ہے۔ اَللّٰھُمَّ جَعَلْنَا مِنْھُمْ ط

یہ بات مصدقہ ہے کہ حضرت آدمؑ کو جزائر غرب الہند میں سراندیپ (سیلون/ لنکا) کی ایک پہاڑی پر اور حضرت مادرِ انسان 'حوا' سلام اللہ علیہا کو وادیٔ مکہ میں جدّہ کے مقام پر اتار دیا گیا تھا۔ بعد از قبولِ توبہ کرۂ ارض پر دونوں میاں بیوی کی پہلی ملاقات عرفات سے چند کلومیٹر دور جبل الرحمۃ کے مقام پر ہوئی اور یہاں سے انسان کی تولید کا سلسلہ شروع ہوا۔

حضرت آدمؑ اور ماں حوّا کے ہاں کئی بیٹے بیٹیاں تولد ہوئیں۔ البتہ انکی نرینہ اولاد میں سے صرف تین بیٹوں کے نام معلوم ہو سکے۔ توریت مقدس کے مطابق ایک کا نام قابیل دوسرے کا ہابیل اور تیسرے کا نام شیث تھا۔ جسے توریت نے کائن (CAIN)/ایبل (ABEL)/اور ثیت (SETHE) کے تلفظ سے ادا کیا ہے۔ جبکہ حضرت آدمؑ کی بیٹیوں کے معلوم ناموں میں صرف دو نام لیوداً اور اقلیما ہیں۔

دنیا میں سب سے پہلا قتل (خونِ ناحق) ہابیل کا ہوا جس کا قاتل اسکا اپنا بھائی قابیل تھا۔ قرآنِ حکیم میں اس واقعہ کا کنایتاً ذکر تو موجود ہے مگر ان دونوں صاحبزادوں کے ناموں کا تذکرہ نہیں کیا گیا اور فقط آدم کے دو بیٹے کہہ کر اسے مجمل چھوڑ دیا ہے۔ البتہ توریت شریف میں اس سے متعلقہ ایک بیان درجِ ذیل ہے:۔

> ''قائن کا پیشہ زراعت اور ایبل کا چوپائی تھا دونوں نے بارگاہِ الٰہی میں نذر گزاری' قائن اپنے کھیت کے کچھ پھل لایا اور ایبل اپنی بکریوں کے کچھ پہلوٹے بچے اور انکی چربی۔ ایبل کی نذر مقبول ہوئی اور قائن کی نامقبول۔ اس پر قائن نہایت غضب ناک ہوا اور اس نے اپنے بھائی کو قتل کر ڈالا۔ بارگاہ ایزدی سے ارشاد ہوا کہ اب تو زمین کی طرف سے لعنتی ہوا' اب زمین سے تیری محنت کا پورا پھل تجھے نہیں ملے گا اور زمین پر تو خانہ خراب اور آوارہ رہے گا۔ اس پر قائن نے خدا سے فریاد کی اور خطرہ ظاہر کیا کہ جو کوئی مجھے دیکھے گا' مار ڈالے گا۔ حکم ہوا کہ نہیں' جو قائن کو قتل کرے گا اس سے سات گنا بدلہ لیا جائیگا اور قائن کے لئے ایک نشان مقرر کر دیا گیا کہ کوئی اسے پا کر مار نہ ڈالے''۔ (کتاب پیدائش باب ۴)

مورخین اور محققین کی رائے میں توریت شریف کا یہ بیان تحریف شدہ ہے۔ کیونکہ مندرجہ بالا بیان اُن تمام مقاصد جلیلہ سے عاری ہے جن کے پیش نظر قرآن نے اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے۔ اس سے نہ تو خونِ ناحق کی حرمت نمایاں ہوتی ہے نہ قابیل کے اس شدید جرم کے عواقب پیش نظر ہوتے ہیں اور نہ ہی ہابیل کے زُہد وتقویٰ اور کردار کی بلندی کا کوئی واضح نقشہ سامنے آتا ہے۔

بلکہ متذکرہ بیان کے آخری حصہ سے گمان ہوتا ہے کہ قابیل کا یہ جرم خدا کے نزدیک کوئی بڑا جرم نہیں تھا کہ وہ نہ صرف معاف کر دیا گیا بلکہ اسکی زندگی کی حفاظت کیلئے تائید ایزدی بھی اسکے شامل حال ہوگئی۔ اسی بناء پر محققین نے اسے تحریف شدہ قرار دیا ہے کہ قابیل و ہابیل کے واقعہ میں فساد اور خون ریزی کی ناپسندیدگی کو واضح نہیں کیا جاسکا اور یوں اس کلام کے اصل ہونے میں ابہام پایا جاتا ہے۔

جہاں تک قرآن حکیم کا تعلق ہے اس میں واقعہ ھٰذا کے ایک ایک پہلو کو واضح اور نمایاں انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ بلکہ اس قتل کی قباحت بیانی میں امام احمدؒ نے اپنی سند میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

> ''دنیا میں جب بھی ظلم سے کوئی قتل ہوتا ہے تو اسکا گناہ قاتل کے ساتھ ساتھ حضرت آدمؑ کے بیٹے قابیل کی گردن پر بھی ضرور آتا ہے۔ اسلئے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے ظالمانہ قتل کی ابتداء کی''۔

دمشق کے شمال میں ''جبل قاسیون'' پر ایک زیارت گاہ بنی ہوئی ہے جو ''مقتل ہابیل'' کے نام سے مشہور ہے اور ابن عساکر نے (احمدؒ ابن کثیر کے تذکرہ میں) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک خواب مبارکہ کے حوالہ سے بھی اس زیارت گاہ کا ذکر کیا ہے۔ رہا قابیل کا تو بمطابق توریت شریف:۔

''ہابیل کے قتل کا ارتکاب کرنے کے بعد قابیل خداوند خدا کے حضور سے نکل گیا اور عدن کے مشرق کی طرف ''نود'' کے علاقہ میں جا بسا۔ (پیدائش باب ۴۔۱۶)

پھر اسی کتاب (توریت شریف) میں قابیل سے چلنے والی نسل کے چھ سلسلوں کے نام مذکور ہیں۔

(۱) قابیل (۲) حنوک

(۳)عیرو (۴)محویایل

(۵)متوسائیل (۶)عک۔

یادرہے کہ یہ نسلیں حضرت نوح علیہ السلام کے عذاب تک محدود ہیں کہ اسکے بعد نہ صرف یہی نسلیں بلکہ تمام عالم انسان (سوائے اولاد وعیال نوح) عذاب الٰہی کا شکار ہوکر نابود ہوگیا تھا۔اسی لئے نوح علیہ السلام کو آدم ثانی کہا جاتا ہے۔

تذکرۂ آدم علیہ السلام کے اختتام کے بعد اولادِ آدمؑ میں آنے والے اُن معزز انبیاء وپیغمبران اور مرسلین کرام کا اختصاراً ذکر کرونگا جن کا ذکر قرآن حکیم اور دیگر الہامی کتب وصحائف میں ہوا ہے۔ قرآن حکیم میں حضرت آدمؑ کا نام نامی قرآن کریم کی جن پچیس آیات میں مذکور ہے انکا جدول یہ ہے:۔

سورۃ البقرۃ/ ۳۱، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۷۔

سورۃ آل عمران/ ۳۳، ۵۹۔

سورۃ المائدہ/ ۲۷۔

سورۃ الاعراف/ ۱۱، ۱۹، ۲۶، ۲۷، ۳۱، ۳۵، ۱۷۲۔

سورۃ بنی اسرائیل/ ۶۱، ۷۰۔

سورۃ الکہف/ ۵۰۔

سورۃ مریم/ ۵۸۔

سورۃ طٰہٰ/ ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۲۰، ۱۲۱۔

سورۃ یٰسٓ /۶۰

حضرت شیث علیہ السلام

حضرت آدمؑ کے دو بیٹوں ہابیل و قابیل کے تذکرہ کے بعد آپکے تیسرے بیٹے کے مختصر حالات ومتعلقات پیش خدمت ہیں جن کا نام نامی شیث علیہ السلام ہے جو حضرت آدمؑ کے بعد نبوت کے عظیم مرتبہ پر فائز ہوئے۔ حضرت شیث علیہ السلام کی بعثت کا پس منظر دراصل یہی واقعۂ ہابیل و قابیل ہے۔ آپکے اسم گرامی کی وجہ تسمیہ کے باب میں حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ لفظ شیث کے لغوی معنی عطیۂ خداوندی کے ہیں۔ آپ چونکہ ہابیل کے المناک قتل جیسے سانحہ کے بعد پیدا ہوئے اس مناسبت سے آپکا نام شیث رکھا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے بصورت صحائف آپ کو مخصوص تعلیمات سے نوازا تا کہ آپ اپنی قوم کو شریعت حقہ اور ایمان واعتقاد کی صحیح راہ دکھائیں۔

آپکی عمر کے بارے میں بھی مفسرین کا اختلاف ہے۔ کوئی آپکی عمر نو صد پینسٹھ (۹۶۵) سال بتاتا ہے کوئی نو سو پچاس (۹۵۰) برس' کسی کے نزدیک چھ سو سے سات سو سال کے درمیان ہے اور کچھ مفسرین کے نزدیک آپکی عمر صرف دو صد تیس (۲۳۰) برس ہے۔ لیکن اکثریت اس پر متفق ہے کہ آپؑ نے بھی اپنے والد کی طرح طویل عمر پائی۔ اڑھائی صد سال عمر والی تحقیق کمزور ہے۔ توریت مقدس کی تصریح (کتاب پیدائش باب ۴/ ۱۷ تا ۲۳) کے مطابق:۔ ''شیثؑ اپنے بھائی ہابیل کی شہادت کے بعد پیدا ہوئے اُس وقت حضرت آدمؑ کی عمر ایک سو تیس سال تھی۔ وہ اپنے والد حضرت آدمؑ ہی کی صورت وشکل کے تھے اور آپؑ نے نو سو بارہ (۹۱۲) برس عمر پائی''۔

اس تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ کی وفات کے وقت حضرت شیثؑ خود بھی آٹھ سو سال کے ہو چکے ہونگے۔ آپکو نبوت حضرت آدمؑ کی زندگی ہی میں مل گئی تھی یا انکی وفات کے بعد؟ اسکے بارے کچھ کہنا دشوار ہے' البتہ یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ تمام انبیاء وپیغمبران اور اولیائے علیین پیدائشی طور پر ان اعزازات سے معزز فرما کر مبعوث فرمائے جاتے ہیں۔ اگرچہ اسکا اعلان وہ جلد یا بدیر فرمائیں۔ بہر حال حضرت شیث علیہ السلام کے بعد آنے والے تمام پیغمبران کا ظہور آپؑ ہی کی نسل سے ہوا۔ نیز علماء کے ایک طبقہ کا خیال ہے کہ آپ حضرت ادریس علیہ السلام کے معلم واستاد بھی ہیں۔

حضرت شیث علیہ السلام کی قبر مبارک

حضرت شیثؑ اپنے پیروکاروں میں بہت مقبول اور کامیاب رہے اور لوگ آپکے انتقال کے بعد بھی مدت تک آپکی تعلیمات اور بتائے ہوئے راستہ پر گامزن رہے۔ جب آپکا سلسلۂ اَولاد بڑھتے بڑھتے پشتِ مہلائیلؑ پر پہنچا تو لوگ مہلائیلؑ کی طرف بہت زیادہ راغب ہوگئے اور انکی نسلیں حضرت شیثؑ کے دین سے پھرنے لگیں۔ کہا جاتا ہے کہ مہلائیلؑ بہت خوبصورت اور حسن و جمال میں لاثانی ہونے کے ساتھ ساتھ خدا کے برگزیدہ تھے اور ہر کوئی ان سے پیار کرتا تھا۔ انہوں نے لوگوں کو اپنے دین (دین شیثؑ) پر قائم رہنے کی تلقین کی اور کچھ مدت تک لوگ اس پر قائم بھی رہے' مگر مہلائیل کے انتقال کے بعد انکی قوم نے اپنے جذباتِ محبت کی تسکین کیلئے انکا بت بنا کر معبد خانہ میں رکھ لیا۔

بت پرستی کی ابتدأ

بت پرستی کی ابتدأ دراصل یہیں سے اور ایسے ہی حالات میں شروع ہوئی۔ پہلے پہل تو لوگوں نے مہلائیلؑ کی تصویر بنائی اور انہیں بطورِ خاص معبد خانے میں اسلئے رکھوایا کہ انکی تعلیمات اور انکا چلن ہمارے دلوں سے فراموش نہ ہو جائے۔ یہ تصویر درختوں کی چھالوں پتوں یا چمڑے وغیرہ پر نقش کی جاتی تھی جو ہر چند ماہ بعد منتشر و موہوم ہو جاتی۔ اس لئے طے پایا کہ یہ نقوش پتھر پر تراش لئے جائیں تا کہ جلد خراب نہ ہوں۔ مگر کچھ عرصہ بعد کسی شیطان صفت کی ترغیب پر پتھر کے ٹکڑوں سے مہلائیل کی صورت انسانی پیکر کی صورت اجاگر کر لی گئی اور یوں بعد میں آنے والی نسلوں کو یاد تک نہ رہا کہ اس بت کی یہاں موجودگی کا باعث کیا تھا۔ انکے چاہنے والوں کی ناعاقبت اندیشی کا یہ نتیجہ نکلا کہ چند پشتوں بعد اُس قوم کو یہ بھی علم نہ رہا کہ بت پرستی مہلائیل کی نظر میں بھی ناپسندیدہ تھی۔ چنانچہ اُنکی کورانہ تقلید اور اندھی عقیدت نے تمام قوم کو بت پرست بنا ڈالا۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ بت پرستوں کو احساس تک نہیں کہ ہم نے بت پرستی سے منع کرنے والی ہستیوں کی زندگی بھر کی کوششوں پر کس نادانی سے پانی پھر دیا۔

حضرت ادریس علیہ السلام

حضرت ادریسؑ کا نام اخنوخ ہے آپ حضرت نوحؑ کے پڑدادا' اور یارد بن مہلائیل بن قینان بن انوش بن شیثؑ کے بیٹے ہیں۔ گویا آپؑ حضرت آدمؑ کی چھٹی پشت سے ہیں۔ نسلِ آدمؑ میں جس شخص نے سب سے پہلے قلم سے لکھا وہ آپؑ ہی ہیں۔ کپڑا سینے اور سلے ہوئے لباس کے استعمال کی ابتدا بھی آپؑ سے ہوئی جبکہ آپؑ سے قبل لوگ کھالیں پہنتے تھے۔ نہ صرف یہی بلکہ سب سے پہلے ہتھیار بنانے والے' ترازو اور پیمانے قائم کرنے والے اور علم نجوم وحساب میں نظر دوڑانے والے بھی آپؑ ہی ہیں۔ حضرت آدمؑ کے بعد آپؑ پہلے رسول ہیں آپؑ پر تیس (۳۰) صحائف نازل فرمائے گئے۔ کتب الٰہیہ کی کثرتِ درس کے باعث آپکا نام ادریس ہوا۔ تاریخی روایات کے مطابق یونانی زبان میں آپکا نام ''طرمیس'' عبرانی میں ''حنوک'' قدیم عربی زبان میں ''اخنوخ یا انوخ'' اور قرآن کریم میں ادریسؑ ہے۔ مورخین آپؑ کے ناموں کے ساتھ ساتھ آپکا ایک لقب ''اورین سوم'' بھی بتاتے ہیں۔

حضرت ادریسؑ کے زمانے اور نام ونسب کے متعلق مورخین میں کچھ اختلاف ہے۔ امام محمد بن اسمٰعیل بخاریؒ صحیح بخاری باب الانبیاء میں فرماتے ہیں کہ حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت عباسؓ ہر دو حضرات کے نزدیک الیاسؑ اور ادریسؑ ایک ہی شخصیت کے نام ہیں مگر واضح رہے کہ یہ روایت مرفوع نہیں' یعنی اس روایت کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں ملتا۔ چنانچہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ایسا گمان ان ہر دو حضرات اور خود امام بخاریؒ کے ذاتی خیال ورجحان پر مبنی ہو۔ کیونکہ حضرت شیثؑ کا زمانہ حضرت نوحؑ اور حضرت ہودؑ کے درمیان کا زمانہ ہے جبکہ امام بخاریؒ حضرت ادریسؑ کا ذکر حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ہودؑ کے بعد کرتے ہیں۔ جبکہ علماء کے نزدیک رائج قول یہ ہے کہ حضرت ادریسؑ حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے گزرے ہیں۔ قران کریم تو اپنے مقصدِ رشد وھدایت کے پیش نظر' تاریخی مباحث سے ہٹ کر صرف آپکی نبوت' آپکی علو مرتبی اور آپکی صفاتِ عالیہ کا ذکر فرماتا ہے۔ احادیث صحیحہ سے بھی آپکے حالات پر مزید روشنی نہیں پڑتی۔ البتہ توریت شریف کا بیان ان علماء کے قول کی تائید کرتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

''حضرت ادریسؑ کے والد کا نام یارد تھا' یارد کی عمر ۹۶۲ برس تھی اور (حضرت ادریسؑ کی پیدائش کے وقت) انکی عمر ۱۶۲ سال تھی۔ حضرت ادریسؑ کے اور بھائی بہن بھی تھے مگر نسل انسانی کا سلسلہ انہی سے چلا۔ جب آپکی عمر ۶۵ برس ہوئی تو متوسلح پیدا ہوئے جو حضرت نوحؑ کے دادا تھے''۔

متوسلح کے علاوہ آپکی اور اولاد بھی ہوئی جنکے نام اور تعداد کے بارے معلومات مہیا نہیں ہوسکیں۔ حضرت ادریسؑ کے وطن کے بارے مورخین کے ایک طبقہ کا خیال ہے کہ آپؑ مصر کے علاقہ ''حنف'' میں پیدا ہوئے جبکہ دوسرے طبقہ کے مطابق آپؑ بابل کے قدیم علاقہ میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ اکثر مورخین اس دوسرے طبقۂ مورخین کے خیال کے حامی ہیں۔ انکے نزدیک بھی آپکی پیدائش بابل کے اس علاقہ میں ہوئی جو ملک عراق میں ہے اور جسے موجودہ زمانہ میں کوفہ کہتے ہیں۔ قرائن سے اسی دوسرے طبقہ کا خیال درست دکھائی دیتا ہے کیونکہ دجلہ وفرات کا یہ دوآبہ (جسے بابل کہا جاتا ہے) ہی' بلحاظ آبادی اور انسانی تہذیب وتمدن کا پہلا عظیم مرکز ہے۔ غالباً اسی بناء پر حضرت ادریسؑ بہت سی ایجادات کا سہرا اپنے سر رکھتے ہیں۔

حضرت ادریسؑ ہی وہ پہلی ہستی ہیں جنہوں نے علمِ حکمت وعلمِ نجوم کی ابتداء کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو افلاک اور انکی ترکیبِ کواکب اور انکے اجتماع وفراق کے نقاط اور انکی باہم کشش کے اسرار و بھیدوں کی تعلیم عطا فرمائی اور انکو علم الاعداد وحساب کا عالم بنایا۔ اگر اس پیغمبرؑ کے ذریعہ ان بیش قیمت علوم کا انکشاف نہ ہوا ہوتا تو انسانی طبائع کی وہاں تک رسائی غیر ممکن ہوکر رہ جاتی۔

عطائے نبوت

علاوہ ازیں حضرت ادریسؑ جب سن شعور کو پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے آپکو نبوّت سے سرفراز فرمایا۔ تب انہوں نے شریر مفسدوں اور بت پرستوں کو راہِ ھدایت کی تبلیغ شروع کی۔ مگر مفسدین نے انکی ایک نہ سنی اور حضرت آدمؑ وحضرت شیثؑ کی شریعت کے مخالف ہی رہے۔ البتہ ایک چھوٹی سی جماعت آپ کے شیدائیوں کی بھی ضرور تیار ہوگئی۔ مگر مخالفین کی چونکہ اکثریت تھی اس لئے وہ حضرت ادریسؑ کو ستانے پر یوں کمربستہ ہوگئے کہ آپکی زندگی کو خطرہ لاحق ہوگیا۔ چنانچہ آپؑ اپنی جماعت سمیت مصر کی جانب

ہجرت کر گئے اور دریائے نیل کے کنارے اقامت پذیر ہوگئے۔ یہاں بھی انہوں نے پیغام الٰہی پہنچانے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض ادا کرنا شروع کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں یہاں قریباً بہتر (۷۲) زبانیں بولی جاتی تھیں اور عطائے ایزدی سے آپؑ ان تمام زبانوں کے زبان دان ہو گئے اور ہر کسی کو اسکی زبان ہی میں وعظ و نصیحت فرماتے۔

انہوں نے مختلف گروہوں اور امتوں کے لئے انکے مناسب حال قوانین و قواعد مقرر فرمائے اور قطائع عالم کو چار حصوں میں منقسم کر کے ہر ربع کیلئے ایک حاکم مقرر کیا' جو اس حصہ زمین کی سیاست و ملوکیت کا ذمہ دار قرار پاتا۔ ان چاروں کے لئے ضروری قرار دیا گیا تھا کہ تمام قوانین سے مقدم شریعت کا وہ قانون رہے گا جسکی تعلیم وحی الٰہی کے موافق ہو۔ اس سلسلہ کے پہلے چار بادشاہوں کے نام:۔
(۱) ایلادس (۲) زدس (۳) اسقلیبوس (۴) ایلادس امون یا لبیلوخس ہیں۔

دکھ کی بات ہے کہ موجودہ توریت میں صحیفہ ادریسؑ کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ حالانکہ کم از کم تیسری صدی عیسوی تک یہ خیال نہایت راسخ تھا کہ حضرت ادریسؑ صاحب کتاب نبی تھے اور آپؑ کی شریعت نہایت جامع تھی۔ البتہ عصر حاضر میں بابل کے جو آثری انکشافات ہوئے اور ان میں جو حجری الواح برآمد ہوئی ہیں ان پر جو کتبات ہیں ان میں ایک کتاب حضرت ادریسؑ کی بھی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ صحیفہ ادریسؑ اصلاً عبرانی (HEBREW) زبان میں تھی جو حبشی زبان میں منتقل ہوئی بعد ازاں اسکے ترجمے بھی ہوئے۔ اس کے علاوہ آپکی ایک اور کتاب ''اسرارِ ادریس'' کے نام سے سلاونک (SALAVONIC) زبان میں برآمد ہوئی۔ موجودہ یہودی اور نصرانی ان کتب کو مستند تسلیم نہیں کرتے حالانکہ عیسائیت کی ابتدائی تین صدیوں تک (جب تک وہ شرک میں مبتلا نہیں ہوئے تھے) ان کتابوں کو مستند مانا جاتا رہا۔ حضرت ادریسؑ کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ لوگو:۔

> ''خدا تعالیٰ کی ہستی اور اسکی توحید پر ایمان رکھنا' صرف خالق کائنات کی عبادت کرنا' آخرت کے عذاب سے نجات کیلئے اعمال صالحہ کو ڈھال بنانا' اس ناپائیدار دنیا سے بے التفاتی برتنا اور تمام امور میں عدل و انصاف کو پیش نظر رکھنا۔ مقررہ طریق پر عبادت کرنا' دین کے دشمنوں سے جہاد کرنا' زکوٰۃ ادا کرنا' پاک وصاف

رہنا' سود سے اجتناب کرنا اور منشیات سے پرہیز کرنا''۔

حضرت ادریس نے اپنے پیروکاروں کیلئے چند ایام عید کے' چند ایام نذر و قربانی اور صدقہ و خیرات کے بھی مقرر فرمائے۔ بروئے حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپکا تمکن چوتھے آسمان پر ہے۔قران مجید میں حضرت ادریسؑ کا ذکر سورۃ مریم اور سورۃ انبیاء میں آیا ہے۔سورۃ مریم میں فرمان ہے:۔

وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيسَ ز اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا (۵۶) وَ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا(۵۷)

(مریم:۵۶/۵۷)

ترجمہ:۔''اور کتاب میں ادریس کا ذکر کرو' بیشک وہ سچا نبی تھا۔اور ہم نے اسے بلند مکان (مقام) پر اٹھایا''۔(مریم:۵۶/۵۷)

اور سورۃ انبیاء میں فرمان ہے:۔

وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِدْرِيسَ وَ ذَا الْكِفْلِ ط كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ (۸۵) وَ اَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ رَحْمَتِنَا ط اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ(انبیاء:۸۵/۸۶)

تراجم:۔''اور اسمٰعیل اور ادریس اور ذوالکفل (کو یاد کرو) وہ سب صبر والے تھے(انبیاء:۸۵) اور انہیں ہم نے اپنی رحمت میں داخل فرمایا' بیشک وہ سب ہمارے صالحین (قربِ خاص کے حقدار) لوگوں میں سے ہیں''(انبیاء۸۶)

حضرت نوح علیہ السلام

حضرت نوح علیہ السلام حضرت ادریس علیہ السلام کے پڑپوتے ہیں۔ حضرت ادریسؑ کے کچھ عرصہ بعد ہی کفر و شرک اور بت پرستی کی وباء پھر سے پھیل گئی تھی۔ گمراہی اور عصبیت نے حضرت آدمؑ حضرت شیثؑ اور حضرت ادریسؑ کی عظمت اور انکی تعلیمات پر سیاہی پوت دی تھی اور یوں آئندہ آنیوالی انسانی نسل کیلئے حقیقت ازلی کی تلاش کے نقوش مدھم پڑ چکے تھے۔ چنانچہ الرحم الراحمین نے اولادِ آدمؑ پر ایک مرتبہ پھر کرم کی نظر فرمائی اور شرف انسانی کو عصبیت و بت پرستی کی قباحت سے متنبہ کرنے کیلئے اپنے ایک الوالعزم پیغمبر کو مبعوث فرمایا' جن کا نام حضرت نوحؑ ہے۔

آپکا شمار ان انبیاء میں ہوتا ہے جنہوں نے تبلیغ الٰہیہ کیلئے پے در پے شدید تکلیفیں اٹھائیں اور انگنت مصائب جھیلے۔ آپؑ نے صراط مستقیم سے بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہِ راست پر لانے اور انہیں توحید کا بھولا سبق یاد دلانے کیلئے اس قوم کے ہر ظلم و ستم کو برداشت کیا اور شدید رکاوٹوں کے باوجود کئی سو سال تک جدوجہد جاری رکھی اور اپنی شریعت قائم کرنے کی حتی المقدور کوشش کرتے رہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کا مسکن دجلہ و فرات کا دوآبہ (موجودہ عراق) تھا جسے ماضی میں کلدانیہ (chaldea) اور بابل کہا جاتا تھا۔ یہ دوآبہ انسانی تہذیب کا سب سے قدیم گہوارہ گردانا جاتا ہے۔ مورخین نے جا فکسل تحقیقات کے بعد حضرت آدمؑ اور حضرت نوح علیہ السلام کا درمیانی عرصہ دو ہزار دو سو چالیس (۲۲۴۰) سال بیان کیا ہے۔ یہ بھی تحقیق ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا مشہورِ آفاق عذاب (جسے آج بھی دنیا طوفانِ نوح کے نام سے یاد کرتی ہے اور جو آج بھی خشیت الٰہی کے حاملین کے دلوں کو لرزہ براندام کر دیتا ہے) واقع ہوا۔

حضرت نوح علیہ السلام کی عمر اُس وقت چھ سو سال کے لگ بھگ تھی جبکہ آپؑ نے ساڑھے نو سو (۹۵۰) سال عمر پائی جس پر توریت شریف اور قرآن حکیم بھی گواہ ہیں۔

قرآن کی سورۃ عنکبوت/۱۴ میں ارشاد ہے:۔

وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖ فَلَبِثَ فِیۡہِمۡ اَلۡفَ سَنَۃٍ اِلَّا خَمۡسِیۡنَ عَامًا ؕ فَاَخَذَہُمُ

الطُّوفَانُ وَ هُمْ ظٰلِمُوْنَ(۱۴)

اور ہم نے نوح کو انکی قوم کی طرف بھیجا تو وہ ان میں ساڑھے نوسو برس رہے (یعنی اس تمام عرصہ میں قوم کو توحید وایمان کی دعوت جاری رکھی' اس پر بھی وہ قوم باز نہ آئی اور تکذیب کرتی رہی) تو انہیں طوفان نے آلیا اور وہ تھے ہی ظالم۔(عنکبوت:۱۴)

یوں اس طوفان کے بعد نسل انسانی اور شریعت کے اجرأ کے لئے تین سو پچاس سال اس دنیا میں مزید تشریف فرما رہے۔

محقق تذکرہ نویسوں نے آپؑ کا اصل نام یشکر لکھا ہے اور ''نوح'' نام کی وجہ تسمیہ کے ضمن میں انکی تحقیق یہ ہے کہ اپنی قوم کی نا سمجھی اور صدیوں تک انہیں سمجھاتے رہنے پر بھی انکی ہٹ دھرمی اور قعر مذلت میں پڑے رہنے پر بہت دکھی رہتے اور نوحہ وگریہ کیا کرتے۔ برس ہا برس تک مسلسل کثرتِ نوحہ کی وجہ سے آپکا نام نوح پڑا۔

اکثر مورخین ومفسرین مستند اخبار وذرائع سے یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کے شجرہ میں والد اور والدہ ہر دونوں کی طرف سے حضرت آدم علیہ السلام تک تمام افراد موحد تھے اور آپکی جدّ میں ایک فرد بھی بت پرستی کا مرتکب نہیں تھا۔ مشہور مفسر عطا نے بھی لکھا ہے کہ تمام آباؤ اجدادِ نوحؑ حضرت آدمؑ تک موحد ومومن تھے اور والدہ بھی مومنہ تھیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کے والد محترم کا نام لمک اور والدہ محترمہ کا نام 'سخا' بنت انوش تھا (یاد رہے یہ انوش اسکے علاوہ ہیں جو اجدادِ نوح میں مذکور ہیں)۔ بعض روایات کے مطابق مادرِ نوح کا والد کی جانب سے شجرہ فینوس بن کامل ابن مہلائیل ابن کیان ابن اخنوع (ادریسؑ) ہے۔ علم الانساب کے ماہرین کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام کا نسب نامہ یوں ہے:۔ ''نوح بن لمک بن متوسلح بن اخنوع (یعنی حنوک یا ادریسؑ) بن یارد بن مہلائیل بن قینان بن انوش بن شیثؑ بن آدمؑ''۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسن لکھتے ہیں:۔

''حضرت آدمؑ کے وقت سے جو وحی شروع ہوئی' تو وہ بالکل ابتدائی حالت تھی حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں وہ حالت پوری ہوکر اس قابل ہوگئی کہ لوگوں کا امتحان لیا جائے تا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمانبرداروں کو انعام اور نافرمانوں کو سزا دی جائے۔ انبیائے اولوالعزم کا سلسلہ بھی حضرت نوح علیہ السلام ہی سے شروع ہوا۔ وحی الٰہی سے سرتابی کرنے والوں پر اوّل عذاب بھی حضرت نوح علیہ السلام کے وقت سے شروع ہوا''۔ (فوائد ترجمہ قرآن مجید شیخ الہند صفحہ:۱۳۳)

اقتباس مندرجہ بالا کے ضمن میں یہ وضاحت ضرور کرنا چاہوں گا کہ اللہ رب العزت محض اپنی نافرمانی کرنے کی پاداش میں کسی کو اس دنیا میں عذاب نہیں کیا کرتا' کیونکہ یہ بات اسکی صفاتِ علویہ کے موافق نہیں۔ البتہ کوئی قوم اسی وقت تباہی و ہلاکت کا سامنا کرتی ہے جب ذاتِ کبریاؑ کے معزز بندگان کی بے حرمتی' ظلم و زیادتی اور نافرمانی حد سے تجاوز کر جاتی ہے، یا عذاب الٰہی تب واقع ہوتا ہے جب کوئی قوم اُن سے نشانی طلب کرے اور معجزات و کرامات کے ظہور کے بعد بھی انکی تکذیب کی مرتکب رہے۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوا کہ کسی قوم کو موافق مصلحت پامال کر کے اسکی جگہ دوسری قوم کو آباد کیا گیا ہو۔ وگرنہ جب نوح علیہ السلام کو نصف صدی سے زائد مدت تک طرح طرح سے اذیتیں دی گئیں' دست و زباں سے انکی دل شکنی کی گئی۔ پھر انبیاء و رسل پر طنز کرنا' انکا مذاق اڑانا تو گویا اقوام عالم کا معمول بن چکا تھا' جسکا گلہ پروردگارِ عالم نے بھی فرمایا۔ سورۃ یٰسٓ میں ہے:۔

یٰحَسۡرَةً عَلَی الۡعِبَادِ ۚ مَا یَاۡتِیۡهِمۡ مِّنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا کَانُوۡا بِهٖ یَسۡتَهۡزِءُوۡنَ (۳۰)

ترجمہ: ''افسوس اِن بندوں پر کہ ہمارا کوئی رسول ایسا نہیں گزرا جسکا انہوں نے مذاق نہ اڑایا ہو''۔ (یٰس/۳۰)

خود قومِ نوح علیہ السلام کے بارے سورۃ القمر میں فرمان ہے:۔

کَذَّبَتۡ قَبۡلَهُمۡ قَوۡمُ نُوۡحٍ فَکَذَّبُوۡا عَبۡدَنَا وَ قَالُوۡا مَجۡنُوۡنٌ وَّ ازۡدُجِرَ (قمر: ۹)

''اس سے پیشتر قومِ نوح نے بھی ہمارے بندے کی تکذیب کی اسکو جھٹلایا' اسے دیوانہ کہا اور اسے جھڑکا'' (قمر/۹)۔

بالآخر اس پر عاجز ہو کر حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے مدد کی التجا کی جسے اس سے متصل اگلی آیت میں قرآن نے بیان فرمایا:۔

فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ (قمر:۱۰)

ترجمہ: پس اس نے اپنے رب سے استدعا کی کہ میں (انکو سمجھا سمجھا کر تھک گیا اور انکی ایذا رسانیوں کا بدلہ نہیں لے سکتا کہ میں) ہار گیا ہوں پس تو میری مدد فرما۔ بایں صورت اس قوم پر عذاب الٰہی نازل ہوا جسے قرآن نے اس سے متصل اگلی دو آیات میں یوں بیان فرمایا:۔

فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ (۱۱) وَّ فَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُیُوْنًا فَالْتَقَی الْمَآءُ عَلٰٓی اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ (۱۲) (سورۃ:قمر)

تراجم: ''پس پھر ہم نے زوردار پانی برسانے کیلئے آسمان کے دروازے کھول دیئے (جو چالیس روز تک نہ تھما) (قمر:۱۱) اور زمین کے چشموں کے دھانے کھول دیئے یوں کہ دونوں پانی آپس میں مل گئے اتنی مقدار میں جو (اس قوم کو ہلاک کرنے کیلئے لکھ دی گئی) تھی''۔ (قمر: ۱۲)

غایتِ بعثت نوح علیہ السلام

جس زمانہ میں اولادِ قابیل بتدریج آتش پرست اور بت پرست بن گئی اور حق پرستوں کے مقابلے پر اتر آئی' وہ زمانہ ایک روایت کے مطابق مہلائیلؑ کے بعد کا ہے۔ نوحؑ حضرت ادریسؑ کے پوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے حضرت ادریسؑ کے پانچ بیٹے تھے جو نہایت خوبصورت و خوب سیرت موحد و مومن تھے اور قوم کو ہمیشہ نیکی و پرہیز گاری کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ لوگ بھی ان سے شدید عقیدت و محبت رکھتے تھے' البتہ انکے وصال کے بعد انہوں نے انکے فراق سے دلبرداشتہ ہو کر پہلے انکی تصاویر بنائیں اور بعد ازاں انکے بت بنا لئے جو بتدریج بت پرستی کا سبب بن گئے۔

دوسری روایت جسے احوال الانبیا' معالم التنزیل' مدارک التنزیل' تصریح الاذکیانی' تفسیر ابن کثیر' تفسیر امام غزالی سورۃ یوسف یاقوت التاویل' تفسیر کشاف' انوار التنزیل' اور جواہر القرآن جیسی مستند

کتب نے بالتفصیل بیان کیا ہے کہ حضرت ادریسؑ کے پانچ حسین وجمیل صالح اور عابد وزاہد بیٹے تھے جنکی شخصیت متاثر کن تھی اور خلق خدا کو ان سے قلبی انس تھا۔ جب یہ انتقال کر گئے تو قوم نے اوّل تو انکی بڑی بڑی تصاویر بنائیں اور بعد ازاں پتھر تراش کر انکے ناموں کے ساتھ انکے بت بنا لئے۔ علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے ''ارض القرآن'' میں ان بتوں کے ناموں کی لغوی تحقیق اور عرب میں آنے کے بعد انکی صورت و ہیئت کی تصریح کی ہے۔ انکی تحقیق کی رُو سے پہلا نام وَدّ تھا جو وُد سے مشتق ہے جسے بابل میں آفتاب کہتے ہیں۔ قبیلہ کلب کے لوگ اس کے پرستار تھے اور اسے خدا کی محبت کا مظہر اور ظہور عالم کا مبداء قرار دیتے تھے۔ دوسرے کا نام سُواع تھا جو قبیلہ ہذیل کا بت تھا۔ اس کا مشتق کلام عرب میں نہیں ملتا، ممکن ہے کہ سوع سے مشتق ہو جسکے معنی زمانہ کے ہیں۔ تیسرے کا نام یعوق تھا (عوق روکنا سے مضارع کا صیغہ ہے) اہل یمن میں یہ بت پوجا جاتا تھا۔ ہمدان اور یمن کے قبائل کا خیال تھا کہ یہ بت انکی مصیبتوں کو روکتا ہے۔ چوتھا بت یغوث تھا جسکے معانی فریاد رسی کرنے کے ہیں۔ قبیلہ مراد اور بنی عظیف کے لوگ اسے پوجتے تھے۔ پانچویں بت کا نام نسر تھا جسکے لغوی معنی گدھ کے ہیں۔ یہ بت حمیر کے خاندان ذی الکلاع کا معبود تھا۔ مشرکین نے انکو مختلف شکلیں دے رکھی تھیں۔ وَدّ کی شکل دراز قد مرد کی، سواع کی شکل عورت کی، یعوق کی گھوڑے کی، یغوث کی شیر کی اور نسر کی شکل گدھ کی تھی۔

حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت سے قبل تک یہ گمراہی نہایت قبیح صورت اختیار کر چکی تھی اور قومِ نوح متذکرہ بالا تمام بتوں کی پرستش میں مبتلاء تھی جسے قرآن نے سورۃ نوح میں بیان بھی فرمایا:۔

وَ قَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَ لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّ لَا سُوَاعًا ۙ۬ وَّ لَا يَغُوْثَ وَ يَعُوْقَ وَ نَسْرًا ۚ (نوح:۲۳)

''اور بولے کہ اپنے خداؤں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور (نوح کے لاکھ منع کرنے پر بھی) وَدّ کو اور سواع کو اور یعوق کو اور یغوث اور نسر کو (عبادت کیلئے) ترک نہ کرنا''۔ (نوح/۲۳)

لوگوں کی ایسی گمراہیوں سے انہیں بچانے اور اہل زمین کی ہدایت وراہنمائی کیلئے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام جیسی ہستی کو مبعوث فرمایا، جنہوں نے ان بتوں کی تکذیب فرمائی اور اپنی قوم کو سمجھایا کہ اے لوگو یہ بت احکم الحاکمین کی بارگاہ میں کچھ وقعت نہیں رکھتے۔ انکو پوجنا صریح گمراہی ہے،

عبادت تو صرف اللہ تعالیٰ کیلئے خاص ہے جو تمہارے سمیت تمام ارض وسماء کا خالق و مالک ہے۔ اسی کے قبضہ قدرت میں تمہاری اور ہر کسی کی زندگی و موت ہے اور وہی تمہارے ہر سود و زیاں پر قدرت رکھتا ہے دوسرا کوئی نہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ کے تین پہلو تھے اوّل جمالِ الٰہی دوئم جلالِ الٰہی اور سوئم براہین و دلائل قدرت الٰہی۔

مگر حضرت نوح علیہ السلام کی اس دعوت کی قوم نے مطلق پرواہ نہ کی۔ آپؑ گھر گھر جاتے فرداً فرداً لوگوں کو دعوت حق دیتے مگر وہ لوگ حق کا اثر قبول کرنے کی بجائے الٹا آپؑ کے خلاف ہو گئے اور آپکو زِچ کرنے میں جُت گئے۔ بات بات پر آپکو تمسخر کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ نہ صرف یہی بلکہ یوں زدوکوب کرتے کہ آپؑ اکثر بیہوش ہو کر گر جاتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ اپنی قوم سے کسی پیغمبر نے اتنی زحمت واذیت نہیں اٹھائی جتنی حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے اٹھائی۔ اس پر بھی حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کی شوخ چشمیوں اور گستاخیوں کو درگزر فرماتے رہے اور قریباً نصف صدی تک انتہائی شفقت و ہمدردی کا مظاہرہ کرتے رہنے کے ساتھ ساتھ انکی ایک ایک بات کا مدلل اور مسکت جواب بھی عطا فرماتے رہے۔ مگر اس بدبخت قوم کی طرف سے جواب میں سوائے تذلیل وحقارت، انکار و تکذیب کے آپکو کچھ نہ ملا۔ وہ بار بار آپکو جان سے مار ڈالنے اور سنگسار کرنے کی دھمکیاں دیتے۔ جسے قرآن نے یوں بیان فرمایا:۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ (الشعراء:۱۱۶)

''بولے اے نوح اگر تم (دعوتِ توحید اور خدا کے عذابوں کی دھمکیاں دینے سے) باز نہ آئے تو ضرور (ہمارے ہاتھوں) سنگسار کئے جاؤ گے''۔ (الشعراء:۱۱۶)

ایک جگہ یوں فرمان ہے جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بھی بیان ہو چکا:۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا وَ قَالُوْا مَجْنُوْنٌ وَّ ازْدُجِرَ (القمر:۹)

''حضرت نوح علیہ السلام کو انکی قوم نے جھٹلایا، انہیں فاطر العقل (دیوانہ) کہا اور انہیں جھڑکا''

اس پر حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے رب سے مدد طلب فرمائی۔ جسے قرآن میں یوں بیان فرمایا:۔

فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ (القمر:۱۰)

''تو اس نے اپنے رب سے دعا کی کہ میں مغلوب ہوں تو میرا بدلہ لے'' (قمر:۱۰)

وَ نُوْحًا اِذْ نَادٰی مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّیْنٰهُ وَ اَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِیْمِ ۚ (انبیاء: ۷۶) وَ نَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِیْنَ (انبیاء:۷۷)

''اور جب نوح نے اس سے قبل ہم کو پکارا تو ہم نے اسکی دعا قبول کی اور اسے اور اسکے گھر والوں کو اس بڑی سختی سے نجات دی (۷۶) اور ہم نے اس قوم کے لوگوں پر جو ہماری نشانیوں کو جھٹلانے والے تھے اس (نوح) کی مدد کی اور واقعی یہ برے لوگ تھے تو ہم نے ان سب کو غرق کر دیا''۔ (سورۃ الانبیاء:۷۶، ۷۷)

جب اس قوم کی سنگدلی حد سے بڑھ گئی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب انکے مقدر فرما دیا گیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کو ایک بیڑا (بڑی کشتی) تیار کرنے کا حکم فرمایا گیا جو اپنی زیر نگرانی بنوایا اور اسکا نقشہ و پیمائش بھی عطا فرمائی گئی۔ کشتی بنانے کے دوران بھی قوم کے سرکش افراد مسلسل آپکا تمسخر اڑاتے اور آوازے کستے رہے کہ دیکھو یہ دیوانہ خشک ریتلے دشت میں کشتی بنا رہا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی بنانے کا جو حکم صادر فرمایا گیا قرآن حکیم میں یوں ہے:۔

فَاَوْحَیْنَاۤ اِلَیْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْیُنِنَا وَ وَحْیِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ ۙ فَاسْلُكْ فِیْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ وَ لَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ (مومنون:۲۷)

''پھر ہم نے اسے وحی بھیجی کہ ہماری نگاہ کے سامنے اور ہمارے حکم سے کشتی بنا' پھر جب حکم آئے اور تنور ابلے تو ہر جوڑے میں سے دو (یعنی تمام حیوانات کے نر اور مادہ) کو اور اپنے گھر والوں کو (اس میں سوار کر) سوائے انکے جنکے بارے بات طے ہو چکی (کہ وہ بوجہ کفر و ظلم ہلاک ہو کر واصل جہنم ہونے والے ہیں) اور ایسے ظالموں کے معاملہ میں مجھ سے بات (سفارش) نہ کرنا' یہ ضرور غرق کئے جائیں گے''۔ (المؤمنون/۲۷)

بالآخر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی (جو سورۃ ہود میں ہے) کہ:۔

حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کے آثار

وَ اُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ۚ (۳۶) وَ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْیُنِنَا وَ وَحْیِنَا وَ لَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ (۳۷) (ھود: ۳۶/۳۷)

''اے نوح جو لوگ ایمان لا چکے بس وہ لا چکے' انکے علاوہ اب کوئی اور ایمان نہیں لائے گا' آپؑ اس قوم کی کرتوتوں (اعمال) پر رنجیدہ نہ ہوں''۔ (ھود/۳۶) اور ہمارے حکم سے ہمارے سامنے کشتی بناؤ اور ظالموں کے بارے مجھ سے بات نہ کرنا وہ ضرور ڈبوئے جائیں گے (ھود/۳۷)

متذکرہ بالا اِن جلالی آیات کا شانِ نزول یہ ہے کہ جب حضرت نوح علیہ السلام کا نافرمان بیٹا آخری وقت تک کشتی میں سوار نہ ہوا تو شفقت پدری کے ہاتھوں مجبور باپ نے اپنے رب کی بارگاہ میں استدعا کی کہ میرے بیٹے کو بچالے کہ تو نے مجھے اور میرے گھر والوں کو بچانے کا وعدہ فرمایا ہے۔

جس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو تجھ پر ایمان نہ لایا وہ تیرے اہل وعیال سے کیونکر ہوا۔ جسے سورۃ ھود میں یوں بیان فرمایا گیا ہے:۔

وَ نَادٰی نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَ اِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَ اَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ (۴۵) قَالَ یٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ ۫ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنِّیْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ (ھود: ۴۶)

''اور نوح نے اپنے رب کو پکار کر عرض کی کہ اے رب میرا بیٹا بھی تو میرے (اہل وعیال) گھر والا ہے' اور تیرا وعدہ (جو مجھے اور میرے گھر والوں کو بچانے کی بابت ہے) سچا ہے اور تو سب حکم کرنے والوں سے بڑا حکم فرمانے والا ہے' (۴۵) (تو جواب میں) فرمان ہوا کہ وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں' اسکے اعمال غیر صالح ہیں پس تو مجھ سے ایسی بات نہ مانگ جس کا تجھے علم نہیں' میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ نادان مت بن''۔ (سورۃ ہود/۴۵ تا ۴۶)

اسکے بعد ہلاکت خیز اور بدترین طوفانِ بادو باراں شروع ہوا جس کو پچھلے صفحات میں بیان

کر بھی چکا ہوں اور جو چالیس دن اور رات تک مسلسل بارش کی صورت میں جاری رہا۔ نہ صرف بارش، بلکہ زمین کے چشمے بھی ابل پڑے، محققین کے مطابق کرّہ ارض پر ہر جانب پانچ ماہ تک پانی بہتا رہا اور انس وحیوانات سمیت کوئی بھی زندہ نہ بچا۔

قرآن اس پر بھی گواہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی کافرہ بیوی بھی اس طوفان میں ہلاک ہوئی جو حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کنعان کی مانند اس طوفان کو معمولی بارش گمان کرتی ہوئی کشتی میں سوار نہ ہوئی (وہ اندر سے کافر ہی تھی) قرآن نے فرمایا:۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّ امْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَّ قِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ (تحریم: ۱۰)

''اللہ کافروں کی مثال دیتا ہے کہ نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی ہمارے صالح بندوں کے نکاح میں تھیں، پھر جب انہوں نے ان سے دغا کی، تو وہ اللہ کے سامنے انکے کچھ کام نہ آئے اور فرمایا گیا کہ تم دونوں عورتیں جہنم میں جانے والوں کے ساتھ جہنم میں جاؤ''۔ (سورۃ تحریم/۱۰)

بعد ازاں وہ کشتی (جس میں قبل از طوفان ایمان لائے لوگوں اور جانوروں کے جوڑوں کو حضرت نوح علیہ السلام نے بموجب حکم آیۃ ''المؤمنون/ ۲۷'' اپنے ہمراہ سوار کر لیا تھا) جودی پہاڑ کی ایک چوٹی پر رک گئی۔ بعض شارحین توریت شریف کے مطابق جودی، اس سلسلۂ کوہ کا نام ہے جس نے ارارات اور جارجیا کے سلسلۂ کوہ کو آپس میں ملا دیا ہے۔

اس موقع پر سورۃ ہود/ ۴۸ میں فرمان ہے کہ:۔

قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَ عَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَ اُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (ھود: ۴۸)

ترجمہ: ''اے نوح اب کشتی سے اتر، ہماری جانب سے تجھ پر سلامتی ہو اور ان پر جو تیرے ساتھ ہیں اور دوسری کتنی ہی جماعتیں (بعد میں آنے والی تیری نسل سے ایسی ہیں) جنہیں ہم دنیا (یعنی دنیاوی عیش وآرام) برتنے کیلئے دینگے پھر انہیں ہماری طرف سے (بوجہ انکے کفر وشرک

جودی پہاڑ جہاں طوفان نوح کے اختتام پر حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی رکی

بروزِ آخرت) دردناک عذاب پہنچے گا"۔ (ہود/ ۴۸)

کیونکہ جو لوگ ایسی عبرت انگیز نشانیوں کو دیکھ کر بھی نصیحت نہ پکڑیں تو ایسوں کا انجام اس سے متفرق کیونکر ہو۔ جو لوگ اپنے انبیاء کی فرمانبرداری میں عافیت کی راہ چلے تو انہیں کشتی والوں کے احوال سے بشارت ہے کہ وہ نجات یافتہ لوگوں میں سے ہونگے۔ اس ضمن میں فرمانِ قرآن ہے:۔

فَاَنجَیْنٰهُ وَ اَصْحٰبَ السَّفِیْنَةِ وَ جَعَلْنٰهَآ اٰیَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ(۱۵) (سورۃ: عنکبوت)

ترجمہ: "تو ہم نے اسے (یعنی نوح علیہ السلام کو) اور کشتی والوں کو بچالیا اور اس کشتی کو سارے جہان کیلئے (برائے عبرت) نشانی کیا"۔ (عنکبوت/ ۱۵)

آج بھی اس کشتی کے کچھ شکستہ ٹکڑے وہاں موجود ہیں اور لوگ زیارت کیلئے آتے ہیں۔

آل واولادِ نوح علیہ السلام

حضرت نوح علیہ السلام کے چار بیٹے تھے ان میں سے 'کنعان' تو طوفان میں غرق ہو گیا اور کشتی سے اترنے والے باقی تین بیٹے سام' حام اور یافث حضرت نوح علیہ السلام کے فرمانے پر دنیا کے مختلف حصوں کی طرف نکل گئے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے پہلے بیٹے سام تھے جنکی نسل سے اقوامِ ایشیا کا ظہور ہوا۔ سام کے پانچ بیٹے تھے جنکے نام/عیلام' اشور' ارفکسد' لود' اور ارم ہیں۔ ارفکسد نامی بیٹے کے بیٹے کا نام سلح تھا اور سلح کے بیٹے کا نام عبر (ہوّد) تھا۔ عبر کے دو بیٹے قحطان اور فلج تھے جن میں سے قحطان کی نسل جنوبی عرب میں یمن سے ظفار تک آباد ہوئی جو حضر موت کے مشرق میں واقع ہے۔ عبر کے دوسرے بیٹے فلج ہی حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے جدامجد تھے۔ نسب نامہ یہ ہے: اب وراحم (ابراہیم) بن تارخ (آزر) بن نحور بن سروج بن رعو بن فلج۔

اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے حام کی نسل افریقہ میں پھیلی اور یافث کی اولاد سے اقوامِ یورپ و موجودہ امریکہ کا سلسلہ چلا۔ سام کے پانچ بیٹوں میں سے ایک بیٹے ارم کے بیٹے کا نام عوض تھا جس سے عاد نامی بیٹا پیدا ہوا جو قومِ عاد کا مورث اعلیٰ ہوا۔ حضرت ہوّد (جو سلح بن ارفکسد بن سام بن نوح کے بیٹے ہیں) اسی قومِ عاد پر پیغمبر بنا کر بھیجے گئے جن کا ذکر انشا اللہ تعالیٰ حضرت ہود علیہ السلام کے عنوان تلے کیا جائیگا۔

حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ کا اجمالی و تفصیلی ذکر تینتالیس (۴۳) جگہ قرآن حکیم میں وارد ہے جسکی جدول یہ ہے:۔

ال عمران/۳۳، النساء/۱۶۳، انعام/۸۴، اعراف/۵۹، ۶۰، التوبہ/۷۰، یونس/۷۱، ہود/۲۵، ۳۲، ۳۶، ۴۲، ۴۵، ۴۶، ۴۸، ۸۹، ابراہیم/۹، بنی اسرائیل/۳، ۱۷، مریم/۵۸، الانبیاء/۷۶، الحج/۴۲، المومنون/۲۳، الفرقان/۳۷، الشعرا/۱۰۵، ۱۰۶، ۱۱۶، العنکبوت/۱۴، الصٰفٰت/۷۵، ۷۹، ص/۱۲، المومن/۵، ۳۱، ق/۱۲، الذاریات/۴۶، النجم/۵۲، القمر/۹، الحدید/۲۶، التحریم/۱۰، نوح/۱، ۲۱، ۲۶،

نوٹ:۔

احسن الخالقین باب (سوئم) میں انبیائے سابقین علیہم السلام کی نافرمان اقوام کی تباہی و بربادی کا تذکرہ کثرت سے ملتا ہے، دراصل یہ اقوام بذات خود ظالم تھیں اور اپنے کئے کا صلہ پاتی ہوئی دنیا میں بھی ہلاک ہوئیں اور آخرت میں بھی دوزخ ایسوں کا ٹھکانہ ہے۔ خود قرآن اس بات کی شہادت دیتا ہے جیسا کہ فرمان ہے:۔

" وَ مَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ " (هود:۱۱۷)

ترجمہ:۔ اور تمہارا رب ایسا نہیں کہ بستیوں کو بے وجہ ہلاک کر دے اور (جبکہ) انکے لوگ اچھے ہوں۔" (ھود/۱۱۷)

وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَ لٰكِنْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَمَاۤ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَ مَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ (ہود:۱۰۱)

ترجمہ:۔ اور ہم نے ان پر ظلم نہ کیا بلکہ انہوں نے خود اپنا بُرا کیا، تو انکے معبود جنہیں وہ اللہ کے علاوہ پوجتے تھے انکے کچھ کام نہ آئے اور جب تمہارے رب کا حکم آیا تو سوائے انکی ہلاکت کے ان (کے باطل معبودوں) سے کچھ نہ بن پڑا" (ہود/۱۰۱)

حضرت ہود علیہ السلام

جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے عنوان تلے عرض کر چکا ہوں کہ آپؑ کے چار بیٹوں میں سے کنعان نامی ایک بیٹا طوفانِ نوح میں بوجہ کفر غرق ہو گیا تھا بقیہ تین بیٹے کرّہ ارض کے مختلف برّ اعظموں میں چلے گئے اور انکی نسلوں سے موجودہ انسانی دنیا از سر نو آباد ہوئی۔ اسی لئے حضرت نوح علیہ السلام کو آدمِ ثانی بھی کہا جاتا ہے۔ آپؑ کے پہلے صاحبزادہ ''سام'' کے پانچ بیٹوں میں سے ارم نامی ایک بیٹے کے بیٹے کا نام عوض تھا جس سے عاد نامی بیٹا پیدا ہوا جو قومِ عاد کا مورث اعلیٰ ہوا' اور سام کے دوسرے بیٹے ارفکسد کے بیٹے سلح سے حضرت ہودؑ پیدا ہوئے۔ حضرت ہود علیہ السلام مطابق شجرہ سلح بن ارفکسد بن سام بن نوح کے بیٹے ہیں جنہیں قومِ عاد پر پیغمبر بنا کر بھیجا گیا۔ توریت شریف کے مطابق:۔

> ''آپؑ حضرت آدمؑ سے چودھویں پشت اور حضرت نوح علیہ السلام سے پانچویں پشت پر ہیں۔ آپؑ کی پیدائش کے وقت آپکے والد سلح کی عمر تیس (۳۰) برس تھی اور آپ (ہودؑ) کی کل عمر چار سو چونسٹھ (۴۶۴) سال ہوئی۔ (پیدائش/۱۱'۱۵)

قرآن حکیم میں حضرت ہود علیہ السلام اور آپکی قوم (عاد) کا مسکن سرزمین احقاف بتایا گیا ہے۔ جیسا کہ سورۃ احقاف میں ارشاد ہے:۔

> وَ اذْكُرْ اَخَا عَادٍ ؕ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ وَ قَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖۤ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (احقاف: ۲۱)
>
> ترجمہ:۔ ''اور عادؑ کے بھائی (ہودؑ) کو یاد کرو جب انہوں نے اپنی قوم کو سرزمین احقاف میں (شرک کی قباحت اور عذاب خداوندی سے) ڈرایا اور بلاشبہ اس (ہودؑ) سے قبل بھی خدا خوفی دلانے والے اور اس (ہودؑ) کے بعد آنے والی (اقوام) پر بھی (ان اقوام کی ہدایت و راہنمائی اور انہیں خدا کا ڈر سنانے کیلئے انبیاء و پیغمبران خدا مسلسل) تشریف لائے (اور ان سب نے اپنی اپنی قوم کو نصیحت کی) کہ مجھے (بصورت شرک و کفر) تم پر ایک بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے''۔ (الاحقاف:۲۱)

بلادِ احقاف کی جغرافیائی حدود کے ضمن میں علامہ سید سلیمان ندوی نے ''ارض القرآن'' میں لکھا ہے کہ:۔ ''یمامہ' عمان' حضرموت اور مغربی یمن کے بیچ جو صحرائے اعظم (الدہنا یا ربع خامی) واقع ہے' گو وہ آبادی کے قابل نہیں مگر اسکے اطراف میں کہیں کہیں آبادی کے لائق جگہ ضرور موجود ہے' خاص کر وہ حصہ جو حضرموت سے نجران تک پھیلا ہوا ہے۔ اگرچہ اس وقت وہ بھی آباد نہیں تھا تاہم عہد قدیم میں اسی حضرموت اور نجران کے درمیانی حصہ میں ایک نہایت تنومند اور قوی الجثہ لوگوں کا ''عادِ ارم'' نامی ایک مشہور قبیلہ آباد تھا۔ قوم عاد' جسے عادِ اولیٰ بھی کہتے ہیں جنوب مشرقی عرب میں سواحل خلیج فارس سے حدودِ عراق اور جنوب مغرب میں حضرموت تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسکے عروج کا زمانہ' ۲۲۰۰ ق م تا ۱۷۰۰ ق م تک ہے۔ اس قوم کی زبان آرامی تھی اور مذہباً یہ لوگ بت پرست اور ستارہ پرست تھے۔ ڈیل ڈول کے لحاظ سے یہ نہایت قوی ہیکل تنومند اور طاقتور تھے۔ سورۃ اعراف میں ہے۔

..... وَّ زَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ..... (الاعراف: ۶۹)

۔۔۔۔۔ ''اور زیادہ کر دیا تمہارے بدن کا پھیلاؤ'' ۔۔۔۔۔ (الاعراف: ۶۹)

نہ صرف یہی بلکہ یہ قوم نہایت فارغ البال بھی تھی اور انکے یہاں دنیوی مال واولاد کی کثرت تھی۔ ان کا ملک نہایت سرسبز وشاداب تھا جس بناء پر یہ لوگ آسودہ حال تھے مگر بدمستیوں میں کھوئے ہوئے یہ لوگ خدا کے انعامات کا شکر ادا کرنے کی بجائے شرک وکفر جیسی لعنت کا شکار ہو چکے تھے۔ شیطان نے انکے اعمال انکی نظر میں یوں آراستہ کر دیئے کہ وہ عقل وشعور کے حامل ہونے کے باوجود راہِ حق سے بھٹک گئے تھے۔ جیسا کہ قرآن نے فرمایا:۔

وَ عَادًا وَّ ثَمُوْدَا وَ قَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ ۫ وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَ كَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ۙ (۳۸) (سورۃ: عنکبوت)

ترجمہ:۔ اور تمہیں عاد وثمود کی بستیاں معلوم ہو چکی ہیں' اور شیطان نے انکے اعمال انکو آراستہ

کر کے دکھائے اور انکو سیدھے راستہ سے روک دیا' حالانکہ وہ دیکھنے والے تھے (عنکبوت:۳۸)

یہ قوم شرک و بت پرستی جیسی قبیح برائی اور گناہِ کبیرہ کی مرتکب تھی۔انہوں نے رزق دینے' بارش برسانے' اولاد عطا کرنے' صحت و تندرستی دینے الغرض مختلف مطالب و حاجات کیلئے الگ الگ بت تراش رکھے تھے جنکی پوجا کیا کرتے۔چنانچہ اس قوم کی اصلاح اور ھدایت کیلئے حضرت ہود علیہ السلام کو مبعوث فرمایا گیا۔حضرت ہودؑ نے پہلے اس قوم کو اپنے منصب رسالت سے مطلع فرمایا کہ میں تمہارا پیغمبر ہوں پھر انہیں توحید کی دعوت دی' بت پرستی سے منع کیا' شرک کا بطلان فرمایا' اور انہیں خدا تعالیٰ کی ناراضگی سے متنبہ کیا اور خدا خوفی کی تلقین کی۔قرآن حکیم میں ارشاد ہے:۔

وَ اِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا ط قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ط اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (اعراف:۶۵)

ترجمہ:۔''اے قوم صرف اللہ کی عبادت کرو' اسکے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں' کیا تم (خدا سے) نہیں ڈرتے''۔(الاعراف:۶۵)

مگر اس قوم پر بھی ابلاغ کا اثر نہ ہوا' آپکی ہر بات کا الٹ جواب دیتے ہتھیں گھڑتے اور آپکی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے۔جسے قرآن نے بیان فرمایا:۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَوْمِہٖٓ اِنَّا لَنَرٰکَ فِیْ سَفَاھَۃٍ وَّ اِنَّا لَنَظُنُّکَ مِنَ الْکٰذِبِیْنَ (اعراف:۶۶)

ترجمہ:۔''انکی قوم کے سردار جو کافر تھے کہنے لگے' تم ہمیں احمق نظر آتے ہو اور ہم تمہیں جھوٹا خیال کرتے ہیں''۔(الاعراف/۶۶)

جس پر حضرت ہودؑ نے نہایت شفقت سے جواب دیا۔

قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ سَفَاھَۃٌ وَّ لٰکِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ(۶۷) اُبَلِّغُکُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَ اَنَا لَکُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ (اعراف:۶۸)

ترجمہ:۔اے میری قوم مجھ میں حماقت کی کوئی بات نہیں' بلکہ میں رب العالمین کا بھیجا ہوا رسول ہوں (۶۷) میں تمہیں خدا کا پیغام پہنچاتا ہوں اور تمہارا معتمد خیر خواہ ہوں (اعراف:۶۸)۔

مگر یہ بد بخت قوم اپنی جسمانی قوت اور مالی آسودگی کے نشہ میں اتنی بدمست تھی کہ اس پر ھادیٔ برحق کے پند و نصائح کا کچھ اثر نہ ہوا۔ بجائے اسکے کہ انکی بات تسلیم کر کے حضورِ حق میں معافی طلب کرتے اور ھدایت وفلاح کی راہ اختیار کرتے' الٹا وہ حضرت ہودؑ کو اپنی ڈگر پر لانے اور اپنے بتوں سے ڈرانے کی بات کیا کرتے۔ قرآن نے فرمایا۔

اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ قَالَ اِنِّيْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَ اشْهَدُوْٓا اَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۙ (۵۴) (سورۃ:ھود)

''بولے اے ہود تم کوئی دلیل لے کر ہمارے پاس نہ آئے اب ہم خالی تمہارے کہنے پر تو اپنے خداؤں کو چھوڑنے والے نہیں' نہ ہی تمہاری بات تسلیم کرنے والے ہیں' بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ ہمارے خداؤں میں سے ہی کسی کی پکڑ میں آئے ہوئے ہو' (اس پر ہودؑ نے فرمایا) میں خدا کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ تم جن (بتوں) کو (خدا کا) شریک بناتے ہو' میں ان سے بیزار ہوں''۔ (ہود:۵۴)

ایک طرف پوری طرح بپھری ہوئی ایک سرکش قوم اور دوسری طرف بظاہر ایک بے سہارا و نادار فردِ واحد جو اپنے ایمان اور خدا کے توکل کے سہارے اس قوم کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگانے کی کوشش کر رہا تھا اور دوسری طرف یہ ہٹ دھرم جہلا کا گروہ کہ میں نہ مانوں کی رٹ لگائے رکھتا۔ یہاں تک کہ قوم سیدھا سیدھا یہ کہنے پر آ گئی کہ جاؤ جس عذاب سے ہر وقت ہمیں ڈراتے رہتے ہو' اپنے خدا سے کہہ کر وہ عذاب ہم پر لے آؤ۔ گویا طویل عرصہ تک حضرت ہودؑ کی دن رات کی سعی پیہم اور دعوت کا کوئی نتیجہ نہ نکلا' اور عادِ اُولیٰ سرکشی پر آمادہ رہی۔ مفسرین کے مطابق صرف چار ہزار کے قریب ایسے خوش بخت تھے جو حضرت ہودؑ پر ایمان لائے اور اس قوم پر آنیوالے ہلاکت خیز عذاب سے بچ گئے جنہیں عادِ ثانیہ کہا جاتا ہے۔

جب عادِ اولیٰ کی مخالفت اور سرکشی حد سے بڑھ گئی تو تین سال تک انہیں خشک سالی نے گھیرے رکھا' جب وہ پھر بھی نہ سنبھلے تو خدا تعالیٰ کی طرف سے ان پر بادِ صرصر کا عذاب آیا۔ یہ بادِ صرصر ایک بادل کی صورت تیز طوفانِ بادو باراں تھا جس کا رُخ عادِ اولیٰ کی رہائشی وادیوں کی طرف تھا۔ حضرت ھودؑ گذشتہ تین سالوں کی خشک سالی کے حوالہ سے بھی انہیں متنبہ کرتے اور باور کراتے رہے کہ یہ گرفتِ

خدا تعالیٰ کی ابتداء ہے مگر وہ بدنصیب انکی بات پر کان دھرنے والے ہی کب تھے۔ چنانچہ مذکورہ عذاب نے بادلوں کی صورت اُن کو آلیا۔ وہ آخری لمحہ تک یہی سمجھتے رہے کہ یہ ابر ہے جو برسے گا تو ہماری آبادیاں پھر سے سیراب ہو جائینگی اور ہمیں (معاذ اللہ) ہودؑ کے احمق ہونے پر ہنسنے کا ایک اور موقع میسر آئیگا۔

مگر یہ ایک دردناک عذاب تھا جہاں جہاں سے گزرا وہاں کی ہر شئے کو نیست و نابود کرتا چلا گیا۔ قرآن حکیم میں ہے:۔

وَ اَنَّهٗۤ اَهۡلَكَ عَادَا نِ الۡاُوۡلٰى ۙ (نجم: ۵۰)

اور یہ کہ اسی (اللہ) نے عادِ اولیٰ کو ہلاک فرمایا"۔ (نجم: ۵۰)

یہ ایسی سخت آندھی تھی کہ جس جس جگہ سے اور جس جس کو چھو کر گزرتی اسے بوسیدہ ہڈی کی مانند کر جاتی۔ سورۃ القمر میں فرمان ہے:۔

كَذَّبَتۡ عَادٌ فَكَيۡفَ كَانَ عَذَابِىۡ وَ نُذُرِ (۱۸) اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ رِيۡحًا صَرۡصَرًا فِىۡ يَوۡمِ نَحۡسٍ مُّسۡتَمِرٍّ ۙ (۱۹) تَنۡزِعُ النَّاسَ ۙ كَاَنَّهُمۡ اَعۡجَازُ نَخۡلٍ مُّنۡقَعِرٍ (۲۰) فَكَيۡفَ كَانَ عَذَابِىۡ وَ نُذُرِ (القمر: ۲۱)

ترجمہ:۔ عاد (کی قوم) نے (اپنے نبی ہودؑ کو) جھٹلایا۔ (کہ کوئی عذاب آنے والا نہیں جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے) تو پھر کیسا رہا ہمارا عذاب اور ڈرانے کا فرمان (القمر/ ۱۸) بیشک ہم نے ان پر ایک سخت آندھی بھیجی ایک منحوس دن (ماہ کے آخر میں بروز بدھ) جسکی نحوست ان پر ہمیشہ کیلئے رہی (القمر/ ۱۹) (وہ سخت آندھی) جو لوگوں کو یوں دے مارتی (اور اٹھا اٹھا کر پٹختی) تھی (کہ کچھ ہی دیر میں وہ یوں پڑے تھے) گویا وہ کھجور کے اکھڑے ہوئے ڈنڈ (تنے بکھرے پڑے) ہوں (القمر/ ۲۰)۔ پھر کیسا رہا ہمارا عذاب اور ڈرانا (القمر/ ۲۱)

اس عذاب سے حضرت ہودؑ اور انکے ایمان لائے ساتھیوں کے علاوہ کوئی زندہ نہ بچا۔ یہی بچ جانے والے اور انکی آئندہ نسلیں عادِ ثانیہ کہلائے۔ ایک عرب روایت کے مطابق یہ لوگ عذابِ صرصر کے بعد حجاز چلے گئے تھے اور بعد ازاں واپس لوٹ آئے۔ دوسری روایت کے مطابق (جو قرین قیاس ہے)

ایمان لائے ہوئے یہ لوگ حضرت ہودؑ کے کہنے پر عذاب آنے سے قبل ہی احقاف چھوڑ کر اس پہاڑی علاقے میں چلے گئے تھے جو عاد کی مرکزی آبادیوں سے باہر حضر موت کی سطح مرتفع کے شمالی حصہ میں تھا۔ (تا کہ متوقع عذاب الٰہی سے محفوظ رہیں) قرآن حکیم سورۃ ہود میں فرمان ہے:۔

وَ لَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا نَجَّیۡنَا هُوۡدًا وَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ بِرَحۡمَةٍ مِّنَّا ۚ وَ نَجَّیۡنٰهُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ غَلِیۡظٍ (ھود:۵۸)

ترجمہ: ''اور جب ہمارا حکم (عذاب) آیا ہم نے ہودؑ اور جو ایمان لائے ہوئے لوگ اسکے ساتھ تھے انہیں اپنی رحمت سے (اس عذاب کا شکار ہونے) سے بچا لیا اور (ایسے) سخت عذاب سے (عادِ ثانیہ کو) نجات دی''۔ (ھود:۵۸)

حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی بقیہ زندگی اپنے ایمان لائے ساتھیوں کے ساتھ وہیں گزاری اور یہیں سے عالم بقاء کو سدھارے۔ آپؑ طوفان صرصر کے بعد اپنے پیروکاروں میں مزید پچاس برس زندہ رہے۔ اکثر مفسرین توریت شریف کی روایت سے متفرق آپکی عمر چار سو چونسٹھ سال کی بجائے صرف چار سو برس بتاتے ہیں۔ آپکے انتقال کے بعد طویل عرصہ تک آپکے متبعین آپکے دین پر قائم رہے لیکن قحطان ابن العرب کے غلبہ کے بعد انہیں پھر گمراہی نے آگھیرا اور یہ بت پرستی میں مبتلاء ہوگئے۔ ''حضر موت'' کے مقامی لوگوں کا دعویٰ ہے کہ حضرت ہودؑ عادِ اولیٰ کی ہلاکت کے بعد ''حضر موت'' چلے آئے تھے یہیں انکا انتقال ہوا اور وہ اسی وادیٔ برہوت میں دفن کیے گئے۔ (واللہ اعلم بالثواب)

حضرت لقمانؒ

یہ درست ہے کہ ترتیب و تسلسل کے لحاظ سے حضرت ہودؑ کے بعد صالح علیہ اسلام کا اسم گرامی آتا ہے۔ تاہم قوم عاد کے ذکر کے ضمن میں حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام کے درمیان قرآن حکیم نے ایک ایسی شخصیت کا بھی ذکر کیا ہے جو اگرچہ پیغمبروں میں شمار نہیں کئے جاتے مگر خزینہ علم و حکمت کی حامل اپنے وقت کی بڑی صالح اور دانشمند ہستی خیال کی جاتی ہے جن کا نام نامی لقمانؒ ہے اور جو توحید کے داعی و نقیب تھے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں صفاتِ پیغمبرانہ سے نوازا تھا۔ آپؒ سوڈان کے رہنے والے حبشی النسل تھے۔ کچھ تذکرہ نویسوں نے آپکے آباؤ اجداد کا نام عنقا بن مرون بتایا ہے اور کوئی عجب نہیں کہ یہی صحیح ہو۔

علمائے اسلام لفظ لقمان کے اشتقاق سے متعلق مختلف الرائے ہیں۔ بعض اسے عربی زبان کا لفظ قرار دیتے ہوئے اس کا مادہ لقم ٹھہراتے ہیں اور بعض اسے عربی کی بجائے عجمی سمجھتے ہیں۔ مؤخر الذکر رائے درست معلوم ہوتی ہے کیونکہ جناب لقمانؒ کا حبشی النسل ہونا محققین ثابت کر چکے ہیں' بنابرایں یہ خیال بھی غلط ہو جاتا ہے کہ آپؒ حضرت ایوب علیہ السلام کے بھانجے ہیں۔ تذکرہ نویسوں میں آپکے ذریعہ معاش کے بارے بھی آراء مختلف ہیں' کوئی آپکو چرواہا جانتا ہے' کوئی کہتا ہے کہ آپؒ بڑھئی کا کام کرتے تھے کسی کا خیال ہے کہ آپؒ خیاط تھے۔ ہوسکتا ہے کہ آپؒ نے مختلف اوقات میں مذکورہ مختلف کام کئے ہوں۔

کار و آثار سے یہ درست معلوم ہوتا ہے کہ آپؒ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں موجود تھے کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھ میں عنوانِ حکومت آنے سے پہلے آپؒ بنی اسرائیل کے مفتی تھے۔ ہر چند کہ آپ سیاہ فام حبشی تھے شکل و صورت بھی واجبی سی پائی تھی لیکن خداداد علم و حکمت کا یہ عالم تھا کہ آپکو بنی اسرائیل میں فتوے دینے کا منصب عطا کیا گیا تھا۔

باوجود یکہ حضرت لقمانؒ بنی اسرائیل بالخصوص حضرت داؤد علیہ السلام کے ہم عصر ہیں تاہم توریت شریف میں نہ تو انکا کہیں ذکر ملتا ہے اور نہ توریت کی تاریخ ہی سے انکے حالات کا کچھ پتہ ملتا

ہے۔حق تو یہ ہے کہ دنیا اگر لقمانؒ کے نام سے آشنا ہوئی ہے تو قرآن حکیم ہی کے طفیل ہوسکی ہے۔قرآن حکیم کی ایک سورۃ لقمان بھی ہے جو آپ ہی کے نام سے موسوم ہے۔آپکا اعزاز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے اپنے محبوب رسولِ برحق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو لقمان کی نصیحتوں کے اس حصہ سے مطلع فرمایا جو توحید سے متعلق تھا۔

آپؒ نے اپنی فطری ذہانت وفطانت سے خود کو حکیم ثابت کیا۔آپکے پند ونصائح اور جو قصے مشہور ہیں انہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ یوزارسیفؑ اور لقمانؒ کے قصص کا مرتب ومحرر کوئی ایک ہی شخص تھا کیونکہ دونوں کے قصوں بلکہ انداز تحریر میں بھی کافی حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔

آپکی دانائی کے واقعات بہت زیادہ ہیں۔مورخین نے ایک واقعہ لکھا ہے جو قابل ذکر ہے کہ مالک نے ایک مرتبہ کسی بکری کی طرف اشارہ کر کے آپکو کہا کہ جاؤ اس بکری کو ذبح کر کے اسکے گوشت کا بہترین حصہ لے آؤ۔آپؒ اسکی زبان اور دل نکال کر لے آئے۔چند روز بعد مالک نے دوسری بکری دی اور کہا کہ اسکو ذبح کرو اور اس مرتبہ اسکے گوشت کا بدترین حصہ لے آؤ۔آپ نے حسب الحکم بکری ذبح کی اور پھر وہی دونوں چیزیں زبان اور دل لا کر پیش کر دیا۔مالک نے حیرت سے کہا کہ بہترین حصہ لانے پر بھی زبان اور دل لائے تھے اور آج بدترین حصہ طلب کرنے پر بھی وہی دل اور زبان لائے ہو۔لقمانؒ نے کہا حضور دل اور زبان اگر پاک ہوں تو اس سے بہتر کوئی شئے نہیں اور اگر یہ ناپاک ہوں تو ان سے بدتر چیز بھی کوئی نہیں۔

غلامی سے آزاد ہونے کا قصہ یوں ہے کہ خربوزہ کھانے کے دوران آپکے مالک کے ہاتھ بہت کڑوا خربوزہ آگیا تو وہ اس نے آپکو کھانے کیلئے دیدیا۔آپؒ اسے جیسے کیسے کھا گئے تو مالک نے حیران ہو کر کہا کہ ایسا کڑوہ پھل تم سے کیونکر کھایا گیا۔جواب میں آپؒ نے کہا کہ حضور کی مجھ پر ایسی ایسی عنایتیں ہوئی ہیں اور آپ سے ایسی ایسی نعمتیں میسر آتی رہی ہیں' اب اگر ایک مرتبہ حضور سے کوئی کڑوی شئے مل گئی ہے تو اسے قبول نہ کرنا صریح ناشکری ہوتی۔مالک اس جواب سے اس قدر خوش ہوا کہ اس نے آپکو فوراً آزاد کر دیا۔

الغرض حضرت لقمانؒ اعلیٰ ترین حکیموں اور داناؤں میں سے تھے۔آپکی تعلیم وتربیت کے

حالات کے بارے تو معلومات میسر نہیں ہوسکیں البتہ یہ طے ہے کہ آپ کو حضرت ایوبؑ کی بارگاہِ نبوت سے فیضیاب ہونے کا موقع میسر ہوا۔ مٹین کی بایوگرافیکل ڈکشنری میں آپکے حالات سے متعلق صرف اتنا لکھا ہے کہ:۔ ''آپؒ ایک حبشی نژاد فلسفی تھے کسی کم تر نسل کی یادگار تھے اور غلام تھے''۔ ایسی بات کرنے والوں کی اوقات اور ذاتی سوچ سے قطع نظر' ذکر لقمانؒ سے مراد صرف یہ ہے کہ جب انسان کی عقل بارگاہِ نبوت سے فیضیاب ہوکر جلا پاتی اور وحی کی روشنی میں فیصلے کرتی ہے تو وہ فیصلے دین فطرت کے عین مطابق اور صحیح تر ہوتے ہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وجہ فضیلت نسب نہیں بلکہ تقویٰ ہوا کرتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے حوالہ سے ''بنی ہود'' (عادِ ثانیہ کی بستی) جو حضرموت کی شمالی سطح مرتفع پر واقع ہے جسے سید سلیمان ندوی مرحوم نے روایات عرب کے حوالہ سے انکا ایک مقام ہجرت حجاز بھی بیان کیا ہے' جہاں عادِ ثانیہ کی ایک حکومت قائم ہوگئی تھی۔ اس میں ایک مشہور بادشاہ لقمانؒ نام کا بھی گزرا ہے۔ سید ندوی کا کہنا ہے کہ ۱۸ھ میں وہاں کی کھدائی کے دوران عاد کا ایک کتبہ ملا تھا جس میں یہ فقرے درج تھے کہ ہم پر وہ بادشاہ حکومت کرتا تھا جو کمینہ خیالات سے بہت دور تھا اور شریروں کو سزائیں دیتا تھا۔ ہودؑ کی شریعت کے مطابق اچھے فیصلے ایک کتاب میں لکھے جاتے تھے۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ ''کیا کتاب میں لکھے ہوئے اچھے فیصلوں کو ہم ''صحیفہ لقمان'' یعنی اچھے فیصلوں کا مجموعہ نہیں کہہ سکتے جو حضرت ہودؑ کی شریعت کے متبع بادشاہ لقمانؒ نے لکھوائے تھے۔ (ارض القرآن/جلد۔۱/صفحہ ۱۸۳'۱۸۷)

حضرت لقمان کون تھے یا کیا کرتے تھے یا کہاں کے رہنے والے اور کس حسب ونسب سے تعلق رکھتے تھے اس سے کیا سروکار؟ محقق تو تحقیقات کرتے ہی رہتے ہیں ہمیں تو سردست یہ دیکھنا ہے کہ قرآن حکیم میں ذکر لقمانؒ سے کیا مقصود ہے۔ اگرچہ حضرت لقمانؒ شروع میں غلام تھے مگر وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں میں سے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انکا رتبہ بلند کیا اور وہ غلام سے بادشاہ بنے۔ انکے شان و شرف کیلئے یہ کیا کم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس برگزیدہ بندے کا ذکر بطورِ خاص قرآن میں فرمایا بلکہ پوری ایک سورۃ مبارکہ آپکے نام سے موسوم ہے۔ سورۃ لقمان میں آپکا ذکر یوں کیا گیا ہے:۔

''اور اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم وہ وقت یاد کیجئے جب لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا کہ کسی کو اللہ کا شریک نہ بنانا کیونکہ شرک بڑا سخت گناہ ہے' اور اس دن کے آنے سے پہلے جو ٹل نہیں

سکتا' اپنا منہ صحیح دین پر مرتکز رکھنا' اس روز سب الگ الگ ہو جائیں گے اور ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے لقمان کو حکمت دے چکے ہیں اور ہم نے اس سے کہا کہ اللہ کا شکر ادا کرو اور جو کوئی شکر ادا کریگا وہ اپنے ہی بھلے کیلئے کریگا۔ اور جو کوئی ناشکری کرے تو اللہ بے پرواہ ہے اور خوبیوں والا ہے۔ اور ہم نے آدمی کو ماں باپ سے اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے''۔ (اقتباس/سورۃ لقمان)

چند وصایائے حضرت لقمانؒ :۔

''اے بیٹے :۔ جب کسی کی صحبت میں جاؤ تو لوگوں کو (اجتماعی) سلام کر کے بیٹھ جاؤ۔ اگر وہ لوگ خدا کی بابت ذکر کر رہے ہوں تو بیٹھے رہنے میں حرج نہیں اور اگر کسی اور کا ذکر کر رہے ہوں تو دامن جھاڑ کے اٹھ کھڑے ہو اور انکی صحبت چھوڑ دو۔ اے بیٹے :۔ برے لوگوں سے اللہ کی پناہ مانگتے رہو اور جو اچھے ہیں ان سے بھی محتاط رہو' دنیا کے جال میں مت پھنسو اور اپنے دل کو اس میں نہ لگاؤ۔ کیونکہ تم دنیا کیلئے پیدا نہیں کیے گئے ہو۔ اے بیٹے :۔ جب تک کسی بات پر مجبور نہ ہو جاؤ نہ بولو اور نہ سنو۔ نہ اس بات کو پوچھو جس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں اور نہ بے مقصد کسی طرف قدم بڑھاؤ۔ اے بیٹے :۔ اپنا مال ضائع نہ کرو اور دوسروں کے مال کی طرف مت دیکھو۔ تمہارا مال وہ ہے جو تم نے اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور دوسروں کا وہ ہے جسے تم دوسروں کیلئے چھوڑ جانے والے ہو۔ اے بیٹے :۔ جو کوئی دوسروں پر رحم کرتا ہے خود اس پر بھی رحم کیا جاتا ہے' جو خاموش رہتا ہے امن میں رہتا ہے۔ جو اچھی بات کہتا ہے اس سے خود بھی فائدہ اٹھاتا ہے۔ جو جھوٹ بولتا ہے وہ گنہگار ہے اور بالآخر نقصان اٹھاتا ہے۔ جو زبان قابو میں نہیں رکھتا وہ ندامت اٹھاتا ہے۔ اے بیٹے :۔ علماء کی صحبت میں گھٹنوں کے بل یعنی ادب سے جاؤ اور انکی خدمت میں خاموش بیٹھو اور کان لگاؤ۔ اس لئے کہ علماء کے نور سے دل اسی طرح زندہ ہو جاتا ہے جس طرح مردہ زمین آسمان کے مینہ سے زندہ ہو جاتی ہے۔''

حضرت صالح علیہ السلام

حضرت صالح علیہ السلام نوح علیہ السلام کے بیٹے سام کے بیٹوں میں سے پانچویں بیٹے ''ارم'' کی اولاد میں سے تھے۔ تاریخ طبری کے مطابق آپکا نسب نامہ حضرت صالح بن ثمود بن جشبر (غاثر) بن ارم بن سام بن حضرت نوح علیہ السلام ہے۔ علمائے انساب قوم ثمود کے اس پیغمبر کے نسب نامہ میں مختلف رائے رکھتے ہیں۔ حافظ الحدیث امام بغویؒ (مشہور تابعی) نے آپکا نسب نامہ یوں بیان کیا ہے: صالح بن عبید بن آسف بن ماشح بن عبید بن حادر بن ثمود۔ جبکہ وہب بن منبہ (جو توریت کے بہت بڑے عالم ہیں) کے نزدیک یوں ہے' صالح بن عبید بن حادر بن ثمود۔

اگرچہ امام بغویؒ زمانہ کے اعتبار سے وہب بن منبہ سے بہت بعد میں ہیں تاہم صالح علیہ السلام سے ثمود تک نسب کی جو کڑیاں امام بغویؒ نے ملائی ہیں (علمائے انساب کے نزدیک تاریخی حیثیت سے) وہی قرین صواب ہیں۔

اس نسب نامہ سے یہ واضح ہو گیا اس قوم کو (جسکے ایک فرد' حضرت صالح علیہ السلام بھی ہیں) ثمود اس لئے کہا جاتا ہے' کہ انکے نسب نامہ کے جد اعلیٰ کا نام ثمود ہے اور اسی کی طرف یہ قبیلہ یا قوم منسوب ہے۔ بہر حال ہر دو روایتوں سے بالاتفاق یہ ثابت ہے کہ قومِ ثمود بھی سامی اقوام ہی کی ایک شاخ ہے اور یہ وہی افرادِ قوم ہیں جو عادِ اولیٰ کی ہلاکت کے وقت حضرت ہودؑ کے ساتھ بچ گئے اور عادِ ثانیہ کہلائے تھے۔

عادِ ثانیہ حضرت ہودؑ کی وفات کے بعد کافی عرصہ شریعتِ ہودؑ اور دین توحید پر کاربند رہی لیکن قحطان ابن العرب کے غلبہ کے بعد یہ پھر سے بت پرستی میں مبتلاء ہو گئے تھے اور پھر سے کسی پیغمبر کی ضرورت کے محتاج تھے۔ چنانچہ حضرت صالح علیہ السلام کو قوم ثمود کی ہدایت و رہنمائی کیلئے مبعوث فرمایا گیا۔ جو شمالی و غربی عرب میں اس مقام پر آباد تھی جسے بعد میں ''وادی القریٰ'' کا نام دیا گیا۔ نام کی وجہ بظاہر یہ ہے کہ اس وادی میں جا بجا چھوٹے چھوٹے قریے آباد تھے۔ وادیٔ القریٰ حجاز اور شام کے مابین عربوں کی اس مشہور تجارتی شاہراہ پر واقع ہے' جو یمن سے سواحل بحر احمر کے کنارے کنارے حجاز و

مدین سے گزر کر خلیج عقبہ کے کنارے سے نکلتی ہوئی شام کو جاتی ہے اور جس کو سورۃ الحجر میں کھلا راستہ کہا گیا ہے۔ (بحوالہ ارض القرآن جلد۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفر تبوک میں اس مقام سے گزرے تھے۔ آجکل یہ مقام ''مدائن صالح'' کے نام سے معروف ہے اور حجاز ریلوے کا ایک اہم اسٹیشن ہے۔

''تاریخ مرۃ الزمان'' میں مذکور ہے کہ قوم ثمود (جو چاہِ ثمود کے قریب رہنے کی مناسبت سے ثمود کے نام سے مشہور ہوگئی تھی) درحقیقت یہ قوم عاد ہی کا بقیہ حصہ ہے جو بادصرصر کے عذاب سے بچ رہا تھا۔ اس اعتبار سے جو خصوصیات قوم عاد میں پائی جاتی تھیں وہی ان میں بھی موجود تھیں۔ عادِ اولیٰ کی طرح (موجودہ قوم) ثمود بھی نہایت قوی الجثہ، قدآور، طاقتور اور طویل العمر تھی۔ فن تعمیر اور فن سنگ تراشی میں ان لوگوں کو خاص مہارت تھی۔ حجاز اور شام کے درمیان وادیٔ القریٰ میں (جہاں یہ قوم کسی زمانہ میں آباد تھی) پہاڑوں کو کاٹ کاٹ کر نہایت شاندار پرتکلف اور پائیدار عمارتیں بناتے تھے، جنکے آثار آج بھی موجود ہیں۔ قرآن میں اسکا حوالہ یوں ہے:۔

وَ ثَمُوْدَ الَّذِیْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۪ (۹) (سورۃ:الفجر)

ترجمہ:۔ اور قوم ثمود جو وادی (القریٰ) میں پتھر کی چٹانیں تراشتے تھے۔ (الفجر:۹)

حضرت صالح علیہ السلام کی نبوت و رسالت اور قوم ثمود کی سرکشی و ہلاکت کی خبر بھی صرف قرآن حکیم نے دی ہے وگرنہ توریت آپکے تذکرہ سے خالی ہے۔ یوں تو یہود و نصاریٰ کی من مانیوں کے سبب الہامی کتب بھی انکی دست و برد سے نہ بچ پائیں اور تحریفات کی نذر ہوتی رہتی ہیں، تاہم یہ غالباً اس لئے ہے کہ توریت میں صرف ان انبیاء کا ذکر آیا ہے جن کا تعلق کسی نہ کسی صورت فلسطین اور شام سے تھا اور انکا ذکر نہیں آیا جو اس دائرے سے باہر تھے۔ یا پھر توریت میں صرف ان انبیاء کا تذکرہ ملتا ہے جو حضرت آدمؑ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان عمود نسب واقع ہوئے ہیں۔

شواہد تاریخ اور قرآنی اطلاعات سے بخوبی عیاں ہے کہ قوم ثمود نہایت آسودہ حال تھی۔ معاشی اعتبار سے مال و دولت کی فراوانی تھی اور انکی زندگی بڑے عیش و آرام میں گزر رہی تھی۔ قوم عاد کے بعد ان میں بھی وہ تمام خرابیاں پیدا ہوگئیں جو عام طور پر ایسے لوگوں میں پیدا ہو جاتی ہیں جنہیں اپنی طاقت و قوت اور دولت و ثروت پر ناز ہو اور نزدیک و دُور کوئی مقابلہ کی جرأت بھی نہ رکھتا ہو۔

چونکہ ثمود خدائے واحد کے علاوہ بہت سے معبودانِ باطل کے پرستار اور انکے بتوں کی پرستش میں مبتلا ہو کر مشرک ہو چکے تھے۔ چنانچہ انکی اصلاح اور احقاق حق کیلئے ذات احسن الخالقین نے انہی کے قبیلہ میں سے حضرت صالح علیہ السلام کو ناصح پیغمبر اور رسول بنا کر بھیجا تا کہ وہ انکو راہِ راست پر لائیں۔ انہیں خدا تعالیٰ کی عطا فرمائی گئی نعمتیں یاد دلائیں اور ان پر واضح فرمائیں کہ کائنات کی ہر شئے خدا تعالیٰ کی توحید و یکتائی کی شاہد ہے۔ یقینی دلائل و مسکت براہین کے ساتھ ان کی گمراہی کو ظاہر کریں اور انہیں بتائیں کہ ذات الٰہیہ ہی وہ اکیلی ذات ہے جو لائق عبادت ہے دوسرا کوئی نہیں۔

حضرت صالح علیہ السلام کی اس دعوت پر انہوں نے نہایت حیرت سے جواب دیا کہ صالح تم جس قدر لائق شخص تھے تم سے تو ہمیں بڑی امیدیں تھیں اور ایسی احمقانہ باتوں کی قطعی امید نہیں تھی۔ تو ہمیں ہمارے معبودوں سے روکتا ہے جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے چلے آئے ہیں۔ حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے تمہیں راہِ ھدایت دکھانے اور تم لوگوں کی مدد کرنے کیلئے بھیجا ہے' اور میں تبلیغ حق کرتا رہونگا۔ آپؑ نے انہیں پرانے حقائق یاد دلائے اور مدلل گفتگو سے انہیں انکی خطا کاری سے باور کروایا مگر اہل ثمود نے بات سمجھ آجانے کے باوجود اپنے کفر و طغیان کے باعث سنی ان سنی کرتے ہوئے راہِ حق سے اپنی آنکھیں بند رکھیں۔ بفرمانِ قرآن:

وَ اَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۱۷) (سورۃ: حٰمٓ السجدہ)

(ترجمہ) ''اور اہل ثمود کہ ہم نے انہیں راہ دکھائی مگر انہوں نے ہدایت کے مقابل اندھا رہنا پسند کیا'' تو انہیں ذلت کے عذاب کی کڑک نے آلیا سزا ان کے کئے کی۔ (حٰمٓ السجدہ: ۱۷)

جب حضرت صالح علیہ السلام کے دلائل و براہین کے خلاف کوئی جواب نہ بن پڑا اور نورِ ھدایت کے مقابل کوئی کارگر دلیل نہ ملی تو قومِ ثمود کے ذمہ دار افراد کھسیانے ہو کر آپؑ سے کسی معجزہ کی فرمائش کرنے لگے اور اپنے تئیں انہیں مشکل میں ڈالنے کیلئے ایک ایسی اونٹنی کی فرمائش کرنے لگے جو بچہ جننے والی ہو۔ حضرت صالح علیہ السلام انہیں بہت سمجھاتے کہ ایسی باتیں ایمان کی کمزوری کی نشانی ہیں اور طلب معجزہ بذات خود انسانی ذہن کی گمراہی ہے۔ نیز نمودِ معجزہ کے بعد بھی تسلیم حق نہ کرنا تو صریح

عذاب خداوندی کو دعوت دینے کے مترادف ہوگا۔ مگر یہ قوم ایسے نصائح کو آپکی کمزوری اور آپکی ٹال مٹول پر منتج کرتی رہی اور اپنے مطالبہ پر بضد رہی۔ آخر کار حضرت صالح علیہ السلام نے دعا فرمائی اور حکم خداوندی سے قوم ثمود کی نظروں کے سامنے ایک ٹھوس چٹان شق ہوگئی جس میں سے ایک نہایت عظیم الجثہ اونٹنی برآمد ہوئی جس نے ظاہر ہوتے ہی ایک بچے کو جنم دیا۔ اس ضمن میں قرآن حکیم میں یوں وارد ہے۔

وَ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰیَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِیْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَیَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (الاعراف:۷۳)

ترجمہ:۔ ''اور ثمود کی طرف انہی کی برادری سے صالح (علیہ السلام نامی ایک فرد) کو (اپنا پیغمبر بنا کر) بھیجا (جس نے) کہا اے میری قوم (صرف) اللہ کو پوجو (کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ) اسکے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ بیشک تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے یہ (اونٹنی ایک) روشن دلیل (بن کر) آئی ہے۔ (اور یاد رکھنا کہ) یہ اللہ کی اونٹنی ہے (اور) تمہارے لئے نشانی (ہے) تو اسے (کھلا) چھوڑ رکھو کہ اللہ کی زمین پر کھائے اور اسے برے ارادہ سے مت چھونا (وگرنہ) تم پر دردناک عذاب آجائیگا'' (الاعراف:۷۳)

حضرت صالح علیہ السلام نے قوم سے فرمایا کہ لو تمہارا مطالبہ پورا ہوگیا۔ بعدازاں وہ اونٹنی چرنے پھرنے لگی۔ اسکی خوراک اس قدر تھی کہ وہ ایک ہی وقت میں اتنا چارہ استعمال کر جاتی کہ ثمود کے جانور بھوکے رہنے لگے۔ جب وہ پانی پینے کیلئے کنویں پر منہ رکھتی تو اسکا تمام پانی پی جاتی اور بقیہ جانور پیاس سے بے حال ہو جاتے۔ اب ان کو ایک نئی مصیبت کا سامنا ہوا تو انہوں نے اس اونٹنی کو مار ڈالنے کا قصد کیا۔ اس پر حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں باور کرایا کہ اونٹنی اللہ کی نشانی ہے اسکو ہلاک کرنے جیسی کوئی حرکت بھول سے بھی مت کر بیٹھنا وگرنہ اسکا انجام بہت خوفناک ہوگا۔

حضرت صالح علیہ السلام نے اس مسئلہ کے حل کیلئے قوم سے فرمایا کہ ایک روز تمہارے جانور کھانا پینا استعمال کریں اور دوسرے روز اس ناقہ کو اپنی خوراک کھانے پینے دو۔ کچھ دن تو اس پر عمل درآمد ضرور ہوا مگر قوم ثمود پھر متردد ہوگئی معاہدہ توڑنے لگی اور کسی طرح اونٹنی کو ہلاک کر ڈالنے کی ترکیبیں

سوچنے لگی۔ جب حضرت صالح علیہ السلام کو اسکی بھنک پڑی تو آپؑ نے انہیں پھر سے سمجھانے کی کوشش کی اور کہا کہ دیکھو اس اونٹنی کو کوئی تکلیف پہنچانے کی کوشش نہ کر بیٹھنا ورنہ سخت عذاب میں پڑ جاؤ گے۔

سید سلیمان ندوی مرحوم ''ارض القرآن'' میں فرماتے ہیں کہ قوم ثمود کی ایک پہاڑی کا پرانا نام عربوں میں ''فج الناقہ'' مشہور ہے۔ بطلیموس نے فج الناقہ کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے اس واقعہ کو بیان کیا اور یونانی زبان میں اس کا نام ''بنڈاناٹا'' لکھا ہے۔ اس وجہ تسمیہ سے نفس اونٹنی کے واقعہ کا ثبوت گویا قرآن کے بیان سے چار سو سال پیشتر بھی ملتا ہے۔

حافظ عماد الدین ابن کثیر نے سورۃ الاعراف کی تفسیر میں ناقۃ اللہ کے وجود میں آنے کی روایت کو سندِ روایات کے اصول پر نہیں' بلکہ ایک تاریخی واقعہ کی طرح یوں تحریر کیا ہے کہ:۔

'' قوم ثمود جب حضرت صالح علیہ السلام کی تبلیغ حق سے اکتا گئی تو تنگ آ کر اس قوم کے سرخیل اور سرکردہ افراد نے قوم کی موجودگی میں مطالبہ کیا کہ اے صالح اگر تو واقعی خدا کا فرستادہ ہے تو کوئی نشانی (ثبوت) دکھا' تا کہ ہم تیری صداقت پر ایمان لے آئیں۔ صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ ایسا نہ ہو کہ نشانی آنے کے بعد بھی انکار پر مُصر اور سرکشی پر قائم رہو۔ قوم کے ان سرداروں نے تاکید وعدہ کیا کہ ہم فوراً ایمان لے آئیں گے۔ تب حضرت صالح علیہ السلام نے ان ہی سے دریافت کیا کہ بتاؤ کس نشانی پر مطمئن ہو سکتے ہو۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ سامنے والے پہاڑ میں یا بستی کے اس پتھر میں سے جو کنارہ پر نصب ہے' ایسی اونٹنی ظاہر ہو جو بچہ جنے۔

حضرت صالح علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں دعا کی تو اسی وقت چٹان شق ہوئی اور اس میں سے اونٹنی برآمد ہوئی جس نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک بچہ کو جنم دیا۔ یہ دیکھ کر انکے سرداروں میں سے جندہ بن عمرو تو اسی وقت مشرف بہ توحید ہو گیا اور دوسرے کئی سرداروں نے بھی ایمان لانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ مگر انکے ہیکل اور مندروں کے مہنتوں' ذوّاب بن عمرو' خباب اور انکے کاہن رباب بن صفر نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا۔ قوم ثمود اگرچہ اس حیرت زدہ کر دینے والے معجزہ کو دیکھ کر بھی ایمان نہ لائی تھی تاہم اس اونٹنی اور قبیلہ کے چوپاؤں کے پانی پینے کی اپنی اپنی جو باری مقرر ہو چکی تھی اسکی پاسداری کچھ عرصہ تک جاری رہی۔ مگر آہستہ آہستہ انہیں یہ بات کھٹکنے لگی اور آپس میں یہ صلاح مشورے ہونے لگے

کہ اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کیلئے اس ناقہ کا خاتمہ ہی کر دیا جائے۔

اس دیو ہیکل ناقہ کو ختم کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی اور کوئی اس کام کی جرأت نہ کرتا تھا' چنانچہ صدوق نامی ایک حسین وجمیل مالدار عورت نے خود کو مصدع نامی ایک شخص کے سامنے اور غیرہ نامی ایک مالدار عورت نے اپنی ایک خوبصورت بیٹی کو قیدار نامی شخص کے رُوبرو یہ کہہ کر پیش کیا کہ اگر وہ دونوں اس ناقہ کو ہلاک کر دیں تو یہ انکی ملک ہونگی اور تم انکے ساتھ عیش کرنا۔ یوں مصدع اور قیدار دونوں کو اس منحوس کام کیلئے آمادہ اور راضی کر لیا گیا۔

ایک روز جب ناقہ اپنی باری پر چراگاہ میں تھی قیدار بن سالف اور مصدع نے حملہ کر کے اسکی کوچیں کاٹیں اور اسے قتل کر دیا۔ پھر آپس میں انہوں نے قسمیں کھائیں کہ راتوں رات صالح اور اسکے اہل وعیال کو بھی قتل کر دیں گے۔ ناقہ کے قتل کے بعد جب یہ حضرت صالح علیہ السلام کو شہید کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے' ناقہ کا بچہ بھاگ کر پہاڑی پر چڑھ گیا اور چیخنے لگا۔ قیدار اور مصدع اسے پکڑنے کیلئے اسکے پیچھے دوڑے مگر وہ دیکھتے ہی دیکھتے انکی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ اسی دوران حضرت صالح علیہ السلام کو انکی اس قبیح حرکت کا علم ہوا تو انہیں نہایت افسوس اور متوقع عذاب کی شدت کا احساس ہوا۔ آپؑ نے اپنی قوم سے مخاطب ہو کر فرمایا' آخر وہی ہوا جسکا مجھے ڈر تھا' اب تم لوگ خدا کے عذاب کا انتظار کرو۔ تمہارے پاس تین دن کی مہلت ہے۔ منقول ہے کہ ان لوگوں نے چہارشنبہ (بدھ) کے روز اونٹنی کی کونچیں کاٹیں تھیں۔ حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ تم اسکے بعد تین دن یوں زندہ رہو گے کہ:۔

''پہلے روز تمہارے چہرے زرد ہو جائیں گے دوسرے روز سرخ اور تیسرے روز سیاہ ہو جائیں گے اور چوتھے روز عذاب آئیگا''۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا' اور (اتوار) دوپہر کے قریب آسمان سے ایک ہولناک آواز آئی جس سے تمام بستی ہل گئی اور اس ہیبت ناک کڑک سے انکے دل پھٹ گئے اور سب ہلاک ہو گئے۔ یوں اللہ تعالیٰ نے نافرمان قومِ ثمود کو تباہ و ہلاک کر دیا۔ اس عذاب سے حضرت صالح علیہ السلام اور انکے ایمان لائے ساتھی محفوظ رہے جنہیں ثمودِ ثانیہ کہا جاتا ہے''۔ (تفسیر ابن کثیر)

اس واقعہ کے ساتھ ساتھ محدث ومفسر' ابن کثیر نے چند روایاتِ حدیث بھی بیان فرمائی ہیں۔ مثلاً:۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہاں سے گزرے تو صحابہ نے ثمود کے

حضرت صالح علیہ السلام کا مزار مبارک

کنوئیں سے پانی بھر کر آٹا گوندھا اور روٹیاں تیار کرنے لگے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی گرا دینے ہانڈیاں اوندھی کر دینے اور آٹا ضائع کر دینے کا حکم فرمایا نیز ارشاد فرمایا کہ یہ وہ بستی ہے جس پر خدا کا عذاب ہوا' یہاں قیام نہ کرو اور یہاں کی اشیا سے فائدہ نہ اٹھاؤ۔ آگے بڑھ کر کسی دوسری جگہ پڑاؤ ڈالو ایسا نہ ہو کہ تم بھی کسی بلاء میں مبتلا ہو جاؤ۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم ان حجر کی بستیوں میں خدا سے ڈرتے' عجز وزاری کرتے ہوئے داخل ہوا کرو یا پھر داخل ہی نہ ہوا کرو۔

''قرآن حکیم میں قوم ثمود پر آنے والے عذاب کی صورت سورۃ ہود/ ۶۷ میں چنگھاڑ بیان فرمائی گئی ہے جبکہ الاعراف/ ۷۸ میں زلزلہ سے انکا ہلاک ہونا بیان ہوا ہے۔'' اسکی شرح میں مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ آسمانی بجلی کی ایک ہولناک کڑک ہے جو ہیبت ناک چنگھاڑ کی صورت تھی جس سے تمام آبادی شدید زلزلہ کی صورت لرز گئی تھی اور چنگھاڑ کی دہشت سے انکے دل پھٹ گئے تھے پس صبح دم جب حضرت صالح علیہ السلام ان پر گئے تو وہ اوندھے پڑے تھے،،۔

قوم ثمود کی ہلاکت کے بعد حضرت صالح علیہ السلام نے کہاں سکونت اختیار کی اس بارے میں بھی مورخین کی آرا مختلف ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ آپؑ فلسطین کے نواحی علاقہ ''رملہ'' میں آ گئے تھے' غالباً یہ رائے اسلئے ہے کہ حجر کے قریب یہی مقام ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ آپؑ مکہ معظّمہ تشریف لے گئے تھے اور وہیں انتقال فرما کر حرم کعبہ کے قریب دفن ہوئے۔ جبکہ حضر موت میں بھی ایک مشہور قبر ہے جسے حضر موت کے لوگ حضرت صالح علیہ السلام کی قبر کہتے ہیں۔ طبری نے آپکی عمر صرف اٹھاون سال اور تبلیغ کا عرصہ بیس سال لکھا ہے' جبکہ ''معجزہ نما'' حمائل شریف کے حاشیہ ۳۶۲ پر مولانا اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں کہ آپؑ کی عمر دو سو اسی برس تھی اور حضرت ہودؑ اور حضرت صالح علیہ السلام کے درمیان سو سال کا فاصلہ ہے۔ قرآن کریم میں حضرت صالح علیہ السلام کا ذکر آٹھ جگہ پر آیا ہے:۔ الاعراف/ ۷۳' ۷۵' ۷۷' ہود/ ۶۱' ۶۳' ۶۶' ۸۹' الشعرأ/ ۱۴۲'

حضرت ابراہیم علیہ السلام

یہ ایک ایسے عظیم المرتبت نبی کی سرگزشت ہے جنہیں ابوالانبیاء کہا جاتا ہے اور جو خلیل اللہ کے اعزاز سے معزز فرمائے گئے ہیں۔ آپؑ کی ولادتِ باسعادت کسدیوں کے قدیم شہر اُر (UR) میں ہوئی جو جنوبی عراق میں دریائے فرات کے کنارے بابل اور نینوا سے پہلے آباد تھا۔ اس کا محل وقوع وہ مقام تھا جو آجکل تلعبیب کے نام سے موسوم ہے البتہ یہ نام توراۃ میں اب تک موجود ہے۔ نیز فلاڈلفیا یونیورسٹی امریکہ کے عجائب خانہ اور برطانیہ کے عجائب خانہ کی مشترکہ جماعتِ آثارِ قدیمہ نے موجودہ صدی میں اس شہر (اُر) کے آثار تلاش کئے ہیں جس سے حضرت ابراہیمؑ کی سرگزشت اور انکے متعلقہ حالات مزید واضح ہوئے ہیں۔ آپکی وفات فلسطین یا شام میں ہوئی جسے کسی زمانہ میں کنعان کہا جاتا تھا۔ توریت میں آپکی جائے وفات ''جبرون'' کے نام سے مذکور ہے اور آپکا مدفن مکفیلہ کے کھیت کا غار بتایا گیا ہے جو کہ جبرون کے سامنے واقع تھا۔ نیز توریت یہ بھی بتاتی ہے کہ آپؑ اہل قدان میں سے تھے اور آپکی قوم بت پرست تھی۔ انجیل برناباس میں تصریح ہے کہ آپکے والد بخاری کا پیشہ کیا کرتے اور قوم کے مختلف قبائل کیلئے لکڑی کے بت بنا کر فروخت کرتے تھے۔ مگر حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے ابتداً ہی سے حق کی بصیرت اور ہدایت عطا فرمائی تھی۔ فرمانِ قرآن ہے:۔

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَآ اِبْرَاهِیْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا بِهٖ عٰلِمِیْنَ (۵۱) (سورۃ:الانبیاء)

(ترجمہ) ''اور بیشک ہم نے ابراہیمؑ کو (تبلیغ حق کیلئے) پہلے ہی سے (پیدائشی یا قبل از سن بلوغت ہی سے) نیک راہ عطا کر دی تھی اور ہم اس (معاملہ کی ضرورت واہمیت) سے خبردار تھے''۔ (الانبیاء: ۵۱)

توریت شریف کے مطابق' حضرت نوح علیہ السلام سے حضرت ابراہیمؑ تک دس پشتیں ہیں۔ سلسلہ نسب یوں ہے:۔ حضرت ابراہیمؑ بن تارخ بن ناخور بن سروج بن رعو بن فلج بن عابر بن شالح بن ارفکشد بن سام بن نوحؑ بن عبر (حضرت ہودؑ)۔

قرآن حکیم نے حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام آزر بیان فرمایا ہے جبکہ توریت شریف میں یہ

نام تارخ ہے۔اسکی تطبیق کی دوصورتیں ہوسکتی ہیں۔اوّل یہ کہ اُس کا نام تارخ ہے اور لقب آزر ہے۔ دوم یہ کہ تارخ باپ اور آزر چچا تھا جس نے آپکی پرورش کی۔ چونکہ عربی میں چچا اور باپ کیلئے ایک ہی لفظ مستعمل ہے اسلئے قران نے آپکے چچا آزر کو (ابّ) باپ کہا ہے۔زمانہ قدیم میں لوگ اپنی اولادوں کے نام بتوں کے نام پر رکھ لیتے تھے ممکن ہے کہ تارخ کا نام اسی لئے آزر ہوگیا ہو۔

مولانا ابوالکلام آزاد سورۃ انبیاء کی شرح کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کے والد تارخ کا انتقال آپکے بچپن ہی میں ہوگیا تھا اور آپکی پرورش آپکے چچا آزر نے کی تھی جو کہ مندر کے پجاریوں میں سے تھا۔قدیم کالدی زبان میں بڑے پجاری یا معبد کے محافظ کو ''آواز'' کہا جاتا تھا' جس نے بعدازاں عربی زبان کے آزر کی شکل اختیار کرلی۔(ترجمان القرآن جلد/۲)

تارخ (آزر) کے تین بیٹے تھے' ابراہیمؑ ہاران اور ناحور۔ ہاران اپنے بیٹے (لوطؑ) کو چھوڑ کر اپنے والد آزر کی زندگی ہی میں مرگیا' ناحور کے بارے کچھ معلومات نہیں کہ وہ کیا کرتا رہا یا کہاں رہا البتہ ابراہیمؑ کے نام مبارک سے دنیا بھر آگاہ ہے' جنہوں نے خلیل اللہ کا مرتبہ پایا اور آپؑ ابوالانبیاء کہلائے۔مشہور مورّخ ''ابوالفدا'' نے طوفان نوح اور ابوالانبیاء حضرت ابراہیمؑ کی ولادتِ باسعادت کے درمیان ایک ہزار اکیاسی (۱۰۸۱) سال کا فاصلہ شمار کیا ہے جبکہ طبری نے ایک ہزار نوسواسی (۱۹۸۰) برس لکھا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ بعض اہل کتاب کی تحقیق کے مطابق یہ عرصہ ایک ہزار دوصد تریسٹھ (۱۲۶۳) سال بنتا ہے۔

ابراہیمؑ توریت اور دیگر صحائف مقدسہ میں اب وراحم کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔لفظ ابراہیم' اب وراحم سے مرکب ہے جسکے معنی مہربان باپ کے ہیں۔حضرت ابراہیمؑ کی ولادت نہایت مخدوش اور نامساعد حالات میں ہوئی۔کہا جاتا ہے کہ آپکی ولادت سے قبل نجومیوں نے نمرود کو پیش گوئی کرتے ہوئے اس خطرہ سے متنبہ کیا کہ اس سال ایک ایسے بچے کی پیدائش متوقع ہے جس سے تمہارا تاج وتخت اور تمہارا شاہی مذہب باطل ٹھہر سکتا ہے۔نمرود کے استفسار پر مختلف نجومیوں نے اس بچے کا نام اب وراحم بتایا۔ یہ سنتے ہی نمرود نے اس نام کے کسی پیدا ہونے والے بچے کی تلاش شروع کروادی۔تمام مملکت میں منادی کروادی کہ کوئی شوہر اپنی بیوی کے پاس نہ جائے اور اگر کوئی عورت نر

بچہ پیدا کرے اس بچے کو قتل کر دیا جائے۔ یہ حکم ایک مدت تک جاری رہا اور ہزار ہا بے گناہ نوزائیدہ معصوم بچے قتل کر دیئے گئے۔

اس خطرہ کے پیش نظر حضرت ابراہیمؑ کی والدہ آپکی ولادت سے چند ماہ قبل ایک غار میں رُوپوش ہوگئیں جہاں آپؑ تولد ہوئے اور کچھ عرصہ تک آپکی پرورش اسی غار ہی میں ہوئی یہاں تک کہ آپؑ بالغ ہوگئے۔ مفسرین بیان کرتے ہیں کہ پیدائش کے بعد آپکی نشوونما عام معمول سے ہٹ کر بہت جلدی جلدی ہوئی اور چند سالوں ہی میں آپؑ سن بلوغت کو پہنچ گئے تھے۔ آپکی والدہ آپکی حفاظت و نگہداشت کیلئے اکثر وہاں آتی جاتی رہتی تھی اور آپؑ اس سے اپنے اور اس دنیا کو پیدا کرنے والے کے بارے مختلف سوال کیا کرتے۔ جب ماں نے بتایا کہ اسے اور اس دنیا کو بنانے والا نمرود بادشاہ ہے تو آپؑ نے سوال کیا پھر نمرود کو بنانے والا کون ہے؟ اس سوال پر ماں کو کپکپی سی آگئی اور اس نے پریشانی سے بیٹے کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کہ ایسے سوال مت کیا کرو۔ آپؑ اس پر خاموش تو ہوگئے لیکن اندر ہی اندر پہروں کسی نامعلوم شئے کی تلاش و جستجو میں کھوئے سے رہا کرتے۔

آپؑ کے سامنے تمام کائنات بایں حسن و جمال پھیلی ہوئی تھی اور آپ کو ان تمام حسین مظاہر فطرت میں سے ایک معبود کا انتخاب کرنا تھا۔ اکثر غار سے باہر نکلنا بھی ہوتا تھا' رات چمکتے چاند کو دیکھ کر گمان ہوا کہ کہیں یہ تو میرا پیدا کرنے اور پالنے والا نہیں' مگر صبح دم جب چاند اوجھل ہوگیا تو اپنے اس خیال کو خود ہی ردّ کر دیا۔ پھر جب خوب روشن اور آنکھیں چندھیا دینے والا سورج دیکھا تو پھر ایسا ہی گمان کیا کہ یہ تو خوب روشن ہے اور بڑا بھی' کہیں یہی میرا رب نہ ہو۔ جب اسے بھی غروب ہوتے پایا تو یہ گمان بھی ردّ فرما دیا اور یہ روح افزا اعلان فرمایا کہ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ یعنی ''میں غروب ہونے والے مظاہر کو (بطور معبود) پسند نہیں کرتا''۔

یہ تھی پہلی ابتلائے خلیلؑ جس کے بعد ہی تحقیق کا درجہ نمودار ہوسکتا تھا۔ پھر جلد آپ کی عرش رس نگاہ آسمان کے نوری کھلونوں کو چیرتی ہوئی بدیع السمٰوات تک جا پہنچی۔

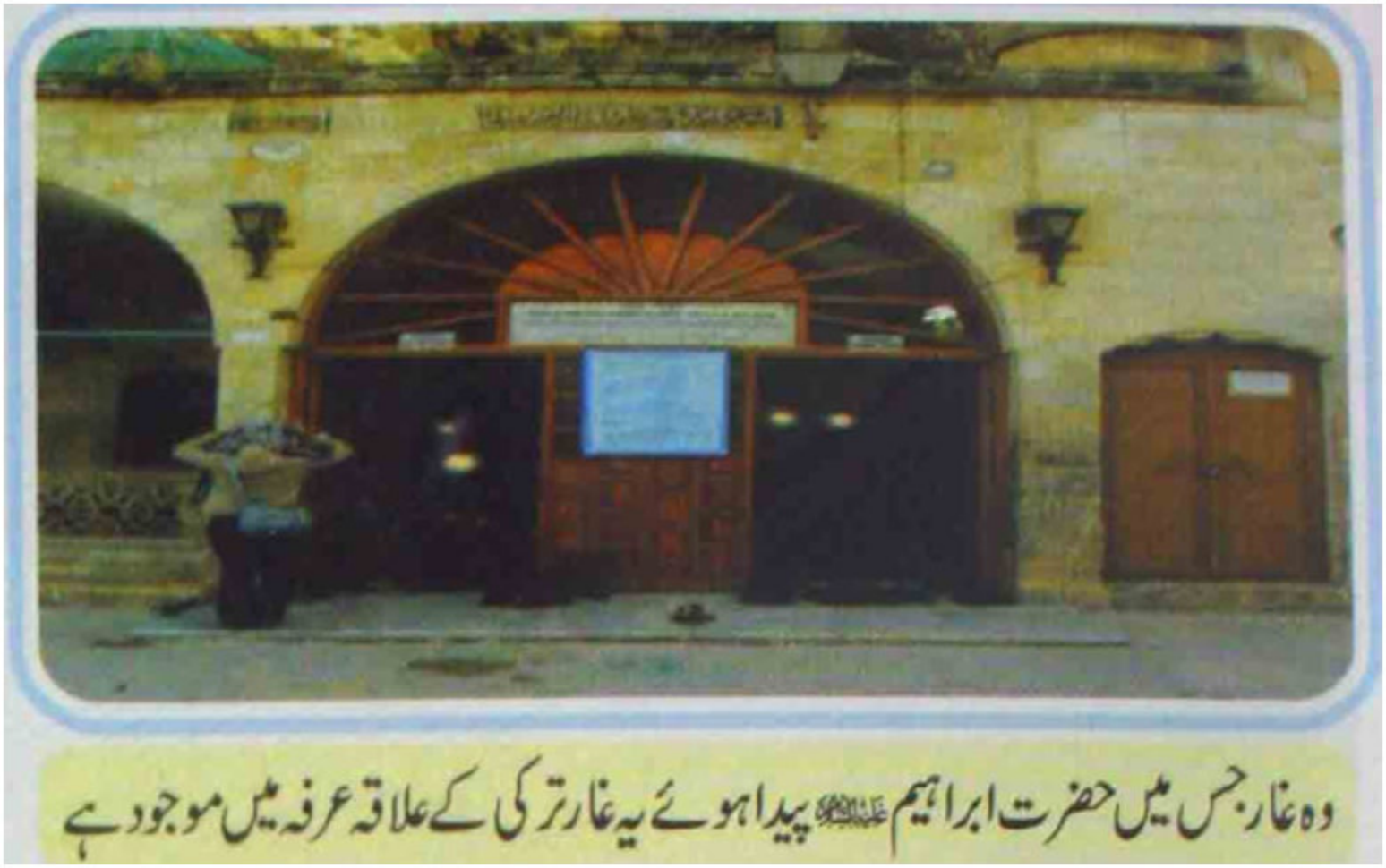

وہ غار جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے یہ غار ترکی کے علاقہ عرفہ میں موجود ہے

نمرود

حضرت نوح علیہ السلام کے دوسرے بیٹے حام کی اولاد میں سے جس شخص نے سب سے پہلے حکومت اور سلطنت کی بنیاد ڈالی وہ کنان بن حام بن نوح تھا۔ کنان نے دریائے دجلہ وفرات کے زیریں حصہ پر بابل نام کے ایک شہرہ آفاق شہر کی بنیاد رکھی۔ یہ شہر اٹھارہ مربع میل میں آباد ہوا جسکے گرداگرد ۷۵ میل لمبی، ۶۰ میل چوڑی اور ۲۵۰ فٹ اونچی شہر پناہ تعمیر کروائی۔ جس میں یکساں فاصلے پر پیائش کر کے ایک سو پھاٹک (بڑے دروازے) بنائے گئے جن میں ٹھوس برنجی پٹ چڑھے ہوئے تھے۔ ہر پہلو پر ۲۵، ۲۵ پھاٹک تھے جن سے مختلف راستے (سڑکیں) نکل کر بہ خط مستقیم پھاٹکوں تک پہنچتی تھیں۔ ان شاہراہوں کی اس تقسیم سے شہر کے اندر خود بخود یکساں مربع قطعات بن گئے تھے اور بابل شہر چار سو تیس کے لگ بھگ ٹکڑوں میں منقسم ہوگیا تھا۔ تنظیمی لحاظ سے ہر ٹکڑہ بجائے خود ایک مستحکم قطعہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ شہر کو بیرونی حملہ آوروں سے بچانے کیلئے شہر پناہ کے گرداڑھائی سو خوبصورت اور مہتمم بالشان برج تعمیر کیے گئے تھے، جن میں مسلح فوج موجود رہتی اور فوج کا ایک معقول حصہ دن رات گشت پر متعین رہتا۔ کنان کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا ''ہاصد'' اس شہر کا بادشاہ بنا جو اپنے وقت کا جابر بادشاہ تھا جس سے لوگ خوف کھاتے تھے۔ اس کے پاس بے پناہ دولت وحشمت اور انگنت لاؤلشکر تھا۔ رُوئے ہستی پر یہ ظالم اور متکبر بادشاہ ''نمرود'' کے نام سے مشہور ہوا۔ آزر (حضرت ابراہیمؑ کے والد یا چچا) نمرود کے شاہی معبد میں (اور بعض مفسرین کے مطابق شاہی دربار میں) ملازم تھا جس نے سفارش کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی دربار میں ملازمت دلوادی تھی اسلئے آپکا دربار میں آنا جانا شروع ہوگیا۔

ایک مرتبہ آپؑ نے انکے بڑے معبد خانہ کے بتوں کو توڑ ڈالا اور کلہاڑا ایک بڑے بت کے کاندھے پر لٹکا دیا۔ اس پر واویلا مچ گیا اور تحقیق وتلاش شروع ہوگئی کہ یہ ناقابل معافی حرکت آخر کس نے کی۔ آپکی عمومی گفتگو سے بھی لوگوں کا شک آپؑ پر ہی تھا، چنانچہ جب آپ سے پوچھا گیا تو آپنے فرمایا کہ اس بڑے بت سے کیوں نہیں پوچھتے جبکہ کلہاڑا بھی اسکے کاندھے پر پڑا پایا گیا۔ نمرود اس بات سے آگ بگولہ ہوکر بولا کیا پتھر کے بت بھی کبھی بولے ہیں۔ تو آپؑ نے بے خوف سیدھا سیدھا اسکو دعوت حق دیتے ہوئے فرمایا جو بت اپنی حفاظت خود نہ کرسکے اور انکا ایسا حال بنانے والے کے بارے

کچھ بتانے سے بھی قاصر ہوں انکی پوجا کرنا کہاں کی عقل مندی ہے۔نمرود آپکی یہ باتیں سن کر مزید مشتعل ہوگیا اور غیض وغضب میں آکر دیوتاؤں کی توہین اور باپ دادا کے دین کی مخالفت کرنے کے جرم میں حضرت ابراہیمؑ کو دھکتی آگ میں جلا ڈالنے کا حکم دیدیا۔ (بحوالہ سورۃ الانعام)

نمرود اور اسکی قوم سے قبل آپؑ نے اپنے باپ کو دعوت حق دی اور توحید الٰہی کی طرف مائل کرنا چاہا مگر اس نے بیٹے کو دھمکایا کہ اگر تو ہمارے بتوں کی برائی کرنے سے باز نہ آیا تو میں خود تمہیں سنگسار کردوں گا۔اس پر حضرت ابراہیمؑ نے باپ سے کہا کہ میں خدا کے سچے دین کو قطعی نہیں چھوڑ سکتا نہ ہی پیغام حق کو اسکی مخلوق تک پہنچانے سے باز آؤں گا۔سورۃ مریم میں یہ واقعہ یوں بیان فرمایا گیا ہے:۔

وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۘ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا(۴۱) اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَ لَا يُبْصِرُ وَ لَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا(۴۲) يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا(۴۳) يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا(۴۴) يٰۤاَبَتِ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا(۴۵) قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا (مریم: ۴۱تا۴۶)

تراجم:اور(آپ قرآن جیسی ہماری مایہ ناز آسمانی) کتاب میں ابراہیمؑ کا ذکر کیجئے (کیونکہ) وہ بلاشک وشبہ صدیق (ہماری وحدانیت اور ہمارے سب انبیاء ورسل اور روزِ آخرت کی تصدیق کرنے والا کثیر التصدیق اور غیب کی خبریں بتانے والا) نبی تھا(۴۱) جب اپنے باپ (آزر بت پرست) کو(سمجھانے کیلئے) فرمایا' کیوں ایسے کو پوجتا ہے جو نہ دیکھے نہ سنے اور نہ تیرے کسی کام آئے(۴۲)(یعنی عبادت تو معبود کی غایتِ تعظیم ہے جسکا مستحق صرف وہی ہو سکتا ہے جو صاحب اوصاف وکمال اور ولی نعم ہو، نہ کہ لکڑی اور پتھروں سے خود تراشے بتوں جیسی کوئی ناکارہ مخلوق)۔ پھر فرمایا:۔''اے میرے باپ بیشک میرے پاس (منجانب اللہ معرفتِ الٰہی کا) وہ علم آیا ہے جو تجھے نہیں پہنچا' تو (میری بات مان کر میری اتباع میں) میرے پیچھے چل پڑ میں تجھے (قرب الٰہی کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی) سیدھی راہ

بجھاؤں گا'' (۴۳) ''اے میرے باپ (ان بتوں کی پوجا اور کفر و شرک کا اختیار کرنا تو شیطان کے ورغلانے کے باعث ہوتا ہے اس لئے صرف خدائے واحد کی عبادت کر اور اپنے پیدا کرنے والے کا بندہ بن) شیطان کا بندہ نہ بن بیشک شیطان رحمٰن کا نافرمان ہے'' (۴۴) ''اے میرے باپ میں ڈرتا ہوں کہ تجھے رحمٰن کا کوئی عذاب پہنچے (اور شیطان کے پھسلانے پر مبتلائے شرک رہنے کے باعث) تو اسکا رفیق (یعنی اسی جیسا ملعون اور معتوب الٰہ) ہو جائے'' (۴۵) (ابراہیمؑ کی اس ناصحانہ بات کا انکے باپ آزر پر کچھ اثر نہ ہوا بلکہ وہ مشتعل ہوکر) ''بولا کیا تو میرے خداؤں سے (انکی مخالفت اور ان سے نفرت کرتا ہوا) منہ موڑتا ہے اے ابراہیم اگر تو (اپنی ان باتوں سے) باز نہ آیا تو اس میں شک نہیں کہ میں (تجھے سنگسار کر دینے کیلئے) تجھ پر پتھر برساؤں گا' اور تو (اب یوں کر کہ) طویل عرصہ تک مجھ سے دُور ہو کر اس علاقہ سے (کہیں اور) چلا جا'' (مریم: ۴۱ تا ۴۶)

بابلی قوم (صابی) کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ ستارہ پرست تھے اور ستارہ پرستی کے علاوہ بت پرستی بھی انکا شیوہ تھی۔ بابلی دراصل قومِ عاد اور قومِ ثمود کی اُن نسلوں میں سے تھے جو عذابوں سے محفوظ رہے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ جن قبائل سامیہ میں مبعوث ہوئے وہ بابل' شام اور مصر میں آباد تھے۔ سفر تکوین کی رُو سے ان تینوں ملکوں میں آپکی آمد و رفت اور سفر و اقامت ثابت بھی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ جس زمانہ میں پیدا ہوئے (بمطابق علامہ سید سلیمان ندوی) اس وقت بابل کے ساتھ ساتھ مصر پر بھی قدیم سامی قومیں حکمران تھیں۔

اس زمانہ میں سامیوں کا یہ اعتقاد تھا کہ یہ تمام دنیا ارواح سے بھری ہوئی ہے' جن میں سے زیادہ تر ارواح خبیث ہیں اور کچھ ارواح طیبہ ہیں۔ سامیوں کے مذہب کے مطابق ارواحِ خبیثہ کو نذر و نیاز سے قربانیاں اور چڑھاوے دیکر خوش کرنا چاہئے اور ارواح طیبہ کو مدح و ثنا گا کر انکے مقابلہ کیلئے تیار کرنا چاہئے۔ انکا ماننا تھا کہ ہر روح کا مسکن ایک ستارہ ہے اسی بناء پر یہ ستاروں کی پرستش میں مبتلا تھے۔ (بابلی کھنڈروں میں جو تختیاں برآمد ہوئی ہیں اور ہیکلوں کے جو کتبات پڑھے گئے ہیں ان میں ایسے بیسیوں معبودوں کے نام ملتے ہیں)۔

اس قوم کے ایسے لغو اور شرکیہ عقائد کی بیخ کنی کیلئے حضرت ابراہیمؑ نے پہلے اپنے باپ کو اور پھر اپنی قوم کو دعوت حق پہنچانے کا فرض ادا کرنا شروع فرمایا تو مخالفت اور بحث مباحث کے دہانے کھل گئے۔ قرآن حکیم کی سورۃ الانبیاء آیات (۵۲تا۵۵) میں فرمان ہے۔

اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَ قَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِیْلُ الَّتِیْۤ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ(۵۲) قَالُوْا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِیْنَ(۵۳) قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ(۵۴) قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِیْنَ(۵۵)

تراجم:۔ ''جب اس (ابراہیمؑ) نے اپنے باپ اور قوم سے کہا یہ مورتیں (جو درندوں' پرندوں اور انسانوں کی صورتوں کی بنی ہوئی ہیں یہ) کیا ہیں؟ جن کے آگے (پوجنے کیلئے) آسن مار کے بیٹھتے ہو() بولے ہم نے اپنے باپ دادا کو انکی پوجا کرتے پایا (جنکی اقتداء میں ہم بھی وہی کرتے ہیں)() کہا (حضرت ابراہیمؑ نے) بیشک تم اور تمہارے باپ دادا سب کھلی گمراہی میں ہو() کہنے لگے (اے ابرہیمؑ) کیا تم (واقعی) ہمارے پاس حق لیکر آئے ہو یا (محض) ہم سے کھیل رہے ہو'' (انبیاء۵۲تا۵۵)۔

چونکہ انہیں اپنے شرکیہ طریق کا باطل ہونا اور خود کا گمراہ ہونا بہت بعید لگتا تھا اور اسکے برخلاف کسی بات کو قبول کرنا ایک غیر معمولی بات تھی نیز موجودہ ماحول میں (جہاں بادشاہ سے رعایا تک سب کے سب ایسی خرافات میں مبتلاء تھے) اس قسم کی بات کرنا ناقابل یقین سا تھا اسی لئے آپکی ایسی دعوت انہیں مذاق میں کھیلنا لگی۔

مگر حضرت ابراہیمؑ نے نہایت سنجیدگی سے الٰہ العالمین کی ربوبیت کا اثبات فرما کر یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ آپؑ بطورِ کھیل کلام فرمانے والے نہیں بلکہ سنجیدگی سے پیغام حق پہنچانے پر متعین ہیں۔ جسے قرآن نے اسی سورۃ الانبیاء کی آیت ۵۶'۵۷ میں یوں بیان فرمایا۔

قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الَّذِیْ فَطَرَهُنَّ ۫ۖ وَ اَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ(۵۶) وَ تَاللّٰهِ لَاَكِیْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِیْنَ(۵۷)

تراجم:۔ ''(ابراہیمؑ نے) فرمایا (یہ تمام اصنام حجر و شجر اور ستارے وغیرہ قطعی لائق عبادت

نہیں) بلکہ تمہارا رب (اور لائق عبادت درحقیقت) وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا (بھی) رب ہے جس نے (تمہاری اور دیگر سب مخلوقات کی طرح) انہیں بھی پیدا فرمایا' اور میں اس حقیقی بات پر (اسکے احد اور لاشریک ہونے کی) گواہی دینے والوں میں سے ہوں'' (۵۶)

''اور (ابراہیمؑ نے) اللہ کی قسم کھائی کہ میں تمہارے بتوں کا برا چاہوں گا جبکہ تم ان سے پیٹھ پھیر کر واپس نہ ہو جاؤ گے (الانبیاء:۵۶/۵۷)۔

واقعہ آتشِ نمرود

اس پر قوم نے نہ صرف یہ کہ آپکی بات تسلیم نہیں کی بلکہ آپکی مخالفت اور دشمنی پر اتر آئے۔ آپکا باپ اس سے پہلے ہی آپؑ سے ناراض ہو کر آپکو سنگسار کر دینے کی دھمکی اور اس علاقہ سے کہیں دور چلے جانے کا کہہ چکا تھا۔ چنانچہ باپ اور بیٹے کے درمیان جب اتفاق کی کوئی صورت نہ بنی اور آزر بھی کسی طرح حق بات قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوا تو حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ آزر سے مایوس ہو کر جدائی اختیار کر لی اور پھر پوری قوم کو دعوت حق اور پیغام رسالت کی تبلیغ کا فرض منصبی انجام پہنچانے کا ارادہ فرمایا۔ اب اس قوم کی طرف سے بھی حوصلہ افزا جواب نہ مل رہا تھا اور نمرود الگ سے آپکے واقعات سن سن کر پریشان ہو رہا اور آپکو سزا دینے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ اسی دوران بڑے معبد سے بتوں کی توڑ پھوڑ والا واقعہ رُونما ہو گیا' جس میں وہ اپنے سالانہ میلہ کے بعد عبادت کے لئے آیا کرتے تھے' اور بعد ازاں آتش نمرود میں حضرت ابراہیمؑ کو جھونک دیئے جانے کا ذکر ہے جسے سورۃ انبیاء نے یوں بیان فرمایا ہے۔

فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ(۵۸) قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ(۵۹) قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ؕ (۶۰) قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ(۶۱) قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ؕ (۶۲) قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَاسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ(۶۳) فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۙ (۶۴) ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ(۶۵) قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَا

يَضُرُّكُمْ ؕ (٦٦) اُفٍّ لَّكُمْ وَ لِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ(٦٧) قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ(٦٨) قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ(٦٩) ۙ وَ اَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ(٧٠)

(الانبیاء:۵۸ تا ۷۰)

''تو ان سب بتوں کو (توڑ پھوڑ کر) چورا چورا کر دیا' مگر ایک کو (نہ توڑا) جو اُن سب سے بڑا تھا کہ شاید وہ اس سے (اس توڑ پھوڑ کرنے والے کے بارے) کچھ پوچھیں'' (الانبیاء/۵۸)

(بت پرست اپنے معبودوں کی یہ درگت بنی دیکھ کر آپس میں ایک دوسرے سے پوچھتے ہوئے) بولے ہمارے خداؤں (کا یہ حال بنانے میں کس کا ہاتھ ہے اور ہمارے معبودوں) کے ساتھ یہ کام کس نے کیا' وہ تو بیشک (کوئی بڑا ہی) ظالم ہے'' (الانبیاء/۵۹)

''ان (مشرکین) میں سے کچھ بولے کہ ہم نے ایک جوان کو انہیں برا بھلا کہتے سنا ہے (جو آزر کا بیٹا ہے اور) جسے ابراہیم کہتے ہیں'' (الانبیاء/۶۰)

(یہ خبر نمرود اور اسکے اُمراء کو بھی پہنچی تو اس نے حکم دیتے ہوئے) کہا اسے (ابراہیمؑ کو اُن) لوگوں کے سامنے لاؤ (جنہوں نے اسے بتوں کیخلاف باتیں کرتا سنا تھا) شاید وہ (اس بات کی) گواہی دیں'' (الانبیاء/۶۱)

(کہ یہ ابراہیمؑ ہی کا فعل ہے یا وہ بتوں کے خلاف اس قسم کی باتیں کرتا سنا گیا ہے اور نمرود بمعہ اسکے امرأ کا مدعا یہ تھا کہ شہادت قائم ہو تو وہ آپکے درپے ہوں' چنانچہ حضرت ابراہیمؑ وہاں بلائے گئے تو نمرود اور اسکے ساتھی پوچھنے کیلئے) بولے اے ابراہیمؑ کیا ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ سلوک تم نے ہی کیا ہے'' (الانبیاء/۶۲)

(حضرت ابراہیمؑ نے ہاں یا نہ میں جواب دینے کی بجائے ان پر حجت قائم کرتے ہوئے جواب میں) فرمایا بلکہ ان (تباہ حال بتوں کا یہ حال اُن) کے بڑے بت نے کیا ہوگا' تو اس سے پوچھو اگر یہ (بت) بولتے ہوں'' (الانبیاء/۶۳)

(جبکہ اسکے کاندھے پر بسولہ ہونے سے یہی گمان کیا جا سکتا ہے اور جب وہ بول نہیں سکتا' کچھ

بتا نہیں سکتا نہ اپنے چھوٹے بتوں کو تباہی سے بچا سکا تو تمہاری بھلائی کیا کریگا۔اس بات پر نمرود اور اسکے ساتھی بروئے انصاف) ''اپنے جی کی طرف پلٹے (اور دل سے یہ اعتراف ضرور کرنے لگے کہ واقعی جو بول نہ سکے اپنا دفاع تک نہ کر سکے وہ خدا کیونکر ہوسکتا ہے اسلئے انکے دلوں نے تو یہ گواہی دی کہ ابراہیمؑ حق پر ہے مگر بدبختی پھر ان پر سوار ہوئی اور پھر کفر و شرک کی طرف پلٹتے ہوئے) کہنے لگے (ابراہیمؑ ایسا گھناؤنا ظلم کرنے میں تمہارا ہی ہاتھ ہے اور) یقیناً تم ہی ستم گار ہو'' (الانبیاء/۶۴) (دل سے تسلیم کر لینے کے باوجود ضد اور گمراہی کے سبب) اپنے سروں کے بل اوندھیائے گئے (اور مجادلہ و مکابرہ پر اترتے ہوئے کہنے لگے) کہ تمہیں خوب معلوم ہے کہ یہ بولتے نہیں (الانبیاء/ ۶۵)

(تو ہم ان سے کیسے پوچھیں اور تم جانتے ہو کہ یہ بول نہیں سکتے پھر تم ایسا کرنے کا ہمیں کیونکر کہہ رہے ہو۔انکی اس بات پر حضرت ابرہیمؑ نے) ''کہا تو کیا اللہ کے علاوہ ایسوں کی پوجا کرتے ہو جو تمہیں (تمہارے پوجنے کے باوجود) کوئی نفع نہ پہنچا سکیں اور نہ ہی (بصورت تمہارے تائب ہوجانے اور انکی پوجا موقوف کر دینے کے) تمہارا کچھ (بگاڑ سکیں یا تمہارا کوئی) نقصان کر سکیں'' (الانبیاء/ ۶۶)

''تف ہے تم پر اور (تمہارے) ان (باطل) معبودوں پر جنہیں اللہ کے سوا پوجتے ہو' تو کیا تمہیں عقل نہیں (کہ اتنا بھی سمجھ سکو کہ یہ بت پوجنے کے لائق نہیں۔اس پر جب نمرودیوں پر حجت تمام ہوگئی اور کسی معقول جواب سے عاجز ہوگئے تو آپس میں) '' کہنے لگے اگر تمہیں کچھ کرنا ہے تو اس (ابراہیمؑ) کو جلا دو اور (اپنے بتوں کا بدلہ لینے میں) اپنے خداؤں کی مدد کرو'' (الانبیاء/ ۶۸)

چنانچہ نمرود اور اسکی قوم حضرت ابراہیمؑ کو جلا ڈالنے پر متفق ہوگئی اور انہوں نے آپؑ کو قریہ کوٹی میں ایک عمارت بنوا کر اس میں قید کر دیا اور ایک ماہ تک جلانے کیلئے قسم قسم کی لکڑیاں اکٹھی کیں اور ایک عظیم آگ جلائی جس سے آسمان میں پرواز کرتے ہوئے پرندے بھی جھلس کر ہلاک ہوجاتے تھے۔ آگ کی تپش اس قدر زیادہ تھی کہ کوئی اسکے دُور تک بھی کھڑا نہیں ہوسکتا تھا اور حضرت ابراہیمؑ کو لیجا کر

آگ میں جھونکنا دشوار تھا چنانچہ اس کام کو انجام دینے کیلئے گوپھن/منجنیق گاڑی گئی اور اس میں باندھ کر دُور سے آپؑ کو اس میں پھینکا گیا۔

اس دوران آپؑ کی زبان مبارک پر حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل جاری تھا۔ جبرائیلؑ امین نے حاضر ہوکر پوچھا میرے لائق کوئی خدمت ہے تو جواب میں فرمایا ''تم سے نہیں''۔ جبرائیلؑ نے عرض کیا کہ اپنے رب سے سوال کیجئے۔ فرمایا میرے سوال کرنے سے اسکا میرے حال کو جاننا میرے لئے کافی ہے۔ پس جب حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینکا جارہا تھا تو فرمان الٰہ ہوا۔

قُلْنَا یٰنَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ (انبیاء: ۶۹) وَ اَرَادُوْا بِهٖ کَیْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِیْنَ (الانبیاء: ۵۸ تا ۷۰)

''ہم نے (آگ کو مخاطب کرتے ہوئے) فرمایا اے آگ (اپنے فطری خواص کے برعکس) ٹھنڈی ہوجا ابراہیمؑ پر اور سلامتی (کا باعث ہو کہ اُس ٹھنڈک میں ایسی شدت نہ ہو کہ اسے اذیت ہو) (الانبیاء/ ۶۹) اور انہوں (نمرود اور اسکے ساتھیوں) نے اُس (ہمارے خلیل ابراہیمؑ) کا برا (حال) کرنا چاہا تو ہم نے انہیں سب سے بڑھ کر (یوں) زیاں کاروں (خسارہ پانے والوں) میں کردیا (۷۰)'' (الانبیاء: ۵۸ تا ۷۰)

(خسارہ یہ کہ انکی مراد پوری نہ ہوئی' اللہ تعالیٰ نے ان پر مچھر بھیجے جو انکے گوشت کھاتے اور خون پیتے تھے۔ ایک مچھر نمرود کے ناک کے راستہ دماغ میں گھس گیا اور اسی سبب اسکی موت واقع ہوئی۔ مزید خسارہ یہ کہ آخرت میں معتوبِ الٰہ ہوکر ہمیشہ کیلئے دوزخی ہوا)۔

آتش نمرود والے واقعہ کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے قوم سے خطاب کیا اور انہیں دوبارہ تلقین کی کہ وہ بت پرستی چھوڑ کر اپنے واحد اور حقیقی مالک سے لَو لگائیں اور انہیں متنبہ فرمایا کہ شرک اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ناپسندیدہ فعل ہے۔ اگر تم بت پرستی' بت گری اور بت فروشی سے باز نہ آئے تو تمہارا ٹھکانہ دوزخ ہوگا اور تمہارا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ مگر یہ قوم حق تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوئی۔

ہجرتِ ابراہیمؑ

جب اَبنائے قوم کے مظالم اور خود اپنے والد آزر کی سختیاں زیادہ بڑھ گئیں تو آپؑ بموجب منشائے الٰہی اپنے کچھ ایمان لائے ساتھیوں سمیت سرزمین شام کی طرف ہجرت فرما گئے۔ ملک شام ہی وہ بابرکت سرزمین ہے جسکا وعدہ آپؑ اور آپکی اولاد سے کیا گیا تھا' اسلئے اسے ''وعدہ کی سرزمین'' بھی کہا جاتا ہے۔ توریت کی تصریح کے مطابق ہجرت کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر ۷۵ سال تھی۔ اس سرزمین پر آپکی نسل نے حکمرانی کی' جسکا آغاز آپکے پوتے (حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے) حضرت یعقوبؑ سے ہوا۔

پھر جب کنعان (شام) میں قحط پڑا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بیوی حضرت سارہ اور اپنے بھتیجے لوط کے ہمراہ مصر کا سفر اختیار کیا۔ اس وقت مصر کا حکمران آپکا ہم نسب ''علوان بن سان'' تھا جو مصر کا پہلا فرعون مشہور ہوا۔ اس نے حضرت سارہ پر غاصبانہ قبضہ کرنے کا ناپاک ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے آپکی حفاظت فرمائی۔ حضرت سارہ سے کرامت سرزد ہوئی تو شاہِ مصر دیکھ کر ڈر گیا اور پھر آپکو رخصت کرتے وقت متعدد تحائف کے ساتھ ساتھ اپنی بیٹی ''ہاغار'' بھی خدمت کیلئے پیش کر دی۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے یہاں سے ہجرت کی اور مکہ میں آکر آباد ہوئے تو مصر کی ہاغار نامی یہ شہزادی ہمراہ تھی جو بعد ازاں ''حضرت ہاجرہ'' کے نام سے مشہور ہوئی۔

عظیم قربانی

یہ حضرات کچھ عرصہ بعد یہاں سے پھر کنعان واپس لوٹ آئے۔ حضرت ابراہیمؑ کی بیوی (سارہ) بانجھ تھیں اور یہاں سے لوٹتے وقت حضرت ابراہیمؑ نے طلب اولاد کیلئے اپنے رب کے حضور دعا کی تھی مگر جب کنعان میں رہنے کے دوران بھی دس سال تک انہیں کوئی اولاد نہ ہوئی تو حضرت سارہ نے خود حضرت ہاجرہ کو حضرت ابراہیمؑ کی زوجیت میں دیدیا۔ جنکے ہاں پہلے سال ہی حضرت اسماعیلؑ کی ولادت ہوئی۔ پہلے فرزند کی ولادت کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر (۸۶) برس تھی۔ آپؑ نہایت شاداں وفرحاں تھے اور بیٹے کی شدید محبت کے حامل تھے۔ حضرت سارہ پر حضرت اسماعیلؑ کی پیدائش بہت شاق گزری تھی اور وہ اس بچے کی پیدائش کے بعد عورت کے بشری تقاضہ کے مطابق حضرت ہاجرہ

کو بہت تنگ کرنے لگی تھیں۔ وہ حضرت ابراہیمؑ کو مجبور کرنے لگیں کہ ہاجرہ اور اسکے بیٹے کو یہاں سے دُور کسی بے آب وگیاہ مقام پر چھوڑ آئیں۔ مگر یہ آپکے شایان شان کہاں تھا اور آپؑ ایسا کیونکر کر سکتے تھے۔ لیکن مصلحات الٰہیہ کو سمجھنا سہل نہیں ہوتا' خداوند قدوس جل جلالہ کو اپنے الوالعزم پیغمبرؑ کو ایک آزمائش میں ڈالنا مقصود تھا۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کو حکم ہوا کہ سارہ کا کہنا مان لو اور ہاجرہ اور اسماعیلؑ کو ارض حجاز میں کوہِ صفا اور مروہ کے دامن میں چھوڑ آؤ۔ جسکا تفصیلی ذکر انشا اللہ حضرت اسماعیلؑ کے عنوان تلے کیا جائیگا۔

البتہ جب بیٹا چلنے پھرنے اور دوڑنے لگا اور بیٹے سے محبت میں شدید اضافہ ہو گیا تو خلیلؑ اللہ نے تواتر کے ساتھ یہ خواب دیکھا کہ اپنے بیٹے اسماعیلؑ کو خدا کی راہ میں قربان کر رہے ہیں۔ انبیاؤ رُسل سلام اللہ علیہم اجمعین کے خواب حقیقی اور بہ مثل وحی ہوتے ہیں چنانچہ اسکو حکم خداوندی جان کر اس پر عمل درآمد کا قصد فرمایا۔ سورۃ الصٰفٰت میں اسکا ذکر یوں فرمایا گیا ہے:۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ (۱۰۲) فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۚ (۱۰۳) وَ نَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۙ (۱۰۴) قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (۱۰۵) اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ (۱۰۶) وَ فَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (۱۰۷) وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ (۱۰۸) سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ (الصٰفٰت: ۱۰۲ تا ۱۰۹)

(تراجم) ''پھر جب وہ (اسماعیلؑ) اسکے ساتھ (چلنے پھرنے اور دوڑتے ہوئے) کام کرنے کے قابل ہو گیا (گویا ایک طرح سے باپ کا بازو اور بڑھاپے کا سہارا بن گیا تو ہم نے اسکو اپنی راہ میں قربان کر دینے کا حکم دیا' جس پر ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے اسماعیلؑ کو اس بارے بتایا اور) کہا اے میرے بیٹے میں خواب میں (خدا کی رضا کے موافق) تجھے ذبح کرتا ہوں' اب تو دیکھ (اور غور کر کے بتا کہ اس بارے) تیری کیا رائے ہے (اسکے جواب میں فرزند عظیم اسماعیلؑ نے) کہا اے میرے باپ آپکو جس بات کا حکم ہوا ہے اس پر عمل کیجئے خدا نے چاہا تو

وہ جگہ جہاں ابراہیم علیہ السلام نے حکم الٰہی پر حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کیلئے لٹایا تھا

آپ مجھے صابرین میں سے پائیں گے" (الصّٰفّٰت/۱۰۲)

آیۃ مذکورہ میں بحکم الٰہی اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے بارے خواب کا ذکر اور اسماعیلؑ کو یہ واضح فرمانا کہ نبیؑ کا خواب حکم خداوندی ہوتا ہے اسلئے تھا کہ اسماعیلؑ کو ذبح سے وحشت وگھبراہٹ نہ ہو بلکہ وہ اطاعت امر الٰہی کیلئے برضاورغبت آمادہ ہو۔ چنانچہ اس فرزند ارجمند نے رضائے الٰہی پر فدا ہونے کا کمال شوق سے اظہار فرمایا۔ اسکے بعد اس سے متصل اگلی آیۃ میں فرمان ہے۔

"تو (اس وقت کا حال نہ پوچھ) جب ان دونوں (باپ بیٹوں) نے ہمارے حکم کی بجاآوری پر (ایک عظیم مثال قائم کرتے ہوئے اظہارِ) تسلیم میں اپنی گردن خم کردی (۱۰۳) (اور باپ نے بیٹے کو ذبح کرنے کیلئے ماتھے کے بل اوندھا لٹایا اور چھری چلادی، مگر قدرتِ الٰہی کہ چھری نے کچھ کام نہ کیا عین اُس وقت) "ہم نے ندا فرمائی کہ اے ابراہیم" (۱۰۴) (جس سے وہ ہماری طرف متوجہ ہونے کے باعث لحہ بھر کو ذبح کرنے کے فعل سے رکا، تو ہم نے اس سے فرمایا) "بیشک تو نے خواب سچ کر دکھایا (تو اپنی اس عظیم آزمائش میں کامیاب ہوا اور تیری اطاعت وفرمانبرداری کمال کو پہنچی، بس اتنا ہی کافی ہے، یوں تیرا بیٹا بھی محفوظ رہا اور تم دونوں کامران بھی ہوگئے اور) بیشک ہم نیکوکاروں کو ایسا ہی صلہ دیتے ہیں" (۱۰۵) "بلاشبہ یہ ایک روشن جانچ تھی" (۱۰۶) "اور ہم نے اس عظیم ذبیحہ کے فدیہ میں (دنبہ یا مینڈھا بھیج کر) اسے (یعنی حضرت اسماعیلؑ کو ذبح ہونے سے اور حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی مفارقت سے) بچالیا" (۱۰۷) "اور ہم نے پچھلوں (قیامت تک آنے والے مسلمانوں) پر (ابراہیمؑ کا نام مبارک اسکی تعریف اسکی ایسی فرمانبرداری اور اسکی یادگار قربانی) باقی رکھی" (الصّٰفّٰت/۱۰۸) "سلام ہو (ہماری طرف سے) ابراہیمؑ پر" (الصّٰفّٰت/۱۰۲تا۱۰۹)

المختصر:۔ آپؑ صاحب کتاب نبی تھے اور آپؑ پر دس صحائف نازل ہوئے۔ آپکو حجاز کی طرف ہجرت، تعمیر کعبۃ اللہ اور حج وقربانی کا شرفِ حکم ہوا۔ حضرت سارہ نے کنعان ہی میں ۱۲۷ سال کی عمر میں انتقال کیا اور انکے انتقال کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے حضرت قطورہ سے تیسری شادی کی، حضرت شعیبؑ کا سلسلۂ نسب انہی سے ملتا ہے۔ حضرت سارہ کی وفات کے بعد آپؑ ۳۸ سال زندہ رہے اور بلآخر ۱۷۵

سال کی عمر میں آپکا وصال ہوگیا۔ آپؑ نہایت عظیم المرتبت پیغمبر تھے اور کائنات کے خالق و مالک نے خُلق، رحمدلی، بردباری، متواضع، مہمان نوازی، خداترسی اور خداشناسی جیسی سینکڑوں خوبیوں سے آپکو نوازا تھا۔

قرآن حکیم اس پر ناطق ہے کہ آپکی محبت واحترام آئندہ آنے والی نسلوں میں باقی رکھا گیا اور مشہور ہے کہ جب احبار (اولیائے بنی اسرائیل) صحائفِ سماوی اور توریت وغیرہ کو نقل فرماتے تو غسل کرکے بیٹھتے تھے۔ اسکے باوجود جہاں کہیں آپکا اسم مبارک نقل کرنا ہوتا قلم وہیں چھوڑ کر اٹھ جاتے اور دوبارہ غسل کرکے آپؑ کے نام مبارک کو تحریر کرتے اور اگر ایک آدھ صفحہ کے بعد پھر یہ نام مبارک کتاب میں آجاتا اور لکھنے کی ضرورت پڑتی تو پھر اٹھ کر غسل کرتے اور تبھی آپکے اسم مبارک کو نقل کرتے۔ آپکی عظیم المرتبت قربانی کی شرفِ مقبولیت کا یہ عالم کہ یہ سنت ابراہیمی قیامت تک کیلئے جاری فرمادی گئی۔ آپکو اللہ تعالیٰ نے اپنا دوست فرمایا یوں آپؑ نے خلیل اللہ جیسا عظیم مرتبہ پایا جس پر قرآن گواہ ہے۔ آپؑ کے بعد جتنے بھی انبیاء و پیغمبران مبعوث ہوئے وہ سب آپؑ ہی کی اولاد میں سے ہوئے اس لئے آپکو ابوالانبیاء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

قرآن حکیم کی ۲۵ سورتوں اور (۶۳) آیات میں آپکا ذکر آیا ہے جسکا جدول یہ ہے:۔

''سورۃ البقرہ/۱۲۴ تا ۱۴۰، ۲۵۸، ۲۵۹ آل عمران/۳۳، ۶۷، ۶۸، ۸۴، ۹۵ تا ۹۷
النساء/۵۴، ۱۲۵، ۱۶۳ الانعام/۷۴، ۷۵، ۸۳، ۱۶۱ یوسفؑ/۶، ۳۸ ابراہیمؑ/۳۵
الحجر/۵۱ النحل/۱۲۰ تا ۱۲۳ مریم/۴۱، ۴۶، ۵۸ الانبیاء/۵۱، ۶۰، ۶۲، ۶۹ الحج/۲۶، ۴۳، ۷۸
الشعراء/۶۹ العنکبوت/۱۶، ۳۱ الصافات/۸۳، ۱۰۴، ۱۰۹ ص/۴۵ الشوریٰ/۱۳ الزخرف/
۲۶ الذاریات/۲۴ النجم/۳۷ الحدید/۲۶ الممتحنہ/۴ اور الاعلیٰ/۱۹

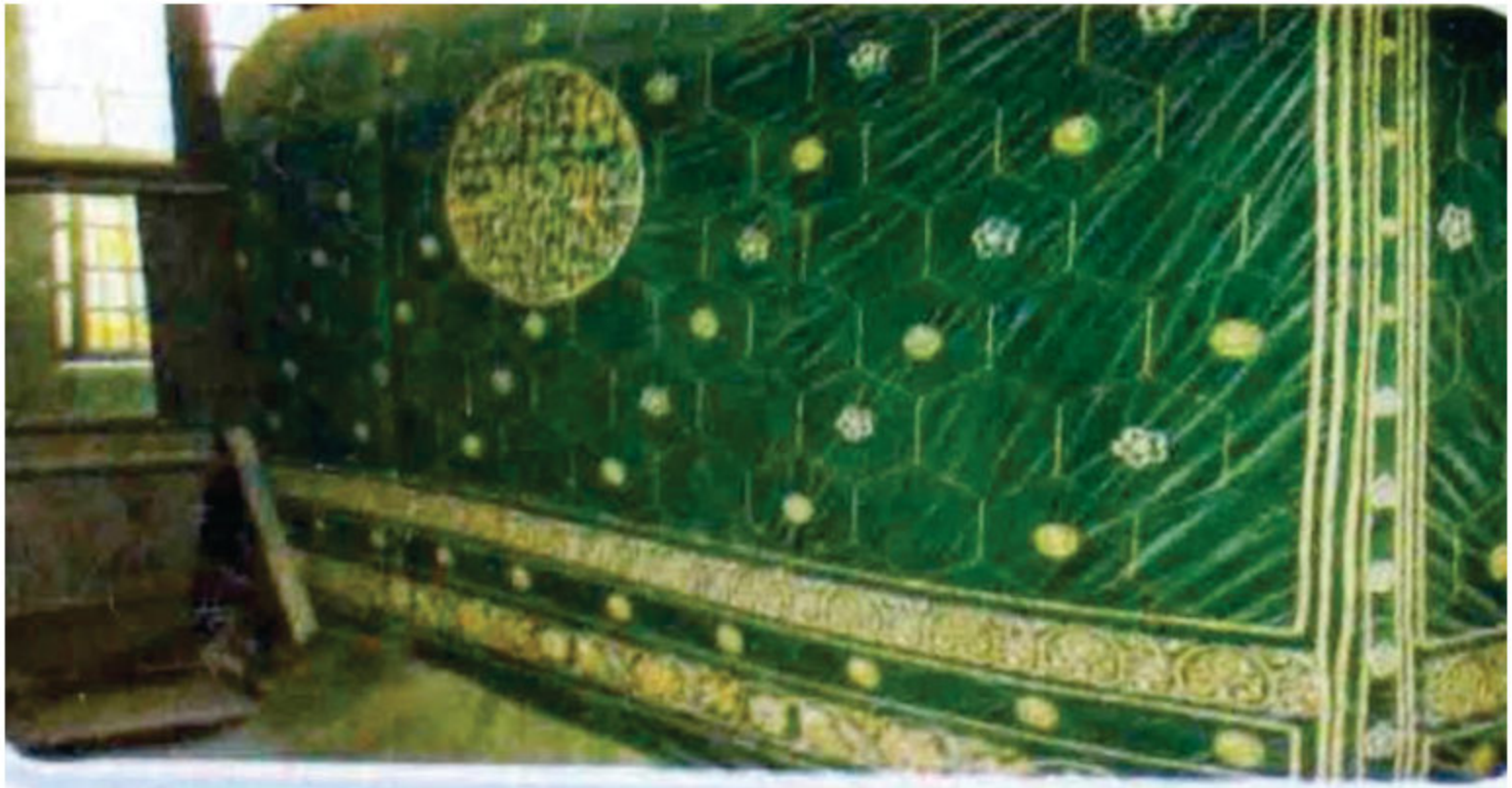

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قبر مبارک (حبرون، اسرائیل)

حضرت اسماعیل علیہ السلام

حضرت ابراہیمؑ کی تین بیویوں سے آٹھ بیٹے تولد ہوئے جن سے نہایت عظیم الشان خاندان اور قومیں پیدا ہوئیں اور ان میں بڑے بڑے اولوالعزم انبیائے کرام نے ظہور فرمایا۔ حضرت قطورا کی کوکھ سے حضرت ابراہیمؑ کے چھ فرزند (زمران، یقسان، مدان، مدیان، اسباق اور سوخ) پیدا ہوئے۔ بنی قطورا میں ''اہل مدین'' اور ''اصحاب الایکہ'' آتے ہیں جن میں حضرت شعیب علیہ السلام کا ظہور ہوا۔

حضرت سارہ سے حضرت ابراہیمؑ کے مایۂ ناز بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کے دو بیٹوں میں سے ایک کا نام عیسو تھا جنکا لقب ادوم تھا اور دوسرے مایۂ ناز بیٹے کا نام مبارک یعقوب علیہ السلام تھا جنکا لقب اسرائیل تھا۔ اُن دونوں سے دو زبردست قبیلوں بنی ادوم اور بنی اسرائیل کی ابتدا ہوئی۔ قبیلہ بنی ادوم میں حضرت ایوب علیہ السلام کا ظہور ہوا، اور بنی اسرائیل میں تو بہت سے بڑے بڑے اولوالعزم انبیاء و پیغمبران پیدا ہوئے، مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔

حضرت ہاجرہ کے بطن مبارک سے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے مایۂ ناز فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے۔ جن کی نسل سے ابط (اصحاب الحجر)، قیدار، اور قریش کے (دو) قبیلے وجود میں آئے اور ان ہی کی نسل میں خاتم الرسل، سردار انبیاء احمد مجتبیٰ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نزول اجلال فرمایا۔

علامہ بغویؒ نے اپنی مایۂ ناز تفسیر معالم التنزیل میں لکھا ہے کہ اسماعیل ''اسمع اور ایل'' دو الفاظ کا مرکب ہے۔ طبرانی زبان میں ''ایل'' اللہ کے مترادف ہے اور عربی زبان کے لفظ ''اسمع'' اور عبرانی زبان کے لفظ ''شماع'' کے معنی ہیں ''سننا''۔ چونکہ بہت عرصہ تک حضرت ابراہیمؑ کے ہاں اولاد نہ ہوئی تو انہوں نے اپنے مہربان رب کے حضور طلب اولاد کیلئے درخواست کی جس نے بارگاہِ قدس تعالیٰ میں شرف قبولیت پایا تو حضرت ہاجرہ کو ایک بے مثال فرزند کی خوشخبری عطا فرمائی گئی۔ سو جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی پیدائش ہوئی تو اسی نسبت سے آپکا نام ''شماع ایل'' رکھا گیا، جو عبرانی زبان کا لفظ

ہے اور عربی میں اسماعیل ہو گیا۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ولادت کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر ۸۶ برس تھی اور آپؑ یہ دولت پا کر از حد شاداں و فرحاں تھے لیکن اللہ تعالیٰ جل شانہ کو اپنے خلیل کی آزمائش منظور تھی۔ ارشاد ہوا کہ اے ابراہیمؑ جاؤ اپنے لخت جگر اسماعیلؑ کو انکی والدہ ہاجرہ سمیت عرب کے ریگستانوں میں کسی بے آب و گیاہ مقام پر تنہا چھوڑ آؤ۔ اس واقعہ کے متعلق ''بخاری شریف'' میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ایک روایت کا مضمون یہ ہے:۔

''ابراہیم علیہ السلام ہاجرہ اور اسکے شیر خوار بچے اسماعیلؑ کو لیکر چلے اور جائے بیت اللہ شریف کے نزدیک موجودہ چاہِ زمزم کے مقام کے بالائی حصہ پر انکو چھوڑ گئے۔ اس وقت وہ جگہ ویران اور غیر آباد تھی، جہاں کھانے کیلئے تو کیا پینے تک کیلئے پانی کا بھی نام و نشان نہ تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے ایک مشکیزہ پانی اور ایک تھیلی کھجور انکے پاس چھوڑیں اور منہ پھیر کر واپس روانہ ہو گئے۔ حضرت ہاجرہ یہ کہتی ہوئی انکے پیچھے پیچھے چلیں کہ اے ابراہیمؑ یہ ہمیں کہاں چھوڑ کر چل دیئے جہاں نہ آدم ہے نہ آدم زاد، نہ کوئی مونس نہ غم خوار۔ ہاجرہ برابر یہ کہتی ہوئی پیچھے چلی آتی تھیں مگر حضرت ابراہیمؑ بغیر جواب دیئے چلتے جا رہے تھے۔ آخر حضرت ہاجرہ نے دریافت کیا کہ کیا یہ خدا تعالیٰ کا حکم ہے تب حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا ہاں یہ اللہ کے حکم سے ہے۔ حضرت ہاجرہ نے جب یہ سنا تو مطمئن ہو کر کہنے لگیں کہ جب یہ خدا کا حکم ہے تو بلاشبہ وہ ہم کو ضائع اور برباد نہ کریگا اور پھر وہیں سے واپس لوٹ آئیں۔ حضرت ابراہیمؑ چلتے چلتے جب ایک ٹیلہ کی اوٹ میں ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں بیوی اور بچہ نگاہ سے اوجھل ہو گئے تو اس طرف جہاں آج کعبہ ہے رُخ کر کے یہ دعا مانگنے لگے:۔

''اے ہمارے پروردگار (تو جانتا ہے کہ) میں نے ایک ایسے (بے آب و گیاہ) میدان میں تیرے حرمت والے گھر کے پاس اپنی کچھ اولاد لاکر بسائی ہے جہاں (پانی نہ ہونے کے باعث) کھیتی (تک) نہیں ہوتی اے ہمارے رب اسلئے کہ وہ نماز قائم رکھیں، پس تو لوگوں کے دل ان (اسماعیل اور اسکی آل واولاد) کی طرف مائل فرمادے اور انہیں کچھ پھل کھانے کو دے تا کہ وہ تیرے

شکر گزار ہوں'' (بحوالہ سورۃ ابراہیم/ ۳۷)

حضرت ابراہیمؑ تو بعد از دعا وہاں سے چلے گئے اور حضرت ہاجرہ بھی چند دن تک مشکیزہ سے پانی اور تھیلی سے کھجوریں کھاتی اور اپنے بچے اسماعیلؑ کو اپنا دودھ پلاتی رہیں لیکن وہ دن بھی آ گیا جب پانی ختم ہو گیا اور کھجوریں بھی نہ بچیں۔ خود بھی چونکہ بھوکی پیاسی تھیں اسلئے دودھ بھی نہ اترتا تھا چنانچہ دونوں ماں بیٹا بھوک و پیاس سے بیتاب ہونے لگے۔ خود سے زیادہ بچے کی فکر تھی جو شدت پیاس سے بے کل ہو کر تڑپنے لگا تھا۔ ممتا کی ماری حضرت ہاجرہ پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑنے لگیں' کبھی صفا کی پہاڑی پر چڑھتیں تو کبھی مروہ کی پہاڑی پر' پھر بچے کی فکر میں بار بار واپس بھی پلٹ کر آنا پڑتا تھا۔ یوں سات بار صفا و مروہ کے درمیان دوڑیں اور جب آخری بار اسماعیلؑ کو دیکھنے آئیں تو قدرت کی فیاضی کا ایک عجیب نظارہ دیکھا کہ کچھ دیر پہلے جہاں پیاس سے بلکتا شیر خوار بچہ پڑا (ایڑیاں رگڑ رہا) تھا وہاں پانی کا ایک چشمہ ابل رہا تھا۔ قریب ہی حضرت جبرائیلؑ بھی موجود تھے جنہوں نے حضرت ہاجرہ کو مخاطب کر کے فرمایا:۔

''خوف اور غم نہ کرو اللہ تعالیٰ اس بچے کو ضائع نہ فرمائیگا۔ یہ مقام بیت اللہ ہے جسکی تعمیر اس بچے (اسماعیلؑ) اور اسکے باپ حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں مقدر فرمائی جا چکی ہے''۔

اسی دوران بنی جرہم کا ایک قبیلہ اس وادی کے قریب سے گزرا تو تھوڑے فاصلے پر انہیں کچھ پرندے فضا میں اڑتے ہوئے دکھائی دیئے۔ جرہم نے کہا کہ یہ پانی موجود ہونے کی علامت ہے چنانچہ وہ پانی کی تلاش میں ادھر آ نکلے جہاں حضرت ہاجرہ اپنے شیر خوار بچے کے ساتھ موجود تھیں۔ جرہم نے حضرت ہاجرہ سے وہاں ٹھہرنے کی اجازت طلب کی تو آپنے فرمایا کہ ہاں تم لوگ یہاں قیام کر سکتے ہو پانی بھی استعمال کر سکتے ہو لیکن پانی کی ملکیت میں حصہ دار نہیں ہو گے۔ جرہم نے بخوشی یہ بات منظور کر لی اور وہیں مقیم ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ'' ہاجرہ خود بھی باہمی انس و رفاقت کیلئے چاہتی تھیں کہ کوئی یہاں آ کر مقیم ہو اسلئے انہوں نے بخوشی جرہم اور اسکے خاندان کو یہاں قیام کرنے کی اجازت دیدی تھی''۔

جرہم نے اپنے بقیہ قبیلے والوں کو بھی بلوالیا اور وہ لوگ یہاں مکانات بنا کر رہنے لگے۔ حضرت اسماعیلؑ بھی انہی میں کھیلتے پلتے رہے اور انکی زبان بھی سیکھ گئے۔اس دوران حضرت ابراہیمؑ ہر تھوڑے عرصہ بعد برابر اپنے اہل وعیال کو دیکھنے آتے رہتے اور کبھی کبھی اپنے ساتھ بھی لاتے لیجاتے رہتے تھے۔

غالباً یہ وہی دَور تھا جب حضرت اسماعیلؑ کی قربانی والا واقعہ رُونما ہوا' جسے قرآن حکیم نے سورۃ الصّٰفّٰت/۱۰۲میں ''لڑکا جب اس سن کو پہنچا کہ اپنے باپ کے ساتھ دوڑے'' فرمایا۔ابھی تک اس اکلوتے فرزند (اسماعیلؑ) کے علاوہ حضرت ابراہیمؑ کے ہاں دوسری کوئی اولاد نہ تھی۔اللہ کے خلیلؑ نے اپنے اس جگر گوشے کو جو مدتوں کی تمناؤں اور بڑھاپے کی دعاؤں کے بعد پیدا ہوا تھا اور جسے سن شیر خواری ہی میں بمطابق حکم الٰہی لق ودق ریگستان اور بے آب وگیاہ صحرا میں چھوڑ آئے تھے اور جسکی شدید محبت آپکے سینہ میں ودیعت فرمادی گئی تھی' ایسی حالت میں یہ حکم ہوا کہ اب اسے ہمارے لئے قربان کردیں۔ جب اس بات کا ذکر اپنے چھوٹے سے بیٹے اسمٰعیلؑ سے کیا تو (اللہ اللہ) تاریخ عالم میں کسی بیٹے کی سعادت مندی کی ایسی مثال شاید ہی ممکن ہو سکے جنہوں نے اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے برملا کہا کہ ابا جان'' آپ بلا تامل حکم الٰہی پر عمل کرگزریں' اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے''۔

وہ فیضانِ نظر تھا' یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آداب فرزندی

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے لخت جگر کو ذبح کرنے کیلئے پیشانی کے بل اوندھا لٹا دیا اور چھری چلادی ہاتھوں کے زور سے دباؤ بھی ڈالا مگر ایک نہایت تیز چھری نے کام نہ کیا' تبھی ندا آئی کہ اے ابراہیمؑ بیشک تو نے خواب سچ کر دکھایا اور اطاعت وفرمانبرداری کمال کو پہنچادی کہ اپنے اکلوتے فرزند کو ہمارے حکم پر قربان کرنے کیلئے بے دریغ پیش کردیا' بس اتنا کافی ہے اور اس کی جگہ فدیہ میں جنت سے مینڈھا یا دنبہ بھیجا جسے حضرت ابراہیمؑ نے قربان کیا۔(اقتباس الصّٰفّٰت/۱۰۲تا۱۰۷)

حضرت اسماعیلؑ قومِ بنی جرہم میں مبعوث فرمائے گئے' جن میں پلے بڑھے تھے۔بنی جرہم

کا قبیلہ اور خاندان آپکے حسن اور حسنِ اخلاق وسیرت سے اس قدر متاثر ہوا کہ اپنے خاندان میں انکی شادی کردی۔ اگرچہ حضرت اسماعیلؑ اپنے والد گرامی حضرت ابراہیمؑ کے ہمراہ کنعان بھی آتے جاتے رہتے تھے مگر زیادہ تر حجاز ہی میں اپنی قوم میں رہے۔ اسی اثناء میں کچھ عرصہ بعد حضرت ہاجرہ کا انتقال ہوگیا اور میزاب وحجر اسود کے درمیان دفن ہوئیں۔ آپنے اہل عرب اور اہل یہود کے رواج کے موافق دو شادیاں کی تھیں۔ دوسری شادی مصر کی ایک لڑکی سے ہوئی۔ آپکی مادری زبان قبطی اور پدری عبرانی تھی۔

حضرت ابراہیمؑ ایک مرتبہ (حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش کے بعد) جب حضرت اسماعیلؑ اور حضرت ہاجرہ کو لیکر حجاز مقدس آئے تو یہاں دونوں باپ بیٹوں نے مل کر کعبۃ اللہ کی بنیاد رکھی اور اسکی تعمیر مکمل فرمائی اور شہر مکہ کو آباد کیا۔ مکۃ المکرّمہ کے چودہ نام ہیں جن میں سے آٹھ قرآن حکیم میں بھی آتے ہیں۔ مکہ دراصل عربی زبان میں بکہ کہلاتا ہے جسکے معنی زائل کرنے' پستان سے دودھ پلانے اور پانی کے کم ہونے کے ہیں۔ غور کیا جائے تو بکہ کے یہ معانی حضرت اسماعیلؑ کی شیر خواری کے ایام میں انہیں تنہا اپنی والدہ محترمہ کے ہمراہ بے آب وگیاہ ویرانے میں چھوڑ دیئے جانے ہی کے مفہوم کے گرد گھومتے ہیں۔ کچھ لوگوں سے روایت ہے کہ جب قریش نے نئے سرے سے کعبہ کی تعمیر جدید کی تو یہاں سے ایک پتھر برآمد ہوا جس پر دو مرتبہ لفظ بکہ بکہ تحریر تھا۔

جب حضرت اسماعیلؑ اپنے والد محترم کے ساتھ کعبہ کی تعمیر مکمل کر چکے تو دونوں اسکے گرد چاروں طرف گھومتے ہوئے یہ دعائیہ کلمات کہہ رہے تھے:۔ سورۃ البقرۃ میں فرمان ہے:۔

وَ اِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَ اِسْمٰعِیْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ(۱۲۷) رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَیْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ(۱۲۸) رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ یُزَكِّیْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ع (البقرۃ:۱۲۷ تا ۱۲۹)

تراجم:۔ اے ہمارے پروردگار ہم سے یہ خدمت قبول فرما' بیشک تو سننے والا اور جاننے والا ہے(۱۲۷) اے پروردگار ہم کو اپنا فرمانبردار بنائے رکھیو اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک گروہ

کو اپنا مطیع بنائے رکھیو۔ اے ہمارے پروردگار ہمیں طریق عبادت بتا اور ہمارے حال پر رحمت سے توجہ فرما بیشک تو بہت توبہ قبول فرمانے والا مہربان ہے (۱۲۸)۔ اے ہمارے رب اور بھیج انہی میں سے ایک رسول جو انکو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور کتاب اور دانائی کی پختہ تعلیم دے اور انکو خوب پاک وستھرا کردے۔ بیشک تو ہی غالب اور صاحب حکمت ہے''

(سورۃ البقرہ/ ۱۲۷تا۱۲۹)

کعبۃ اللہ کی پہلی بنیاد اور تعمیر حضرت اسماعیل علیہ السلام اور آپکے والد گرامی حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی۔ دوسری مرتبہ اسکی تجدید تعمیر قوم عمالقہ اور بنی جرہم نے کرائی۔ تیسری مرتبہ قصیٰ بن کلاب کو یہ اعزاز حاصل ہوا' اور چوتھی مرتبہ یہ سعادت نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں قریش مکہ کے حصے میں آئی۔

حضرت اسماعیلؑ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جداعلیٰ ہیں۔ آپؐ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دو ہزار سات سو سال قبل پیدا ہوئے اور توراۃ شریف کے مطابق آپؑ نے ۱۳۷ برس عمر پائی۔ آپؑ اپنے والد گرامی حضرت ابراہیمؑ کی وفات کے وقت ۸۹ سال کے تھے۔ آپؑ کے ہاں بارہ بیٹے تولد ہوئے جن کے نام قیدار' اوبیل' بشام' شماع' زومہ' مسا' حرا' بطور' نافس' قدما' بنابوت اور تیما' تھے۔ انتقال کے بعد اپنی والدہ حضرت ہاجرہ کے قریب ''میزاب اور حجر اسود'' کے درمیان مدفون ہوئے۔ قرآن حکیم میں متعدد بار آپکا تذکرہ اور اوصاف بیان فرمائے گئے ہیں اور سورۃ مریم میں آپکے نام سے آپکا ذکر فرمایا گیا اور آپکے صدیق و نبی ہونے پر گواہی عطا فرمائی گئی ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام

حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے اور جناب حاران کے فرزند تھے۔ آپکا بچپن حضرت ابراہیمؑ ہی کے زیر سایہ گزرا۔ آپؑ اور حضرت سارہ ملت ابراہیمی کے پہلے مسلم اور (السابقون الاوّلون) میں داخل ہیں۔ حضرت لوط علیہ السلام کی پیدائش بھی عراق کے اسی قدیم شہر اُر (UR) میں ہوئی جو حضرت خلیلؑ اللہ کا جائے پیدائش اور مسکن تھا۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے اُر سے حاران ہجرت کی تو حضرت لوط علیہ السلام بھی آپکے ہمراہ آ گئے اور وہیں حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ سکونت پذیر ہو گئے۔ جب وہاں قحط پڑا اور حضرت ابراہیمؑ ہجرت کر کے مصر تشریف لے گئے تو آپؑ بھی ساتھ ہی مصر تشریف لے گئے تھے۔ مصر ہی میں آپکو منصب نبوت عطا ہوا تو حضرت ابراہیمؑ نے آپکو ''سدوم'' شہر میں بھیج دیا جو بحر مردار (DEAD SEA) کے کنارے دریائے یرون کی وادی میں واقع تھا۔

توریت شریف کے مطابق:۔ مصر میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوط علیہ السلام کے پاس کافی ساز و سامان اکٹھا ہو گیا تھا اور مویشیوں کے بڑے بڑے ریوڑ تھے۔ ان کے چرواہوں اور محافظوں میں اکثر یہ تنازعہ رہا کرتا کہ چراگاہ اور سبزہ زار سے پہلے انکے ریوڑ فائدہ اٹھائیں اور حضرت لوط علیہ السلام کو اپنی بھیڑ بکریاں چرانے کا پہلا حق ہو۔ جبکہ حضرت ابراہیمؑ کے چرواہے یہ چاہتے کہ انہیں اپنے جانوروں کو پہلے چرنے دیا جائے۔ جب یہ کشمکش شدت اختیار کرنے لگی تو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوط علیہ السلام نے باہم صلاح و مشورہ سے یہ طے کیا کہ باہمی محبت اور تعلقات کی خوشگواری کو برقرار رکھنے کیلئے حضرت لوط علیہ السلام مصر سے ہجرت کر کے مشرقی اردن کے علاقہ ''سدوم'' اور ''عامورہ'' چلے جائیں اور وہاں رہ کر دین حنیف کی تبلیغ اور حضرت ابراہیمؑ کی بھی رسالت کا پیغام حق سناتے رہیں۔

جب حضرت لوط علیہ السلام سدوم آ کر مقیم ہوئے تو دیکھا کہ یہاں کے باشندے معصیات و فواحشات میں اس قدر مبتلاء تھے کہ الامان والحفیظ۔ دنیا کی شاید ہی ایسی کوئی برائی ہو جو اُن میں نہ پائی جاتی ہو اور شاید ہی کوئی خوبی ہو جو اُن میں موجود ہو۔ دنیا کی سرکش اور بداخلاق اقوام کے دیگر عیوب و فواحش کے علاوہ یہ قوم ایک خبیث عمل کی موجد تھی۔ اپنی جنسی خواہشات کو پورا کرنے کیلئے ایسی گندی بے

راہروی کا شکار تھی کہ عورتوں کی بجائے مردوں اور لڑکوں سے جنسی اختلاط رکھتی۔ دنیا کی کسی بھی قوم میں اس وقت تک ایسا خبیث عمل مروج نہیں تھا۔ طرہ یہ کہ ایسی خباثت و بے حیائی اور ایسی بدکرداری انکے نزدیک کوئی عیب ہی نہ تھا۔ بلکہ لڑکوں سے ایسے تعلقات کو بڑے فخر و مباہات سے علی الاعلان بیان کیا کرتے۔ سورۃ انبیاء/۷۴ میں ہے کہ ''اس بستی کے لوگ گندے کام کرتے تھے' بیشک وہ برے اور نافرمان لوگ تھے''۔ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم آپکے لاکھ منع کرنے اور سمجھانے پر بھی باز نہ آئی بلکہ الٹا لوط علیہ السلام کے درپے آزار ہوگئی تو عذاب الٰہی میں ہلاک کر ڈالی گئی۔ حضرت جبرائیلؑ نے زمین کا یہ حصہ اٹھا کر پٹخ دیا' جس سے وہ زمین میں دھنس گیا۔ اس ضمن میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

> ''اردن کی وہ جانب جہاں آج بحر مردار (بحر لوط) واقع ہے' یہی وہ جگہ ہے جس میں سدوم اور عامورہ کی بستیاں آباد تھیں۔ اسکے قریب بسنے والوں کا ماننا ہے کہ پہلے یہ تمام حصہ (جو آج سمندر نظر آتا ہے) خشک زمین تھا' جہاں شہر آباد تھے' سدوم و عامورہ نامی بستیاں اسی مقام پر تھیں۔ یہ مقام اصل سمندر کا حصہ نہیں تھا بلکہ جب قوم لوط پر عذاب آیا تو زمین کا یہ حصہ اپنی سطح سے چار سو میٹر زمین کے نیچے تک دھنس گیا تھا اور پھر پانی اُبھر آنے سے سمندر کا حصہ بن گیا۔ عذاب الٰہی کا یہ عالم کہ ہزاروں سال گزر جانے کے باوجود آج تک اس میں کوئی جاندار چیز (یہاں تک کہ آبی مخلوق بھی) زندہ نہیں رہ سکتی۔ اسی لئے اسکو بحر میت' بحر مردار یا بحر لوط کہا جاتا ہے۔ (بستانی ج۹ ص۵۳۷)

مفسرین کا کہنا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کی امت جن بستیوں میں آباد تھی وہ بڑی سرسبز و شاداب تھیں۔ غیر بستیوں کے لوگ شادابی کے سبب اپنے جانوروں کے ساتھ اکثر یہاں آجایا کرتے جسکی وجہ سے قوم لوط کو تکلیفوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ شیطان لعین نے انکو بہکایا کہ غیر بستیوں سے آنے والے جتنے نوعمر لڑکے ہوں انکے ساتھ غیر فطری فعل کیا جائے تو وہ لوگ تمہاری بستیوں میں آنا ترک کر دیں گے۔ رفتہ رفتہ یہ قوم اس عادتِ بد کی شکار ہوگئی۔

عبدالوہاب بخار کہتے ہیں کہ میں نے عبرانی ادب کی ایک کتاب میں اہل سدوم کی بداعمالیوں

کا حال پڑھا ہے جس سے معلوم ہوا کہ انکی بری عادات میں سے ایک یہ عادت بھی تھی کہ وہ باہر سے آنے والے تاجروں کو ایک اچھوتے انداز میں لوٹ لیا کرتے تھے۔ انکا انداز ایسا تھا کہ جب کوئی سوداگر مال لیکر سدوم میں آتا تو اسکے مال کو دیکھنے کے بہانے ہر شخص تھوڑا تھوڑا مال اٹھالیتا اور وہاں سے چل دیتا۔ نہ صرف یہی بلکہ وہ باہر سے آنے والے سوداگروں اور راہگیروں کو انکے اموال چھیننے کیلئے انہیں قتل بھی کرڈالتے تھے اور انکے ہمراہ آنے والے نوعمر لڑکوں کو زبردستی اپنی گندی ہوس کا نشانہ بناڈالتے۔ راہ چلتے لوگوں پر پھبتیاں کسنا' بلاوجہ ان پر کنکر پھینکنا' فحش گوئی کرنا ایک دوسرے پر تھوک پھینکنا اور مغلظات بکتے رہنا ان لوگوں میں عام تھا۔

اس کتاب میں یہ عجیب واقعہ بھی پڑھنے کو ملا کہ ایک مرتبہ حضرت سارہ اور حضرت ابراہیمؑ نے حضرت لوط علیہ السلام کی خیریت دریافت کرنے کیلئے اپنے خالہ زاد البعر ز دمشقی کو سدوم بھیجا۔ جب وہ بستی کے قریب پہنچا تو ایک سدومی نے اسکے سر پر پتھر کھینچ مارا جس سے البعر ز کا سر پھٹ گیا۔ معاملہ سدوم کے قاضی کے پاس پہنچا تو فیصلہ میں قاضی نے پتھر مارنے والے کو کہا کہ اتنی رقم زخمی ہونے والے کو معاوضہ میں ادا کرو۔ یہ فیصلہ سنتے ہی پتھر مارنے والے کو غصہ آ گیا اور اس نے ایک اور پتھر اٹھا کر حاکم کے سر پر بھی دے مارا اور اپنی گرہ سے دوگنا معاوضہ نکالتے ہوئے کہا کہ یہ لو اس میں تمہارا سر پھاڑنے کا معاوضہ بھی شامل ہے۔ یہ واقعات خواہ صحیح ہوں یا غلط' لیکن اِن سے قوم کی نفسیاتی سطح کا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔ نیز زمانہ ماضی کی قوموں کی طرف منسوب واقعات بلاوجہ بھی نہیں تھے۔

اس بدکردار قوم کی اصلاح اور تزکیہ کیلئے انہیں کسی راہبر کی اشد ضرورت تھی۔ چنانچہ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو پیغام حق پہنچانے کیلئے حضرت لوط علیہ السلام کو منصب رسالت پر متعین فرمایا۔ آپؑ نے اہل سدوم کی بے حیائیوں اور خباثتوں کی ملامت شروع کر دی اور لوگوں کو شرافت وطہارت کی زندگی کی رغبت دلائی اور حسن خطابت سے لطافت ونرم خوئی کے ساتھ سمجھانے کے جو ممکن طریقے ہو سکتے تھے استعمال فرما کر انکو سمجھایا اور تواتر کے ساتھ وعظ ونصیحت کرتے رہے مگر ان لوگوں نے آپکی باتوں کا کوئی اثر قبول نہ کیا۔

احسان ماننے اور تعظیم وادب سے پیش آنے کی بجائے انکے خلاف مجادلہ ومقابلہ پر آ گئے۔

آپکو تنگ کرنے' آپکا مذاق اڑانے سے جب انکا جی نہیں بھرا تو وہ آپکو دھمکانے پر اُتر آئے۔ حضرت لوط علیہ السلام جو مامور من اللہ تھے' انکی دھمکیوں سے ڈر کر اپنے فرائض منصبی سے کیونکر منہ موڑ سکتے تھے۔ آپؑ نے انکی ایسی حرکاتِ بد کے انجام سے انہیں بارہا مطلع کیا اور خدا کی پکڑ سے ڈرایا۔ مگر وہ تلملاتے ہوئے جھلا کر یہاں تک کہنے لگے کہ تمہارا خدا ہمارے اعمال سے اگر اتنا ہی ناراض ہے تو ہم پر اپنا وہ عذاب کیوں نہیں لے آتا جس کا ذکر کر کے تو بار بار ہمیں ڈراتا رہتا ہے۔ پھر انہوں نے حضرت لوط علیہ السلام اور انکے ساتھیوں کو شہر بدر کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ سورۃ اعراف میں فرمان ہے:

وَ مَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ (۸۲)

(ترجمہ) ''لوط کی قوم کا جواب اسکے سوائے کچھ نہ تھا کہ کہنے لگے لوط (اور اسکے پیروکاروں) کو اپنے شہر سے نکال دو (کیونکہ) یہ لوگ تو پاکیزگی چاہتے ہیں'' (الاعراف/۸۲)

مقام عبرت ہے کہ پاکیزگی جو قابل مدح صفت ہے اس بدمذاق و بدبخت قوم کے نزدیک صفت عیب قرار پائی یا یہ بات انہوں نے طنز کے طور پر کہی۔ بہرحال ایسا کردار کسی قوم کی ہلاکت کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ جبکہ انبیاء کیلئے انکی اقوام انکی اولاد کی طرح ہوتی ہیں اور انکی فلاح و اصلاح کی کوشش سے کسی حال میں منہ نہیں موڑ سکتے تاوقتیکہ پانی سر سے ہی نہ گزر جائے۔ غالباً آپؑ بھی حضرت نوح علیہ السلام کی طرح اپنی قوم اور اسکی آئندہ نسلوں کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے۔ انکی نافرمانیوں اور ہٹ دھرمیوں سے عاجز آ کر بالآخر لوط علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے استعانت چاہی اور بارگاہِ میں دعا کی۔

رَبِّ نَجِّنِيْ وَ اَهْلِيْ مِمَّا يَعْمَلُوْنَ (الشعرأ/۱۶۹)

'' اے میرے پروردگار مجھے اور میرے اہل وعیال (اور میرے پیروکاروں) کو (ان بدکرداروں کے) کاموں (کے وبال و پریشانی) سے نجات دے''۔ (الشعرأ/۱۶۹)

چنانچہ حضرت لوط علیہ السلام کی دعا پر فرشتوں کو سدوم کی بستی تباہ کرنے کا حکم ہوا۔ مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ فرشتے حضرت جبرائیلؑ حضرت میکائیلؑ اور اسرافیلؑ تھے جو نہایت خوبصورت اور حسین نوجوانوں کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ یہ فرشتے پہلے حضرت ابراہیمؑ کے پاس پہنچے اور انہیں حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت کی بشارت دی پھر اطلاع دی کہ ہم سدوم اور اسکے گردونواح کی نافرمان بستی کو تباہ

کرنے جارہے ہیں کیونکہ وہاں کے لوگوں کی بدکاریاں اور فسق و فجور حد سے بڑھ چکے ہیں۔

یہ تینوں فرشتے حضرت ابراہیمؑ کے ہمراہ رات کے وقت جب حضرت لوط علیہ السلام کے ہاں سدوم پہنچے تو لوط علیہ سلام کی بیوی کی مخبری پر ابنائے قوم کو ان حسین لڑکوں کی آمد کی خبر مل گئی۔ وہ لوگ اپنے ناپاک مقصد کی تکمیل کا سنہری موقع ہاتھ سے گنوانے والے کب تھے' بے تہاشہ دوڑتے ہوئے حضرت لوط علیہ السلام کے مکان پر جمع ہوگئے اور مہمانوں کو انکے سپرد کردینے کا مکروہ مطالبہ کرنے لگے۔ آپنے مکان کا دروازہ اندر سے بند کرلیا اور انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ میرے مہمان ہیں اور مہمانوں کے ساتھ یہ بدتمیزی اور ایسی کسی گھناؤنی خواہش کا مطالبہ نہایت شرم ناک بات ہے۔ قوم میں اتنی عورتیں موجود ہیں جو میری بیٹیوں کی طرح ہیں تم لوگ ان سے نکاح کر کے اپنی جنسی ضروریات کیوں پورا نہیں کرتے۔ مگر یہ لوگ آپکی بات سمجھنے اور ماننے والے نہیں تھے۔

پورا مجمع مشتعل ہوتا جارہا تھا اور آپکے مکان کے دروازے توڑ ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ حضرت لوط علیہ السلام اس صورت حال سے بہت پریشان ہوئے کہ یہ مہمان تو حضرت ابراہیمؑ کے ہمراہ یہاں آئے تھے اور انکی توقیر ایسے واہیات مطالبہ سے ویسے ہی آلودہ ہورہی تھی۔ طرہ یہ کہ انکے اشتعال سے بخوبی اندازہ ہوتا تھا کہ انکو روکنا آسان نہیں تھا۔ اس پر فرشتوں نے انہیں بھی اپنا تعارف کروایا کہ یہ لوگ تم تک نہیں پہنچ سکتے اور بتایا کہ ہم اس بستی کو تباہ و ہلاک کرنے کیلئے آئے ہیں اسلئے آپؑ اپنے اہل و عیال اور ساتھیوں سمیت یہاں سے نکل جائیں اور پیچھے مڑ کر بھی مت دیکھیں۔ مگر گھر کے باہر موجود اژدہام سے بچ کر نکلنا آسان نہ تھا۔ چنانچہ حضرت جبرائیلؑ نے بحکم الٰہی اپنا پَر انکے منہ پر مارا جس سے تمام مجمع وقتی طور پر اندھا ہوگیا اور فرشتوں نے لوط علیہ السلام اور آپکے ساتھیوں کو وہاں سے نکالا' اسی وجہ سے اس جگہ کا نام صنغر ہوا۔ حضرت ابراہیمؑ بھی وہاں سے نکل کر کنعان واپس لوٹ گئے۔

توریت شریف میں بھی مذکور ہے کہ ان فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام اور انکے رفقاء کو وہاں سے نکال کر دوسری جگہ پہنچایا۔ مفسرین نے یہ وضاحت بھی کی کہ حضرت لوط علیہ السلام اور انکے ساتھیوں کے وہاں سے چلے جانے کے بعد فرشتوں نے سدوم کی بستیوں کو یوں اٹھایا کہ کسی لبالب بھرے برتن سے کوئی سیال تک نہ چھلکا' کوئی چیز نہ تو الٹ کر گری نہ کسی کو اپنے ہلنے تک کا احساس ہوا۔

یہاں تک کہ یہ بستیاں آسمانِ دنیا کے اس قدر نزدیک اوپر تک اٹھائی گئیں کہ ان بستیوں میں رہنے والوں کی باہمی گفتگو، بھیڑ بکریوں اور مرغیوں وغیرہ کی آوازیں آسمانِ اوّل کے باسیوں کو سنائی دیتی تھیں۔ اتنی اونچائی پر لیجا کر ان بستیوں کو زمین پر الٹا کر پٹخ دیا گیا اور مزید ذلت و رسوائی کے لئے کھنگر یلے پتھر برسائے گئے۔ توریت میں مذکور ہے:۔

''تب خداوند نے اپنی طرف سے سدوم اور عاموره پر گندھک اور آگ آسمان سے برسائی اور اس نے اِن شہروں کے سب رہنے والوں کو اور سب کچھ جو زمین سے اُگا تھا، غارت کر دیا''

(باب: پیدائش/۱۹، ۲۴، ۲۵)

مفسرین کا کہنا ہے کہ قوم لوط پر جو پتھر آسمان سے برسائے گئے ان پر ہر ہلاک ہونے والے کا الگ الگ نام لکھا ہوا تھا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اس قوم کے جو لوگ بستیوں میں رہنے والے گھروں میں موجود تھے وہ زمین میں دھنسا دیئے گئے اور جو سفر میں تھے وہ گندھک و آتشی پتھروں کی بارش میں ہلاک کیے گئے۔

ایک معتبر حوالہ کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے کنعان میں بیٹھ کر (ظاہرہ یا خواب میں) اس عذاب کا مشاہدہ کیا۔ اس عذاب میں حضرت لوط علیہ السلام، انکے گھر والے اور ایمان لائے آپکے رفقاء کو اللہ تعالیٰ نے بچالیا۔ البتہ انکی بیوی جو منافقہ تھی اور کافروں سے ملی ہوئی تھی اس عذاب میں ہلاک ہوئی۔ قرآن نے جہاں حضرت مریم سلام اللہ علیہا اور فرعون کی بیوی حضرت آسیہ کی تعریف فرمائی ہے وہاں لوط علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کی بیویوں کے دوزخی ہونے کی اطلاع بھی عطا فرمائی ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام کے دو بیٹوں کے نام ''مواب'' اور ''عمون'' تھے۔ آپکی دو بیٹیاں بھی تھیں مگر بیٹیوں کے نام نامعلوم ہیں۔ قرآن حکیم میں حضرت لوط علیہ السلام کا ذکر اِن سورتوں اور آیات میں آیا ہے:۔ الانعام/۸۶۔ الاعراف/۸۰، تا ۸۴۔ ہود/۷۴، تا ۸۳۔ الحجر/۵۸ تا ۷۷۔ الانبیاء/۷۴، ۷۵۔ الشعراء/۱۶۰ تا ۱۷۳۔ العنکبوت/۲۸ تا ۳۵۔ الصافات/۱۳۳ تا ۱۳۸۔ الذاریٰت/۳۲، ۳۷۔ القمر/۳۶ تا ۳۹۔ التحریم/۱۰۔

حضرت اسحاق علیہ السلام

حضرت اسحاق علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے معزز پیغمبر ہیں' دیگر اعزازات کے ساتھ آپؑ کا اضافی اعزاز یہ ہے کہ آپؑ کے بعد بنی اسرائیل کے جتنے بھی انبیاء و پیغمبران مبعوث ہوئے وہ سب آپؑ ہی کے خاندان اور آپؑ ہی کی نسل سے ہوئے۔ جب حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی عمر مبارک سو سال کے قریب تھی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ بشارت دی کہ سارہ (جو کہ بانجھ اور بوقت بشارت نوے سال کی تھیں) کے بطن سے بھی تیرا ایک بیٹا ہوگا جس کا نام اسحاقؑ ہوگا۔ سورۃ ہود میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ(هود: ٦٩)

''اور بلاشبہ ہمارے فرشتے ابراہیم کے پاس بشارت لے کر آئے انہوں نے ابراہیمؑ کو سلام کیا اور تھوڑی دیر بعد ابراہیم بچھڑے کا بھنا گوشت لائے اور جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ (کھانے کیلئے) بھنے ہوئے گوشت کی طرف نہیں بڑھے تو انہوں نے فرشتوں کو اجنبی محسوس کیا اور ان سے خوف کھایا''۔ (ھود:٦٩)

چونکہ اُس زمانہ میں چور ڈاکو یا نقصان پہنچانے والا اُس گھر کا نمک نہ کھاتا تھا' آپؑ کے خوف و اندیشہ کے شکار ہونے کی دوسری وجہ جو مفسرین نے بیان فرمائی وہ یہ کہ آپؑ کو اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ فرشتے ہیں اور انکے چہروں پر جلال دیکھ کر کسی انجانے خوف کو محسوس فرما رہے تھے چنانچہ آپؑ کی کیفیت دیکھ کر:

فَلَمَّا رَآٰ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَ اَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ؕ(٧٠) وَ امْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَ مِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ (هود: ٧٠/٧١)

''فرشتے کہنے لگے کہ خوف نہ کھاؤ ہم (فرشتے ہیں جو) لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب نازل کرنے کیلئے بھیجے گئے ہیں (ھود:٧٠) اور ابراہیم کی بیوی (سارہ) کھڑی ہنس رہی تھیں۔ پس ہم نے اس کو اسحاقؑ کی اور اسکے بعد (اسحاقؑ کے بیٹے) یعقوبؑ کی بشارت دی'' (ہود: ٧١)

حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش اور مسکن شام کی سرزمین تھی جہاں مصر سے واپسی پر حضرت ابراہیمؑ اقامت گزین ہوئے تھے۔ چارلس مارٹن کی تحقیق کے مطابق حضرت اسحاقؑ کا سن پیدائش ۲۰۶۰ ق م تھا۔ حضرت سارہ کی عمر اُس وقت نوے سال یعنی حضرت ابراہیمؑ سے دس سال کم تھی۔ قرآن حکیم میں حضرت اسحاق کی ولادت کا کنایۃً ذکر سورۃ ہود کے علاوہ سورۃ حجر اور سورۃ الذاریٰت میں بھی فرمایا گیا ہے اور سورۃ الانعام' سورۃ مریم' سورۃ الصّٰفّٰت اور سورۃ صٓ میں آپکی نبوت اور آپؑ پر اللہ کی رحمتوں اور برکتوں کے نزول کا ذکر ہے۔

اسمِ اسحاق اصل تلفظ کے اعتبار سے عبرانی زبان میں یضحق ہے جسکے معانی ''ہنستا ہوا'' کے ہیں جسے انگریزی زبان میں ائزک کہا جاتا ہے اور قرآن میں انہیں اسحاق فرمایا گیا ہے۔ عربی قاعدہ سے یضحق مضارع کا صیغہ ہے اور اہل عرب کا ہمیشہ سے یہ دستور چلا آتا ہے کہ وہ مضارع کے صیغوں کو بطور نام بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ حضرت اسحاق کے بچپن کے واقعات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب آپؑ آٹھ دن کے ہوئے تو شریعت ابراہیمی کے مطابق آپؑ کا ختنہ ہوا۔ دورانِ رضاعت پورا عرصہ آپ کی والدہ حضرت سارہ نے ہی آپؑ کو اپنا دودھ پلایا اور رضاعت کا زمانہ ختم ہونے پر حضرت ابراہیمؑ نے ایک شاندار ضیافت کی۔

آپؑ کی والدہ حضرت سارہ کی عمر ۱۲۷ سال ہوئی تو جبرون میں انتقال فرما گئیں اور وہیں دفن ہوئیں۔ اس وقت تک حضرت ابراہیمؑ نہایت بوڑھے اور ضعیف ہو چکے تھے اور آپ کو حضرت اسحاق کی شادی کی فکر لاحق تھی۔ حضرت ابراہیمؑ چاہتے تھے کہ اسحاق کی شادی کسی کنعانی لڑکی سے نہ ہو بلکہ خاندان ہی کی کسی مناسب لڑکی سے رشتہ ہو جائے۔ چنانچہ آپؑ کی شادی ربقہ نامی لڑکی سے ہوگئی جو حضرت ابراہیمؑ کے بھائی ناحور کی پوتی اور بتوایل کی بیٹی تھیں۔ توریت شریف کی تصریح کے مطابق اس وقت حضرت اسحاق علیہ السلام کی عمر چالیس سال تھی اور حضرت ابراہیمؑ ایک سو چالیس سال کے ہو چکے تھے۔ جناب ربقہ بانجھ تھیں جب بیس سال تک آپکے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی تو حضرت اسحاق علیہ السلام نے ساٹھ سال کی عمر میں پروردگار سے استدعا کی کہ میرے والد کو میرے ساتھ میری اولاد کی بھی بشارت عطا فرمائی گئی تھی۔ اے میرے رب مجھے بھی دولت اولاد سے نواز دے۔ یہ دعا مقبول بارگاہ ہوئی تو آپؑ کے

ہاں توام (جڑواں) دو بیٹے پیدا ہوئے۔ پہلے بیٹے کا نام ''عیسوادوم'' تھا جن کا رنگ سرخ اور بدن پر بال تھے اور پھر ساتھ ہی حضرت یعقوبؑ پیدا ہوئے جن کی ایک ایڑی عیسوادوم کے ہاتھ میں تھی۔ عیسوادوم بڑے ہوکر ایک ماہر شکاری نکلے اور شکار کا گوشت لا کر حضرت اسحاق علیہ السلام کی تواضع کیا کرتے تھے۔ حضرت اسحاق علیہ السلام سادہ مزاج تھے اور اکثر اپنے ڈیرہ ہی میں رہا کرتے تھے۔ آپؑ کا پیشہ چوپانی (بھیڑ بکریاں پالنا) تھا جو امم سامیہ کے اکثر پیغمبروں کا رہا ہے۔

کنعان میں جب شدید قسم کا قحط پڑا تھا اور حضرت ابراہیمؑ کو مصر کا سفر اختیار کرنا پڑا تھا' اُسی نوعیت کا ایک سخت قحط حضرت اسحاق علیہ السلام کے دَور میں بھی پڑا۔ چنانچہ آپؑ نے بھی کنعان سے مصر کی طرف ہجرت کا ارادہ فرمایا۔ مگر اس وقت آپؑ کو وحی الٰہی کے ذریعے مصر جانے سے منع فرما دیا گیا اور حکم ہوا کہ آپ فلسطینیوں کے ملک ''جرار'' تشریف لیجائیں۔

جرار اُن دنوں قدیم فینسیہ یا موجودہ لبنان کے جنوب میں بحر روم کے کنارے واقع تھا۔ جہاں کا حکمران ابی ملک حضرت ابراہیمؑ کا حلیف اور دوست تھا۔ حضرت اسحاق علیہ السلام اپنے اہل و عیال سمیت جرار میں اقامت گزین ہوگئے۔ جرار آتے ہوئے آپؑ اپنے مال مویشی ہمراہ لے آئے تھے اور نہایت خوشحال اور متمول تھے' اسلئے مقامی آبادی آپ سے حسد کی بناء پر آپؑ کے خلاف ہوگئی۔ ان لوگوں نے آپؑ کے خلاف شرارتیں شکایتیں اور شدید ہنگامے شروع کر دیئے۔ انہوں نے حضرت ابراہیمؑ کے کھدوائے ہوئے بہت سے کنویں بند کر دیئے اور ابی ملک کو اکسایا کہ وہ کسی بھی طرح حضرت اسحاق علیہ السلام کو ملک جرار سے باہر نکال دے۔ اُس نے مصلحت جانتے ہوئے آپ کو ملک بدر کر دیا۔ مگر آپؑ کو باہر نکالتے ہی اسے طرح طرح کی مصیبتوں نے آگھیرا' جن سے کسی طرح جان چھڑانا دشوار ہوگیا۔ مآلِ کار وہ سمجھ گیا کہ یہ حضرت اسحاق علیہ السلام سے بیگانوں جیسا سلوک کرنے اور انکے یہاں سے رخصت ہو جانے کی وجہ سے اِن مصائب کا شکار ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس نے آپ سے معافی مانگی اور منت سماجت کر کے آپؑ کو جرار واپس بلا لیا۔

جرار واپس آ کر حضرت اسحاق علیہ السلام نے حضرت ابراہیمؑ کے کنوؤں کی دوبارہ کھدائی کروائی اور انکے وہی نام رکھے جو پہلے تھے۔ مثلاً بیئر عسق' بیئر ستنہ' بیئر رجولت اور بیئر سبع وغیرہ۔ بیئر سبع

میں آپنے ایک عبادت گاہ بھی تعمیر کرائی۔قرآن سے انکی تبلیغ وتلقین یا انکی قوم کے بارے زیادہ تفصیلات تو میسر نہیں، البتہ انکی شان وشرف کے بارے کلام مجید میں آتا ہے کہ:۔

وَ اذْكُرْ عِبٰدَنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَ الْاَبْصَارِ (۴۵) اِنَّاۤ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ۚ (۴۶) وَ اِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ؕ (۴۷) (صٓ: ۴۵ تا ۴۷)

(ترجمہ) ''اور یاد کرو ہمارے بندوں ابراہیمؑ اور اسحاق اور یعقوب قدرت اور علم والوں کو(۴۵) بیشک ہم نے ان کو امتیاز بخشا ایک کھری بات یعنی آخرت کے گھر کی یاد دلانے پر(۴۶)اور بیشک وہ ہمارے نزدیک چنے ہوئے لوگوں میں سے تھے''()(صٓ ۴۵ تا ۴۷)

حضرت اسحاق علیہ السلام اپنی آخری عمر میں بینائی سے محروم ہو گئے تھے اور انہوں نے باقی ساری عمر فلسطین میں گزاری۔آپؑ نے ایک سو اسی سال کی عمر پائی اور کنعان میں انتقال فرما کر یہیں قریہ اربع (جبرون) میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت سارہ کے پہلو میں دفن ہوئے۔قرآن حکیم میں حضرت اسحاق علیہ السلام کا ذکر ان سورتوں میں آیا ہے:۔

البقر/۱۳۳، ۱۳۶، ۱۴۰،

الانعام/۸۴،

ھود/۷۱،

مریم/۴۹، ۵۰،

انبیاء/۷۲، ۷۳،

الصافات/۱۱۲، ۱۱۳،

صٓ /۴۵ تا ۴۷،

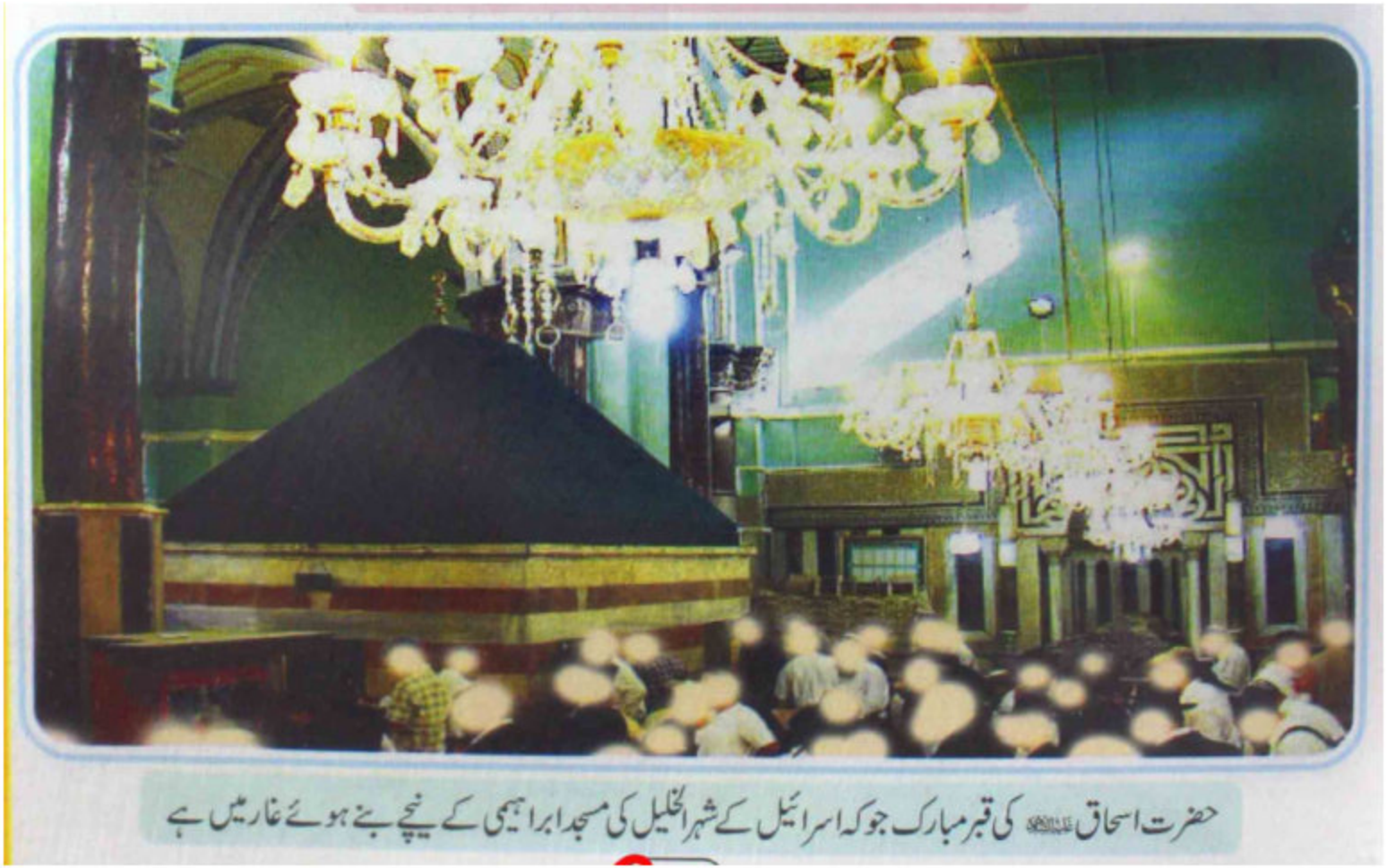

حضرت اسحاق علیہ السلام کی قبر مبارک جو کہ اسرائیل کے شہر الخلیل کی مسجد ابراہیمی کے نیچے بنے ہوئے غار میں ہے

حضرت یعقوب (اسرائیل) علیہ السلام

اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے جسکی وجہ تسمیہ کے بارے اگرچہ بہت سی روایات ہیں تاہم ان سب کا ماحصل یہی ہے کہ آپؑ یادالٰہی میں زیادہ استغراق، اللہ تعالیٰ پر توکل واعتماد اور ہر حال میں صبر ورضا جیسی خصوصیات کی بناء پر اسرائیل مشہور ہوگئے تھے۔ لفظ اسرائیل عبرانی زبان کا لفظ ہے جو ''اسرا'' اور ''ایل'' کا مرکب ہے جس میں اسرا کے معنی بندہ اور ایل کے معنی اللہ کے ہیں جیسے عربی میں اس کا ہم معنی نام عبداللہ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کا وہ اسحاقی خاندان جو حضرت یعقوبؑ کی نسل سے ہے بنی اسرائیل کہلاتا ہے اور تاحال یہود ونصاریٰ کے پرانے خاندان اسی نسبت (بنی اسرائیل) سے منسوب ہیں۔

حضرت یعقوبؑ اللہ کے برگزیدہ نبی تھے جو حضرت اسحاق بن حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے بیٹے اور حضرت یوسفؑ کے والد ہیں۔ توریت میں تحریفات کرنے والوں نے جہاں اکثر انبیائے اسلام پر اتہام تراشی کی ہے وہاں حضرت یعقوبؑ کو بھی معاف نہیں کیا۔ آپ کو نبوت ملنے کے متعلق توریت سے ایک اقتباس کا خلاصہ یوں ہے:۔

> ''آپ نے والد کی ضعف بصارت کا فائدہ اٹھا کر والدہ کی سازش کے مطابق جھوٹ بولا اور خود کو عیسو بتا کر حضرت اسحاق علیہ السلام سے اپنے حق میں دعائے خیر و برکت کروالی''
>
> (پیدائش باب ۲۷)

اور جب اس دھوکہ دہی پر عیسو نے بگڑ کر آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تو آپ کی والدہ نے آپ کو اپنے آبائی وطن فدان ارام (حاران) میں اپنے نانا بتیوایل کے پاس رہنے اور شادی کرنے کیلئے بھیج دیا۔ حالانکہ اس سے مختلف یہ بیان بھی توریت میں مذکور ہے کہ:

> ''جب آپؑ کی والدہ اُمید سے تھیں تو حضرت اسحٰق علیہ السلام نے (اپنی زوجہ جناب ربقہ کو) پیش گوئی فرمائی تھی کہ تیرے پیٹ میں دو قومیں ہیں اور یہ دو قبیلے تیرے بطن سے نکلتے ہی الگ الگ ہو جائیں گے اور بڑا چھوٹے کی خدمت کریگا''۔ (پیدائش باب ۲۳، ۲۵)

قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو پہلے ہی حضرت اسحٰق علیہ السلام کی بشارت کے ساتھ (پوتے) حضرت یعقوبؑ کی بشارت بھی دیدی تھی۔ قرآن نے چند الفاظ میں محرفین توریت کی اس ساری افسانہ طرازی کو باطل کر کے رکھ دیا ہے۔ تفسیر طبری جلد اوّل صفحہ ۱۱۹ پر مذکور ہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام نے اپنے چہیتے فرزند حضرت یعقوبؑ کو انکی اوائل عمر ہی میں نبوت کی بشارت دیدی' جو آپ کے بھائی عیسو ادوم پر سخت ناگوار گزری اور اسکی آتش حسد اتنی بڑھ گئی کہ جناب یعقوبؑ کو اپنے گھر کے بجائے ماموں کے ہاں پناہ لینا پڑی۔

توریت کے حوالہ سے اس واقعہ کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ حضرت یعقوبؑ اپنی والدہ کے اشارہ پر فدان ارام (حاران) چلے گئے تو آپؑ کے ماموں لابان نے آپ سے یہ عہد لیا کہ اگر وہ دس سال انکے یہاں رہ کر بکریاں چرائیں تو اس مدت کو مہر قرار دیکر اپنی لڑکی سے آپ کی شادی کر دیں گے۔ حضرت یعقوبؑ نے یہ مدت پوری کی تو لابان نے اپنی بڑی لڑکی لیہ سے آپ کا نکاح کرنا چاہا' مگر حضرت یعقوبؑ نے اپنا رجحانِ طبع چھوٹی لڑکی راحیل کی طرف ظاہر کیا۔ جس پر لابان نے یہ عذر بیان کیا کہ یہاں کے دستور کے مطابق بڑی لڑکی کے نکاح سے قبل چھوٹی لڑکی کا نکاح نہیں ہوسکتا اس لئے آپ اسی رشتہ کو قبول کر لیں اور اپنے قیام کو اگر سات سال مزید طویل کر لیں تو راحیل بھی آپ کے نکاح میں دی جا سکے گی۔ (اس زمانہ میں دو سگی بہنوں کا ایک شخص سے نکاح شرعاً ممنوع نہیں تھا) چنانچہ حضرت یعقوبؑ نے یہ مدت بھی پوری کی اور سات سال بعد راحیل سے بھی آپ کی شادی ہوگئی۔ ان دونوں کے علاوہ لیہ کی خالہ زاد ''زلفا'' اور راحیل کی خالہ زاد ''بلہا'' بھی آپؑ کے حلقہ زوجیت میں آئیں اور ان چاروں سے آپ کی اولاد ہوئی۔

> ''لیہ اور راحیل دونوں بہنوں میں شروع ہی سے رقابت تھی۔ شروع میں لیہ سے پے در پے چار بیٹے تولد ہوئے تھے مگر راحیل کے اولاد نہ ہوئی یہ دیکھ کر راحیل نے اپنی کنیز بلہا کو آپؑ کی زوجیت میں دے دیا۔ جن سے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ لیہ نے جب دیکھا کہ انکے مزید اولاد ہونے میں تاخیر ہو رہی ہے تو انہوں نے بھی اپنی کنیز زلفا کو حضرت یعقوبؑ کی زوجیت میں

دیدیا۔ان سے بھی دو بیٹے پیدا ہوئے۔اسکے بعد لیہ سے پھر دو بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئی۔
آخر میں راحیل سے دو بیٹے پیدا ہوئے حضرت یعقوبؑ کی کل اولاد یعنی ایک لڑکی اور بارہ
لڑکے تھے جو تمام کی تمام فدان ارام میں ہی پیدا ہوئی''۔(کتاب پیدائش باب ۳۰)

ماموں کے ہاں پرورش پاتے ہوئے جب حضرت یعقوبؑ چالیس سال کے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو منصب نبوت سے سرفراز فرمایا اور آپؑ اہل کنعان کی ہدایت کے لئے منتخب ہوئے۔اُس زمانہ میں کنعان کا بادشاہ سلجم ابن دارا تھا۔آپؑ نے مع اسکی قوم اسے دعوتِ حق دی لیکن اسکی امارت نے اسے قبول نہ کیا بہت سمجھانے اور کوشش کرنے پر بھی وہ قوم سرکشی وتمرد پر آمادہ رہی۔ابتدا میں تو آپؑ کا تمسخر اڑاتی رہی اور پھر سیدھے سیدھے مخالفت پر کمربستہ ہوگئی۔جب انکی نازیبا حرکات حد سے بڑھیں تو عذاب الٰہی نے انہیں آلیا اور زلزلے کی لپیٹ میں آکر سب کے سب واصل جہنم ہوگئے۔

حضرت یعقوبؑ جس زمانہ میں فدان ارام چلے گئے تھے اسی زمانہ میں عیسو ادوم بھی ناراض ہوکر اپنے چچا اسمٰعیلؑ کے پاس آبسے تھے اور انکی بیٹی سے شادی کرکے قریب ہی آباد ہوگئے تھے۔اس عرصہ میں دونوں بھائیوں کے درمیان جو چپقلش چل رہی تھی وہ بھی دُور ہوگئی اور محبت کا رشتہ پھر سے استوار ہوگیا تھا۔دونوں نے ایک دوسرے کو تحائف بھیجنے کا سلسلہ جاری رکھا۔یہ واقعات توریت کی کہانیوں سے ماٰخذ ہیں وگرنہ قرآن حکیم ان تفصیلات کے حق میں قطعاً خاموش ہے اور صرف حضرت یعقوبؑ کے جلیل القدر صاحب عزیمت نبی اور حضرت یوسفؑ کے برگزیدہ والد ہونے کا ذکر کرتا ہے۔

حضرت یعقوبؑ کو اپنی اولاد میں سب سے زیادہ محبت حضرت یوسفؑ سے تھی اور یہ بات حضرت یوسفؑ کے سوتیلے بھائیوں پر سخت گراں گزرتی تھی۔بالآخر برادرانِ یوسفؑ نے باہم سازش کرکے حضرت یوسفؑ کو ایک اندھے کوئیں میں ڈال دیا۔(اس واقعہ کی تفصیل اور فراقِ یوسفؑ کا ذکر انشا اللہ حضرت یوسفؑ کے تذکرہ میں پیش کرونگا)۔حضرت یعقوبؑ اپنے چہیتے بیٹے یوسفؑ کی جدائی میں برسوں روتے رہے اور کثرت گریہ کے باعث آپکی بینائی چلی گئی۔ایک سو چالیس سال کی عمر میں آپؑ اپنے بیٹے یوسفؑ سے مصر میں ملے (توریت کی تصریح کے مطابق یہ ملاقات ایک سو تیس سال کی عمر میں ہوئی) اور وہیں سات یا سترہ سال بعد ۱۴۷ سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔حضرت یوسفؑ نے اپنے والد

کی لاش کو حنوط کرایا' اس میں خوشبو بھروائی اور باپ کی لاش کو (انکی وصیت کے مطابق) کنعان لیجا کر حضرت سارہ' حضرت اسحٰاق اور حضرت ربقہ کے پہلو میں دفن کیا۔

قرآن حکیم میں حضرت یعقوبؑ کے ساتھ اسباط کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ کلامِ عرب میں سبط اس درخت کو کہتے ہیں جسکی بہت سی شاخیں ہوں۔ مفسرین کا کہنا ہے کہ چونکہ حضرت یعقوبؑ کثیر الاولاد تھے اسلئے آپؑ کے ساتھ اسباط کا لفظ استعمال فرمایا گیا۔ لابان نے حضرت یعقوبؑ کو بیس سال اپنے پاس رکھنے کے بعد بہت سامال ومتاع اور ریوڑ دیکر رخصت کیا اور آپؑ پھر سے اپنے دادا کے دارالہجرت (فلسطین) آکر مقیم ہوگئے۔ مفسرین کا بیان ہے کہ آپکے بارہ بیٹوں میں سے بنیامین کے علاوہ حضرت یعقوبؑ کی ساری اولاد ماموں کے ہاں ہوئی البتہ جب یعقوبؑ واپس فلسطین آگئے تو بنیامین یہاں پیدا ہوئے۔ یعقوبؑ کی اولاد کی تفصیل یہ ہے:۔

(لیہ سے) روبن' شمعون' لادی' یہوداہ' اسکار' زبلون اور دینہ (بیٹی)۔ (زلفا سے) جد اور آشر۔

(راحیل سے) یوسفؑ اور بنیامین۔ (بلہا سے) دان اور نفتالی۔

قرانِ حکیم میں حضرت یعقوبؑ کا ذکر جابجا ضمائر اور اوصاف کے ساتھ درجِ ذیل سورتوں میں ہوا۔

سورۃ البقر/۱۳۳' ۱۳۶' ۱۴۰ سورۃ النساء/۱۶۳'

سورۃ انعام/۸۴' سورۃ یوسف/۶' ۳۸'

سورۃ مریم/۶' سورۃ انبیا/۷۲' ۷۳' اور

سورۃ ص/۴۵'

حضرت یعقوب علیہ السلام کی قبر مبارک کے باہر لگی جالیاں یہ مزار اسرائیل کے شہر حبرون کی مسجد الخلیل کے نیچے غار میں آج بھی موجود ہے

حضرت یوسف علیہ السلام

حضرت یوسفؑ کا سن پیدائش تحقیق کے مطابق ۹۲۷ ق م ہے۔آپ تمام بھائیوں میں سے چھوٹے لیکن اپنے سگے بھائی بنیامین سے بڑے تھے۔ پیدائش کے وقت آپؑ کے والد حضرت یعقوبؑ کی عمر ۷۳ برس تھی۔آپؑ کا نسب نامہ یوسفؑ بن یعقوبؑ بن اسحاق بن ابراہیمؑ ہے اور والدہ ماجدہ کا نام راحیل بنت لابان تھا۔حضرت یعقوبؑ کو اپنی ساری اولاد میں سے یوسفؑ سے بے پناہ محبت تھی اور وہ ایک پل کیلئے بھی آپ کو آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتے تھے۔حضرت یعقوبؑ کی اس شدید محبت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ یوسفؑ کی پیشانی پر ایک خاص چمکتا ہوا نور بخوبی دیکھتے تھے۔مگر حضرت یعقوبؑ کی حضرت یوسفؑ سے ایسا لگاؤ اور شدید محبت حضرت یوسفؑ کے سوتیلے بھائیوں پر سخت ناگوار گزرتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ ناگواری بڑھتے ہوئے مخاصمت میں بدلتی گئی اور آخر کار آتش حسد میں مبتلاء ہو کر انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ٹھکانے لگانے کا منصوبہ تیار کر لیا۔

قرآن میں حضرت یوسفؑ کا قصہ آپؑ کے خواب سے شروع ہوتا ہے۔بارہ برس کی عمر میں آپ نے خواب دیکھا کہ آفتاب و ماہتاب اور نجوم و کواکب آپ کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔اپنے والد ماجد سے اس کی تعبیر دریافت کی تو حضرت یعقوبؑ نے فرمایا کہ اے بیٹے مستقبل میں تجھے بہت بڑا رُتبہ اور اقتدار ملنے والا ہے۔لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ اس خواب کے بارے کسی کو کچھ مت بتانا۔

قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ(۵) (سورۃ:یوسف)

''فرمایا اے بیٹے اپنے خواب کا ذکر اپنے بھائیوں سے (بھی) نہ کرنا کہ وہ تیرے حق میں فریب کی کوئی چال چلیں گے' کچھ شک نہیں کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے''۔(یوسف/۵)

حضرت یعقوبؑ چونکہ یوسفؑ کو ایک پل کیلئے بھی اپنے سے جدا نہیں کرتے تھے اسلئے سب بھائیوں نے مل کر باپ سے بلطائف الحیل یوسفؑ کو جنگل میں سیر کرانے کی اجازت حاصل کر لی اور لے جا کر ایک اندھے کنویں میں ڈال دیا۔پھر مکر و فریب سے روتے ہوئے گھر لوٹے اور باپ کو کہا کہ یوسف کو ایک

بھیڑیا کھا گیا ہے۔ پھر اپنے مکر اور جھوٹ کو چھپانے کیلئے انکے کپڑوں کو (جن پر بکری کے بچے کا خون لگایا ہوا تھا) والد کے رُوبرو پیش کیا۔ یہ بہانہ سن کر حضرت یعقوبؑ ایسے پیغمبر کے صبر و رضا اور ایمان باللہ کا عالم یہ کہ آپؑ نے زبانِ مبارک سے صرف یہ کہا:۔

وَجَآءُوْا عَلٰی قَمِیْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ ؕ وَ اللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوْنَ (یوسف:۱۸)

(ترجمہ) ''نہیں تم یہ بات اپنے دل سے بنالائے ہو اب میرے لئے صبر ہی بہتر ہے اور اُس بارے میں خدا ہی سے مدد مانگتا ہوں جو تم بیان کرتے ہو'' (یوسف/۱۸)

توریت نے ''چاہِ کنعان'' (جس کنویں میں حضرت یوسفؑ کو پھینکا گیا تھا) کا مقام جبرون کی وادی میں سکم سے آگے بتایا ہے۔ مفسرین قرآن کے مطابق یہ کنواں کنعان سے تین فرسنگ کے فاصلہ پر بیت المقدس سے نزدیک سرزمین اردن میں واقع تھا' اور مذکور ہے کہ اس وقت حضرت یوسفؑ کی عمر سترہ سال تھی۔ اگرچہ ہر نبی کو وحی الٰہی کا سلسلہ اسکی چالیس سال عمر کے بعد ہی شروع ہوتا ہے مگر حضرت یوسفؑ کے کنویں میں گرتے ہی قادر مطلق نے وحی نازل فرما کر انہیں تسلی دی جسے قرآن نے یوں بیان فرمایا ہے کہ:۔

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَ اَجْمَعُوْۤا اَنْ یَّجْعَلُوْهُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ (یوسف: ۱۵)

(ترجمہ) ''غرض جب وہ اس (یوسفؑ) کو لے گئے اور اس بات پر اتفاق کر لیا کہ اس کو گہرے کنویں میں ڈال دیں تو ہم نے یوسفؑ کی طرف وحی بھیجی کہ (ایک وقت ایسا آئیگا کہ) تم ان (کنویں میں ڈالنے والے بھائیوں) کو انکا سلوک جتاؤ گے اور انکو (اِس وحی کی اور اُس وقت آپکی شناخت کہ تم ہی یوسف ہو) کچھ خبر نہ ہوگی''۔ (یوسف/۱۵)

ایک طرف جبکہ حضرت یوسفؑ کو کنوئیں میں ڈال کر پیراہن یوسفؑ کو حضرت یعقوبؑ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا تھا' تو دوسری طرف اسماعیلی عربوں کے ایک قافلے کا ادھر سے گزر ہوا جو مصر کی طرف جا رہا تھا اور راہ بھٹکنے کے باعث اِدھر آنکلا تھا۔ قافلے کے لوگوں نے پانی کیلئے کنویں میں ڈول ڈالا تو حضرت

وہ کنواں جس میں حضرت یوسف علیہ السلام کے 10 سوتیلے بھائیوں نے حسد میں آ کر حضرت یوسف علیہ السلام کو ڈال دیا تھا پھر مصر سے ایک قافلہ نے پانی کی تلاش میں ڈول ڈالا تو حضرت یوسف علیہ السلام کو پایا اور مصر جا کر عزیز مصر کے ہاتھوں حضرت یوسف علیہ السلام کو فروخت کر دیا۔

یوسفؑ ڈول پکڑ کر باہر نکل آئے۔ ڈول نکالنے والے شخص کا نام مالک بن ذعر خزاعی تھا جو مدین کا رہنے والا تھا۔ جب اس نے ایک نہایت حسین نوجوان کو کنویں سے برآمد ہوتے دیکھا تو انکے حسن دلفریب پر پہلے تو مبہوت سا ہو کر رہ گیا پھر اس خیال سے بہت خوش ہوا کہ اسے فروخت کروں تو اچھی خاصی رقم مل جائیگی' یوں بیٹھے بٹھائے ایک گراں بہا مایہ ہاتھ لگی اور پھر اپنے ساتھیوں کو بلا کر ماجرا بیان کرنے لگا۔ ادھر تیسرے روز برادرانِ یوسفؑ بکریاں چراتے ہوئے یوسفؑ کا حال معلوم کرنے کیلئے اس کنویں کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ اپنے بھائی یوسفؑ کو قافلہ والوں نے اپنے قبضہ میں کر رکھا ہے' تو کہنے لگے کہ یہ ہمارا غلام ہے جو بھاگا ہوا ہے چنانچہ اسے ہمیں واپس کر دو۔ مگر انہوں نے چند سکے دیکر انہیں رخصت کر دیا۔ پھر انہیں کپڑے پہنائے اور غلام بنا کر فروخت کرنے کیلئے اپنے ہمراہ مصر لے گئے۔ یہاں سے حضرت یوسفؑ کی مصری زندگی کی ابتداء ہوتی ہے۔

توریت کی تصریح کے مطابق یہ قافلہ جس نے حضرت یوسفؑ کو کنویں سے باہر نکالا اور اپنے ساتھ مصر لے گیا تھا' اسماعیلی عربوں اور مدیانی سوداگروں کا قافلہ تھا جو جلعاد سے گرم مصالحہ' روغن بلسان اور دوسرا تجارتی سامان اونٹوں پر لادے ہوئے مصر جا رہا تھا۔ یہ شمع بزم رسالت' آفتاب حسن وخوبی اور دیارِ مصر کے خزانوں کا ہونے والا مالک چاندی کے صرف بیس سکوں میں بیچ ڈالا گیا۔ جسے فوطیفار نامی (عزیز مصر) نے خرید کیا۔

یوں تو آپؑ کئی بار بکے' کبھی کسی بڑھیا نے سوت کی ایک اٹی کے عوض آپؑ کو خریدنا چاہا اور کبھی برادرانِ یوسف نے آپؑ کو اپنا غلام بتا کر مدیانی سوداگروں کے قافلہ والوں سے اونے پونے دام وصول کرنے پر اکتفا کیا اور پھر آپؑ مصر کے وزیر اعلیٰ کے ہاتھوں بک کر شاہی محل میں جا پہنچے۔ اُن دنوں غیر مصریوں کو بڑی حقارت سے دیکھا جاتا تھا اور محل میں تو کیا کوئی عام مصری اپنی جھونپڑی میں بھی کسی غیر مصری کو ساتھ بٹھانے پر راضی نہ تھا۔ اُس دَور کے حالات کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد نے توریت کے حوالے سے فرمایا۔

> ''اُس علاقہ (کنعان) سے تھوڑے فاصلے پر مصر کی سرزمین اپنے تمدن وحضارۃ میں شہرہ آفاق ہو رہی تھی اور ایک بڑی سلطنت کی پایہ گاہ تھی۔ اس کا دارالحکومت ریمسس (فرعون) وقت

کے علوم وصنعتوں کا مرکز تھا اور وہاں کے باشندوں میں شہریت اور امارت کی خصوصیات نشو و نما پا چکی تھیں۔ جیسا کہ قاعدہ ہے' مصر کے لوگ اپنے آپ کو متمدن اور ترقی یافتہ سمجھتے اور اطراف و جوانب کے بدوؤں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ خصوصاً کنعانی اور عبرانی انکی نظر میں بڑے ذلیل وحقیر تھے۔ مصری انہیں چرواہے کہہ کر پکارتے اور قطعاً اس قابل نہ سمجھتے کہ اپنی مجلسوں میں انہیں بیٹھنے کی جگہ (یا اجازت) دیں۔ یہ بات بھی ان میں عام مستعمل تھی کہ کوئی مصری کسی کنعانی کے ساتھ ایک دسترخوان پر کھانا نہیں کھاتا تھا۔ یہاں تک کہ مصر کے دیہاتی (تک) بھی انہیں اس درجہ برا سمجھتے کہ اپنی آبادیوں میں انکا بسنا گوارا نہ کرتے''۔
(پیدائش/۴۶'۳۴)

مولانا ابوالکلام آزاد (ترجمان القرآن جلد دوم صفحہ ۲۴۰ میں) مزید لکھتے ہیں:۔

''لیکن قدرت کے بعض عجائبات فہم وعقل انسانی سے ماوریٰ بھی ہوتے ہیں کہ کنعان کے بدوی قبیلے کا ایک کم سن بے زر و بے پر لڑکا جو اپنی خواہش و مرضی کے بغیر مصر پہنچ گیا۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد دنیا نے دیکھا کہ مصر کی اس عظیم الشان مملکت کی حکومت کی باگ ڈور اسی کنعانی اور بدوی قبیلے کے ایک چرواہے کے ہاتھوں میں پہنچ چکی تھی جسکے معاشرہ کے لوگوں کو متمدن آبادی کا ہر فرد حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اور اب یہ حال کہ بادشاہ سے لیکر عام رعایا تک سب اسکی عظمت وفضیلت کے آگے جھکے ہوئے تھے''۔

یہ حضرت یعقوبؑ کے ہونہار اور محبوب فرزند حضرت یوسف علیہ السلام تھے۔ آپؑ اس مرتبہ پر کیسے فائز ہوئے' یہ اولوالعزمی اور صبر واستقلال کی ایک طویل داستان ہے جو توریت شریف اور قرآن حکیم میں بیان فرمائی گئی ہے۔

فوطیفار (عزیز مصر) نے اگرچہ یوسفؑ کو خریدا تھا مگر اس نے انکے ساتھ کبھی بھی غلاموں سا سلوک نہیں کیا بلکہ انہیں اپنی اولاد کی طرح عزت واحترام کے ساتھ رکھا۔ اپنی ریاست' دولت وثروت یہاں تک کہ اپنی گھریلو زندگی کی ذمہ داریاں بھی آپؑ کے سپرد کر کے آپکو اِن سب کا امین بنا دیا۔ آپؑ

نے بھی امانت داری اور عزیز مصر کے اعتماد کا پورا پورا حق ادا فرمایا۔ کنعان کے اس گلہ بان کو عنقریب جو جہانداری سونپے جانے والی تھی یہ گویا اس کی تمہید تھی۔

اب وقت کی دوسری اور کٹھن آزمائش شروع ہوئی ۔ چار دانگ عالم میں آپکے حسن کے چرچے ہونے لگے جو آج تک' بلکہ آئندہ بھی موجود و مشہور ہیں ۔ پھر جوانی کا بھرپور عالم تھا اور مردانہ وجاہت و حسن اور خوبروئی کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جو ان میں موجود نہ ہو' مجسم رخِ روشن جو شمس و قمر کی طرح منور تھا اوپر سے عصمت و حیاء کی فراوانی' طرہ یہ کہ وقت کا ساتھ بھی میسر تھا۔ ایسے میں عزیز مصر کی بیوی (زلیخا) اپنے دل پر قابو نہ رکھ سکی اور یوسفؑ پر پروانہ وار فدا ہونے لگی۔ ایک روز اس نے محل کے ایک کمرہ میں حضرت یوسفؑ کو تنہا پایا تو اپنے جذبات سے بے قابو ہوتے ہوئے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور اصرار کرنے لگی کہ مجھے شاد کام کیا جائے۔

حضرت یوسفؑ کیلئے یہ آزمائش کا سخت ترین اور نازک ترین وقت تھا۔ مصر کے شاہی خاندان کی خوبرو دوشیزہ' شعلہ حسن سے لالہ رُو' آرائش حسن و زینت کی بے پناہ نمائش سے لیس' جو محبوبہ نہیں بلکہ عاشقہ اور پھر خود دعوت دیتی ہوئی خاتون' جسے نہ کسی رقیب کا ڈر نہ خاوند کی موجودگی کا فکر اور دروازے بند۔ ایسی حالت میں کسی جوان مرد کا بچ نکلنا کس قدر مشکل ہے اسکا اندازہ چنداں مشکل نہیں۔ آپؑ نے ایک لحہ کیلئے بھی زلیخا کی حوصلہ افزائی نہ کی بلکہ اسے چھوڑ کر بھاگ نکلنے کی کوشش کی تو زلیخا نے پیچھے سے دامن پکڑ کر زبردستی روکنے اور آمادہ کرنے کی کوشش کی جس سے آپؑ کی قمیص پھٹ گئی۔

آپؑ نے کسی طرح اس سے خود کو آزاد کروا کر دروازہ کھولا تو عزیز مصر کا چچازاد بھائی سامنے کھڑا تھا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر زلیخا نے الٹا حضرت یوسفؑ پر الزام لگا دیا کہ آپؑ نے اسکی عزت پر حملہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ عزیز مصر کا بھائی بہت ذہین و فطین شخص تھا اس نے دونوں کے تیور بھانپ لئے تھے اور تسلی کیلئے آپؑ کی قمیص کا معائنہ کیا جو کہ پیچھے کی جانب سے کھنچ کر پھٹی ہوئی تھی وہ اس معاملہ کو بخوبی جان چکا تھا کہ یوسفؑ صادق القول ہیں اور زلیخا جھوٹی ہے۔

جب عزیز مصر تک یہ بات پہنچی تو اس نے اپنی عزت و ناموس کی خاطر معاملہ یہیں ختم کر دینے کا حکم دیا۔ مگر ایسی باتیں بھلا کب چھپی رہتی ہیں' قریہ قریہ پھیلتی یہ بات عوام و خواص کی خواتین تک پہنچ گئی

تو انہوں نے زلیخا کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ زلیخا آخر کب تک یہ باتیں سنتی۔ اس نے خباثت نفس کو آشکارہ کرنے کیلئے ایک دعوت کا انتظام کیا اور تمام بڑی بڑی عورتوں کو مدعو کیا۔ پھر کھانے کے بعد ہر کسی کے سامنے تیز چھریاں رکھ دیں اور ہاتھوں میں پھل پکڑوا دیئے' تب حضرت یوسفؑ کو انکے سامنے سے گزارا گیا۔ جونہی عورتوں کی نظر حضرت یوسفؑ پر پڑی انہیں اپنے تن من کا ہوش نہ رہا اور بیخودی میں انہوں نے پھلوں کی بجائے اپنی انگلیاں کاٹ کر زخمی کر لیں۔ بے اختیار انکی زبانوں سے نکلا کہ یہ کوئی بشر نہیں ضرور کوئی فرشتہ ہے۔

اسکے بعد بھی زلیخا موقع بہ موقع مقصد براری کیلئے کوشش کرتی رہی یہاں تک کہ سیدھا دھمکیاں دینے پر اتر آئی۔ پھر وہ عورتیں بھی حضرت یوسفؑ کو اپنی طرف مائل کرنے اور دعوت گناہ دینے پر جُت گئیں۔ جب زلیخا اور یہ عورتیں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئیں تو مایوس ہو کر انہوں نے جھوٹا الزام لگا کر آپکو جیل بھجوا دیا جہاں اس ناکردہ گناہ کی پاداش میں حضرت یوسفؑ سات برس جیل میں قید رہے۔

آپؑ نبی زادہ تھے اور خداوند تعالیٰ نے خود آپؑ کو منصب نبوت کیلئے منتخب فرما لیا تھا اس لئے تبلیغ حق کے ذوق وشوق اور اپنے فرضِ منصبی سے کسی مقام پر بھی غفلت کیونکر برت سکتے تھے۔ آپؑ جیل میں بھی مقصد حیات کو نہ بھولے اور اعلائے کلمۃ الحق کو فراموش نہ کیا۔ دورانِ قید جیل کے ساتھیوں کی مدد کرنا انہیں راہ راست کی طرف رغبت دلانا اور لوگوں کے خوابوں کی تعبیریں بتانا آپؑ کے مشاغل میں شامل تھا۔ جیل میں آپ کے دو ساتھیوں میں سے ایک نے اپنا خواب بیان کیا کہ میں شراب نچوڑتا ہوں اور دوسرے نے کہا میں نے خواب دیکھا کہ میرے سر پر کچھ روٹیاں ہیں جن میں سے پرندے کھاتے ہیں' ہمیں انکی تعبیر بتائیں ہم آپ کو نیکوکار پاتے ہیں۔

اسکے جواب میں پہلے تو آپؑ نے انہیں دعوت توحید دی' شرک کی قباحت و برائیاں بیان فرمائیں اور یہ بتایا کہ تعبیر کا فن مجھے رب تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے۔ پھر خواب دیکھنے والوں کو تعبیریں بتائیں کہ جس نے خود کو شراب نچوڑتے دیکھا تھا وہ اپنے بادشاہ کا ساقی ہوگا اور اسکو شراب پلائے گا۔ دوسرے کو (جس نے سر پر رکھی روٹیوں کو پرندوں کی خوراک بنتے دیکھا تھا) بتایا کہ تو سولی دیا جائیگا

اور پھر پرندے تیرے سر سے تیرے دماغ کو نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ دوسرے کو پھانسی ہوگئی اور پہلا جیل سے چھوٹ کر بادشاہ کی ساقی گری کی ملازمت میں چلا گیا۔ جب پہلے کو جیل سے رہائی کی نوید ملی تو حضرت یوسفؑ نے اس سے کہا تھا کہ موقع پا کر بادشاہ سے میری بے گناہی کے بارے بات کرنا' مگر وہ اس بات کو بھول گیا اور آپؑ سالوں تک جیل میں پڑے رہے۔

ابھی آپؑ زنداں میں تھے کہ شاہِ مصر نے ایک خواب دیکھا' یوں کہ سات دبلی گائیں سات موٹی گائیوں کو نگل گئیں اور سات خشک بالیوں نے سات سرسبز بالیں نگل لیں۔ وہ اسکی تعبیر معلوم کرنے کی کوشش میں سخت بے چین تھا۔ اپنے تعبیر کرنے والوں سے پوچھا تو انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ایسے خواب پریشان خواب کہلاتے ہیں اور ہم ایسے خوابوں کی تعبیر بتانے سے معذور ہیں۔ بادشاہ کے ساقی نے جب یہ معاملہ دیکھا تو مدت بعد اسے جیل میں خوابوں کی تعبیر بتانے والا اور اسکا پیغام یاد آیا۔ تب اس نے بادشاہ سے کہا کہ میں اس خواب کی تعبیر بتاؤں گا۔ لیکن اس کیلئے مجھے جیل میں جا کر کسی سے ملنے کی اجازت دیجائے۔

جب ساقی نے جا کر بادشاہ کا خواب بیان کر کے اسکی تعبیر دریافت کی تو حضرت یوسفؑ نے فرمایا کہ پہلے سات سال مصر میں خوب اچھی فصلیں ہونگی اور پھر سات سال تک سخت قسم کا قحط پڑے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ پہلے سات سالوں کا زیادہ سے زیادہ غلہ انکی بالیوں ہی میں محفوظ رہنے دیا جائے جو آئندہ قحط سالی کے دوران استعمال کیا جاسکے۔ بادشاہ نے یہ تعبیر سنی تو اسکے دل نے اسکے حق ہونے پر گواہی دی اور اس نے حکم دیا کہ اس تعبیر کرنے والے کو میرے پاس لاؤ۔ جب یہ فرمان حضرت یوسفؑ کے پاس زندان میں پہنچا تو آپؑ نے فرمایا کہ پہلے اپنے بادشاہ سے یہ پوچھ کر آؤ کہ جن عورتوں نے اپنی انگلیاں کاٹ لی تھیں ان کا ماجرا کیا ہوا۔ جب بادشاہ کو یہ پیغام ملا تو اسے یہ واقعہ یاد آ گیا اور اس نے از سر نو اسکی تحقیق کا ارادہ کیا۔ عورتوں کو بلوا کر ان سے تمام احوال سچ سچ بیان کرنے کو کہا۔ اس مرتبہ انہوں نے حق بیان کیا اور اعتراف کیا کہ ہم ہی نے یوسفؑ کو لبھانے کی دعوت دی تھی اور اس پاکباز شخص کو تو واقعی بے گناہ زندان میں ڈالوایا گیا۔ زلیخا نے بھی اعتراف کیا میں وقتی طور پر بہک گئی تھی اور اپنے شوہر (عزیز مصر) کے ڈر کی بناء پر اس بیگناہ پر جھوٹا الزام لگا کر خود محفوظ رہنا چاہتی تھی۔

اس معاملہ کے طے ہوتے ہی حضرت یوسفؑ کو زندان سے آزاد کرنے کا حکم نامہ جاری ہو گیا اور پھر بادشاہ نے انہیں عزت وسطوت سے نوازتے ہوئے اپنے پاس بلا کر اپنا معتمد ساتھی بنالیا۔ پھر آپؑ پر اعتبار کی بناء پر خزانوں کی نگرانی بھی آپؑ کے سپرد کر دی گئی۔

ایک سال بعد آپؑ کی دیانت وذہانت کے قائل ہونے پر بادشاہ نے حضرت یوسفؑ کی تاج پوشی کی' شاہی تلوار اور مہر پیش کی اور طلائی تخت پر تخت نشین کیا جو بیش قیمت جواہرات سے مرصع تھا۔ پھر عزیز مصر کو معزول کر کے (یا غالباً اسکی وفات پر) اسکی جگہ آپؑ کو والی مصر بنا دیا۔ نہ صرف یہی بلکہ تمام خزانوں اور تمام ملکی معاملات سمیت اپنا پورا ملک آپؑ کو تفویض کر دیا اور خود مثل ایک تابع کے ہو گیا۔ آپؑ کے معاملات وفیصلوں پر لیت ولعل یا اعتراض نہ کرتا اور آپؑ کے احکام پر عمل درآمد کو افضلیت و اہمیت دیتا۔ عزیز مصر کا انتقال ہو چکا تھا چنانچہ بحکم الٰہیہ زلیخا کا نکاح آپؑ سے ہو گیا۔

جب یوسفؑ زلیخا کی خلوت میں پہنچے تو فرمایا کیا یہ اس سے بہتر نہیں ہے جو تو چاہتی تھی۔ زلیخا نے کہا کہ آپؑ مجھے شرمندہ نہ کریں میں جوان وخوبصورت تھی میرے شوہر کو عورتوں سے سروکار ہی نہ تھا۔ آپؑ نہایت وجیہ وحسین تھے میں شرمندہ ہوں کہ خود پر قابو نہ رکھ سکی اور آپؑ کو اللہ نے معصوم کیا ہے آپؑ اس گناہ سے محفوظ رہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے زلیخا کو باکرہ پایا اور اس سے آپؑ کے دو فرزند ''افرائیم'' اور ''میشا'' پیدا ہوئے۔

حکومت ملتے ہی آپؑ نے نظام عدل قائم فرمایا اور دیگر انتظامی امور کے ساتھ ساتھ آنے والے زمانہ قحط سے نمٹنے کی تدابیر پر عمل درآمد شروع کروا دیا۔ نہریں اور رفاہِ عامہ کے کام کئے۔ بڑے بڑے وسیع اور عالی شان انبار خانے تعمیر کروائے اور خوشحالی کے زمانہ میں غلہ کے بہت کثیر ذخائر جمع کر لئے۔ فراخی کے دن گزرتے ہی قحط سالی کا آغاز ہوا تو پہلے سال ہی لوگوں کے پاس موجود اجناس ختم ہو گئیں' بازار سنسان وویران ہو گئے۔ لوگوں نے آپؑ سے نقد غلہ خریدنا شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے انکے درہم ودینار سب ختم ہونے لگے۔ دوسرے سال لوگوں نے اپنے زیورات وجواہرات کے عوض غلہ خریدا' تیسرے سال اپنے چوپائے اور جانور دیکر اجناس خریدیں۔ چوتھے سال اپنے تمام غلام اور لونڈیاں فروخت کرنا پڑیں۔ پانچویں سال اہل مصر کو اپنی جائیدادیں' اراضی ومکانات وغیرہ حضرت

یوسفؑ کے ہاتھ فروخت کرنا پڑیں۔ چھٹے سال اپنی اولاد تک کو فروخت کرنا پڑا اور ساتویں سال زندہ رہنے کیلئے انہیں خود کو بھی بیچنا پڑا اور یوں وہ سب آپؑ کے غلام ہو گئے۔ اس وقت پورے مصر میں کوئی مرد ایسا نہ تھا جو آپؑ کا غلام نہ ہو اور کوئی ایسی عورت نہ بچی جو آپؑ کی کنیز نہ ہو۔ ایک وقت وہ تھا جب آپؑ خود بکے تھے اور آج یہ عالم کہ تمام مصر بمع اموال آپ کی ملکیت میں آ چکے تھے۔ حضرت یوسفؑ نے بادشاہ سے مشورہ کیا کہ اب عوام کے حق میں آپ کی کیا رائے ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ جو حضرت کی رائے ہو ہم آپؑ کے تابع ہیں۔ اس پر یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ آپ گواہ رہیں میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے تمام اہل مصر کو آزاد کیا اور پھر انکے اموال و جائیدادیں بھی انہیں واپس کر دیں۔

مفسرین نے بیان کیا ہے کہ جب قحط کی شدت ہوئی اور یہ بلائے عظیم عام ہوئی تو تمام بلاد وامصار قحط کی اس سخت مصیبت میں مبتلاء ہو کر ہر جانب سے غلہ خریدنے کیلئے مصر پہنچنے لگے۔ حضرت یوسفؑ کسی کو ایک اونٹ سے زیادہ غلہ نہیں دیتے تھے تاکہ مساوات رہے اور سب کی مصیبت دُور ہوتی رہے۔ قحط کی تکلیف جیسے مصر اور دیگر بلاد میں تھی ویسے ہی کنعان بھی اسکی لپیٹ میں تھا۔ اس وقت حضرت یعقوبؑ نے بنیامین کے علاوہ اپنے دس بیٹوں کو غلہ خریدنے مصر روانہ کیا۔ جب برادرانِ یوسف غلہ لینے کیلئے آپؑ کے پاس آئے تو آپؑ نے انہیں پہچان لیا مگر وہ آپؑ کو قطعی نہ پہچان پائے۔ آپؑ نے فرمایا تم لوگ کون ہو؟ کہیں جاسوس تو نہیں ہو۔ جس پر انہوں نے کہا ہم شام کے رہنے والے ہیں اور سب بھائی ہیں اور خدا کو گواہ کرتے ہیں کہ ہم جاسوس وغیرہ نہیں ہمارے والد بوڑھے ہیں اور وہ اللہ کے نبی ہیں۔ تو یوسفؑ نے فرمایا کہ تم سب کتنے بھائی ہو؟ جواب میں انہوں نے بتایا کہ ہم بارہ بھائی ہیں ایک بچپن میں جنگل میں کھو گیا تھا جو دوبارہ نہیں ملا اور ایک بھائی والد صاحب کے پاس کنعان ہی میں رہ گیا ہے؛ آپؑ اسکا غلہ بھی دیدیں۔ حضرت یوسفؑ نے ایک شتر غلہ مزید دینے کا وعدہ کیا اور فرمایا کہ اب مصر آتے ہوئے اپنے بھائی کو ساتھ لیکر آنا وگرنہ ادھر کا رُخ مت کرنا۔

آپؑ نے بھائیوں کی طرف سے غلہ کے معاوضہ میں دی جانے والی رقم انکے غلہ ہی میں چھپا کر رکھوادی تاکہ وہ شرمندگی محسوس نہ کریں اور دوبارہ غلہ لینے آئیں۔ جب یہ دسوں بھائی واپس کنعان پہنچے اور بادشاہ کے اخلاق کا ذکر کیا اور بتایا کہ بنیامین کے حصے کا اناج اسکے ساتھ جانے پر ہی ملے گا تو

حضرت یعقوبؑ اس پر راضی نہ ہوئے اور پھر انہوں نے رب کو گواہ بنا کر یقین دلایا تو بنیامین کو ہمراہ لیجانے کی اجازت مل گئی۔ اسی اثناء میں جب غلہ اتارا گیا تو اس میں سے انکی پونجی بھی دستیاب ہوگئی اور وہ خوش ہوکر واپس مصر آنے پر تیار ہوگئے۔ حضرت یعقوبؑ نے فرمایا کہ جا کر بادشاہ سے ہمارا سلام کہنا۔ یہ لوگ بنیامین سمیت مصر پہنچے اور یوسفؑ سے ملے آپؑ نے اپنے بھائی بنیامین کو اپنے پاس بٹھالیا اور خوب خاطر و مدارت کی پھر غلہ دیکر وہاں سے روانہ کیا۔

آپؑ نے اپنے بھائیوں کو روانہ کرنے سے پہلے بنیامین کے اونٹ کے کجاوے میں اپنا ماپ کرنے والا قیمتی پیالہ (جو جواہرات سے مرصع تھا) چھپا کر رکھ دیا اور یہ لوگ کنعان کیلئے روانہ ہوگئے۔ جب یہ لوگ شہر سے باہر نکل گئے تو انبار خانے والوں کو معلوم ہوا کہ پیالہ نہیں ہے۔ انکے خیال میں یہی آیا کہ کنعان جانے والے یہ پیالہ لے گئے ہیں۔ انہوں نے اس کی تفتیش کیلئے آدمی دوڑائے جنہوں نے اس قافلہ کو جالیا اور تلاشی کیلئے واپس مصر حضرت یوسفؑ کے پاس لا حاضر کیا۔ حضرت یوسفؑ نے سب کی تلاشی کا حکم کیا اور بعد میں بنیامین کے سامان سے یہ پیالہ برآمد کرلیا' چنانچہ انکے قانون کے مطابق (کہ جو چوری کرے وہ مالک کا غلام ٹھہرتا تھا) بنیامین کو اپنے غلام کی حیثیت بتا کر اپنے پاس روک لیا اور خاموشی سے اسے بتادیا کہ میں ہی تمہارا سگا اور کھویا ہوا بھائی یوسفؑ ہوں۔ یہ ماجرا دیکھ کر دوسرے بھائی سخت پریشان ہوئے کہ والد کو یقین دلا کر اسے ہمراہ لائے تھے اب اسکے بغیر واپس جائیں گے تو کیا جواب دیں گے۔ والد ہماری بات کا یقین نہیں کریں گے کیونکہ پہلے بھی یوسفؑ کو ساتھ لیجا کر کنویں میں ڈال کر جھوٹ بول چکے تھے۔

تاہم وہ واپس لوٹے اور باپ سے ماجرا بیان کیا کہ بنیامین نے چوری کی اور اب وہ شاہ مصر کی غلامی میں ہے آپؑ چاہیں تو وہاں کے لوگوں اور ہمراہیان قافلہ سے گواہی لے لیں۔ اس پر یعقوبؑ نے فرمایا کہ میں پھر صبر کرتا ہوں اللہ نے چاہا تو وہ مجھے بچھڑے ہوئے بیٹے سے ملادیگا۔ تم لوگ پہلے بھی یوسف کو مجھ سے جدا کر چکے ہو اور اب بنیامین کو کہیں چھوڑ آئے ہو۔ اس پر وہ کہنے لگے کہ یوسف کی یاد سے روتے روتے تمہارا یہ حال ہوگیا کہ مرنے کے قریب ہوگئے مگر پھر بھی اسے یاد کرنا ترک نہیں کیا۔ حضرت یعقوبؑ نے فرمایا میں تو اپنی پریشانی اور غم کی فریاد اللہ ہی سے کرتا ہوں۔ اب جاؤ اور یوسفؑ اور

بنیامین کا سراغ لگاؤ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو بیشک اللہ کی رحمت سے سوائے کافروں کے کوئی مایوس نہیں ہوتا۔

تمام بھائی پھر سے حضرت یوسفؑ کے پاس پہنچے اور اپنے باپ کی تکلیف سے آگاہ کیا اور رحم کرنے اور بنیامین کو واپس لوٹانے کی درخواست کی۔ اس پر حضرت یوسفؑ نے ان سے پوچھا کہ تم لوگوں نے یوسفؑ کے ساتھ کیا سلوک کیا اور بنیامین پر کس کس طرح سے ظلم ڈھائے۔ یہ فرماتے ہوئے حضرت یوسف مسکرائے تو انہوں نے یوسفؑ کو پہچان لیا اور پوچھا کہ کیا آپ ہی یوسف ہیں۔ اس پر آپؑ نے فرمایا کہ ہاں اور یہ بنیامین میرا بھائی ہے۔ بے شک اللہ نے ہم پر احسان فرمایا ہے اور جو کوئی پرہیزگاری اختیار کرتا اور صبر کرتا ہے تو اللہ نیکوکاروں کی نیکیاں ضائع نہیں فرماتا اور وہ سب مہربانوں سے بڑھ کر مہربان ہے۔ اس پر وہ سخت شرمندہ ہو کر معافی مانگنے لگے تو آپؑ نے انہیں معاف فرما دیا اور فرمایا کہ میرا یہ کرتہ لیجاؤ اور اسے میرے والد کے منہ پر ڈالو (یعنی انکی آنکھوں سے لگاؤ) ان کی آنکھیں کھل (کر ٹھیک ہو) جائیں گی۔ اور اپنے تمام گھر والوں کو میرے پاس لاؤ۔ تب یہ لوگ خوشی خوشی واپس اپنے والد کے پاس پہنچے اور یوسفؑ کے زندہ ہونے کی خوشخبری سنائی جونہی قمیص یوسفؑ انکے چہرہ پر ڈالی انکی بینائی لوٹ آئی اور آپؑ نے بے ساختہ فرمایا' میں نہ کہتا تھا کہ مجھے اللہ کی وہ شانیں معلوم ہیں جو تم نہیں جانتے۔ پھر وہ سب اپنے باپ سے معافی مانگنے لگے اور اقرار کیا کہ ہم خطاوار ہیں۔ حضرت یعقوبؑ نے فرمایا میں اپنے رب سے تمہاری بخشش چاہوں گا بیشک وہی بخشنے والا مہربان ہے۔

حضرت یوسفؑ نے اپنے والد اور اہل وعیال کو بلوانے کیلئے دو سو سواریاں اور بہت سا ساز و سامان بھائیوں کے ہمراہ روانہ کیا تھا۔ جب بلوائے گئے سب حضرات مصر کے قریب پہنچنے والے تھے آپؑ انکے شاہانہ استقبال کیلئے اپنی فوج کے چار ہزار لشکریوں اور بہت سے سواروں سمیت استقبال کیلئے نکلے' جو صد ہا ریشمی پھریرے لہراتے قطار باندھے روانہ ہوئے۔ جب حضرت یعقوبؑ نے یہ منظر دیکھا تو اپنے بیٹے یہوداہ سے پوچھا کہ کیا یہ فرعونِ مصر ہے جسکا لشکر اس شان وشوکت سے آرہا ہے۔ عرض کیا نہیں یہ حضور کے فرزند یوسف ہیں جو آپؑ کے استقبال کیلئے آئے ہیں۔ چالیس سال بعد باپ بیٹے کی ملاقات ہوئی۔ عجیب منظر تھا دونوں ایک دوسرے سے گلے مل کر دیر تک روتے رہے۔ پھر اُس مزین فرودگاہ میں

آئے جو پہلے سے آپ کے استقبال کیلئے نفیس خیمے نسب کروا کر آراستہ کی گئی تھی۔ بعدازاں دوسرا دخول شہر مصر میں ہوا۔ بعدازاں محل تشریف لیجائی گئی تو انہوں نے اپنے ماں باپ کی تکریم کیلئے انکو اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا۔ پھر وہ سب حضرت یوسفؑ کی تعظیم میں انکے رُوبرو سجدہ میں گر گئے۔ (کیونکہ انکی شریعت میں سجدہ تعظیمی جائز تھا مگر اسلام میں یہ بھی جائز نہیں)۔

حضرت یعقوبؑ نے اپنے فرزند حضرت یوسفؑ کے پاس مصر ہی میں اپنی بقیہ زندگی گزاری جو نہایت آرام و سہولت سے گزری اور ایک سو سینتالیس سال کی عمر میں انتقال فرما کر اپنی وصیت کے مطابق ارض مقدس شام میں اپنے والد حضرت اسحاقؑ کی قبر کے ساتھ دفنائے گئے۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ اسی روز حضرت یوسفؑ کے چچا عیسو بھی انتقال کر گئے جو پیدا بھی ایک ہی دن ہوئے تھے اور وفات بھی ایک ہی دن ہوئی اُن دونوں بھائیوں کو دفن بھی ایک ہی قبر میں کیا گیا۔

حضرت یوسفؑ اپنے والد گرامی کی وفات کے بعد تئیس سال زندہ رہے پھر آپؑ نے انتقال فرمایا۔ قرآن نے آپؑ کی ایک دعا بھی بیان فرمائی ہے کہ ''اے رب' اے آسمانوں اور زمین کے بنانے والے مجھے مسلمان اٹھا اور ان سے ملا جو تیرے قربِ خاص کے لائق ہیں''۔ وفات کے بعد آپؑ کی جائے تدفین کے بارے اہل مصر کے اندر سخت اختلاف پیدا ہو گیا۔ کیونکہ ہر محلّہ اور ہر علاقہ حصول برکت کیلئے اس پر اصرار کرتا کہ انکی قبر ہمارے ہی علاقہ اور محلّہ میں بنائی جائے۔ بلآخر یہ رائے طے پائی کہ آپؑ کو دریائے نیل میں دفن کر دیا جائے تا کہ اس کا پانی آپؑ کی قبر مبارک کو چھو کر گزرے اور یوں تمام اہل مصر اس سے فیضیاب ہوں۔ چنانچہ آپؑ کو سنگ رُخام یا سنگ مرمر کے ایک صندوق میں دریائے نیل کے اندر دفن کیا گیا۔ چار سو سال بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آپؑ کے تابوت کو دریا سے نکالا اور آپکے آبائے کرام کے پاس ملک شام میں دفن کیا۔

علامہ ترمذی فرماتے ہیں کہ دیگر انبیاء کے جو قصے قرآن مجید میں ہیں وہ متفرق طور پر بیان ہوئے ہیں مثلاً حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ کم سے کم بارہ سورتوں میں' حضرت نوح علیہ السلام کا چھ سورتوں میں' حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اٹھارہ سورتوں میں' حضرت لوط علیہ السلام کا نو سورتوں میں' حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتیس سورتوں میں' حضرت شعیب علیہ السلام کا تین سورتوں میں' حضرت عزیر

Grave of Prophet Yousuf (A.S) Palestine

علیہ السلام کا دو سورتوں میں، حضرت سلیمان علیہ السلام کا چار سورتوں میں، حضرت داؤد علیہ السلام کا پانچ سورتوں میں، حضرت ذکریا علیہ السلام کا تین سورتوں میں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر نو سورتوں میں آیا ہے۔ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر قرآن حکیم میں ایک مکمل سورۃ یعنی سورۂ یوسف میں آیا ہے۔ البتہ سورہ انعام/ ۸۶ میں بہت سے انبیاء کے اسمائے گرامی کے ساتھ صرف آپؑ کے نام مبارک کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام

انبیائے کرام کی تاریخ میں آپ کا نام صبر جیسی اہم صفت سے متصف ہے۔ جہاں کہیں صبر کا ذکر ہوتا ہے اہل علم کے اذہان میں لامحالہ صبر ایوب ایک مجسم تصویر کی طرح سامنے آجاتا ہے۔ مورخین کے بیان کے مطابق آپ عیسو ادوم بن اسحاق علیہ السلام کے خاندان سے تھے اور آپ کا قبیلہ عوض تھا' جو آپ ہی کی اولاد سے تھا۔ یوں تو عیسو کی اولاد کثیر تعداد میں ہوئی لیکن عمالق اور عوض بہت مشہور ہوئے۔ انکے خاندان کو ادوم بھی کہا جاتا ہے جس کے معنی سرخ کے ہیں۔ جب عیسو پیدا ہوئے تو انکے جسم کا رنگ سرخ تھا اور جسم پر بال تھے۔ دوسرے کوہِ شعیر یا سراۃ' جس کو آپ نے اپنا مسکن بنایا وہاں کی مٹی کا رنگ بھی سرخ تھا جس کی وجہ سے عیسو نام کے ساتھ ادوم بھی منسلک ہوگیا اور آپ عیسو ادوم بن حضرت اسحاؑق کہلوائے۔ حضرت ایوبؑ انہی عیسو ادوم کے خاندان سے پیدا ہوئے۔

رفتہ رفتہ یہ خاندان پوری ایک قوم میں تبدیل ہوگیا جس نے سترہ سو قبل مسیح تک ایک زبردست حکومت قائم کرلی تھی۔ یہاں کے بادشاہوں کی حکومت موروثی نہیں تھی بلکہ انکا انتخاب مختلف قبائل سے ہوتا تھا۔ اسرائیلی تسلط سے پہلے یہاں کم وبیش آٹھ سلاطین گزر چکے تھے جن کے نام بالع بن بعور' یوباب بن زرح' حشام' ہدوین بدو' شملہ' ساؤل' بعلمنان بن عکبو راور ہدر تھے۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے ارض القرآن جلد ۲ صفحہ ۳۴ میں عوض قبیلہ کا سلسلہ نسب یہ بیان کیا ہے:۔ عوض بن ویسان بن عیسو ادوم بن اسحاؑق بن ابراہیمؑ۔ توریت کی تصریح کے مطابق ویسان عیسو ادوم کی اولاد نہیں بلکہ وہ شعیر حوری کا بیٹا تھا اور بنی شعیر کے متعلق یہ بتایا ہے کہ وہ اُس ملک کے باشندے تھے جہاں عیسو ادوم نے حضرت یعقوبؑ سے مفارقت کے بعد توطن اختیار کیا تھا۔

توریت میں حضرت ایوبؑ کا نام بوباب مذکور ہے اور زمانہ حیات ایک ہزار سال یا سات سو سال قبل مسیح کے درمیان ہے۔ عبرانی زبان میں آپؑ کا نام اوبؔ ہے توراۃ میں (JOB) اور قرآن میں ایوبؑ ہے۔ حضرت یوسفؑ کے بیٹے افراہیم کی دختر نیک اختر بی بی رحمت آپؑ کی زوجہ محترمہ تھیں۔ آپؑ کے وطن کے بارے کہا جاتا ہے کہ ادومیوں کے جدامجد عیسو ادوم نے کنعان سے ہجرت کر کے کوہ

شعیر یا کوہِ سراۃ کے دامن میں اپنا ایک مسکن بنالیا تھا۔ کوہ شعیر یا کوہ سراۃ عرب کے شمال مغرب میں خلیج عقبہ کے درمیان طولاً واقع ہے۔ یہ وہی قطعہ زمین ہے جسے یونانی تحریروں میں ادومیہ اور توریت میں ادوم کہا گیا ہے۔ اسکے شمال میں بحر میت (بحر مردار) شمال مغرب میں فلسطین، جنوب میں خلیج عقبہ اور مدین، جنوب مغرب میں جزیرہ نمائے سینا اور ارض عمالقہ اور جنوب مشرق میں ریگستانِ عرب ہے۔ یہی مقام ''ادومیہ'' حضرت ایوبؑ کا وطن ہے۔ توراۃ میں آپؑ کا مسکن بُصری بتایا گیا ہے جو اب تک عرب میں فلسطین کے قریب ایک مشہور شہر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر شام کے دوران وہاں قیام بھی فرمایا تھا۔

مفسرین کا بیان ہے کہ آپؑ ایک شاہانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ آپکے پاس تین ہزار گھوڑے، تین ہزار اونٹ، ایک ہزار بکریاں، سات ہزار بھیڑیں، پھلوں کے بہت سے باغات اور پانچ سو ہل کی کھیتی تھی اور انکی دیکھ بھال کیلئے پانچ سو کے قریب غلام تھے۔ پھر بھی سخاوت اور عبادت کبھی ترک نہ ہوئی۔

اللہ تعالیٰ نے جب آپؑ کو ایک سخت آزمائش سے گزارا تو آپؑ کے تمام غلہ خانوں میں اچانک آگ لگ گئی اور تمام مال واسباب جل کر راکھ ہوگیا۔ اولاد جو ہر شئے سے پیاری ہوتی ہے ایک مکان کے حادثہ میں دب کر ہلاک ہوگئی۔ لیکن آپ مجسم تسلیم ورضا نکلے اور اللہ تعالیٰ کا صبر وشکر ہی کرتے رہے۔ آپؑ کے ایمان وایقان میں ذرا بھی لغزش نہ آئی۔ آپؑ حالت آسودگی و دولتمندی میں بھی اللہ تعالیٰ کا ہر دم شکر کیا کرتے اور ہر قسم کی زیادتی و برائی سے دور رہتے تھے اور اب بھی یہی حال تھا۔ پھر جب زندگی کی ساری مصیبتیں اُن پر آن پڑیں، آپؑ کے مویشی لوٹ لئے گئے نوکر چاکر قتل ہوگئے اور جو باقی بچے وہ بھی ایسی حالت میں آپ کو چھوڑ کر بھاگ گئے، اولاد مرگئی، جاہ وحشم نابود ہوگیا اور زندگی کی خوشحالیوں میں سے کوئی چیز بھی باقی نہ رہی۔

یہ سب کچھ بتدریج بھی نہیں ہوا بلکہ آناً فاناً حالات نے پلٹا کھایا اور اچانک آپؑ کی دنیا کچھ سے کچھ ہوگئی اور جب بھی کوئی ایسی خبر ملتی کلمہ صبر وشکر ہی ادا فرماتے رہے۔ آپؑ کا فرمانا تھا کہ میں ماں کے پیٹ سے برہنہ پیدا ہوا تھا اور برہنہ ہی جاؤں گا۔ میرے پاس جو کچھ تھا میرے رب ہی نے عطا فرمایا تھا اور اب اگر اس نے واپس لے لیا ہے تو اس میں شکوہ یا شکایت کیسی۔

سب کچھ جا چکا تھا صرف جسم کی تندرستی باقی رہ گئی تھی سو اب اس نے بھی جواب دینا شروع کر دیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آپؑ کے پاؤں کے تلووں سے لیکر سر کی چاندی تک سارے جسم میں جلتے ہوئے پھوڑے نکل آئے۔ پھوڑوں میں زخم بن گئے اور تمام جسم شریف میں آبلے پڑ گئے' جن میں ہمہ وقت سخت قسم کی خارش ہوتی رہتی اور آپؑ ایک ٹھیکری ہاتھ میں لئے جگہ جگہ کھجاتے رہتے۔ جسم سے زخموں کے گلنے سڑنے کے باعث سخت ناگوار بدبو اٹھا کرتی جسکے باعث سوائے آپؑ کی بیوی کے کوئی قریب بھی نہ پھٹکتا تھا۔ مگر اس اذیت ناک تکلیف پر بھی آپ کی زبان مبارک سے ناشکری یا کلمہ شکایت کبھی نہ نکلا۔ ایک موقع پر آپ کی بیوی کو آنے میں تاخیر ہوگئی تو آپ نے قسم کھائی کہ اسے سو ضربیں لگاؤں گا۔ بعد ازاں جب وجہ تاخیر معقول پائی تو اپنی قسم کی فکر دامن گیر ہوئی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے حکم فرمایا کہ اپنی قسم نہ توڑ اور یوں کر کہ سو تنکوں والا جھاڑو لیکر اپنی بیوی کو مارو تا کہ اسے تکلیف بھی نہ پہنچے اور تیری قسم بھی پوری ہو جائے۔ اپنی تکالیف پر صبر کے ساتھ ساتھ اپنے رب کی رحمت کو دیکھتے ہوئے دامن امید بھی کبھی ہاتھ سے نہیں چھوٹا تھا۔ آخر ایک موقع پر ان تکلیفوں سے نجات اور امداد طلبی کیلئے اپنے پروردگار سے جو التجاء کی اسے قرآن نے یوں بیان فرمایا:

وَ اَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗۤ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ (۸۳) فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّ اٰتَیْنٰهُ اَهْلَهٗ وَ مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ ذِكْرٰی لِلْعٰبِدِیْنَ (۸۴) (سورۃ: الانبیاء)

ترجمہ: ''اور ایوب (کے معاملہ) کو یاد کرو جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے تکلیف پہنچی اور تو سب مہربانوں سے بڑھ کر مہربان ہے (الانبیاء/۸۳) تو ہم نے اس کی دعا سن لی' پس ہم نے دُور کر دی جو تکلیف اسے تھی اور ہم نے اسے اسکے گھر والے اور انکے ساتھ اتنے ہی اور عطا کئے اپنی طرف سے رحمت فرماتے ہوئے اور (اس معاملہ کو) بندگی (کرنے) والوں کیلئے نصیحت (آموز) بنایا'' (الانبیاء/۸۴)

قبولیت دعا کے بارے مفسرین نے بیان فرمایا ہے کہ حضرت ایوبؑ کو حکم ہوا کہ زمین پر پاؤں ماریں جب پاؤں زمین پر مارا تو وہاں سے ایک چشمہ پھوٹ پڑا جس میں آپ نہائے اس سے تمام

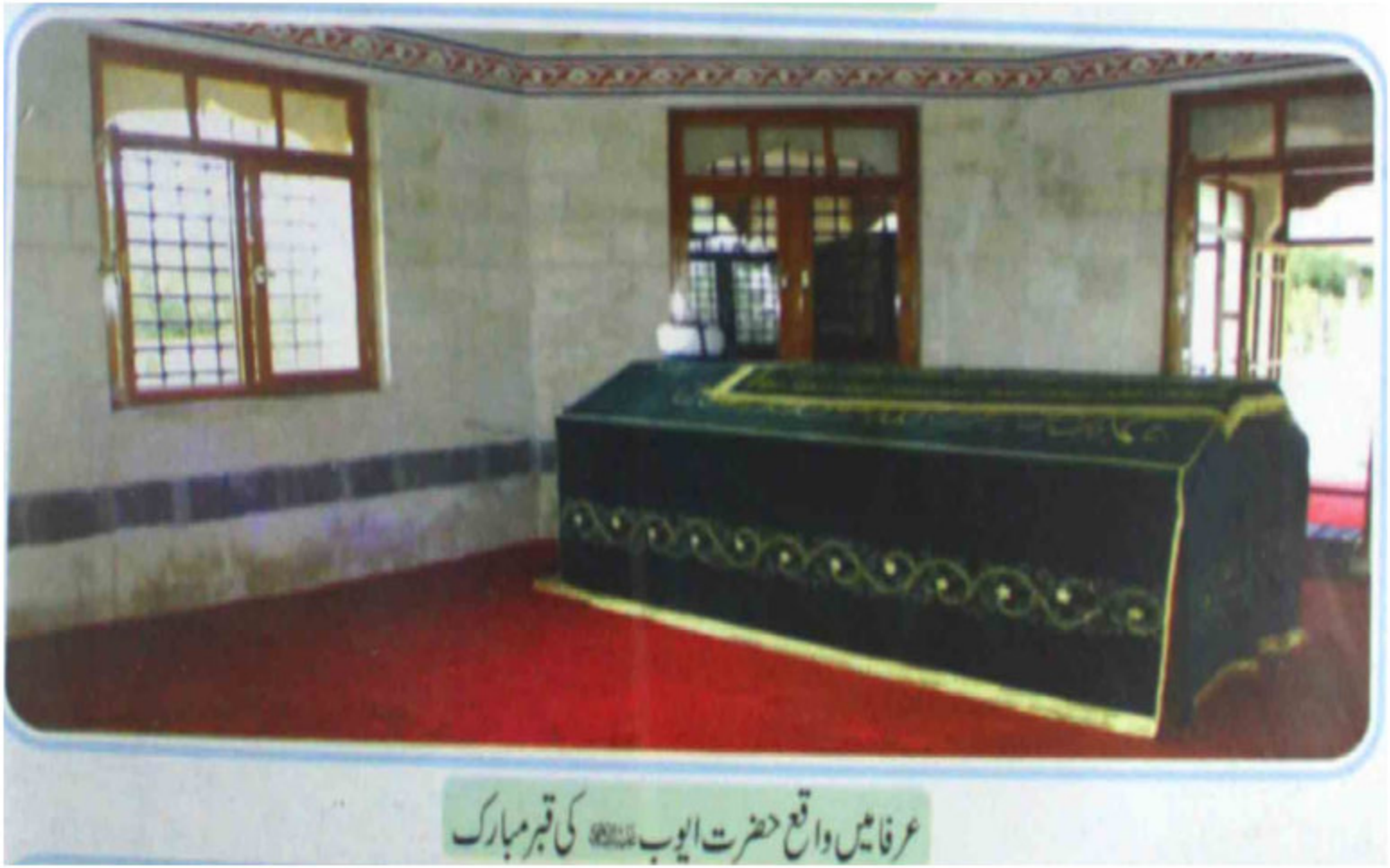

عرفا میں واقع حضرت ایوب علیہ السلام کی قبر مبارک

جسمانی بیماریاں دُور ہوگئیں۔آپؑ چالیس قدم زمین پر چلے تو حکم ہوا کہ پھر پاؤں زمین پر ماریں چنانچہ دوسرا چشمہ جاری ہوگیا آپؑ نے اس میں سے پانی پیا تو تمام اندرونی بیماریاں بھی رفع ہوگئیں۔پھر آپ کو اللہ تعالیٰ نے پہلے سے زیادہ اولاد اور اموال عطا فرمائے۔

حضرت ایوبؑ ادومی قبائل کی طرف مبعوث ہوئے۔اللہ تعالیٰ نے آپ کو عزت واحترام اور جاہ وحشم سے نوازا تھا۔آپ نے ایک سو چالیس سال عمر پائی اور اپنے بیٹوں اور پوتوں کو چار پشتوں تک دیکھا۔توریت میں ایک مکمل صحیفہ ''سفر ایوب'' کے نام سے موجود ہے اور قرآنِ حکیم میں آپ کا ذکر ان آیات میں آیا ہے:۔

سورہ النساء/۱۶۳

سورۃ الانعام/۸۵

سورۃ الانبیاء/۸۳،۸۴

سورۃ صٓ /۴۱ تا ۴۴

حضرت شعیب علیہ السلام

حضرت شعیب علیہ السلام مدین اور اصحاب الایکہ کی طرف مبعوث ہوئے۔ مدین کسی مقام کا نام نہیں بلکہ ایک قبیلے کا نام ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے ایک بیٹے مدین کی نسل سے تھا (جو حضرت ابراہیمؑ کی تیسری بیوی قطورا سے پیدا ہوئے) اس مناسبت سے حضرت ابراہیمؑ کا یہ خاندان بنی قطورا بھی کہلایا۔ مدین اپنے اہل وعیال سمیت اپنے سوتیلے بھائی حضرت اسماعیلؑ کے قریب ہی حجاز میں آباد ہوگئے تھے۔ یہی خاندان آگے چل کر ایک بڑا قبیلہ بن گیا جو لوٹ مار اور ماپ تول میں خیانت جیسی اخلاقی برائیوں میں مبتلاء ہو چکا تھا اور عقیدتاً درختوں اور بتوں کی پرستش جیسے شرک میں مبتلاء تھا۔ چنانچہ اس قبیلہ کی طرف حضرت شعیبؑ کو مبعوث فرمایا گیا جو اسی نسل اور قبیلہ کے ایک فرد تھے۔ یہی قبیلہ بعد ازاں ایک قوم کے رُوپ میں ابھرا جو قومِ شعیب کے نام سے مشہور ہوئی۔

حضرت شعیبؑ کے نسب کے بارے مفسرین میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ نیز یہ کہ مدین اور اصحاب ایکہ آیا ایک ہی قوم ہے یا دو مختلف گروہ ہیں۔ اس ضمن میں حافظ عماد الدین ابن کثیر کا خیال ہے کہ ''ایکہ'' ایک جنگل یا جھاڑیوں کے جھنڈ کا نام ہے۔ اہل قبیلہ چونکہ اسکی پرستش کیا کرتے تھے اسلئے اس نسبت سے اصحاب مدین کے اس گروہ کو اصحاب ایکہ کہا گیا۔ آپؑ کے نسب کے بارے علامہ مسعودی کا خیال ہے کہ: حضرت شعیبؑ مشہور قبیلہ مدیان کے ایک سردار محضر ابن جندل ابن یعصب ابن مدین کے ایک نسبی بھائی ہیں۔ ابن حبیب نے ''کتاب البدء'' میں آپکو نویب ابن حزم ابن مدین کا بیٹا لکھا ہے۔ علامہ سہیلی کے خیال میں آپؑ ابن عیفا ابن مدین تھے۔

ابن جوزی نے شعیبؑ بن عیفا ابن ثویب ابن مدین لکھا ہے۔ ابن اسحاق نے شعیب ابن میکائیل تحقیق کیا ہے۔ علامہ ابن خلدوم کے مطابق نسب نامہ شعیب ابن نویل ابن رعویل ابن عیا ابن مدین ہے۔

تہذیب الاسماء میں شعیبؑ بن میکائیل ابن یثخب ابن مدین ابن ابراہیم علیہ السلام لکھا ہے۔ اور بعض آپؑ کو اولادِ صالح علیہ السلام بتاتے ہیں۔

صاحب شمس العلوم نے آپکو قوم حمیر میں سے شمار کیا ہے اور کہا ہے کہ آپ کی والدہ محترمہ

حضرت لوط علیہ السلام کی دختر نیک اختر تھیں ۔ ابراہیمؑ کا بیٹا ''مدین'' (جسکے نکاح میں بنت لوط علیہ السلام آئیں) شام کے بڑے بڑے قبیلوں کا مورث اعلیٰ تھا اور وہ تمام قبائل اسی کے نام سے مدیانی مشہور ہوئے ۔ بعد میں یہ قبائل بت پرست و خائن ہوگئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کیلئے حضرت شعیبؑ کو مامور فرمایا۔ حضرت شعیبؑ نہایت فصیح السان تھے اس بناء پر آپ شیخ الانبیاء اور خطیب الانبیاء لقب رکھتے تھے۔ آپؑ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سسر بھی ہیں ۔ جب موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکل کر مدین پہنچے تو کچھ مدت حضرت شعیبؑ کی خدمت میں رہے اور پھر انکی بیٹی حضرت صفورہ سے نکاح کیا۔

اس قوم کے اصل محل وقوع کے بارے عبدالوہاب بخّار کہتے ہیں کہ یہ حجاز میں شام کے متصل علاقہ میں ایسی جگہ آباد تھا جس کا عرض البلد افریقہ کے جنوبی صحرا کے عرض البلد کے مطابق پڑتا ہے۔ بعض کے نزدیک شام کے متصل معان کے حصہ میں آباد تھا۔ قرآن حکیم کی تصریح کے مطابق قوم لوط اور قوم مدین دونوں بڑی شاہراہ پر آباد تھے ۔ عرب کے جغرافیہ میں جو شاہراہ حجاز کے تاجر قافلوں کو شام' فلسطین' یمن بلکہ مصر تک لے جاتی اور بحیرہ قلزم کے مشرقی کنارے سے ہوکر گزرتی تھی' قرآن اسکو امام مبین (کھلی اور صاف شاہراہ) فرماتا ہے۔ کیونکہ سردی و گرمی کے ہر دو موسموں میں قریش کے قافلوں کیلئے یہ ایک متعارف اور بڑی تجارتی سڑک تھی جس کا سلسلہ برّی مسافت کے ساتھ ساتھ بحری راستوں کے ڈانڈے بھی ملا دیتا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ اصحابِ ایکہ (یعنی جھنڈ والے) تھے ۔ عربی میں ''ایکہ'' ان سرسبز و شاداب جھاڑیوں کو کہتے ہیں جو گنجان درختوں کے بیچوں بیچ جنگلوں میں اگی رہتی اور جھنڈ کی شکل اختیار کر لیتی ہیں ۔

''ان دونوں باتوں کو جان لینے کے بعد مدین کے مقام کا پتہ آسانی سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ کہ مدین یا اصحاب الایکہ کا قبیلہ بحر قلزم کے مشرقی کنارے اور عرب کے مغربی شمال میں ایسی جگہ آباد تھا جو شام کے متصل حجاز کا آخری حصہ کہلا سکتا ہے اور حجاز والوں کو شام' فلسطین بلکہ مصر تک دونوں جانب اسکے کھنڈرات راستہ میں پڑتے تھے جو تبوک کے بالمقابل واقع تھا''۔ (معجم البلدان جلد ۵ ص ۴۱۸)

اہل مدین جس قدر متمول اور خوشحال تھے اسی قدر حریص اور خائن تھے۔ حضرت شعیبؑ کا

پیشہ اپنے فرض منصبی پر فائز ہونے سے قبل بھی چوپانی (بھیڑ بکریاں پالنا) تھا۔قبل ازیں بھی آپؑ اپنی قوم کو انکے واہیات طرز عمل پر تنبیہ کیا کرتے اور ان کے وطیرہ پر اپنی ناگواری کا احساس دلاتے رہتے تھے' اب زیادہ وقت انکو تبلیغ و نصیحت کرنے پر خرچ کرنے لگے۔آپ نے بارہا انہیں تلقین کی کہ وہ بددیانتی اور خیانت کو ترک کردیں اور شرکیہ عقائد سے تائب ہوکر خدائے واحد کی عبادت کریں' مگر وہ باز نہ آئے بلکہ آپ کی مخالفت پر کمربستہ ہوگئے' یہاں تک کہ قتل کی دھمکیاں دینے لگے۔

اس قوم کی اخلاقی حالت بہت پست تھی یہاں تک کہ شرفائے قوم کی بیٹیاں بھی اخلاق کا بدترین نمونہ تھیں۔توریت کی تصریح کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے بڑھتے ہوئے اقتدار کا مقابلہ جب مرد اپنی قوت بازو سے نہ کرسکے تو قوم کی عورتیں میدان میں نکل آئیں اور انہوں نے بنی اسرائیل کے سرداروں کو اپنے دامِ تزویر میں پھانس کر احسن الخالقین سے برگشتہ کردیا۔یہ عورتیں سرعام فحش حرکات کی مرتکب ہوتیں جس نے ایک فتنہ کا روپ دھارلیا تھا جو اس قدر بڑھا کہ ایک مدیانی عورت سرعام سب کے سامنے ایک اسرائیلی لڑکے سے مصروفِ معصیت ہوگئی اور بالآخر حضرت ہارونؑ کے پوتے الیعزر کے بیٹے فنحاس نے اٹھ کر ان دونوں کو خنجر سے ہلاک کیا۔(سفر العدد باب ۲۵/۱تا۸)

مذہبی اعتبار سے یہ قوم شرک و بت پرستی میں مبتلاء تھی۔ان کا سب سے بڑا دیوتا بعل تھا جس کے لئے عطر' لوبان اور نجورات جلائے جاتے تھے اور اس پر نذریں چڑھائی جاتی تھیں۔سب سے بڑی قربانی یہ تھی کہ اسکی خوشنودی کیلئے اپنی اولاد تک کو آگ میں ڈال دیا جاتا تھا۔یہ ''بعل'' وہی دیوتا ہے جس کا ذکر قرآن حکیم میں بھی آیا ہے کہ: ''تم بعل کو (برائے عبادت) پکڑتے ہو اور احسن الخالقین کو چھوڑتے ہو''۔علامہ سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں:

> ''مستشرقین یورپ کی تحقیق کے مطابق بعل دراصل ستارہ زحل کا نام تھا جس کی دوسری مانوس شکل ''ہبل'' ہے۔مدین میں اسکی پوجا ہوتی تھی اور ایبل (اونٹ) کی قربانی اس کیلئے سب سے بہتر سمجھی جاتی تھی''۔(ارض القرآن جلد۲ صفحہ ۱۷۷)

حضرت شعیبؑ اپنی قوم کی بداعمالیوں اور مشرکانہ عقائد پر سخت رنجیدہ ہوتے اور انکے متوقع انجام سے بےکل رہتے۔آپؑ نے انہیں ہر طرح سمجھانے کی کوشش کی' خدائے واحد کی طرف بلایا اور

اسکے احکام وتعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی جیسا کہ سورۃ اعراف/۸۵ میں ہے:۔

وَ اِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا ط قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ط قَدْ جَآءَتْکُمْ بَیِّنَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ فَاَوْفُوا الْکَیْلَ وَ الْمِیْزَانَ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَھُمْ وَ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِھَا ط ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ج ()

(الاعراف:۸۵)

''اور مدین کی طرف انکی برادری سے شعیبؑ کو بھیجا (جنہوں نے) کہا اے قوم خدا ہی کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں بیشک تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے روشن دلیل آئی (جس سے میری نبوت ورسالت یقینی طور پر ثابت ہوتی ہے) پس (خرید و فروخت میں) ناپ اور تول کو پورا رکھو اور لوگوں کو چیزیں گھٹا کر نہ دو اور زمین میں انتظام کے بعد فساد نہ پھیلاؤ۔ یہی تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم ایمان لاؤ (الاعراف:۸۵)

مگر اس بد بخت قوم پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ الٹا وہ حضرت شعیبؑ کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آنے لگے اور جان سے مار ڈالنے کی دھمکیاں دیتے۔ جو چند لوگ ایمان لائے تھے وہ جب حضرت شعیبؑ کو ملنے اور احکام الٰہیہ دریافت کرنے جاتے تو کافر سردارانِ قوم راستوں میں بیٹھ جاتے اور انہیں پٹیاں پڑھاتے کہ اگر شعیبؑ کے پیچھے چلے تو ضرور خسارہ میں رہو گے۔ پھر انکے انکار پر ان مسلمانوں کو دھمکیاں دیتے' مار پیٹ کرتے اور زبردستی ان کو روکنے کی کوشش کرتے۔ جسے قرآن نے اسی سورۃ کی آیت ۸۶ میں بیان فرمایا:

وَ لَا تَقْعُدُوْا بِکُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ بِہٖ وَ تَبْغُوْنَھَا عِوَجًا ج وَاذْکُرُوْٓا اِذْ کُنْتُمْ قَلِیْلًا فَکَثَّرَکُمْ ص وَانْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الْمُفْسِدِیْنَ (اعراف :۸۶)

(ترجمہ) ''اور ہر راستہ پر یوں نہ بیٹھو کہ راہگیروں کو ڈراؤ اور اللہ کی راہ سے انہیں روکو جو اس پر ایمان لائے اور اس میں کجی چاہو (کہ یہ بھی شعیبؑ کے دین سے پھر جائیں یا ان میں بگاڑ پیدا ہو جائے) اور یاد کرو جب تم تھوڑے تھے اس نے تمہیں بڑھا دیا (جو کہ مقام شکر ہے نہ کہ

باعث سرکشی) اور دیکھو فسادیوں کا کیسا انجام ہوا (یعنی نصیحت پکڑو کہ سابقہ نافرمان کتنی ہی اقوامؑ انبیاء اور ایمان لائے لوگوں کو ستانے اور ان پر ایمان نہ لانے کی پاداش میں کیونکر عذاب الٰہی کا شکار ہوئیں) (اعراف:۸۶)

مگر اہل مدین نے اپنی روش نہ بدلی۔ آخر کار تنگ آ کر آپؑ نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھائے کہ اب تو ہی ان لوگوں کا علاج فرما۔ جب کوئی قوم اپنے نبی و پیغمبر کی بے حرمتی اور اللہ تعالیٰ کے نمائندگان سے زیادتی پر اتر آتی ہے تو اس قوم پر عذاب الٰہی کا نزول لازم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس سے قبل کہ اہل مدین پر عذاب نازل ہوتا آپؑ اپنے ایمان لائے ساتھیوں کو لے کر شہر سے دُور نکل گئے۔ آپؑ کے نکل جانے کے بعد لوگ ابھی سو رہے تھے کہ اس قوم پر شدید زلزلے کا عذاب آیا۔ یہ ہولناک زلزلہ ابھی ختم بھی نہ ہوا تھا کہ اوپر سے آگ کی بارش برسنے لگی۔ سورۃ اعراف میں فرمانِ قرآن ہے:۔

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ج (۹۱) اَلَّذِیْنَ كَذَّبُوْا شُعَیْبًا كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا ج اَلَّذِیْنَ كَذَّبُوْا شُعَیْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِیْنَ (۹۲)

(ترجمہ) ''تو انہیں زلزلہ نے آلیا تو صبح اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے (۹۱) اور انکا یہ حال ہو گیا گویا وہ کبھی ان گھروں میں رہتے ہی نہ تھے (جو مسلمانوں کو کہتے تھے کہ شعیبؑ کی اطاعت کر کے نقصان میں رہو گے وہ یہ دیکھنے کو موجود ہی نہ رہے کہ) شعیبؑ کو جھٹلانے والے ہی تباہی و خسارہ میں پڑے'' (اعراف/۹۱تا۹۲)

سورۃ ہود آیت/۹۴ میں قوم شعیب پر عذاب کی صورت ایک چنگھاڑ بھی بیان فرمائی ہے۔ مفسرین کا اس ضمن میں کہنا ہے کہ قتادہ کے قول کے مطابق حضرت شعیبؑ کو اصحاب ایکہ کی طرف بھی مبعوث فرمایا گیا تھا اور اہل مدین کی طرف بھی۔ اصحاب ایکہ تو گرم ابر کی بارش سے ہلاک ہوئے اور اہل مدین زلزلہ اور ہولناک چنگھاڑ سے ہلاک ہوئے۔ اصحابِ ایکہ کے بارے سورۃ الشعرأ میں وہ مذکور ہے جو ہوشمند اور عبرت حاصل کرنے والوں کیلئے کسی مخفی خزانے کے نقشہ سے کم نہیں۔

كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْـَٔیْكَةِ الْمُرْسَلِیْنَ ج (۱۷۶) اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَیْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ج (۱۷۷) اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ لا (۱۷۸) فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ج (۱۷۹) وَ

مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۱۸۰) اَوْفُوا الْكَيْلَ وَ لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ۚ (۱۸۱) وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۚ (۱۸۲) وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۚ (۱۸۳) وَ اتَّقُوا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَ الْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ ۝ (۱۸۴) قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۙ (۱۸۵) وَ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَ اِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۚ (۱۸۶) فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (۱۸۷) قَالَ رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۱۸۸) فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۱۸۹) (الشعراء: ۱۷۶ تا ۱۸۹)

(تراجم) ''اصحاب ایکہ نے رسولوں کو جھٹلایا (۱۷۶) جب ان سے شعیبؑ نے فرمایا کیا تم کو خدا کا خوف نہیں (۱۷۷) بیشک میں تمہارے لئے اللہ کا امانت دار رسول ہوں (۱۷۸) پس اللہ سے ڈرو اور میرا حکم مانو (۱۷۹) اور میں اس پر تم سے کچھ اجرت یا معاوضہ بھی نہیں مانگتا میرا اجر تو اسی پر ہے جو سارے جہان کا رب ہے (۱۸۰) تو ناپ اور تول پورا کرو اور گھٹانے والوں میں سے نہ ہو (۱۸۱) اور ترازو سیدھی رکھ کر تولو اور لوگوں کی چیزیں کم کر کے نہ دو اور زمین میں فساد پھیلاتے نہ پھرو (۱۸۳) اور اس سے ڈرو جس نے تم کو پیدا کیا اور (تم سے پہلے گزر چکی) اگلی مخلوق کو (۱۸۴) (اس پر) کہنے لگے (لگتا ہے کہ) تم پر جادو ہوا ہے (جو ایسی باتیں کر رہے ہو ورنہ) (۱۸۵) تم ہماری طرح ہی کے بشر ہو اور بلاشبہ ہم تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں (۱۸۶) اگر تم واقعی اپنی بات میں سچے ہو تو لاؤ ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا لا گراؤ (۱۸۷) (اس پر حضرت شعیبؑ نے) فرمایا میرا رب خوب جانتا ہے جو تم کرتوت ہیں (۱۸۸) پس جب انہوں نے اسے جھٹلایا تو انہیں شامیانے والے دن کے عذاب نے آلیا۔ بیشک وہ بڑے دن کا عذاب تھا'' (الشعرآء/۱۷۶ تا ۱۸۹)

شامیانے والے عذاب کے بارے مفسرین بیان فرماتے ہیں کہ ان پر دوزخ کی آگ یوں ڈالی گئی کہ سخت ترین گرمی پیدا ہوگئی وہ اس سے بچنے کی کوشش میں تہہ خانوں میں چھپنے کی کوشش کرتے مگر وہاں اس سے بھی زیادہ گرمی محسوس ہوتی ۔ پھر گھبرا کر جنگلوں کا رخ کیا تو ایک بادل کے ٹکڑے نے سائبان کی طرح ان پر شامیانہ تن دیا جو ٹھنڈا تھا وہ دوسروں کو بھی اس طرف بلا کرا سکے نیچے جمع کرتے گئے تب ہی اس سے آگ برسی اور وہ سب کے سب اس میں جل کر بھسم ہوگئے ۔ پھر اہل مدین کے بارے سورۃ عنکبوت میں فرمانِ قرآن یوں ہے:۔

وَ اِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ۙ فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ ارْجُوا الْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَ لَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ(۳۶) فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ۟ (عنکبوت:۳۶تا۳۷)

(ترجمہ) ''اور مدین کی طرف انکے ہم قوم شعیبؑ کو بھیجا تو اس نے فرمایا اے میری قوم اللہ کی بندگی کرو اور پچھلے دن کی امید رکھو اور زمین میں فساد پھیلاتے نہ پھرو(۳۶) تو انہوں نے اسے جھٹلایا تو انہیں زلزلے نے آلیا تو (اگلی) صبح اپنے گھروں میں گھٹنوں کے بل پڑے رہ گئے'' (عنکبوت/۳۶تا۳۷)

اس عذاب کے بعد حضرت شعیبؑ نے کس طرف مراجعت فرمائی' اس بارے توریت اور قرآن حکیم میں کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ البتہ تاریخی واقعات کی کڑیاں ملانے سے یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ آپؑ اصحاب ایکہ اور اہل مدین پر عذاب کے بعد اپنے مومنین ساتھیوں کے ساتھ کافی دیر تک زندہ رہے۔ حضرت صفورہ کی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شادی کے وقت آپؑ کافی ضعیف اور بوڑھے ہو چکے تھے۔ اس کے بعد آپ مصر چلے گئے تھے آپ نے طویل عمر پائی آپ کا زمانہ سترویں یا سولہویں صدی قبل مسیح کا ہے۔ قرآن حکیم میں آپؑ کا ذکر چار سورتوں میں دس جگہ آیا ہے:۔

الاعراف/۸۵تا۹۲ ہود/۸۴'۸۷'۹۰'۹۵ شعراء/۱۷۷ عنکبوت/۳۶'۳۷

حضرت موسیٰ علیہ السلام

اس میں کلام نہیں کہ آپؑ خدا تعالیٰ کے پیغمبر اور جلیل القدر رسول ہیں۔آپؑ پر توراۃ نازل ہوئی اس نسبت سے آپؑ صاحب کتاب نبی تھے اور خداوند قدوس سے شرفِ ہمکلامی کی نسبت سے آپؑ کلیم اللہ جیسے اعلیٰ اعزاز سے معزز ہیں۔اللہ تعالیٰ نے آپکو انبیاء کے سچے دین کی تلقین وتبلیغ اور فرعون کی غلامی سے بنی اسرائیل کی رہائی جیسے اہم کاموں کیلئے منتخب فرمایا۔

لفظِ موسیٰ عبرانی زبان میں موشیٰ ہے جسکے معنی نجات دہندہ کے ہیں۔توریت کے سبائی نسخہ اور انجیل میں لفظ موسیٰ کی بجائے لفظ موایستر آیا ہے جس کے معنی پانی سے نکالا ہوا ہے۔چونکہ فرعون کی بیوی نے آپؑ کو پانی (دریائے نیل) سے نکالا تھا اس لئے آپ کا یہ نام رکھ دیا گیا۔ایک حسین اتفاق یہ بھی کہ اپنے نام کے مصداق آپؑ ایک پوری قوم کو پانی سے نکال کر بچالائے اس لئے یہ نام اسم بامسمّٰی ہے۔امکان غالب ہے کہ موایستر کے معنی میں یہ نسبت بھی ملحوظ ہوگی۔

توریت کے مطابق موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے روانہ ہوئے تو اس وقت تک بنی اسرائیل کو مصر میں رہتے ہوئے چار سو تیس سال گزر چکے تھے۔(خروج باب ۱۲، ۴۰) خروج کی تاریخ ۱۴۴۰ ق م ہے اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عمر شریف ۸۰ سال تھی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ۱۵۲۰ ق م میں پیدا ہوئے۔آپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ساتویں پشت میں سے تھے۔آپؑ کا نسب نامہ یوں ہے: حضرت موسیٰ بن عمران بن قاہاث بن لادی بن یعقوبؑ بن حضرت اسحٰق علیہ السلام بن حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام۔آپؑ کی والدہ ماجدہ جو ایک رفیع المرتبت خاتون تھیں جن کا نام یوکبد (JOCHEBID) تھا اور نسلی اعتبار سے وہ بنی لادی سے تعلق رکھتی تھیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت ہارونؑ کے بھائی اور عمر میں ہارونؑ سے دو تین سال چھوٹے تھے۔انکی ایک بہن بھی تھی جس کا نام مریم تھا۔آپؑ کی پیدائش کے ضمن میں قرآن میں آپکی والدہ اور بہن کا ذکر تو آیا ہے مگر والد کا ذکر نہیں آیا جس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ آپؑ بحالت یتیمی پیدا ہوئے۔آپ کی پرورش بادشاہِ وقت (فرعون) کے محل میں ہوئی۔اُس زمانے میں مصر کا ہر بادشاہ تخت نشین

ہوتے ہی فرعون لقب اختیار کر لیتا تھا۔ آپؑ جس زمانہ میں پیدا ہوئے اس وقت کے فرعون کا نام قابوس بن معصب بن ریان تھا جو ریمسس دوم کے نام سے پہچانا جاتا اور جو کردار کے لحاظ سے طبعًا بابل کے نمرود جیسا تھا۔ دونوں نے خدائی کا دعویٰ کیا' دونوں نے کاہنوں اور ستارہ شناسوں وغیرہ کے کہنے پر بہت سے نوزائدہ بچوں کو قتل کروایا۔ نمرود نے حضرت ابراہیمؑ کے اندیشۂ پیدائش میں اور فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے اندیشہ میں۔ یہ بات مشہور ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت بنی اسرائیل کی نرینہ اولاد کو قتل کرنے کا حکم عمل میں آچکا تھا۔ مورخین کا بیان ہے کہ فرعون کو بنی اسرائیل سے اس لئے عداوت ہوگئی تھی کہ اس زمانہ کے کاہنوں قیافہ شناسوں اور نجومیوں نے فرعون کو بتایا تھا کہ اس کی حکومت کو زوال آنے والا ہے جو ایک اسرائیلی لڑکے کے ہاتھوں ہوگا۔ دراصل فرعون نے خود ایک خواب دیکھا تھا اور تعبیر طلب کرنے کے جواب میں یہ جواب پایا۔ جس پر فرعون نے حکم جاری کر دیا کہ تاحکم ثانی تمام اسرائیلی لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا جایا کرے۔ البتہ یہ وہ فرعون نہیں جو بحر قلزم میں غرق ہوا تھا اور جس کی لاش کو قرآن نے باعث عبرت محفوظ رکھنے کی پیش گوئی فرمائی تھی۔ فرعونِ موسیٰ اپنے باپ ریمسس دوم کا جانشین اور اپنے باپ سے بڑھ کر ظالم وضدی تھا۔

درایں حالات حضرت موسیٰؑ کی پیدائش پر آپکی والدہ کو فکر وتشویش لاحق ہوئی اور کوئی چارہ نہ پا کر آخر کار اپنے نومولود بچے کو ایک صندوق میں بند کر کے خدا کے بھروسے سمندر میں بہا دیا۔ قدرتِ خداوندی کہ یہ صندوق تیرتے ہوئے فرعون کے محل کے کنارے آلگا۔ جہاں سے آسیہ نامی فرعون کی ایک زوجہ نے اسے نکلوا کر دیکھا تو اس بچے کو خود پالنے کا قصد کر لیا۔ فرعون کو علم ہوا تو اس نے اس بچے کو بھی قتل کر ڈالنے کا ارادہ ظاہر کیا مگر آسیہ نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا اور مشورہ دیا کہ ہم اس بچے کو اپنا بیٹا بنالیں گے۔ فرعون نے اپنی بیوی کی بات مان لی اور یوں حضرت موسیٰؑ کی پرورش فرعون کے محل میں آسیہ کی زیرنگرانی ہونے لگی۔ حضرت موسیٰؑ کے سمندر سے نکالے جانے کی خبر دُور دُور تک پھیل گئی تھی اور آپکی ہمشیرہ جو صندوق کے ساتھ ساتھ محل تک پہنچ گئی تھی وہ بھی بھائی کی پرورش اور دیکھ بھال کیلئے کسی طرح شاہی محل کی خادماؤں میں شامل ہوگئی۔

حضرت موسیٰؑ ایک عرصہ تک شاہی تربیت میں آسیہ کے زیرنگرانی رہے۔ عنفوانِ شباب ہی

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مصر سے مدین کی طرف سفر
اور پھر مصر کی طرف واپسی بذریعہ نقشہ
البحر الکبیر (المتوسط)
غزة
القدس
اورشالم
الخليل
(حبرون)
ارض مواب
البحر الأحمر (البحر الخلزم)
جبل موسیٰ
جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے
اللہ عزوجل کی آواز سنی اور
آپ علیہ السلام کو نبوت کا تحفہ دیا گیا۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مصر سے مدین کی طرف سفر
مدین جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام
نے 10 سال گزارے اور
آپ علیہ السلام کا نکاح
حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی سے ہوا۔
مدين
٣
٢
مصر
١
مصر جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔
ممفس
جہاں فرعون کی حکومت تھی
برکة قارون
قارون سے منسوب کنویں کا مقام
الفيوم
دریائے نیل
جبل الجلالة
القبلية
جبل غارب
خليج السويس
السويس
الإسماعيلية
القرما
المنصورة
دمياط
رشيد
الإسكندرية
منوف
بنى سويف
المنيا
أسيوط
سوهاج
قنا
سفاجة
القرمطة
أسوان
شلال
أسوان
مقياس الرسم
سم ٤٠ ٨٠ ١٢٠ ١٦٠ ٢٠٠ كم

میں آپؑ قوی الجثہ اور ایک بہادر جوان نکلے۔ چہرے سے رعب ٹپکتا تھا اور گفتگو سے ایک خاص قسم کا وقار اور شانِ عظمت عیاں ہوتی تھی۔ آپؑ کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ آپؑ اسرائیلی ہیں اور مصری خاندان سے آپکو کوئی نسبت و قرابت داری نہیں۔ پھر آپ نے دیکھا اور محسوس کیا کہ بنی اسرائیل پر سخت مظالم ہو رہے ہیں اور ان کے قبیلہ کے لوگ مصر میں نہایت ذلت و غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر آپکا خون کھولنے لگتا۔

طبری نے یہ واقعہ لکھا ہے کہ جب موسیٰؑ قوی ہیکل جوان ہو گئے تو عبرانیوں کے معاملے میں مصری گماشتوں کے مظالم پر سخت ردِّعمل کا اظہار کیا کرتے۔ آپکی حمایت و نصرت کے نتیجے میں مصریوں کے مظالم و شدائد عبرانیوں پر کم ہونے لگے۔ آپؑ کا معمول بن چکا تھا کہ آپؑ روزانہ شہر کا گشت کرتے اور خود حالات کا مشاہدہ کرتے۔ ایک مرتبہ آپنے دیکھا کہ ایک مصری ایک اسرائیلی کو بیگار کیلئے گھسیٹ رہا ہے جب اسرائیلی نے موسیٰؑ کو دیکھا تو فریاد کرنے اور مدد طلب کرنے لگا۔ موسیٰؑ نے پہلے تو مصری کو سمجھایا اور زیادتی سے منع کیا مگر جب وہ باز نہ آیا تو آپؑ نے اسکی جابرانہ حرکت پر اس کو اس زور کا طمانچہ رسید کیا کہ وہ نیچے گر پڑا اور جہنم رسید ہو گیا۔ حالانکہ آپکا ارادہ اسے قتل کر ڈالنے کا ہرگز نہیں تھا۔

اس سے پیشتر کہ آپؑ خود فرعون کے پاس جا کر روداد بیان کرتے ہرکاروں اور فرعون کے کچھ وزرا نے موقع غنیمت جان کر بادشاہ کے کان بھرنے شروع کر دیئے اور فرعون کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ اس نے آپکی گرفتاری کا حکم جاری کیا اور آپکو سخت سزا دینے کیلئے دربار طلب کر لیا۔

''تاریخ الرسل والملوک'' میں ہے کہ آپؑ مصر سے بھاگ نکلے اور سات دن و سات راتیں مسلسل پیدل سفر کیا یہاں تک کہ مدین پہنچ گئے جہاں آپؑ حضرت شعیبؑ کے ہاں سکونت پذیر ہوئے۔ آپؑ کو وہاں نہ صرف امن و اطمینان اور متاہل زندگی ہی ملی بلکہ حضرت شعیبؑ جیسے پیغمبر کی صحبت صالحہ اور انکی تربیت بھی نصیب ہوئی۔

حضرت شعیبؑ نے آپکی روداد سن کر اپنی پیغمبرانہ فراست سے سمجھ لیا تھا کہ آج مدین میں کس درجہ برگزیدہ مسافر وارد ہوا ہے۔ آپؑ نے اپنی بیٹی صفورہ کی شادی بھی موسیٰؑ سے کر دی۔ آخر دس سال کی موعودہ مدت پوری ہونے پر آپؑ نے مصر واپس جانے کا ارادہ فرمایا اور اپنے سسر سے اجازت لے کر

بمعہ اہلیہ مصر کو مراجعت کے ارادہ سے عازمِ سفر ہوئے۔ سردی کا موسم اور تاریک رات تھی کہ راستہ بھول گئے۔ بھیڑ بکریوں کا ایک غلہ ساتھ تھا اور راستہ سجھائی نہ دیتا تھا۔ جانے کس طرف سے ہوتے ہوئے کوہ سینا کی مشرقی سمت کی طرف جا نکلے۔ جہاں آپؑ کو پہاڑی پر روشنی نظر آئی۔ وادیٔ ایمن میں شعلہ سا چمکتا دیکھ کر حضرت موسیٰؑ نے اپنی بیوی سے کہا کہ تم یہیں ٹھہرو میں کچھ آگ لے آؤں اور ممکن ہے وہاں کسی پتہ بتانے والے سے ہمیں صحیح راستہ کی نشاندہی بھی ہو جائے۔

یہاں پہنچ کر حضرت موسیٰؑ نے ایک حیرت ناک منظر دیکھا کہ ایک درخت سے عجیب وغریب قسم کے پُر ہیبت شعلے نکل رہے تھے۔ جوں جوں آگ زیادہ ہوتی توں توں درخت زیادہ سرسبز وشاداب ہوتا جاتا۔ جوں جوں موسیٰؑ آگ کی طرف بڑھتے آگ کھسک کر آگے ہوتی جاتی۔ اسی اثنا میں انہیں ندائے خداوندی سنائی دی۔

وَ نَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَ قَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا (مریم:۵۲)

ترجمہ:۔ اور ہم نے ان کو طور کی داہنی طرف پکارا اور باتیں کرنے کیلئے نزدیک بلایا (مریم:۵۲)

مزید فرمان ہوا جسکا ذکر طٰہٰ میں یوں ہے:۔

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى (۱۱) اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (۱۲) وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى (۱۳) (سورۃ:طٰہٰ)

ترجمہ:۔ پھر جب آگ کے قریب آیا تو اسے ندا دی اے موسیٰ (طٰہٰ:۱۱) بیشک میں تیرا رب ہوں پس اپنے جوتے اتار ڈال بیشک تو مقدس وادی طویٰ میں ہے (طٰہٰ:۱۲) میں نے تجھے پسند کیا سو اب تو کان لگا کر سن جو تجھے وحی ہوتی ہے (طٰہٰ:۱۳) اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ (۱۴) اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى (۱۵) فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى (۱۶) (طٰہٰ:۱۳ تا ۱۶)

ترجمہ:۔ بیشک میں ہی اللہ ہوں میرے سوا کوئی لائق عبادت نہیں پس تو میری عبادت کر اور میری یاد کیلئے نماز قائم رکھ (طٰہٰ:۱۴) بیشک قیامت آنے والی ہے قریب تھا کہ میں اس بات کو

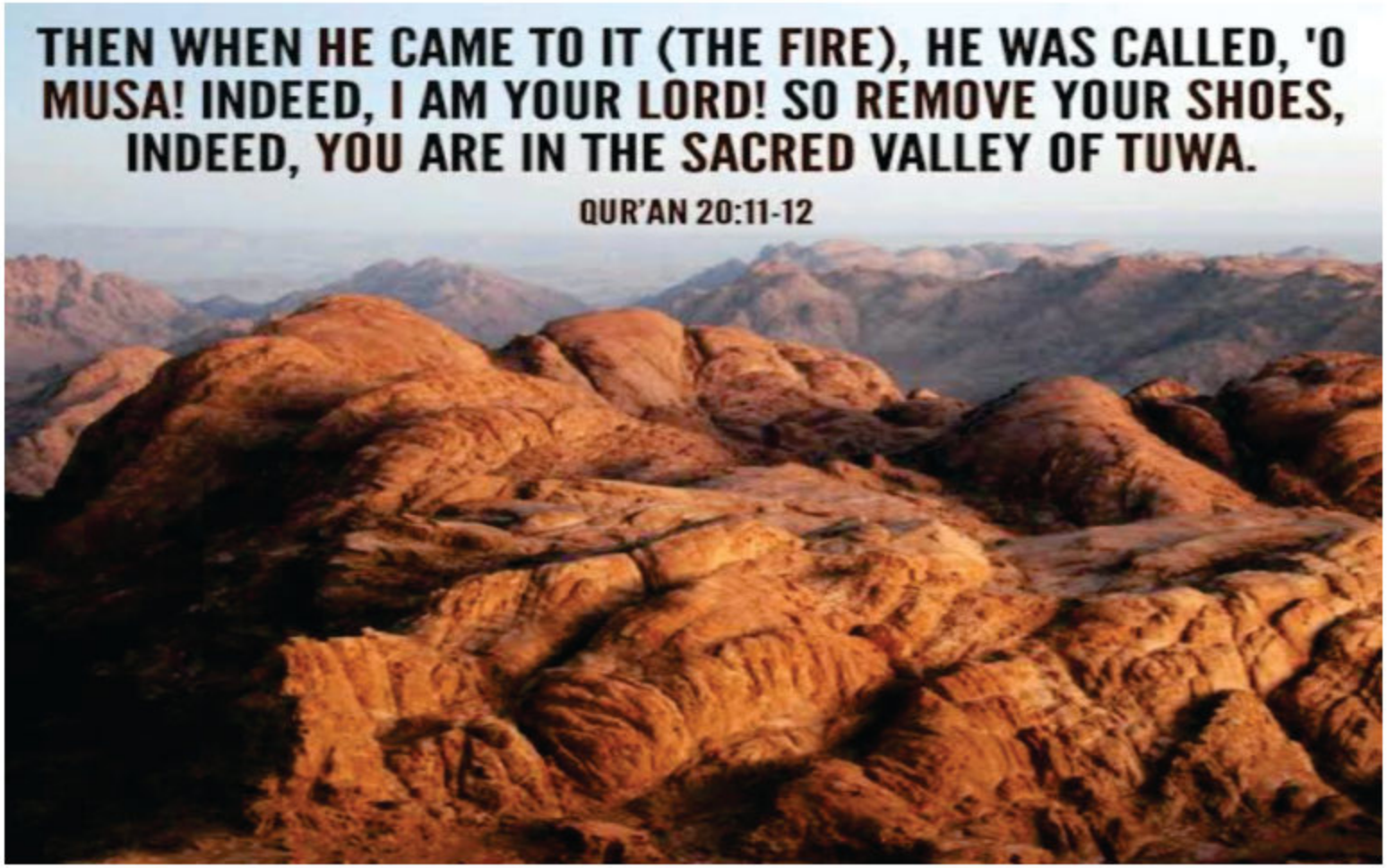
THEN WHEN HE CAME TO IT (THE FIRE), HE WAS CALLED, 'O MUSA! INDEED, I AM YOUR LORD! SO REMOVE YOUR SHOES, INDEED, YOU ARE IN THE SACRED VALLEY OF TUWA.
QUR'AN 20:11-12

سب سے چھپاتا کہ ہر نفس اپنی کوشش کا بدلہ پائے (طٰہٰ:۱۵) پس جو اس پر ایمان نہیں لاتا وہ تجھے ہرگز اس سے باز نہ رکھے وگرنہ (یہ نہ ہو کہ) تو ہلاکت میں پڑ جائے (طٰہٰ:۱۶)

نبوت کے ساتھ حضرت موسیٰؑ کو عصا' ید بیضا اور سات دیگر معجزات عطا ہوئے۔ اِن نو معجزات کے ساتھ آپؑ کو فرعون اور اسکے دربار کی طرف جانے کا حکم صادر ہوا کہ وہ سرکش ہو رہا تھا۔ دراصل یہی وہ فرعون ہے جو فرعونِ موسیٰ کہلواتا ہے اور جس کے جسد خاکی کو قیامت تک برائے عبرت محفوظ رکھنے کی پیش گوئی قرآن حکیم میں سینکڑوں سال سے چلی آ رہی تھی۔

منصب نبوت اور تجلّیٔ الٰہی سے سرفراز ہو کر حضرت موسیٰؑ نے دعا کی اور پھر عازمِ مصر ہوئے۔ راستہ میں دو مرتبہ آپ پر وحی نازل ہوئی اور حکم ہوا کہ فرعون کے دربار میں جا کر ہمارے معجزات دکھاؤ اور اسے کہو کہ وہ بنی اسرائیل کو مصر سے چلے جانے کی اجازت دیدے۔ اسی اثناء میں مصر میں موجود حضرت ہارؑون کو موسیٰؑ کے بارے بھی مطلع کر دیا گیا تھا اور وہ بیابانِ سینا میں آپؑ کے استقبال کیلئے چلے آئے تھے۔ پھر دونوں بھائی مصر پہنچے اور بنی اسرائیل کے سب بزرگوں کو جمع کر کے انہیں حکم الٰہی سے مطلع فرمایا اور خدا تعالیٰ کی طرف سے عطا شدہ معجزات انہیں دکھائے۔

مورّخین کے مطابق جب آپؑ دربار میں پہنچے اس وقت آپکی عمر مبارک اسّی سال تھی۔ آپؑ نے فرعون کے سامنے دو مطالبات پیش کیے۔ پہلا یہ کہ خدائے واحد کو مان کر اسکے آگے سر جھکا دو جو کہ سب حاکموں کا حاکم اور تمام جہانوں کا رب ہے اور اپنے آپ کو خدا کہلوانا ترک کر دو۔ دوسرا یہ کہ بنی اسرائیل کو (جسے تم نے اپنی غلامی میں لے رکھا ہے) آزاد کر دو اور مصر سے جانے دو۔

فرعون کی خدائی پر یہ ایسی کاری ضرب تھی جو آئندہ کیلئے ''ضرب کلیمی'' کے طور پر ایک مثل بن گئی۔ فرعون نے سخت غضب ناک ہو کر اِن ہر دو مطالبات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور موسیٰؑ کو اپنے دعوے کے حق میں کوئی ثبوت پیش کرنے کا کہا۔ اس پر حضرت موسیٰؑ نے اپنی لاٹھی کو زمین پر ڈالا تو وہ اژدھا بن گیا اور اپنے ہاتھ کو اپنی بغل سے نکال کر (ید بیضاء کا معجزہ) دکھایا کہ وہ سفید براق ہو کر چاند کی طرح روشن ہو گیا۔ مگر فرعون اور اسکے درباریوں پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا اور وہ کہنے لگے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔ یوں فرعون نے آپکی دعوت کو جھٹلا دیا اور اسکا جواب دینے کیلئے جادوگروں کو مدعو کر لیا۔

مصر کے عجائب گھر میں موجود فرعون کی لاش

یومِ زینت مصر میں فرعون کی سالگرہ کا دن تھا اور اس دن ملک میں سب سے بڑا میلہ اور جشن منعقد ہوتا تھا۔ فرعون نے اس موقع پر ملک کے گوشے گوشے سے چوٹی کے ماہر اور کامل الفن ساحروں کو جمع کیا اور انہیں بڑے بڑے انعامات کا لالچ دیکر حضرت موسیٰؑ کے مقابلہ کیلئے تیار کرلیا۔ وہ میدان میں آئے اور انہوں نے رسیاں زمین پر پھینکیں جو سانپ بن کر رینگنے لگیں۔ میلے میں موجود عوام وخواص سب ہی لوگ سانپوں کو بکھر کر رینگتے اور پھیلتے دیکھ کر گھبرانے لگے تو حضرت موسیٰؑ نے اسی وقت اپنا عصا زمین پر پھینک دیا جو ایک حقیقی اژدھے میں تبدیل ہوگیا اور رسیوں کے بنے سانپوں کو نگلنے لگا یہاں تک کہ چند لمحوں میں جادوگروں کے تمام سانپوں کو نگل گیا۔ اس معجزے کا قوم پر بہت اثر ہوا حالانکہ یہ وہی معجزہ تھا جسے پہلے دیکھ کر فرعون اور اسکے درباریوں نے اسے محض ایک جادوگری قرار دیکر صرفِ نظر کردیا تھا اور جمہور سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی تھی۔

فرعون کے مدعو کیے گئے ساحر جو اِس فن کے ماہر تھے بخوبی جان چکے تھے کہ یہ شعبدہ بازی یا نظر بندی ہرگز نہیں کیونکہ کسی سحر میں یہ طاقت قطعی نہیں ہوسکتی۔ اس لئے انہوں نے حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے حضرت موسیٰؑ پر ایمان لانے کا برملا اقرار کرلیا۔ فرعون ہزار ہا لوگوں میں اپنی اس ذلت آمیز شکست سے تلملا اٹھا اور اسکے سینے میں جادوگروں کے خلاف نفرت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ زیادہ تکلیف اسے جادوگروں کے ایمان لے آنے پر ہوئی اور وہ انہیں مخالف ہاتھ پاؤں کاٹ کر موت کی سزا دینے اور اپنی رسوائی کا بدلہ بنی اسرائیل سے لینے پر یوں تل گیا کہ انکے بیٹوں کو قتل اور انکی عورتوں کو زندہ رکھنے کا حکم پھر جاری کیا۔ اس کی غضب ناکی کا عالم یہ کہ اس نے خود حضرت موسیٰؑ کو قتل کرڈالنے کا ناپاک ارادہ کیا۔

وَ قَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِیْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰی وَ لْیَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّبَدِّلَ دِیْنَكُمْ اَوْ اَنْ یُّظْهِرَ فِی الْاَرْضِ الْفَسَادَ(۲۶) (سورۃ:المومن)

ترجمہ:۔ اور فرعون بولا مجھے چھوڑو کہ میں موسیٰ کو قتل کروں اور وہ (مدد کیلئے) اپنے رب کو بلائے، میں ڈرتا ہوں کہ کہیں وہ تمہارا دین بدل ڈالے یا زمین میں فساد چمکادے (مومن ۲۶)

آیت ھٰذا میں فرعون کا یہ کہنا کہ مجھے چھوڑ دو اس لئے ہے کہ اسے اسکے درباریوں نے ایسا کرنے سے روک رکھا تھا کہ ابھی تک تو لوگ تذبذب میں ہیں اور موسیٰؑ کو ایک ماہر جادوگر سمجھ رہے ہیں مگر تمہارے قتل

فرعون کے دور کے محلات کے کھنڈرات

کر ڈالنے سے لوگوں کی ہمدردیاں موسیٰؑ کے ساتھ ہو جائیں گی اور تیری قوم میں یہ خیال جڑ پکڑ لے گا کہ موسیٰؑ سچا تھا اور تو جھوٹا ہے اور تو نے اپنی خفت مٹانے کیلئے طیش میں آ کر اسے قتل کر ڈالا۔ اسکے باوجود وہ آپؑ پر حملہ آور ہوا مگر تائید ایزدی سے دربار میں موجود ایک پوشیدہ مومن شخص کی مدد سے حضرت موسیٰؑ کی جان بچ گئی۔ اس کو قرآن نے سورۃ مومن میں یوں بیان فرمایا:۔

وَ قَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَكْتُمُ اِیْمَانَهٗۤ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ یَّقُوْلَ رَبِّیَ اللّٰهُ وَ قَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَیِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَ اِنْ یَّكُ كَاذِبًا فَعَلَیْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَ اِنْ یَّكُ صَادِقًا یُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِیْ یَعِدُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ (مومن : ۲۸) یٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْیَوْمَ ظٰهِرِیْنَ فِی الْاَرْضِ ۫ فَمَنْ یَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا ؕ قَالَ فِرْعَوْنُ مَاۤ اُرِیْكُمْ اِلَّا مَاۤ اَرٰی وَ مَاۤ اَهْدِیْكُمْ اِلَّا سَبِیْلَ الرَّشَادِ (المومن : ۲۹)

ترجمہ:۔ اور فرعون والوں میں سے ایک مردِ مسلمان بولا جو اپنے ایمان کو چھپاتا تھا کہ کیا ایک مرد کو اس پر مارے ڈالتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور بیشک وہ روشن نشانیاں لے کر تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس لائے اور اگر بالفرض وہ غلط کہتے ہیں تو انکی غلط گوئی کا وبال ان پر اور اگر وہ سچے ہیں تو تمہیں پہنچ جائیگا جس کا تمہیں وعدہ دیتے ہیں بیشک اللہ اسے راہ نہیں دیتا جو حد سے بڑھنے والا بڑا جھوٹا ہو (مومن: ۲۸) اے میری قوم آج بادشاہی تمہاری ہے کہ زمین میں غلبہ رکھتے ہو تو اللہ کے عذاب سے ہمیں کون بچائیگا اگر ہم پر آئے فرعون بولا میں تو تمہیں وہی سمجھاتا ہوں جو میری سوجھ ہے (یعنی موسیٰؑ کو قتل کر ڈالو) اور میں تمہیں وہی بتاتا ہوں جو بھلائی کی راہ ہے (مومن:۲۹)

فرعون اس قریبی شخص کی باتوں پر بھی قائل نہ ہوا اور اپنے ساتھیوں کو قتلِ موسیٰؑ پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر یہ دیکھتے ہوئے کہ وہ اس پر جلد آمادہ نہیں ہونگے تو اس نے خود اپنے ناپاک ارادہ کو انجام تک پہنچانے کی کوشش کی مگر اُس نیک اور ایمان دار شخص کی مدد سے حضرت موسیٰؑ بچ گئے۔

اسی دوران وحی نازل ہوئی کہ بنی اسرائیل اپنی الگ بستی بنائیں تا کہ عذاب الٰہی نازل ہو تو یہ

لوگ محفوظ رہیں۔اس کے بعد مصر مینڈکوں کی بارش' پانی کے خون ہو جانے اور پہلوٹھی کے بیٹے ہلاک ہو جانے جیسے کئی عذابوں کا شکار ہوا مگر فرعون اپنی ضد پر اڑا رہا کہ نہ تو وہ ایمان لایا اور نہ ہی بنی اسرائیل کو رہا کرنے پر آمادہ ہوا۔ چنانچہ موسیٰؑ نے قوم کو مصر سے خروج کا حکم دیدیا۔فرعون کو خبر ہوئی تو اپنے لشکر سمیت بنی اسرائیل کے تعاقب میں نکل آیا۔وہ اس بات سے خوش تھا کہ بنی اسرائیل جس سمت دوڑ رہے ہیں وہ راستہ قلزم کے راستہ میں پڑنے کی وجہ سے مسدود ہے اور ہم جلد ہی انہیں پا کر تہہ تیغ کر ڈالیں گے۔

بنی اسرائیل بھی فرعون کے لشکر کا پیچھا کرتے ہوئے اور اس قدر قریب آتے دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے اور حضرت موسیٰؑ کو کوسنے دینے پر آ گئے تھے۔مگر موسیٰؑ نے بموجب حکم الٰہی جب اپنے عصا کو سمندر پر مارا تو وہ دو حصوں میں پھٹ گیا اور راستہ بناتے ہوئے دونوں اطراف سے عموداً کھڑا ہو گیا جس سے بنی اسرائیل بآسانی گزرتے ہوئے قلزم سے پار اتر گئے۔تعاقب کرتی ہوئی فرعونی فوج بھی اسی راستہ سے گزرنے کی کوشش میں جب وسط قلزم میں پہنچی تو دریا آپس میں مل گیا جس سے فرعون اور اسکا تمام لشکر ڈوب کر ہلاک ہو گیا۔

توراۃ کا بیان ہے کہ فرعون کی ضد اور تکبر کے باعث اہل مصر پر مختلف آزمائشیں اور سختیاں نازل ہوئیں۔حضرت موسیٰؑ کے حکم سے حضرت ھارونؑ نے عصائے کلیمی نیل پر مارا تو تمام دریا کا پانی خون بن گیا۔نہ صرف دریا بلکہ ہر جھیل جوہڑ اور لوگوں کے گھروں میں ذخیرہ شدہ پانی بھی خون ہو چکا تھا۔اہل فرعون جس برتن میں پانی انڈیلتے دیکھتے ہی دیکھتے خون میں تبدیل ہو جاتا۔پھر اسی لاٹھی کو دوبارہ زمین پر مارا تو تمام مصر مینڈکوں اور دیگر موذی حشرات سے بھر گیا۔مینڈکوں کی بہتات کا یہ عالم کہ ہر کونے کھدرے ہر برتن الغرض ہر شئے میں سے مینڈک برآمد ہونے لگے۔یہاں تک کہ ایک معجزہ کے نتیجہ میں اس قوم کے تمام پہلوٹی کے بچے ہلاک ہونے لگے حتیٰ کہ خود فرعون کا اکلوتا بیٹا بھی ہلاک ہو گیا مگر وہ اور اسکے پیروکار اپنی ڈھٹائی اور ضد کی بناء پر کسی طرح ایمان لانے اور بنی اسرائیل کو آزاد کرنے پر راضی نہ ہوئے۔حضرت موسیٰؑ اور حضرت ھارونؑ کے معجزات اور سرزنش کیلئے آنے والے عذابوں کو جادو قرار دیکر رد کرتے رہے۔جیسا کہ سورۃ اعراف میں ہے۔

وَ قَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰیَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِیْنَ (۱۳۲)

The Parting Of The Red sea

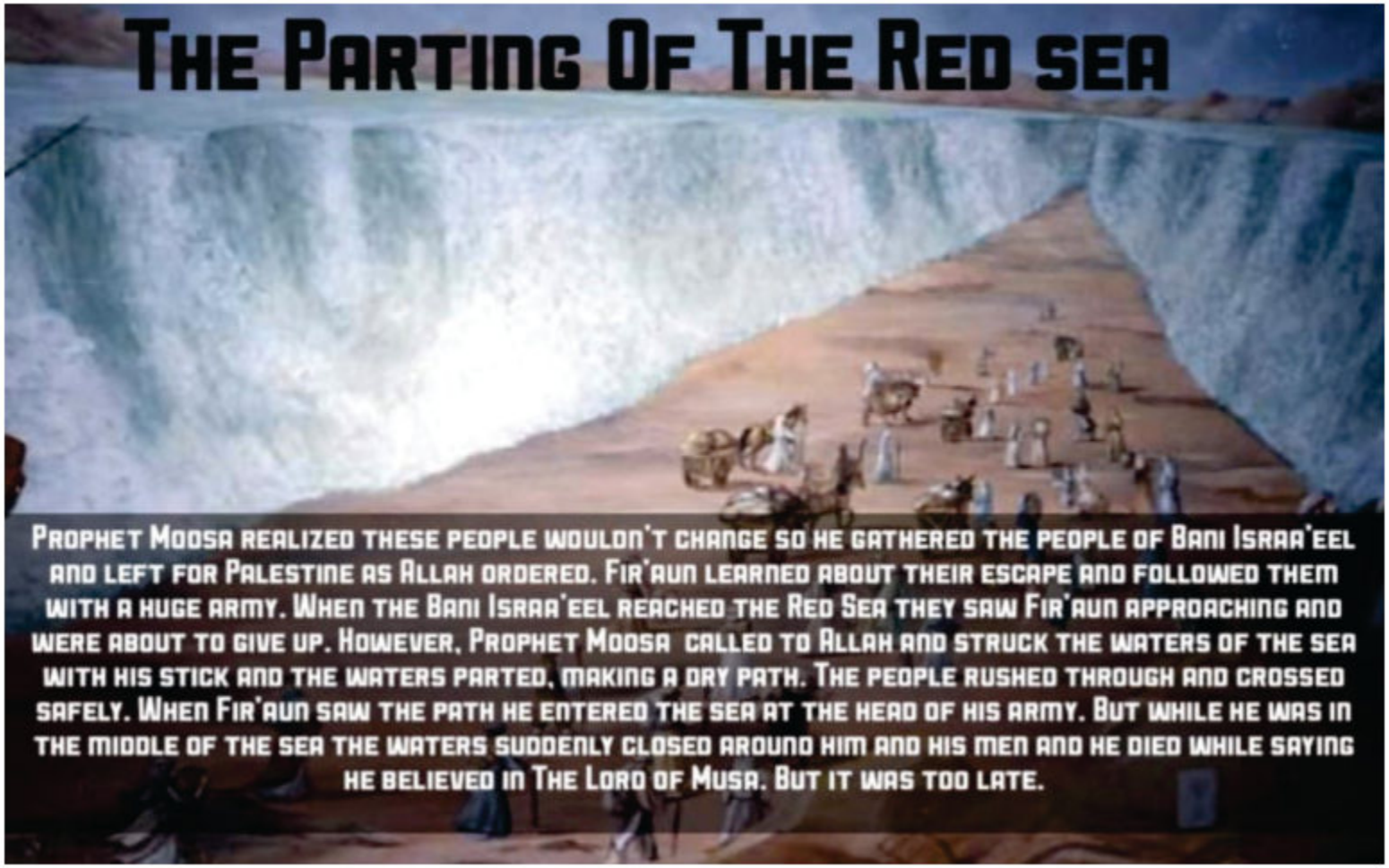

Prophet Moosa realized these people woulon't change so he gathered the people of Bani Israa'eel and left for Palestine as Allah ordered. Fir'aun learned about their escape and followed them with a huge army. When the Bani Israa'eel reached the Red Sea they saw Fir'aun approaching and were about to give up. However, Prophet Moosa called to Allah and struck the waters of the sea with his stick and the waters parted, making a dry path. The people rushed through and crossed safely. When Fir'aun saw the path he entered the sea at the head of his army. But while he was in the middle of the sea the waters suddenly closed around him and his men and he died while saying he believed in The Lord of Musa. But it was too late.

ترجمہ:۔اور کہنے لگے کہ تم کیسی بھی نشانی لیکر ہمارے پاس آؤ اور اس سے ہم پر جادو کرو ہم کسی طرح تم پر ایمان لانے والے نہیں (الاعراف: ۱۳۲)

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَ الْجَرَادَ وَ الْقُمَّلَ وَ الضَّفَادِعَ وَ الدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ (الاعراف:۱۳۳)

ترجمہ:۔تو ہم نے ان پر ٹڈی اور گھن (یا کلنی یا جوؤں) اور مینڈکوں کا عذاب نازل کیا اور تمام پانی خون بنا دیئے جیسی مختلف نشانیاں (حق شناسی کیلئے) ان پر ظاہر کیں مگر انہوں نے تکبر کیا اور وہ مجرم قوم تھی (الاعراف: ۱۳۳) الاعراف ہی کی آیات: ۱۳۴/۱۳۵/۱۳۶ بھی دیکھیں۔

وَ لَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَ لَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ (۱۳۴) فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بَالِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ (۱۳۵) فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ (۱۳۶)

ترجمہ:۔ان عذابوں سے اکتا کر وعدہ کرتے اور حضرت موسیٰؑ سے التجا کرتے کہ اپنے رب سے کہہ کر ہم پر سے یہ عذاب اٹھوا دو تو ہم ضرور ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو تمہارے ساتھ جانے دیں گے (الاعراف: ۱۳۴) پھر جب ہم ان سے ایک مدت تک کیلئے عذاب اٹھا لیتے تو وہ پھر عہد سے مکر جاتے (الاعراف: ۱۳۵) تو ہم نے ان کو (بنی اسرائیل پر ظلم کرنے اور وعدہ خلافیوں کے) بدلہ میں غرقِ دریا کر دیا اس لئے کہ وہ ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے اور اصلاً ان سے تدبر و التفات نہ کرتے تھے (الاعراف: ۱۳۶)

پھر فرمان ہوا جو الاعراف کی آیات ۱۳۷ تا ۱۴۱ تک ہے:۔

وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَ دَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَ قَوْمُهٗ وَ مَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ (۱۳۷) وَ جٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا يٰمُوْسَى

اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ(۱۳۸) اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ(۱۳۹) قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّ هُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ(۱۴۰) وَ اِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ع (الاعراف:۱۳۷تا ۱۴۱)

ترجمہ:۔اور ہم نے اس قوم (بنی اسرائیل) کو جو (فراعین مصر کے ہاتھوں) دبالی گئی تھی اس زمین (یعنی مصروشام) کے پورب پچھم کا وارث کیا جس میں ہم نے برکت رکھی اور بنی اسرائیل پر تیرے رب کا اچھا وعدہ پورا ہوا بنی اسرائیل کے صبر کا۔اور فرعون اور اسکی قوم جو کچھ بناتی اور بلند و بالا چنائیاں اٹھاتی (تعمیر کرتی) تھی سب کو برباد کر دیا (الاعراف:۱۳۷) اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا کے پار اتارا تو انکا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا کہ (گائے کی صورت گھڑے ہوئے) اپنے بتوں کے آگے آسن مارے تھے بولے اے موسیٰؑ انکے پاس اتنے خدا ہیں ایسا ایک خدا ہمیں بھی بنا دے تو حضرت موسیٰؑ نے فرمایا یقیناً تم بڑے جاہل لوگ ہو (الاعراف:۱۳۸) بیشک یہ حال تو بربادی کا ہے جس میں یہ لوگ مبتلا ہیں اور جو کچھ کر رہے ہیں بالکل باطل ہے (الاعراف:۱۳۹) فرمایا (موسیٰؑ نے) کیا اللہ کے سوا تمہارا کوئی اور خدا تلاش کروں حالانکہ اس نے تمہیں زمانے بھر پر فضیلت دی (الاعراف:۱۴۰) اور یاد کرو کہ تم پر فرعون والے کیسا کیسا ظلم کرتے تھے جس سے اللہ نے تمہیں نجات عطا فرمائی کہ وہ تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور تمہاری بیٹیاں باقی رکھتے تھے اور اس بلا سے نجات ملنا تمہارے رب کا کتنا بڑا فضل ہے (الاعراف:۱۴۱)

حضرت ھارونؑ کی نیابت کے ضمن میں سورۃ اعراف میں بیان شدہ واقعہ عرض کرتا چلوں کہ جب حضرت موسیٰؑ کے کوہِ طور پر چالیس روز معتکف ہونے کا مرحلہ آیا تو آپؑ نے حضرت ھارون علیہ السلام کو نیابت عطا فرمائی، بنی اسرائیل کی سرپرستی ونگہبانی پر مقرر فرمایا اور پھر کوہِ طور کی طرف مراجعت فرما ہو گئے۔اس حکم کو (اعراف کی آیۃ ۱۴۲ میں) یوں بیان فرمایا گیا۔

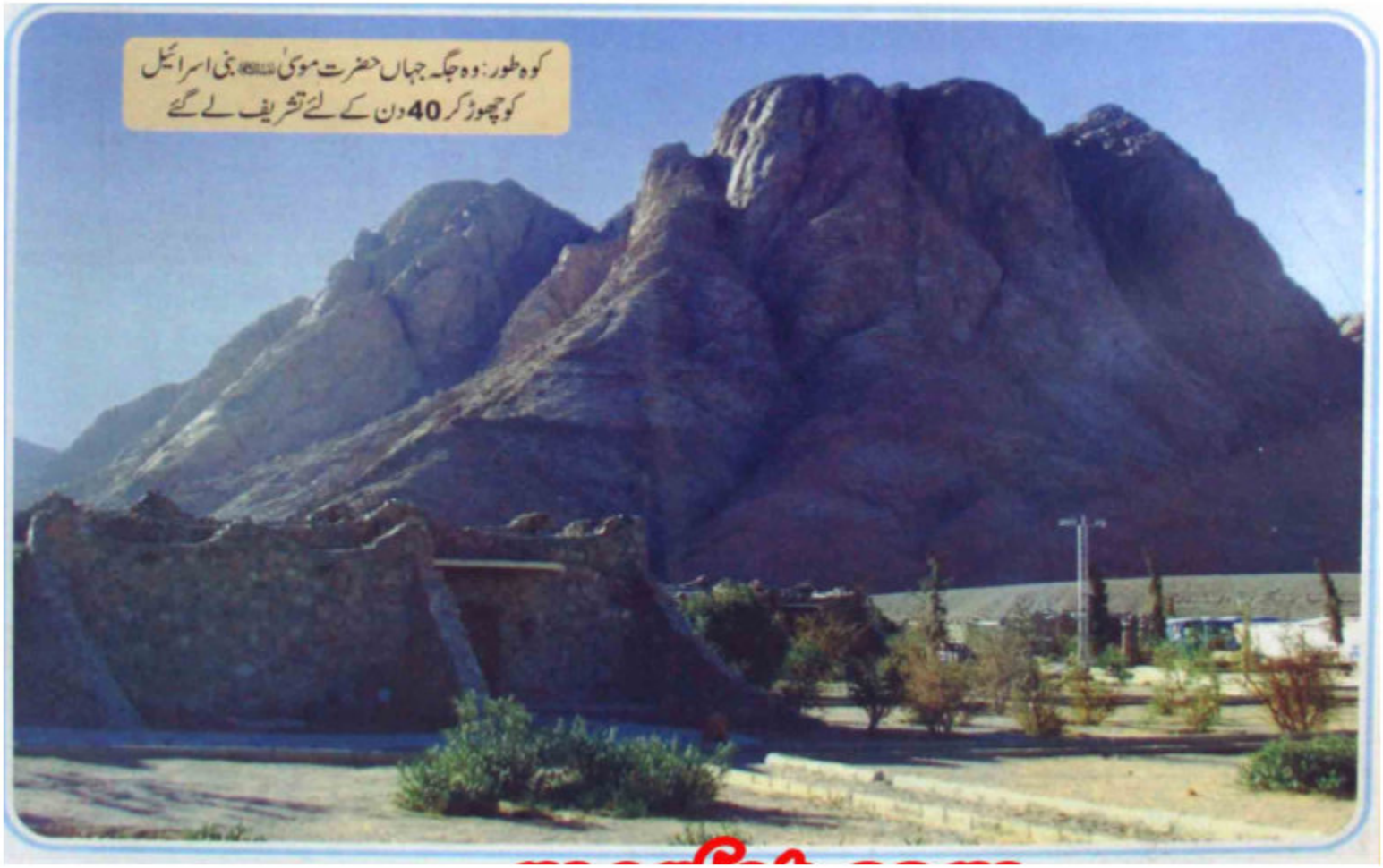
کوہ طور: وہ جگہ جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل
کو چھوڑ کر 40 دن کے لئے تشریف لے گئے

وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَ قَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَ اَصْلِحْ وَ لَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ(الاعراف : ۱۴۲)

ترجمہ:۔ اور ہم نے موسٰی سے تیس راتوں کا وعدہ فرمایا اور ان میں دس اور بڑھا کر پوری کیں تو اس کے رب کا وعدہ پوری چالیس رات کا ہوا۔ اور موسٰیؑ نے اپنے بھائی ہارونؑ سے کہا میری قوم پر میرے نائب رہنا اور اصلاح کرنا اور فسادیوں کو راہ نہ دینا(الاعراف: ۱۴۲)

اس دوران حضرت ھارونؑ رشد و ھدایت اور نفاذِ احکام توحید و نظمِ ریاست کے تمام اختیارات بروئے کار لائے مگر بنی اسرائیل نے آپکے جانے کے کچھ ہی دنوں بعد (جیسا کہ راستے میں دیکھا تھا) پرستش کیلئے ایک بچھڑا بنالیا۔ سامری نامی ایک شخص نے تمام قوم کو اپنے اپنے زیورات پیش کرنے کی رائے دی اور سونے کے زیورات کو پگھلا کر ایک بچھڑا بنالیا۔ مصری بت بنانے والے مشاق کاری گروں نے گھنٹی نما آلہ تیار کر کے بچھڑے میں رکھ دیا جو ہوا چلنے سے بچھڑے کی سی آواز پیدا کرتا تھا۔ سامری نے بنی اسرائیل کے سامنے یہ بت پیش کیا اور کہا کہ موسٰیؑ تو جانے کہاں چلا گیا البتہ تمہارا خدا تو یہ سامنے موجود ہے۔ جب اسکے منہ سے بچھڑے کی آواز پیدا ہوئی تو سنتے ہی بہت سے لوگ فوراً سجدہ میں گر گئے اور یوں بچھڑے کی پرستش شروع کر دی۔ حضرت ھارونؑ نے یہ کیفیت دیکھی تو سخت مضطرب ہوئے اور انہیں سمجھانے اور ایسے فعل بد سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی۔ آپؑ نے سختی و نرمی ہر طرح سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی اور بتایا کہ یہ تو صرف تمہاری آزمائش ہے۔ تمہارا حقیقی پروردگار تو خدا ہے اس لئے میری پیروی کرو، میرا کہنا مانو اور صرف خدائے واحد کی عبادت کرو۔ مگر قوم پوری طرح شیطان کی گرفت میں آچکی تھی انہوں نے حضرت ھارونؑ کی ایک نہ سنی بلکہ انہیں قتل کرنے کے درپے ہو گئے۔ اس پر حضرت ھارونؑ خاموش ہو گئے کہ قوم دو گروہوں میں بٹ کر خانہ جنگی میں مبتلا نہ ہو جائے۔ جب حضرت موسٰیؑ طور سے واپس آئے تو یہ صورتِ حال دیکھ کر سخت نالاں ہوئے اور لوگوں کے بتانے پر کہ یہ کیا دھرا سامری کا ہے اسی نے ہم کو بہکایا۔ اسی دوران کچھ لوگوں نے یہ بھی کہا کہ ھارونؑ نے بھی ہم کو منع

نہیں کیا۔ یہ سنتے ہی شدت غضب اور بغض فی اللہ سے معمور ہو کر موسیٰؑ نے احکام شریعت کی تختیاں ایک طرف ڈال دیں اور اپنے بھائی ھارونؑ کی طرف لپکے۔ انکی داڑھی اور سر کے بال پکڑ کر کھینچے کہ تم تو محرم اسرارِ حقیقت تھے آخر تم نے ایسا کیونکر ہونے دیا۔ اس ضمن میں فرمان قرآن الاعراف ۱۴۸ ہے:۔

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَ لَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ لازم وقف اِتَّخَذُوْهُ وَ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ (الاعراف :۱۴۸)

ترجمہ:۔ اور موسیٰؑ کے (طور پر جانے کے) بعد اس کی قوم اپنے زیورات سے ایک بچھڑا بنا بیٹھی جس کا بیجان بدن گائے کی طرح آواز کرتا تھا کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ وہ نہ ان سے بات کرے اور نہ انہیں کچھ راہ بتائے اسے (پوجا کیلئے) لے لیا اور وہ ظالم تھے (۱۴۸)

وَ لَمَّا رَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَ اَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَ اَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗۤ اِلَيْهِ ؕ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَ كَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ۫ صلے فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَآءَ وَ لَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (الاعراف :۱۵۰)

ترجمہ:۔ اور جب موسیٰؑ (طور سے چلہ کے بعد) واپس اپنی قوم کی طرف پلٹا غصہ میں بھرا جھنجھلایا ہوا کہا (ھارونؑ) تم نے میرے بعد کیا بُری جانشینی کی۔ کیا تم نے اپنے رب کے حکم سے جلدی کی (یعنی میرے توراۃ لیکر آنے کا انتظار نہ کیا) اور توراۃ کی تختیاں ڈال دیں اور اپنے بھائی (ھارونؑ) کے سر کے بال پکڑ کر کھینچے (اس پر ھارونؑ) کہنے لگا اے میری ماں جائے قوم نے مجھے کمزور سمجھا اور قریب تھا کہ (میرے منع کرنے پر) مجھے مار ڈالیں تو مجھ پر دشمنوں کو نہ ہنسا اور مجھے ظالموں میں شامل نہ کر (الاعراف:۱۵۰)

اسی ضمن میں سورۃ طٰہٰ میں بھی فرمان ہے کہ ھارونؑ کے منع کرنے پر بھی وہ اپنے شرکیہ فعل سے باز نہ آئے اور ضد سے کہنے لگے کہ ہم تو موسیٰؑ کے واپس لوٹنے تک اسی بات پر جمے رہیں گے:۔

سورۃ طٰہٰ میں فرمان ہوا۔

قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى (۹۱) قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا

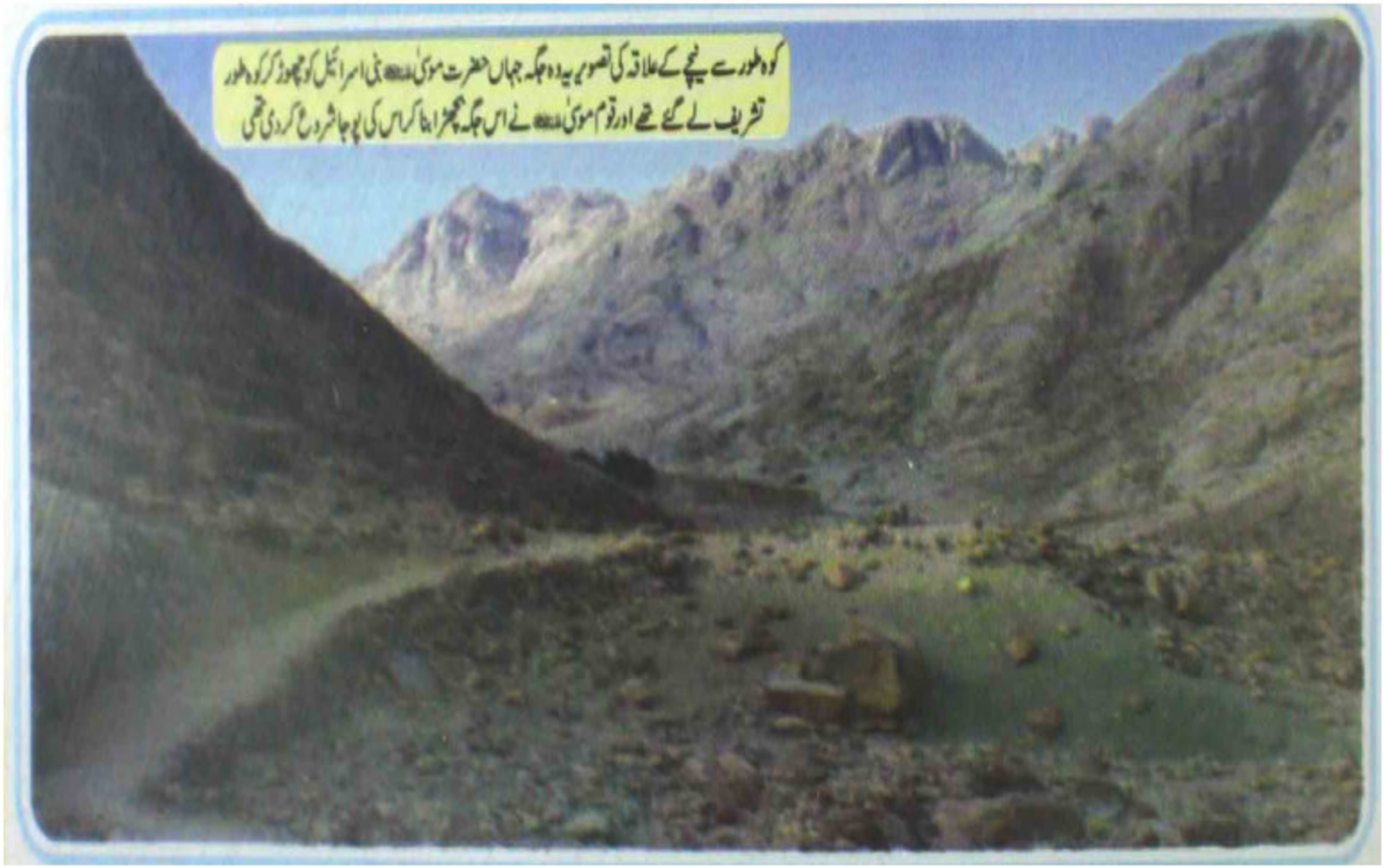
کوہ طور سے نیچے کے علاقہ کی تصویر یہ وہ جگہ جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو چھوڑ کر کوہ طور تشریف لے گئے تھے اور قوم موسیٰ علیہ السلام نے اس جگہ بچھڑا بنا کر اس کی پوجا شروع کر دی تھی

مَنَعَکَ اِذۡ رَاَیۡتَهُمۡ ضَلُّوۡۤا ۙ (۹۲) اَلَّا تَتَّبِعَنِ ؕ اَفَعَصَیۡتَ اَمۡرِیۡ (۹۳) قَالَ یَبۡنَؤُمَّ لَا تَاۡخُذۡ بِلِحۡیَتِیۡ وَ لَا بِرَاۡسِیۡ ۚ اِنِّیۡ خَشِیۡتُ اَنۡ تَقُوۡلَ فَرَّقۡتَ بَیۡنَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ وَ لَمۡ تَرۡقُبۡ قَوۡلِیۡ (طٰہٰ:۹۱تا۹۴)

ترجمہ:۔بنی اسرائیل بولے ہم تو موسیٰؑ کے واپس لوٹنے تک اس بچھڑے پر آسن مارے بیٹھے رہیں گے(طٰہٰ:۹۱) کہا موسیٰؑ نے اے ھارون تمہیں کس بات نے میرے پاس آنے سے روکا تھا جب انکو گمراہ ہوتے ہوئے دیکھا(طٰہٰ:۹۲) کہ تم میرے پیچھے نہ آئے تو کیا تم نے میرا حکم نہ مانا(طٰہٰ:۹۳) کہا ھارونؑ نے اے میری ماں جائے میری داڑھی اور سر کے بال نہ پکڑ مجھے اس بات کا خوف ہوا کہ تم کہو گے کہ میں نے بنی اسرائیل کو تفرقہ میں ڈال دیا اور تم نے میری بات کا انتظار نہ کیا(طٰہٰ:۹۱تا۹۴)

جب یہ سنا تو کچھ تسلی ہوئی کہ اس میں ہارونؑ کی چنداں غلطی نہیں اس پر آپؑ کا غصہ کچھ کم ہوا تو اپنے بھائی کو گلے سے لگالیا۔ پھر سامری کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سے اس قبیح فعل کی وضاحت چاہی کہ تم نے یہ حرکت کیونکر کی تو اس نے جواب دیا جو سورۃ طٰہٰ میں ہے:۔

قَالَ بَصُرۡتُ بِمَا لَمۡ یَبۡصُرُوۡا بِهٖ فَقَبَضۡتُ قَبۡضَةً مِّنۡ اَثَرِ الرَّسُوۡلِ فَنَبَذۡتُهَا وَ کَذٰلِکَ سَوَّلَتۡ لِیۡ نَفۡسِیۡ ۙ (۹۶) قَالَ فَاذۡهَبۡ فَاِنَّ لَکَ فِی الۡحَیٰوةِ اَنۡ تَقُوۡلَ لَا مِسَاسَ ۪ وَ اِنَّ لَکَ مَوۡعِدًا لَّنۡ تُخۡلَفَهٗ ۚ وَ انۡظُرۡ اِلٰۤی اِلٰهِکَ الَّذِیۡ ظَلۡتَ عَلَیۡهِ عَاکِفًا ؕ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنۡسِفَنَّهٗ فِی الۡیَمِّ نَسۡفًا (طٰہٰ:۹۶/۹۷)

ترجمہ:۔سامری بولا میں نے وہ دیکھا جو لوگوں نے نہ دیکھا تو ایک مٹھی بھر لی فرشتے کے نشان سے پھر اسے ڈال دیا اور میرے جی کو یہی بھلا لگا(طٰہٰ:۹۶) فرمایا موسیٰؑ نے تو چلتا بن کہ دنیا میں تیری یہ سزا ہے کہ تو کہے چھونہ جا اور بیشک تیرے لئے ایک وعدہ کا وقت ہے جو تجھ سے خلاف نہ ہوگا اور اپنے اس معبود کو دیکھ جسکے سامنے تو دن بھر آسن مارے رہا۔قسم ہے کہ ہم ضرور اسے جلائیں گے پھر ریزہ ریزہ کر کے دریا میں بہائیں گے(طٰہٰ:۹۷)

یہ گفتگو سامری اور حضرت موسیٰؑ کے مابین ہے جسکا خلاصہ یہ ہے کہ سامری نے ایک مرتبہ

حضرت جبرائیلؑ کو اسپ حیات پر اس وقت سوار دیکھا جب وہ حضرت موسیٰؑ سے قبل از اعتکاف ملاقات کیلئے آئے تھے وہیں سامری نے یہ مشاہدہ کیا کہ جہاں جہاں حضرت جبریل امینؑ کے گھوڑے کی ٹاپ پڑتی تھی وہاں وہاں سے زمین سبزہ اُگنے سے سرسبز ہو جاتی تو اس نے اس جگہ سے کچھ مٹی اٹھا کر اپنے پاس رکھ لی اور جب بچھڑا بنایا تو وہ مٹی بجنے والے اس آلہ میں رکھ دی جس کے باعث اس میں سے نکلنے والی آواز ہو بہو زندہ بچھڑے سے مشابہ تھی۔ یوں وہ بنی اسرائیل کو ورغلانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس پر سامری کو دنیا میں یہ سزا دی گئی کہ جو کوئی اس سے چھو جاتا' سامری اور چھونے والے دونوں کو سخت بخار آ جاتا۔ یوں اوّلاً تو کوئی اس سے ملنے پر راضی نہ رہا دوسرے وہ خود بھی اس اندیشے میں پریشان رہتا کہ اگر کوئی اُس سے چھو جائے تو وہ خود بھی اذیت ناک بخار میں مبتلا ہو جائیگا۔ اس لئے وہ آبادی کو چھوڑ کر جنگلی علاقے میں جا بسا اور ہر آتے جاتے کو پکار پکار کر خود سے چھو جانے سے باز رکھنے کی استدعا کیا کرتا۔ بہر حال جب حضرت موسیٰؑ کو حضرت ھارونؑ کی بیگناہی اور انکی مجبوری کا احساس ہو گیا تو آپ نے اپنے بھائی کو گلے لگا لیا اور پھر بارگاہِ الٰہیہ میں بغرضِ معافی عرض کرنے لگے:۔

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَلِاَخِیْ وَ اَدْخِلْنَا فِیْ رَحْمَتِکَ ۖ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ع (الاعراف: ۱۵۱)

ترجمہ:۔ (موسیٰؑ نے) عرض کی اے میرے رب مجھے اور میرے بھائی کو بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت کے اندر لے لے اور تو سب مہربانوں سے بڑھ کر مہربان ہے (اعراف/۱۵۱)

پھر حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کی طرف متوجہ ہوئے اور انہیں سخت سرزنش کی اور خدا خوفی کا احساس دلایا تو وہ بھی شرمندہ اور پریشان ہوئے۔ جسے قرآن نے یوں بیان فرمایا:۔

وَ لَمَّا سُقِطَ فِیْٓ اَیْدِیْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ یَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَ یَغْفِرْ لَنَا لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ (الاعراف: ۱۴۹)

ترجمہ:۔ اور جب پچھتائے اور سمجھے کہ ہم بہکے تو بولے اگر ہمارا رب ہم پر مہربانی نہ کرے اور ہمیں نہ بخشے تو ہم تباہ ہوئے (اعراف:۱۴۹)

اس پر اس قوم کو معاف فرمانے کی یہ شرط عائد ہوئی کہ وہ ایک دوسرے کو قتل کریں یعنی جس نے بچھڑے کی پوجا نہیں کی وہ اُن دوسروں کو (جنہوں نے یہ قبیح شرکیہ حرکت کی تھی) قتل کر ڈالیں اور قتل ہونے والے بے چون و چرا خود کو قتل ہونے کیلئے پیش کر دیں۔ چنانچہ صبح سے شام تک کئی ہزار لوگ قتل ہوئے یہاں تک کہ موسیٰؑ کو ان پر ترس آیا اور انہوں نے انکی مغفرت کیلئے دعا فرمائی چنانچہ بارگاہِ الٰہیہ سے باقی لوگوں کو معافی مل گئی اور انکی جان بخشی کر دی گئی اور جو اپنی رضامندی سے چپ چاپ قتل ہوئے انہیں شہادت کا رتبہ عطا فرما دیا گیا۔ اس ضمن میں قرآن کا فرمان سورۃ البقرۃ:۵۴ میں ہے:۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْۤا اِلٰی بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَیْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ (البقرۃ :۵۴)

ترجمہ:۔ اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم بیشک تم نے بچھڑے کو خدا بنا کر اپنے آپ پر ظلم ڈھایا سو تمہیں چاہیئے کہ اپنے خالق کے حضور توبہ کرو۔ پس قتل کروان اپنوں کو جنہوں نے شرک کیا یہ تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک تمہارے حق میں بہتر ہے۔ پھر حق تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول فرمالی۔ بیشک وہی بہت توبہ قبول فرمانے رحم فرمانے والا ہے (البقرۃ :۵۴)

اسی نوع کا فرمان سورۃ الاعراف میں یوں ہے:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَیَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُفْتَرِیْنَ (۱۵۲) وَ الَّذِیْنَ عَمِلُوا السَّیِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْۤا ۫ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۱۵۳)

ترجمہ:۔ بیشک جو لوگ بچھڑا لے بیٹھے انہیں عنقریب ذلت اور اپنے رب کا غضب دنیاوی زندگی ہی میں پہنچنے والا ہے اور ہم ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں بہتان باندھنے والوں کو (الاعراف:۱۵۲) اور جنہوں نے برائیاں کیں اور انکے بعد توبہ کی اور ایمان لائے تو پھر تمہارا رب بخشنے والا مہربان ہے (الاعراف:۱۵۳)

بنی اسرائیل کا اصلی وطن شام تھا یہ لوگ حضرت یوسفؑ کے عہد میں مصر چلے گئے تھے۔عمالقہ نامی قوم نے اس دوران شام پر قبضہ کرلیا۔ جب انہیں مصر سے آزادی ملی تو حکم ہوا کہ واپس شام اپنے وطن واپس چلے جاؤ کیونکہ ارضِ مقدس تمہیں عطا کردی گئی ہے۔ جہاں عمالقہ نامی ایک قوت ور اور جابر مشرک قوم آباد ہے تم لوگ ان سے جہاد کرو اور انکو فتح کر کے وہاں آباد ہو جاؤ۔مگر نسل در نسل غلامی میں پرورش پانے والی یہ قوم کسی طرح جہاد میں حصہ لینے پر رضامند نہ ہوئی۔حضرت موسٰیؑ حضرت ہارونؑ اور یوشع علیہ السلام نے انہیں حوصلہ دینے کی بہت کوشش کی کہ وہ بستی اللہ تعالیٰ نے تمہارے مقدر کردی ہے جونہی تم لوگ حملہ آور ہو گے تمہارے دشمنوں کے دلوں میں تمہارا خوف بھر دیا جائیگا اور وہ شکست کھا کر وہاں سے فرار ہو جائیں گے۔مگر بنی اسرائیل کا کہنا یہ تھا کہ اے موسٰیؑ تم اور تمہارا خدا جا کر عمالقہ سے لڑو جب وہ شکست کھا کر وہاں سے بھاگ جائیں تو پھر یقیناً ہم اس شہر میں داخل ہو جائیں گے۔اِس پر انکی ایسی بدتمیزی کی پاداش میں انہیں وادیٔ تیہ میں (جہاں وہ اُس وقت موجود تھے) چالیس سال قید کی سزا دیدی گئی۔انہوں نے اس وادی سے فرار ہونے کی بہت کوشش کی مگر وہ جتنا بھی سفر کرتے صبح ہوتی تو خود کو وہیں پاتے جہاں سے سفر شروع کیا تھا۔

وہاں دورانِ قید بھی یہ نت نئی فرمائشیں کیا کرتے کہ ہمیں دھوپ کی تمازت ستاتی ہے تو حضرت موسٰیؑ کی دعا و برکت سے ایک بدلی ان پر سایہ فگن رہنے لگی۔پانی کیلئے مختلف قبیلے آپس میں جھگڑتے رہتے یہاں تک کہ حضرت موسٰیؑ کلیم اللہ نے ایک چٹان پر اپنا عصا مارا تو اس سے بارہ چشموں کا اجرا ہو گیا اور بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں نے اپنا اپنا گھاٹ شناخت کرلیا اور اس سے متمتع ہونے لگے۔

وَ اِذِ اسْتَسْقٰی مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ (البقرة:٦٠)

ترجمہ:۔اور یاد کرو جب پانی کی دعا مانگی موسٰیؑ نے اپنی قوم کے لئے تو ہم نے فرمایا فلاں پتھر (چٹان) پر اپنا عصا ماریئے تو اس چٹان میں سے فوراً بارہ چشمے جاری ہو گئے اور بارہ گروہوں

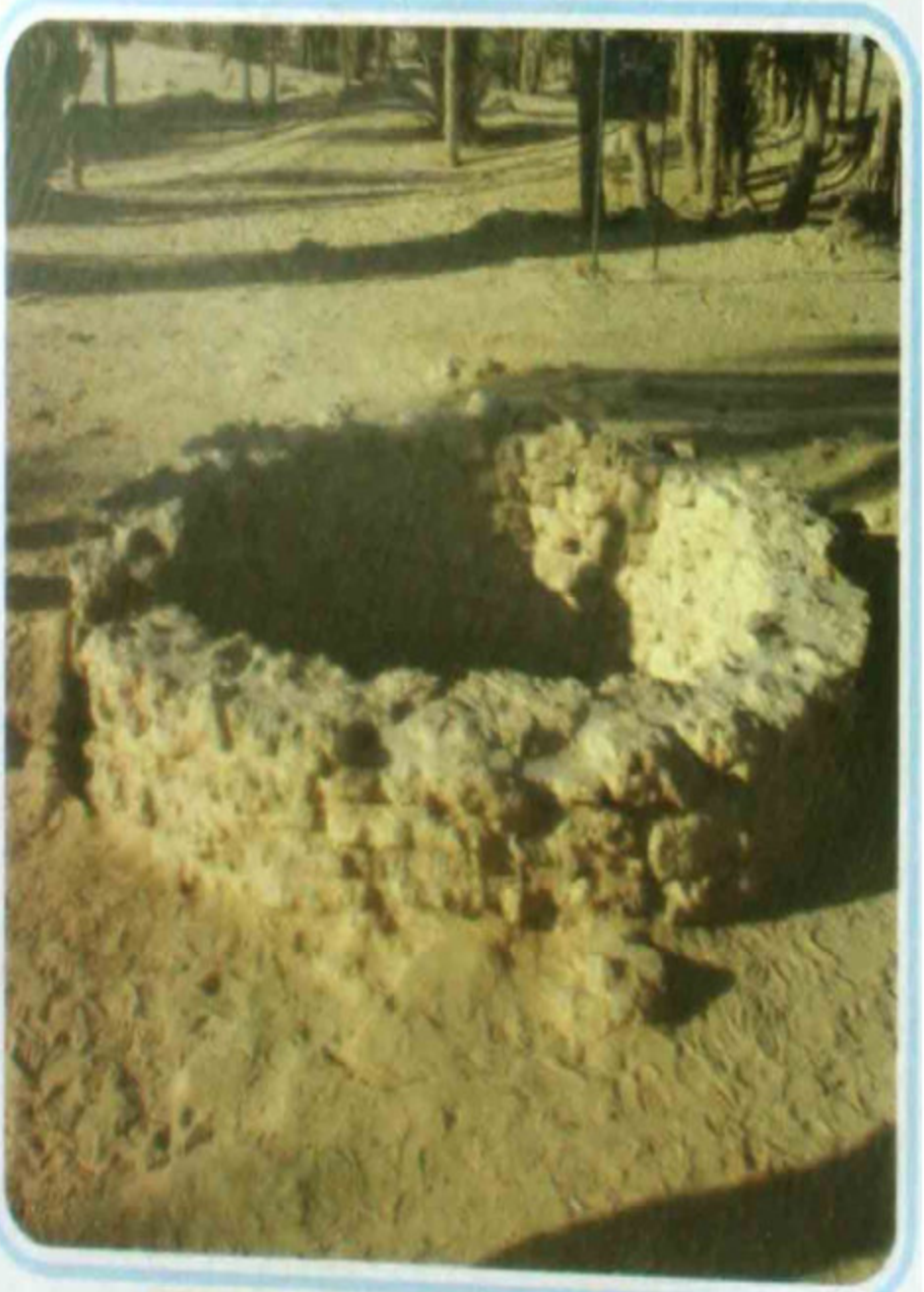

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے منسوب چشمہ

وادی تیہ وہ جگہ جہاں قوم موسیٰ نے 40 سال تک من وسلوی کھایا

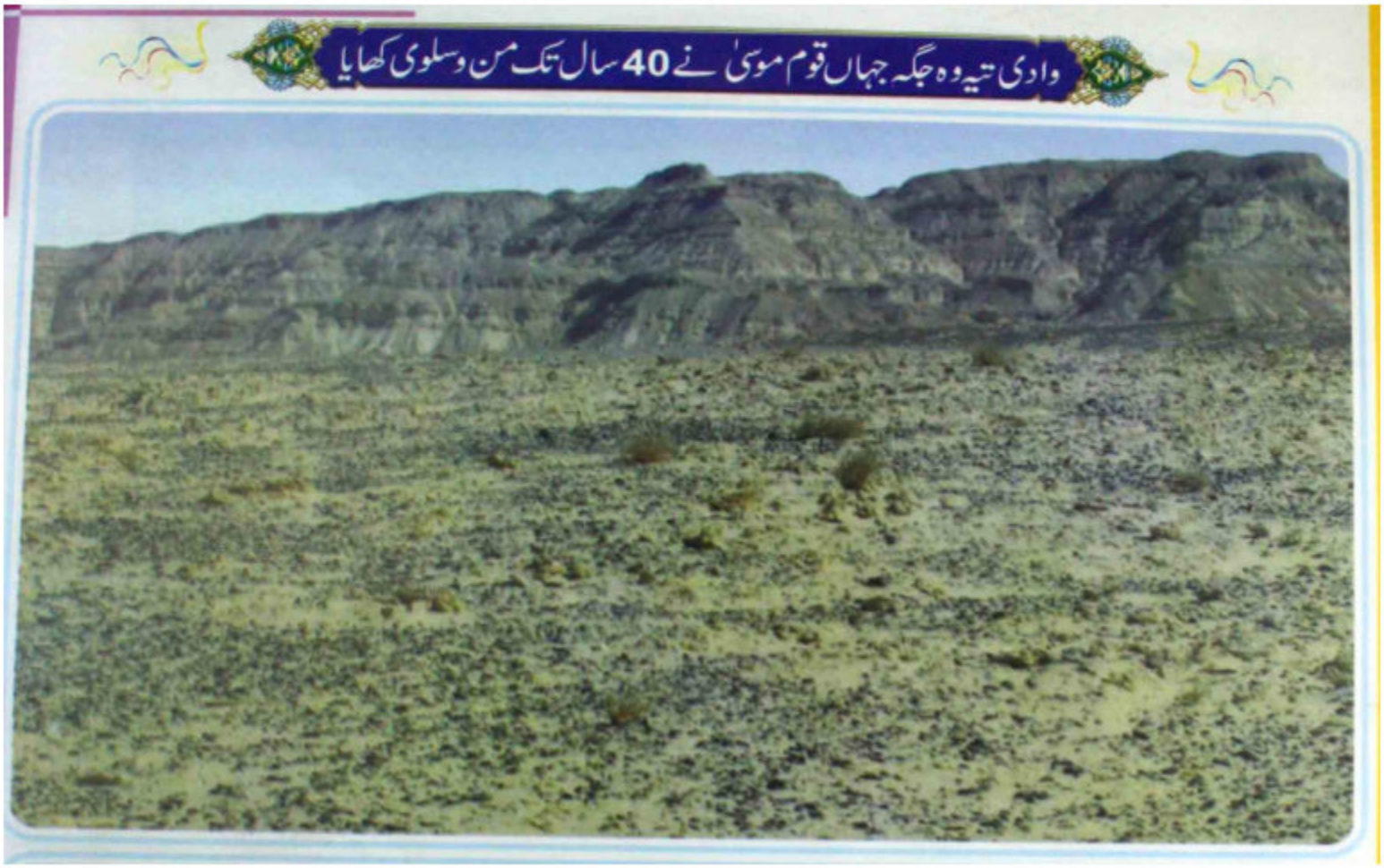

میں سے ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ پہچان لیا۔ (تو فرمایا) کھاؤ اور پیو اللہ کے دیئے رزق سے اور زمین میں فساد برپا نہ کرتے پھرو (بقرۃ:۶۰)

حضرت موسیٰؑ کی معرفت پروردگارِ عالم نے انکو بہت سہولیات سے نوازا۔ تیہ میں پیدا ہونے والے بچے لباس سمیت پیدا ہوتے اور جوں جوں پرورش پاتے بڑھتے رہتے توں توں انکے لباس بھی جسامت کے مطابق بڑھتے رہتے۔ بے طلب آسمان سے انکے کھانے کیلئے (من وسلوا) ہر روز نازل ہوتا مگر یہ بے مشقت روزی میسر آنے پر بھی خوش نہیں ہوئے اور مطالبہ کرنے لگے کہ ہمیں پیاز ککڑیاں اور سبزیاں دو کہ ہم وہ کھائیں۔ حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ نے کہا کہ کیا تم ایک اعلیٰ خوراک کے بدلے کم تر چیز کی فرمائش کرتے ہو۔ سورۃ بقرۃ کی آیۃ ۶۱ میں اسی کا تذکرہ فرمایا گیا ہے:۔

وَ اِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَ قِثَّآئِهَا وَ فُوْمِهَا وَ عَدَسِهَا وَ بَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَکُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَ ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْکَنَةُ ۟ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا وَّ کَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ع (البقرۃ: ۶۱)

ترجمہ:۔ اور (اے یہودیو) یاد کرو جب تم نے کہا اے موسیٰؑ ہم ایک ہی طرح کے کھانے پر صبر نہیں کر سکتے آپ ہمارے لئے اپنے پروردگار سے دعا کیجیے کہ وہ ہمارے لئے زمین سے اگنے والی اشیاء ساگ، ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز نکالے۔ موسیٰؑ نے کہا کیا تم عمدہ چیز کی بجائے ادنیٰ چیز طلب کرتے ہو (اگر ایسا ہی چاہتے ہو تو) کسی شہر میں جا رہو وہاں تمہیں یہ سب مل جائیگا جو تم نے طلب کیا ہے۔ (اس پر انہوں نے منہ بسورے اور بدتمیزی کی تو اسی آیت میں فرمایا) اور ہم نے ان پر ذلت و مسکینی مسلط کر دی اور وہ غضب الٰہی کے مستحق ہو گئے۔ یہ (سب کچھ) اس وجہ سے تھا کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے رہتے تھے۔ اور وہ انبیاء کو ناحق قتل کرتے تھے (یہ سب کچھ) اس وجہ سے تھا کہ وہ نافرمان تھے اور نافرمانی میں حد سے بڑھ

من و سلوٰی

جایا کرتے تھے (بقرۃ:۶۱)

آیت متذکرہ بالا میں واضح فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی پر زیادتی نہیں فرماتا۔ انکے بار بار گرفتارِ عذاب ہونے کی وجوہ یہ ہیں کہ وہ آیات خداوندی کا انکار کیا کرتے تھے۔ جو احکام نازل ہوتے انکی نافرمانی کیا کرتے اور نافرمانی میں حد سے تجاوز کرتے تھے اور انبیاء کو ناحق بے دریغ قتل کر ڈالتے تھے۔ جن وجوہ کی بناء پر انہیں بارہا غضب الٰہی کا سامنا کرنا پڑا۔

اس قسم کے جرائم اور قتل انبیاء جیسے مذموم افعال سے بنی اسرائیل کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ مثلاً جب زکریا علیہ السلام نے بلند جگہ پر کھڑے ہو کر یہودی احباروں سے کہا' چونکہ تم نے خداوند کو چھوڑ دیا ہے اس لئے اس نے بھی تمہیں چھوڑ دیا ہے۔ تو انہوں نے زکریا علیہ السلام کے خلاف سازش کر کے بادشاہ کو اپنے ساتھ ملا لیا اور بادشاہ کے حکم سے خدا کے گھر کے صحن میں انہیں پتھر مار مار کر سنگسار کر دیا۔ اسی طرح مرقس کے باب ۶ کی آیات ۱۷ تا ۲۹ میں حضرت یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) کے متعلق مذکور ہے کہ جب آپنے ہیرودیس بادشاہ کو اس بات پر ٹوکا کہ اس نے اپنے بھائی فلپس کی بیوی ہیرودیاس کو اپنے پاس داشتہ بنا کر کیوں رکھا ہوا ہے تو بادشاہ نے اتنی بات پر انہیں قید کر دیا اور بعد ازاں اپنی داشتہ کی فرمائش پر حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر کٹوایا اور ایک تھال میں رکھ کر اس کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ ہی نہیں بلکہ اور بہت سے انبیاء و پیغمبروں کو بھی ناحق شہید کرتے رہے۔

ایک مرتبہ بدتمیزی کرتے ہوئے کہنے لگے کہ ہمیں کیونکر یقین ہو کہ خدا نے ارضِ مقدس ہمیں عطا کرنے جیسا کوئی وعدہ کیا ہے اور کیا واقعی خدا تم سے ہم کلام ہوتا ہے۔ اس لئے ہماری تسلی کیلئے ہم میں سے کچھ چنیدہ افراد کو ہمراہ لے جا کر اپنی اور خدا کی باتیں سنواؤ کہ ہم یقین کر سکیں۔ چنانچہ ایسا بھی کیا گیا مگر کلام الٰہی سن کر بھی وہ مکر گئے اور کہنے لگے کہ ہم نے خدا کو تو دیکھا ہی نہیں ہمیں خدا کو دکھاؤ اور ہمارے سامنے خدا سے ہم کلامی کرو تا کہ ہم یقین کر سکیں۔ ان کی ایسی بدتمیزی و گستاخی پر انہیں ہلاک کر ڈالا گیا مگر حضرت موسیٰؑ کی عاجزانہ درخواست پر انہیں معافی عطا فرما کر دوبارہ زندگی دیدی گئی۔

حضرت موسیٰؑ کی وفات سے کچھ عرصہ پیشتر بنی اسرائیل کے مستقبل کی پیش گوئیوں اور آخری ہدایات کیلئے حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوا کہ یوشع کو ہمراہ لے کر خیمہ اجتماع میں آجائیں۔ اس وقت تجلی الٰہی ابر

کے ستون میں مسطور ہو کر خیمہ میں نمودار ہوئی اور حضرت موسیٰؑ سے خطاب ہوتا رہا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب بنی اسرائیل نے خدا تعالیٰ اور موسیٰؑ کی گفتگو خود سننے کی فرمائش کی تھی اور بنی اسرائیل کے ستر چنیدہ لوگ حضرت موسیٰؑ کے ہمراہ طور پر گئے تھے۔ چونکہ وہ ذات پوشیدہ ہے اس لئے خیمہ اجتماع کا لفظ استعمال ہوا کہ ان لوگوں نے صرف آوازِ مبارک کو سنا مگر یہ ستر حضرات بدتمیزی و بے ادبی کے شکار ہو گئے اور خدا کو آنکھوں دیکھنے کی فرمائش کر ڈالی۔ جس پر انہیں ایک زلزلے نے آلیا اور تمام لوگ ہلاک ہو گئے۔ اس واقعہ سے متعلق سورۃ الاعراف میں قرآن کا فرمان ہے:۔

وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَ اِيَّاىَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِىَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَ تَهْدِىْ مَنْ تَشَآءُ ؕ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَ اَنْتَ خَيْرُ الْغَافِرِيْنَ (الاعراف:۱۵۵)

ترجمہ:۔ اور موسیٰؑ نے اپنی قوم سے ستر مرد ہمارے وعدہ کیلئے چنے پھر جب انہیں زلزلہ نے آلیا تو موسیٰؑ نے عرض کی اے میرے رب تو چاہتا تو میرے سمیت انکو پہلے ہی ہلاک کر دیتا۔ کیا تو ہمیں اس کام پر ہلاک فرمائے گا جو ہمارے بے عقلوں نے کیا۔ وہ تیری آزمائش تھی تو اس سے جسے چاہے بہکائے اور جسے چاہے راہ دکھائے۔ تو ہمارا مولیٰ ہے تو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر اور تو سب سے بہتر بخشنے والا ہے (اعراف:۱۵۵)

آیت متذکرہ بالا کا تشریحی خلاصہ یوں ہے کہ توہّم کے شکار بنی اسرائیل کو گئوشالہ پوجا کے بعد کچھ شکوک نے آگھیرا کہ موسیٰؑ جس خدا سے ہم کلامی کا دعویٰ کیا کرتے اور نت نئے احکام ہم پر لاگو کرتے رہتے ہیں آخر کیوں نہ ہم خود چل کر انکی گفتگو اپنے کانوں سے سنیں تا کہ ہمیں یقین ہو سکے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے دبے لفظوں اس کا اظہار کیا اور کہا کہ ہم خدا کے حضور پیش ہو کر گئوشالہ پوجا جیسی حرکت کی معافی طلب کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر حضرت موسیٰؑ نے فرمایا میں اپنے رب سے اس کی اجازت لے لوں تبھی تم لوگوں کو ہمراہ لیجا سکونگا۔ اجازت عطا ہونے پر قومِ بنی اسرائیل نے اپنے ستر چنیدہ افراد کو قوم کی نمائندگی کیلئے حضرت موسیٰؑ اور حضرت یوشع علیہ السلام کے ہمراہ روانہ کر دیا۔ جب وہ

مقامِ میقات میں پہنچے تو ایک ابر چاروں طرف سے ان پر پھیل گیا جس سے یہ سب سجدہ میں گر گئے مگر خدا تعالیٰ کی گفتگو سن رہے تھے۔ جب ہم کلامی اختتام کو پہنچی تو بادل چھٹ گیا اور یہ اٹھ کھڑے ہوئے مگر اٹھتے ہی انہوں نے نئی فرمائش کر ڈالی کہ اے موسیٰؑ ہم آپ کو اور خدا کو گفتگو کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں اور صرف آواز سن کر مطمئن ہونے والے نہیں۔ کیا معلوم کہ وہ آواز خدا ہی کی تھی یا کسی اور کی۔ انکی ایسی گستاخی پر غضب الٰہی کے سبب زلزلہ کے شدید جھٹکے آنے لگے اور بجلی کڑکنے لگی۔ اس وحشت ناک منظر کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ بیہوش ہو کر گر پڑے اور بعض کے نزدیک ہلاک ہو گئے۔

موسیٰؑ نے جب یہ حالت دیکھی تو آپکو بنی اسرائیل کے برہم ہو جانے کا اندیشہ ہوا۔ وہ لوگ جو بات بات پر بگڑ جانے کے عادی ہیں جب یہ دیکھیں گے کہ ہمارے ستر آدمی لقمۂ اجل ہو گئے تو نہ معلوم کیا ادھم مچائیں گے۔ اس لئے حضرت موسیٰؑ نے بارگاہ ایزدی میں التجاء کی کہ اے رب بیشک تو ہر چیز پر با اختیار ہے زندگی و موت تیرے ہاتھ ہے تو اگر انہیں ہلاک کرنا ہی چاہتا تھا تو ہمارے یہاں میقات میں آنے سے پہلے قوم کے بیچ ہی میرے سمیت سب کو ہلاک کر دیتا۔ تا کہ وہ اس واقعہ کو اپنے سامنے دیکھ لیتے اور انہیں مجھ پر الزام تراشی اور اِن لوگوں کے قتل کی تہمت لگانے کا موقع نہ ملتا۔

اے مالک کیا تو ہمیں ایسے جرم پر ہلاک کرتا ہے جو قوم کے کچھ بے عقلوں نے کیا (یعنی خواہش دید کرنے والے یا بچھڑا پوجنے کے مرتکبین) تو یہ تو تیری طرف سے آزمائشیں ہیں تو ایسی آزمائشوں سے جسے چاہے گمراہ کر دے اور جسے چاہے سیدھا راستہ دکھائے۔ تو ہمارا مولیٰ ہے ہم پر رحم فرما اور ہماری بخشش فرما دے اور تو سب سے بہتر خطا پوش ہے۔ یعنی موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ کے قادرِ مطلق اور مختارِ کل ہونے کا اعتراف کرنے کے بعد اپنا دامن طلب پھیلایا۔ آپؑ نے اس حقیقت کا بھی اعتراف کیا کہ اگر توفیق الٰہی انسان کی دستگیری کرے تو ہی وہ امتحان و آزمائش کے میدان میں کامیاب ہو سکتا ہے اور اگر اسکی توفیق و تائید شامل حال نہ ہو تو معمولی سی آزمائش بھی انسان کی لغزش کا سبب بن جاتی ہے اور زُہد و پارسائی کے سارے جبے تار تار ہو جاتے ہیں۔ اس اعتراف اور اپنے عجز کی دہائی دینے پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کی التجاء قبول فرماتے ہوئے ہلاک ہونے والے تمام لوگوں کو نئی زندگی عطا فرما دی انہوں نے اٹھ کر معافی مانگی پھر وہ قوم میں واپس لوٹ گئے۔ یہودیوں کی ایک اور عہد شکنی کے ضمن میں

سورۃ البقرۃ میں انہیں خطاب فرمایا جارہا ہے کہ:۔

وَ اِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَکُمۡ وَ رَفَعۡنَا فَوۡقَکُمُ الطُّوۡرَ ؕ خُذُوۡا مَاۤ اٰتَیۡنٰکُمۡ بِقُوَّۃٍ وَّ اذۡکُرُوۡا مَا فِیۡہِ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ(۶۳) ثُمَّ تَوَلَّیۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ ۚ فَلَوۡ لَا فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَ رَحۡمَتُہٗ لَکُنۡتُمۡ مِّنَ الۡخٰسِرِیۡنَ(۶۴) (البقرۃ:۶۴)

ترجمہ:۔اور یاد کرو جب ہم نے کوہِ طور کو تمہارے اوپر بلند کر کے تم سے پختہ وعدہ لیا (اور حکم دیا) کہ ہم نے جو تمہیں دیا ہے (کتابِ توراۃ) اسے مضبوطی سے پکڑلو اور جو اس میں ہمارے احکام کی مد سے ہے اسے یاد رکھنا تا کہ تم پرہیزگار بن جاؤ (۶۳) پھر تم نے پختہ وعدہ کرنے کے بعد اس عہد سے منہ موڑ لیا تو اگر تم پر اللہ کا فضل اور اسکی رحمت نہ ہوتی تو تم ضرور نقصان اٹھانے والوں میں ہو جاتے (بقرۃ:۶۳/۶۴)

مراد ہے کہ اس وقت بھی جب کوہِ طور تم پر معلق اور گرنے والا تھا تمہارے معافی مانگنے اور توراۃ پر عمل پیرائی کے پختہ وعدہ کے بعد تمہیں ہلاک ہو جانے سے نجات دی مگر جب خطرہ ٹل گیا تو تم پھر عہد شکنی کے مرتکب ہو گئے جبکہ خدا تعالیٰ تو تمہیں جانتا ہی تھا اس نے اپنے فضل و کرم اور صفت رحمت کے صدقے میں تم پر مہربانی فرمائی وگرنہ تم اسی وقت خسارہ اٹھانے والوں میں ہو جاتے یعنی اسی حالت گناہ گاری میں ہلاک ہو جاتے۔حضرت موسیٰؑ کے دور کا ایک اور واقعہ سورۃ البقرۃ میں بیان فرمایا گیا ہے:۔

وَ اِذۡ قَتَلۡتُمۡ نَفۡسًا فَادّٰرَءۡتُمۡ فِیۡہَا ؕ وَ اللّٰہُ مُخۡرِجٌ مَّا کُنۡتُمۡ تَکۡتُمُوۡنَ ۚ (۷۲) فَقُلۡنَا اضۡرِبُوۡہُ بِبَعۡضِہَا ؕ کَذٰلِکَ یُحۡیِ اللّٰہُ الۡمَوۡتٰی ۙ وَ یُرِیۡکُمۡ اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ(البقرۃ:۷۲/۷۳)

ترجمہ:۔اور یاد کرو جب تم نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا تھا پھر تم اس قتل کا الزام ایک دوسرے پر ڈالنے لگے اور اللہ تعالیٰ اس کو ظاہر کرنے والا تھا جو تم چھپا رہے تھے (۷۲) تو ہم نے فرمایا اس مقتول کو گائے کے کسی ٹکڑے سے مارو۔تو یوں ہی زندہ فرمائے گا مُردوں کو اور تمہیں اپنی (قدرت کی) نشانیاں دکھاتا ہے تا کہ تم سمجھ جاؤ (بقرۃ:۷۳)

آیاتِ متذکرہ بالا اور بعد میں پیش کی جانے والی آیات اس ضمن میں ہیں کہ جب کوئی خود کو یا

اپنی کسی امانت کو خدا کے سپرد کرتا ہے تو وہ مہربان اسکی کیونکر حفاظت فرماتا ہے۔ جیسا کہ مفسرین نے بیان فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک نیکوکار شخص تھا جسکا ایک معصوم بچہ تھا اور اس کے پاس ایک بچھیا تھی۔ جب وہ مرنے کے قریب ہوا تو اس نے دعا کی اے بارالٰہ! اس ننھے بچے کیلئے یہ بچھیا میں تیرے پاس امانت چھوڑتا ہوں اور اس بچے کو تیرے سپرد کرتا ہوں اور پھر اس بچھیا کو جنگل میں چھوڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس نیک بندے کی عرض کو قبول فرمایا اور وہ بچھیا اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں پلتی بڑھتی رہی۔ جب اس شخص کا بچہ جوان ہوگیا تو اس کی ماں نے کہا گھر میں تو عرصہ سے فاقہ کی نوبت ہے۔ تیرے باپ نے ایک بچھیا تیرے لئے خدا کے سپرد کر کے جنگل میں چھوڑ دی تھی جا کر اسے تلاش کر کہ اسے فروخت کر کے کھانے پینے کا کچھ انتظام ہو سکے۔ وہ بچہ اس جنگل میں گیا جہاں وہ گائے چرا کرتی تھی۔ اپنے مالک کی آواز سنتے ہی وہ اسکے پاس آ گئی جو نہایت صحت منداور خوبصورت رنگ کی تھی۔

اسی دوران بنی اسرائیل نے ایک شخص کو قتل کر دیا اور اس کا الزام ایک دوسرے پر ڈالنے کی کوشش کرنے لگے۔ کچھ لوگ موسیٰؑ کے پاس حاضر ہو کر مقتول کے قاتل کے بارے دریافت کرنے لگے کہ اب آپ ہی معلوم کر کے بتائیں کہ یہ قبیح حرکت کس نے کی ہے۔ اس پر موسیٰؑ نے کہا کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ گائے کو ذبح کر کے اس کے جسم کا کوئی ٹکڑہ مقتول پر مارو تو وہ زندہ ہو کر اپنے قاتل کا نام بتا دیگا جس پر یہ لوگ اس گائے کی نشانیاں دریافت کرنے لگے جسکی وضاحت درج ذیل آیات میں یوں ہے:۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِہٖٓ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَۃً ؕ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ(۶۷) قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا هِیَ ؕ قَالَ اِنَّہٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَۃٌ لَّا فَارِضٌ وَّ لَا بِکْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَیْنَ ذٰلِکَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ(۶۸) قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّہٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَۃٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ(۶۹) قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا هِیَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَیْنَا ؕ وَ اِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ لَمُهْتَدُوْنَ(۷۰) قَالَ اِنَّہٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَۃٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِیْرُ الْاَرْضَ وَ لَا تَسْقِی الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَۃٌ لَّا شِیَۃَ فِیْهَا ؕ قَالُوا الْئٰنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَ مَا کَادُوْا یَفْعَلُوْنَ ﴿ع﴾ (۷۱) (سورۃ:البقرۃ)

ترجمہ:۔اور یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو تو کہنے لگے آپ ہمارا مذاق اڑاتے ہیں۔آپؑ نے کہا میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں کے گروہ میں شامل ہو جاؤں (٦٧) کہنے لگے تو ہمارے لئے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں اس گائے کے بارے بتائے کہ وہ کیسی ہے۔تو موسیٰؑ نے کہا اللہ فرماتا ہے کہ وہ گائے نہ تو بوڑھی ہو نہ ہی بچی ہو بلکہ درمیانی عمر کی ہو تو جو حکم تمہیں دیا جا رہا ہے اسے بجا لاؤ (٦٨) کہنے لگے کہ ہمارے لئے اپنے رب سے التجا کر کہ وہ ہمیں اسکا رنگ بتائے۔موسیٰؑ نے کہا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ایسی گائے جس کی رنگت خالص زرد خوب گہری ہو جو دیکھنے والوں کو فرحت بخشے (٦٩) کہنے لگے اپنے رب سے پوچھو کہ وہ کھل کر بتائے کہ گائے کیسی ہو۔بیشک ہم پر گائے مشتبہ ہوگئی ہے اور اگر خدا نے چاہا تو ضرور اس گائے کو تلاش کر لیں گے (٧٠) موسیٰؑ بولے کہ اللہ فرماتا ہے وہ گائے جس سے خدمت نہ لی گئی ہو کہ ہل چلائے زمین میں اور نہ کھیتوں کو پانی دیتی ہو۔بالکل بے داغ و بے عیب ہو۔(اس پر عاجز ہو کر) بولے اب آپ صحیح نشانیاں لائے۔پھر انہوں نے (اس گائے کو) ذبح کیا اور وہ ایسا کرتے معلوم نہیں ہوتے تھے (بقرۃ:٦٧ تا ٧١)

یعنی اگر سیدھے سیدھے فرمان سنتے ہی کوئی بھی گائے ذبح کر کے مقتول پر مارتے تو انکا کام ہو جاتا،مگر حجت بازی سے اس گائے کے اوصاف کی حامل گائے صرف اس نیک آدمی کے بیٹے کے پاس تھی جو ہوتے ہوتے اتنی مہنگی ہوگئی کہ بنی اسرائیل اسکی قیمت ادا کرنے میں مشکل سے دوچار ہو گئے کیونکہ اس گائے کی قیمت اس کی کھال میں سونے کی مہریں بھرنے کی مقدار کے برابر مقرر ہوئی اور حضرت موسیٰؑ اس پر ضامن ہوئے۔یوں جس نے اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس پر بھروسہ کرتے ہوئے اسے اپنی امانت سونپی تھی اس کریم نے اسے کیسے محفوظ رکھا اور کس شاندار پیرائے میں اسے واپس لوٹایا۔

مفسرین کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس گائے کو ذبح کر کے اس کے سینگ یا کان کے ٹکڑے کو اس مقتول سے مس کیا گیا تو اس میں یکا یک تحریک پیدا ہوئی وہ اٹھ کر بیٹھا اس نے اپنے قاتل کا نام بتایا اور پھر مردہ حالت میں واپس لیٹ گیا۔نیز گائے کو انکے ہاتھوں ذبح کروانا بھی مشیت سے خالی نہیں۔چونکہ

فرعون کی غلامی کے دوران بھی یہ لوگ گائے کی پوجا ہوتے دیکھتے آئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت موسیٰؑ کی غیر موجودگی میں پوجا کیلئے بچھڑا بنالیا تھا۔ بظاہر توبہ کرنے کے باوجود انکے دلوں سے بچھڑے کی محبت نہ گئی تھی اسلئے انکے ہاتھوں گائے ذبح کروائی گئی۔ سورۃ بقرۃ آیۃ ۹۳ میں بیان ہے:۔

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ عَصَیْنَا ۪ وَ اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا یَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِیْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (البقرۃ:۹۳)

ترجمہ:۔ اور یاد کرو جب ہم نے تم پر طور بلند کر کے تم سے پختہ عہد لیا اور تمہیں حکم دیا کہ جو (کتاب توراۃ کے احکام) تمہیں دیئے گئے ہیں انہیں مضبوطی سے پکڑ لو اور خوب غور سے سنو اس پر انہوں نے (زبان سے) کہا ہم نے سن لیا اور (دل سے) مانا نہیں اور انکے دل سیراب ہو چکے تھے بچھڑے (کے عشق) سے جو انکے پیہم انکار کی نحوست تھی۔ (اے موسیٰؑ) آپ فرمایئے کہ (اگر تم اپنے تئیں ایماندار بنتے ہو تو) بہت برا حکم کرتا ہے تمہارا (یہ عجیب و غریب) ایمان (بقرۃ:۹۳)

یہ تو دورِ موسوی کی باتیں ہیں اِن یہودیوں کا دورِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ حال تھا کہ انہوں نے علم رکھتے ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جانتے پہچانتے ہوئے ایمان لانے اور اسلام قبول کرنے سے انکار کیا۔ وہ احکام جو نبی آخر الزمان پر ایمان لانے کی تاکیدات سے متعلق تھے انہیں بھی تحریفات کی بھینٹ چڑھا ڈالا۔ سورۃ بقرۃ آیۃ:۸۹ یہودیوں کی ہٹ دھرمی اور دانستہ کفر کی مثال بیان فرمائی جارہی ہے:۔

وَ لَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ یَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ۚۖ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۚ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ (۸۹) (البقرۃ:۸۹)

ترجمہ:۔ اور جب آئی انکے پاس وہ کتاب (قرآن) جو تصدیق کرتی تھی اس کتاب (توراۃ) کی جو انکے پاس تھی (تو اسے ماننے سے انکار کر دیا حالانکہ) وہ اس سے پیشتر (کفار کے خلاف لڑائی میں) فتح مانگا کرتے تھے (اِس نبی کے وسیلہ سے) پھر جب وہ آ تشریف

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرنور قبر مبارک

فرماہوئے جسے جانتے تھے تو اس کو ماننے سے انکار کر دیا۔ پس خدا کی پھٹکار ہو (دانستہ) کفر کرنے والوں پر (بقرۃ:۸۹)

الغرض انکی ایسی بہت سی بدتمیزیاں اور نافرمانیاں تادیر جاری رہیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ ہٹ دھرم نافرمان قوم بعدازاں بھی اپنی انوکھی اور غلامانہ ذہنیت سے طویل مدت تک آزاد نہ ہوسکی۔

نوٹ:۔

حضرت موسٰیؑ کی وفات اور آپؑ سے متعلقہ کچھ احوال، یعنی قومِ بنی اسرائیل مصر سے خروج کے بعد کن حالات سے دوچار ہوئی، حضرت موسٰیؑ کی حضرت خضرؑ سے ملاقات اور دیگر کچھ قابل ذکر واقعات ہنوز قابل بیان ہیں۔ چونکہ انکا تذکرہ حضرت ہارونؑ کے ذکر کے ساتھ ہوا ہے اور کچھ واقعات کی نسبت حضرت یوشع علیہ السلام کے ساتھ بھی ہے اس لئے بہتر ہے کہ موسٰیؑ کے دیگر واقعات حضرت ھارون علیہ السلام اور حضرت یوشع بن نونؑ کے حالات کے ساتھ پیش کروں اور ہم حضرت موسٰیؑ کے بڑے بھائی (ھارونؑ جو خود بھی پیغمبر ہیں) کے احوال اور حضرت موسٰیؑ کے ایک اور ساتھی حضرت یوشع علیہ السلام سے بھی متعارف ہوسکیں جو کہ حضرت موسٰیؑ کے خادم خاص تھے پیغمبر کے عہدہ جلیلہ سے معزز تھے اور حضرت موسٰیؑ کی حضرت خضرؑ سے ملاقات کے سفر میں بھی آپکے ہم سفر تھے۔

قرآن حکیم میں حضرت موسٰیؑ کا ذکر کم وبیش چالیس سورتوں میں آیا ہے۔ جن میں سے سورۃ اعراف، سورۃ یونس، سورۃ بنی اسرائیل، سورۃ طٰہٰ، سورۃ شعراء اور سورۃ قصص میں تفصیلاً ذکر فرمایا گیا ہے۔ اور سورۃ ال عمران، سورۃ نسا، سورۃ مائدۃ، سورۃ انعام، سورۃ انفال، سورۃ یونس، سورۃ ہود، سورۃ ابراہیم، سورۃ مریم، سورۃ انبیاء، سورۃ مومنون، سورۃ فرقان، سورۃ نمل، سورۃ عنکبوت، سورۃ سجدہ، سورۃ احزاب، سورۃ صافات، سورۃ ص، سورۃ مومن، سورۃ حٰم سجدہ، سورۃ زخرف، سورۃ دخان، سورۃ احقاف، سورۃ ذاریٰت، سورۃ قمر، سورۃ صف، سورۃ حاقہ، سورۃ مزمل، سورۃ نازعات، سورۃ بروج، سورۃ اعلیٰ اور سورۃ فجر میں اختصاراً ذکر موجود ہے۔

حضرت ھارون علیہ السلام

حضرت ھارونؑ حضرت موسٰیؑ سے (بلحاظ عمر) تین سال بڑے اور آپکے سگے بھائی ہیں۔ توراۃ شریف اور قرآن حکیم میں حضرت موسٰیؑ کے ساتھ ساتھ آپکا تذکرہ بھی متعدد بار ہوا ہے اور بلاشبہ آپؑ بھی اللہ تعالٰی کے جلیل القدر نبی و پیغمبر ہیں' اگرچہ توراۃ شریف میں آپکا ذکر نبی یا پیغمبر کے طور پر نہیں کیا گیا۔ البتہ آپؑ کو بحیثیت کاہن تسلیم کیا اور مومن قرار دیا ہے۔ اہل یہود میں کاہن کی وہی حیثیت ہے جو اہل اسلام میں امام کی۔ اسی لئے تاریخ بنی اسرائیل میں مشہور جرمن فاضل ہینرچ بوالڈ نے متذکرہ تاریخ کی جلد اوّل کے صفحہ ۲۵ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ جس طرح یہودیوں میں کاہن ہے اسی طرح مسلمانوں کے ہاں امام کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

آپؑ شریعت' عبادت خانہ اور قربانی وغیرہ کے انتظام اور رسومات انجام دینے پر مامور تھے۔ قومِ بنی اسرائیل آپکو کاہن (امام) گردانتی تھی مگر توراۃ کی اس تصریح کے برعکس قرآن حکیم نے آپکی نبوت و پیغمبری کا برملا اعتراف کیا ہے۔ جیسا کہ سورۃ مریم آیۃ ۵۳ میں ہے کہ:۔

وَ وَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا (مریم: ۵۳)

ترجمہ:۔ اور ہم نے اپنی رحمت سے اس (موسٰیؑ) کو اسکا بھائی ہارون نبی عطا فرمایا (مریم: ۵۳)

حضرت ھارونؑ بلاشبہ حضرت موسٰیؑ کی نبوت میں برابر شریک اور آپ کے مددگار رہے۔ آپ کو قرآن نے حضرت موسٰیؑ کا وزیر کہہ کر خطاب کیا ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ۚ (فرقان: ۳۵)

ترجمہ:۔ اور ہم نے موسٰیؑ کو کتاب عنایت کی اور انکے بھائی ہارون کو (ان کا) وزیر یعنی مددگار بنا کر انکے ساتھ کیا (فرقان: ۳۵)

پھر جب حضرت موسٰیؑ کو سرکش فرعون کی سرکوبی کیلئے بھیجا گیا تو اس وقت بھی حضرت ھارونؑ بحکم خداوند تعالٰی ان کے ہمراہ تھے۔ بنابرایں بنی اسرائیل کے دورانِ قیامِ مصر جب نماز کا حکم ہوا تو اس کی وحی بھی حضرت موسٰیؑ اور حضرت ھارونؑ دونوں کی طرف بھیجی گئی۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہوا:۔

وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰی وَ اَخِیۡہِ اَنۡ تَبَوَّاٰ لِقَوۡمِکُمَا بِمِصۡرَ بُیُوۡتًا وَّ اجۡعَلُوۡا بُیُوۡتَکُمۡ قِبۡلَۃً وَّ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ ؕ وَ بَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ() (یونس:۸۷)

ترجمہ:۔اور ہم نے موسیٰؑ اور اسکے بھائی کی طرف وحی بھیجی کہ اپنی قوم کے لئے مصر میں گھر بناؤ اور اپنے گھروں کو قبلہ (مسجد) ٹھہراؤ اور نماز قائم کرو اور مومنوں کو خوشخبری سنادو (یونس:۸۷)

حضرت ھارونؑ کی زندگی بھی تقریباً وہی ہے جو حضرت موسیٰؑ کی بعض کے نزدیک آپ موسیٰؑ سے تین سال بڑے تھے اس طرح سن پیدائش ۱۵۲۳ق م نکلتا ہے توراۃ میں ہے:۔

اور موسیٰ اسّی اور ہارون تراسی برس کا تھا جب وہ فرعون سے ہم کلام ہوئے (خروج باب ۷)

حضرت ہارونؑ کے والد کا نام عمرام (عمران) اور والدہ ماجدہ کا نام یوکبد تھا اور یہی ولدیت حضرت موسیٰؑ کی بھی ہے۔آپکی ولادت بھی مصر ہی میں ہوئی اور وہیں پرورش پائی۔توراۃ شریف اور قرآن حکیم سے واضح ہے کہ آپ نہایت خوش کلام اور فصیح البیان تھے۔سورۃ قصص میں اس بات کی وضاحت بھی موجود ہے کہ ھارونؑ کو اپنے بھائی حضرت موسیٰؑ کی دعا کی برکت سے نبوت عطا فرمائی گئی تھی۔غالباً اسکی وجہ بھی حضرت ھارونؑ کی فصاحت و بلاغت اور خوش کلامی ہے۔القصص میں ہے:۔

وَ اَخِیۡ ہٰرُوۡنُ ہُوَ اَفۡصَحُ مِنِّیۡ لِسَانًا فَاَرۡسِلۡہُ مَعِیَ رِدۡاً یُّصَدِّقُنِیۡۤ ۫ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اَنۡ یُّکَذِّبُوۡنِ(۳۴) قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَکَ بِاَخِیۡکَ وَ نَجۡعَلُ لَکُمَا سُلۡطٰنًا فَلَا یَصِلُوۡنَ اِلَیۡکُمَا ۚۖ بِاٰیٰتِنَا ۚۛ اَنۡتُمَا وَ مَنِ اتَّبَعَکُمَا الۡغٰلِبُوۡنَ (القصص:۳۴/۳۵)

ترجمہ:۔اور میرا بھائی ہارون مجھ سے بہت زیادہ فصیح البیان ہے تو اسے میری مدد کیلئے رسول بنا کہ میری تصدیق کرے مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے (القصص:۳۴) فرمایا قریب ہے کہ ہم تیرے بازو کو تیرے بھائی سے قوت دیں گے اور تم دونوں کو غلبہ عطا فرمائیں گے تو ہماری نشانیوں کے سبب وہ تم دونوں کا کچھ نقصان نہ کرسکیں گے تم دونوں اور جو تمہاری پیروی کریں گے غالب آؤ گے (القصص:۳۵)

اس سے پیشتر تک حضرت ھارونؑ کو عہدہ نبوت سے نوازا نہیں گیا تھا۔یہ اس وقت کی بات ہے جب حضرت موسیٰؑ کو مدین سے واپسی پر کوہِ طور پر آگ کی روشنی دکھائی دی اور وہاں نبوت سے سرفراز

ہوئے تو حکم ہوا کہ فرعون کو جا کر دعوتِ حق دو اور بنی اسرائیل کو اس کی قید سے رہا کرواؤ۔ اس پر آپؑ کو خدشہ لاحق ہوا کہ میں وہاں سے ایک قتل میں ملوث ہو کر فرار ہوا تھا واپس جاتے ہی فرعون کی قید میں نہ آ جاؤں اس پر فرمان ہوا کہ تم فکر نہ کرو۔ تبھی حضرت موسیٰؑ کو اپنی زبان کی لکنت کا بھی احساس ہوا اور آپؑ نے حق تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے بڑے بھائی کو اپنا ساتھی بنانے کی درخواست کی جو قبول فرمالی گئی اور یوں حضرت ھارونؑ کو بھی خلعت نبوت سے نواز کر آپکے ہمراہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہی ارشاد ہوا کہ تم دونوں ہماری نشانیاں لے کر جاؤ اور میری یاد سے غفلت نہ برتنا۔

اس وقت سے زندگی کے آخری لمحات تک حضرت ھارونؑ اپنے بھائی کے وزیر کی حیثیت سے آپکے مددگار رہے' ہر آڑے وقت میں حمایت و نصرت فرماتے رہے اور دونوں ایک ساتھ فرعون کے دربار میں پہنچے۔ جب فرعون کے ساحرین سے مقابلہ ہوا تو ساحرین مات کھا کر بے ساختہ سجدوں میں گر گئے اور یہ کلمات ادا کرنے لگے جسے قرآن نے سورۃ اعراف میں بیان فرمایا:۔

قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱۲۱) رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ (۱۲۲)

ترجمہ:۔ کہنے لگے ہم پروردگارِ عالم پر ایمان لائے (الاعراف:۱۲۱) ہم موسیٰؑ اور ہارونؑ کے رب پر ایمان لائے (الاعراف:۱۲۲)

اسی بات کو سورۃ شعراء میں بھی یوں بیان فرمایا گیا:۔

فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا (۴۶) قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۴۷) رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ (شعراء: ۴۶تا۴۸)

ترجمہ:۔ پس ساحرین سجدوں میں گرنے لگے () کہنے لگے ہم پروردگارِ عالم پر ایمان لائے () موسیٰؑ اور ھارونؑ کے پروردگار پر ایمان لائے ()(شعراء۴۶تا۴۸)

حضرت ھارونؑ آخری وقت تک تیہ میں بنی اسرائیل کے ساتھ رہے۔ وادیٔ سینا میں بھی آپؑ بنی اسرائیل کے ساتھ فیدرم پہنچے جہاں ضرب کلیمی نے ٹھوس چٹان سے پانی کے بارہ چشمے بہائے تھے۔ پھر آپؑ قادس برنیع میں بھی ساتھ تھے جہاں من وسلویٰ نازل ہوا۔ پھر جب بنی اسرائیل قادس سے چلے تو آپؑ انکے ہمراہ ادوم کی سرحد پر کوہِ شعیر کے دامن میں سے ہوتے ہوئے گزرے تھے۔ البتہ

یہ حضرت ھارون علیہ السلام کا آخری سفر تھا یہیں آپؑ کا انتقال ہوا۔آپؑ نے ۱۲۳ برس کی عمر پائی۔آپکا سن وفات ۱۴۰۰ ق م ہے۔آپکی شادی مصر میں ہوئی آپکی زوجہ محترمہ کا نام الیسع تھا جو عمیذاب کی بیٹی اور عنسون کی بہن تھیں ۔آپکے چار فرزند پیدا ہوئے جن کے نام (۱)ندب (۲) ابیہو (۳)الیعزر اور (۴)اتمر تھے۔الیعزر کی شادی فوطیل کی دختر سے ہوئی جس میں سے فنیحاس تولد ہوئے۔

حضرت ھارونؑ کے ذکر کے ساتھ ساتھ حضرت موسٰیؑ سے حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات کا ذکر کرتا ہوں۔جس کے بعد حضرت موسٰیؑ کے ایک اور معتمد ساتھی حضرت یوشع علیہ السلام کا ذکر کرونگا۔ کیونکہ حضرت موسٰیؑ کے ساتھ جیسے حضرت ھارونؑ کی وابستگی رہی اسی طرح حضرت یوشع علیہ السلام بھی آپ ہر دو حضرات کے ساتھ رہے۔حضرت موسٰیؑ کی حضرت خضرؑ سے ملاقات کے وقت بھی آپؑ ہمراہ تھے اور حضرت ھارونؑ کے زمانہ میں بنی اسرائیل کی وادئ تیہ میں قید کے دوران بھی۔

وفات حضرت ھارونؑ و موسٰیؑ :۔ایک روایت میں ہے کہ جب حضرت موسٰیؑ اور ھارونؑ کو میدانِ تیہ میں تیس برس گزر چکے تو حضرت موسٰیؑ کو وحی ہوئی کہ فلاں روز فلاں وقت اور فلاں جگہ پر ھارونؑ کو اپنے پاس بلالوں گا۔ چنانچہ وقت موعود کے مطابق حضرت موسٰیؑ نے اپنے بھائی ھارونؑ کو کہا کہ بھائی اس میدان سے فلاں جگہ چل کر دیکھیں۔ جب وہاں پہنچے تو ایک باغ دیکھا جو نہایت خوبصورت تھا اور اسکے نیچے ایک نہر جاری تھی۔اس کے کنارے پر ایک تخت بچھا ہوا دیکھا تو حضرت ھارونؑ اس پر بیٹھ گئے اور نہایت مسرور ہوتے ہوئے فرمانے لگے سبحان اللہ کیسی خوبصورت اور پُرسکون جگہ ہے جی چاہتا ہے یہیں رہ جاؤں۔اسی اثناء میں ملک الموت نے آکر انکی جان قبض کرلی اور تخت سمیت زمین کے اندر پہنچادیا کہ نشانِ قبر بھی مٹ گیا۔

حضرت موسٰیؑ کو بھائی کی جدائی کا رنج ہونا ایک فطری عمل تھا تاہم جب آپؑ نے قوم میں واپس جاکر حضرت ھارونؑ کے انتقال کی اطلاع کی تو بنی اسرائیل (جو حضرت ھارونؑ سے نسبت محبت زیادہ رکھتے تھے) کہنے لگے آپ انہیں ساتھ لیکر گئے تھے وہ مرے نہیں یا پھر آپ ہی نے انہیں مار ڈالا ہے۔حضرت موسٰیؑ نے فرمایا خدا گواہ ہے کہ میں نے اسے نہیں مارا۔اس پر وہ کہنے لگے کہ ہمیں انکی لاش دکھاؤ تاکہ ہم زخم وغیرہ دیکھ کر قیاس کریں کہ واقعی آپ نے انہیں مارا ہے یا نہیں۔حضرت موسٰیؑ نے

دعا کی تو رب تعالیٰ نے دعا قبول فرمالی اور زمین سے آپ کی لاش باہر نکل آئی۔ انہوں نے اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھا تو کہیں کوئی زخم یا وجہ موت کا سراغ نہیں ملا۔ اس کے باوجود بنی اسرائیل کسی طرح یقین کرنے پر تیار نہ ہوئے اور حضرت موسیٰؑ پر الزام لگاتے رہے۔ حضرت موسیٰؑ نے بارگاہِ خداوند تعالیٰ میں پھر استدعا کی کہ گواہی کیلئے ھارونؑ کو زندہ فرمادے' چنانچہ ایک لحہ کیلئے حضرت ھارونؑ کو زندگی عطا ہوئی آپؑ نے اتنا کہا کہ مجھے میرے بھائی نے نہیں مارا بلکہ میں خدا تعالیٰ کے حکم سے اپنی طبعی موت مرا ہوں یہ فرما کر آپؑ پھر جاں بحق ہوگئے اور بنی اسرائیل کی آنکھوں کے سامنے اسی لحہ غائب ہوگئے اور زمین پہلے کی مانند برابر ہوگئی۔ اسی لئے حضرت ھارونؑ کی قبر مبارک کا کوئی نشان موجود نہیں۔

حضرت موسیٰؑ سرخرُو ہو کر قوم میں واپس آئے اور اپنے بھانجے یوشع بن نون کو اپنا خلیفہ مقرر فرمایا' کیونکہ آپکی وفات کا وقت بھی قریب آچکا تھا۔ وفاتِ حضرت ھارونؑ کے تین سال بعد حضرت عزرائیلؑ حضرت موسیٰؑ کے پاس حاضر ہوئے تو حضرت موسیٰؑ نے پوچھا کہ اے ملک الموت تو مجھ سے ملاقات کیلئے آیا ہے یا روح قبض کرنے کا ارادہ ہے۔ وہ کہنے لگے میں آپؑ کی روح قبض کرنے کیلئے حاضر ہوا ہوں۔ تو آپؑ طیش میں آگئے اور فرمانے لگے میں نے ہزارہا بار اپنے پروردگار سے شرفِ ہمکلامی پایا جو بغیر کسی واسطہ کے تھا۔ اسکی عزت کی قسم میں بھی تمہیں اپنی جان اتنی جلد دینا قبول نہیں کرونگا اور یہ فرما کر جان دینے سے انکار کردیا۔ ایک روایت ہے کہ طیش میں حضرت عزرائیلؑ کے چہرے پر تھپڑ رسید کیا' جس پر حضرت عزرائیلؑ واپس چلے گئے اور جناب باری تعالیٰ جل جلالہ کے حضور عرض کیا کہ اے رب جیسا کہ تو جانتا ہے تیرے بندے نے اپنی جان دینے سے انکار کردیا اور شدید ناراضگی کا اظہار فرمایا ہے۔ اس پر حضرت موسیٰؑ پر وحی ہوئی کہ اے موسیٰؑ کیا تو ہمارے پاس آنا نہیں چاہتا۔ حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا اے بارِ الٰہ میں تیری طرف آنے کو راضی ہوں' تیرے دیدار کیلئے بیقرار ہوں اور ہزار بار یہ جان فدا کرنے کا خواہش مند ہوں' البتہ ایک بار مزید کوہِ طوُر پر جا کر مناجات اور آپ کا شکر ادا کرنا چاہتا ہوں اور خواہش ہے کہ دنیا سے لوٹنے سے پہلے ایک بار پھر آپ جل جلالہ سے شرفِ ہمکلامی کا اعزاز پاؤں۔ چنانچہ آپؑ کو اسکی اجازت عطا فرمادی گئی اور آپؑ کوہِ طوُر پر جا کر بارگاہِ ایزدی میں عرض کرنے لگے:۔

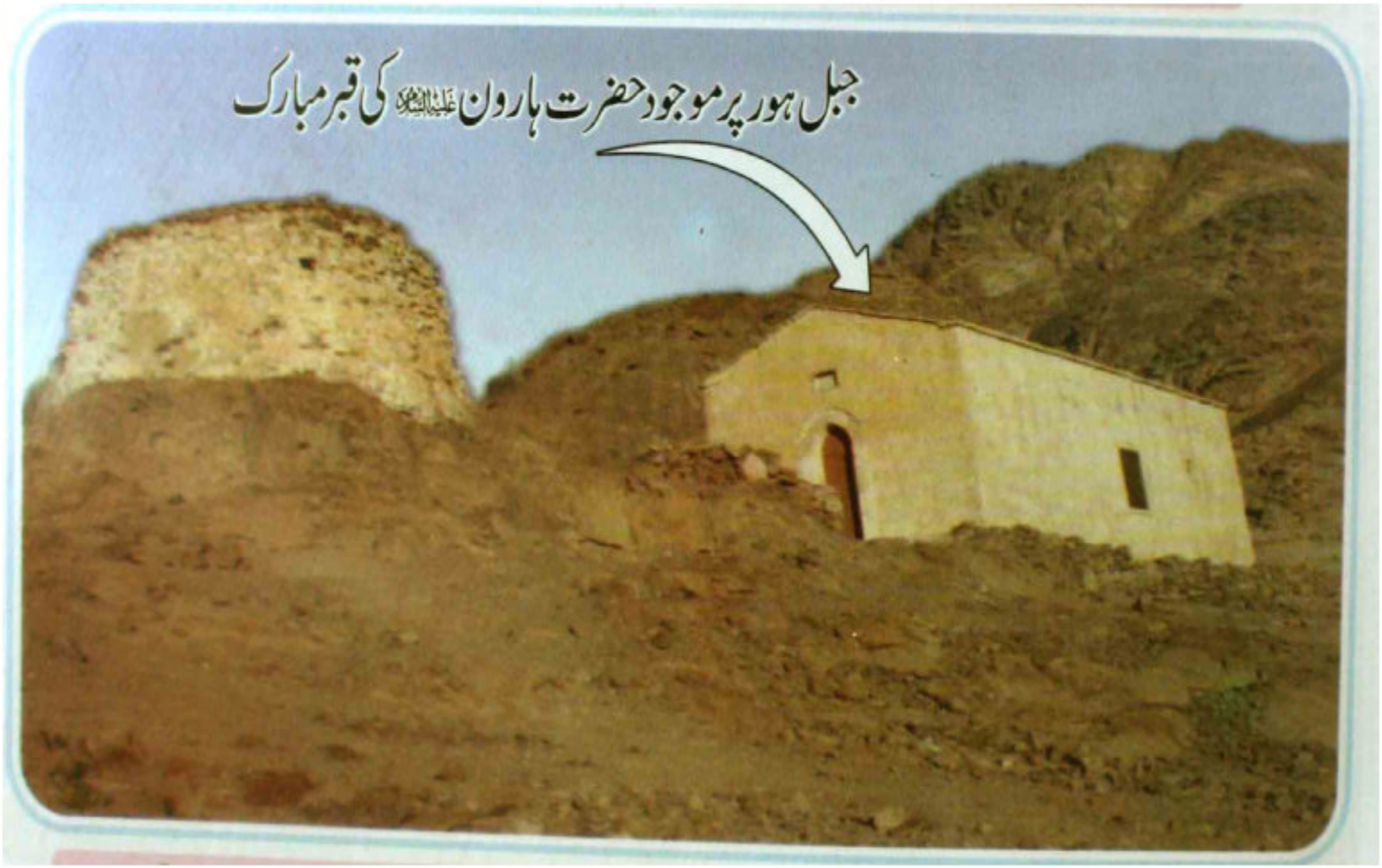
جبل ہور پر موجود حضرت ہارون علیہ السلام کی قبر مبارک

''خدایا میں نے اپنی آل اور اُمت تجھ کو سونپی تو انکو اپنی پناہ میں رکھیو' ان کو مالِ حرام سے باز رکھیو اور انہیں حلال روزی عطا فرمانا جیسا کہ تو جاننے والا ہے میری اُمت ناتواں ہے''۔

فرمان رب العالمین ہوا کہ عصا پتھر پر مار جب ایسا کیا تو پتھر دو ٹکڑے ہو گیا اور بیچ میں سے ایک رینگتا ہوا کیڑا برآمد ہوا۔ فرمایا کہ جب میں اس پتھر میں موجود کیڑے کو بھی رزق پہنچاتا ہوں تو تیری امت کیونکر اس سے محروم رہے گی۔ یہ سن کر موسیٰؑ خوش ہو گئے اور طوُر سے نیچے اتر آئے۔ راستہ میں دیکھا کہ کچھ لوگ ایک قبر کھود رہے ہیں تو آپؑ بھی ثواب کی نیت سے اس کام میں شامل ہو گئے۔ پھر کسی نے کہا کہ میت کا قد کاٹھ اور جسامت بالکل آپؑ جیسی ہے قبر میں لیٹ کر دیکھ لیں کہ آیا ہر طرح سے درست ہے یا کچھ فرق ابھی باقی ہے۔ آپؑ قبر میں اتر گئے اور لیٹ کر فرمانے لگے واہ سبحان اللہ کیسی اچھی قبر ہے کاش میری قبر بھی ایسی ہی ہو۔ اسی دوران حضرت عزرائیلؑ نے جنت کا ایک سیب حضرت موسیٰؑ کو پیش کیا۔ آپؑ نے جیسے ہی سیب کو سونگھا حضرت عزرائیلؑ نے آپؑ کی روح قبض کر لی اور یوں حضرت موسیٰؑ جاں بحق تسلیم ہو گئے۔ وہاں موجود قبر کھودنے والے دراصل فرشتے تھے جنہوں نے آپؑ کو غسل دیا' کفن اوڑھایا اور اسی قبر میں دفنا کر قبر کو حضرت ھارونؑ کی قبر کی مانند زیر زمین کر دیا۔ اسی بناء پر کوئی نہیں جانتا کہ آپکی قبر مبارک کہاں ہے۔ (اناللہ وانا الیہ راجعون)

صحیح بخاری کی رُو سے حضرت ھارونؑ کا تمکن پانچویں آسمان پر ہے جہاں انکی ملاقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شب معراج کو ہوئی تھی۔ قرآن حکیم میں آپکا ذکر درج ذیل سورتوں میں آیا ہے:۔ سورۃ النساء' سورۃ انعام' سورۃ یونس' سورۃ اعراف' سورۃ انبیاء' سورۃ مومنون' سورۃ فرقان' سورۃ شعراء اور سورۃ قصص۔

حضرت خضر علیہ السلام

قرآن حکیم میں حضرت موسیٰؑ کی جس بزرگ سے ملاقات کا ذکر ہے اگر چہ قرآن حکیم میں انکا نام مذکور نہیں تاہم احادیث مبارکہ سے ثابت ہے کہ وہ بزرگ حضرت خضرؑ ہیں۔ صحیحین کی روایت اس پر گواہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے کہا ابن کعبؓ اور سعید ابن جبیرؒ نے ہمیں بتایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایک مرتبہ حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کے سامنے خطبہ ارشاد فرما رہے تھے اس دوران کسی نے سوال کیا کہ اے موسیٰؑ سب سے زیادہ علم والا کون ہے؟ تو حضرت موسیٰؑ نے خود کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ میں۔ بارگاہِ خداوندی میں یہ بات ناپسند فرمائی گئی اور اس قول پر حضرت موسیٰؑ پر عتاب کیا گیا۔ کیونکہ موسیٰؑ نے عالم ہونے کی نسبت خدا کی طرف کرنے کی بجائے خود کی طرف کی تھی ۔سورۃ الکہف آیات ۶۰ تا ۸۲ سے ماخوذ اس واقعہ کا خلاصہ درج ذیل ہے:۔

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم سب سے زیادہ عالم نہیں ہو بلکہ میرا بندہ جو مجمع البحرین میں ہے تم سے زیادہ عالم ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا یا الٰہی میری اس بندے سے ملاقات کیونکر ہو سکتی ہے۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا تم ایک مچھلی ٹوکری میں رکھ لو جہاں مچھلی گم ہو جائے وہیں وہ شخص تمہیں مل جائیگا۔ حسب الحکم موسیٰؑ نے روٹی اور نمکین بھنی ہوئی مچھلی توشہ کے طور پر لے کر ٹوکری یا اپنی زنبیل میں رکھی اور اپنے خادم یوشع بن نونؑ کو ہمراہ لیکر چل دیئے۔ سفر کرتے ہوئے تھکاوٹ محسوس کی تو ایک پتھر کی چٹان کے پاس کچھ دیر آرام کرنے کیلئے رک گئے جہاں پتھر پر سر رکھ کر دونوں حضرات سو گئے دورانِ نیند مچھلی زندہ ہو کر پھڑکی اور ٹوکری سے باہر نکل کر پھڑکتی ہوئی قریب بہتے دریا میں جا پڑی اور راستہ بنا کر چل دی۔ خدا تعالیٰ نے اس جگہ پانی کے بہاؤ کو روک دیا جو ایک محراب کی طرح ہو گیا۔

حضرت موسیٰؑ اور حضرت یوشع علیہ السلام جب بیدار ہوئے تو رات دن کی مسافت کا جتنا سفر باقی رہ گیا تھا اس میں چلتے رہے جب اگلے دن صبح ہوئی تو حضرت موسیٰؑ نے اپنے خادم یوشع علیہ السلام کو فرمایا کہ بھوک اور تھکان محسوس ہو رہی ہے کھانا لاؤ۔ سامان نکالتے وقت احساس ہوا کہ مچھلی اس ٹوکری میں موجود نہیں۔ خادم نے کہا کہ جب ہم اس پتھر کے پاس رکے تھے وہاں میں مچھلی کے بارے بھول

گیا اور یہ کام شیطان کا ہے۔ موسیٰؑ نے فرمایا اسی کی تو مجھے تلاش تھی چنانچہ واپس لوٹ کر پھر اسی جگہ واپس پتھر کے پاس پہنچے تو یہاں ایک شخص کو کپڑا اوڑھے دیکھا۔ موسیٰؑ نے اسے سلام کیا تو اس نے بھی جواب دیا اور کہا کہ تمہارے ملک میں سلام کا رواج کہاں سے آ گیا۔ موسیٰؑ نے کہا میں موسیٰؑ ہوں تو اس نے کہا بنی اسرائیل والے موسیٰؑ ؟ تو آپنے اثبات میں جواب دیا۔ تب اس نے آپکے آنے کی وجہ پوچھی تو حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا میں اس لئے آیا ہوں کہ کچھ علم ایسا ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپکو عطا فرمایا ہے اور کچھ ایسا ہے جو مجھے ودیعت فرمایا گیا ہے۔ البتہ میں آپکو عطا فرمائے گئے علم سے کچھ ھدایت کی باتیں سیکھنے کیلئے آیا ہوں۔ خضرؑ نے کہا کہ آپ میرے ساتھ رہ کر میری باتوں اور میرے افعال پر صبر نہ کر سکیں گے کیونکہ وہ آپکے علم سے باہر ہونگے۔ موسیٰؑ نے کہا کہ آپ مجھے صابر پائیں گے اور میں کسی بات میں خلافِ حکم نہ کرونگا۔ چنانچہ دونوں پاپیادہ ساحل کے کنارے کنارے چل دیئے۔ اسی دوران اُدھر سے کرایہ پر مسافروں کو دریا پار کرانے والی ایک کشتی آ گئی۔ کشتی والے نے حضرت خضر علیہ السلام کو پہچان لیا اور بلا معاوضہ کشتی میں سوار ہونے کی دعوت دی اور دونوں حضرات کو سوار کر لیا۔ (حضرت یوشع کا ذکر حدیث مبارکہ میں نہیں اس لئے نہیں معلوم کہ وہ کنارے پر منتظر رہے یا واپس لوٹ گئے)۔

کشتی میں حضرت موسیٰؑ اور خضرؑ سوار تھے کہ ایک چڑیا آئی اور کشتی کے کنارے پر بیٹھ کر اس نے ایک دو چونچ پانی پیا تو خضرؑ نے حضرت موسیٰؑ سے مخاطب ہو کر کہا جس طرح اس چڑیا کے پانی پینے سے اس دریا کے پانی میں کمی واقع نہیں ہوئی اسی طرح مجھے اور آپکو علم عطا فرمانے سے اللہ تعالیٰ کے وسیع خزائن علم میں کچھ کمی واقع نہیں ہوتی۔ اسکے بعد منزل پر پہنچ کر کشتی سے اترتے ہوئے خضرؑ نے ایک بسولہ نکالا اور کشتی کا ایک تختہ توڑ دیا۔ موسیٰؑ سے یہ بات برداشت نہ ہوئی فوراً فرمانے لگے کہ یہ تم نے کیا کیا؟ کشتی والوں نے ہم سے سفر کا معاوضہ تک نہیں لیا اور تم نے انکا نقصان کر دیا کیا تم ان کو ڈبونا چاہتے ہو؟ اس پر خضرؑ نے کہا میں نے پہلے ہی آپکو نہیں کہہ دیا تھا کہ آپ میرے ساتھ رہ کر صبر نہ کر سکیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ موسیٰؑ سے یہ حرکت بھول سے ہوئی تھی پھر جب کشتی سے نکل کر بستی کی طرف چلنے لگے تو راستے میں ایک لڑکا بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا خضرؑ نے اس کو مار ڈالا

یہ دیکھ کر موسیٰؑ فوراً بول اٹھے کہ خضرؑ تم نے ایک معصوم کی جان لے لی یہ تم نے بہت برا کیا۔ خضرؑ بولے میں نے کہا نہیں تھا کہ آپؑ میرے ساتھ رہ کر ضبط نہ کر سکیں گے۔ موسیٰؑ نے کہا اب کے جانے دیجئے اگر پھر دریافت کروں تو بے شک مجھے اپنے ساتھ نہ رکھنا۔ دونوں پھر چل دیئے اور ایک گاؤں میں پہنچے۔ اس گاؤں کے لوگوں سے کھانا مانگا تو انہوں نے بے رخی سے انکار کر دیا۔ اسی اثناء میں حضرت خضرؑ کی نظر ایک دیوار پر پڑی جو گرنے کے قریب تھی آپ نے اسے ہاتھ سے کوشش کر کے سیدھا کر دیا۔ اس پر موسیٰؑ نے پھر پوچھا کہ اس گاؤں والوں نے ہمیں کھانا تک نہ دیا اور تم نے انکی دیوار مرمت کر دی جبکہ چاہتے تو اسکی اجرت لے سکتے تھے۔ حضرت خضرؑ نے کہا کہ بس اب میرے اور تمہارے درمیان جدائی ہے اور وہ اس کے بعد الگ ہو گئے"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہمارا دل چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ موسیٰؑ اور خضرؑ کا قصہ آگے بھی بیان فرماتا مگر موسیٰؑ سے صبر نہ ہو سکا اگر موسیٰؑ ضبط کر سکتے تو خدا تعالیٰ اور قصہ بیان فرماتا۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ خدا موسیٰؑ پر رحم فرمائے۔۔۔۔۔ ان تینوں باتوں کی تفصیل کیلئے ابن عباسؓ سورۃ الکہف کی تلاوت فرماتے تھے جس کا خلاصہ یہ ہے:۔

> خضرؑ نے موسیٰؑ سے علیحدہ ہوتے وقت اپنے افعال کی یہ تاویلات بیان کیں کہ جو کشتی میں نے داغدار کر دی تھی وہ کچھ محتاجوں کی تھی وہ دس بھائی تھے جن میں سے پانچ اپاہج تھے اور کام کاج کرنے سے قاصر تھے باقی پانچ بھائی جو تندرست تھے کشتی چلا کر اپنی روزی کماتے اور بیمار بھائیوں کی بھی ذمہ داری اٹھاتے تھے۔ ان کی بستی سے پیچھے جلندی نامی ایک ظالم بادشاہ تھا جو اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اچھی اور کارآمد کشتیوں کو زبردستی چھین لیتا تھا۔ کشتی والوں کو اس بات کی خبر نہیں تھی۔ جب بادشاہ تمام کارآمد کشتیاں انکے مالکان سے زبردستی چھین لے جائے گا تو اس کشتی کو (جسے میں نے توڑ دیا) عیب دار اور ناکارہ جان کر چھوڑ جائیگا میں نے جس لڑکے کو قتل کر دیا تھا وہ نیک والدین کا کافر لڑکا تھا اور اندیشہ تھا کہ اسکی وجہ سے کہیں اسکے والدین بھی تباہ نہ ہو جائیں اس لئے بحکم خدا میں نے اس کو قتل کر ڈالا اور اللہ تعالیٰ

اسکی جگہ انہیں اور اولاد عطا فرمائیگا جو نیک اور والدین کی خدمت کرنے والی ہوگی۔ گاؤں والوں کی وہ شکستہ دیوار جس کی میں نے مرمت کی تھی اسکی تہہ میں اصرم اور صریم نامی دو یتیم بچوں کا خزانہ تھا۔ خدشہ تھا کہ ان بچوں کے جوان ہونے سے قبل دیوار گر جاتی اور وہ خزانہ اس گاؤں والوں کے ہاتھوں لٹ جاتا تو حق دار محروم رہ جاتے۔ چنانچہ بحکم خدا میں نے اسے مرمت کر کے سیدھا کر دیا۔ (خلاصہ الکہف ۶۰ تا ۸۲)

ترمذی شریف کی ایک حدیث مبارکہ کے مطابق حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ مذکورہ خزانہ سونے اور چاندی کی چند اشیاء پر موقوف تھا جس میں سونے کی ایک ایسی تختی بھی موجود تھی جسکے ایک طرف کندہ تھا:۔

''اسکا حال عجیب ہے جسے موت کا یقین ہو' اسے خوشی کس طرح ہوتی ہے۔ اسکا حال عجیب ہے جو قضاء وقدر کا یقین رکھے اس کو غصہ کیسے آتا ہے۔ اس کا حال عجیب ہے جسے رزق کا یقین ہو پھر وہ کیوں تعجب میں پڑتا ہے۔ اس کا حال عجیب ہے جسے روزِ قیامت حساب کتاب کا یقین ہو وہ کیسے غافل رہ سکتا ہے۔ اس کا حال عجیب ہے جس کو دنیا کے زوال وتغیر کا یقین ہو پھر وہ کیسے مطمئن ہوتا ہے۔ نیز اس کے ساتھ لکھا تھا لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ''۔

دورِ بنی اسرائیل سے بھی قبل کلمہ محمدیہ کا کسی مہر پر موجود ہونا نہایت حیران کن بات دکھائی دیتی ہے مگر اس کے حقیقی ہونے میں شک کی گنجائش نہیں کہ حدیث مبارکہ اس پر گواہ ہے۔ اس مہر کے دوسری جانب بھی یہ تحریر موجود تھی:۔

''میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں میں یکتا ہوں میرا کوئی شریک نہیں میں نے خیر وشر دونوں کو پیدا کیا''۔

مفسرین کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ حضرت خضرؑ بنی اسرائیل کے پیغمبروں میں سے تھے۔ بعض انہیں نبی مانتے ہیں بعض ولی اللہ اور بعض عبد صالح کہتے ہیں۔ حضرت خضرؑ کے بارے قرآن حکیم میں وضاحت ہے:۔

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا (کہف:۶۵)

ترجمہ:۔ ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ جس کو ہم نے اپنی رحمت بخشی تھی اور اپنے پاس سے علم (لدنی) عطا کیا تھا (کہف:۶۵)

حضرت خضرؑ کے سلسلہ میں جس علم کا عطا فرمانا ذکر ہوا ہے وہ تکوین کا علم ہے کیونکہ آپؑ واقعاتِ کونیہ کا علم حاصل کر کے اسی کے موافق عمل کرنے پر مامور ہیں۔ علم تو جس کو بھی عطا ہوا خداوند تعالیٰ ہی کی طرف سے عطا ہوا لیکن اپنے پاس سے علم عطا فرمانے کا فرمان اس مخصوص علم کی جانب اشارہ کرتا ہے جسے علم لدنی کہا جاتا ہے۔ قرآن کا یہ اندازِ بیان مقام نبوت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ سورۃ انبیاء ۷۴، ۷۵ میں قصص ۱۴، یوسف ۶۸ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت لوطؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت یوسفؑ اور حضرت یعقوبؑ کی صفات کا ذکر کرتے ہوئے بھی فرمایا ہے کہ ہم نے ان کو حکم اور علم بخشا۔

حضرت موسیٰؑ کو دیگر انبیاء و پیغمبران کی طرح علم شریعت عطا فرمایا گیا تھا۔ انبیاء خواہ شریعت کے ساتھ ساتھ ذاتی طور پر طریقت و حقیقت سے بھی شناسا ہوں تاہم حضرت موسیٰؑ جن علوم کے حامل تھے ان کا تعلق تشریعی قوانین و کلیات سے تھا۔ چنانچہ جن جزئیات میں عوارض یا عام ضابطۂ شریعت کی خلاف ورزی نظر آئی حضرت موسیٰؑ نے روک ٹوک شروع کر دی اور خاموشی کے مسلک کو باوجود کوشش کے برقرار نہ رکھ سکے۔ جبکہ خضرؑ ایک حامل علم تکوینیات تھے جو اپنی جگہ درست تھے۔ اس سے میری مراد کسی کے مراتب یا درجاتِ علم میں درجہ بندی کرنا قطعی نہیں۔ میں صرف یہ عرض کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، جیسا کہ شبیر احمد عثمانی اور بعض محققین کا خیال ہے کہ ''جو انبیاء جدید شریعت لے کر نہیں بھی آتے ان کو بھی اتنا تصرف و اختیار حاصل ہوتا ہے کہ مصلحاتِ خصوصیہ کی بناء پر شریعت مستقلہ کے کسی عام کی تخصیص یا مطلق کی تقلید یا عام ضابطہ سے بعض جزئیات کا استثناء کر سکیں۔ اسی طرح کے جزئی تصرفات حضرت خضرؑ کو بھی حاصل تھے، واللہ اعلم بالثواب''۔

خضرؑ آپکا نام نہیں بلکہ لقب ہے۔ لغت میں اسکے معنی سبز کے ہیں صحیح بخاری کے مطابق حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کا یہ لقب بایں وجہ ہے کہ ایک بار وہ صاف چٹیل زمین پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے بیٹھنے کی وجہ سے زمین کا وہ حصہ سرسبز ہو گیا تھا۔ سیدنا غوث اعظمؒ کے حضرت خضرؑ کو ابوالعباس کہہ کر مخاطب فرمانے سے ثابت ہے کہ آپکا نام ابوالعباسؑ ہے اور آپ

اسرائیلی ہیں۔ بہت سے علماء اور اولیائے خداوندی کے مطابق حضرت خضرؑ کو حیات ابدی حاصل ہے اور وہ بھولے بھٹکے لوگوں کو راستہ دکھاتے ہیں۔ یہ بھی ایک مشہور حقیقت ہے کہ آپ دوستانِ الٰہیہ پر نگران مقرر ہیں۔ اکثر اولیائے کرام کے تذکروں میں خواجہ خضرؑ سے انکی ملاقات کے احوال منقول ہیں۔

قرآن کریم نے حضرت موسیٰؑ سے حضرت خضرؑ کی ملاقات کا مقام مجمع البحرین بتایا ہے یعنی دو دریاؤں کا مقام اتصال۔ لیکن اس سے کون سے دو دریاؤں کا مخصوص مقام مراد ہے اس کے تعین میں مفسرین میں کچھ اختلاف ہے۔ بعض کی رائے میں یہ مقام عقبہ ہے بعض کے نزدیک یہ وہ مقام ہے جہاں دجلہ و فرات مل کر خلیج فارس میں گرتے ہیں بعض کے نزدیک دو دریاؤں سے مراد بحر قلزم اور بحر روم ہیں جبکہ بعض کے نزدیک یہ افریقہ کے دو دریا ہیں۔ بندہ کے نزدیک بحر فارس و بحر روم بجانب مشرق مقام اتصال کی رائے زیادہ درست ہے، واللہ اعلم بالثواب۔

حضرت خواجہ خضرؑ کا ذکر مندرجہ بالا واقعہ کی صورت قرآن حکیم میں آپ کا نام لئے بغیر سورۃ الکہف (آیات ۶۰ تا ۸۲) میں آیا ہے۔

حضرت یوشع علیہ السلام

حضرت موسیٰؑ کی مقدس اور جہاد سے لبریز زندگی میں حضرت ھارونؑ کے بعد توراۃ میں حضرت یوشع (یشوع) علیہ السلام کا ذکر بار بار آیا ہے۔ آپ حضرت موسیٰؑ کے خادم خاص تھے اور حضرت ھارونؑ اور حضرت موسیٰؑ کی رحلت کے بعد انکے جانشین نبوت ہوئے۔ کنعان میں جابر اور مشرک اقوام کے حالات کا تجزیہ کرنے کیلئے جو وفد بھیجا گیا تھا' حضرت یوشع علیہ السلام اسکے ایک اہم رکن تھے اور جب حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کو مشرک اقوام سے جہاد کرنے کی دعوت دی اور انہوں نے انکار کر دیا تو آپ ہی وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے بنی اسرائیل کو جرأت و ہمت دلاتے ہوئے خدا کے وعدۂ نصرت پر بھروسہ کرنے اور جہاد کی اہمیت وضرورت کی تلقین کی۔

حضرت موسیٰؑ کی زندگی ہی میں ان پر ظاہر کر دیا گیا تھا کہ یوشع اللہ تعالیٰ کے خاص بندے ہیں اور بنی اسرائیل کے نوجوان انہی کی قیادت میں کنعان اور بیت المقدس کو جابر مشرکین سے پاک کریں گے۔ حضرت موسیٰؑ اور ھارونؑ کے وصال کے بعد ان ہی کی قیادت میں چالیس برس (یعنی وادیٔ تیہ میں مدت قید ختم ہونے کے) بعد بنی اسرائیل کی نسل ارض مقدس میں داخل ہوئی اور انہوں نے یوشع علیہ السلام کی سربراہی میں کنعان' شام اور شرقِ اردن سے تمام جابر وظالم قوتوں کا صفایا کیا۔

توراۃ میں حضرت یوشع علیہ السلام کا نام تین صورتوں میں استعمال ہوا ہے۔ کسی جگہ تو یا شوعا (JOSHUA) لکھا گیا ہے کہیں ہوسیع (HOSKEA) اور کہیں یہوسوع۔ یہی یہوسوع نام ہی خفیف اختلاف کے بعد عربی زبان میں یوشع بن گیا۔ قرآن حکیم میں آپ کا نام کسی سورۃ اور آیت میں مذکور نہیں البتہ سورۃ الکہف میں دو مقام پر حضرت موسیٰؑ کے ایک نوجوان رفیق سفر کا تذکرہ ضرور ملتا ہے جس سفر میں وہ حضرت خضرؑ سے ملاقات کیلئے تشریف لے گئے تھے۔ حضرت ابیؓ بن کعب سے منقول حدیث میں اس نوجوان رفیق سفر کا نام یوشع مذکور ہوا ہے اور دوسری حدیث مبارکہ میں بھی جو سعید ابن جبیرؓ سے مروی ہے اس میں بھی آپ کا نام یوشع علیہ السلام بتایا گیا ہے۔ اکثر مفسرین نے تفاسیر میں اور تاریخ نویسوں نے بنی اسرائیل کی نافرمانیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اس بستی میں داخل ہونے والی جماعت کے سربراہ کا نام

یہی لکھا ہے۔

حضرت یوشع علیہ السلام بنی اسرائیل کے اسباط میں حضرت یوسفؑ کی اولاد میں سے ہیں۔ مفسرین نے آپکا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے:۔ یوشع بن نونؑ بن افرائیم بن یوسفؑ بن یعقوبؑ بن ابراہیمؑ۔ آپ اپنے قبیلہ کے سردار تھے۔ حضرت موسٰیؑ کو آپکی ذات پر اعتماد تھا اور انہوں نے شروع ہی میں اہم خدمات آپ کے سپرد کر دی تھیں۔ جب بنی اسرائیل بیابانِ سینا رفیدیم میں مقیم تھے اور عمالقہ کے جبارین اور طاقتور لوگوں سے پہلی بار مقابلہ ہوا تو حضرت موسٰیؑ نے آپ ہی کو بنی اسرائیل کا سردار اور سپہ سالار مقرر کر کے روانہ فرمایا۔ اس جنگ میں حضرت یوشع نے عمالقہ کو شکست دی اور انہیں بھاگ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

توراۃ میں ہے کہ حضرت یوشع شروع ہی سے حضرت موسٰیؑ کے ہمراہ رہے حتیٰ کہ جب کوہِ طور پر آپکو نبوت سے سرفراز کیا گیا تب بھی حضرت یوشع علیہ السلام انکے قریب تھے۔ جبکہ قرآن نے آپکا حضرت موسٰیؑ کے قریب ہونا اس وقت ظاہر فرمایا ہے جب وہ مجمع البحرین کی سمت حضرت خضرؑ سے ملاقات کیلئے جا رہے تھے۔ تاہم قرآن نے آپکی حضرت موسٰیؑ سے اس سے قبل کسی ملاقات کی تردید بھی نہیں فرمائی۔

حضرت موسٰیؑ کی وفات سے کچھ عرصہ پیشتر بنی اسرائیل کے مستقبل کی پیش گوئیوں اور آخری ہدایات کیلئے حضرت موسٰیؑ کو حکم ہوا کہ یوشع کو ہمراہ لے کر خیمہ اجتماع میں آجائیں۔ اس وقت تجلی الٰہی ابر کے ستون میں مسطور ہو کر خیمہ میں نمودار ہوئی اور حضرت موسٰیؑ سے خطاب ہوتا رہا۔ وادیٔ تیہ میں بنی اسرائیل کی چالیس سالہ مدتِ قید ختم ہونے کے قریب تھی حضرت ھارونؑ کی وفات ہو چکی تھی اور حضرت موسٰیؑ کے وصال کا وقت بھی قریب آچکا تھا کہ توراۃ میں حضرت یوشع علیہ السلام سے خداوند قدوس کا خطاب ہوا جو یوں ہے کہ ہم نے:۔

> ''نون کے بیٹے یوشع کو ھدایت کی اور کہا تو مضبوط ہو جا اور حوصلہ رکھ کیونکہ تو بنی اسرائیل کو اسی ملک میں لے جائیگا جن کی قسم میں نے ان سے کھائی تھی اور میں تیرے ساتھ رہونگا۔ (استثنا: باب ۳۱، ۲۳)

سورۃ اعراف کی آیۃ ۱۶۱، ۱۶۲ میں بنی اسرائیل کی بدتمیزیوں اور نافرمانیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمانِ خداوند تعالیٰ ہے:۔

وَ اِذْ قِیْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْیَةَ وَ كُلُوْا مِنْهَا حَیْثُ شِئْتُمْ وَ قُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِیٰٓـئٰتِكُمْ ؕ سَنَزِیْدُ الْمُحْسِنِیْنَ (۱۶۱) فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا یَظْلِمُوْنَ (الاعراف: ۱۶۱/۱۶۲)

ترجمہ:۔اور جب انہیں کہا گیا کہ جاؤ اس شہر میں جا کر آباد ہو جاؤ اور اس شہر میں جہاں سے چاہو کھاؤ اور یہ کہتے ہوئے کہ ہمیں بخش دے، دروازہ سے سجدے کی شکل میں جھک کر داخل ہونا، ہم تمہاری خطاؤں کو بخش دیں گے اور نیکی کرنے والوں کو (اور) زیادہ دیں گے (۱۶۱) تو ان میں سے ظلم کرنے والوں نے بات بدل ڈالی جو انہیں کہی گئی تھی، تب ہم نے انکی زیادتیوں کے باعث ان پر آسمان سے عذاب بھیج دیا (اعراف:۱۶۲)

انہیں ہدایت فرمائی جارہی ہے کہ جب فاتحانہ طور پر شہر میں داخل ہونے لگیں تو دوسرے فاتحین کی طرح سرکش و مغرور ہو کر داخل نہ ہوں بلکہ دل سے خدا کے حضور عجز و تواضع سے جھکے ہوئے اور زبان سے طلبِ مغفرت کے الفاظ ادا کرتے ہوئے داخل ہوں مگر انہوں نے اسکے خلاف کیا۔قرآن کے اس فرمان کہ ''ظالموں نے بات بدل دی'' سے مراد انکی وہ شرارت ہے کہ انہیں ''حطة'' کہنے کی تاکید تھی جس کے معنی ہیں ''ہمارے گناہ جھاڑ ڈال'' جب کہ انہوں نے بدتمیزی کرتے ہوئے دانستہ اسکو ''حنطة'' کر دیا جس کے معنی ہیں ''ہمیں گندم دے''۔اس پر انہیں آسمانی عذاب کا سامنا ہوا۔تقریباً اسی مفہوم و الفاظ کے ساتھ یہی مضمون سورۃ بقرۃ آیۃ ۵۸، ۵۹ میں بھی گزرا ہے۔

قانونِ سبت

حضرت موسیٰؑ حضرت ہارونؑ حضرت یوشعؑ کے بعد بھی اس قوم میں سدھار نہیں آیا اور انکی نافرمانیاں بدستور قائم رہیں۔سورۃ بقرۃ کی آیت ۶۵ میں بیان فرمایا گیا ہے کہ:۔

وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِیْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِی السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِیْنَ (۶۵)

ترجمہ:۔اور تم انہیں خوب جانتے ہو جنہوں نے تم میں سے سبت کے قانون کی نافرمانی کی تھی تو ہم نے انہیں حکم دیا کہ ہو جاؤ پھٹکارے ہوئے بندر (بقرۃ:۶۵)

''قانونِ سبت'' یہ تھا کہ بنی اسرائیل پر ہفتہ (سنیچر) کا روز عبادت الٰہی کیلئے مختص و مقرر فرما دیا گیا تھا جیسے اتوار کا روز عیسائیوں کیلئے اور جمعہ کا روز مسلمانوں کی عبادت کیلئے مقرر ہے۔اُس روز بنی اسرائیل کیلئے کھیتی باڑی' کاروبار' شکار وغیرہ تک ممنوع تھا اور اس کی نافرمانی کی سزا موت مقرر تھی۔بنی اسرائیل نے اس حکم کو بے اثر بنانے کیلئے رفتہ رفتہ مختلف حیلوں بہانوں کا سہارا لینا شروع کر دیا۔سنیچر کے روز شکار پر پابندی کے سبب مچھلیاں بے دھڑک شکاریوں کی آمد سے بے خطر دریا کی سطح پر کثرت سے نمودار ہونے لگیں تو بنی اسرائیل کے ایک گروہ کے لوگ دریا کے کناروں پر گڑھے کھود کر چھوٹی چھوٹی نالیوں کے ذریعے انہیں دریا کی سطح سے ملا دیتے اور دہانے بند کر دیتے۔جب مچھلیاں زیادہ تعداد میں سطح آب پر جمع ہو جاتیں تو نالیوں کے دہانے کھول دیتے جس سے کثیر تعداد میں مچھلیاں خود بخود ان نالیوں کے ذریعے مصنوعی جوہڑوں میں چلی آتیں۔تبھی یہ دہانوں کے منہ بند کر دیتے اور پھر اتوار کے روز آ کر انہیں پکڑ لیتے۔اللہ تعالیٰ کی غیرت ہرگز برداشت نہیں کرتی کہ اس کے احکامِ شریعت کو حیلے بہانوں سے پامال و بے اثر کر دیا جائے۔اسلئے اُس گروہ پر ایسا عذاب مسلط کیا گیا جس سے وہ ذلیل و رُسوا ہو کر ہلاک ہو گئے۔انکے چہروں اور ذہن و فکر کو مسخ کر کے انہیں انسانوں سے بندر بنا دیا گیا اور وہ چند روز اسی حالت میں رہنے کے بعد ہلاک ہو گئے۔

مجاہد کا قول ہے کہ یہ مسخ معنوی تھا' یعنی انکی صورتیں تو انسانی ہی رہیں مگر انکا ذہن اور فکر مسخ ہو گئے تھے۔غور کریں کہ اگر انکی شکلیں انسانی بھی رہی ہوں اور بندروں کی سی مذموم اور قبیح حرکتیں کرتے ہوں تو خدا کی پناہ یہ بھی کس قدر برا عذاب تھا۔تاہم جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ انکی شکلیں بھی متبدل ہو کر بندروں کی سی ہو گئیں تھیں۔اسی بناء پر وہ اس سزا کے دوران لوگوں کے سامنے آنے کے لائق نہ رہے اور شرم کے باعث اپنے محلے کے گرد باڑ کھینچ کر محصور ہو گئے تھے اور چند روز کے اندر ہی ہلاک ہو گئے تھے۔اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ایسے عذابوں سے اپنی پناہ میں رکھے اور اپنے احکام و فرامین کی نافرمانی سے محفوظ رکھے۔خاص طور پر وہ مسلمان جنہیں حکومت اور قانون سازی سونپی گئی ہے اور جو انصاف فراہم کرنے

پر متعین ہیں انہیں ان آیات پر بار بار غور وفکر کرنا چاہئے اور خدا کے خوف سے لرزتے ہوئے نصیحت پکڑنی چاہئے کیونکہ ایسے واقعات کا ذکر پروردگار نے ہماری عبرت پذیری کیلئے کیا ہے وگرنہ محض داستان سرائی قرآن حکیم کا مقصود نہیں۔

کچھ لوگ اس واقعہ کو ہضم کرنے میں مشکوک الذہنی کا شکار ہیں حالانکہ یہ کوئی امر محال نہیں۔ وہ بدبخت لوگ جو اسکے تشریعی قوانین کو مسلسل توڑتے رہے ہوں اگر اللہ تعالیٰ ان کو سزا دینے کیلئے اپنے تکوینی قانون میں تھوڑی سی تبدیلی کردے تو اِس میں کیا استحالہ ہے؟ نیز جو لوگ آدم کے بارے ڈارون کے نظریۂ ارتقاء پر ایمان لا چکے ہیں ان کیلئے تو سرے سے اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں۔ کیونکہ یہ بھی تو سلسلۂ ارتقاء ہی کی ایک کڑی ہے۔ ارتقاء مستقیم نہ سہی ارتقاء معکوس ہی سہی بہر حال ہے تو ارتقاء ہی۔

میں مضمون جاریہ کی طرف واپس پلٹتا ہوں کہ حضرت یوشع علیہ السلام کی نبوت کی بشارت حضرت موسیٰؑ کی حیات مبارکہ ہی میں دے دی گئی تھی بلکہ اس منصب پر آپکو نامزد بھی فرمادیا گیا تھا۔ جیسا کہ توراۃ شریف میں فرمان ہے:۔

> ''خداوند نے موسےٰ سے کہا تو نون کے بیٹے یشوع کو لے کر اس پر اپنا ہاتھ رکھ کیونکہ اس شخص میں روح ہے اور الیعزر کاہن اور ساری جماعت کے آگے کھڑا کر کے انکی آنکھوں کے سامنے اسے وصیت کر اور اپنے رعب وداب سے اسے بہرہ ور کردے تا کہ بنی اسرائیل کی ساری جماعت اسکی فرمانبرداری کرے'' (کتاب گنتی: باب ۲۷ میں ۱۸ تا ۲۳)

چونکہ اب بنی اسرائیل کی تیہ میں قید کی مدت ختم ہو رہی تھی اور وہ وقت قریب آرہا تھا جو مشیت الٰہی میں انکے ارض مقدس میں داخلہ کیلئے مقدر ہو چکا تھا۔ مدت قید ختم ہونے سے کچھ پہلے حضرت موسیٰؑ نے رحلت فرمائی جبکہ حضرت ھارونؑ کی وفات اس سے تین سال قبل ہو چکی تھی۔ چنانچہ حضرت یوشع بن نون پر وحی نازل ہوئی اور ارشاد ہوا:۔

> ''اے یشوع میرا بندہ موسیٰؑ مر گیا' سو اب تو اٹھ اور ان سب لوگوں کو ساتھ لے کر دریائے یردن کے پار اُس ملک میں جا' جسے میں بنی اسرائیل کو دیتا ہوں''۔

خدا تعالیٰ کی کرشمہ سازیوں کا یہ کمال اور عجب مظاہرہ ہے کہ جس یوسفؑ کی بدولت کنعان

کے ستر انسانوں پر مشتمل خاندان عزت وعظمت اور جاہ وجلال کے ساتھ کنعان سے ہجرت کر کے مصر میں آباد ہوا تھا اب اسی یوسفؑ کے پوتے یعنی حضرت یوشع علیہ السلام کی قیادت میں لاکھوں کی مردم شماری پر مشتمل خاندان پھر اسی جاہ وجلال اور سطوت و جبروت کے ساتھ اپنے آباؤ اجداد کے وطن کنعان واپس لوٹ رہا تھا۔

اسکی تفصیل یوں ہے کہ مدتِ قید کے چالیس سال گزر جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت یوشع علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ تم بنی اسرائیل کو لے کر موعودہ سرزمین کی طرف بڑھو اور وہاں موجود عمالقہ اور دوسری جابر قوموں سے جہاد کر کے انہیں شکست دو میری مدد تمہارے ساتھ رہے گی۔ یوشع علیہ السلام نے یہ پیغامِ خداوندی بنی اسرائیل کو سنایا اور وہ سب دشت سینا سے نکل کر ارض کنعان کے پہلے شہر اریحا (یریحو) کی جانب بڑھے اور دشمنوں کو للکارا۔ دشمنوں نے بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر شکست کھا گئے اور بنی اسرائیل کو فتح ونصرت نصیب ہوئی۔ یوں حضرت یوشع علیہ السلام کی سرپرستی میں بنی اسرائیل رفتہ رفتہ تمام ارض مقدس پر قابض ہو گئے اگر چہ یہ سب اتنی آسانی سے بھی نہیں ہو گیا۔ اس ضمن میں قرآن حکیم نے ایک سبق آموز واقعہ بھی کنایہ فرمایا ہے کہ بعض اوقات ھدایت یافتہ لوگ بھی شیطان کے چنگل میں پھنس کر اپنے کئے کرائے پر پانی پھروا لیتے ہیں جیسا کہ فرمان ہے:۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ (الاعراف:۱۷۵)

ترجمہ:۔ اور اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو اس شخص کا احوال سناؤ جسے ہم نے اپنی آیات دیں تو وہ ان سے صاف نکل گیا۔ پس شیطان اسکے پیچھے لگا تو وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔ (الاعراف:۱۷۵)

بلعم بن باعور (ایک عابد)

یہ شخص جس کا احوال سنانے کا حکم فرمایا گیا ہے اس کا نام بلعم باعور تھا جو اسم اعظم کا عامل تھا اور اسکی دعا شرفِ قبولیت سے نوازی جاتی تھی۔ تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد قوم بنی اسرائیل تیہ میں تقریباً سات سال تک رہی۔ جب چالیس سالہ قید کی مدت ختم ہوئی تو حضرت

یوشع بن نونؑ کو پیغمبری عطا ہوئی جو کہ حضرت موسٰیؑ کے بھانجے تھے۔ انہیں حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو تیہ سے لے کر ملک شام چلے جاؤ اور جبارین کو جہاد کر کے وہاں سے نکال دو۔ یوشع بن نونؑ بمطابق ارشادِ خداوندی بنی اسرائیل کو لے کر ملک شام کی طرف روانہ ہو گئے۔ پہلے اریحا کو فتح کیا پھر ایلیا کی طرف بڑھے اور اس شہر کو بھی فتح کر لیا۔ پھر بلقان کی طرف آئے جو ایک بڑا شہر تھا اور بالق نامی ایک بادشاہ کا پائیہ تخت تھا۔ بالق بہت بڑی رعیت پر حکمران تھا اور بہت سارے ہتھیار اور ایک مہیب لشکر اسکے ملک کی حفاظت پر مقرر تھے۔ اس کے باوجود جب حضرت یوشع علیہ السلام نے بلقان کو محاصرہ میں لے لیا تو لشکرِ کفار کے دلوں میں ہیبت پیدا ہو گئی اور ان کو ہزیمت کا شدید خطرہ لاحق ہو گیا۔

مفسرین کے مطابق جب حضرت یوشع علیہ السلام نے جبارین سے جہاد کا قصد فرمایا اور سرزمین شام میں اترے تو بلعم باعور کی قوم کو سخت خطرے کا احساس ہوا اور اس درویش کے پاس مدد طلب کرنے پہنچ گئی اور کہنے لگی کہ حضرت یوشع علیہ السلام بہت تیز مزاج ہیں اور انکے ساتھ کثیر لشکر ہے۔ وہ ہمیں ہمارے شہر سے نکال دیں گے اور قتل کر ڈالیں گے اور ہماری جگہ بنی اسرائیل کو آباد کریں گے۔ تیرے پاس اسم اعظم ہے اس لئے تو باہر نکل اور دعا کر کہ اللہ تعالیٰ انہیں یہاں سے واپس ہٹا دے۔ بلعم باعور نے کہا تمہارا برُا ہو نون کا بیٹا یشوع علیہ السلام نبی ہے انکے ساتھ فرشتے اور ایمان لائے لوگ ہیں میں انکے خلاف کیسے دعا کروں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک انکا بڑا مرتبہ ہے اس لئے اگر میں ایسا کروں تو میری دنیا و آخرت دونوں برباد ہو جائیں گی۔ اس پر شاہِ بلقان خود اسکے پاس آ کر درخواست کرنے لگا کہ حملہ آور لشکر کے حق میں بددعا کریں۔ بلعم نے اسے بھی اپنی مجبوری سے مطلع کیا اور یہ رائے دی کہ تم دین موسوی کو قبول کر لو اور خدا پر ایمان لے آؤ۔ اس مردُود نے کہا ہم ہرگز دین موسٰی قبول کرنے والے نہیں اور پھر دھمکی دینے لگا کہ سن لو اگر تم نے انکے حق میں بددعا نہ کی تو ہم بغاوت کے جرم میں تمہیں دار پر کھینچیں گے، یہ سن کر بلعم ابن باعور سچ مچ دہل گیا مگر اس نے بددعا پھر بھی نہ کی۔

تاہم قومِ بالق اس پر مُصر رہی اور بہت الحاح وزاری سے اپنا سوال جاری رکھا۔ اس پر بلعم باعور نے کہا کہ میں اپنے رب کی مرضی معلوم کر لوں اور اسکا یہی طریقہ تھا کہ جب کوئی دعا کرنا ہوتی پہلے مرضیٔ الٰہی معلوم کرتا جس کا جواب اسے خواب میں مل جاتا تھا۔ چنانچہ اس مرتبہ بھی اس نے یہی کیا تو اس

کو یہ جواب ملا کہ تو یوشع علیہ السلام کے حواریوں کے خلاف دعا نہ کرنا۔ یہی اس نے اپنی قوم کو بتایا کہ دعا کرنے کی اجازت نہیں ملی۔ اس پر قوم نے اسکو بہت سے ہدیے اور نذرانے پیش کئے اور اپنا مطالبہ جاری رکھا۔ اس پر بلعم باعور نے دوبارہ اجازت چاہی تو اسے کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے قوم کو بتایا کہ مجھے اس بار کوئی جواب ہی نہیں ملا' تو قوم کے لوگ کہنے لگے کہ اگر اللہ کو منظور نہ ہوتا تو وہ پہلے کی طرح دوبارہ بھی منع فرماتا اور قوم نے اسکو مزید اموال پیش کرتے ہوئے اپنے سوال پر اصرار جاری رکھا اور اسکی بیوی کے ذریعے اپنے حق میں اصرار کروایا حتیٰ کہ انہوں نے اس کو فتنہ میں ڈال دیا۔

بلعم کی بیوی نہایت خوبصورت تھی اور بلعم اس پر عشق کی حد تک فریفتہ تھا۔ بادشاہ کے ساتھیوں نے اس عورت کو بہت سا مال دیکر سفارش پر آمادہ کرلیا۔ اس نے اپنے شوہر کو کہا کہ میری خاطر بادشاہ کے دشمنوں کے لئے بددعا کرو۔ پس کچھ تو بیوی کی سفارش اور کچھ بادشاہ کی دھمکی کے پیش نظر ایک حیلہ کیا اور بادشاہ کے نمائندوں کو مشورہ دیا کہ نہایت نوجوان اور خوبصورت عورتوں کو حضرت یوشع کے لشکر میں داخل کردو۔ گمان غالب ہے کہ وہ انہیں دیکھ کر فریفتہ ہوجائیں اور زنا کے مرتکب ہوجائیں تو میں انکے حق میں بددعا کرسکوں گا اور وہ اپنی اسی بدبختی کے باعث ہزیمت اٹھائیں گے۔

بالق بادشاہ نے ایسا ہی کیا اور فاجرہ عورتوں کو لشکر یوشع بن نونؑ میں داخل کردیا گیا لیکن اس کا یہ وار خالی گیا کہ خدا کے فضل و کرم سے نیکوکار مجاہدین نے ان فاحشہ عورتوں کے عشوؤں اور دلبرانہ اداؤں کی طرف توجہ ہی نہ دی۔ آخرکار بلعم باعور کی بیوی نے زچ ہوکر کہا کہ اگر تو ان کے خلاف بددعا نہ کریگا تو مجھے تم سے طلاق لینا ہوگی پس مجھے طلاق دیدے پھر جو چاہے کر۔ چنانچہ وہ شیطان کے بہکائے میں آگیا اور سوچنے لگا کہ یوں بیوی بھی خوش ہوجائے گی' بادشاہ کے ہاتھوں مصلوب ہونے سے بھی بچ جاؤں گا اور بہت سا زر و مال تو دستیاب ہو ہی رہا تھا' چنانچہ اس نے وہ نذرانے قبول کر لئے اور بددعا کرنے کیلئے اُس پہاڑی چوٹی پر جا پہنچا جہاں اپنے سر کو ننگا کر کے دعا کیا کرتا تھا۔

مگر جب بنی اسرائیل کیلئے بددعا کرتا وہ اسکی قوم کی طرف لوٹ جاتی اور جب اپنی قوم کیلئے دعا کرتا اسکی زبان سے بنی اسرائیل کا نام نکلتا۔ یہاں تک کہ اسکی زبان اسکے منہ سے باہر نکل پڑی۔ اس پر اس نے بمشکل اپنی قوم سے کہا کہ زر و مال کے لالچ کے باعث میری دنیا و آخرت دونوں برباد ہوگئیں۔

جسے قرآن نے اسکا دنیا سے چمٹ جانا' شیطان کا اسکے پیچھے لگنا اور خود اس کا اپنی خواہشات کے پیچھے لگنا قرار دیا۔ سورۃ اعراف میں ہے:۔

وَ لَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَ لٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (اعراف:۱۷۶)

ترجمہ:۔''اور اگر ہم چاہتے تو آیتوں کے سبب اسے اٹھا لیتے (اسکے درجات میں اضافہ فرما کر اسے ابرار کی منزل تک پہنچا دیتے) مگر وہ تو زمین پکڑ گیا (دنیا کا مفتوں ومتقاضی ہوا) اور اپنی خواہش کا تابع ہوا' (یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایسی بددعا کرنے میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی نہیں' مگر زر و مال کی ہوس میں ایسا کر گزرا) تو ایسے کا حال کتے کی طرح ہے کہ تو اس پر حملہ کرے تو زبان نکالے اور چھوڑ دے تو زبان نکالے۔ (یہ ایک ذلیل جانور کے ساتھ تشبیہ ہے کہ جو دنیا کی حرص میں مبتلا ہو' اگر اسکو نصیحت کرو تو بھی مبتلائے حرص رہتا ہے اور چھوڑ رکھو کہ شاید باز آئے مگر پھر بھی پاک و ناپاک مال کی ہوس اسکو مبتلائے حرص رکھتی ہے) جنہوں نے ہماری آیتیں جھٹلائیں انکی مثال (جیسا اوپر بیان ہوا) ایسی ہی ہے۔ پس تم ایسے نصیحت آموز واقعات انہیں سناؤ تا کہ غور و فکر کریں۔ (یعنی اپنے نفع و نقصان کو پہچان کر ہماری ھدایت پر (کاربند) رہیں اور شیطان کے اغوا سے بچے رہیں)۔ (اعراف:۱۷۶)

تابوتِ سکینہ

یہ صندوق حکم الٰہی کے بموجب کیکر کی لکڑی سے تیار شدہ مربعہ شکل صندوق تھا جس کی لمبائی ڈیڑھ ہاتھ چوڑائی ڈیڑھ ہاتھ اور اونچائی بھی ڈیڑھ ہاتھ تھی۔ اسکے اندر اور باہر سونے کے پترے لگے ہوئے تھے اور کنڈے بھی سونے کے تھے جس میں توراۃ رکھی جاتی تھی۔ حضرت موسیٰؑ نے یادگار کے طور پر ایک مرتبان میں ''من'' بھروا کر اس صندوق میں رکھوا دیا تھا۔ حضرت ھارونؑ کی وفات کے بعد آپکا پیراہن اور حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد آپکا عصا اور چند دیگر تبرکات بھی اس صندوق میں رکھے گئے۔ اسی صندوق کو تابوت سکینہ کہا جاتا ہے۔ سکینہ کے معنی ہیں سکون و آرام اور تسلی و اطمینان کے۔ یہ تابوت

تابوت سکینه

جس قوم کے پاس ہوتا وہ اسے باعث برکت تصور کرتے اور جنگ کے دوران اسے اپنے ساتھ آگے رکھ کر چلتے جس سے فتح و نصرت انکے قدم چومتی۔ سورۃ البقرۃ میں فرمان ہے:۔

وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖۤ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَ اٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ع (بقرۃ:۲۴۸)

ترجمہ:۔ اور انکے نبی نے ان سے کہا کہ اس کی بادشاہی کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس وہ صندوق پہنچ جائیگا جس میں تسلی کا سامان ہے اور وہ تبرکات ہیں جو موسیٰؑ اور ھارونؑ کی اولاد چھوڑ گئی ہے۔ اسے فرشتے اٹھالائیں گے بے شک اس میں بڑی نشانی ہے تمہارے لئے اگر تم ایمان دار ہو (بقرۃ:۲۴۸)

غرضیکہ وہ ایک متبرک صندوق تھا جو اس وقت بنی اسرائیل کے لشکر کے ہمراہ تھا جسے کاہنوں نے اٹھا رکھا تھا۔ جب وہ کاہن دریائے یرون پر پہنچے اور انہوں نے اپنے پاؤں دریا میں ڈالے تو دریا کا پانی دو حصوں میں تقسیم ہو گیا جس سے دریا کے بیچ راستہ بن گیا اور بنی اسرائیل دریا پار کر گئے۔ یرون کو عبور کرنے کے بعد حضرت یوشع علیہ السلام نے جلجال میں قیام کیا جہاں اریحا کے مشہور شہر کی فصیل سامنے تھی۔ حضرت یوشع علیہ السلام کو حکم ہوا کہ تابوتِ سکینہ کو ساتھ لیکر چھ دن تک روزانہ شہر کی فصیل کے گرد ایک چکر لگایا جائے۔ اس کے بعد یہ شہر فتح ہو گیا۔

فتح سے قبل اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا کہ وہ شہر میں عاجزی سے جھک کر خدا کے حضور توبہ و استغفار کرتے ہوئے داخل ہوں مگر انہوں نے رُوگردانی کی اور فاتحانہ متکبرانہ نعروں کے ساتھ شہر میں داخل ہوئے۔ انکی بدتمیزی کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ انہیں سجدہ کی حالت میں جھکتے ہوئے داخل ہونے کی تاکید تھی مگر وہ منہ پھیر کر الٹے پاؤں اپنی سرینوں کے بل گھسٹتے ہوئے اور حطۃ کی بجائے حنطۃ کہتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے جس پر انہیں آسمانی عذاب کا سامنا کرنا پڑا۔ (اس کے باوجود انکا دعویٰ ہے کہ انہیں جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی سوائے اُن چند دنوں کے جتنے دن وہ بچھڑا پوجنے میں مبتلا رہے) بعد ازاں اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق یوشع علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے قبیلوں میں فلسطین کی

علاقائی تقسیم کی۔

حضرت یوشع بن نونؑ نے ایک سودس برس کی عمر میں انتقال فرمایااور آپکوآپ ہی کی میراث کے شہر تمنت سرح میں (جوافراہیم کے کوہستانی علاقہ میں تھا) دفن کیا گیا۔قرآن حکیم نے آپکا نام لئے بغیر سورۃ مائدہ کی آیۃ ۲۳ میں اور سورۃ کہف کی آیات ۶۰ تا ۶۳ میں آپؑ کا ذکر فرمایا ہے۔

حضرت حزقیل علیہ السلام

حضرت موسیٰؑ کے بعد انبیائے بنی اسرائیل کا ایک طویل سلسلہ رواں دواں رہا جو حضرت عیسیٰؑ تک پہنچتا ہے۔ صدیوں پر محیط اس دَور میں کس قدر انبیاء ورُسل مبعوث ہوئے ان کی صحیح تعداد تو رب العزت ہی جانتا ہے البتہ اُن میں سے کچھ کا تذکرہ توراۃ شریف میں موجود ہے کچھ کا انجیل مقدس میں اور کچھ کا ذکر قرآن حکیم میں ہے۔ قرآن حکیم نے جن انبیاء وپیغمبران کا ذکر فرمایا ہے ان میں سے کچھ کا تذکرہ تفصیل سے کچھ کا اجمال کے ساتھ اور کچھ کے صرف نام بتائے ہیں اور بتقاضۂ مصلحت کچھ کے نام پوشیدہ رکھے ہیں۔

بنی اسرائیلی پیغمبروں کی تاریخی ترتیب ایک اختلافی مسئلہ رہا ہے اور جو تذکرے ترتیب دیئے گئے ہیں وہ زیادہ تر ابن جریر طبری اور ابن کثیر کی زمانی ترتیب کو مدنظر رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ توراۃ شریف اور تاریخی حوالوں کے مطابق حضرت موسیٰؑ اور حضرت ھارونؑ کی بعد حضرت یوشع علیہ السلام منصب نبوت پر فائز ہوئے اور ان کے بعد انکی جانشینی کا حق حضرت موسیٰؑ کے دوسرے رفیق ''کالب بن یوحنا'' نے ادا کیا۔ یہ موسیٰؑ کی ہمشیرہ مریم بنت عمران کے شوہر تھے مگر نبی نہیں تھے۔ طبری کا کہنا ہے کہ انکے بعد جس ہستی نے بنی اسرائیل کی روحانی اور دنیوی قیادت ورہنمائی کا فریضہ انجام دیا وہ حضرت حزقیل علیہ السلام ہیں۔ توراۃ کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ بوزی نامی ایک کاہن کے بیٹے تھے اور آپؑ کا نام حزقی ایل تھا۔ آپؑ اسرائیلیوں میں ابن العجوز کے لقب سے بھی مشہور تھے۔ حزقی ایل عبرانی زبان کے دو الفاظ حزقی اور ایل کا مرکب ہے جس میں حزقی کے معنی قدرت اور قوت کے ہیں اور ایل اسم جلالت ہے یعنی ایل اللہ تعالیٰ کو کہا جاتا ہے۔ یوں حزقی ایل نام کا معنیٰ ''قدرت اللہ'' ہے۔ جو اختصار کے ساتھ حزقیل ہوگیا۔

کہتے ہیں حضرت حزقیلؑ کے والد کا آپکے بچپن میں ہی انتقال ہوگیا تھا اور جب آپکی بعثت کا زمانہ قریب آیا تو اس وقت تک آپکی والدہ بھی بہت ضعیف اور معمر ہوچکی تھیں، اس لئے آپؑ بنی اسرائیل میں ''ابن العجوز'' کے لقب سے مشہور ہوئے جس کے معنی بڑھیا کے بیٹے کے ہیں۔

قرآن حکیم میں حضرت حزقیلؑ کا نام مذکور نہیں لیکن سورۃ بقرۃ میں بیان کردہ ایک واقعہ آپؑ سے منسوب ہے۔ صلف صالحین سے جو روایات منقول ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کا تعلق حضرت حزقیلؑ سے ہے۔ کتب تفاسیر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور بعض دوسرے صحابہ سے یہ روایت منقول ہے کہ بنی اسرائیل کی ایک بہت بڑی جماعت سے جب انکے پیغمبر حزقیلؑ نے یہ کہا کہ فلاں دشمن سے جنگ کیلئے تیار ہو جاؤ اور اعلاء کلمۃ اللہ کا فرض ادا کرو تو وہ اپنی جانوں کے خوف سے بھاگ کھڑے ہوئے اور اس یقین کے ساتھ کہ اب جہاد سے بچ کر موت سے محفوظ ہو گئے ہیں دُور ایک وادی میں قیام پذیر ہو گئے۔ اب یا تو حزقیلؑ نے ان کے فرار کو خدا کے حکم کی خلاف ورزی اور قضاء قدر کے فیصلہ سے رُو گردانی سمجھ کر ناراضگی کے سبب ان کیلئے بد دعا کی اور یا پھر خود اللہ تعالیٰ کو انکی یہ حرکت ناگوار گزری اور انہیں موت کی سزا دی۔ بہر حال غضب خداوندی کے نتیجے میں موت سے ڈر کر بھاگنے والے یہ تمام کے تمام لوگ ہلاک کر دیئے گئے۔

ایک ہفتہ کے بعد اُن پر حضرت حزقیلؑ کا گزر ہوا تو انہوں نے انکی اس حالت پر افسوس کا اظہار کیا اور ترس کھا کر دعا مانگی کہ یا الٰہ العٰلمین ان کو موت کے عذاب سے نجات عطا فرما تا کہ ان کی زندگی ان کیلئے باعث عبرت اور دوسروں کیلئے باعث بصیرت بن جائے۔ پیغمبرؑ کی دعا قبول فرمالی گئی اور وہ زندہ ہو کر نمونہ عبرت و بصیرت بنے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۱۳۴، روح المعانی ج ۲ ص ۱۳۰)

یہ اسرائیلی جماعت داذرُون کی باشندہ تھی جو شہر واسط سے چند کوس پر واقع اُس زمانہ کی مشہور آبادی تھی اور یہ لوگ حکم جہاد سے پہلو تہی کرتے ہوئے فرار ہو کر وادیٔ انیح میں چلے آئے تھے جہاں ان پر موت کا عذاب نازل ہوا۔ سورۃ بقرۃ ۲۴۳ میں ارشادِ ربانی ہے:۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ خَرَجُوۡا مِنۡ دِيَارِهِمۡ وَ هُمۡ اُلُوۡفٌ حَذَرَ الۡمَوۡتِ ۪ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوۡتُوۡا ثُمَّ اَحۡيَاهُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَشۡكُرُوۡنَ (البقرۃ:۲۴۳)

ترجمہ:۔ کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا' جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے ہزاروں کی تعداد میں نکلے' تو اللہ نے فرمایا مر جاؤ' پھر ان کو زندہ کر دیا' بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں پر فضل کرنے

والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے (بقرۃ ۲۴۳)

شریعت محمدیہ میں بھی میدان جہاد سے فرار (شرک باللہ کے بعد) سب سے بڑے گناہوں میں شمار ہوتا ہے اور حقیقت حال بھی یہی ہے کہ خدا پر ایمان لانے کے بعد جب انسان اپنی جان و مال کو اس کے سپرد کر دیتا ہے (کیونکہ اپنے رب کی غلامی و فرمانبرداری ہی کا نام اسلام ہے) تو پھر اس کو ایک لمحہ کیلئے بھی یہ حق حاصل نہیں رہتا کہ وہ اس کے حکم کے خلاف جان بچانے کی فکر کرے۔ یوں بھی جب انسان یہ اعتقاد و یقین حاصل کر لے کہ خیر و شر اور موت و حیات سب خالق کائنات کے کارکنانِ قضاء و قدر کے ہاتھ ہے تو پھر ایک لمحہ کیلئے بھی اس کو یہ خیال نہیں آتا کہ وہ خدا کی مقررہ قدر کے متعلق یہ باور کرے کہ وہ خدا کے فیصلہ کو رد کر سکتا یا کسی طرح تبدیل کر سکتا ہے۔

مشہور تابعی ابن جریج کہتے ہیں حضرت حزقیلؑ اور بنی اسرائیل کے ضمن میں جو کچھ کہا گیا ہے یہ واقعہ اپنی نوعیت کا اکلوتا واقعہ ہے جو قرآن نے بطورِ تمثیل جہاد سے بھاگنے والوں کی عبرت و بصیرت کیلئے بیان فرمایا۔ حزقیلؑ اور بنی اسرائیل سے متعلق جو بصیرتیں نمایاں طور پر دعوتِ فکر دیتی ہیں ان میں سے پہلی تو یہ ہے کہ اگر فطرت سلیم اور طبع مستقیم ہو تو انسان کی ہدایت اور بصیرت کیلئے محض ایک مرتبہ فکر و ذہن کو حقائق کی جانب متوجہ کر دینا کافی ہے۔ پھر اس کی انسانیت خود بخود راہِ مستقیم پر گامزن ہو جاتی اور منزلِ مقصود کا پتہ لگا لیتی ہے۔ دوسری یہ کہ جہاد اگرچہ قوم کے بعض افراد کیلئے پیغامِ موت بن کر ان کو دنیوی لذائذ سے محروم کر دیتا ہے، لیکن وہ اقوام و اُمم کیلئے اکسیر حیات اور قومی و ملی نظام کی بقائے دوام کا کفیل بھی ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ آغوش موت میں جانے والوں کیلئے فانی اور ناپائیدار زندگی کے عوض حیاتِ سرمدی عطا فرما دی جانے کا سبب بھی ہے۔ جیسا کہ سورۃ بقرۃ آیت ۱۵۴ میں فرمان ہے:۔

وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (۱۵۴)

ترجمہ:۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے انہیں مردہ نہ کہو، بلکہ وہ حقیقی حیات کے حامل ہیں، لیکن تم اس حقیقت سے شعوری طور پر آگاہ نہیں (بقرۃ:۱۵۴)

حضرت الیاس علیہ السلام

بنی اسرائیل کی روائتی گمراہی، بے دینی اور شرک و بت پرستی جن دنوں اپنے شباب پر تھی اس دَور میں انکی ھدایت کیلئے حضرت الیاسؑ تشریف لائے۔ قرآن حکیم میں موسٰیؑ اور ھارونؑ کے بعد جس نبی کا تذکرہ نام کے ساتھ فرمایا گیا ہے وہ حضرت الیاسؑ ہیں۔ انجیل یوحنا میں آپؑ کو ایلیا کے نام سے پکارا گیا ہے۔ بعض آثار میں ہے کہ الیاسؑ اور ادریسؑ ایک ہی نبی کے دو نام ہیں حالانکہ یہ حقیقت نہیں۔ قرآن حکیم کا اندازِ بیان ان آثار کی تردید کرتا ہے۔ نیز مورّخین نے حضرت ادریسؑ کا جو نسب نامہ بیان کیا ہے وہ حضرت الیاسؑ کے نسب نامہ سے الگ ہے اور پھر دونوں نبیوں کے درمیان صدیوں کا بُعد پایا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے حضرت ادریسؑ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے قبل گزرے ہیں اور تقریباً انکے وسط میں آپکا زمانہ تھا۔ حضرت الیاسؑ بنی اسرائیلی ہیں اور حضرت موسٰیؑ و ھارونؑ کے بعد مبعوث ہوئے۔ طبری کی تحقیق ہے کہ آپؑ حضرت الیسع علیہ السلام کے چچازاد بھائی تھے اور آپکی بعثت حضرت حزقیلؑ کے بعد اور حضرت الیسع علیہ السلام سے قبل ہوئی۔

بیشتر مورّخین اس پر متفق ہیں کہ حضرت الیاسؑ حضرت ھارونؑ کی نسل سے ہیں اور آپؑ کا نسب نامہ یہ ہے:۔ الیاس بن یاسین بن فخاص بن العیزر بن ھارونؑ۔ مفسرین اور مورخین کا اس امر پر بھی اتفاق ہے کہ الیاسؑ ملک شام کے باشندوں کی ھدایت کیلئے بھیجے گئے تھے اور بعلبک کا مشہور شہر آپکی رسالت و ھدایت کا مرکز تھا۔

حضرت الیاسؑ کی قوم مشہور بت ''بعل'' کی پرستار، توحید سے بیزار ایک مشرک قوم تھی۔ آپؑ نے انہیں سمجھایا اور توحید کی طرف راہنمائی کرتے ہوئے صنم پرستی و کواکب پرستی کے خلاف وعظ و نصیحت جاری رکھی مگر ان لوگوں پر بھی کم ہی اثر ہوا۔ کیونکہ یہ لوگ بعل کی بہت تعظیم کرتے تھے جس بناء پر اسکے خلاف کسی قسم کی بات سنتے ہی سیخ پا ہو جاتے یہاں تک کہ وہ حضرت الیاسؑ کے جانی دشمن ہو گئے۔

جس جگہ بعل نامی یہ بت ایستادہ تھا اس جگہ کا نام ''بک'' تھا اور یہ جگہ بعل کے بک کی نسبت سے بعلبک ہوگئی بلکہ پورے شہر کا نام ہی بعلبک مشہور ہو گیا جو کہ شام میں واقع ہے۔ بعل سونے سے بنا

ایک دیوہیکل بت تھا جس کی لمبائی بیس گز تھی اور اسکے چار منہ بنائے گئے تھے۔انہوں نے اسکی خدمت کیلئے چار سو خادم مقرر کر رکھے تھے۔(روح المعانی جلد۲۳ص ۶۲۷)

بعل مشرق میں آباد سامی اقوام کا مشہور اور سب سے زیادہ مقبول دیوتا تھا۔یہ بت مذکر تھا اور زحل یا مشتری کا مثنیٰ سمجھا جاتا تھا۔فنیقی، کنعانی، موابی اور مدیانی قبائل خاص طور پر اسکی پوجا کرتے تھے۔ یوں تو بعل کی پرستش عہد قدیم سے چلی آتی تھی تاہم موابی اور مدیانی بھی عہد موسوی سے اس کی پوجا کرتے آئے تھے اور حضرت شعیبؑ مدین میں اسی کے پرستاروں سے نبرد آزما رہے۔

بعض مورّخین کا خیال ہے کہ حجاز کا مشہور بت ہبل بھی یہی بعل ہی ہے اور بعل کے شروع میں ''ہ'' کا اضافہ کر کے وسطی ''ع'' حزف کر دیا گیا ہے۔اس بت کی عظمت کا یہ حال تھا کہ مختلف مربیانہ عطاء ونوال کی وجہ سے یہ مختلف ناموں سے موسوم تھا۔توراۃ شریف نے سامی قوموں کی پرستشِ بعل کا ذکر کرتے ہوئے بعل کو بعل بریث اور بعل فغور کے نام سے یاد کیا ہے۔عقرونیوں کے ہاں بعل زبوب کا اضافہ پایا جاتا ہے۔کلدانیوں کے ہاں بعل زیر کے ساتھ بولا جاتا ہے اور وہ اکثر بیل اور بیلوس یا بعل اور بعلوس بھی کہتے ہیں۔

سامی اور عبرانی زبانوں میں بعل کے معنی مالک، سردار، حاکم اور رب کے ہوتے ہیں اسی لئے اہل عرب خواتین شوہر کو بھی بعل کہتی ہیں۔یہودی یا مشرقی اسرائیلیوں کے یہاں بعل کی پرستش کیلئے مختلف موسموں میں نوعیت کے لحاظ سے عظیم الشان مجالس منعقد ہوا کرتی تھیں اور اسکے لئے بڑے بڑے ہیکل اور بڑی بڑی قربان گاہیں بنائی جاتی تھیں۔کاہن اس پر طرح طرح کی خوشبوئیں نچھاور کرتے اور اس بت پر بڑی عقیدت سے انسانوں کو بھینٹ چڑھایا جاتا۔(دائرۃ المعارف البستانی ج/۴)

حضرت الیاسؑ کے زمانے میں یمن وشام کا یہ بت ہی محبوب دیوتا تھا اور حضرت الیاسؑ کی قوم بھی دیگر بتوں کی نسبت خصوصیت سے بعل کی پرستش کرتی تھی جن کی ھدایت کیلئے آپؑ مبعوث ہوئے۔حضرت الیاسؑ کے بارے سورۃ الصٰفٰت ۱۲۳ تا ۱۳۲ میں ارشادِ ربانی یوں ہے:۔

وَ اِنَّ اِلْیَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ (۱۲۳) اِذْ قَالَ لِقَوْمِہٖٓ اَلَا تَتَّقُوْنَ (۱۲۴) اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّ تَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِیْنَ (۱۲۵) اللّٰہَ رَبَّکُمْ وَ رَبَّ اٰبَآئِکُمُ

اَلْاَوَّلِیْنَ(۱۲۶) فَکَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ لا (۱۲۷) اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِیْنَ(۱۲۸) وَ تَرَکْنَا عَلَیْهِ فِی الْاٰخِرِیْنَ لا (۱۲۹) سَلٰمٌ عَلٰٓی اِلْ یَاسِیْنَ(۱۳۰) اِنَّا کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ(۱۳۱) اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ(۱۳۲) (الصّٰفّٰت:۱۲۳تا۱۳۲)

ترجمہ:۔اور بلاشبہ الیاس رسولوں میں سے ہیں (۱۲۳) (وہ وقت قابل ذکر ہے) جب اس نے اپنی قوم سے کہا کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے (۱۲۴) (تمہاری عقلوں پر حیرت ہے) کیا تم بعل کو پکارتے ہو اور سب سے بہترین خالق (خدا) کو چھوڑتے ہو (۱۲۵) (جبکہ حق بات یہ ہے) اللہ ہی تمہارا اور تمہارے گزر چکے باپ داداؤں کا پروردگار ہے (۱۲۶) تو (اسکے باوجود) انہوں نے الیاسؑ کو جھٹلایا اور بلاشبہ وہ (مجرموں کی طرح خدا کے حضور سزائے جہنم کیلئے) لائے جائیں گے (۱۲۷) سوائے ان لوگوں کے جو (اس قوم میں) اللہ کے خالص چنیدہ بندے (اور الیاسؑ پر ایمان لائے ہوئے) ہیں (۱۲۸) اور ہم نے بعد آنے والوں میں اسکی ثنا باقی رکھی (۱۲۹) الیاسؑ پر سلامتی ہو (۱۳۰) بیشک ہم نیکوکار لوگوں کو ایسا ہی صلہ دیتے ہیں (۱۳۱) بیشک وہ (الیاسؑ) ہمارے اعلیٰ درجہ کے کامل الایمان بندوں میں ہے (الصّٰفّٰت:۱۳۲))

اللہ تعالیٰ نے سورۃ انعام میں بھی دیگر انبیاء کے ساتھ حضرت الیاسؑ کو صالحین میں سے شمار فرمایا ہے:۔

وَ زَکَرِیَّا وَ یَحْیٰی وَعِیْسٰی وَ اِلْیَاسَ ط کُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ لا (انعام:۸۵)

ترجمہ:۔اور زکریاؑ اور یحیٰؑ اور عیسیٰؑ اور الیاسؑ یہ تمام ہی صالحین میں سے ہیں (انعام:۸۵)

حضرت الیاسؑ سے کئی معجزوں کی فرمائشیں کی جاتی رہیں جنہیں آپؑ تائید خداوندی سے پورا بھی فرماتے رہے مگر اسکے باوجود آپکی قوم گمراہی پر قائم رہی اور آپکے قتل پر آمادہ ہوگئی۔تفسیر روح المعانی جلد پنجم میں مذکور ہے کہ آپؑ رُوپوش ہوگئے اور حکومت نے آپکی گرفتاری پر بڑے انعام کا لالچ بھی دیا نیز گوشے گوشے میں جاسوسی کے جال پھیلائے گئے اور بڑی مستعدی سے آٹھ برس تک آپکی تلاش جاری رہی مگر آپؑ کا کہیں سراغ نہ ملا۔کہا جاتا ہے کہ آپؑ بھی خضرؑ کی مانند زندہ ہیں۔واللہ اعلم بالثواب

سورۃ الصافات ۱۲۳تا۱۳۲ میں اور سورۃ الانعام ۸۵ میں آپکا ذکر آیا ہے۔

حضرت الیسع علیہ السلام

وہب بن منبہؒ کی اسرائیلی روایات میں ہے کہ آپ کا نام الیسع ہے اور آپ عدی خطوب کے بیٹے تھے۔ابن اسحٰق نے اسی کو اختیار کیا ہے۔تواریخ کی بیشتر کتب میں یہ بھی منقول ہے کہ حضرت الیسع علیہ السلام حضرت الیاسؑ کے چچازاد بھائی تھے۔ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے کہ آپ حضرت یوسفؑ بن یعقوبؑ کی نسل میں سے تھے اور نسب نامہ اس طرح ہے:۔الیسع بن عدی بن شوتم بن افراہیم بن یوسفؑ بن یعقوبؑ بن اسحٰق علیہ السلام بن ابراہیمؑ۔اور اگر توراۃ کے یسعیاہ اور حضرت الیسع ایک ہی شخصیت ہیں تو ولدیت کے لحاظ سے آپ عموص کے بیٹے ہیں۔

حضرت الیسع علیہ السلام حضرت الیاس علیہ السلام کے نائب اور خلیفہ ہیں اور اوائل عمر ہی سے انکی رفاقت میں رہے اور حضرت الیاس کے رُوپوش یا انتقال کے بعد بنی اسرائیل کی رہنمائی کیلئے حضرت الیسع کو نبوت سے سرفراز فرمایا گیا اور انہوں نے حضرت الیاسؑ کے ہی طریقہ پر بنی اسرائیل کی رہنمائی فرمائی۔قرآن عزیز میں انکے حالات پر زیادہ روشنی نہیں ڈالی گئی اور سورۃ انعام اور سورۃ صٓ میں صرف نام اور مختصر ذکر پر اکتفا کیا ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں فرمان ہے:۔

وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَ الْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ؕ وَ كُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ ؕ (۴۸) (سورۃ:صٓ)

ترجمہ:۔اور ذکر کیجئے اسمٰعیل اور الیسع اور ذوالکفل کا اور وہ سب اخیار (نیک انسانوں) میں سے تھے (صٓ:۴۸)

وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ الْيَسَعَ وَ يُوْنُسَ وَ لُوْطًا ؕ وَ كُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۙ (انعام:۸۶)

ترجمہ:۔اور اسمٰعیلؑ اور یسعؑ اور یونسؑ اور لوطؑ اور سب (انبیاء) کو (انکے وقتوں میں) تمام جہانوں میں فضیلت (وبرتری) سے نوازا (انعام:۸۶)

سورۃ صٓ کی آیت ۴۸ میں اخیار کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے جس کے ظاہرہ معانی تو نیکوکار لوگوں کے یا چنے ہوئے پسندیدہ لوگوں کے ہیں لیکن دراصل صوفیاء اور اہل اللہ کے مراتبِ قرب کا یہ ایک درجہ ہے۔جیسا کہ ان درجات کا حتمی بلند درجہ فردیت اور صدیقیت سے بھی بڑا ہے جو عبودیت سے

منسوب ہے اور عبودیت کے اس درجہ کے حامل کو ''عبد'' کہا جاتا ہے۔

سورۃ انعام کی آیات ۸۳ تا ۸۶ میں انبیاء و رُسل کی جو شان بیانی فرمائی گئی ہے اس سے مراد بطورِ خاص طبقہ صالحین کی اہمیت سے متعارف کرانا ہے۔ البتہ سب کو جہانوں میں فضیلت عطا فرمائی جانے کا فرمان ہمیں اس بات کو سمجھنے کی دعوت بھی دیتا ہے۔ ایک تو یہ بات اپنی جگہ مستحکم ہے کہ ہر نبی و رُسل اپنی قوم میں ہر کسی سے افضل ہوتا ہے خواہ اسکے مقابل کوئی دنیاوی شہنشاہ موجود ہو یا کوئی روحانی ہستی تشریف فرما ہو۔ دوسرے آیت متذکرہ سے یہ سند لائی جاتی ہے کہ انبیائے کرام ملائکہ سے افضل ہیں۔ کیونکہ ''عالمین'' اللہ تعالیٰ کے سوا تمام موجودات کو شامل ہے اور فرشتے بھی اس میں داخل ہیں۔ جب انبیاء کو تمام جہان والوں پر فضیلت دی گئی تو ملائکہ پر بھی ثابت ہوگئی۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے اٹھارہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ذکر فرمایا اور اس ذکر میں ترتیب نہ تو زمانہ کے اعتبار سے ہے نہ فضیلت کے اعتبار سے، لیکن جس شان سے انبیاً علیہم السلام کے اسماء ذکر فرمائے گئے اس میں ایک عجیب لطیفہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی ہر ایک جماعت کو ایک خاص طرح کی کرامت و فضیلت کے ساتھ ممتاز فرمایا۔

حضرت نوح و ابراہیم و اسحٰق و یعقوب علیہم السلام کا اوّل ذکر فرمایا کیونکہ یہ انبیاء کے اصول ہیں یعنی ان کی اولاد میں بکثرت انبیاء ہوئے جن کے انساب انہی کی طرف راجع ہیں۔ نبوت کے بعد مراتبِ معتبرہ میں سے ملک، اختیار و سلطنت اور اقتدار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ کو اس کا وافر حصہ دیا۔ مصیبت و بلاً پر صابر رہنا مراتب رفیعہ میں سے ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوبؑ کو اسکے ساتھ ممتاز فرمایا۔ پھر ملک اور صبر کے دونوں مرتبے حضرت یوسفؑ کو عنایت کیے کہ آپؑ نے شدائد و بلاً پر مدتوں صبر فرمایا پھر اللہ تعالیٰ نے آپکو نبوت کے ساتھ ملک مصر عطا فرمایا۔ معجزات و قوتِ براہین بھی مراتبِ معتبرہ میں سے ہیں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ھارونؑ کو اسکے ساتھ مشرف فرمایا۔ زُہد اور ترکِ دنیا بھی مراتب معتبرہ میں سے ہے تو حضرت زکریا و یحییٰ و عیسیٰ و الیاس علیہم السلام کو اسکے ساتھ مخصوص فرمایا۔

اِن حضرات کے بعد اُن انبیاء کا ذکر فرمایا گیا ہے جن کے نہ متبعین باقی رہے نہ انکی شریعتیں

بعلبک : مقام تبلیغ قوم یسع علیہ السلام

جیسے کہ حضرت اسمٰعیلؑ حضرت یسّعٰ حضرت یونسؑ اور حضرت لوط علیہ السلام۔ پھر اس شان سے اپنے انبیاء کا ذکر فرمانے اور ان کی کرامتوں اور خصوصیات کو (جو اُسی کی عطا فرمائی ہوئی ہیں) سراہنے سے ہمارے قلب و جاں میں ایسے مسحور کن اثرات مرتب ہوتے ہیں جو قلوب کو خوشی سے بھر دیتے ہیں اور بے اختیار ہمارے ایمان حق الیقین کی سرحدات کو چھونے لگتے ہیں۔ یقیناً ایسی پرشکوہ ہستیوں کو پیدا فرمانے والا ہمارا رب لاجواب ہے اور بلاشک احسن الخالقین ہے۔

اخبار الرسل میں مذکور ہے کہ حضرت الیسع علیہ السلام اوّلاً خلیفہ ہوئے پھر بنی اسرائیل کی ہدایت کیلئے نبی بنا دیئے گئے۔ آپؑ کے بیشتر معجزات میں سے ایک یہ ہے کہ ایک مرتبہ دمشق کے بادشاہ نے بنی اسرائیل کے ایک حاکم کو خط لکھا کہ میری برص کی بیماری کیلئے کوئی اچھا سا طبیب روانہ کرو۔ اس حاکم نے آپؑ سے ایک طبیب کو بھیجنے کی اجازت چاہی تو آپؑ نے فرمایا طبیب بھیجنے کی ضرورت نہیں اسے کہو کہ دمشق کی نہر میں غسل کرلے اللہ کے حکم سے اچھا ہو جائیگا۔ بادشاہ نے ہر چند یہ جواب پا کر غسل کرنے میں تامل کیا۔ غالباً اس لئے کہ وہ اس نہر میں بارہا غسل کر چکا تھا مگر امراء و وزراً کے اصرار پر بالآخر غسل پر آمادہ ہو گیا اور غسل کر آیا۔ خدا کی قدرت کہ وہ چند یوم میں تندرست و شفایاب ہو گیا۔ اس پر وہ حضرت الیسع علیہ السلام کے عقائد کا قائل ہو گیا اور آپکی بے پناہ عزت و تکریم کرنے لگا۔

تفسیر ابن جریر طبری جلد سوم میں لکھا ہے کہ حضرت الیسع علیہ السلام کی زندگی میں سادگی بہت تھی اور آپؑ کھیتی باڑی کر کے بسر اوقات کرتے تھے۔ آپؑ حتی المقدور بنی اسرائیل کو راہِ راست پر لانے کی سعی کرتے رہے۔ قوم پر آپکا رعب و دبدبہ بہت تھا اور جب آپؑ وعظ و نصیحت فرماتے لوگوں کے دلوں پر ہیبت طاری ہو جاتی۔ مگر بنی اسرائیل کی بدقسمتی کہ مسلسل سعی و تنبیہ کے باوجود قوم سیدھے راستے پر نہ آئی۔ جب آپؑ ان سے بہت زیادہ بیزار ہو گئے تو خدا کے حضور عرض کی کہ اب میرا اِس قوم میں رہنا دشوار ہو گیا ہے مجھے اپنی بارگاہ میں واپس بلا لیجئے چنانچہ آپؑ اس دنیا سے کوچ فرما گئے۔

جس طرح حضرت الیاسؑ قوم کی سنگدلی اور گمراہی کی دلدل میں پھنسی رہنے کی بناء پر بیزار ہو کر رُوپوش ہو گئے تھے بعین اسی طرح حضرت الیسع علیہ السلام کے بارے میں بھی مورّخین و مفسرین خاموش ہیں کہ انہوں نے کس عمر میں اور کہاں انتقال فرمایا اور وہ بنی اسرائیل میں کتنے عرصہ تک تبلیغ کا حق

ادا کرتے رہے۔

تاہم ان واقعات سے یہ بات صاف واضح ہے کہ جلیل القدر انبیاء کے شرفِ صحبت اور انکی مخلصانہ اتباع کے باعث ان کے بہت سے خوش نصیب ساتھی بھی خلافت اور منصب نبوت جیسے مراتب سے سرفراز ہوئے۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ نیکوں کی صحبت حصولِ خیر کیلئے اکسیر اعظم ہے۔ رُومیؒ نے سچ فرمایا ہے:۔

یک زمانہ صحبتِ با اولیاء
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

قرآن حکیم میں حضرت الیسع علیہ السلام کا تذکرہ صرف دو موقعوں پر آیا ہے:۔

۱۔ سورۃ انعام آیت ۸۶ میں اور

۲۔ سورۃ ص کی آیت ۴۸ میں۔

حضرت شمویل علیہ السلام

حضرت یوشع علیہ السلام کے وصال کے وقت تک ملک شام پوری طرح فتح نہیں ہوا تھا اور فلسطین کا کافی علاقہ فتح ہونے سے رہ گیا تھا۔ حضرت یوشع علیہ السلام کے بعد نبی یہوداہ کو حکم ہوا کہ وہ آگے بڑھیں اور فتوحات کے سلسلے کو مکمل کریں۔ نبی یہوداہ نے نبی شمعون اور بنی اسرائیل کے دوسرے قبائل کو ساتھ لے کر اس حکم کی تعمیل کی۔ لیکن اس دوران بنی اسرائیل پھر گناہ و معصیت اور شرک و بت پرستی میں مبتلا ہو گئے۔ جس کی سزا انہیں یہ ملی کہ قرب و جوار کی قومیں ان پر حملہ آور ہو کر غالب آتی رہیں اور ان کو طرح طرح کی اذیتیں دیتی رہیں۔

حضرت یوشع علیہ السلام اپنے آخری وقت میں قاضیوں کا تقرر فرما گئے تھے۔ حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد تقریباً ساڑھے تین سو سال تک یہ نظام یوں ہی قائم رہا۔ خاندانوں اور قبیلوں میں سردار حکومت کرتے اور انکے مناقشات و معاملات کے فیصلے قاضی انجام دیتے تھے اور نبی' ان تمام امور کی نگرانی کے ساتھ ساتھ دین کی دعوت و تبلیغ اور اسکی نشر و اشاعت کی خدمت بھی سرانجام دیتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بفضل ایزدی کسی قاضی کو خلافت یا منصب نبوت عطا ہو جاتا۔ البتہ اس تمام عرصہ میں نہ تو بنی اسرائیل کا کوئی بادشاہ تھا اور نہ تمام قوم کا ایک حکمران۔ یہ قبیلوں اور خاندانوں میں بٹے ہوئے تھے اسلئے ہمسایہ قومیں اکثر ان پر حملہ آور ہوتی رہتیں اور بنی اسرائیل ان کا نشانہ بنتے رہتے تھے۔ کبھی عمالقہ ان پر چڑھ دوڑتے اور کبھی فلسطینی' کبھی ارامی حملہ آور ہوتے تو کبھی مدیانی۔ پھر اگر ان حملہ آوروں میں سے کبھی کسی کو ہزیمت ہو بھی جاتی تو بھی وہ آئے دن چھاپے مارتا رہتا' لوٹ مار کرتا رہتا اور یہ سلسلہ مدتوں یونہی جاری رہتا۔ یہاں تک کہ اِن پیہم جنگوں میں بنی اسرائیل کی سب سے مقدس متاع عہد کا صندوق یعنی (تابوتِ سکینہ) بھی ان سے چھن گیا تھا جس میں توراۃ شریف کا نسخہ' حضرت موسیٰؑ کا عصا' حضرت ھارونؑ کا پیراہن' مٹی کا ایک مرتبان جس میں حضرت موسیٰؑ نے تبرک کے طور پر آسمان سے اترنے والا ''من'' بھروا کر رکھا تھا اور چند دوسرے تبرکات تھے۔ فلسطینی قوم ''اشدودی'' ان سے یہ صندوق چھین کر لے گئے جسے انہوں نے اپنے سب سے بڑے دیوتا ''دجون'' کے مندر میں رکھ دیا۔

یہ چوتھی صدی موسوی کا زمانہ تھا جس میں عیلی کاہنؒ اِن حملہ آوروں سے برسر پیکار تھے۔ جب اُن کے دو بیٹے حفنی اور فیخاس بھی جنگ میں کام آ گئے تو عیلی کاہن پر یہ صدمۂ جانکاہ ناقابل برداشت ثابت ہوا اور وہ چند یوم بعد ہی جاں بحق ہو گئے۔ گویا اب عیلی کاہن کا زمانہ بھی ختم ہو گیا تو قضاۃ میں سے شموئل نام کے ایک قاضی کو من جانب اللہ منصب نبوت عطا ہوا جن کو بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کیلئے مامور کیا گیا۔

بعض آثار میں مذکور ہے کہ جب حضرت الیسع علیہ السلام کی وفات ہو گئی تو مصر اور فلسطین کے درمیان بحر روم پر آباد عمالقہ کے جالوت نامی ایک جابر و ظالم حکمران نے بنی اسرائیل کو مغلوب کر کے انکی آبادیوں پر قبضہ کر لیا اور انکے بہت سے سرداروں اور قبائل کے معزز لوگوں کو گرفتار کر کے ساتھ لے گیا۔ جالوت نے نہ صرف باقی بچ جانے والوں کو مقہور و مغلوب کر کے ان پر خراج مقرر کیا بلکہ انکی مذہبی کتاب توراۃ کو بھی فنا کر ڈالا۔

بنی اسرائیل کیلئے یہ ایک ایسا نازک دَور تھا جس میں انکا نہ کوئی نبی تھا نہ رسول، نہ سردار نہ امیر، نکبت اِدبار کی اس حالت میں اللہ تعالیٰ کے فضل اور عیلی کاہن کی دعا سے حنا نامی ایک بانجھ عورت کے ہاں بچہ پیدا ہوا جس کا نام شموئیل رکھا گیا۔ یہ بھی روایت ہے کہ رضاعت کا زمانہ ختم ہونے کے بعد حنا اپنے بچے کو لے کر عیلی کاہن کے پاس آئیں اور نذر کے مطابق بچہ انکے سپرد کر دیا۔ شموئیل کی پرورش کا ذمہ بنی اسرائیل کے اس بزرگ نے اپنے ذمے لے لیا جن کا نام عیلی کاہن ہے۔ ان ہی کی سرپرستی میں شموئیلؑ نے توراۃ حفظ کی اور دینی تعلیم کے مدارج طے کئے۔ شموئیل جب سن رشد کو پہنچے تو بنی اسرائیل میں ممتاز اور نمایاں نظر آنے لگے۔ حضرت یوشع علیہ السلام نے اپنی آخری عمر میں جو نظامِ قضاۃ قائم فرمایا تھا اس نظام کے تحت شمایلؑ قاضی مقرر ہو گئے اور عیلی کاہن کی وفات کے بعد شمایل نامی اسی قاضی کو منصب نبوت عطا فرمایا گیا۔

حضرت شموئیلؑ عمر بھر بنی اسرائیل میں نبوت اور عدالت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ یوں تو آپ کا مستقل قیام اپنے آبائی شہر ''رامہ'' میں تھا لیکن آپ بسلسلہ عدالت ہر سال مختلف مقامات کا دَورہ فرمایا کرتے اور ساتھ ہی ساتھ ہدایت و تبلیغ کا سلسلہ بھی جاری رکھتے۔ جب آپؑ کو یہ وحشت ناک

خبر ملی کہ دشمن تابوت سکینہ بھی چھین کر لے گئے ہیں تو آپؑ نے بنی اسرائیل کو جمع کر کے ایک خطبہ ارشاد فرمایا کہ موجودہ پریشان کن حالات' انکی بدکرداری' نافرمانی اور شرک کی سزا ہے جو انہیں دی گئی ہے۔ اگر اب بھی یہ لوگ اپنی گمراہی سے باز آجائیں اور شرک سے توبہ کر کے توحید الٰہی پر جم جائیں تو اُس غفور الرحیم سے کچھ بعید نہیں کہ وہ پھر اُن کو اپنی نوازشات اور عنایاتِ خصوصی سے سرفراز فرمادے۔

شمویل نام دراصل سموئیل ہے اور عبرانی میں شما ایل۔ شماع یعنی سماع (سننا) اور ایل خدا تعالیٰ کا نام مبارک ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا سننا جو کہ عربی زبان میں اسمٰعیل ہے۔ مورخین کہتے ہیں حضرت شمویلؑ حضرت ہارونؑ کی نسل سے ہیں (خازن ج ۲ ص ۳) اور انکا نسب نامہ یہ ہے:۔ شمویل بن بالی بن علقمہ بن یرخام بن یہو بن تہو بن علقمہ بن ماحث بن عموص بن عزایا۔ (روح المعانی ج ۲ ص ۴۲ تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۵)

حضرت شمویلؑ کے دو بیٹے تھے پہلے کا نام یوئیل اور دوسرے کا نام ابیاہ تھا۔ ان دونوں کا قیام بیر سبع میں تھا اور حضرت شمویلؑ نے ان دونوں کو قاضی مقرر کر دیا تھا۔ مگر افسوس کہ اِن دونوں کو طمع و ہوس نے راہِ راست سے بھٹکا دیا۔ حضرت شمویلؑ آخری وقت تک اپنے آبائی شہر رامہ میں ہی رہے اور وہیں انتقال فرمایا۔ آپؑ کی بعثت کا زمانہ ۱۱۰۰ ق م بتایا جاتا ہے۔ توراۃ شریف میں آپکا ذکر سموئیل اوّل کے نام سے ہوا ہے جبکہ قرآن حکیم میں آپکا نام لئے بغیر سورۃ بقرۃ کی آیات ۲۴۶ تا ۲۵۱ میں آپؑ کا اجمالی اور ضمنی تذکرہ ہوا ہے جسے میں حضرت طالوت کے مضمون میں بیان کرونگا۔ تاہم قرآن حکیم نے جن الفاظ میں آپکا تذکرہ فرمایا ہے اُس سے آپکے علم و ایمان کی پختگی' آپکے کردار کی پاکیزگی و بلندی اور آپؑ کی عظمت و فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔

حضرت طالوتؒ

ایک طرف حضرت شمویلؑ کافی کمزور اور ضعیف ہو چکے تھے تو دوسری طرف عمالقہ کے حملے اور مظالم شدید سے شدید تر ہوتے جا رہے تھے۔ توراۃ شریف میں مذکور ہے کہ شمویل کے دونوں بیٹوں یوئیل اور ابیاہ کو طمع اور ہوس نے راہِ راست سے بھٹکا دیا تھا۔ ان حالات کے پیش نظر بنی اسرائیل کے سردار جمع ہو کر حضرت شمویلؑ کے پاس آئے اور درخواست کی کہ انکے لئے کوئی بادشاہ مقرر فرما دیں۔ حضرت شمویلؑ نے پہلے تو انہیں منع کر دیا اور ٹالنے کی کوشش کی مگر جب انکا اصرار زیادہ بڑھ گیا تو آپؑ نے اُن سے اقرار لیا کہ یہ نہ ہو کہ تم پر جہاد فرض ہو جائے اور تم اس سے پہلوتہی کا ارتکاب کرو تو انہوں نے اقرار کیا اور کہا کہ ہم ایسوں سے کیوں نہ لڑیں گے جنہوں نے ہمیں ہمارے گھروں سے بے گھر اور بال بچوں سے جدا کر دیا ہے۔ اس پر بحکم خداوندی حضرت شمویلؑ نے ساؤل کو انکا بادشاہ نامزد کر دیا۔ سورۃ بقرۃ میں اسی ساؤل کا نام ''طالوت'' بیان فرمایا گیا ہے ارشادِ ربانی ہے:۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ۭ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَاۗىِٕنَا ۭ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ (البقرۃ: ۲۴۶)

ترجمہ:۔ کیا تم نے بنی اسرائیل کی ایک جماعت کو نہیں دیکھا' جس نے موسیٰؑ کے بعد اپنے پیغمبر سے کہا کہ آپ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیں' تا کہ ہم خدا کی راہ میں جہاد کریں۔ پیغمبر (شمویلؑ) نے کہا اگر تم کو جہاد کا حکم دیا جائے تو عجب نہیں کہ لڑنے سے پہلوتہی کرو۔ وہ کہنے لگے ہم راہِ خدا میں کیوں نہ لڑیں گے جبکہ ہم وطن اور بال بچوں سے دُور کر دیئے گئے۔ لیکن جب ان کو جہاد کا حکم دیا گیا تو چند لوگوں کے سوا سب پھر گئے اور خدا ظالموں سے خوب واقف ہے (بقرۃ: ۲۴۶)

حضرت طالوت قبیلۂ بنیامین سے تعلق رکھتے تھے آپ کا نسب نامہ توراۃ میں مختلف مقامات پر بیان ہوا ہے مگر ہر جگہ درمیان کی کچھ کڑیاں بیان ہونے سے رہ گئی ہیں اور سلسلہ بنیامینؓ حضرت یعقوبؑ تک نہیں پہنچتا۔ حضرت طالوت نہایت وجیہہ قدآور اور جری انسان تھے۔ طوالت قد کا یہ عالم کہ لوگ آپ کے کندھوں تک آتے تھے۔ مگر مالی لحاظ سے آپ متمول نہیں تھے اور آپکا خاندان نہایت غریب اور مفلوک الحال تھا۔ آپکے والد قیس کے چند گدھے گم ہوگئے تو والد کی ہدایت پر حضرت طالوت انہیں تلاش کرتے کرتے حضرت شمویلؑ کے پاس آ نکلے۔ حضرت شمویلؑ نے بحکم الٰہی آپ کو بنی اسرائیل کا بادشاہ نامزد فرمادیا۔ خود حضرت طالوت کو اپنی غربت و ناداری کے پیش نظر اس غیر متوقع پیش کش پر سخت حیرانی ہوئی اور آپ نے تعجب سے حضرت شمویلؑ سے کہا کہ کیا میں بن یمینی کے سب سے چھوٹے قبیلے کا فرد نہیں؟ اور کیا میرا گھرانہ بنی اسرائیل کے سب گھرانوں سے چھوٹا نہیں؟

اُدھر بنی اسرائیل کے کانوں میں حضرت طالوت کی تقرریٔ شاہی کی اطلاع پہنچی تو انہیں یہ فیصلہ سخت ناگوار گزرا۔ ناگواری کی ایک وجہ یہ تھی کہ حضرت طالوت کسی متمول گھرانے سے نہیں تھے جبکہ انکا خیال یہ تھا کہ شاہی منصب کے لائق وہی ہوسکتا ہے جو بڑی جاہ وحشمت کا مالک ہو۔ دوسری وجہ یہ کہ اس وقت تک سرداری کے منصب پر دوسرے قبیلوں کے لوگ قابض تھے اور ان کو گوارا نہ تھا کہ قبیلۂ بنیامین کا کوئی شخص اور وہ بھی ایسا جو نادار، غریب و گمنام ہو، انکا بادشاہ مقرر ہوجائے۔ چنانچہ انہوں نے اس پر شدید احتجاج کیا جیسا کہ سورۃ بقرۃ میں ارشادِ ربانی ہے:۔

وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْۤا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَ نَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَ لَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ ؕ وَ اللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (البقرۃ:۲۴۷)

ترجمہ:۔ اور ان کے پیغمبر نے ان سے کہا کہ خدا نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر فرمادیا ہے، تو کہنے لگے اس (مفلس و نادار) کو ہم پر حکومت کا حق کیسے ہوسکتا ہے حکومت کے اس سے زیادہ حق دار ہم ہیں، اسے مال و دولت میں بھی فراخی نہیں دی گئی۔ نبی (شمویلؑ) نے کہا بے شک

اللہ تعالیٰ نے اسے تمہارے مقابلہ میں چن لیا ہے اور اسے علم میں اور جسامت میں کشادگی عطا فرمائی ہے اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنا ملک عطا فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے (بقرۃ:۲۴۷)

بنی اسرائیل بھی عجیب وغریب قوم رہی ہے۔ان کی خواہش اور اصرار کے باعث اللہ تعالیٰ نے جب طالوت کو انکا سردار اور سپہ سالار مقرر فرمادیا تو اعتراض کرنے لگے کہ یہ شخص نہ تو لادی بن یعقوبؑ کی اولاد میں سے ہے جن میں نبوت چلی آتی ہے اور نہ یہودہ بن یعقوبؑ کی اولاد سے ہے جن میں پشت در پشت حکومت وسلطنت چلی آرہی ہے۔اب ایسا نادار اور قلاش شخص کیونکر سردارِ قوم اور سالارِ لشکر بن سکتا ہے۔امامت کے حقدار تو ہم ہیں جن کے پاس دولت کی فراوانی ہے۔حضرت شمویلؑ نے انہیں بتایا کہ حکومت وبادشاہت کیلئے تمہارا یہ معیار درست نہیں بلکہ اس کا صحیح معیار تو علم وشجاعت ہے اور اِن دونوں خوبیوں میں وہ تم سب سے ممتاز ہے۔نیز سب سے بڑی بات یہ کہ اللہ رب العزت نے خود اسے تمہاری قیادت کیلئے منتخب فرمایا ہے۔

بنی اسرائیل بھلا آسانی سے کب اپنی ضد سے باز آنے والے تھے۔مطمئن نہ ہوئے اور دبے لفظوں یہ الزام لگایا کہ آپ نے اس عمومی شخص کو ہم پر بادشاہی کیلئے منتخب کیا ہے اور مطالبہ داغ دیا کہ آپؑ کوئی دلیل پیش کریں کہ طالوت کا انتخاب واقعی اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔حضرت شمویلؑ نے فرمایا طالوت کے من جانب اللہ منتخب ہونے کی نشانی یہ ہے کہ خدا کے عہد کا صندوق (تابوت سکینہ) جو تم سے چھن چکا ہے فرشتوں کے ذریعے تم تک واپس پہنچ جائے گا اور یہ بہت بڑی نشانی ہوگی کہ طالوت کو اللہ تعالیٰ نے ہی تم پر بادشاہ مقرر فرمایا ہے۔اگر تم ایمان رکھتے ہو تو اتنی بڑی نشانی کے بعد تمہیں مزید کسی نشانی کی ضرورت نہ رہے گی اور ایسی صورتِ حال میں تم پر لازم ہے کہ تم اسکی اطاعت کرنا۔سورۃ بقرۃ کی آیت ۲۴۸ میں اسی بات کو بیان فرمایا گیا ہے۔

وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖۤ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَ اٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ع (البقرۃ:۲۴۸)

ترجمہ:۔اور انکے نبی نے ان سے کہا کہ اس کی بادشاہی کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس وہ صندوق پہنچ جائیگا جس میں تسلی کا سامان ہے اور وہ تبرکات ہیں جو موسیٰؑ اور ھارونؑ کی اولاد چھوڑ گئی ہے۔اسے فرشتے اٹھالائیں گے بے شک اس میں بڑی نشانی ہے تمہارے لئے اگر تم ایمان دار ہو (بقرۃ:۲۴۸)

جب فرشتے تابوت سکینہ اٹھالائے یا اس بیل گاڑی کو ہانک لائے جس پر یہ صندوق رکھا ہوا تھا تو انہیں طالوت کے من جانب اللہ بادشاہ بننے کے متعلق اطمینان ہو گیا اور ڈھارس بندھی کہ اب وہ یقیناً فتح یاب ہو جائیں گے۔ایک وجہ تو یہ کہ جو نشانی طالوت کے من جانب اللہ تقرری کیلئے طے پائی تھی پوری ہوگئی اور دوسرے تابوت سکینہ میں موجود انبیائے کرام کے تبرکات جس میں حضرت موسیٰؑ کا عصا اور پارچات اور حضرت ھارونؑ کا عمامہ مبارک موجود تھا انہیں واپس مل گیا۔اس آیت پاک سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ وہ اشیاء بھی (جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں سے ہوتا ہے) باعث برکت اور مستجاب الدعوات ہوتی ہیں۔جیسے کہ حضرت خالد بن ولیدؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بال مبارک اپنی ٹوپی میں سلا رکھا تھا اور وہ جب بھی کسی معرکہ میں شریک ہونے کیلئے جاتے تو بطورِ تبرک وہ ٹوپی استعمال کرتے اور کامرانی سے فیض یاب ہو کر لوٹتے۔

یہ صندوقِ عہد کہاں سے کہاں پہنچا' اس کے بارے کہا جاتا ہے کہ فلسطین کی اشدودی قوم کے لوگ اس صندوق کو بنی اسرائیل سے چھین کر لے گئے تھے اور اسے اپنے سب سے بڑے بت دجون کے مندر میں رکھ دیا تھا۔لیکن اس کے اثر سے دجون کا بت روزانہ اوندھے منہ گرا ہوا ملتا اور ایک دن تو یہ دیکھ کر انکی گھبراہٹ اور غیض وغضب کی حالت دیدنی تھی کہ اُن کے سب سے بڑے دیوتا کا سر اور انگلیاں ٹوٹی پڑی تھیں۔وہ یہ دیکھ کر سہم بھی گئے اور اس صندوق کو ایک ناگہانی مصیبت گمان کرنے لگے۔ رہی سہی کسر اس وقت پوری ہوگئی جب اشدودیوں میں طاعون پھیل گیا اور وہ کثیر تعداد میں مرنے لگے۔چنانچہ انہوں نے اس تابوت کو پہلے جات اور پھر عقرون بھیج دیا' لیکن جیسے ہی صندوق ان شہروں میں پہنچا وہاں بھی طاعون کی وباء پھیل گئی۔بالآخر ان لوگوں نے فیصلہ کیا کہ اس صندوق کو ایک بیل گاڑی

میں رکھ کر بنی اسرائیل کی طرف ہانک دیا جائے اور یوں اشدد و دیوں نے اپنی جان چھڑانے کیلئے اس فیصلہ پر بسرعت عمل کیا۔ جب بیل گاڑی کو ہانکا تو فرشتے خود بخود بیل گاڑی سمیت اس صندوق کو بیت الشمس تک لے آئے۔ یہ گاڑی حضرت یوشع بن نونؑ کے کھیت میں آ کر کھڑی ہوگئی تو قریہ بصریم کے لوگ اسے حضرت طالوت کے بیٹے ابیناداب کے گھر چھوڑ گئے۔

اب فلسطین کی اشدد و دی قوم اور عمالقہ نے پھر سے جنگ کی پُرزور تیاریاں شروع کر دیں اور جلد ہی زبردست فوجیں لے کر یہوداہ کے شہر شوکہ میں جمع ہوگئے اور جنگی زاویہ نگاہ سے شوکہ اور عزیقہ کے وسط افسدیم میں خیمہ زن ہوگئے۔ جب حضرت طالوت نے ان حالات کے بارے سنا تو وہ بھی پوری تیاری کے ساتھ اپنی فوجیں لے کر آگے بڑھے۔ راستہ میں کہیں پانی نہیں تھا کافی دُور چل کر جب ایک دریا آیا (جو ممکن ہے دریائے اردن ہو) تو حضرت طالوت نے انکو حکم دیا کہ دریا سے پانی پینے کی اجازت نہیں یہ تم سب کا امتحان ہے۔ ہاں اگر پیاس کی شدت زیادہ محسوس کرتے ہو تو صرف ایک چلو پانی پی سکتے ہو۔ یاد رہے جو میرا ساتھی ہے وہ ایک گھونٹ سے زیادہ پانی نہ پیئے۔ اب کیا تھا سب ٹوٹ پڑے اور ان میں سے زیادہ تر لوگوں نے خوب سیر ہو کر پانی پی لیا۔ دریا سے پار اترتے ہی اپنے پیٹوں کو ہاتھوں میں پکڑ کر درد سے کراہتے ہوئے وہیں لیٹ گئے خود کو لڑنے کے قابل نہ پایا اور جہاد میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ سورۃ بقرۃ میں ہے:۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَ مَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً ۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (البقرۃ: ۲۴۹)

ترجمہ:۔ پھر جب روانہ ہوا طالوت اپنی فوجوں کے ساتھ اس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک نہر سے آزمانے والا ہے سو جس نے اس سے پانی پی لیا وہ مجھ سے نہیں اور جس نے ایک چلو سے زیادہ نہ پیا وہ یقیناً میرے ساتھیوں میں سے ہے تو سوائے چند لوگوں کے سب نے پانی پی لیا پھر جب طالوت اور اسکے مومن ساتھیوں نے دریا عبور کر لیا تو (جنہوں نے پانی سیر ہو کر

پیا تھا) کہنے لگے آج ہم میں جالوت اور اسکے لشکر کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں (مگر جنہوں نے سوائے ایک آدھ چلو کے پانی نہ پیا تھا اور) جو خدا سے ملاقات کرنے کا یقین رکھتے تھے کہنے لگے بارہا چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر اللہ کے اذن سے غالب آئی ہیں اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے (بقرۃ:۲۴۹)

جب حضرت طالوت عمالقہ کی سرکوبی کیلئے روانہ ہوئے تو ان کے ہمراہ بنی اسرائیل کا ایک انبوہِ کثیر تھا مگر اب سوائے چند مخلصین کے جو اس امتحان میں کامیاب ہوئے اور جن کی تعداد تین سو سے کچھ ہی زائد تھی، باقی ہزاروں کی تعداد نے لشکر سے کنارہ کشی کر لی۔ حکم کی متابعت کرنے والوں میں الیشی کے سب سے چھوٹے بیٹے حضرت داؤدؑ بھی شامل تھے جو ابھی کم سن تھے اور بکریاں چرایا کرتے تھے۔

حضرت طالوت بنی اسرائیل کی اس مختصر جماعت کو لے کر ایلیا کی وادی میں خیمہ زن ہوئے۔ میدان کا نقشہ یہ تھا کہ ایک طرف کے پہاڑ پر فلسطینیوں کا جم غفیر کھڑا تھا اور سامنے دوسرے پہاڑ پر بنی اسرائیل کی مختصر سی جماعت کھڑی تھی اور درمیان میں یہ وادی۔ حضرت طالوت اپنے مٹھی بھر جانباز سپاہیوں کو لے کر آگے بڑھے۔ لیکن جب انہوں نے جالوت کا لشکر جرار دیکھا تو سہم سے گئے اور کہنے لگے اس قدر اسلحہ سے لیس جالوت کے اتنے بڑے لشکر سے ہم میں مقابلہ کی طاقت نہیں۔ تو انہی کے چند مخلص تر ساتھیوں نے انکی ہمت بندھائی کہ فتح و نصرت تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہے اور اللہ تعالیٰ کی مدد ان لوگوں کے شامل حال ضرور ہوتی ہے جو حق و صداقت کیلئے صبر و ثبات سے کام لیتے ہیں۔ یوں انکی ہمت بندھی اور وہ جانباز سر ہتھیلیوں پر رکھے میدان میں اترے اور اترتے ہی انہوں نے بارگاہِ رب العزت میں دعا کیلئے ہاتھ پھیلائے اور اپنے صبر و استقامت کی دعا کی اور دشمن کی شکست کا سوال کیا۔ جسے سورۃ بقرۃ میں یوں بیان فرمایا گیا ہے:۔

وَ لَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (البقرۃ: ۲۵۰)

ترجمہ:۔ اور جب جالوت اور اسکی فوجوں کے سامنے آ گئے تو بارگاہِ الٰہی میں عرض کرنے لگے

کہ اے ہمارے رب ہم پر صبر اتار اور ہمارے قدموں کو جمائے رکھنا اور ہمیں کافر قوم پر فتح دینا (بقرۃ:۲۵۰)

عمالقہ کی فوج کا سپہ سالار جالوت نہایت قد آور اور جری تھا۔اس دیو قامت کا قد چھ ہاتھ اور ایک بالشت تھا۔سر پر پیتل کا خود تھا اور پیتل کی زرہ پہنے ہوئے تھا۔اس کی ٹانگوں پر پیتل کے دو ساق پوش تھے اور دونوں شانوں کے درمیان پیتل کی برچھی تھی۔ ہاتھ میں اس کا بھالہ لوہے کا شہتیر دکھائی دیتا تھا کہا جاتا ہے کہ اسکے نیزے کا پھل چھ سو مثقال وزنی لوہے کا تھا۔وہ بڑے متکبرانہ انداز میں چلتا ہوا میدان میں اترا اور اس نے آتے ہی بڑے غرور سے مبارزت طلب کی۔ بظاہر کسی میں اس کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں تھا اور کوئی بھی اس کے مقابلہ میں آنیکی جرأت نہیں کر پا رہا تھا کہ ایک کم سن نوجوان نے اس سے مقابلہ کرنے کی اجازت طلب کی اور اپنا گوپیا لے کر اجازت ملنے کا انتظار کئے بغیر میدان میں کود پڑا۔ یہ حضرت داؤدؑ تھے جنہیں بعد ازاں نبوت سے سرفراز فرمایا گیا۔ یہ اس وقت بہت چھوٹی عمر کے تھے اور بیماری کے باعث زرد رُو اور جسمانی لحاظ سے بہت کمزور دکھائی دیتے تھے۔ جالوت اپنی طاقت پر مغرور سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ منہنی سا نوجوان اسے کوئی گزند پہنچا سکتا ہے اور حضرت داؤد علیہ السلام کو خود بھی اس کا اندازہ تھا' چنانچہ آپؑ نے میدان میں آتے ہی گوپی میں پتھر رکھ کر اس پر وار کیا جو تائید ایزدی سے سیدھا اس کے سر پر لگا اور اسکے وزنی خود کو توڑتا ہوا اسکی کھوپڑی میں جا گھسا۔جس سے وہ زمین پر گر پڑا اور ہلاک ہو گیا۔اس واقعہ کو خداوند عالم نے سورۃ بقرۃ میں یوں بیان فرمایا ہے:۔

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَ قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (بقرۃ: ۲۵۱)

ترجمہ:۔پس انہوں نے اللہ کے اذن سے جالوت کے لشکر کو شکست دی اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا اور (پھر) اللہ نے داؤد کو حکومت اور دانائی عطا فرمائی اور اسکو سکھا دیا جو چاہا' اور اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کا بعض کے ذریعے بچاؤ نہ کرتا تو زمین برباد ہو جاتی لیکن اللہ تعالیٰ

سارے جہانوں پر کرم فرمانے والا ہے (بقرۃ:۲۵۱)

آیت متذکرہ بالحاظِ مضمون دو حصوں میں منقسم ہے حصہ اوّل میں حضرت داوٗد علیہ السلام کی شجاعت و بہادری کا ذکر اور ان کو دانائی و بادشاہت عطا فرمانا مذکور ہے جسکی تفصیل انشااللہ آئندہ صفحات میں داوٗد علیہ السلام کے مضمون تلے پیش کی جائیگی فی الحال آیت مبارکہ کے دوسرے حصہ پر نظر ڈالتے چلیں جس میں اللہ رب العٰلمین نے اپنی ایک سنت مبارکہ کو بیان فرمایا ہے کہ جب کوئی ظالم ظلم وستم پر کمر بستہ ہو جاتا ہے تو اسکی ہلاکت انگیزیوں کی روک تھام کیلئے اس کے مقابل کسی اور کو لے آتا ہے خواہ یہ معاملہ افراد سے متعلق ہو یا اقوام سے۔ پھر اسی سے ظالم کے مظالم کا خاتمہ کروادیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر اپنی حکمت اور قدرت سے طاقت کا توازن یوں قائم نہ رکھے تو سرکش افراد اور قومیں آبادیوں کو کھنڈرات میں اور بستیوں کو ویرانوں میں تبدیل کردیں اور زمین کے کسی گوشہ میں انسان کو امن وچین کا سانس لینا نصیب نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ ہر فرعون کی سرکوبی کیلئے وہ کسی نہ کسی موسیٰ کو پیدا فرمادیتا ہے اور یہی اس آیت مبارکہ کے دوسرے حصہ کا مفہوم ہے۔

قرآن حکیم میں حضرت طالوت کا ذکر سورۃ بقرۃ کی آیات ۲۴۷ تا ۲۵۱ میں تفصیل سے آیا ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام

انبیاء ورُسل میں سے حضرت آدمؑ کے علاوہ صرف حضرت داؤدؑ ہی وہ پیغمبر ہیں جن کو قرآنِ حکیم میں ''خلیفہ'' کے لقب سے پکارا گیا۔ توراۃ شریف نے حضرت داؤد علیہ السلام کو بادشاہ کہا اور اسی حیثیت سے آپکا ذکر کیا ہے اور آپکے زمانہ کے نبی کا نام ''ناتھن'' بتایا ہے۔ مگر قرآن حکیم نے تصریح فرمائی ہے کہ آپؑ خلیفۃ اللہ کے اعزاز کے ساتھ ساتھ ایک اولوالعزم اور جلیل القدر پیغمبر بھی تھے۔ آپکو خلیفہ کے لقب سے مخاطب فرمانے کی مصلحت کی تحقیق وکاوش کے بعد داؤد علیہ السلام کے اس امتیازی لقب کی حیثیت اور جو حکمت سامنے آئی وہ یہ ہے کہ جب بنی اسرائیل میں صدیوں سے قائم شدہ اس رسم کے خلاف (کہ نبوت اور بادشاہت الگ الگ خاندانوں میں چلتی آرہی تھیں) حضرت داؤدؑ میں نبوت و رسالت کے ساتھ حکومت وسلطنت بھی شامل کردی گئی تو ضروری تھا کہ انہیں ایک ایسے لقب سے پکارا جائے جو اللہ تعالیٰ کی صفاتِ علم وقدرت کا مظہر اتم ہونے پر صراحت کرتا ہو تو ظاہر ہے اس کیلئے شریعت حقہ کی اصطلاح میں ''خلیفہ'' سے بہتر کوئی دیگر لفظ نہیں ہوسکتا تھا۔ چنانچہ سورۃ صٓ کی آیت ۲۶ میں داؤدؑ کو مخاطب فرماتے ہوئے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعِ الْھَوٰی فَیُضِلَّکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ لَھُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌۢ بِمَا نَسُوْا یَوْمَ الْحِسَابِ ع (صٓ:۲۶)

ترجمہ:۔ اے داؤد بیشک ہم نے تجھے زمین میں (اپنا) نائب کیا تو لوگوں میں (انصاف سے) سچا حکم کر اور (اپنی کسی نفسانی) خواہش کے پیچھے نہ جانا کہ (وہ) تجھے اللہ کی راہ سے بہکا دے گی بیشک وہ جو اللہ کی راہ سے بہک جاتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب (مقرر) ہے اس لئے کہ وہ حساب (قیامت) کے دن کو بھول بیٹھے (صٓ :۲۶)

آیت متذکرہ میں حضرت داؤد علیہ السلام کو خلیفۃ اللہ فی الارض کے معزز خطاب سے نوازا گیا اور اس ضمن میں جو قانون قائم فرمایا گیا وہ یہ ہے کہ ایسے مرتبہ کے حامل کسی شخص کیلئے غیر مناسب

ہوگا کہ وہ انصاف کرتے وقت حق کا ساتھ دینے میں ذرّہ برابر بھی چوک کا مرتکب ہو اپنے کسی عزیز یا پسندیدہ شخصیت کے معاملہ میں اپنی ذاتی خواہش سے کام لے۔ دوسرے مفہوم میں یہ واضح فرمادیا گیا کہ خدا کے پیغام کو بلا کسی لحاظ یا دباؤ کے لوگوں میں حکم کرنا بھی نائب خدا کی ذمہ داری ہے اور اس ضمن میں ذاتی خواہش کو عمل دخل نہیں۔ خدا کی راہ سے بہک جانے والوں کا انجام سخت عذاب بیان فرمایا گیا ہے اور یہ ہوتا ہی تب ہے جب کوئی روزِ حساب اور اپنے ہونے والے احتساب کو بھول گیا ہو۔ یاد رہے یہ بھول مرضِ نسیان سے متعلق نہیں بلکہ الغرضی ولاپرواہی سے اس طرف توجہ نہ دینے والے مراد ہیں۔

اس نوع کے احکام بظاہر تو انبیاء و پیغمبران کو مخاطب فرما کر نازل کیے جاتے ہیں لیکن دراصل انکی اُمم کو قوانین شریعہ سے متعارف کروانا اور خدا تعالیٰ کے احکامات کی سختی سے پابندی کرنے کی اہمیت واضح کرنا ہوتا ہے۔ پھر یہ صرف انبیاء و رسل پر ہی موقوف نہیں بلکہ آدمؑ اور انکی اولاد کو خلیفہ بنانا ازل سے علم کائنات میں ہے اس لئے ہر فرد بشر کیلئے اپنی ذمہ داری کو سمجھنا اور اس اعزاز کی قدر کرنا ضروری ہے۔ اس اعزاز کی قدر کرنا اس کے سوا کیا ہے کہ انسان اپنے خالق کی منشا و مراد کو سمجھے اور اس کی پیروی کرے۔ نیز دوسروں کو بھی اس پر مائل اور آمادہ کرے جیسا کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے (باوجود سلطنت کی انگنت ذمہ داریوں کے) حق خلافت کو من وعن نبھا کر دکھایا۔

انبیائے کرام کے تذکرہ کے ذیل میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تحقیق ہے کہ داؤد علیہ السلام الشی (ایشا) کے آٹھویں اور سب سے چھوٹے فرزند تھے۔ آپکے والد بیت اللحم کے باشندے تھے جن کا عام مشغلہ خاندان کی بھیڑ بکریاں چَرانا تھا اور انہوں نے یہی کام داؤد علیہ السلام کے سپرد کیا تھا۔ آپؑ کم سنی میں بھی بانسری اور بربط خوب بجاتے تھے اور کبھی کبھی یہودیوں کے ہونے والے پہلے بادشاہ طالوت (جسے حضرت شمویلؑ نے منتخب کیا تھا) کے پاس جا کر بربط بجا کر اس کا دل خوش کرتے۔ حضرت شمویلؑ نے ابتدائی دَور ہی میں جب داؤد علیہ السلام کو دیکھا تھا تو بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ چھوٹی سی عمر کا یہ نوجوان ایک دن خدا کی برگزیدہ ہستیوں میں سے ہوگا۔

فلسطینیوں کے مشہور سردار جالوت نے بنی اسرائیل پر حملہ کیا تو بنی اسرائیل کو بڑی پریشانی کا سامنا ہوا کیونکہ جالوت کا مقابلہ کرنے کی کسی میں ہمت و جرأت نہیں تھی۔ میدان جنگ کے باہر سے

آپکے والد نے اپنے بڑے بیٹوں کیلئے (جو فلسطینیوں کے خلاف حضرت طالوت کے لشکر میں شامل مصروف جنگ تھے) داؤدؑ کو کھانا دیکر بھیجا کہ موقع دیکھ کر اپنے بڑے بھائیوں کو کھلا آؤ۔ عین اس وقت جالوت مبارزت طلب کرتا ہوا میدان جنگ میں آ گیا۔ بنی اسرائیلیوں میں سے کسی کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ اسکے مقابلہ میں نکلے۔ جب داؤدؑ نے دیکھا کہ کوئی اس کے مقابلہ پر آنے کو تیار نہیں تو آپؑ نے کہا مجھے اجازت دی جائے میں اس سے لڑونگا۔ یہ کہا اور اپنا گوپیا' پتھر کے کنکروں والا تھیلا اور بھیڑ بکریاں چرانے والی لاٹھی لے کر جالوت کے مقابلے کیلئے میدان میں کود پڑے۔ پہلے تو وہ ہنسنے لگا کہ یہ کیا مجھے کتا سمجھ کر لاٹھی سے بھگانے آیا ہے؟ مگر داؤدؑ کے دلیرانہ جواب سن کر مشتعل ہو گیا اور آپؑ پر وار کرنے کیلئے آگے بڑھا۔ اسی اثناء میں حضرت داؤدؑ نے تھیلے میں سے پتھر نکالا اور گوپیے میں رکھ کر اس زور سے مارا کہ پتھر جالوت کا خود توڑتا ہوا اسکے سر میں جا گھسا اور وہ زمین پر گر پڑا۔ پھر اسی کی تلوار سے اسکا سر تن سے جدا کر ڈالا۔ آپکی اس فتح سے فلسطینی سراسیمگی کے عالم میں میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے اور حضرت داؤد علیہ السلام بنی اسرائیل کے ہیرو بن گئے۔

قتل جالوت کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام سردار مقرر ہو گئے۔ اس زمانے میں آپ جزیرہ نمائے سینا کے جنوبی حصہ میں مقیم تھے وہاں کے شہر معون میں ایک نہایت دولت مند شخص رہتا تھا جس کا نام نابال تھا۔ یہ شخص بہت بدکار' بے ادب اور بخیل تھا' جبکہ اسکی بیوی ابی جیل بہت دانشمند' خوبصورت و خوب سیرت تھی جو حضرت کالبؓ کی نسل سے تھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے آدمیوں کو نابال کے پاس روانہ کیا اور پیغام دیا کہ خدا نے تمہیں کثیر دولت و ثروت سے نوازا ہے میری دعا ہے کہ اس میں اور برکت ہو تم ہمارے ساتھیوں کیلئے کچھ مال بھیج دو' مگر نابال حضرت داؤد علیہ السلام کے آدمیوں کے ساتھ سختی سے پیش آیا۔ اس کی بیوی نے جب یہ صورت حال دیکھی تو اس نے فوراً بڑی مقدار میں کھانا تیار کرایا اور تحائف کے ساتھ حضرت داؤدؑ کی خدمت میں معذرت کی طلبگار ہوئی اور درخواست کی کہ اسکے خاوند کیلئے بددعا نہ کی جائے تو آپؑ نے اقرار کر لیا۔ اس نے واپس جا کر اپنے خاوند سے حضرت داؤدؑ کی بردباری اور حلیمی کا ذکر کیا تو وہ پتھر کی مانند سن ہو گیا اور اسی حالت میں گر کر مر گیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے نابال کی موت کا سن کر ابی جیل کو نکاح کا پیغام بھیجا جو اس نے قبول کر لیا' چنانچہ وہ آپکے عقد میں

آ گئیں اسی زمانے میں آپنے اخیو عم سے بھی شادی کی جو یزرعیل کی رہنے والی تھیں۔(سموئیل اوّل ب ۲۵)

حضرت طالوت کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام کی ہی ذات تھی جس پر بنی اسرائیل کی نظریں لگی ہوئی تھیں چنانچہ انہوں نے آپکو اپنا بادشاہ چن لیا۔اللہ تعالیٰ نے آپکو نبوت بھی عطا فرمائی اس طرح آپؑ سلطنت وحکمت اور نبوت ورسالت سے ایک ساتھ متمتع ہوئے۔جیسا کہ سورۃ ص میں ہے:۔

وَ شَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَ اٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَ فَصْلَ الْخِطَابِ (صٓ:۲۰)

ترجمہ:۔اور ہم نے اسکی سلطنت کو مستحکم کیا اور اسکو حکمت عطا کی اور بات کا فیصلہ کرنا سکھایا(صٓ:۲۰)

آیت ھٰذا میں حضرت داؤدؑ کو حکومت و دانائی کے ساتھ قضیہ کا فیصلہ کرنا اضافی طور پر بیان فرمایا ہے جیسا کہ سورۃ صٓ کے علاوہ سورۃ انبیاء میں بھی فرمان ہے:۔

وَ عَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ(انبیاء:۸۰)

اور ہم نے اسے تمہارا ایک پہناوا بنانا سکھایا کہ تمہیں تمہاری آنچ سے بچائے تو کیا تم شکر کروگے(انبیاء:۸۰)

آیت ھٰذا میں بیان شدہ پہناوے سے مراد زرہ ہے جو جنگوں میں دشمنوں کے مقابل کام آتی ہے۔اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کو اس فن سے رُوشناس فرمایا اور آپؑ اس کے موجد ہیں اور ظاہر ہے کہ اس نعمت خداوندی پر بھی شکر گزاری واجب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو حکومت کے ساتھ ساتھ صاحب کتاب نبی ہونے کا اعزاز بھی بخشا اور آپکو زبور عطا ہوئی۔سورۃ نساء اور سورۃ بنی اسرائیل میں ہے"واتینا دائود زبورا" اور ہم نے داؤد کو زبور عنایت کی۔بنی اسرائیل کیلئے شریعت کی اصل کتاب توراۃ تھی انہی اصول وقوانین کو تازہ کرنے کیلئے زبور نازل ہوئی جو دراصل توراۃ کا ایک حصہ اور جزو ہے۔زبور کے معنی ٹکڑے ہی کے ہیں۔موجودہ توراۃ میں زبور بھی شامل ہے مگر افسوس کہ دیگر آسمانی کتابوں کی طرح یہ بھی محرف ہے۔زبور پانچ حصوں پر مشتمل ہے اور ہر حصۂ کتاب میں متعدد (مزامیر) خدا کی حمد وستائش کے نغمے ہیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے عہد میں بنی اسرائیل کو بہت فتوحات حاصل ہوئیں۔ابتداء میں جبرون اسرائیلیوں کا دارالحکومت تھا جسے اب الخلیل کہتے ہیں۔ پھر داؤد علیہ السلام نے یبوسیوں کا شہر فتح کرلیا جو موقع محل کے لحاظ سے زیادہ بہتر دارالحکومت تھا۔ یبوسیوں کا یہی شہر ساڑھے سات سو سال بعد حضرت داؤد علیہ السلام کا مرکز بن گیا جس کا نام یروشلم (یعنی شہر امن وصلح) رکھا گیا۔

قرآن واحادیث مبارکہ میں حضرت داؤد علیہ السلام کے متعدد خصائص مذکور ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں اور پرندوں کو حضرت داؤد علیہ السلام کیلئے مسخر کر دیا تھا۔آپؑ کی آواز بہت سریلی تھی اور آپؑ بے انتہا خوش آواز تھے اسی بناء پر لحن داؤدی آج تک مشہور اور ضرب المثل ہے۔وہ یوں کہ جب آپؑ خوش الحانی سے زبور کے زمزمے گاتے تو فلک پر اڑتے پرندے پھڑ پھڑاتے ہوئے زمین پر آ گرتے۔آپؑ پہلے شخص تھے جنہوں نے عبرانی موسیقی مدوّن کی اور مصری و بابلی مزامیر کو ترقی دی۔آپؑ نے بانسری اور بربط وغیرہ جیسے موسیقی کے آلات ایجاد کئے۔(مسلم شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا) اللہ تعالیٰ نے آپکو ایک اور اضافی خوبی سے بھی نوازا تھا کہ آپؑ کے ہاتھوں میں لوہا موم تھا۔

ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں حضرت داؤد علیہ السلام کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے:۔

داؤد بن ایشا (ایشی) بن عوبد بن عابز بن سلمون بن عونیاذب بن عرم بن حصرون بن یہوداہ بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم علیہ السلام۔آپؑ نے سو سال کی عمر میں ۱۰۱۵ ق م میں وفات پائی اور صیہون میں دفن ہوئے۔قرآن کریم میں آپکا نام سولہ (۱۶) جگہ آیا ہے جن کی تفصیل درج ذیل ہے:۔

سورۃ بقرۃ	۱۰۲تا۲۵۱	سورۃ مائدہ	۷۸
سورۃ اسرأ	۵۵	سورۃ نحل	۱۵تا۴۴
سورۃ صٓ	۱۷تا۲۶اور۳۰تا۴۰	سورۃ نساء	۱۶۲
سورۃ انبیاء	۷۸تا۸۲	سورۃ سبا	۱۰ اور ۱۴

حضرت داؤد علیہ السلام کی قبر مبارک

حضرت سلیمان علیہ السلام

حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤدؑ کے فرزند ارجمند اور جانشین تھے۔ آپؑ کی ولادت کی تاریخ ۱۰۳۵ ق م بیان کی جاتی ہے۔ گویا والد ماجد کے انتقال کے وقت حضرت سلیمانؑ کی عمر ۲۵ سال تھی۔ یہودیوں پر حکمرانی کرنے والے حکمرانوں میں سے آپکی حکمرانی کا عہد درخشاں ترین مانا جاتا ہے۔ یقیناً اس عہد میں یہودی (بنی اسرائیلی) سلطنت کی وسعت، استحکام اور جاہ وجلال اوجِ کمال پر پہنچ گیا تھا۔ اسی عہد میں ہیکل تعمیر ہوا جو حسن تعمیر کے اعتبار سے بھی اس دَور میں یگانہ مانا جاتا تھا۔ آپؑ کے عہد میں نہ صرف فولاد ہی کی صنعت نے ترقی کی بلکہ دوسری دھاتیں بھی صنعت کیلئے استعمال ہونے لگیں۔ چنانچہ عصیون جابر میں (جو کہ ایلہ کے قریب تھا) تانبا پگھلانے کا ایک بڑا کارخانہ قائم کیا گیا۔ جبکہ آپکے چالیس سالہ دَورِ حکومت کے بعد جب ۹۷۵ ق م میں آپکا انتقال ہوگیا تو آپکے بعد اسرائیلی حکومت دو حصوں میں منقسم ہوگئی اور غیروں کے قبضے میں آ گئی۔ آپکی عمر کا اندازہ ۶۵ برس لگایا جاتا ہے۔

توراۃ شریف نے حضرت سلیمانؑ کی والدہ کا نام بنت سبع لکھا ہے اور حضرت داؤدؑ کی طرح آپکو بھی فقط ایک بادشاہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے جبکہ قرآن حکیم نے صاف صاف آپکے عظیم المرتبت اور جلیل القدر پیغمبر کی حیثیت سے آپکے منصب نبوت کی وضاحت کی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:۔

اِنَّآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ کَمَآ اَوْحَیْنَآ اِلٰی نُوْحٍ وَّ النَّبِیّٖنَ مِنْۢ بَعْدِہٖ ۚ وَ اَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَعِیْسٰی وَ اَیُّوْبَ وَ یُوْنُسَ وَ ھٰرُوْنَ وَسُلَیْمٰنَ ۚ وَ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۚ (۱۶۳) وَ رُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰھُمْ عَلَیْکَ مِنْ قَبْلُ وَ رُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْھُمْ عَلَیْکَ ؕ وَ کَلَّمَ اللّٰہُ مُوْسٰی تَکْلِیْمًا ۚ (نسآء: ۱۶۴)

ترجمہ:۔ بے شک اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے آپکی طرف وحی بھیجی جیسے نوح اور اس کے بعد پیغمبروں کو وحی بھیجی اور ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور انکے بیٹوں اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ھارون اور سلیمان کو وحی کی اور ہم نے داؤد کو زبور عطا

فرمائی (۱۶۳) اور رسولوں کو جن کا ذکر اس سے پہلے ہم آپ سے فرما چکے ہیں اور اُن رسولوں کو جن کا ذکر آپ سے نہ فرمایا اور اللہ نے موسٰی سے حقیقتاً کلام فرمایا (نسآء ۱۶۴)

حضرت داؤدؑ کے انتقال کے بعد جب حضرت سلیمانؑ نے عنان حکومت سنبھالی تو حالات کچھ زیادہ سازگار نہ تھے۔ آپ کے سوتیلے بھائی ''ادونیاہ'' حضرت داؤد علیہ السلام کی حیات ہی میں حضرت سلیمانؑ کی ولی عہدی اور تخت نشینی کے خلاف علم بغاوت بلند کر چکے تھے اور سردارِ لشکر ایوب سمیت لوگوں کی ایک کثیر تعداد ادونیاہ کے ساتھ تھی اور ابیاتر کاہن مخالفت وشرارت پر آمادہ تھا۔ ادھر قبیلۂ بن یمین کے ایک طاقتور شخص سمعی بجوریمی بن جبیر احضرت داؤدؑ کی زندگی ہی میں ایک مشکل اور نازک وقت میں انکی توہین کر کے اپنی دشمنی اور مخالفت کا اعلان کر چکا تھا اور اِس وقت بھی اس کیلئے شرارت و بغاوت کا نہایت اچھا موقع تھا۔ اس طرح کے کچھ دیگر عناصر بھی تھے جو سر اٹھا رہے تھے اور اُن سے حضرت سلیمانؑ کی حکومت اور سلطنت کو مستقل خطرہ تھا۔

''حضرت سلیمانؑ نے ادونیاہ کو بغیر کسی باز پرس کے پیغمبرانہ عفو و درگزر کا مظاہرہ کرتے ہوئے معاف کر دیا تھا مگر اس کی گمراہی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ کچھ ہی عرصہ بعد اس نے اپنی سوتیلی ماں (حضرت داؤدؑ کی بیوہ ابی شاگ شونمیت) سے شادی کرنا چاہی۔ اس کی اس حرکت پر حضرت سلیمانؑ اس قدر برو فراختہ ہوئے کہ اسے قتل کر دیا۔ رفتہ رفتہ بڑے بڑے دشمن یواب اور سمعی بھی مارے گئے۔ ابیاتر کو موقوف کر کے آپؑ نے صدوق کو باقاعدہ منصبِ کہانت پر فائز کیا اور اس طرح کچھ ہی عرصہ میں آپؑ نے مخالف عناصر پر قابو پا کر سلطنت کو نہایت مضبوط' متحد اور مستحکم بنا دیا''۔ (سلاطین اوّل باب:۲)

اس طرف سے اطمینان حاصل کر کے حضرت سلیمانؑ نے تاجدارِ مصر فرعون کی بیٹی سے شادی کر لی۔ سلاطین اوّل باب ۳ میں ہے کہ یہ شادی سیاسی حیثیت سے نہایت اہم تھی۔ فرعون نے اسرائیل کے علاقہ جزر کے شہر کو فتح کر لیا تھا اور وہاں کے کنعانی باشندوں کو قتل کر کے شہر کو آگ لگا دی تھی۔ اس شادی کے بعد اس نے یہ شہر اپنی بیٹی کے جہیز کی صورت میں حضرت سلیمانؑ کو واپس کر دیا۔

قرآن کریم کی سورۃ ص میں حضرت سلیمانؑ کی ایک آزمائش اور اسکے فوراً بعد آپکی دعا کا ذکر ہے، جسکی بعض مفسرین نے کچھ توجیہات کی ہیں۔ جیسے ابوالسعود اور سید محمود آلوسی وغیرہ نے اس کی تفسیر

یہ بیان کی ہے کہ ایک دفعہ حضرت سلیمانؑ نے فرمایا کہ آج شب میں اپنی ستر بیویوں کے پاس جاؤں گا اور ہر ایک کے لڑکا پیدا ہوگا جو بڑا ہو کر اللہ کی راہ میں جہاد کرے گا۔ آپؑ انشاءاللہ کہنا بھول گئے۔ وقت مقررہ کے بعد صرف ایک بیوی کے ہاں ادھورا بچہ ہوا تو دایہ نے وہی لا کر تخت پر ڈال دیا۔ آپ کو تنبیہ ہوئی چنانچہ مغفرت چاہی اور دعا کی۔ جسکو سورۃ ص میں یوں بیان فرمایا گیا:۔

وَ لَقَدْ فَتَنَّا سُلَیْمٰنَ وَ اَلْقَیْنَا عَلٰی کُرْسِیِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ (۳۴) قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَهَبْ لِیْ مُلْکًا لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ ۚ اِنَّکَ اَنْتَ الْوَهَّابُ (۳۵)

ترجمہ:۔ اور بیشک ہم نے سلیمان کو جانچا اور اسکے تخت پر ایک بیجان بدن ڈال دیا (۳۴) پھر رجوع لایا عرض کی اے میرے رب مجھے بخش دے اور مجھے ایسی سلطنت عطا کر کہ میرے بعد کسی کو لائق نہ ہو بیشک تو ہی بہت دینے والا ہے (ص:۳۵)

قرآن حکیم نے حضرت سلیمانؑ کے متعدد خصائل بیان فرمائے ہیں ان میں پرندوں کا مسخر ہونا اور پرندوں کی بولی سمجھنا اور ان سے بات کرنا وغیرہ تو وہی خصائل ہیں جو حضرت داؤد علیہ السلام کے بھی تھے البتہ انکے علاوہ بھی کچھ خصائل تھے جن سے اللہ تعالیٰ نے آپکو نوازا تھا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ہوا کو آپکے تابع کر دیا تھا جو آپؑ کے تخت کو شام سے یمن اور یمن سے شام (یا جہاں وہ آنا جانا چاہتے) لاتی لیجاتی تھی۔ نہ صرف ہوا بلکہ جنات بھی آپکے تابع فرمان تھے۔ فرمان ہے:۔

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّیْحَ تَجْرِیْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَیْثُ اَصَابَ (۳۶) وَ الشَّیٰطِیْنَ کُلَّ بَنَّآءٍ وَّ غَوَّاصٍ (۳۷) وَّ اٰخَرِیْنَ مُقَرَّنِیْنَ فِی الْاَصْفَادِ (۳۸) هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِکْ بِغَیْرِ حِسَابٍ (۳۹) وَ اِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰی وَ حُسْنَ مَاٰبٍ (۴۰) سورۃ:ص ع

ترجمہ:۔ تو ہم نے ہوا کو اسکے بس میں کر دیا کہ اسکے حکم سے نرم نرم چلتی جہاں وہ چاہتا (۳۶) اور دیو بس میں کر دیئے ہر معمار (جو آپکے لئے عمارتیں تعمیر کرتے) اور غوطہ خور (جو آپکے لئے سمندر سے موتی نکالتے) (۳۷) اور دوسرے (سرکش شیاطین بھی آپکے مسخر کر دئے گئے تھے جن کو آپؑ تادیب اور فساد سے روکنے کیلئے) بیڑیوں اور زنجیروں میں باندھ رکھتے (۳۸) یہ ہماری عطا ہے اب تو چاہے تو احسان کر (یعنی کسی کو دیدے یا آزاد کر دے) یا روک رکھ تجھ پر

(پابندی یا) کچھ حساب نہیں (۳۹) اور بیشک اس کیلئے ہماری بارگاہ میں ضرور قرب اور اچھا ٹھکانا ہے (صٓ:۳۶تا۴۰)

حضرت سلیمانؑ کے بارے سورۃ صٓ کے علاوہ سورۃ انبیاء میں بھی ہوا اور جنات کا مسخر فرمایا جانا منقول ہے سورۃ انبیاء کی آیت ۸۱تا۸۲ میں ارشادِ گرامی ہے کہ:۔

وَ لِسُلَیۡمٰنَ الرِّیۡحَ عَاصِفَۃً تَجۡرِیۡ بِاَمۡرِہٖۤ اِلَی الۡاَرۡضِ الَّتِیۡ بٰرَکۡنَا فِیۡہَا ؕ وَ کُنَّا بِکُلِّ شَیۡءٍ عٰلِمِیۡنَ (۸۱) وَ مِنَ الشَّیٰطِیۡنِ مَنۡ یَّغُوۡصُوۡنَ لَہٗ وَ یَعۡمَلُوۡنَ عَمَلًا دُوۡنَ ذٰلِکَ ۚ وَ کُنَّا لَہُمۡ حٰفِظِیۡنَ ۙ (۸۲) (سورۃ:الانبیاء)

ترجمہ:۔اور سلیمانؑ کیلئے تیز ہوا مسخر کردی کہ اس کے حکم سے چلتی اس زمین کی طرف جس میں ہم نے برکت رکھی اور ہم کو ہر چیز معلوم ہے (انبیاء ۸۱) اور شیطانوں میں سے وہ جو اس کیلئے غوطہ لگاتے اور اس کے علاوہ (بھی) اور کام بجالاتے اور ہم ان (شیاطین) کو روکے ہوئے تھے (انبیاء:۸۲/۸۱)

قرآن حکیم میں متعدد جگہ حضرت سلیمانؑ کیلئے ہوا کو مسخر فرمادیا جانا اور جنات پر آپکی حکومت ہونا بیان فرمایا گیا کہ ہوا جناب کو یمن یا جہاں سے بھی بذریعہ ہوا کہیں جانا چاہتے سرعت رفتار سے آپکا تخت اڑا کر لے جاتی۔آیت ھٰذا میں برکت والے شہر سے مراد ملکِ شام ہے جو آپکا مسکن تھا۔سورۃ انبیاء کی آیت نمبر۸۲ میں جنات پر آپؑ کی حکومت کا تذکرہ فرمایا گیا ہے کہ وہ آپکے محکوم تھے اور آپکے حکم کے مطابق سمندروں سے غوطہ لگا کر موتی وغیرہ نکال کر لاتے اور کچھ جنات آپؑ کیلئے عمارات تعمیر کیا کرتے اور جنات کے ضرر اور شر و فساد سے اللہ تعالیٰ نے آپکو محفوظ فرمارکھا تھا۔

سورۃ انبیاء کی آیت ۷۸ میں حضرت سلیمانؑ کی ذہانت اور فیصلے فرمانے کی سوجھ بوجھ کے بارے ارشادِ گرامی ہے:۔

وَ دَاوٗدَ وَ سُلَیۡمٰنَ اِذۡ یَحۡکُمٰنِ فِی الۡحَرۡثِ اِذۡ نَفَشَتۡ فِیۡہِ غَنَمُ الۡقَوۡمِ ۚ وَ کُنَّا لِحُکۡمِہِمۡ شٰہِدِیۡنَ ۙ (۷۸) (انبیاء:۷۸)

ترجمہ:۔اور داؤد اور سلیمان کو یاد کرو جب کھیتی کا ایک جھگڑا چکاتے تھے جب رات کو اس میں

کچھ لوگوں کی بکریاں چھوٹیں اور ہم ان کے حکم کے وقت حاضر تھے (انبیاء:۷۸)

یعنی جب کسی کی بکریاں کسی کا کھیت چر گئیں تو یہ مقدمہ حضرت داؤدؑ کے سامنے پیش ہوا تو آپؑ نے اس کا فیصلہ یہ فرمایا کہ یہ بکریاں کھیتی والے کو دیدی جائیں کیونکہ بکریوں کی قیمت کھیتی کے نقصان کے برابر تھی۔لیکن حضرت سلیمانؑ نے فیصلہ سے متفرق رائے دی جس کا ذکر فرمایا جارہا ہے:۔

فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَ كُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا ۡ وَّ سَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَ الطَّيْرَ ؕ وَ كُنَّا فٰعِلِيْنَ(انبیاء: ۷۹)

ترجمہ:۔ہم نے وہ معاملہ سلیمان کو سمجھا دیا اور دونوں کو حکومت اور علم عطا فرمایا اور داؤد کے ساتھ پہاڑ مسخر فرمادیئے کہ تسبیح کرتے اور پرندے اور یہ ہمارے کام تھے (انبیاء:۷۹)

آیت متذکرہ اس واقعہ کی طرف کنایہ ہے' جب حضرت داؤدؑ نے یہ فیصلہ فرمایا تو حضرت سلیمانؑ کو (جو اس وقت گیارہ برس کے تھے) اللہ تعالیٰ نے اس سے بہتر بات سجھائی۔تو انہوں نے اپنے والد ماجد سے ادباً عرض کیا کہ فریقین کیلئے اس سے آسان صورت بھی ہوسکتی ہے' تو حضرت داؤدؑ نے فرمایا بیان کرو۔اس پر حضرت سلیمانؑ نے عرض کیا میری تجویز ہے کہ بکریوں والا اس وقت تک کھیت کاشت کرے جب تک کھیت اس حالت کو نہ پہنچ جائے جس حالت میں بکریوں کی خوراک بنا' اور اس وقت تک کھیتی والا بکریوں کے دودھ وغیرہ سے نفع اٹھائے اور پھر کھیتی والے کو کھیتی اور بکریوں والے کو بکریاں واپس کردی جائیں۔یہ فیصلہ حضرت داؤدؑ نے بہت پسند فرمایا۔آیت ھٰذا کے اگلے حصہ میں اطلاع ہے کہ پہاڑ اور پرندے جو انکے تابع فرمان فرمائے گئے تھے وہ حضرت داؤدؑ کی موافقت میں تسبیح و ذکر الٰہی کیا کرتے تھے۔مزید فرمان ہے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایماء و توفیق کی بناء پر تھا۔

حضرت سلیمانؑ کو جہاد کا شوق تھا اور اس کیلئے آپؑ گھوڑوں کو بہت پسند فرماتے تھے۔اور جب اس کا اظہار کیا کہ بارالٰہا مجھے گھوڑے بہت پسند ہیں تا کہ آپکی راہ میں استعمال کروں۔تو انہیں ایک ہزار گھوڑے جو ایک سے بڑھ کر ایک تھا عطا فرمائے گئے۔سورۃ ص آ ہی میں فرمان ہے:۔

وَ وَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ؕ (۳۰) اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ۙ (۳۱) فَقَالَ اِنِّيْۤ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ ۚ حَتّٰى

تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ (۳۲) رُدُّوْهَا عَلَيَّ ط فَطَفِقَ مَسْحًاۢ بِالسُّوْقِ وَ الْاَعْنَاقِ (۳۳)

ترجمہ:۔اور ہم نے داؤدؑ کو سلیمانؑ (فرزند) عطا فرمایا وہ کیا اچھا بندہ بیشک بہت رجوع لانے والا (یعنی تمام وقت تسبیح و ذکر میں مشغول رہنے والا) (ص آ ۳۰) جب اس پر ظہر کے بعد پیش کیے گئے (جو کیسے اس شان اور ادا کے حامل) کہ روکیے تو تین پاؤں پر کھڑے ہوں (اور) چوتھے سم کا کنارہ زمین پر لگائے ہوں (۳۱) اور چلایئے تو ہوا سے باتیں کریں تو سلیمانؑ نے کہا مجھے ان گھوڑوں کی محبت پسند آئی اپنے رب کی یاد کیلئے پھر انہیں چلانے کا حکم دیا (تو تیز رفتار ایسے کہ آناً فاناً ہوا سے باتیں کرنے لگے) یہاں تک کہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے (۳۲) تو پھر حکم دیا کہ انہیں میرے پاس واپس لاؤ تو (انکے واپس آنے پر خوشی اور محبت سے) انکی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگا (ص آ: ۳۰ تا ۳۳)

توراۃ میں حضرت سلیمانؑ کی ان خصوصیات کا تو ذکر نہیں کیا گیا البتہ یہ موجود ہے کہ آپؑ کے پاس چالیس ہزار جنگلی رتھ، بارہ ہزار سوار اور بے شمار مصری گھوڑے تھے۔ حضرت سلیمانؑ وہ پہلے نبی اور بنی اسرائیلی حکمران ہیں جن کو ایک بحری بیڑے کی تشکیل کا خیال آیا اور آپؑ نے ''عصیون جابر'' میں جہازوں کا ایک بیڑہ بنایا اور صور (موجودہ لبنان) کے حکمران ''حیرام اوّل'' (جو کہ حضرت داؤدؑ کا ہمعصر اور حلیف تھا) کے تجربہ کار اور ہوشیار ملاح بھی اس بیڑے میں ملازم رکھے۔

بیت المقدس اور مسجدِ اقصیٰ کی تعمیر کا خیال پہلے حضرت داؤد علیہ السلام کو آیا تھا مگر وہ اپنی جنگی اور سیاسی مصروفیات کے باعث اپنے اس ارادہ کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے تھے۔ البتہ انہوں نے اپنے انتقال سے قبل حضرت سلیمانؑ کو اسکی تعمیر کی وصیت فرمائی تھی۔ چنانچہ آپؑ نے سلطنت کی توسیع و استحکام سے فارغ ہونے کے تین سال بعد بیت المقدس اور مسجدِ اقصیٰ کی تعمیر پر توجہ دی۔ صنوبر اور عمدہ قسم کے پتھر صور (لبنان) کے حکمران سے خریدے۔ ان دنوں حضرت سلیمانؑ اور صور کے حکمران حیرام کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ جب حیرام کو علم ہوا کہ آپؑ بیت المقدس اور مسجدِ اقصیٰ کی تعمیر و تزئین کا ارادہ رکھتے ہیں، تو اس نے سونے چاندی اور پیتل کی صنعت کا ایک مشّاق کاریگر بھی خدمت کیلئے ہمراہ روانہ کر دیا۔ خروجِ مصر کے چار سو اسّی ویں (۴۸۰) سال یعنی اپنی حکومت کے چوتھے سال کے دوسرے ماہ

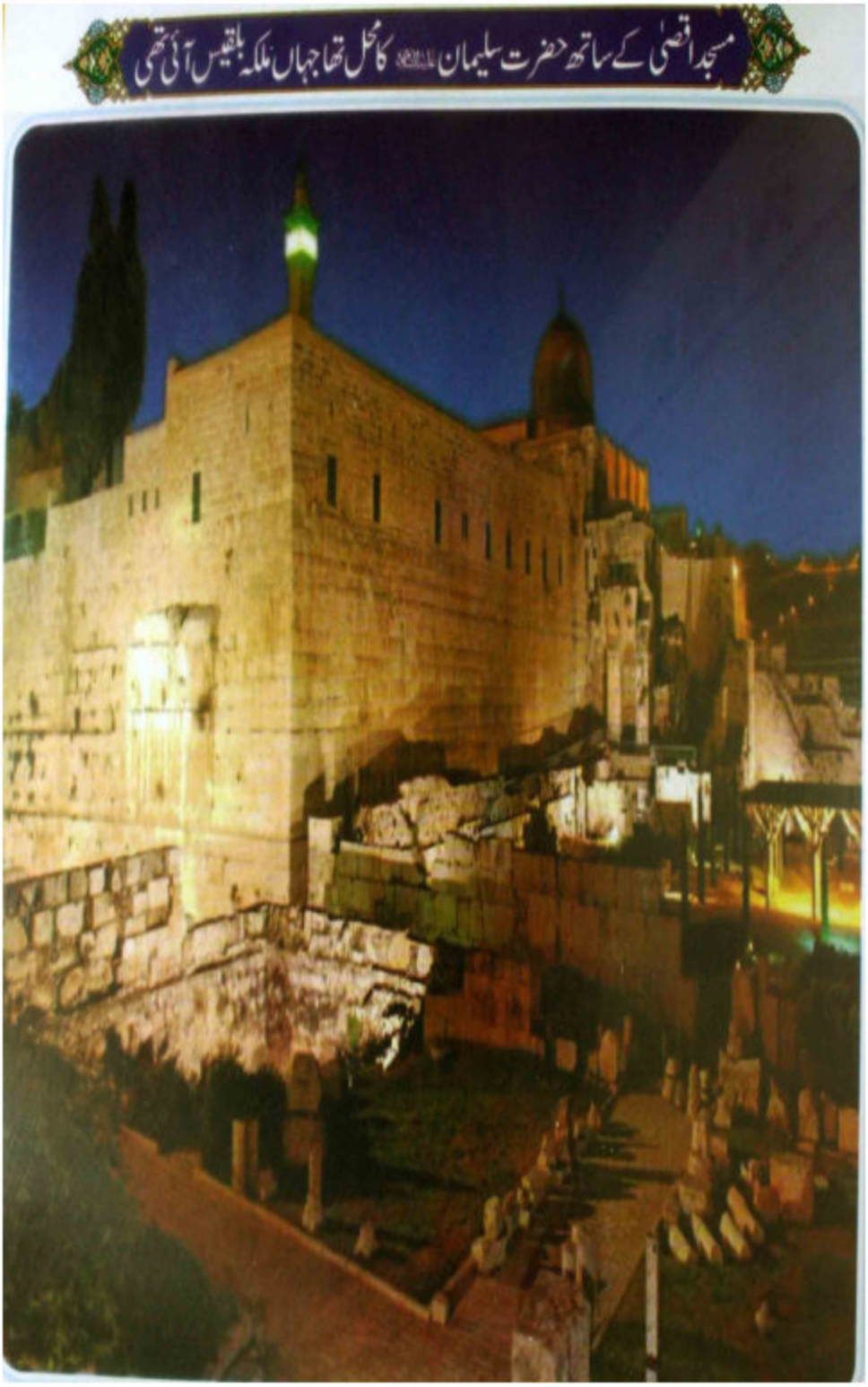
مسجد اقصیٰ کے ساتھ حضرت سلیمان علیہ السلام کا محل تھا جہاں ملکہ بلقیس آئی تھی

میں حضرت سلیمانؑ نے مسجدِ اقصیٰ کی تعمیر کا آغاز کیا جس کیلئے تیس ہزار مزدُور روزانہ کام کرتے تھے۔

قرآن حکیم کے مطابق یہ مزدُور انسان نہیں بلکہ وہ جنات تھے جنہیں حضرت سلیمانؑ کا تابع فرمان کر دیا گیا تھا۔ پہلے پوری عمارت' برآمدے' بارہ دریاں دیودار اور صنوبر کی لکڑی کی بنائی گئیں اور پھر انکو خالص سونے سے منڈھا گیا۔ مقدس ترین مقام جو عہد کے صندوق (تابوتِ سکینہ) کیلئے مخصوص تھا اسے چندن (صندل) کی لکڑی سے بنایا گیا' جس کی لمبائی چوڑائی اور اونچائی ہر ایک بیس ہاتھ تھی۔ صرف اس مخصوص مقام کو منڈھنے کیلئے جو سونا صرف ہوا' اس کا وزن توراۃ شریف کے مطابق چھ سو قنطار ہے جو سات سو بیس من بنتا ہے۔ اس حصے کیلئے دو کروبیوں (فرشتوں) کی شبیہ بھی تراش کر بنائی گئی تھیں جن کے بازو بیس ہاتھ لمبے تھے۔ ہیکل کیلئے بھی عجیب وغریب ظروف اور سامان تیار کیا گیا تھا۔ یہ ساری عمارت ساڑھے سات سال میں مکمل ہوئی۔ چنانچہ اس کی تاریخ تعمیر ۹۶۰ ق م تا ۹۵۳ ق م قرار پائی۔

بیت المقدس اور مسجدِ اقصیٰ کی تعمیر سے فارغ ہونے کے بعد حضرت سلیمانؑ نے یروشلم میں ایک شاندار محل تعمیر کیا جس کی لمبائی سو ہاتھ چوڑائی پچاس ہاتھ اور اونچائی تیس ہاتھ تھی۔ یہ نہایت بیش قیمت تراشے ہوئے پتھروں کا بنا ہوا محل تھا جسکی بنیادوں میں آٹھ آٹھ اور دس دس ہاتھ کے پتھر لگائے گئے تھے۔ عمارت میں دیودار کی لکڑی استعمال ہوئی تھی اور اس محل کے ایک حصہ میں بلوری فرش تھا جس کو دیکھنے پر پانی کا دھوکہ ہوتا تھا۔ سورۃ نحل میں ملکہ سبا کا ذکر ہے کہ اس جگہ سے گزرتے وقت ملکہ سبا نے اپنے ٹخنوں سے لباس کے پائینچے اٹھالیئے تھے کہ پانی سے بھیگ نہ جائیں۔ حالانکہ اہل سبا اپنے عظیم الشان قلعوں اور عمارتوں کیلئے مشہور تھے۔ یہ ایک تاجر قوم تھی اور مذہبی لحاظ سے مشرک وبت پرست تھی۔ انکا سب سے بڑا دیوتا ''سورج'' تھا۔ توراۃ شریف کے مطابق یہ محل تیرہ سال میں مکمل ہوا۔

اہل سبا قومِ عاد کی ایک شاخ تھی جس کی زبان بھی قومِ عاد کی قدیم آرامی عربی کی کچھ بدلی ہوئی شکل تھی جس کو سبائی زبان کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ انسانوں' جنوں اور پرندوں کے لشکر کے ساتھ قریۃ النحل سے گزرے تو چیونٹیوں سے انکی زبان میں باتیں کیں۔ پھر لشکر کا معائنہ فرمایا اور پرندوں کی فوج سے ہدہد کو غائب پا کر برہم ہوئے۔ اسی اثناء میں جب ہدہد واپس آیا اور اس سے اس غیر حاضری کی وجہ دریافت کی تو اس نے آپؑ کو اہل سبا اور اسکی ملکہ کے بارے اطلاع دی اور انکی گمراہی اور

شرک و بت پرستی کا تذکرہ کیا۔ آپؑ نے یہ حالات سنے تو ملکہ کے نام ایک خط تحریر فرمایا جس میں اس کو توحید کی تعلیم اور اسلام کی دعوت دی گئی تھی۔ ہدہد یہ خط لے کر ملکہ سبا کے پاس پہنچا تو ملکہ نے آپؑ کا خط پڑھا۔ وہ حضرت سلیمانؑ کی شہرت سن چکی تھی چنانچہ اس نے خط پڑھ کر اپنے مشیروں اور درباریوں سے مشورہ کیا۔ سردارانِ سبا کو اپنی قوتِ بازو اور جنگی ساز و سامان پر گھمنڈ تھا اسلئے انہوں نے حضرت سلیمانؑ سے جنگ کا مشورہ دیا۔ ملکہ بہت دانشمند اور بالغ نظر عورت تھی' اس نے سیاسی حکمت عملی سے کام لیا اور خط کا کوئی جواب دیئے بغیر ہدہد کو قیمتی تحائف دیکر روانہ کر دیا۔ حضرت سلیمانؑ پیغمبرانہ فراست سے سمجھ گئے کہ ملکہ نے مجھے محض ایک دنیاوی بادشاہ گمان کیا ہے۔ چنانچہ آپؑ نے دوبارہ خط دیکر قاصد کو روانہ کیا کہ حیلہ سازی اور دفع الوقتی سے کام نہیں چلے گا بت پرستی سراسر گمراہی ہے اس سے باز آجاؤ۔ ملکہ سبا نے بھی بخوبی اندازہ لگالیا کہ اس طرح کام چلنے والا نہیں۔ چنانچہ دوسرے خط کے جواب میں وہ یمن سے بڑی شان و شوکت اور ساز و سامان کے ساتھ روانہ ہوئی۔ پورا قافلہ اونٹوں پر سوار تھا اور دیگر بہت سے اونٹ شاہی ساز و سامان' تحائف' سونے اور خوشبودار اشیاء سے لدے ہوئے ہمراہ تھے۔

یمن میں ملکہ کا تخت نہایت شاندار مکلّف و مرصع تھا جس میں بیش قیمت زر و جواہر جڑے ہوئے تھے اور جس کا ذکر ہدہد پہلے ہی کر چکا تھا۔ ملکہ سبا جب یروشلم کے قریب پہنچی تو حضرت سلیمانؑ نے اپنے وزیر آصف برخیاؑ کے ذریعے (جو ایک ولی کامل تھے) سبا کے تخت کو پلک جھپکنے میں منگوالیا۔ جونہی ملکہ سبا حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں حاضر ہوئی اپنے تخت کو یہاں موجود پا کر ششدر رہ گئی اور آپکے پیغمبرانہ اعجاز سے متاثر ہو کر آپؑ پر ایمان لے آئی۔

مفسرین نے ملکہ سبا کا نام بلقیس بیان کیا ہے اور عرب و یہود کی اسرائیلی داستانوں میں بھی یہی نام مذکور ہے۔ اہل حبش' جن کا دعویٰ ہے کہ وہ ملکہ سبا اور حضرت سلیمانؑ کی نسل سے ہیں' اپنی سبائی زبان میں ملکہ کا نام ''ماکدہ'' بتاتے ہیں۔ مفسرین کا یہ بھی کہنا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ملکہ سبا سے شادی فرمالی تھی اور ملکہ کو اسکے ملک جانے کی اجازت دیدی تھی' اور وقتاً فوقتاً خود بھی یمن تشریف لیجاتے تھے۔

حضرت سلیمانؑ کے آخری دَور میں مختلف بغاوتیں رُونما ہوئیں۔ پہلی بغاوت ہدادومی نے کی۔ دوسری بغاوت کی ابتداء دمشق سے ہوئی۔ تیسری بغاوت یربھام نے کی جو حضرت سلیمانؑ کا ملازم

مسجد اقصیٰ: ایک قول کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام یہاں مدفون ہیں

اور افرائیم قبیلے کا ایک فرد تھا۔ تاہم ان بغاوتوں کا کوئی مثبت نتیجہ نہ نکل سکا اور حضرت سلیمانؑ کو انکا کوئی دشمن شکست نہ دے سکا۔

توراۃ شریف کا بیان ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے یروشلم میں تمام بنی اسرائیل پر چالیس برس تک حکومت کی جس کے بعد آپؑ کا انتقال ہوگیا اور آپؑ اپنے والد حضرت داؤد علیہ السلام کے شہر میں دفن ہوئے۔ آپکی ازواج کی تعداد سات سو اور حرموں کی تعداد تین سو بتائی ہے۔

قرآن حکیم میں آپؑ کا ذکر سولہ مرتبہ آیا ہے جسکی جدول یہ ہے:۔

سورۃ البقرۃ	۱۰۲
سورۃ النساء	۱۶۳
سورۃ الانعام	۸۵
سورۃ انبیاء	۷۸، ۷۹، ۸۱
سورۃ النحل	۱۵ تا ۱۸، ۲۰، ۳۶، ۴۴
سورۃ سبا	۱۳
سورۃ صٓ	۳۰، ۳۴

حضرت یونس علیہ السلام

بنی اسرائیل نے چھ سو برس کے مصائب و آلام کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں جو عروج و اقتدار حاصل کیا تھا وہ حضرت سلیمانؑ کے دَور میں بامِ عروج کو چُھو کر آپکے انتقال کے ساتھ ہی دم توڑ گیا۔ حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد بنی اسرائیل پھر سے کفر و شرک کے اندھیروں میں کھو گئے۔ جب انکی گمراہی حد سے تجاوز کر گئی اور کسی طرح توبہ کی طرف مائل نہ ہوئے تو قدرتِ الٰہی نے شاہِ نینوا بنوکد نصر (بخت نصر) کو عذاب بنا کر اُن پر مسلط کر دیا۔ جس نے بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجادی، ہیکل سلیمانی اور مسجدِ اقصٰی کو لوٹ لیا۔ بنی اسرائیل ملیامیٹ کر دیئے گئے یوں کہ اس کے صرف ایک آخری اور شدید حملے میں ستر ہزار اسرائیلی قتل ہوئے۔ تمام شہر اپنی بنیادوں پر گر کر ملیامیٹ ہو گیا اور بنی اسرائیلی بادشاہ کو گرفتار کر کے اسکی آنکھوں میں نیل کی سلائیاں پھیر کر اسے اندھا کر دیا گیا۔ تمام شہزادے جان بچا کر مصر بھاگ گئے مگر بخت نصر برق و باد کی طرح وہاں بھی جا پہنچا اور سب کو دبوچ لیا، ایسی غارت گری مچائی کہ الامان والحفیظ۔

بخت نصر واپس لوٹتے ہوئے اربوں سکوں کی اشیاء ہیرے اور جواہرات کے ساتھ ساتھ ساٹھ ہزار اسرائیلیوں کو بھی غلام بنا کر اپنے ساتھ بابل لے گیا۔ اس نے بنی اسرائیل کی دینی و مذہبی ساکھ کو یوں تباہ کیا کہ اس قوم کے تمام عالموں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور توراۃ کے تمام نسخے تلاش کر کے نذرِ آتش کر دیئے۔ بنابرایں یہ حکم بھی ہوا کہ جو اسرائیلی عبادت میں مصروف دیکھا جائے اسے وہیں تہ تیغ کر دیا جائے۔ الغرض یہ ایک ایسا عذابِ الٰہی تھا جس نے آن کی آن میں اسرائیلی جاہ و حشمت کو پائے حقارت تلے روند ڈالا۔

نصف صدی بعد جب انہوں نے پھر کروٹ لی اور بیت المقدس کو پھر سے آباد کیا تو ایک رومی نے اٹھ کر انہیں پھر سے تباہی و ہلاکت کی پاتال میں پہنچا دیا۔ دیکھا جائے تو جو قوم خدا تعالیٰ کی انگنت ناز و نعم کی قدر نہ کرے اور بار بار بخششوں پر بھی شکر گزاری سے محروم رہے، تو بیشک ایسی قوم کا ایسا حشر ہونا بھی چاہیئے تھا۔

اس کے بعد عراقیوں کو اقتدار نصیب ہوا جن میں اہل نینویٰ اور اہل بابل دونوں شامل ہیں۔ یہ قومیں بھی کافر اور نافرمان تھیں اسلئے اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت مبارکہ کے مطابق انکی ھدایت وراہنمائی کیلئے حضرت یونس علیہ السلام کو مبعوث فرمایا جو حضرت موسیٰؑ سے ڈیڑھ صدی بعد تشریف لائے۔ حضرت یونسؑ کا زمانہ قریباً آٹھویں صدی قبل مسیح ہونا چاہیئے۔

توراۃ اور کتب سیر وتواریخ میں آپ کا نسب کہیں مذکور نہیں ہے البتہ توراۃ شریف میں آپؑ کا نام یوناہ (jonah) مذکور ہے' جو یونس کا عبرانی تلفظ ہے۔ نیز آپکے والد کا نام متی یا امتی مذکور ہوا ہے جسکی احادیث مبارکہ سے تصدیق ہوتی ہے۔ صحیح بخاری/کتاب الانبیاء میں حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی احادیث میں آپکے والد کا نام متی بیان ہوا ہے۔ قران حکیم میں آپکے نام یونس کے علاوہ دو القاب ذوالنون اور صاحب الحوت بھی بیان ہوئے ہیں۔ حوت مروج عربی زبان میں مچھلی کو کہتے ہیں جبکہ قدیم عربی زبان میں نون بھی مچھلی کیلئے مستعمل ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:۔

''عہدِ عتیق'' یوناہ نبی کے نام کا ایک صحیفہ ہے جسے عہدِ عتیق کا بتیسواں صحیفہ سمجھنا چاہیئے۔ اسکے صرف چار باب اور کل اڑتالیس آیات ہیں۔ صحیفہ مذکورہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ حضرت یونسؑ ہی کی داستان ہے۔ انہیں یوناہ بن متی کہتے تھے اور ذوالنون بھی۔ کیونکہ نون مچھلی کو کہتے ہیں اور ان پر مچھلی کا واقعہ گزرا تھا اور صاحب الحوت بھی جیسا کہ سورۃ القلم میں ہے''۔:۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَ لَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ اِذْ نَادٰى وَ هُوَ مَكْظُوْمٌ (۴۸)

ترجمہ:۔ تو اپنے رب کے حکم کا انتظار کر اور اس مچھلی والے کی طرح نہ ہو نا جب اس حال میں پکارا کہ (مچھلی کے پیٹ میں) اس کا دل گھٹ رہا تھا (القلم:۴۸)

حضرت یونس علیہ السلام کے دَورِ دعوت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ نینویٰ پر ۶۲۵ ق م میں حملے شروع ہو گئے تھے اور ۶۱۲ ق م میں یہ فتح ہو گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ آثارِ عذاب دیکھتے ہی اہل شہر نے معافی مانگ کر خدا پرستی اختیار کر لی تھی جس پر انہیں عذاب سے مہلت مل گئی تھی۔ انکے پیروکاروں کی کچھ

تعداد جو اُن پر ایمان لائی تا دیر انکے مسلک پر قائم رہی۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ کیلئے طائف تشریف لے گئے تھے تو طائف کے بدبختوں نے نہایت بدسلوکی کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سنگ باری کی تھی تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک باغ میں پناہ لی تھی۔ باغ کے مالکوں نے جس غلام کے ہاتھوں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تحفتاً انگور دے کر بھیجا تھا وہ غلام حضرت یونسؑ کے دین ہی کا پیرو کار تھا۔

حافظ ابن حجر کا فرمانا ہے کہ حضرت یونسؑ کے زمانہ کا تعین تاریخ کی روشنی میں مشکل ہے البتہ بعض مورّخین کا کہنا ہے کہ جب فارس (ایران) میں طوائف الملوکی کا دَور تھا اس وقت نینویٰ میں جناب حضرت یونسؑ کا ظہور ہوا۔ اس وقت آپکی عمر اٹھائیس برس کی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو منصب نبوت پر فائز فرما کر اہل نینویٰ کی رُشد وھدایت کیلئے مامور فرمایا۔

یونسؑ ایک عرصہ تک ان کو تبلیغ فرماتے اور توحید کی دعوت دیتے رہے مگر انہوں نے اعلانِ حق پر کان نہ دھرے۔ تمرّد وسرکشی سے اپنے شرکیہ وکفریہ عقائد پر مُصر رہے اور سابقہ نافرمان اقوام کی مانند ایک سچے پیغمبر کی دعوت کا مذاق اڑاتے رہے۔ بلآخر جب قوم کسی طرح راہِ راست پر نہ آئی تو قوم کی پیہم مخالفت ومعاندت سے تنگ آکر حضرت یونسؑ ان سے ناراض ہوگئے اور انکو عذاب الٰہی کی بددعا دیتے ہوئے اُن میں سے اٹھ کر چلے آئے۔

جب فرات کے کنارے پہنچے تو ایک کشتی کو مسافروں سے بھرا ہوا پایا جس میں آپؑ بھی سوار ہوگئے تو کشتی نے لنگر اٹھا دیا۔ راستے میں طوفان نے آگھیرا تو کشتی ڈگمگانے لگی اور ایک موقع ایسا آیا کہ اہل کشتی کو یقین ہوگیا کہ وہ غرق ہوجائیں گے۔ ان لوگوں نے اپنے عقیدے کے مطابق اندازہ لگایا کہ کشتی کی سواریوں میں کوئی ایسا غلام ضرور ہے جو اپنے آقا سے بھاگا ہوا ہے۔ حضرت یونسؑ نے سنا تو انہیں معاً خیال ہوا کہ یہ میں ہی ہوں۔ کیونکہ میں بھی نینویٰ سے اپنے مالک کی اجازت اور اسکی وحی کا انتظار کیے بغیر چلا آیا ہوں' یہ طوفان اور کشتی کا ڈولنا میری ہی آزمائش کے آثار ہیں۔

یہ سوچ کر آپؑ نے کشتی والوں سے کہا کہ میں ہی وہ غلام ہوں جو اپنے آقا کی مرضی کے بغیر یہاں آگیا ہوں لہٰذ دستور کے مطابق مجھے کشتی سے باہر پھینک دیں۔ ملاح آپؑ کی صاف گوئی سے اس

قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے آپکو کشتی سے باہر پھینکنے سے انکار کر دیا۔ مگر چونکہ طوفان بدستور جاری تھا اور کشتی کا ڈولنا ڈگمگانا بڑھتا ہی جارہا تھا اس لئے انہوں نے تین مرتبہ قرعہ اندازی کی اور ہر مرتبہ حضرت یونسؑ ہی کے نام کا قرعہ نکلتا رہا۔ جسے قرآن حکیم نے سورۃ انبیاء میں یوں ارشاد فرمایا:۔

وَ ذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (انبیاء :۸۷)

ترجمہ:۔اور ذنون کو (یعنی مچھلی والے کو یاد کرو) جب چلا غصہ میں بھرا ہوا تو گمان کیا کہ ہم اس پر تنگی نہ کریں گے تو (مچھلی کے پیٹ کے) اندھیروں میں پکارا کوئی معبود نہیں سوائے تیرے پاکی ہے تجھ کو بیشک مجھ سے بیجا ہوا (انبیاء:۸۷)

بار بار قرعہ آپکے نام نکلنے کی صورت میں انکے پاس بھی اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ حضرت یونسؑ کو دریا برد کر دیا جائے چنانچہ انہوں نے حضرت یونس علیہ السلام کو دریا میں ڈال دیا۔ اس بات کا تذکرہ سورۃ الصّٰفّٰت میں یوں فرمایا گیا ہے:۔

وَ اِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (۱۳۹) اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ (۱۴۰) فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ (الصّٰفّٰت:۱۳۹تا۱۴۱)

ترجمہ:۔ اور بیشک یونس پیغمبروں میں سے ہے (۱۳۹) پھر جب بھری کشتی کی طرف نکل گیا (۱۴۰) جب قرعہ ڈالا تو دھکیلے (ہارے) ہوؤں میں سے ہُوا (۱۴۱) سورۃ الصّٰفّٰت

جونہی انہیں دریا میں ڈالا گیا اسی وقت خدا تعالیٰ کے حکم سے ایک مچھلی نے حضرت یونسؑ کو زندہ نگل لیا۔ فتح الباری ج ۶ ص ۳۵۱ میں ہے کہ "مچھلی کو حکم تھا کہ تجھے صرف نگلنے کی اجازت ہے یونسؑ تیری غذا نہیں اس لئے انکے جسم کو مطلق گزند نہ پہنچے۔"

جب یونس علیہ السلام نے خود کو مچھلی کے پیٹ میں زندہ پایا تو بارگاہِ ایزدی میں اپنا سر جھکا دیا اور عرض کرنے لگے "لاالہ الاانت سبحانک انی کنت من الظالمین" الٰہی تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو ہی یکتا ہے میں تیری پاکی بیان کرتا ہوں بے شک میں اپنے اوپر خود ہی زیادتی کرنے والا ہوں کہ میں تیری اجازت لئے بغیر نینویٰ سے نکل کھڑا ہوا' سو تیری بارگاہ میں عفو و تقصیر کے لئے دعا گو ہوں۔ اس پر

اُس مہربان ازلی وابدی نے انہیں معاف فرمادیا۔جس کوسورۃ الانبیاء میں یوں بیان فرمایا گیا ہے۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَ نَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ وَ كَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ

(الانبیاء:۸۸)

تو ہم نے اس کی پکار سن لی اور اسے غم سے نجات بخشی اور ایسی ہی نجات دیں گے مسلمانوں کو

(الانبیاء۸۸)

اللہ تعالیٰ جل شانہ نے یونسؑ کی اس درد بھری التجاء کو سن کر انکی خطا معاف فرمادی وگرنہ یہ طے تھا کہ حضرت نونسؑ قیامت تک مچھلی کے پیٹ سے باہر نہ نکل سکتے یا پھر مردہ حالت میں انہیں ساحل پر اُگلوادیا جاتا اور وہ اپنی قوم میں مرنے کے بعد بھی خطا کاری کے ملزم گردانے جاتے۔تاہم معافی مل جانے پر آپکو رب العالمین نے اپنی بارگاہِ قرب میں جگہ عطا فرمائی اور مچھلی کو حکم ہوا کہ یونسؑ کو جو تیرے پاس ہماری امانت ہے اسے واپس اُگل دے۔چنانچہ مچھلی نے حضرت یونسؑ کو ساحل پر اُگل دیا۔اس ضمن میں سورۃ القلم میں ارشادِ عالی شان ہے:۔

لَوْ لَاۤ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَ هُوَ مَذْمُوْمٌ(۴۹) فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ(القلم: ۴۹/۵۰)

ترجمہ:۔اگر اسکے رب کی نعمت اس کی خبر کو نہ پہنچ جاتی تو ضرور میدان پر پھینک دیا جاتا الزام دیا ہوا(۴۹) تو اسے اس کے رب نے چن لیا اور اپنے قرب کے خاص سزاواروں میں (شامل) کرلیا(القلم:۴۹/۵۰)

جب مچھلی نے حضرت یونسؑ کو اُگلا اُس وقت انکی حالت کے بارے میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:۔مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی وجہ سے آپؑ کا جسم ایسا ہوگیا تھا جیسا کسی پرندے کے نومولود بچے کا' جو کہ نہایت نرم ونازک اور بے پَر وبال ہوتا ہے۔ (بحوالہ تفسیر ابن کثیر الصافات)

اس واقعہ کے ضمن میں سورۃ الصّٰفّٰت میں یوں ہے:۔

فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَ هُوَ مُلِيْمٌ(۱۴۲) فَلَوْ لَاۤ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ۙ(۱۴۳) لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۚ(صّٰفّٰت: ۱۴۲تا۱۴۴)

ترجمہ:۔ پھر اسے مچھلی نے نگل لیا اور وہ خود کو ملامت کرتا تھا (۱۴۲) پھر اگر وہ تسبیح کرنے والا نہ ہوتا (۱۴۳) تو ضرور اس کے پیٹ میں قیامت میں اٹھائے جانے تک رہتا (الصّٰفّٰت ۱۴۴)

مچھلی کے اُگل دینے پر آپؑ کے جسم کی حالت نہایت نازک ہو چکی تھی اللہ الرحم الراحمین نے آپؑ کیلئے کدو کا ایک بیلدار درخت اُگا دیا۔ جس کے سائے میں حضرت یونسؑ ایک جھونپڑی ڈال کر رہنے لگے۔ جسے سورۃ الصّٰفّٰت میں یوں بیان فرمایا:۔

فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ ۚ (۱۴۵) وَ اَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ۚ (۱۴۶)

پھر ہم نے اسے میدان پر ڈال دیا اور وہ بیمار تھا (۱۴۵) اور ہم نے اس پر کدو کا پیڑ اُگایا (الصّٰفّٰت: ۱۴۶/۱۴۵)

کدّو کے پیڑ کی یہ بیل جس کے سائے تلے حضرت یونسؑ رہ رہے تھے ایک روز کیڑا لگنے کے باعث سوکھ کر ٹوٹ گئی تو حضرت یونسؑ کو اس کا بہت ملال ہوا۔ چنانچہ وحی نازل ہوئی کہ اے یونسؑ تم کو اس معمولی سی بیل کے سوکھنے کا بہت رنج ہوا جو ایک حقیر سی شئے ہے۔ مگر تم نے یہ نہ سوچا کہ نینویٰ کی ایک لاکھ سے زیادہ آبادی ہے جس میں انسان بس رہے ہیں اور انکے علاوہ اور بہت سے جاندار بھی ہیں۔ کیا انہیں ہلاک کر ڈالنے میں ہمیں ناگواری نہ ہوتی، جو تم وحی کا انتظار کیے بغیر انکے لئے بددعا کر کے چلے آئے۔ جبکہ یہ بات ایک نبی کے شایانِ شان نہیں تھی۔ جس پر آپ اپنے رب کے حضور سخت شرمسار ہوئے اور پھر سے توبہ کے خواستگار ہوئے۔

کسی پیغمبر کی دعا یا بددعا کبھی ضائع نہیں کی جاتی اسلئے جونہی حضرت یونس علیہ السلام قوم سے جدا ہوئے اُدھر عذاب کے آثار نمودار ہونے لگے تو قوم نے توبہ و استغفار شروع کر دی۔ اس دوران بادشاہ سے لے کر عوام تک سب نے ایک میدان میں جمع ہو کر اپنی گمراہی سے توبہ کی اور خوفِ خدا سے چیختے چلاتے ہوئے نہایت تضرع سے اقرار کرنے لگے کہ:۔ امنّا بما جاءَ بہٖ یونس جو کچھ یونسؑ لے کر آئے ہم اس پر ایمان لائے۔

صورتِ حال یہ تھی کہ جب حضرت یونسؑ ان سے مایوس ہوئے تو انہیں عذاب خداوندی کی خبر

دیکر بوجہ ناراضگی ان سے جدا ہو کر چلے آئے۔ان لوگوں نے آپس میں کہا کہ یونسؑ نے آج تک کبھی کوئی بات غلط نہیں کہی۔اب دیکھو اگر وہ رات یہاں رہے پھر تو کوئی اندیشہ نہیں اور اگر انہوں نے رات یہاں نہ گزاری تو سمجھ لینا عذاب ضرور آ کر رہے گا۔شب میں یونسؑ وہاں سے تشریف لے گئے تھے اور صبح کو عذاب کے آثار نمودار ہو گئے۔آسمان پر ہیبت ناک قسم کا سیاہ ابر چھا گیا اور بہت بڑی مقدار میں دھواں جمع ہو کر تمام شہر پر پھیلنے لگا۔یہ دیکھ کر انہیں یقین ہو گیا کہ عذاب آنے والا ہے۔تو انہوں نے حضرت یونسؑ کی تلاش شروع کر دی۔جب آپؑ کو نہ پایا تو انہیں اور بھی زیادہ تشویش ہو گئی تو وہ اپنے بال بچوں اور جانوروں سمیت موٹے کپڑے پہن کر جنگل کے وسیع میدان میں نکل گئے اور توبہ و استغفار کرتے ہوئے قبولِ اسلام کا اظہار کرنے لگے۔بارگاہِ الٰہیہ میں گریہ زاری شروع کر دی۔جس کسی نے کسی سے زیادتی کی تھی ایک دوسرے سے معافی مانگنے لگے۔پرائے مال واپس لوٹا دیئے یہاں تک کہ کسی نے اگر کسی کا ایک پتھر اپنی بنیاد میں لگایا ہوا تھا اس نے گھر کی بنیاد اکھیڑ کر وہ پتھر واپس کیا۔شوہر بیوی سے جدا ہو گیا اور ماؤں کو بچوں کی خبر نہ رہی' گویا قیامت کا منظر ہو۔اللہ تعالیٰ نے انکے اخلاص کے باعث اُن پر رحم کیا انکی دعا قبول فرمالی اور عذاب اٹھا دیا گیا۔

سورۃ یونس میں فرمانِ الٰہ العٰلمین ہے:۔

فَلَوْ لَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ؕ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ (یونس:۹۸)

ترجمہ:۔تو کوئی بستی (ہلاک) نہ ہوئی ہوتی (جن کو ہم نے ہلاک کیا) کہ ایمان لاتی (اور عذاب آنے سے پہلے پہلے اخلاص کے ساتھ توبہ کرتی) تو اسکا ایمان کام آتا ہاں یونس کی قوم جب ایمان لائی ہم نے ان سے رسوائی کا عذاب دنیا کی زندگی میں ہٹا دیا اور ایک وقت تک انہیں برتنے دیا (یونس:۹۸)

اسی ضمن میں سورۃ الصّٰفّٰت میں فرمان ہے:۔

وَ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ؕ (۱۴۷) فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۚ (۱۴۸)

ترجمہ:۔اور ہم نے اسے ایک لاکھ آدمیوں کی طرف بھیجا بلکہ زیادہ (۱۴۷) اور وہ ایمان لے

آئے تو ہم نے انہیں ایک وقت تک برتنے دیا (الصّٰفّٰت: ۱۴۷ تا ۱۴۸)

اس واقعہ کے بعد حضرت یونسؑ کو حکم دیا کہ وہ دوبارہ اپنی قوم میں واپس چلے جائیں اور انکی رہنمائی کریں۔ آپؑ کتنا عرصہ ان میں رہے یا بعد ازاں کیا صورتِ حال ہوئی الہامی کتب اس بارے خاموش ہیں اس لئے ہم اس بارے کچھ عرض کرنے سے قاصر ہیں۔

حضرت شاہ عبدالقادر نوراللہ مرقدٗ فرماتے ہیں کہ حضرت یونسؑ کی وفات اسی جگہ ہوئی جس جانب وہ مبعوث ہوئے یعنی نینویٰ میں۔ عبدالوہاب بخار کے خیال میں آپکی قبر فلسطین کے شہر خلیل کی بستی حلحوں میں ہے جبکہ یہ غیر درست ہے۔ دراصل یہاں حضرت یونسؑ کے والد کی قبر ہے جبکہ آپکا مزار شریف شاہ عبدالقادر کی رائے کے مطابق نینویٰ ہی میں ہے۔

قرآن حکیم میں حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر چھ سورتوں میں اٹھارہ مرتبہ آیا ہے جس کا جدول درجِ ذیل ہے۔

سورۃ النساء	۱۶۳
سورۃ الانعام	۸۷
سورۃ یونس	۹۸
سورۃ انبیاء	۸۷، ۸۸
سورۃ الصّٰفّٰت	۱۳۹ تا ۱۴۸
سورۃ القلم	۴۸ تا ۵۰

حضرت عزیر علیہ السلام

آپؑ حضرت ھارونؑ کی اولاد میں سے تھے جن کا ظہور حضرت ھارونؑ کی سولہویں پشت میں ہوا۔توراۃ شریف کے مطابق آپکا نسب نامہ اس طرح ہے:۔
عزیرؑ بن سرایاہ بن عزریاہ بن خلقیاہ بن سلام بن صدوق بن اخطوب بن امریاہ بن عزریاہ بن مرایوت بن زراخیاہ بن عزی بن بقی بن ابیسوع بن فنحاس بن الیعزر بن ہارونؑ (صحیفہ عزرا باب ۷/ص ۱تا۵)۔

جب یہودیوں کی نافرمانیاں حد سے بڑھ گئیں' انبیاء کو ناحق بے دریغ قتل کرڈالنا اور توراۃ کے احکامات میں من مانی تاویلات کرنا وغیرہ انکی عادت بن گئی تو خدا کا عذاب بخت نصر متوفی ۴۶۱ ق م کی صورت میں نمودار ہوا۔تواریخ کے مطابق شاہ یہوداہ یہویقیم کی سلطنت کے تیسرے سال ۵۸۶ ق م میں بنوکدنصر (بخت نصر) نے بیت المقدس پر حملہ کر کے اسکی اینٹ سے اینٹ بجادی' شہر کولوٹا ہزار ہا یہودیوں کو قتل و غارت گری کی بھینٹ چڑھایا اور بہت سوں کو قید کر کے اپنے ہمراہ اپنی راجدھانی بابل لے گیا جن میں حضرت عزیرؑ اور حضرت دانیالؑ بھی شامل تھے۔اسی ہڑبونگ میں توراۃ کے موجود نسخے بھی ضائع ہوگئے۔آخر کار فارس کے شاہ سائرس کیخسرو نے بنوکدنصر کے بیٹے بلیشعر بیل شاہ زار کو شکست دیکر بنی اسرائیل کو ستر سال بعد رہائی دلائی اور ان کو دوبارہ ارض مقدس میں آباد کیا۔توراۃ کی تصریح کے مطابق جو لوگ بابل سے ارض مقدس واپس گئے انکی تعداد ۴۹۸۹۷ تھی' بنی اسرائیل کی تعداد ۴۲۳۶۰ تھی جن میں ۷۳۳۷ غلام تھے اور ۲۰۰ موسیقار تھے۔ان واپس لوٹنے والوں کے ساتھ ۸۱۳۶ جانور بھی تھے جن میں سے ۷۳۶ گھوڑے ۲۴۵ خچر ۶۷۲۰ گدھے اور ۵ عدد اونٹ تھے۔

مفسرین کے مطابق حضرت عزیرؑ کی ابتدائی زندگی حضرت دانیالؑ کی معیت میں بسر ہوئی۔ تاہم رہائی کے بعد شاہِ فارس ارتخشثا نے خواجہ سراؤں کے سردار اسپنز کو حکم دیا کہ اسرائیلی اسیروں میں سے چند عالی خاندانوں کے صاحب علم و دانش افراد کو شاہی دربار میں شریک کرنے کیلئے منتخب کرلیا جائے' انہیں بابلی زبان سکھائی جائے اور انہیں شاہانہ لباس و شاہی غذا بہم پہنچائی جائے۔اسپنز نے بڑی دانش

مندی اور غور وفکر کے بعد بنی اسرائیل کے چار افراد کو منتخب کیا جن میں حضرت عزیرؑ بھی شامل تھے۔ یہ چار حضرات (۱) حضرت دانیالؑ (۲) حضرت عزیرؑ (۳) اخنیاہ اور (۴) میسائیل تھے۔ اسپنتر نے ان سب کے نام تبدیل کر کے حضرت دانیالؑ کا نام بلیطشفر حضرت عزیرؑ کا عبد نجو' خنیاہ کا سدرک اور میسائیل کا میسک رکھا۔ ان کو کلدانی زبان سکھائی گئی' زرق برق لباس پہنائے گئے اور شاہی غذا پیش کی گئی۔ شاہی غذا میں چونکہ شراب بھی شامل تھی اسلئے حضرت عزیرؑ نے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی طرف سے اس کھانے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ انکار پر چاروں شاہِ فارس کے دربار میں پیش کیے گئے تو بادشاہ نے کھانے سے انکار کی وجہ دریافت کی اور اُن سے کچھ دیر گفتگو کی تو بادشاہ حضرت عزیرؑ سے بہت متاثر ہوا (گو کہ آپؑ ابھی صغرسن تھے) اُس نے آپکو بابل کا گورنر مقرر کر دیا۔ مفسرین کا خیال ہے اس وقت آپکی عمر بیس سے پچیس سال کے درمیان تھی۔

یہ وقت حضرت عزیرؑ کیلئے آزمائش کا دور تھا کیونکہ بابل ان دنوں کفر وشرک کا سب سے بڑا مرکز بنا ہوا تھا۔ بنوکد نصر نے اپنے وقت سے صوبہ بابل کے ایک اہم مقام پر سونے کا ایک دیو قامت بت نصب کروا رکھا تھا جس کی لمبائی ساٹھ ہاتھ اور چوڑائی چھ ہاتھ تھی۔ حکم عام تھا کہ جب پوجا کا ساز بجے تو سب لوگ کام کاج چھوڑ کر فوراً اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جایا کریں۔ حضرت عزیرؑ نے گورنر بنتے ہی اس رسم کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ یہ خبر فوراً ارتخشثا کے کانوں تک پہنچی تو اس نے آپؑ کو دربار میں طلب کر لیا اور اس فعل کا سبب دریافت کیا۔ حضرت عزیرؑ نے علی الاعلان کہا کہ عبادت کے لائق صرف ایک ہی خدا ہے خدائے موسیٰؑ دوسرا کوئی نہیں اور یہ بت فضول و بیکار ہیں۔ اس پر وہ سیخ پا ہو گیا اور اس نے حضرت عزیرؑ کو انکے عہدہ سے سبکدوش کر کے جلتی آگ کے دہکتے شعلوں میں ڈال دینے کا حکم صادر کیا۔ لیکن حضرت عزیرؑ تائید ایزدی سے اس آگ سے بالکل محفوظ و مامون رہے۔ یہ معجزہ دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوا' اور آپکا پہلے سے بھی زیادہ قائل ہو گیا اور بے اختیار پکار اٹھا:۔

''عبد نجو (عزیرؑ) کا خدا مبارک ہے جس نے اپنا فرشتہ بھیج کر اسے رہائی بخشی'
اور واقعی اسکے خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہو سکتا''۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بابل و نینوا کی طرف مبعوث ہونے والے انبیاء میں سے حضرت یونسؑ نینوا کی

جانب جبکہ حضرت عزیرؑ بابل کی طرف مبعوث فرمائے گئے۔شاہِ بابل تو آپؑ سے متاثر دکھائی دیتا ہے مگر جب سے آپؑ نے رسمِ بت پرستی اٹھائی اور بت پرستی کی مذمت کی' بہت سے بت پرست اندر ہی اندر آپ کے خلاف ہو گئے اور خدائے عزیرؑ کے بارے نازیبا الفاظ و بیان استعمال کرنے لگے۔اس پر شاہِ فارس نے حکم دیا کہ اگر کسی نے عزیرؑ کے خدا کے بارے کوئی نازیبا بات کہی تو اسکے ٹکڑے کر دیئے جائیں گے اور آپکو صوبہ بابل دوبارہ عطا کر دیا۔آپؑ بسلسلہ تبلیغ بیت المقدس آتے جاتے رہتے اور لوگوں کو توراۃ کے احکامات پر عمل درآمد کی تاکید کیا کرتے۔البتہ احکاماتِ توراۃ کی ترسیل کا یہ سلسلہ زبانی تھا۔کیونکہ اوّلاً تو توراۃ کے نسخوں کی پہلے ہی سے قلت تھی' رہی سہی کسر بنوکدنصر نے پوری کر دی کہ اسکے حملوں کے دوران اصل سمیت توراۃ کے تمام نسخے جل کر نابود ہو چکے تھے۔

ابن اللہ قرار دینے کی وجہ تسمیہ

حضرت عزیرؑ جب بیت المقدس تشریف لائے اس سے قبل بنوکدنصر (بخت نصر) کے حملوں کے باعث جہاں تمام صوبہ بیت المقدس سمیت تباہ و برباد ہو چکا تھا وہیں توراۃ کے تمام نسخے بھی جل کر نابود ہو گئے تھے۔اس وقت صرف حضرت عزیرؑ ہی ایک ایسی شخصیت تھے جو توراۃ کے حافظ تھے۔وہ نہ صرف حافظِ توراۃ بلکہ شریعت موسوی کے ماہر اور زبردست فقیہ بھی تھے۔آپؑ نے (ایسی عبرانی زبان میں جو کلدانی زبان سے مخلوط تھی) ازسرِ نو صحائف توراۃ کو مرتب کیا اور یہی اصل نسخہ کا بدل سمجھا گیا۔گویا توراۃ کی ازسرِ نو تالیف ہوئی جو اس دور میں ایک ناممکن چیز سمجھی جاتی تھی' جس سے یہودی انکے بہت مداح و معترف ہو گئے تھے۔پھر کچھ مدت بعد جب توراۃ کا ایک قدیم نسخہ دستیاب ہوا تو وہ ہو بہو اسی طرح پایا گیا جس طرح حضرت عزیرؑ نے تحریر کروایا تھا۔اس سے یہود کے دلوں میں آپکی قدر و منزلت بہت بڑھ گئی اور آپکو ''مجدّدِ دین موسوی'' کا خطاب دیا گیا۔ان ہی میں سے بعض یہودیوں نے اتنا غلو کیا کہ وہ بغیر غور و تدبر کئے آپؑ کو خدا کا فرزند (ابن اللہ) کہنے لگ گئے۔

عام یہودیوں کا اگرچہ یہ عقیدہ نہ تھا اور یہ عقیدہ صرف ایک فرقہ تک محدود تھا تاہم قرآن نے تمام یہودی قوم کو خطاب فرما کر اس گمراہی کو طشت از بام کیا۔کیونکہ جب قوم کے بعض ذمہ دار افراد کسی

بات کے قائل ہوں تو بطورِ نمائندہ وہ بات انکی ساری قوم کی طرف سے منسوب متصور کی جاتی ہے اگرچہ ساری قوم نے وہ بات نہ بھی کہی ہو۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق اس فرقہ میں سلام بن مشکم، نعمان ابن اوفیٰ، وشاس بن قیس اور مالک بن الصیف وغیرہ جیسے لوگ تھے۔ گو اب اس عقیدے کے لوگ ختم ہو چکے ہیں تاہم آج کے روشن دور میں بھی فلسطین کے نواح میں یہودیوں کا ایک ایسا فرقہ آباد ہے جو حضرت عزیرؑ کو ''خدا کا بیٹا'' مانتا ہے اور رومن کیتھولک عیسائیوں کی طرح آپ کا مجسمہ بنا کر اسکی پرستش کرتا ہے۔ اس ضمن میں قرآن حکیم نے سورۃ توبہ (آیت ۳۰) میں فرمایا:۔

وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ نِ ابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (توبہ: ۳۰)

ترجمہ:۔ اور یہودیوں نے کہا کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائیوں نے کہا مسیح اللہ کا بیٹا ہے یہ انکی باتیں ہیں محض انکی زبانوں سے نکالی ہوئی ان لوگوں نے بھی ان ہی کی سی بات کہی جو اس سے پہلے کفر کی راہ اختیار کر چکے ہیں ان پر اللہ کی مار یہ کدھر بھٹکے جا رہے ہیں (توبہ: ۳۰)

غالباً حضرت عزیرؑ سے ہی متعلق احیائے موتیٰ کا درج ذیل واقعہ سورۃ بقرۃ۔ ۲۵۹ میں یوں بیان ہوا۔

اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَ انْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَ انْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (البقرۃ: ۲۵۹)

ترجمہ:۔ یا اس شخص کی طرح جو اس بستی پر گزرا جو اپنی چھتوں پر گری پڑی تھی۔ بولا اللہ اسکو اسکی موت کے بعد کیسے زندہ کرے گا۔ تو اللہ نے اسے سو سال مردہ رکھا پھر اسے زندہ کر دیا اور فرمایا تم یہاں کتنا ٹھہرے۔ اس نے عرض کی میں دن بھر یا اس سے کچھ کم رہا۔ فرمایا تم یہاں ایک سو سال ٹھہرے۔ اپنے کھانے اور پانی کی طرف دیکھو وہ خراب نہیں ہوئے اور اپنے گدھے کی بوسیدہ ہڈیوں کو دیکھو۔ یہ اس لئے کیا کہ ہم تمہیں لوگوں کیلئے نشانی بنائیں اب دیکھو کہ ہم ان

ہڈیوں کو کیسے اٹھاتے اور کیسے ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ پھر جب اس پر (ہمارا مردوں کو زندہ کرنا) ظاہر ہو گیا تو بولا اب میں (زیادہ یقین سے) جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (البقرۃ۔۲۵۹)

سورۃ بقرۃ آیت ۲۵۹ میں احیائے موتی کی تمثیل کے سلسلہ میں جس ہستی کا ذکر ہوا ہے کہ وہ ایک اُجڑ چکی ویران بستی سے گزرے تو اس بربادی کو دیکھ کر انکو خیال آیا کہ خدا تعالیٰ اِن مر چکے لوگوں کو بھلا کیونکر زندہ کریگا اور یہ بستی کیسے آباد ہو سکے گی۔ اس ضمن میں جو قصہ آیتِ بالا میں بیان فرمایا گیا وہ دراصل قیامت تک کیلئے عالم جن و بشر کیلئے راہنمائی اور روشنائی کا مینار ہے۔

کچھ مفسرین کا خیال ہے کہ اس قصہ میں مذکورہ ہستی حضرت یرمیاہؑ تھی۔ جیسے وہب بن منبہؒ اور عبداللہ بن عبیدؒ کے اقوال ہیں۔ بعض کے نزدیک حضرت عزرؑا ہیں مگر حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضرت عبداللہ بنؓ عباس حضرت عبداللہ بنؓ سلام (جو کہ قبل از قبولِ اسلام خود یہودی احبار تھے) حضرت قتادہ حضرت سلمانؓ اور حضرت حسنؒ سے متعدد روایات منقول ہیں کہ یہ واقعہ حضرت عزیرؑ سے متعلق ہے۔

حضرت عزیرؑ ایک بلند پایہ پیغمبر، زبردست عالم اور فقیہ تھے۔ تائید ایزدی ہر ہر لحہ آپکے شامل حال رہی۔ آپؑ نے ۴۵۸ ق م میں وفات پائی۔ ابن کثیر وہب بن منبہ، کعب احبار، عبداللہ بن سلامؓ کی ایک روایت کے مطابق عراق میں آپؑ کا انتقال ہوا اور وہیں دیر حزقیل کے قریب قریہ سائر آباد میں آپکی قبر بتاتے ہیں۔ (البدایۃ والنہایۃ ج ۲ ص ۴۵) دوسری جگہ مذکور ہے کہ آپکی قبر مبارک دمشق میں ہے اور مفسرین کی اکثریت اسے درست مانتی ہے۔ (واللہ اعلم بالثواب)

قرآن کریم میں آپکا ذکر نام لئے بغیر سورۃ بقرۃ آیت ۲۵۹ میں اور نام کے ساتھ سورۃ توبہ آیت ۳۰ میں آیا ہے۔

حضرت زکریا علیہ السلام

قرآن مجید میں حضرت عیسیٰؑ کے تذکرے کی ابتداً حضرت مریمؑ کی پیدائش اور حضرت زکریاؑ کے ذکر سے ہوتی ہے۔ یہ اُن شہید پیغمبروں میں سے ایک ہیں جو بنی اسرائیلی یہودیوں کی سفا کی کا نشانہ بنتے ہوئے شہید ہوئے۔ بد بخت یہودیوں نے انہیں ایک درخت میں موجود پا کر اس درخت کو آرے سے چیر کر آپؑ کو شہید کر ڈالا۔ عہد نامہ عتیق (توراۃ) میں ایک اور نبی زکریاؑ کا تذکرہ ملتا ہے اور انکے نام سے ایک صحیفہ بھی اُس میں شامل ہے' لیکن قرآن حکیم نے جن زکریاؑ کا ذکر کیا ہے یہ وہ زکریاؑ نہیں۔ توراۃ میں مذکور زکریاؑ شاہِ فارس دارا کے عہد میں گزرے ہیں اور انکے بارے صحیفہ زکریاؑ میں یہ مذکور ہے۔

(۱) ''دارا کے دوسرے برس کے آٹھویں مہینے میں خداوند کا کلام زکریاؑ بن برکیاہ بن عدو پر نازل ہوا''۔

(۲) ''دارا کے زمانہ میں جب اسکے حکم سے بیت المقدس دوبارہ تعمیر ہوا تو حضرت زکریاؑ اس کی تعمیر میں پیش پیش تھے''۔

جبکہ قرآن حکیم نے جن زکریاؑ کا ذکر کیا ہے وہ حضرت عیسیٰؑ کے معاصر' آپکی والدہ ماجدہ حضرت مریمؑ کے مربی' حضرت عیسیٰؑ کے خالہ زاد بھائی اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کے والد ہیں۔ جبکہ عہد نامہ عتیق میں مذکور زکریاؑ کی ولدیت برکیاہ بن عدو بیان ہوئی ہے پھر حضرت عیسیٰؑ اور عہدِ دارا میں پانچ صدی کا فرق ہے۔

قرآن حکیم میں مذکور حضرت زکریاؑ کے بارے انجیل مقدس کے بیان کے مطابق آپؑ کاہن تھے۔ جیسا کہ انجیل لوقا میں ہے:۔ ''یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانہ میں ابیاہ کے فریق میں سے زکریاؑ نام کا ایک کاہن تھا''۔ (باب ۱/۵)

اُس زمانے میں چونکہ مختلف کاہن بیت المقدس کی خدمات انجام دیتے تھے اس لئے قرآن میں مذکور زکریاؑ کے بارے انجیل لوقا کی یہ قیاس آرائی محض گمانی دکھائی دیتی ہے' جبکہ قرآن حکیم نے حضرت زکریاؑ کے عہد کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتادیا ہے کہ آپؑ ایک جلیل القدر پیغمبر تھے۔ جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:۔

" وَ زَكَرِيَّا وَ يَحْيٰى وَعِيْسٰى وَ اِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۙ (انعام: ۸۵)"

ترجمہ:۔"اور زکریا اور یحیٰ اور عیسٰی اور الیاس یہ سب نیکوکار تھے" (انعام:۸۵)۔

نیز متعدد کتبِ تواریخ میں مندرج آپؑ کا شجرہ حضرت داؤد علیہ السلام تک جاتا ہے جو یوں ہے:۔

حضرت زکریا بن اون بن شبوی بن لان (برخیا) بن مسلم بن صدوق بن حشیان بن داؤد بن سلیمان بن مسلم بن صدقیہ بن برخیاہ بن بلعاطہ بن ناحور بن شلوم بن ہفاشاط بن ابیاہ بن رحبعام بن حضرت سلیمانؑ بن حضرت داؤد علیہ السلام۔(فتح الباری از حافظ ابن حجرؒ تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۴۷)

صحیح مسلمؒ ابن ماجہ اور مسند احمد ابن حنبل کی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زکریاؑ نے کسب معاش کیلئے بخاری کا پیشہ اختیار فرما رکھا تھا۔حضرت زکریاؑ کی زوجہ الیشبع (ELIZABETH) کی ایک بہن کا نام حنہ بنت فاقوذا تھا جنکے شوہر جناب عمران تھے جو نہایت بزرگ شخصیت اور بہت بڑے کاہن تھے۔عمران نامی دو شخصیات گزری ہیں ایک عمران بن یصہر بن فاہث بن لادی بن یعقوبؑ۔یہ عمران حضرت موسٰیؑ اور حضرت ہارونؑ کے والد ہیں۔دوسرے عمران جو مذکورِ حال ہیں وہ عمران بن ماثان ہیں اور حضرت زکریاؑ کے ہم زلف یعنی حضرت زکریاؑ کی زوجہ محترمہ الیشبع (ELIZABETH) بنت فاقوذا کی سگی بہن محترمہ حنہ بنتِ فاقوذا کے شوہر ہیں۔دونوں عمرانوں کے عہد میں ایک ہزار آٹھ سو برس کا فرق ہے۔

حنہ جب امید سے تھیں تو انہوں نے زمانہ کے دستور کے مطابق منت مانی کہ جو بچہ میرے بطن سے ہوگا اسے میں "محرر" کروں گی یعنی اللہ کے نام پر آزاد کروں گی اور وہ تمام دنیوی مشاغل اور قیدِ نکاح سے آزاد رہ کر ہمیشہ کیلئے صرف خدا کی عبادت اور بیت المقدس کی خدمت کیلئے وقف رہے گا۔

سورۃ آل عمران میں ارشادِ ربانی ہے:۔

اِذْ قَالَتِ امْرَاَةُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۚ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (آل عمران :۳۵)

ترجمہ:۔جب کہا عمران کی بیوی نے اے میرے پروردگار جو (بچہ) میرے بطن میں ہے میں اسے تیری نذر کرتی ہوں میری طرف سے قبول فرما بیشک تو ہی سننے اور جاننے والا ہے (۳۵)

علماء نے یہ واقعہ یوں ذکر کیا ہے کہ حضرت زکریّا اور عمران دونوں ہم زلف تھے فاقوذا کی دختر الیشبع (ELIZABETH) جو حضرت یحییٰ کی والدہ اور حضرت زکریّا کی زوجہ محترمہ ہیں' جنکی سگی بہن حنہ ہیں جو فاقوذا کی دوسری دختر اور حضرت مریّم کی والدہ ہیں۔ایک عرصہ تک حنہ کے اولاد نہیں ہوئی یہاں تک کہ بڑھاپا آ گیا اور اولاد کی طرف سے بالکل مایوسی ہوگئی۔ یہ صالحین کا خاندان تھا اور یہ سبھی لوگ اللہ کے مقبول بندے تھے۔ایک روز حنہ نے درخت پر ایک چڑیا دیکھی جو اپنے بچہ کو بھرا رہی تھی یہ دیکھ کر آپکے دل میں شدت سے اولاد کی خواہش پیدا ہوئی اور آپ نے بارگاہِ الٰہی میں دعا کی کہ اے رب اگر تو مجھے بچہ دے تو میں اسے تیری نذر کروں اور بیت المقدس کی خدمت کیلئے وقف کردوں۔ جب وہ حاملہ ہوئیں تو انہوں نے حسب نیت یہ نذر مان لی۔

اس پر حنہ کے شوہر عمران نے فرمایا کہ حنہ یہ تم نے کیا کیا' اگر لڑکی ہوئی تو وہ اس قابل کہاں ہوگی کہ اسے نذر کے مطابق بیت المقدس کی خدمت کیلئے وقف کیا جاسکے (کیونکہ اُس زمانہ میں صرف لڑکوں ہی کو بیت المقدس کی خدمت کیلئے دیا جاتا تھا جبکہ لڑکیاں عوارض نسائی' زنانہ کمزوریوں اور مردوں کے ساتھ نہ رہ سکنے کی بناء پر اس قابل نہیں سمجھی جاتی تھیں) اسلئے عمران کو تشویش لاحق ہوئی اور پھر حنہ کے وضع حمل سے قبل ہی عمران کا انتقال ہوگیا۔

اتفاق سے حنہ کے ہاں لڑکی ہی تولد ہوئی جس پر حنہ کو بھی تشویش لاحق ہوئی کہ میں نے جو نذر مانی تھی اس کا کیا ہوگا اور وہ کیونکر پوری ہوگی۔ چنانچہ حنہ نے بارگاہ الٰہی میں استدعا کی' جسے قرآن حکیم نے سورۃ ال عمران میں یوں بیان فرمایا:۔

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰی ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَلَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰی ۚ وَ اِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَ اِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِكَ وَ ذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ (ال عمران: ۳۶)

ترجمہ:۔ پھر جب اُسے جنا' (حنہ) بولی اے میرے رب یہ تو میں نے لڑکی جنی' اور اللہ کو خوب معلوم ہے جو کچھ وہ جنی اور وہ لڑکا جو اس نے مانگا اس لڑکی سا نہیں اور میں نے اس کا نام مریّم رکھا اور میں اس (بچی مریم) کو اور اسکی اولاد کو شیطان

مردود سے (محفوظ رکھنے کیلئے) تیری پناہ میں دیتی ہوں (آل عمران:۳۶)

اور یوں وعدہ کے مطابق حنہ نے اسے خدا کی نذر (یعنی بیت المقدس کی خدمت کیلئے وقف) کر دیا کہ خدا کی عبادت کے سوا کوئی دنیاوی کام اس کے متعلق نہ ہو اور صرف بیت المقدس کی خدمت اس کے ذمہ ہو۔ آیت متذکرہ میں ''تم نے جو لڑکا مانگا تھا وہ اس لڑکی سا نہیں'' سے مراد ہے کہ یہ لڑکی اللہ کی خاص عطا ہے اور اسکے فضل سے فرزند سے زیادہ فضیلت والی ہے یہ صاحبزادی حضرت مریمؑ اپنے زمانہ کی تمام عورتوں میں سب سے حسین و افضل تھیں اور اپنے نام کی مناسبت سے نہایت زاہدہ و عابدہ تھیں۔ حنہ کی اس عاجزانہ التجاء اور مریمؑ کو بمع اسکی اولاد اللہ کے سپرد کر دینے پر اللہ تعالیٰ نے حنہ کی یہ منت قبول فرمالی جسے سورۃ آل عمران کی ۳۷ ویں آیت مبارکہ میں یوں بیان فرمایا:۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّ اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ؕ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (آل عمران:۳۷)

ترجمہ:۔ تو اسے اس کے رب نے اچھی طرح قبول کیا اور اسے اچھا پروان چڑھایا اور اسے زکریا کی نگہبانی میں دیا' جب زکریا اس کے پاس اسکی نماز پڑھنے کی جگہ جاتے تو اس (مریم) کے پاس نیا رزق پاتے (ایک روز) کہا اے مریم یہ تیرے پاس کہاں سے آیا' بولیں وہ اللہ کے پاس سے ہے بیشک اللہ جسے چاہے بے گنتی رزق عطا فرمائے (آل عمران:۳۷)

جب حنہ نے اپنی نورِ چشم بیٹی حضرت مریمؑ کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر مطابق نذر بیت المقدس کے احباروں کے سامنے رکھا' تو تمام کے تمام احبار ہی حضرت مریمؑ کا تکفّل کرنے میں رغبت کا اظہار کرنے لگے۔ یہ احبار حضرت ھارونؑ کی اولاد میں سے تھے اور بیت المقدس میں انکا منصب ایسا تھا جیسا کہ کعبۃ اللہ میں حجبہ کا۔ چونکہ حضرت مریمؑ اُن احباروں کے امام اور انکے صاحب قربان کی دختر تھیں اور حضرت مریمؑ کا خاندان بنی اسرائیل میں بہت اعلیٰ اور اہل علم کا خاندان شمار ہوتا تھا اس لئے اُن سب نے جن کی کل تعداد ستائیس تھی حضرت مریمؑ کو کفالت میں لینے کی سر توڑ کوشش کی۔ حضرت زکریاؑ نے فرمایا کہ میں اسکی کفالت کا سب سے زیادہ حق دار ہوں کیونکہ میری زوجہ مریمؑ کی خالہ ہیں۔ نوبت یہاں

تک آ گئی کہ اس کیلئے باقاعدہ قرعہ ڈالا جانے کا فیصلہ ہوا' جو حضرت زکرّیا کے نام نکلا۔ یوں حضرت زکرّیا حضرت مرّیم کی کفالت کیلئے چنے گئے۔ حضرت زکرّیا جس پاکیزہ خاتون کی تربیت و کفالت کیلئے چنے گئے اسکی پاکدامنی اور علو مرتبی پر خداوند قدوس کی گواہی کی اہمیت کسی صاحب نصیب سے پوشیدہ نہیں۔ بایں قاعدہ حضرت زکرّیا کے مرتبہ کی شناخت بھی چنداں مشکل نہیں رہتی جو اس عظیم المرتبت خاتون کی تربیت پر متعین ہوئے۔ سورۃ انبیاء میں اسی ضمن میں فرمانِ پروردگار ہے:۔

وَ الَّتِیۡۤ اَحۡصَنَتۡ فَرۡجَهَا فَنَفَخۡنَا فِیۡهَا مِنۡ رُّوۡحِنَا وَ جَعَلۡنٰهَا وَ ابۡنَهَاۤ اٰیَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ (انبیاء: ۹۱)

ترجمہ:۔ اور اس عورت (مرّیم) کو جس نے اپنی پارسائی نگاہ میں رکھی (کہ پورے طور پر کوئی بشر اس کی پارسائی کو چھو نہ سکا) تو ہم نے اس میں (بذریعہ روح الامین) روح پھونکی اور اسکے بیٹے (حضرت عیسٰیؑ) کو سارے جہان کیلئے (بغیر باپ کے پیدا فرما کر اپنی قدرت کی) نشانی بنایا (انبیاء:۹۱)

اُدھر حضرت زکرّیا کی بیوی الیشبع (ELIZABETH) جو حضرت ھارونؑ کی نسل سے تھیں وہ بھی بانجھ تھیں۔ حضرت زکرّیا نے بھی بارگاہِ الٰہی میں اولادِ نرینہ کیلئے استدعا کی جو قبول فرمالی گئی۔ آپؑ عبادت گاہ میں نماز کے قیام میں تھے کہ وحی نازل ہوئی۔ سورۃ انبیاء کی درجہ ذیل آیات میں اسی بات کا ذکر فرمایا جارہا ہے۔ علاوہ ازیں قریباً ملتے جلتے مضمون والفاظ میں یہ تذکرہ سورۃ آل عمران اور سورۃ مریم میں بھی عطا فرمایا گیا ہے:۔

وَ زَکَرِیَّاۤ اِذۡ نَادٰی رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرۡنِیۡ فَرۡدًا وَّ اَنۡتَ خَیۡرُ الۡوٰرِثِیۡنَ (۸۹) فَاسۡتَجَبۡنَا لَهٗ ۫ وَ وَهَبۡنَا لَهٗ یَحۡیٰی وَ اَصۡلَحۡنَا لَهٗ زَوۡجَهٗ ؕ اِنَّهُمۡ کَانُوۡا یُسٰرِعُوۡنَ فِی الۡخَیۡرٰتِ وَ یَدۡعُوۡنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا ؕ وَ کَانُوۡا لَنَا خٰشِعِیۡنَ (الانبیاء: ۸۹/ ۹۰)

ترجمہ:۔ اور زکریا نے جب اپنے رب کو پکارا کہ اے میرے رب مجھے اکیلا (بلا وارث) نہ چھوڑ اور تو سب سے بہترین وارث ہے (انبیاء:۸۹) تو ہم نے اسکی دعا قبول کی اور اسے یحیٰی

(نامی ایک بیٹا) عطا فرمایا اور اس کیلئے اسکی زوجہ (بانجھ پن دور کر کے) سنواری بیشک وہ بھلے کاموں میں جلدی کرتے تھے اور ہمیں پکارتے تھے امید سے اور خوف سے اور ہمارے حضور گڑگڑاتے ہیں (انبیاء:۹۰)

آیت متذکرہ میں حضرت زکریا کی بیوی کو سنوارنا بیان ہوا ہے جس کے معنی ہیں کہ اس کے بانجھ پن کو قابل اولاد بنا دیا۔ اسی نوع کے مضمون کو سورۃ مریم میں یوں ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا(۲) اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا(۳) قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَ اشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّ لَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا(۴) وَ اِنِّيْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَآءِيْ وَ كَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا (۵) يَّرِثُنِيْ وَ يَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۫ وَ اجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا(مریم: ۲تا۶)

ترجمہ:۔ یہ مذکور ہے تیرے رب کی اس رحمت کا جو اس نے اپنے بندہ زکریا پر کیا (۲) جب اس نے اپنے رب کو آہستہ سے پکارا (۳) عرض کی اے میرے رب میری ہڈی (بوجہ پیرانہ سالی) کمزور ہوگئی اور سر سے بڑھاپے کا بھبھوکہ پھوٹا (کہ بال سفید ہوگئے) اور میرے رب میں تجھے پکار کر کبھی نامراد نہیں رہا (۴) اور مجھے اپنے بعد اپنے قرابت والوں کا ڈر ہے (کہ میرے علم و ابلاغ کو تحریف و نابود نہ کر ڈالیں) اور میری زوجہ بانجھ ہے (اس لئے) تو مجھے اپنے پاس سے کوئی ایسا (وارث) دے ڈال جو میرا کام اٹھالے (۵) وہ میرا جانشین ہو اور اولادِ یعقوب کا وارث ہو اور اے میرے رب اسے (اپنا) پسندیدہ کر (مریم: ۲تا۶)

حضرت زکریا نے یہ دعا مانگی جو بارگاہ رب العزت میں مستجاب ہوئی۔ اس پر فرمان ہوا:۔

يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ۨاسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا(۷) قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ كَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّ قَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا(۸) قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّ قَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ تَكُ شَيْـًٔا(۹) قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا(۱۰) فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّ

عَشِیًّا (مریم:۷ تا ۱۱)

ترجمہ:۔اے زکریا ہم تجھے یحییٰ نامی ایک لڑکے کی خوشخبری سناتے ہیں اس سے پہلے ہم نے اس نام کا کوئی نہ کیا(۷)(حضرت زکریا نے) عرض کیا اے میرے رب مجھے لڑکا کہاں سے ہوگا میری عورت تو بانجھ ہے اور میں بڑھاپے سے سوکھ جانے کی حالت کو پہنچ گیا(۸) فرمایا ایسا ہی ہے (تم دونوں سے ہی ہوگا) تیرے رب نے فرمایا وہ مجھے آسان ہے اور میں نے تو تجھے (بھی) اس سے پہلے اس وقت بنایا جب تو کچھ بھی نہ تھا(۹) عرض کی (زکریا نے) اے رب مجھے کوئی نشانی دے (جس سے مجھے اپنی زوجہ کے حاملہ ہونے کی معرفت ہو) فرمایا تیری نشانی یہ ہے کہ تو چنگا بھلا ہوتے ہوئے بھی تین رات دن لوگوں سے کلام نہیں کریگا(۱۰) پھر مسجد سے باہر (نکل کر) اپنی قوم میں آیا تو انہیں اشارہ سے کہا کہ صبح و شام تسبیح کرتے رہو (مریم:۷ تا ۱۱)

اسی نوع کا کلام سورۃ ال عمران میں یوں ارشاد ہوا:۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ(۳۸) فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّ حَصُوْرًا وَّ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ(۳۹) قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ قَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ(۴۰) قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّ سَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِبْكَارِ ع (ال عمران:۳۸ تا ۴۱)

ترجمہ: یہاں پکار از کرّیا اپنے رب کو بولا اے میرے رب مجھے اپنی جناب سے کوئی ستھری اولاد دے بے شک تو ہی دعا سننے والا ہے (۳۸) تو فرشتوں نے اسے آواز دی اور وہ اپنی نماز کی جگہ نماز پڑھ رہا تھا بیشک اللہ آپکو مژدہ دیتا ہے یحییٰ کا جو اللہ کی طرف سے ایک کلمہ (عیسیٰؑ) کی تصدیق کریگا اور سردار (ہوگا) اور

ہمیشہ کیلئے عورتوں سے بچنے والا اور نبی ہمارے خاصوں میں سے (۳۹) عرض کیا اے میرے رب مجھے لڑکا کہاں سے ہوگا مجھے تو بڑھاپا پہنچ گیا اور میری عورت بانجھ ہے تو فرمایا اللہ یونہی جو چاہے کرتا ہے (۴۰) عرض کی اے میرے رب میرے لئے کوئی نشانی کردے تو فرمایا تیری نشانی یہ ہے کہ تو لوگوں سے تین دن بات نہ کرے مگر اشارے سے اور اپنے رب کی بہت یاد کر اور شام وصبح اسکی پاکی بول (آل عمران: ۳۸ تا ۴۱)

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ حضرت زکریّا لوگوں سے گفتگو کرنے سے معذور رہے اور زبان تین روز تک بند رہی مگر تسبیح وذکر پر آپ قادر رہے اور یہ ایک عظیم معجزہ ہے کہ جس میں تمام جوارِح صحیح وسالم ہوں اور زبان سے تسبیح وتقدیس کے کلمات بھی ادا ہوتے رہیں مگر لوگوں کے ساتھ گفتگو نہ ہوسکے اور یہ علامت اس لئے مقرر فرمائی گئی کہ اس نعمت عظیمہ کے ادائے حق میں زبان سوائے شکر کے کسی اور بات میں مشغول نہ ہو۔

ادھر قومِ بنی اسرائیل نے حسب عادت فساد کھڑا کر رکھا تھا اور بے شرع چلنے لگے تھے۔ حضرت زکریّا انہیں وعظ ونصیحت اور خدا کا خوف دلانے کی بہت کوشش کرتے مگر وہ شقاوت ازلی کے شکار کچھ بھی ماننے کو تیار نہ ہوئے بلکہ بدکلامی اور گستاخی کے مرتکب ہونے لگے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ یہودی آپکو ہلاک کرڈالنے کے فیصلے پر متفق ہوگئے۔ جب آپؑ نے انکے تیور دیکھے تو ان ظالموں سے بچنے میں جنگل کی طرف نکل گئے۔ دشمنوں نے آپکا پیچھا کیا تو آپؑ کو ایک درخت سے پناہ حاصل کرنے کے علاوہ کچھ نہ سوجھا چنانچہ اس درخت کو حکم دیا کہ مجھے دشمنوں سے بچاؤ اور اپنے اندر پناہ دو۔ چنانچہ اسکے تنے میں گھس گئے۔ ایک نبی کیلئے سوائے خدا کسی سے مدد طلب کرنا خدا تعالیٰ کو پسند نہ آیا۔ بدبخت یہودی برابر پیچھا کررہے تھے' اُس درخت کے پاس پہنچے تو حضرت زکریّا کو غائب پایا۔ آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے کہ ابھی ابھی تو اسے یہیں دیکھا تھا آخر یک دم کہاں غائب ہوگیا۔ اسی اثنا میں کسی نے آپکے پاؤں کے نشان اس تنے تک جاتے ہوئے پہچان لئے پھر انہوں نے بڑا آرا منگوا کر تنے کو درمیان سے اُوپر تا نیچے تک چیر ڈالا اور آپکو شہید کرڈالا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے سنا تو

حضرت زکریا علیہ السلام کی قبر مبارک

کہا۔"اناللہ وانا الیہ راجعون"۔حضرت زکرؑیا کے زُہدوتقویٰ،ھدایت وراستبازی کے بارے قرآن حکیم اورانجیل مقدس گواہ ہیں۔قرآن مجید میں حضرت زکرؑیا کا ذکر چار سورتوں میں اٹھارہ جگہ آیا ہے جو درجِ ذیل ہے:

سورۃ آلِ عمران ۳۷تا۴۱ سورۃانعام ۸۵ سورۃانبیاء ۸۹، ۹۰ سورۃ مریم ۲تا۱۱

حضرت یحییٰ علیہ السلام

حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت زکریا کے فرزند ارجمند اور اُنکی پیغمبرانہ دعاؤں کا ماحاصل تھے۔آپؑ اُن خوشبخت ہستیوں میں سے ہیں جن کا اسم مبارک خود پروردگارِ عالم نے رکھا۔اس سے قبل یہ نام آپکے خاندان میں کسی کا نہ تھا۔جیسا کہ سورۃ مریم کی آیت نمبرے میں ارشادِ رب العالمین ہے کہ:۔

''اے زکریا بیشک ہم تجھے بشارت دیتے ہیں ایک فرزند کی جس کا نام یحییٰ ہوگا کہ اس سے پہلے ہم نے یہ نام کسی کا نہیں ٹھہرایا ہے''۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰؑ سے صرف چھ ماہ بڑے تھے۔آپکی پیدائش بھی بطورِ خود ایک معجزہ ہے کہ آپکے والد مکرم حضرت زکریاؑ بہت ضعیف و ناتواں اور بوڑھے ہو چکے تھے اور آپکی والدہ بھی بانجھ تھیں۔مگر حضرت مریمؑ کی خرق عادت پیدائش دیکھ کر بارگاہِ الٰہی میں خلوص دل سے ایک وارثِ نبوت کی دعا کی جو سورۃ انبیاء کی آیت ۸۹ میں ہے کہ:۔

''اے میرے پروردگار مجھے تنہا (بے وارث) نہ چھوڑ تو سب سے بہتر وارث ہے''۔

اس دعا کی قبولیت کے نتیجہ میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی۔حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بچپن کے بارے کہا جاتا ہے کہ آپؑ صغرسنی میں ہی جنگلوں میں چلے گئے تھے اور تقریباً ساری زندگی جنگلوں ہی میں بسر فرمائی۔انجیل لوقا میں ہے کہ:۔

''اور وہ لڑکا بڑھتا اور روح میں قوت پاتا گیا اور بنی اسرائیل میں ظاہر ہونے تک جنگلوں میں رہا''۔(باب ۱/۸۰) یہ جنگل یہودیہ کے بیابان تھے۔انجیل متی میں ہے ''اُن دنوں یوحنا بپتسمہ دینے والا آیا اور یہودیہ کے بیابانوں میں منادی کرنے لگا''۔(باب ۳/۱)

بپتسمہ ایک قسم کی مذہبی رسم تھی کہ جو شخص آپکی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے گناہوں سے توبہ کرتا اور آپؑ کی تعلیمات پر چل کر آئندہ گناہوں سے مجتنب رہنے کا عہد کرتا' آپؑ اسکے سر پر دریائے یردن کا پانی چھڑک کر اسکے حق میں دعائے خیر و برکت فرماتے' یہ بپتسمہ کہلاتا تھا۔انجیل لوقا میں ہے:۔

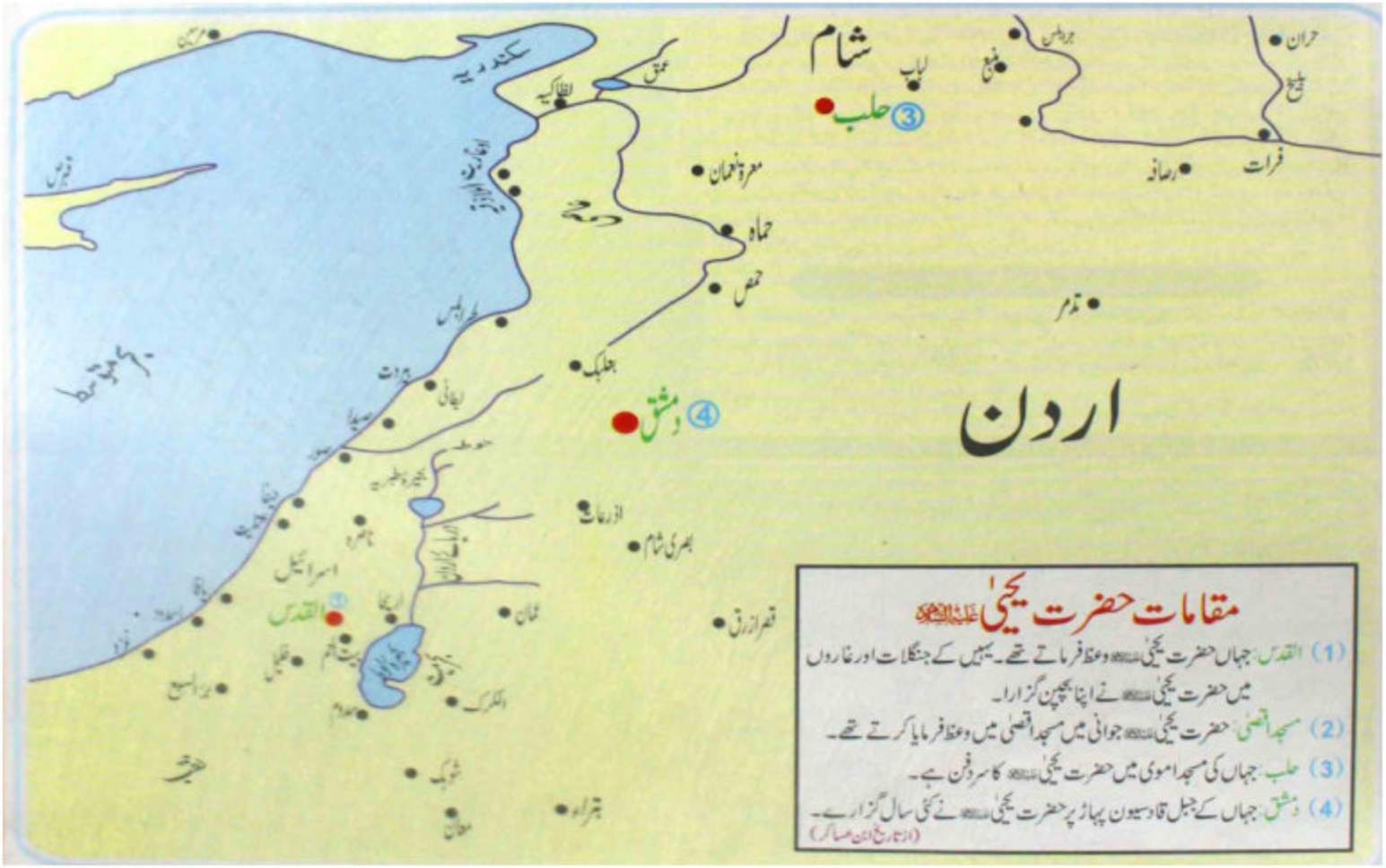

مقامات حضرت یحییٰ علیہ السلام

(1) القدس: جہاں حضرت یحییٰ علیہ السلام وعظ فرماتے تھے۔ یہیں کے جنگلات اور غاروں میں حضرت یحییٰ علیہ السلام نے اپنا بچپن گزارا۔

(2) مسجد اقصیٰ: حضرت یحییٰ علیہ السلام جوانی میں مسجد اقصیٰ میں وعظ فرمایا کرتے تھے۔

(3) حلب: جہاں کی مسجد اموی میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر دفن ہے۔

(4) دمشق: جہاں کے جبل قاسیون پہاڑ پر حضرت یحییٰ علیہ السلام نے کئی سال گزارے۔

(از تاریخ ابن عساکر)

''اُس وقت خدا کا کلام بیابانوں میں زکریا کے بیٹے یوحنا پر نازل ہوا۔ یوحنا اونٹ کے بالوں کی پوشاک پہنے چمڑے کا پٹکا اپنی کمر سے باندھے رہتا تھا اور اس کی خوراک ٹڈیاں اور جنگلی شہد تھا''۔ (انجیل باب ۳/۲۔۳)

حضرت یحییٰ علیہ السلام نیکوں کے سردار نہایت رقیق القلب اور زُہد و ورع میں بیمثال تھے۔ آپؑ نے تمام عمر شادی نہیں کی اور نہ ہی آپکے دل میں گناہ کا خطرہ پیدا ہوا۔ اپنے والد بزرگوار کی طرح آپؑ بھی خدا کے برگزیدہ نبی تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپکو بچپن ہی میں علم و حکمت سے معمور کر دیا تھا۔ آپکی زندگی کا ایک مقصد حضرت عیسیٰؑ کی بشارت اور انکی نبوت پر گواہی دینا اور انکی تبلیغ اور رشد و ھدایت کیلئے ماحول کو سازگار بنانا تھا۔ آپؑ نے جہاں حضرت عیسیٰؑ کی بشارت و تصدیق فرمائی وہیں آپؑ نے اپنے منصب نبوت کو نبھاتے ہوئے توراۃ کی تعلیم اور شریعت موسوی کی احیاء بھی فرمائی۔ سورۃ ال عمران میں آپکو ''سید'' اور ''حصور'' فرمایا گیا ہے۔

''کتب سیر میں ''سید'' کے مختلف معنی منقول ہیں۔ مثلاً دین و دنیا کا سردار، عالم و فقیہ، حلیم و شریف، پرہیزگار اور اللہ کے نزدیک برگزیدہ و پسندیدہ۔ اسی طرح ''حصور'' کے معنی بھی مختلف نہیں کہ وہ شخص جو عورت کے قریب تک نہ گیا ہو، جو ہر قسم کی معصیت سے محفوظ ہو اور اس کے قلب میں معصیت کا خطرہ تک نہ گزرتا ہو، جو شخص اپنے نفس پر پوری طرح قابو رکھتا ہو اور خواہشاتِ نفس کو روکتا ہو''۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۳۶۱)

آپؑ نہایت رقیق القلب ہونے کے باعث خشیت الٰہی کے سبب اکثر و بیشتر روتے رہتے تھے یہانتک کہ آپکے رخساروں پر آنسوؤں کی لڑیوں کے نشان پڑ گئے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت زکریاؑ آپکو تلاش کرتے ہوئے جنگل میں آئے اور فرمایا ''اے جانِ پدر ہم تمہاری یاد میں مضطرب ہیں اور تم یہاں بیٹھے آنسو بہا رہے ہو''۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے جواب دیا ''اے محترم باپ آپ ہی نے مجھے بتایا ہے کہ جنت اور دوزخ کے درمیان ایک لق و دق میدان ہے جو خدا کے خوف میں آنسو بہائے بغیر طے نہیں ہوتا اور جنت تک رسائی نہیں ہوتی''۔ یہ سن کر حضرت زکریاؑ بھی اشک بار ہو گئے۔

مسند احمد' ترمذی' ابن ماجہ وغیرہ میں حارثؓ اشعری سے منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔ اللہ تعالیٰ نے یحییٰ بن زکریاؑ کو ان پانچ باتوں کا خاص طور پر حکم فرمایا کہ وہ ان پر خود بھی عمل پیرا ہوں اور بنی اسرائیل کو بھی ان کی تلقین کریں۔ پہلا حکم یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو اور کسی کو اسکا شریک و سہیم نہ ٹھہراؤ۔ دوسرا حکم یہ تھا کہ نماز خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرو۔ تیسرا حکم روزہ رکھنے کا تھا' اس لئے کہ روزہ دار کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص مشک کی تھیلی لئے لوگوں کی جماعت میں بیٹھا ہو۔ چوتھا حکم مال میں سے صدقہ نکالنے کا تھا۔ پانچواں حکم یہ تھا کہ دن رات کثرت سے اللہ کا ذکر کرتے رہو' کیونکہ ایسے شخص کی مثال اس شخص جیسی ہے جو دشمن سے بھاگ رہا ہو' اور دشمن تیزی سے اسکا تعاقب کر رہا ہو' مگر وہ بھاگ کر کسی مضبوط قلعہ میں پناہ لے لے۔ بلاشبہ انسان کے دشمن' شیطان' کے مقابلہ میں اللہ کے ذکر میں مشغول ہو جانا محکم قلعہ میں محفوظ ہو جانا ہے۔

یہودی حضرت یحییٰ علیہ السلام کی برگزیدگی اور مقبولیت سے حسد کرنے لگے تھے پھر جب آپؑ نے باقاعدہ خدا کے دین کی منادی شروع کر دی اور لوگوں کو بتایا کہ مجھ سے بڑھ کر خدا کا ایک اور پیغمبر آنے والا ہے جو صاحب کتاب ہوگا اور اپنی شریعت لائیگا' تو یہودیوں کی یہ مخالفت عداوت و دشمنی میں بدل گئی۔ ایک دن تنگ آ کر وہ آپکے پاس آئے اور سوال کیا' کیا آپ مسیح ہیں؟ آپنے فرمایا نہیں۔ پھر پوچھنے لگے کیا آپ وہ نبی نہیں جس کا اعلان کرتے ہیں؟ آپنے فرمایا نہیں۔ تو انہوں نے پوچھا کیا آپ ایلیا نبی بھی نہیں؟ جواب دیا کہ نہیں۔ اس پر وہ جھلا گئے اور غصے میں بولے پھر آخر کونسے نبی ہیں جو اس طرح منادی کرتے پھرتے ہیں۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا:۔ ''میں جنگل میں پکارنے والے کی آواز ہوں جو حق کیلئے بلند کی گئی ہے''۔ یہ سن کر یہودی بھڑک اٹھے اور بالآخر انہوں نے آپؑ کو شہید کر ڈالا۔

ابن عساکر نے آپکی شہادت کا واقعہ یوں نقل کیا ہے کہ دمشق کے بادشاہ ہداد ین حدرانے اپنی چہیتی ملکہ کو غصہ میں مطلق طلاق دیدی تھی اور اب دوبارہ اسے اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے اس معاملہ میں فتویٰ طلب کیا تو حضرت یحییٰ نے اسکی اجازت دینے سے انکار کر دیا اور صاف طور پر کہہ دیا کہ بادشاہ پر ملکہ حرام ہے۔ بادشاہ چونکہ آپکی بہت عزت کرتا تھا اسلئے خاموش ہو کر بیٹھ رہا مگر ملکہ کو یہ بات

قبۃ الصخرہ نامی جگہ۔ جہاں ایک قول کے مطابق حضرت یحییٰ ؑ کو ذبح کیا گیا

سخت ناگوار گزری اور وہ آپکے قتل کے درپے ہوگئی۔اس نے یہودیوں سے سانٹھ گانٹھ کر کے آپکے قتل کا منصوبہ بنالیا اور ایک روز جب آپؑ مسجد جبرون میں نماز ادا کر رہے تھے ان ظالموں نے آپکو قتل کر دیا اور ملکہ کی خواہش کے مطابق آپکا سر مبارک چینی کے طشت میں رکھ کر اسکے سامنے پیش کیا۔

مفسرین کا کہنا ہے کہ اس وقت بھی سر مبارک سے یہی آواز آئی کہ ملکہ بادشاہ کیلئے حرام ہے' تاوقتیکہ کسی دوسرے سے شادی نہ کرے۔کہتے ہیں اس آواز کے چند لمحوں بعد ہی اس جگہ سے زمین پھٹ کر واپس مل گئی جس سے ملکہ اور آپکا سر مبارک زمین میں دفن ہوگئے۔علمائے سیر و تاریخ کا آپکی جائے شہادت پر کچھ اختلاف ہے' بعض کے نزدیک آپکی شہادت بیت المقدس میں ہیکل اور قربان گاہ کے درمیان ہوئی جہاں یہودیوں نے اس سے پیشتر بھی ستر انبیاء کو شہید کیا تھا۔البتہ جب سر مبارک طشت میں رکھ کر ملکہ کے پاس پہنچا تو ملکہ یہیں موجود تھی اور زمین دھنسنے کا متذکرہ واقعہ یہیں پیش آیا۔

تصریحات کے مطابق حضرت عیسٰیؑ سے آپکی ملاقات گلیلی کے شہر ناصریہ میں دریائے یرون کے ساحل پر ہوئی۔حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت اقم میں ہوئی اور آپکی شہادت کا واقعہ ۳۰ء میں پیش آیا۔اُس وقت حضرت عیسٰیؑ کی عمر ۳۲/۳۳ سال بتائی گئی ہے۔صحیح بخاری میں حضرت مالک بن صعصہؓ کی روایت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفر معراج میں دوسرے آسمان پر پہنچے تو وہاں آپکی ملاقات حضرت یحییٰ علیہ السلام سے ہوئی جہاں حضرت عیسٰیؑ بھی آپکے ساتھ تھے۔قرآن حکیم میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کا ذکر اِن آیات میں آیا ہے۔

سورۃ آل عمران ۳۸ تا ۴۱ سورۃ مریم ۵ تا ۱۵ سورۃ انبیاء ۹۰

حضرت ذوالکفل علیہ السلام

آپ کا ذکر مبارک صرف قرآن حکیم میں مذکور ہے اور دیگر کسی آسمانی کتاب میں نہیں۔ توراۃ آپکے متعلق بالکل خاموش ہے البتہ قرآن حکیم کی سورۃ انبیاء میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وَ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِدۡرِیۡسَ وَ ذَا الۡکِفۡلِ ؕ کُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِیۡنَ (۸۵) وَ اَدۡخَلۡنٰہُمۡ فِیۡ رَحۡمَتِنَا ؕ اِنَّہُمۡ مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ (الانبیاء:۸۵/۸۶)

ترجمہ:۔اور اسمٰعیل اور ادریس اور ذوالکفل سب راہِ حق میں صبر کرنے والے تھے (۸۵) ہم نے انہیں اپنی رحمت کے سائے میں لے لیا بیشک وہ نیک بندوں میں سے تھے (انبیاء: ۸۶)

علامہ ابن جریر نے مشہور تابعی مجاہدؒ کے حوالے سے حضرت ذوالکفل کے متعلق جو واقعات بیان کیے ہیں انکے مطابق آپؑ حضرت الیسع علیہ السلام کے خلیفہ اور جانشین تھے۔ جب اسرائیلی نبی حضرت الیسع علیہ السلام بہت بوڑھے ہوگئے تو ایک دن متفکرانہ انداز میں فرمانے لگے کاش میری زندگی ہی میں کوئی شخص ایسا ہوتا جو میرا قائم مقام ہوسکتا اور مجھے اطمینان ہوجاتا کہ وہ میری صحیح نیابت کرنے کا اہل ہے۔ اس کے بعد حضرت الیسع علیہ السلام نے بنی اسرائیل کا اجتماع کیا اور فرمایا کہ میں تم سے ایک شخص کو اپنانا چاہتا ہوں بشرطیکہ وہ مجھ سے تین باتوں کا وعدہ کرے۔ اوّل دن بھر روزہ رکھے دوم تمام شب یادِ خدا میں مصروف رہے اور سوم کبھی دل میں غصہ نہ لائے۔ یہ سن کر ایک شخص نے (جو بظاہر بے وقعت سا دکھائی دیتا تھا) کھڑے ہوکر کہا کہ میں حاضر ہوں اور میں یہ تمام شرائط پوری کرونگا۔ حضرت الیسع علیہ السلام نے محفل برخاست کرتے ہوئے سب کو دوسرے روز پھر جمع ہونے کا حکم دیا۔ دوسرے روز بھی اپنی تینوں شرائط دھرائیں تو پھر وہی شخص کھڑا ہوکر اقرار کرنے لگا۔ تیسرے روز پھر یہی شرائط دھرائی گئیں اور تیسرے روز بھی وہی شخص کھڑا ہوا تب آپنے بنی اسرائیل میں سے اس شخص کو اپنا خلیفہ منتخب کرلیا۔

خلیفہ کا معمول ہوگیا کہ رات جاگ کر عبادت الٰہی میں مصروف رہتا۔ علی الصبح روزے کی نیت کرکے تمام دن روزہ سے رہتا اور کچھ دیر کیلئے دوپہر کو قیلولہ کرتا۔ ابلیس جو شروع انتخاب کے وقت سے اس کے پیچھے لگا ہوا تھا چوکنا ہوگیا اور اس نے خلیفہ کو پریشان کرنا شروع کردیا۔ ایک روز عین دوپہر کو

مقام تبليغ حضرت ذوالكفل عليه السلام
الآراميون
باهية الشام
الآراميـــون
الفينيقيون
دمشق
الصوريون
الأموريون
الكنعانيون
الصهيونيون
البحر الكبير
(المتوسط)
مقياس الرسم
صفر
٥٠
١٠٠
كـ١٥م

پراگندہ حال بوڑھے کی شکل بنائے خلیفہ کے دروازے پر پہنچا اور دستک دی۔ آپ باہر تشریف لائے تو اس نے بڑے دلدوز لہجے میں اپنی کتھا سنانی شروع کی کہ میری اور میری قوم کے درمیان خصومت ہے انہوں نے مجھ پر ظلم روا رکھا ہوا ہے وغیرہ وغیرہ اور داستان کو اتنا طول دیا کہ خلیفہ کے قیلولہ کا وقت نکل گیا۔ خلیفہ نے اسے کہا کہ اب تم جاؤ اور شام کی مجلس میں آنا تاکہ تمہاری دادرسی کی جائے۔ ابلیس چلا گیا مگر شام کو نہ آیا۔ دوسرے روز جب آپ قیلولہ فرمانے لگے تو یہ پھر آ ٹپکا۔ دستک دینے پر آپ نے دروازہ کھولا تو اس نے کل کی طرح پھر گفت وشنید کو اس قدر طول دیا کہ خلیفہ کے آرام کرنے کا وقت جاتا رہا۔ خلیفہ نے پھر اسے جانے اور شام کے وقت مجلس میں آنے کا کہا۔ مگر وہ اس شام بھی مجلس میں نہ پہنچا۔ تیسرے روز جب نیند نے عاجز کر دیا تو خلیفہ نے اہل خانہ کو کہا کہ کوئی بھی آئے میرے قیلولہ کے دوران کوئی دروازہ نہ کھٹکھٹائے اور نہ ہی کسی کو مجھے ملنے کیلئے آنے دیا جائے۔ تیسرے روز ابھی خلیفہ لیٹا ہی تھا کہ وہ پھر آ گیا اور دروازہ کھٹکھٹانے کی کوشش کرنے لگا مگر اسے یہی جواب ملا کہ اس وقت ان سے کسی کی ملاقات نہیں ہو سکتی۔ جب دروازہ نہ کھلا تو ابلیس کسی پراسرار طریقے سے اندر داخل ہو گیا جس سے خلیفہ جاگ پڑے اور حقیقت حال سمجھ گئے۔ کہنے لگے تو ابلیس ہی ہے نا۔ ابلیس نے کہا ہاں' تو نے مجھے تھکا دیا میری ذریت کسی طرح تمہیں روزے اور شب بیداری سے نہ روک سکی تو میں نے آخری حربہ یہ اختیار کیا کہ تمہیں غضب ناک کروں اور تمہیں ایفائے عہد کی تیسری شرط میں ناکام بنا دوں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں خود ہی ناکام رہا ہوں۔ یوں اس خلیفہ نے جو تکفل حضرت الیسع علیہ السلام سے کیا تھا اسکو پورا کر دکھایا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو ذوالکفل کے خطاب سے یاد فرمایا۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۱۹۰' ۱۹۱)

امام طبریؒ نے حضرت ذوالکفل کو حضرت ایوبؑ کا بیٹا بتایا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں کہ آپ کا نام بشر تھا اور ذوالکفل آپکا لقب تھا آپ کے بیٹے کا نام ابدان تھا۔ آپؑ نے ۷۵ سال عمر پائی اور ایک شخص کا ضامن بن کر برسوں قید و مشقت برداشت کی۔ (طبری ج ۱ ص ۶۷)

شاہ عبدالقادر محدثؒ دہلوی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ (موضح قرآن سورۃ انبیاء)

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ حضرت حزقیلؑ کا لقب ہے۔ اسکے علاوہ ایک مفسر کا دلچسپ اظہار یہ ہے کہ ذوالکفل گوتم بدھ کا لقب ہے۔ کیونکہ گوتم بدھ کا دارالحکومت کپل تھا جس کا معرب کفل ہے اور عربی زبان میں ''ذو'' صاحب' حامل' اور مالک کیلئے مستعمل ہے۔ اسی لئے مفسر نے صاحبِ کفل یا شاہِ کفل کو ذوالکفل کہا ہے۔ اگرچہ مورخین کی اکثریت یہ بات تسلیم نہیں کرتی لیکن جس طرح گوتم بدھ نے اپنی بادشاہی چھوڑ کر ویرانہ اختیار کیا اور لوگوں کو بت پرستی سے منع کیا اور بہت حد تک لوگوں کو اس قبیح شرک سے روک بھی دیا تھا۔ کہا نہیں جاسکتا کہ وہ کوئی اوتار یا پیغمبر نہ ہوں۔ حضرت ذوالکفلؑ بہرحال بروئے قرآن انبیاء کی صف میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ سورۃ صٓ میں ارشادِ رب العالمین ہے:۔

وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَ الْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ؕ وَ كُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ (۴۸)

ترجمہ:۔ اور یاد کرو اسمٰعیل اور الیسع اور ذوالکفل کو یہ سب نیکوکار تھے (ص:۴۸)

اس سے جہاں یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت الیسع علیہ السلام اور حضرت ذوالکفلؑ دو الگ الگ شخصیتیں ہیں وہاں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ذوالکفلؑ کی بعثت حضرت الیسع علیہ السلام کے بعد ہوئی۔

حضرت ذوالکفلؑ کا ذکر قرآن حکیم میں اِن سورتوں میں آیا ہے۔

سورۃ انبیاء ۸۵، ۸۶

سورۃ صٓ ۴۸

سورۃ عنکبوت (اجمالاً) ۲۷

حضرت مریم علیہا السلام

قرآن کریم میں حضرت مریمؑ کی خرقِ عادت پیدائش کا واقعہ تفصیل کے ساتھ سورۃ آلِ عمران میں بیان ہوا ہے۔ آپؑ ایک پاکباز اور خدا رسیدہ خاتون تھیں اور سیدنا حضرت عیسٰیؑ کی والدہ ہونے کا اعزاز الگ سے آپکے سر پر سجے تاج کا قیمتی ہیرا ہے۔ آپکی پرورش و تربیت حضرت زکریاؑ جیسی ہستی کے زیرِ سرپرستی بیت المقدس میں ہوئی۔ اگرچہ یہاں چاروں اناجیل پیدائش کی پوری تفاصیل بیان کرنے میں ساکت ہیں تاہم پوری تفصیلات قرآن حکیم سے مہیا ہو چکی ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد رقمطراز ہیں:۔

> ''انیسویں صدی میں متروک اناجیل کا جو نسخہ ویٹکان کے کتب خانہ سے برآمد ہوا' اس نے حضرت مریمؑ کی پیدائش کا یہ مفقود ٹکڑا مہیّا کر دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم چوتھی صدی عیسوی کے اوائل تک سرگزشت کا یہ ٹکڑا بھی اسی طرح الہامی یقین کیا جاتا تھا جس طرح بقیہ ٹکڑے یقین کیے جاتے تھے۔
>
> (ترجمان القرآن ج ۲ ص: ۴۴۳، ۴۴۴)

حضرت مریمؑ کی پیدائش کے واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں عمران بن ماثان نامی ایک بزرگ کاہن تھے جن کی بیوی کا نام حنہ بنت فاقوذا تھا۔ جبکہ حنہ کی سگی بہن الیشبع (ELIZABETH) بنتِ فاقوذا حضرت زکریاؑ کی زوجیت میں تھیں جن سے حضرت یحییٰ علیہ السلام تولد ہوئے۔ پچھلے صفحات میں بھی لکھا جا چکا ہے کہ حنہ بنت فاقوذا بانجھ تھیں۔ انہوں نے اپنی عمر عزیز کے آخری ایام میں یہ منت مانی کہ اگر میرے ہاں اولاد ہوئی تو میں اسے ہیکل کی خدمت کیلئے وقف کر دوں گی۔ بیت المقدس اور اس میں واقع ہیکل کی خدمت یہود کے نزدیک ایک مقدس مذہبی رسم تھی۔ حنہ کی دعا قبول ہوئی اور آپ کے بطن سے حضرت مریمؑ پیدا ہوئیں۔ حنہ قدرے دلگیر ہوئیں کہ ہیکل کی خدمت کیلئے تو صرف لڑکوں کو ہی قبول کیا جاتا ہے یہ منت کیونکر پوری ہوگی۔ سو بارگاہِ الٰہی میں التجاء کی کہ اے رب میرے ہاں تو لڑکی پیدا ہوئی ہے تو جواب ملا کہ اللہ کو خوب معلوم ہے جو تم نے جنا ہے' اور وہ لڑکا جو تم امید کرتی تھی اس لڑکی کے پایہ کا ہرگز نہ ہوتا۔ اس پر حنہ نے عرض کیا میں نے اس کا نام مریمؑ رکھا ہے اور میں اس کو اور اسکی اولاد کو

شیطان مردود کے شر سے تیری حفظ و پناہ میں سونپتی ہوں۔(بحوالہ: آل عمران:۳۶)

اللہ تعالیٰ نے مریمؑ کو حسن قبولیت سے نوازا اور انکی تربیت و پرورش کی ذمہ داری حضرت زکریاؑ کو سونپ دی گئی۔ مسجد اقصیٰ میں آپ کیلئے ایک الگ حجرہ تعمیر کرادیا جہاں آپ نے اپنی ابتدائی زندگی گزاری۔ بچپن ہی سے آپ پاکیزہ صفات اور عابدہ و زاہدہ تھیں۔ شروع ہی سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے فیوض و برکات سے نوازا ہوا تھا۔ حضرت زکریاؑ جب بھی آپ کے حجرہ مبارک میں تشریف لاتے تو حضرت مریمؑ کے سامنے مختلف بے موسم پھل موجود دیکھتے اور حجرہ مبارک کو عجیب مسحور کن خوشبو سے معطر پاتے۔ ایک روز متعجب ہو کر آپ سے استفسار فرمایا کہ اے مریمؑ تیرے پاس یہ بے موسم پھل کہاں سے آتے ہیں۔ حضرت مریمؑ کے چہرے پر ایک ملکوتی مسکراہٹ کِھل اٹھی اور فرمایا ''یہ اللہ کی طرف سے آتے ہیں''۔ گویا یہ جنت کے پھل تھے اور جنت کی ہوائیں تھیں جو حضرت مریمؑ کے حجرہ مبارک کو معطر رکھتیں۔ انجیل مقدس اور قرآن حکیم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ فرشتے آپ سے ہمکلام ہوتے تھے۔ اس لئے مفسرین اور علمائے کرام کی اکثریت حضرت مریمؑ کی نبوت کی قائل ہے جن میں محمد بن اسحاق، شیخ ابوالحسن اشعری، قرطبی اور ابن حزم قابل ذکر ہیں۔ ابن حزم نے تو یہاں تک دعویٰ کیا ہے کہ حضرت حواؑ، حضرت سارہؑ، حضرت ہاجرہؑ، حضرت اُم موسیٰؑ، حضرت آسیہؑ (زوجہ فرعون) اور حضرت مریمؑ سب نبیہ تھیں۔ لیکن قرآن حکیم کی تصریح کے بعد ایسی جرأت نہیں ہونی چاہیئے۔ البتہ یہ محترم معزز خواتین بہت اعلیٰ پائے کی اولیائے خداوندی میں سے یقیناً ہیں۔ خواجہ حسن بصریؒ، امام الحرمین شیخ عبدالعزیز اور قاضی عیاض وغیرہ اس پر ہیں کہ عورت نبی نہیں ہوسکتی اور وہ سورۃ نحل کی اِس آیت سے استدلال کرتے ہیں:۔

وَ مَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ فَسۡئَلُوۡۤا اَہۡلَ الذِّکۡرِ اِنۡ کُنۡتُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ (نحل:۴۳)

ترجمہ:۔ اور ہم نے تم سے پہلے نہ بھیجے مگر مرد جن کی طرف ہم وحی کرتے تو اے لوگو اہل ذکر (علم والوں) سے پوچھو اگر تمہیں علم نہیں (نحل:۴۳)

مگر جو لوگ عورت کی نبوت کے قائل ہیں وہ آیتِ ھٰذا سے یہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ عورت کی رسالت کی نفی ہے نبوت کی نہیں۔ جبکہ یہ آپکے احترام میں غلو کرنا ہے۔ بعض لوگ حضرت مریمؑ کو نبی نہیں بلکہ ولی مانتے

ہیں جو بجا ہے۔قرآن حکیم میں آپکی فضیلت ان الفاظ میں بیان فرمائی گئی ہے:۔

وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِکَۃُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰکِ وَطَھَّرَکِ وَاصْطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ (سورۃ:ال عمران: ۴۲)

ترجمہ:۔اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم بیشک اللہ نے تجھے چن لیا اور خوب ستھرا کیا اور آج سارے جہان کی عورتوں سے تجھے پسند فرمایا (ال عمران:۴۲)

صحیح بخاری میں حضرت علی المرتضٰی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''اپنے زمانہ میں سب عورتوں سے افضل مریمؑ تھیں اور خدیجہؓ اپنے زمانہ کی عورتوں سے افضل ہیں۔

لوقا کا بیان ہے کہ ''حضرت مریمؑ بالغ ہونے پر بیت المقدس سے ہجرت فرما کر گلیلی کے شہر ناصریہ میں چلی گئیں جہاں آپکی نسبت یوسف بخار سے طے ہوگئی' لیکن رخصتی یا خلوت صحیحہ سے ایک روز پیشتر ایک خوبرو جواں مرد کی صورت میں ایک فرشتہ آپکی خلوت میں نازل ہوا۔پیکرِ عفت وعصمت مریمؑ ایک اجنبی مرد کو دیکھ کر فطری طور پر گھبرا گئیں۔فرشتے نے کہا ''اے مریمؑ خوف نہ کر' کیونکہ خدا کی طرف سے تجھ پر فضل ہوا ہے اور دیکھ تو امید سے ہوگئی اور تیرے بیٹا ہوگا اس کا نام یسوع رکھنا۔حضرت مریمؑ نے استعجاب وتحیر سے پوچھا یہ کیونکر ممکن ہے جبکہ میں مرد کو نہیں جانتی۔فرشتے نے جواب دیا:۔روح القدس تجھ پر نازل ہوگا اور خدا تعالیٰ کی قدرت تجھ پر سایہ ڈالے گی''۔(انجیل لوقا باب ۱/۳۰تا۳۵)

قرآن کریم نے بھی اس واقعہ کو صراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے جیسا کہ سورۃ مریم میں ہے:۔

وَ اذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ مَرْیَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَھْلِھَا مَکَانًا شَرْقِیًّا ۙ (۱۶) فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِھِمْ حِجَابًا ۪ فَاَرْسَلْنَآ اِلَیْھَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَھَا بَشَرًا سَوِیًّا (مریم:۱۷)

ترجمہ:۔اور کتاب میں مریم کا ذکر کرو جب وہ اپنے اہل خانہ سے الگ پورب کی طرف ایک جگہ چلی گئی (۱۶) تو ان سے ادھر (غسل وغیرہ کیلئے) ایک پردہ کرلیا' تو ہم نے اسکے سامنے ایک تندرست آدمی کی صورت میں اپنا فرشتہ

بھیجا (مریم:۱۷)

آپ اپنی تنہائی میں ایک مرد کو اتنے قریب دیکھ کر گھبرا گئیں اور بے اختیار اللہ کی پناہ چاہی:۔

قَالَتْ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْکَ اِنْ کُنْتَ تَقِیًّا (سورۃ:مریم:۱۸)

ترجمہ:۔ کہنے لگی میں تجھ سے رحمان کی پناہ مانگتی ہوں اگر تجھے اس کا ڈر ہے (مریم:۱۸)

یہ گھبراہٹ فطری تھی جو آپکی عفت و پاکیزگی کی آئینہ دار تھی۔ آپکے سہم جانے پر وہ فرشتہ بولا:۔

قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّکِ ۖ لِاَھَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّا (مریم:۱۹)

ترجمہ:۔ کہنے لگا میں تیرے رب کا بھیجا ہوا فرشتہ ہوں کہ تجھے ایک ستھرا بیٹا دوں (مریم:۱۹)

قَالَتْ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّ لَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ وَّ لَمْ اَکُ بَغِیًّا (۲۰) قَالَ کَذٰلِکِ ۚ قَالَ رَبُّکِ ھُوَ عَلَیَّ ھَیِّنٌ ۚ وَ لِنَجْعَلَهٗٓ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَ رَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَ کَانَ اَمْرًا مَّقْضِیًّا (مریم:۲۰تا۲۱)

ترجمہ:۔ کہنے لگیں مجھے لڑکا کیسے ہوگا مجھے تو کسی بشر نے چھوا تک نہیں اور نہ ہی میں بدکار ہوں (۲۰) کہا فرشتے نے کہ ایسا ہی ہے' تیرے رب نے فرمایا ہے کہ یہ مجھے آسان ہے اور یہ اس لئے ہے کہ ہم اسے لوگوں کیلئے نشانی کریں اور اپنی طرف سے ایک رحمت اور یہ طے ہو چکا ہے (مریم:۲۰'۲۱)

یعنی منشائے الٰہی یہی ہے کہ تمہیں کسی مرد کے چھوئے بغیر لڑکا عطا فرمائے اور یہ کرنا اس کیلئے کچھ بھی مشکل نہیں۔ یہ اس لئے کہ وہ لڑکا اللہ کی قوت و قدرت کی نشانی بن جائے کہ خدا بے باپ بھی پیدا کرسکتا ہے' جیسا کہ اس نے حضرت آدم و حوا علیہم السلام کو بغیر ماں اور بغیر باپ کے پیدا فرمایا۔

سریانی میں مریم کے معنی خادمہ کے ہیں چونکہ آپ ہیکل کی خدمت کیلئے وقف تھیں اسی وجہ سے آپ کا یہ نام رکھا گیا۔ جو بعد ازاں زاہدہ' عابدہ' پاکباز' نیک سیرت اور خدا رسیدہ کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ حضرت مریم کی عظمت و فضیلت کیلئے یہ بھی کیا کم ہے کہ بحکم خداوندی بغیر مرد کے وہ بچہ تولد ہوا جو ایک اولوالعزم پیغمبر اور خدا کی نشانی ٹھہرا اور حضرت عیسیٰؑ کے نام سے دنیا میں مشہور ہوا۔ چونکہ حضرت عیسیٰؑ کی ولادت معجزاتی طور پر ہوئی اور عرف عام میں عام قوانین فطرت اور سنت کے خلاف

عمل میں آئی اس وجہ سے فطری طور پر اس کا امکان موجود تھا کہ بدفطرتوں کی زبانیں آپؑ کو بدنام کرنے کی جسارت کریں گی۔ اسی وجہ سے حضرت عیسٰیؑ کی ولادت کی بشارت کے ساتھ ساتھ حضرت مریمؑ کی تسکین خاطر کیلئے واضح الفاظ میں بتادیا گیا کہ جو بچہ اس طرح مافوق الفطرت طریقہ سے پیدا ہونے والا ہے وہ (اس بناء پر کہ کوئی اس کا باپ نہیں ہے) سبک یا ذلیل وخوار بن کر نہیں رہیگا بلکہ دنیا اور آخرت میں وجیہہ ومحترم اور باعزت ہوگا۔ جیسا کہ سورۃ ال عمران میں فرمان ہے:۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ (۴۵) وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (ال عمران: ۴۵/۴۶)

ترجمہ:۔ اور یاد کرو جب فرشتوں نے مریم سے کہا کہ اے مریم اللہ تجھے بشارت دیتا ہے اپنے پاس سے ایک کلمہ کی جس کا نام مسیح عیسا ابن مریم (ہوگا جو) رُودار ہوگا دنیا اور آخرت میں اور قرب (خداوندی) والا (۴۵) اور لوگوں سے (نہایت چھوٹی عمر یعنی) پالنے میں بات کرے گا اور پکی عمر میں بھی اور صالحین (خدا کے خاصوں میں) سے ہوگا (ال عمران: ۴۶)

یوں حضرت مریمؑ کو کچھ تسلی ہوئی اور اطمینان ہوگیا کہ یہ فرشتہ ہے اور کوئی بشر نہیں کہ کسی برے ارادے کے ساتھ میری تنہائی میں آ گھسا ہو۔ بعد ازاں حضرت جبرائیل امینؑ نے حضرت مریمؑ کے گریباں میں چھینک یا پھونک ماری جس سے اسی لمحے حضرت مریمؑ حمل سے ہوگئیں اور دُور کسی مقام پر چلی گئیں۔ جسے سورۃ مریمؑ میں یوں بیان فرمایا گیا ہے:۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا (مریم: ۲۲)

ترجمہ:۔ پھر مریم نے اسے اپنے پیٹ میں لیا پھر اسے لئے ہوئے ایک دُور جگہ چلی گئی (مریم: ۲۲)

یعنی اپنے گھر والوں سے دُور بیت اللحم میں چلی گئیں۔ وہب کا قول ہے کہ جس شخص کو سب سے پہلے حضرت مریمؑ کے حمل کا علم ہوا وہ آپکا چچازاد بھائی یوسف بخار ہے جو مسجد بیت المقدس کا خادم اور بہت بڑا عابد تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ مریمؑ حمل سے ہیں تو اسے نہایت حیرت ہوئی۔ جب چاہتا کہ اس کی اطلاع منتشر کی جائے تبھی وہ حضرت مریمؑ کی طبع سلیم انکی ریاضت وعبادت اور ہر وقت اپنے حجرہ

میں حاضر رہنا کسی وقت بھی غائب نہ ہونا یاد کر کے خاموش رہتا۔ لیکن جب حمل کے بارے خیال جاتا تو انکو بَری سمجھنا بھی سخت دشوار معلوم ہوتا تھا۔ بالآخر اس نے حضرت مرّیم کو مخاطب کر کے کہا کہ میرے دل میں ایک بات آتی ہے ہر چند چاہتا ہوں کہ اسے زبان پر نہ لاؤں مگر اب صبر نہیں ہوتا۔ آپ اجازت دیجئے کہ کہہ دوں تا کہ میرے دل کی پریشانی رفع ہو سکے۔ حضرت مرّیم نے کہا اچھا کہو! تو اس نے کہا اے مرّیم! مجھے بتاؤ کہ کیا کھیتی بغیر تخم اور درخت بغیر بارش کے اور بچہ بغیر باپ کے ہو سکتا ہے؟

حضرت مرّیم نے فرمایا کہ ہاں کیا تجھے معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو کھیتی سب سے پہلے پیدا فرمائی وہ بغیر تخم کے تھی' اور درخت بغیر بارش کے اُگائے تھے۔ کیا تو یہ کہہ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پانی کی مدد کے بغیر درخت پیدا کرنے پر قادر نہیں۔ یوسف نے جواب میں کہا میں اس کا قائل ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے وہ جسے کن فرمائے وہ فوراً ہو جاتی ہے۔ اس پر حضرت مرّیم نے دلیل کیلئے حضرت آدمؑ وحوّا کو بغیر ماں اور بغیر باپ کے پیدا فرمانے کی مثال پیش کی۔ حضرت مرّیم کے اس کلام سے یوسف بخار کا شبہ رفع ہو گیا۔ بعد ازاں ہی آپؑ کو الہامی اطلاع ہوئی کہ اپنی قوم سے علیحدہ کہیں چلی جائیں جس پر حضرت مرّیم بیت اللحم میں چلی گئیں۔

پھر جب آپکو زِہ کا درد شروع ہوا تو اوٹ کیلئے کھجور کے ایک درخت کی جڑ میں چلی آئیں اور درد سے کراہتی تھیں' جسے سورۃ مریم میں بیان فرمایا گیا ہے:۔

فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِىْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَ كُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا (مریم:۲۳)

ترجمہ:۔ پھر اسے جننے کا درد ایک کھجور کی جڑ میں لے آیا' کہنے لگی اے کاش میں کسی طرح اس (درد کے ہونے) سے پہلے ہی مرگئی ہوتی اور بھولی بسری ہو جاتی (مریم:۲۳)

درد سے نجات پانے کی کوشش میں کھجور کے اس خشک درخت سے ٹیک لگانے کیلئے اسکی جڑ والے مقام پر بیٹھ گئیں۔ نہ وہاں کھانے کا کوئی انتظام تھا نہ پینے کا اور نہ ہی کسی عزیز کی مدد مہیا تھی' کیونکہ کنوارے پن میں حمل کا بیان کرنا رسوائی کا موجب تھا۔ ان سب پریشانیوں اور دَردِ زِہ کی اذیت سے

گھبرا کر کہا کہ اس سے تو موت بہتر تھی کہ سب مجھے بھول بھال چکے ہوتے اور مجھے یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔ اسی اثنا میں حضرت جبرائیل امینؑ نے ان تمام پریشانیوں کے حل کیلئے آپکو مخاطب فرمایا جسے سورۃ مریم میں بیان فرمایا گیا ہے:۔

فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا (۲۴) وَ هُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا (۲۵) فَكُلِيْ وَ اشْرَبِيْ وَ قَرِّيْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا (۲۶) (مریم: ۲۵/۲۶)

ترجمہ:۔تو اسے (جبرائیلؑ نے) وادی کے نشیب سے پکار کر آواز دی کہ (مریمؑ) غم نہ کر بیشک تیرے رب نے تیرے نیچے ایک نہر بہادی ہے اور کھجور پکڑ کر ہلا تو (اسی خشک درخت سے) تازی پکی کھجوریں گریں گی (۲۵) تو کھا اور پی اور آنکھ ٹھنڈی رکھ (متفکر و پریشان نہ ہو' رہا مسئلہ موجودہ صورتِ حال کی جواب دہی کا) تو کسی بشر کو دیکھے تو کہنا کہ میں آج رحمٰن کے روزے سے ہوں اور ہرگز کسی سے بات نہ کرونگی (مریم: ۲۵/۲۶)

حضرت عیسٰیؑ کی پیدائش ہوگئی تو جنت سے حوروں نے آکر آپکی زچگی کا فعل انجام دیا اور عیسٰیؑ کو بھی زمزم کے پانی سے نہلا دُھلا کر اور جنت سے ہمراہ لایا گیا لباس پہنا کر حضرت مریمؑ کی گود میں دیدیا۔ چارو ناچار اپنے بچے کو لے کر اپنے اقرباء میں لوٹ آئیں۔ حضرت مریمؑ کی گود میں ایک نوزائیدہ بچے کو دیکھتے ہی' حسب اندیشہ لوگوں نے حضرت مریمؑ پر الزام تراشی شروع کردی اور در پردہ آپکی عصمت وعفت پر شکوک وشبہات کا اظہار کرنے' بلکہ رقیق حملے کرنا شروع کردیئے۔ تمام گھر والے اس صورتِ حال کو دیکھ کر رونے لگے اور سخت پریشانی میں مبتلا ہوگئے' کیونکہ وہ تمام صالحین کے گھرانے کے لوگ تھے اور یوں بھی حضرت مریمؑ کی نجی زندگی' انکے زُہد وعبادت اور انکی طبع سلیم کو دیکھتے ہوئے یہ غیر یقینی صورتِ حال سے پریشانی ایک طبعی بات تھی۔ اسے سورۃ مریم میں یوں بیان فرمایا گیا ہے:۔

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ؕ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا (مریم: ۲۷)

ترجمہ:۔تو اسے گود میں لیکر اپنی قوم میں آئی تو بولے کہ مریم یقیناً یہ تو نے بہت

بری بات کی ہے (مریم:۲۷)

پھر حضرت مریمؑ پر سوالات کی بوچھاڑ ہونے لگی کہ اے ہارونؑ کی بہن کہ تو انبیاء کی اعلیٰ نسل سے ہوتے ہوئے بھی یہ کیا کر گزری' اب جواب دے کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ اس پر آپؑ نے اشارہ سے اپنے روزہ دار ہونے اور سوالوں کے جواب اس نوزائیدہ بچے سے معلوم کرنے کا اشارہ کیا۔ اس پر قوم کے افراد کو طیش آ گیا۔ طعنہ دیتے ہوئے کہنے لگے کہ یہ چھوٹا سا بچہ کیا جواب دیگا۔ اسے سورۃ مریمؑ میں یوں بیان فرمایا گیا:۔

یٰۤاُخۡتَ هٰرُوۡنَ مَا كَانَ اَبُوۡكِ امۡرَاَ سَوۡءٍ وَّ مَا كَانَتۡ اُمُّكِ بَغِيًّا (۲۸) فَاَشَارَتۡ اِلَيۡهِ ؕ قَالُوۡا كَيۡفَ نُكَلِّمُ مَنۡ كَانَ فِى الۡمَهۡدِ صَبِيًّا (مریم:۲۸/۲۹)

ترجمہ:۔ اے ہارونؑ کی بہن تیرا باپ برا آدمی نہیں تھا نہ تیری ماں بدکار (مریم:۲۸) اس پر مریم نے اپنے بچے (عیسیٰؑ) کی طرف اشارہ کیا تو کہنے لگے ہم اس پالنے میں پڑے بچے سے کیسے بات کریں (مریم:۲۹)

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ حضرت عیسیٰؑ جو پالنے میں لیٹے ہوئے تھے کروٹ بدل کر بائیں ہاتھ کو اپنی ٹھوڑی کے نیچے رکھے نیم دراز حالت میں اٹھ گئے اور دائیں باز و مبارک کو ہوا میں بلند کرتے ہوئے سوالات کرنے والوں سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے:۔ جسے سورۃ مریم میں بیان فرمایا گیا ہے:۔

قَالَ اِنِّىۡ عَبۡدُ اللّٰهِ ۟ اٰتٰنِىَ الۡكِتٰبَ وَجَعَلَنِىۡ نَبِيًّا (۳۰) وَّ جَعَلَنِىۡ مُبٰرَكًا اَيۡنَ مَا كُنۡتُ ۖ وَ اَوۡصَانِىۡ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمۡتُ حَيًّا (۳۱)

ترجمہ:۔ فرمایا (عیسیٰؑ نے) میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا ہے (مریم:۳۰) اور مجھے مبارک کیا ہے میں جہاں کہیں بھی ہوں مجھے نماز اور زکوٰۃ کی تاحیات تاکید فرمائی ہے (مریم:۳۰/۳۱)

کتاب سے مراد انجیل مقدس ہے۔ حسن کا قول ہے کہ ابھی آپؑ بطن مادر ہی میں تھے کہ آپکو توراۃ کا الہام فرما دیا گیا تھا اور ابھی پالنے ہی میں تھے کہ نبوت عطا فرما دی گئی تھی البتہ انجیل مقدس بعد میں ملی۔ اتنی چھوٹی عمر میں کلام فرمانا غالباً آپکا پہلا معجزہ ہے۔ بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر کرتے

ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ کتاب اور نبوت کا دعویٰ فرمانا ایک اطلاع تھی جو بہر حال آپؑ کو ملنے والی تھیں۔

اس سے لوگوں کو اطمینان ہو گیا اور آپکی عفت و عصمت محفوظ قرار پائی۔ بعد ازاں مریمؑ اپنے بیٹے عیسیٰؑ کو لے کر پہلے بیت المقدس واپس آئیں اور پھر مصر روانہ ہو گئیں جہاں دونوں ماں بیٹا' شاہ ہیرودیس کے مرنے تک وہیں رہے۔ بعد ازاں کچھ عرصہ فلسطین میں مراجعت کی اور آخر میں اپنے آبائی وطن ناصریہ میں چلی گئیں۔ غالباً آپؑ وہ واحد صاحب المرتبت خاتون ہیں جنہیں مردوں کے ساتھ باجماعت نماز پڑھنے کی ھدایت فرمائی گئی۔ جیسا کہ سورۃ آل عمران میں حکم فرمایا گیا:۔

یَامَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّکِ وَاسْجُدِیْ وَارْکَعِیْ مَعَ الرّٰکِعِیْنَ(۴۳) (آل عمران)

ترجمہ:۔اے مریم اپنے رب کے حضور ادب سے کھڑی ہو اور اس کے لئے سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر (آل عمران:۴۳)

آپ حضرت ھارونؑ اور حضرت داؤد علیہ السلام کی نسل سے تھیں۔ جس پر تمام مفسرین کا اتفاق ہے۔ صاحب مغازی نے آپکا نسب نامہ یوں بیان کیا ہے:۔ مریم بنت عمران بن ہاشم بن میشا بن حزقیاہ بن ابراہیم بن عزریاہ بن ناؤش بن آخز بن یہوداہ بن نازم بن مقاسط بن ایشا بن ایاز بن زجیم بن سلیمانؑ بن داؤد علیہ السلام۔

قرآن کریم میں حضرت مریمؑ کا ذکر ان سورتوں میں ہوا ہے:۔

سورۃ آل عمران ۳۵ تا ۶۳

سورۃ مریم ۱۶ تا ۳۴

حضرت ذوالقرنین علیہ السلام

یوں تو قاعدے کے مطابق یہاں حضرت عیسیٰؑ کا تذکرہ آنا چاہیے تھا مگر حضرت ذوالقرنین علیہ السلام کے ذکر کے بغیر بہت سی معلومات سے محرومی کا اندیشہ تھا اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ آپکے ذکر سے قبل اختصاراً سکندر ذوالقرنین علیہ السلام کے بارے ضروری معروضات پیش کرتا چلوں۔ علمائے یہود نے قریش کے توسط سے بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں (بغرضِ امتحان) تین سوال پیش کیے تھے کہ:۔

(۱) روح کی حقیقت کیا ہے؟

(۲) اُن چند نوجوانوں (اصحاب کہف) پر کیا گزری جو کافر بادشاہ کے خوف سے غارِ کوہ میں جا چھپے تھے۔

(۳) اس شخص (ذوالقرنین) کا حال بیان کیجئے جو مشرق سے مغرب تک فتوحات کرتا چلا گیا۔

ان سوالات کے جواب میں سورۃ کہف کا نزول ہوا اور تیسرے سوال کے جواب میں حضرت ذوالقرنین علیہ السلامؑ کے حالات بیان فرمائے گئے۔ اس ضمن میں قرآن کہتا ہے:۔

وَ یَسْئَلُوْنَکَ عَنْ ذِی الْقَرْنَیْنِ ؕ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَیْکُمْ مِّنْهُ ذِکْرًا ؕ (الکھف:۸۳)

ترجمہ:۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذوالقرنین کے بارے پوچھتے ہیں آپ فرمائیں کہ میں اس کا مذکور پڑھ کر سناتا ہوں (کہف:۸۳)

حضرت ذوالقرنین علیہ السلام کی شخصیت کے بارے علمائے سلف کے دو مسلک رہے ہیں۔ ابن جریر اور امام رازیؒ نے ذوالقرنین علیہ السلام کو سکندر مقدونی گمان کیا ہے جبکہ تاریخی حقائق اسکے خلاف ہیں اور اکابر تفسیر و حدیث مثلاً حضرت عمرؓ فاروق، حضرت علیؓ المرتضیٰ، حضرت عبداللہؓ بن عمر، حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ، مجاہد، شعبی، حافظ ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن کثیر، ابن حیان، حافظ ابن حجر، شیخ بدرالدین یمنی، امام نوَوی اور قرطبی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین وغیرہ سب ہی حضرت ذوالقرنین علیہ السلامؑ کے سکندر مقدونی ہونے کا انکار کرتے ہیں۔

چونکہ قرآن کا بیان کردہ ذوالقرنین موحد و مومن ہے جبکہ سکندر مقدونی مشرک و بت پرست

تھا' اسلئے سکندر مقدونی ذوالقرنین نہیں ہوسکتا۔ پھر سکندر مقدونی ظالم اور ستم گر تھا جبکہ سکندر ذوالقرنین علیہ السلام رحیم' صالح اور عادل تھے۔ حضرت سکندر ذوالقرنین علیہ السلام کی مغربی مہمات کا ذکر صراحت کے ساتھ قرآن حکیم میں موجود ہے جبکہ تاریخ گواہ ہے کہ سکندر مقدونی مغرب کی جانب اپنے دارالخلافہ ''مقدونیہ'' کے مغربی کنارے پر واقع جھیل سے آگے نہیں بڑھا۔ امام رازی اور ابن جریر کو یہ مغالطہ غالباً یوں لگا کہ ذوالقرنین لقب رکھنے والی اس شخصیت کا اصل نام بھی سکندر تھا۔

علمائے سلف کا خیال ہے ذوالقرنین علیہ السلام ایک قدیم بادشاہ تھے' جن کا نام سکندر اور انکے وزیر کا نام حضرت خضرؑ ہے۔ انکی مراد سکندر مقدونی سے نہیں' بلکہ (۲۰۰۰ ق م) کی ایک دوسری ہستی سکندر رومی اسکے مصداق ہیں۔ وہ سکندر مقدونی اور سکندر ذوالقرنین علیہ السلام کو جدا جدا شخصیات مانتے ہیں' جن کی تصدیق اور تصریح (تفسیر ابن کثیر جلد۲ ص ۱۶۷)' (فتح الباری جلد ۶ ص ۲۹۴)' (البدایۃ والنہایۃ یعنی تاریخ ابن کثیر جلد۲ ص ۱۰۵' ۱۰۶) میں موجود ہے۔

علمائے متاخرین میں سے بعض علماء نے تو اسی غلط بات کو اختیار کرلیا کہ سکندر مقدونی قرآن کا مذکورہ ذوالقرنین ہے اور بعض نے علمائے سلف کے قول پر اکتفا کیا اور کچھ علماء نے بلا دلیل یمن کے حمیری بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ کو ذوالقرنین قرار دیدیا۔ (قصص القرآن جلد:۳)

اس سلسلہ میں مولانا ابوالکلام آزاد نے جو تحقیق پیش کی ہے وہ اسلامی تاریخ کا ایک کارنامہ ہے۔ یہ تحقیق ان تمام اقوال سے جدا اور قرآنی براہین و دلائل کی روشنی میں ہے۔

> ''قرآن کریم نے جس شخصیت کو ذوالقرنین کہہ کر پکارا ہے وہ اسکا نام نہیں لقب ہے۔ عربی اور عبرانی میں قرن کے معنی سینگ کے ہیں اور ذوالقرنین کے معنی ہیں دو سینگوں والا۔ لیکن چونکہ ہمارے علماء کو تاریخ میں اس نام کا کوئی حکمران نظر نہیں آیا اس لئے وہ اس کے معنی کے معاملہ میں گومگو میں پڑ گئے''۔

توراۃ کے بغور مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یروشلم کی عام تباہی اور بنوکدنصر کے حملہ سے بہت پہلے ہی متعدد انبیائے بنی اسرائیل نے یہود کی اس تباہی و اسیری کی اطلاع دیدی تھی اور ساتھ ہی یہ پیش گوئی بھی کردی تھی کہ اُس ستر سالہ اسیری کے بعد ایک نیک اور صالح حکمران کا ظہور ہوگا جو بابل کو

شکست دیکر بنی اسرائیل کو دوبارہ رہائی دلائیگا۔ان متعدد پیشگوئیوں میں سے بعض میں اس کا نام خورس بعض میں اس کا لقب شاخ یا سینگ اور بعض میں اس لقب کا تمثل بہ عالم رُویا پیش کیا گیا ہے۔

مثلاً یہودیوں پر اس مصیبت عظیمہ اور بالآخر نجات سے تقریباً ایک سو ساٹھ سال قبل حضرت یسعیاہؑ ارشاد فرماتے ہیں:۔

''۔۔۔۔۔ جو یروشلم کے بارے کہتا ہوں کہ وہ آباد ہو جائے گا اور یہوداہ کے شہروں کی بابت کہ وہ تعمیر کیے جائیں گے اور میں اس کو تعمیر کرونگا' جو سمندر کو کہتا ہوں کہ سوکھ جا اور میں تیری ندیاں سکھا ڈالونگا' جو ڈورس کے حق میں کہتا ہوں کہ وہ میرا چرواہا ہے اور میری مرضی پوری کریگا اور یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ اس کی بنیاد ڈالی جائیگی''۔(یسعیاہ باب ۴۴/۲۴ تا ۲۸)

اس کے بعد حضرت یرمیاہؑ اور حضرت زکریاؑ کی پیشگوئیاں ہیں۔صحیفہ زکریا میں ہے:۔

''رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ دیکھ وہ شخص جس کا نام شاخ (یعنی سینگ) ہے اسکے زیر سایہ خوشحالی ہوگی اور وہ خدا کا ہیکل تعمیر کریگا۔اس کے ساتھ کاہن بھی تخت نشین ہوگا''۔(صحیفہ زکریا باب ۶ ص ۱۲'۱۳)

لیکن ان سب میں حضرت دانیالؑ کا خواب بہت اہم ہے جس میں لقب ''ذوالقرنین علیہ السلام'' کی تمثیل زیادہ واضح ہے۔یہ بنوکدنصر (بخت نصر) کے بیٹے بلیشغر کی حکومت کے تیسرے سال کا واقعہ ہے جسکے بارے حضرت دانیالؑ فرماتے ہیں:۔

''تب میں نے آنکھ اٹھا کر نظر کی اور کیا دیکھتا ہوں کہ دریا کے پاس ایک مینڈھا کھڑا ہے جس کے دو سینگ ہیں دونوں سینگ اونچے تھے لیکن ایک دوسرے سے بڑا تھا اور بڑا دوسرے کے بعد نکلا تھا۔میں نے اس مینڈھے کو دیکھا کہ مغرب وشمال وجنوب کی طرف سینگ مارتا ہے۔یہاں تک کہ کوئی جانور اس کے سامنے کھڑا نہ ہوسکا اور نہ کوئی اس سے پیچھا چھڑا سکا۔وہ جو چاہتا تھا کرتا تھا۔یہاں تک کہ وہ بہت بڑا ہو گیا میں سوچ ہی رہا تھا کہ ایک بکرا مغرب کی طرف سے آکر تمام رُوئے زمین پر ایسا پھرا کہ زمین کو بھی نہ چھوا۔اس بکرے کی دونوں

آنکھوں کے درمیان ایک عجیب سا سینگ تھا اور وہ اس دو سینگ والے مینڈھے کے پاس آیا جسے میں نے دریا کے کنارے دیکھا تھا اور اس مینڈھے پر پورے قہر کے ساتھ حملہ آور ہوا۔ وہ اس پر اس غضب سے بھڑا کہ مینڈھے کے دونوں سینگ ٹوٹ گئے۔ مینڈھے میں اس سے مقابلہ کی تاب نہیں تھی۔ پس اس نے اسے زمین پر پٹخ دیا اور خوب لتاڑا۔ کوئی ایسا نہ تھا کہ مینڈھے کو اس سے چھڑا سکے۔ وہ بکرا نہایت بزرگ ہوا جب زور آور ہوا تو اس کا بڑا سینگ ٹوٹ گیا اور اس کی جگہ چار عجیب سینگ آسمان کی چاروں دشاؤں کی طرف نکلے"۔ (دانی ایل باب ۸/۳ تا ۸)

صحیفہ دانیال میں ہے کہ اس کے بعد حضرت جبرائیلؑ ظاہر ہوئے اور انہوں نے حضرت دانیالؑ کو اس خواب کی یہ تعبیر بتائی:۔

"جو مینڈھا تو نے دیکھا' اسکے دونوں سینگ میڈیا اور فارس کے بادشاہ ہیں اور وہ جسیم بکرا یونان کا بادشاہ ہے اور اس کی آنکھوں کے درمیان کا بڑا سینگ پہلا بادشاہ ہے اور اس کے ٹوٹ جانے کے بعد جو چار سینگ نکلے وہ چار سلطنتیں ہیں جو اس کی قوم میں قائم ہونگی لیکن ان کا اقتدار اس کا سا نہ ہوگا"۔ (صحیفہ دانیال باب ۸/۲۰ تا ۲۲)

اس تعبیر سے ظاہر ہے کہ دو سینگوں والا مینڈھا دراصل سائرس کا تمثل تھا جو میڈیا اور فارس کا شہنشاہ تھا۔ جس کا زمانہ تواریخ میں (۵۵۵ ق م تا ۵۲۳ ق م) بتایا گیا ہے۔ ایک سینگ والا بکرا سکندر مقدونی تھا جس کا زمانہ (۳۳۶ ق م تا ۳۲۳ ق م) تھا جس نے سائرس کی مملکت کے وارث دارا کو شکست دی' جسکے مرنے کے بعد اسکی وسیع و عریض سلطنت چار حصوں میں تقسیم ہوگئی۔

(۱) مقدونیہ' جہاں انٹی گومینس دوم نے حکومت قائم کی۔

(۲) ایشیائی ممالک جو سیلوکس کے زیر اقتدار ہو رہے۔

(۳) مصر و ملحقہ ممالک جن پر ٹالمی نے حکومت کی۔ اور

(۴) یونان' ایشیائے کوچک کے کچھ علاقے' کریٹ اور کچھ دوسرے یونانی جزائر جو مذکورہ بالا تینوں

حصوں سے الگ اور خود مختار تھے۔

اس خواب میں میڈیا اور فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ دی گئی ہے اسلئے عجب نہیں کہ فارس کے شہنشاہ کیلئے یہودیوں میں ذوالقرنین علیہ السلام کا تخیل پیدا ہو گیا ہو یعنی دو سینگوں والا شہنشاہ۔ ۱۸۳۸ء کے ایک انکشاف نے (جسکے نتائج بہت عرصہ بعد منظر عام پر آئے) اس قیاس کو ایک تاریخی حقیقت ثابت کر دیا کہ فی الحقیقت شہنشاہِ سائرس کا لقب ذوالقرنین تھا اور یہ محض یہودیوں کا کوئی مذہبی تخیل نہ تھا' بلکہ سائرس کا یا باشندگانِ فارس کا مجوزہ اور پسندیدہ لقب تھا۔ (ترجمان القرآن ج ۲ ص ۴۰۱)

۱۸۳۸ء کا یہ انکشاف دراصل سائرس کا مجسمہ ہے جو اصطخر کے کھنڈرات سے دستیاب ہوا۔ اس میں سائرس کی شکل وصورت ایسی ہی ہے جیسی حضرت دانیالؑ نے عالم رُویا میں مشاہدہ کی تھی۔ یعنی اس میں سائرس کے دونوں طرف عقاب کے پَر بھی ہیں اور سر پر جو خود ہے اس پر مینڈھے کی طرح دو سینگ ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میڈیا اور فارس کے شہنشاہ اسکندر کو دو سینگوں والے (ذوالقرنین) کے لقب سے کیوں پکارا جاتا تھا۔ سائرس کے متعلق قدیم تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ وہ اس خاندان سے تعلق رکھتا تھا جس کا بانی ہخامنش تھا۔ ہخامنش کا یونانی نام ایکی محانیز تھا جس کے بیٹے کا نام ٹیز پیز تھا اور ٹیز پیز کے بیٹے کا نام کمبائسس اوّل (CAMBYSES) تھا۔ کمبائسس کے بیٹے کا نام سائرس یا سکندر اور لقب ذوالقرنین علیہ السلام تھا۔ ذوالقرنین علیہ السلام کے بڑے بھائی کا نام دارا اوّل تھا جس کا یہ سلسلہ دارا سوم تک جاری رہا' بعد ازاں سکندر مقدونی نے شکست دے کر دارا سلطنت کے سلسلے کا خاتمہ کر دیا۔

سائرس کا فارسی نام گورش یا کے ارش تھا جو عبرانی میں خورس ہوا یونانی میں سائرس اور عربی میں کیخسرو ہو گیا۔ قرآن نے انہیں انکے لقب ذوالقرنین علیہ السلام سے مخاطب فرمایا اور انکے حالات بیان فرمائے ہیں جس سے انکے بارے بہت کچھ معلوم ہوا' نیز یہ کہ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک اور پوری دنیا پر حکومت رکھتے تھے۔ میڈیا کو فتح کر لینے اور بابل کو اپنی قلمرو میں داخل کر لینے سے انکی شہرت بام عروج پر پہنچ گئی تھی اور ان کی عظمت سے دل تھرتھرانے لگے تھے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں بیان ہوا ہے:۔

اِنَّا مَکَّنَّا لَهٗ فِی الْاَرْضِ وَ اٰتَیْنٰهُ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ سَبَبًا (۸۴) (سورۃ:الکھف)

ترجمہ:۔ہم نے اس کو زمین میں بڑی دسترس دی تھی اور ہر چیز کا سامان عطا کیا تھا(کھف:۸۴)

یعنی ایک تو تمام دنیا پر حکومت عطا فرمائی دوسرے یہ جس چیز کی بھی خلق کو حاجت ہو سکتی ہے اور جو کچھ بادشاہوں کو دیار و امصار فتح کرنے اور دشمنوں کے محاربہ کیلئے درکار ہوتا ہے وہ سب عنایت کیا۔سورۃ الکہف میں سکندر ذوالقرنین علیہ السلام کے بارے جو کچھ بیان فرمایا گیا ہے میں اس کا خلاصہ عرض کرتا ہوں تا کہ حضرت اسکندر ذوالقرنین علیہ السلام کا تعارف مہیّا ہو سکے۔

حضرت ذوالقرنین علیہ السلام کا نام سکندر ہے یہ حضرت خضرؑ کے خالہ زاد بھائی ہیں۔انہوں نے سکندریہ شہر بنایا اور اس کا نام اپنے نام پر رکھا۔حضرت خضرؑ انکے وزیر اور صاحب لواٗ تھے۔دنیا میں ایسے چار بادشاہ ہوئے ہیں جو تمام دنیا پر حکمران تھے۔دو مؤمن' جو کہ حضرت ذوالقرنین علیہ السلام اور حضرت سلیمانؑ ہیں اور دو کافر' جو کہ نمرود اور بخت نصر ہیں۔عنقریب ایک پانچواں بادشاہ بھی تشریف فرما ہونے والا ہے جنکی حکومت تمام رُوئے زمین پر ہوگی۔وہ امت مسلمہ سے ہونگے اور جن کا مبارک نام نامی حضرت امام مہدی ہے۔حضرت ذوالقرنین علیہ السلام کی نبوت میں اختلاف ہے' حضرت علی المرتضیٰؓ نے فرمایا کہ وہ نہ تو نبی تھے نہ ہی فرشتے' وہ اللہ سے محبت کرنے والے اسکے بندے تھے پس اللہ نے بھی انہیں محبوب بنایا۔

ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ قرآن حکیم نے ذوالقرنین علیہ السلام کی جن تین مہمّوں کا ذکر فرمایا ہے کیا ان کی راہنمائی سائرس نے کی ہے۔؟ کیونکہ حضرت سکندر ذوالقرنین علیہ السلام کی ایک مہم مغرب الشّمس کی طرف ہے' دوسری مطلع الشّمس کی طرف' اور تیسری ایک ایسے مقام کی طرف ہے جہاں ایک وحشی قوم آباد تھی اور یہ لوگ (یاجوج و ماجوج) وہاں آ کر لوٹ مار مچایا کرتے تھے۔

یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب بخت نصر نے حملہ کر کے' ہیکل کو برباد کیا اور بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔وہ بنی اسرائیل کو قیدی بنا کر بابل لے آیا تھا اور انکی جمعیت ختم کرنے کیلئے بھیڑ بکریوں کی طرح انہیں آپس میں تقسیم کر دیا تھا۔حضرت دانیالؑ بھی ان اسیروں میں شامل تھے۔آپکو خواب میں بنی اسرائیل کی رہائی کی خوشخبری دی گئی تھی کہ دو سینگوں والا مینڈھا کھڑا ہے۔چنانچہ کچھ عرصہ

بعد سائرس (سکندر ذوالقرنین) فارس کے حکمران بنے اور انہوں نے کچھ عرصہ بعد میڈیا کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ انہی کے حکم سے بنی اسرائیل کو رہائی نصیب ہوئی اور ہیکل کی دوبارہ تعمیر ہوئی۔ ہیکل کے سونے چاندی کے ظروف وسامان جو بخت نصر لوٹ کر لے گیا تھا سائرس کے حکم سے وہ بھی بنی اسرائیل کو واپس ملے اور ہیکل میں داخل کیے گئے۔

اطلاعات قرآنیہ کے علاوہ سائرس کے بارے مورخین کا کہنا ہے کہ جب اس نے میڈیا کو فتح کر کے اپنی سابقہ مملکت فارس میں شامل کرلیا تو فوراً بعد ہی ایشیائے کوچک کی ایک ریاست ''لیڈیا'' کے بادشاہ کروسیس نے صلح کے تمام معاہدات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سائرس پر حملہ کر دیا۔ سائرس نے مقابلہ کیا اور اپنے حریف کو شرم ناک شکست دیکر لیڈیا کی ساری حکومت پر قبضہ کرلیا۔ اب تمام ایشیائے کوچک، بحر شام سے لے کر بحر اسود تک اسکے زیر نگیں تھا۔ وہ برابر بڑھتا ہوا فارس سے لے کر لیڈیا تک چودہ سو میل کا فاصلہ طے کر کے مغربی ساحل تک پہنچ گیا جہاں سمندر نے اسکی پیشقدمی روک دی۔

سکندر ذوالقرنین علیہ السلام نے اپنے لشکر سمیت مشرق و مغرب شمال و جنوب الغرض ہر طرف سفر کیا اور بتدریج تمام دنیا کو فتح کرلیا۔ جہاں جہاں تک آبادی ہے وہ سب منازل قطع کر ڈالے اور جانب مغرب وہاں پہنچے جہاں سے انہیں ڈوبتا ہوا سورج ایسا نظر آیا گویا وہ کسی سیاہ چشمے میں ڈوب رہا ہو۔ اگرچہ سورج تو اپنی مدار میں متحرک سفر رہتا ہے اور کہیں ڈوبتا یا ابھرتا نہیں۔ تاہم جو جہاں موجود ہے اسے آفتاب و ماہتاب اور سیاروں ستاروں کا ابھرنا، ڈوبنا بظاہر دکھائی تو دیتا ہے۔ چونکہ ایشیائے کوچک کا مغربی ساحل چھوٹی چھوٹی خلیجوں کا مجموعہ ہے اور سمندر کی گہرائی کم ہونے کی وجہ سے پانی گدلا ہے۔ اسلئے سورۃ الکہف میں سکندر ذوالقرنین علیہ السلام کی پہلی مغربی مہم کا تذکرہ میں سورج غروب کی کیفیت کو اس طرح بیان فرمایا:۔

فَاَتۡبَعَ سَبَبًا(۸۵) حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ مَغۡرِبَ الشَّمۡسِ وَجَدَهَا تَغۡرُبُ فِیۡ عَیۡنٍ حَمِئَةٍ وَّ وَجَدَ عِنۡدَهَا قَوۡمًا ؕ قُلۡنَا یٰذَا الۡقَرۡنَیۡنِ اِمَّاۤ اَنۡ تُعَذِّبَ وَ اِمَّاۤ اَنۡ تَتَّخِذَ فِیۡهِمۡ حُسۡنًا(۸۶) قَالَ اَمَّا مَنۡ ظَلَمَ فَسَوۡفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ یُرَدُّ اِلٰی رَبِّهٖ فَیُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّکۡرًا(۸۷) وَ اَمَّا مَنۡ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۨ الۡحُسۡنٰی ۚ وَ سَنَقُوۡلُ لَهٗ

مِنۡ اَمۡرِنَا یُسۡرًا ؕ (الکھف: ۸۵تا۸۸)

ترجمہ:۔تو وہ ایک سامان کے پیچھے چلا(۸۵) یہاں تک کہ جب سورج ڈوبنے کی جگہ پہنچا اسے ایک سیاہ کیچڑ کے چشمے میں ڈوبتا پایا اور وہاں ایک قوم ملی، ہم نے فرمایا اے ذوالقرنین یا تو انہیں سزا دے یا ان کے ساتھ بھلائی اختیار کر(۸۶) عرض کی کہ وہ جس نے ظلم کیا اسے تو ہم عنقریب سزا دیں گے پھر اپنے رب کی طرف پھیرا جائیگا وہ اسے بری مار دے گا(۸۷) اور جو ایمان لایا اور نیک کام کیے تو اس کا بدلہ بھلائی ہے اور عنقریب ہم اسے آسان کام کہیں گے (الکہف ۸۸)

یہ وہی قوم ہے جس نے کرولسیس کی سرکردگی میں معاہدہ توڑتے ہوئے سائرس پر حملہ کیا تھا۔ جن کے بارے ذوالقرنین علیہ السلام کو اجازت دی گئی کہ ان کے ساتھ جیسا سلوک کرنا مناسب سمجھیں کریں۔اوّلاً تو انہیں دین توحید کی تعلیم دیں اور داخل اسلام کریں پھر بھی جو کوئی اپنے ظلم وزیادتی کو ترک نہ کرے کفر پر اڑا رہے اسے قتل کر ڈالیں، اور آخرت کا عذاب تو ایسوں کیلئے مقرر ہے ہی۔

سائرس کے مورّخین یک زبان ہو کر کہتے ہیں کہ اس نے قطعاً کسی پر زیادتی نہیں کی بلکہ اپنی فوج کو ھدایت کی کہ دشمن کے لشکریوں کے علاوہ کسی پر ہاتھ نہ اٹھانا بلکہ جو نیزہ جھکا دے اسے بھی قتل نہ کیا جائے۔قرآن سے بھی مورّخین کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ وہ نہ صرف خود ایک مومن اور نیک شخص تھا بلکہ نیکوکاروں کا قدردان بھی تھا۔

حضرت سکندر ذوالقرنین علیہ السلام (سائرس) اپنے لشکر سمیت کئی برس یہاں رہے جس کا اثر یہ ہوا کہ یہ لوگ آپ علیہ السلام پر ایمان لے آئے اور آپ نے ان میں سے جو لوگ نیکوکار اور انصاف کرنے والے تھے انہیں باقی لوگوں پر انتظامی امور کی انجام دہی اور لوگوں میں اعتدال و انصاف قائم کرنے کیلئے متعین فرمایا اور انہیں بہت سی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ان میں سے جو لوگ کفر و شرارت پر مُصر رہے اُنکو تعذیب کیا۔

اس کے بعد سکندر ذوالقرنین علیہ السلام نے جانب شرق سفر کا قصد فرمایا۔یہ انکی دوسری مہم تھی جسکی وجہ سفر یہ تھی کہ مملکت کے مشرقی اطراف میں بعض خانہ بدوش قبائل نے فتنہ وفساد کی آگ

بھڑکا دی تھی۔ جسے فرو کرنے' بلخ اور باختر کے قبائل کی سرکوبی کیلئے انہیں مشرق کا رُخ کرنا پڑا۔ ان سب کو مطیع کرنے کے بعد وہ مزید آگے بڑھے اور ہندوستان تک پہنچے وہاں کے بادشاہ نے آپکا استقبال کیا اور خراج ادا کرنا قبول کر کے آپؑ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ اس کے بعد مشرق کی طرف مزید بڑھے تو وہاں تک جا پہنچے جہاں سے آگے پہاڑوں کا طویل اور اونچا سلسلہ تھا۔ وہاں ایک قوم کو دیکھا' جہاں محلات اور قلعوں کا تو ذکر کجا' وہاں باقاعدہ کوئی بستی ہی نہ تھی جہاں مکانات تعمیر کر کے ان میں رہائش کی جاتی۔ یہ باغی قبیلہ صحرا نورد تھا' یہ لوگ جو نہ تو اپنے گھر بنا کر رہتے تھے نہ ہی انکو کھیتی باڑی کی گنجائش تھی' کیونکہ وہ بیابان ریگستان میں رہ رہے تھے جہاں یہ سہولیات میسر نہیں تھیں۔ کبھی درختوں کے کسی جھنڈ کی آڑ میں وقت بسر کر لیا۔ کبھی کوئی معمولی سا خیمہ تان لیا۔ اس کے علاوہ دھوپ وغیرہ سے بچنے کیلئے بھی انکے پاس کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ اُن لوگوں کو بھی آپ علیہ السلام نے دین و مذہب اور اخلاقیات کا درس دیا۔ انہیں عصمت وحیاء کی اہمیت بتائی۔

پھر سکندر ذوالقرنین علیہ السلام تیسری مہم کے سلسلہ میں کاکیشیا کے پہاڑی درّے تک جا پہنچے جسے قرآن نے سدّین کہہ کر ارشاد فرمایا ہے۔ یعنی اس مقام پر پہنچے جہاں دو بلند پہاڑ موجود تھے۔ ان پہاڑوں کے ایک جانب ایک قوم آباد تھی جو انکی زبان سے ناشناس تھی اور اشاروں وغیرہ سے مقصود بیان کرنا پڑتا تھا۔ اسے قرآن نے یوں بیان فرمایا:۔

ثُمَّ اَتۡبَعَ سَبَبًا (۹۲) حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ بَیۡنَ السَّدَّیۡنِ وَجَدَ مِنۡ دُوۡنِهِمَا قَوۡمًا ۙ لَّا یَکَادُوۡنَ یَفۡقَهُوۡنَ قَوۡلًا (۹۳) (سورۃ:الکھف)

ترجمہ:۔ پھر (سکندر ذوالقرنین) ایک سامان کے پیچھے چلا (۹۲) یہاں تک کہ دو پہاڑوں کے بیچ پہنچا تو ادھر کچھ ایسے لوگ پائے کہ کوئی بات سمجھتے معلوم نہ ہوتے تھے (۹۳) (سورۃ:الکھف)

کاکیشیا کے اس پہاڑی درّہ کی دائیں طرف بحرخزر ہے جس نے شمال اور مشرق کی راہ روکی ہوئی ہے۔ بائیں جانب بحر اسود ہے جو شمال مغرب کیلئے ایک قدرتی رکاوٹ ہے۔ درمیانی علاقہ میں اس کا سر بفلک سلسلۂ کوہ ایک قدرتی دیوار کا کام دے رہا ہے۔ اس درمیانی درّے کے علاوہ شمالی قبائل کیلئے

ادھر آنے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہیں سے یاجوج و ماجوج آ کر اس علاقہ میں آباد بستیوں پر حملہ کرتے انہیں لوٹتے اور ان کے علاقہ کو تاراج کر کے واپس لوٹ جاتے تھے۔ یہاں کے رہنے والے یہ بیچارے یاجوج و ماجوج کے ہاتھوں سخت اذیت میں مبتلاء تھے۔ انکے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور انکے سامنے نہایت کمزور و بے بس تھے۔

یاجوج و ماجوج (ایک مخلوق)

یاجوج و ماجوج' حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے یافث کی اولاد میں سے وہ فسادی گروہ ہیں جن کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ یہ دو بھائیوں یاجوج اور ماجوج کی اولاد ہیں اور انہی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ مصلحت خداوندی ہے کہ ان کو موت بھی نہیں ہے۔ جب تک یہ کھلے رہے زمین میں فساد برپا رکھتے اور خاص کر ربیع کے زمانے میں قریبی آبادیوں کی طرف نکلتے تو لوگوں کی کھیتیاں' سبزہ' پیڑ پودے تک سب کھا جاتے۔ واپس لوٹتے وقت لوگوں کی خشک اجناس لاد کر ہمراہ لے جاتے۔ یہ صرف مردہ جانوروں کی کھالیں پہنتے اسکے علاوہ ان کے جسموں پر کوئی اور لباس نہ ہوتا تھا۔ ہر قسم کے درند چرند اور مردہ دریائی جانور انکی غذا تھے۔ ضرورت پڑنے پر انسانوں کو بھی کھا جاتے اور سانپ بچھوؤں درندوں وغیرہ تک کو بھی نہ چھوڑتے۔ جانوروں کی طرح ہر کسی کے سامنے جنسی افعال و اختلاط میں مصروف ہو جاتے۔ فضلہ و پیشاب بھی جہاں ضرورت پڑ جاتی تو حیوانوں کی طرح سر عام اجابت میں انہیں کسی قسم کی شرم نہ تھی اور مذہباً یہ سب کافر تھے۔ انکی شکلیں اور جسم تو انسانی تھے مگر کچھ تو طویل القد اور کچھ ٹھگنے اور کچھ یک بالشت کے بونے تھے۔ ان کے کان ہاتھی کے کانوں سے بھی بڑے ہیں کہ ایک کان اپنے نیچے بچھا کر دوسرا کان اپنے اوپر اوڑھ کر سو جاتے۔

اس آفت سے لوگوں کو بچانے کی توفیق قدرت نے سکندر ذوالقرنین علیہ السلام کو پہلے ہی سے تفویض فرما رکھی تھی۔ حضرت دانیالؑ اور یسعیاہؑ نبی کی پیشین گوئیاں جو پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اس پر گواہ ہیں:۔

> ''جو خورس (سائرس) کے حق میں کہتا ہوں کہ وہ میرا چرواہا ہے اور میری مرضی بالکل پوری کریگا اور یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ وہ تعمیر کیا جائیگا اور ہیکل کی بابت

کہ اس کی بنیاد ڈالی جائیگی''۔(یسعیاہ باب ۴۴ آیت ۲۸)

اسی کتاب کے اگلے باب یعنی ۴۵ کی پہلی آیت بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

''خداوند اپنے ممسوح خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ میں نے اس کا داہنا ہاتھ پکڑا کہ امتوں کو اس کے سامنے زیر کروں اور بادشاہوں کی کمریں کھلواڈالوں اور دروازوں کو اسکے لئے کھلوادوں اور پھاٹک بند نہ کیے جائیں گے''۔(یسعیاہ باب ۴۵ آیت ۱)

یاجوج وماجوج کا ذکر قرآن حکیم میں دو جگہ آیا ہے ایک تو اسی سورۃ کہف میں اور دوسرا سورۃ انبیاء میں۔ یورپین انہیں اپنی زبان میں (GOG AND MAGOG) کہتے ہیں۔ یہ کون سی قوم تھی؟ تمام تاریخی قرائن متفقہ طور پر شہادت دیتے ہیں کہ اس سے مقصود صرف ایک ہی قوم ہوسکتی ہے یعنی شمال مشرقی میدانوں کے وہ وحشی اور ماورائی طاقت ور قبائل جن کے مشرقی حملوں کی روک تھام کیلئے چین کے شہنشاہ ''شین ہوانگ ٹی'' کو بھی وہ پندرہ سو میل طویل عظیم الشان دیوار بنانا پڑی جو ''دیوارِ چین'' کے نام سے مشہور ہے۔اس کی تعمیر ۲۱۴۔ق م میں شروع ہوئی اور دس سال میں مکمل ہوئی۔اس نے شمال اور مغرب کی طرف منگولین قبائل کے حملوں کی تمام راہیں مسدود کر دیں۔اسلئے ان کے حملوں کا رُخ پھر وسط ایشیا کی طرف مُڑ گیا۔انہی کے حملوں کو روکنے کیلئے سائرس (سکندر ذوالقرنین علیہ السلام) کو سدّ سکندری تعمیر کرنا پڑی۔شمال مشرق کے اس علاقہ کا بڑا حصہ اب منگولیا کہلاتا ہے۔چینی ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ اس کا قدیمی نام ''موگ'' ہے اور چھ سو ۶۰۰ برس قبل مسیح میں یونانیوں کے ہاں اس قوم کو میگ اور میگاگ کہہ کر پکارا جاتا تھا جو بعد ازاں عبرانی میں یاجوج اور ماجوج ہوگیا۔

آخر میں ہمیں یہ تحقیق کرنا ہے کہ سائرس نے جو سدّ تعمیر کی تھی اس کا محل وقوع کہاں ہے۔بحر خزر کے مغربی ساحل پر ایک قدیم شہر دربند آباد ہے یہ ٹھیک اس مقام پر واقع ہے جہاں کاکیشیا کا سلسلۂ کوہ ختم ہوکر بحرخزر سے مل جاتا ہے۔یہاں ایک دیوار ہے جس کا طول پچاس میل اور اونچائی انتیس فٹ اور موٹائی دس فٹ ہے۔(انسائیکلو پیڈیا) اس مقام سے مغرب کی طرف درّۂ دانیال میں (جو دو بلند پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے) قدیم زمانے سے ایک دیوار موجود ہے اور اسے آہنی دروازہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔مولانا ابوالکلام آزاد کے خیال کے مطابق یہ آخری دیوار وہی ہے جو قرآن میں مذکور ہے۔واللہ

اعلم (تفسیر ترجمان القرآن از۔ابوالکلام آزاد)

حضرت سکندر ذوالقرنین علیہ السلام جب یہاں پہنچے تو ان پہاڑوں میں رہنے والے لوگوں نے ان سے اپنی بپتا بیان کی اور مدد کی درخواست کی کہ یاجوج و ماجوج اور ہمارے علاقے کے درمیان جو پہاڑی خلاء ہے وہاں کوئی مضبوط دیوار بنادیں ہم اس کا خرچ اٹھانے پر تیار ہیں ۔ حضرت ذوالقرنین علیہ السلام نے فرمایا مجھے تم سے کچھ لینے کی حاجت نہیں۔اللہ کے فضل سے میرے پاس کثیر مال اور ہر قسم کا سامان موجود ہے۔تم بس جسمانی طور پر میری مدد کرو کہ جو میں تمہیں کہوں تم وہ کرتے جاؤ۔ جسے سورۃ الکھف میں یوں بیان فرمایا گیا:۔

قَالُوْا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ اِنَّ یَاْجُوْجَ وَ مَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَکَ خَرْجًا عَلٰٓی اَنْ تَجْعَلَ بَیْنَنَا وَ بَیْنَهُمْ سَدًّا(۹۴) قَالَ مَا مَکَّنِّیْ فِیْهِ رَبِّیْ خَیْرٌ فَاَعِیْنُوْنِیْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَیْنَکُمْ وَ بَیْنَهُمْ رَدْمًا (الکھف:۹۴/۹۵)

ترجمہ:۔کہا اے ذوالقرنین بیشک یاجوج و ماجوج زمین میں فساد مچاتے ہیں تو کیا ہم آپ کے لئے کچھ مال مقرر کردیں کہ آپ ان میں ہمارے درمیان ایک دیوار بنادیں (۹۴) کہا (سکندر ذوالقرنین نے) کہ مجھے جس پر میرے رب نے قابو دیا ہے وہ بہتر ہے، تم بس میری مدد طاقت سے کرو کہ میں تم میں اور اُن میں ایک مضبوط آڑ بنادوں (کہف:۹۴/۹۵)

اس پر انہوں نے کہا کہ آپ علیہ السلام حکم فرماتے جائیں ہم ہر طرح سے آپکا حکم بجالانے کو تیار ہیں۔ چنانچہ آپ علیہ السلام نے انہیں بنیاد کھودنے کا کہا اور وہ اتنی گہری کھودی گئی کہ تہہ سے پانی نکل آیا۔ پھر فرمایا کہ لوہے کے تختے لاؤ جس کی دو موٹی تہیں دونوں اطراف سے پہاڑوں کی چوٹیوں تک اٹھادی گئیں۔ جنکے بیچ تانبہ لکڑی اور کوئلہ تہہ در تہہ جمادیا گیا اور اسے دھونکا کر آگ دیدی گئی۔اس طرح یہ فولادی دیوار دونوں پہاڑوں کی بلندی تک اونچی اور ایسی مضبوط کردی گئیں کہ اسکے درمیان کوئی جگہ یا خلاء ایسا باقی نہ رہا کہ جس میں سے ہوا بھی گزر سکے۔ پھر آپؑ نے اوپر سے مزید تانبہ پگھلا کر پوری دیوار میں پلادیا۔اسی دیوار کا نام ''سدِّ سکندری'' مشہور ہے۔اس کے بعد سے آج تک یاجوج و ماجوج اس پر نہ چڑھ سکے نہ ہی اس میں سوراخ کر سکے اور قیامت کے قریب تک اسی علاقے میں مقید رہیں

گے۔اس کو قرآن حکیم نے سورۃ کہف میں یوں بیان فرمایا ہے:۔

اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ ط حَتّٰٓی اِذَا سَاوٰی بَیْنَ الصَّدَفَیْنِ قَالَ انْفُخُوْا ط حَتّٰٓی اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا لا قَالَ اٰتُوْنِیْٓ اُفْرِغْ عَلَیْهِ قِطْرًا (۹۶) فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ یَّظْهَرُوْهُ وَ مَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا (الکھف: ۹۶/۹۷)

ترجمہ:۔میرے پاس لوہے کے تختے لاؤ یہاں تک کہ جب وہ دیوار دونوں پہاڑوں کے کناروں تک برابر کردی تو کہا دھونکو یہاں تک کہ جب اسے آگ کردیا کہا لاؤ میں اس پر پگھلا ہوا تانبہ انڈیل دوں (۹۶) تو (پھر یاجوج وماجوج) اس پر نہ چڑھ سکے اور نہ اس میں سوراخ کرسکے (کہف:۹۷)

احادیث مبارکہ میں ہے کہ قرب قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ یاجوج و ماجوج نکل کر تمام کرۂ ارض پر پھیل جائیں گے اور شر وفساد برپا کریں گے۔قتل وغارت گری کریں گے' چشموں کا تمام پانی پی جائیں گے' جانوروں' درندوں' درختوں اور انسانوں سمیت جو کچھ انکے ہاتھ چڑھ گیا اسے کھا جائیں گے۔تمام کرۂ زمین سے صرف مدینہ طیبہ اور بیت المقدس میں داخل نہ ہوسکیں گے۔ مفسرین کا کہنا ہے کہ جب سے یہ دیوار بنی ہے وہ روزانہ اور مسلسل اس دیوار کو توڑنے میں مصروف ہیں' تمام دن محنت کرتے کرتے جب اس میں سوراخ کرنے کے قریب ہوتے ہیں' تب ہی ان میں سے کوئی کہتا ہے اب چلو باقی کل توڑ لیں گے' تو یہ لوٹ جاتے ہیں البتہ جب دوسرے روز واپس آتے ہیں تو دیوار ویسی کی ویسی مکمل ہوتی ہے جیسی کہ توڑنے سے قبل تھی۔

قربِ قیامت میں جب یہ تھک کر لوٹنے لگیں گے تو ان میں سے کوئی یہ کہے گا کہ اب چلو باقی دیوار انشاءاللہ کل توڑیں گے۔انشاءاللہ کہنے کا ثمر یہ ہوگا کہ اس دن کی محنت رائیگاں نہیں جائیگی اور اگلے دن انہیں وہ دیوار اُتنی ٹوٹی ہوئی ملے گی جتنی وہ گزشتہ روز توڑ چکے تھے۔یوں وہ ایک روز اس جگہ سے نکلنے میں کامیاب ہوجائیں گے اور وہ قرب قیامت کا وقت ہوگا۔حضرت عیسیٰؑ کا نزول ہوچکا ہوگا اور آپؑ ہی انہیں ہلاک کریں گے۔اس طرح کہ ان کی گردنوں میں کیڑے پیدا ہوجائیں گے جو انکی ہلاکت کا باعث ہونگے۔اس ضمن میں سورۃ کہف ہی میں فرمان رب العالمین ہے:۔

قَالَ هٰذَا رَحۡمَةٌ مِّنۡ رَّبِّیۡ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ رَبِّیۡ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَ كَانَ وَعۡدُ رَبِّیۡ حَقًّا ۟ (۹۸) وَ تَرَكۡنَا بَعۡضَهُمۡ یَوۡمَئِذٍ یَّمُوۡجُ فِیۡ بَعۡضٍ وَّ نُفِخَ فِی الصُّوۡرِ فَجَمَعۡنٰهُمۡ جَمۡعًا ۙ (الکھف:۹۸/۹۹)

ترجمہ:۔کہا(ذوالقرنین نے) یہ میرے رب کی رحمت ہے' پھر جب میرے رب کا وعدہ آئیگا (یعنی یاجوج و ماجوج کے خروج کا وقت آئیگا) پاش پاش کردیگا (اس سد سکندری کو) اور میرے رب کا وعدہ سچا ہے (۹۸) اور اس دن ہم انہیں چھوڑ دیں گے کہ انکا ایک گروہ دوسرے پر ریلہ آوے گا اور صور پھونکا جائیگا تو ہم سب کو اکٹھا کرلائیں گے (کہف ۹۹)

سکندر ذوالقرنین علیہ السلام نے پڑھا تھا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے سام کی اولاد میں سے ایک شخص چشمۂ حیات میں سے پانی پیئے گا اور پھر اسے موت نہ آئیگی۔آپ علیہ السلام نے اپنے حکیموں سے بھی دریافت کیا کہ کیا واقعی کوئی ایسی جگہ ہے جہاں ایسا چشمہ موجود ہو۔اس پر ایک حکیم نے عرض کی کہ اے جہاں پناہ !ایک چشمہ ظلمات میں کوہِ قاف کے اندر موجود ہے جسے مخفی رکھا گیا ہے۔جس کا پانی شفاف میٹھا اور ٹھنڈا ہے اور جس کے پینے کی تاثیر یہ ہے کہ اسے پینے والے کو صورِ اسرافیل پھونکے جانے تک کسی طرح موت نہیں۔چنانچہ سکندر ذوالقرنین علیہ السلام چشمۂ حیات کی طلب میں حضرت خضرؑ کے ہمراہ کوہِ قاف کی جانب روانہ ہوئے اور چشمہ تک پہنچ بھی گئے مگر اچانک دونوں ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔حضرت خضرؑ نے اس چشمے کو پالیا اور اسکا پانی پی لیا مگر ذوالقرنین علیہ السلام کے مقدر میں نہ تھا اس لئے وہ نہ پی سکے۔

یہ تھا اس سوال کا جواب جو یہودی ابوجہل کے ذریعے بطورِ آزمائش پوچھ رہے تھے۔جب انہوں نے یہ تمام تفصیل سنی تو ہکا بکا رہ گئے اور آپس میں کہنے لگے کہ یہ تو حرف بحرف وہی کلام ہے جو توراۃ و زبور میں ہے اور اس میں ذرا بھی فرق نہیں۔چنانچہ سوائے ابوجہل کے سب ایمان سے مشرف ہوگئے۔ابوجہل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا اب بھی گواہی دیتے ہو کہ میں خدا کا سچا رسول ہوں یا کچھ اور پوچھنا چاہتے ہو؟ اس پر وہ لعین کہنے لگا' تم ایک ساحر ہو جیسا کہ دوسرا ساحر موسیٰ تھا۔میں ہرگز تمہارے دین میں آنے والا نہیں۔(نعوذ باللہ من ذالک)

حضرت سکندر ذوالقرنین علیہ السلام کا ذکر قرآن حکیم میں سورۃ الکہف میں تفصیل سے بیان فرمایا گیا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

آپؑ کا نام مبارک یسوع اور عیسیٰؑ ابن مریمؑ ہے جبکہ لقب مسیح تھا۔ انجیل اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ کی ولادت سے پیشتر ہی یہ لقب اللہ جل شانہ کی طرف سے آپ کو عطا فرما دیا گیا تھا۔ انجیل میں ہے کہ جب فرشتے نے حضرت مریمؑ کو حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کی بشارت دی تو کہا:۔

''دیکھ تو امید سے ہوگی اور تیرے بیٹا ہوگا اس کا نام یسوع رکھنا''۔ (لوقا باب ۱/۳۱)

قرآن حکیم میں اس بشارت کو یوں بیان فرمایا گیا ہے:۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ق اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ (۴۵) وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (۴۶) (سورۃ: آل عمران: ۴۵/۴۶)

ترجمہ:۔ جب فرشتے نے کہا اے مریم بیشک اللہ تجھے اپنی طرف سے ایک کلمہ کی بشارت دیتا ہے جس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا جو دنیا و آخرت میں وجیہہ اور مقربین خدا میں سے ہوگا (۴۵) اور وہ لوگوں سے پالنے ہی میں کلام کریگا اور پکی عمر میں بھی اور خدا کے خاصوں (یعنی صالح لوگوں) میں سے ہوگا (آل عمران: ۴۵/۴۶)

گویا نہ صرف آپکا نام بلکہ لقب بھی من جانب اللہ تھا۔ جہاں تک آپؑ کی بشارت دیتے ہوئے ''کلمہ'' کا لفظ بیان فرمائے جانے کا تعلق ہے، تو عرض ہے کہ یوں تو کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے کلمۂ کن کی جلوہ گری ہے (کہ وہ جس چیز کو فرمائے ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے) لیکن اس کیلئے بھی اس ذات نے اپنی حکمت کاملہ سے اشیاء کو سبب اور مسبّب، علت اور معلول کے رشتوں سے مربوط فرما رکھا ہے اور دنیا کو تخلیق فرماتے وقت بھی اس دنیا کو دنیاوی نظام کے تحت ہی تخلیق فرمایا گیا۔ وگرنہ ارادۂ کن سے یک جنبش چشم میں اس کائنات کو تخلیق فرما سکنے والی ذات اسے ایامِ ستہ میں تخلیق فرمانے پر مجبور تو نہیں تھی۔ یہاں حضرت عیسیٰؑ کی خرقِ عادت تخلیق اور آپکی معجزاتی پیدائش میں عام نگاہ، سبب اور علل کے حجاب میں اٹک سکتی تھی۔ کیونکہ بشری ولادت کا سببِ عادی (باپ) موجود نہیں، اور یہاں کلمۂ کن کی جلوہ

گری اور کرشمہ آفرینی بہت واضح اور نمایاں ہے اسلئے حضرت عیسیٰؑ کو بطورِ خاص "کلمة" فرمایا گیا۔

گزشتہ اَوراق میں حضرت مریمؑ کے زیرِ عنوان تحریر کیا جا چکا ہے کہ مختلف اعتراضیہ سوالات کے جواب میں حضرت مریمؑ نے خاموشی اختیار فرمائی اور اپنے نوزائدہ بیٹے کی جانب اشارہ کیا کہ اپنے سوالات خود انہی سے پوچھ لو تو وہ لوگ برہم ہوتے ہوئے تعجب سے کہنے لگے کہ پالنے میں پڑا یہ شیر خوار بچہ کیونکر بول سکتا یا ہمیں جواب دے سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے عیسیٰؑ کو زبانِ تکلم عطا فرمائی' آپ نیم دراز حالت میں اٹھے اور معترضین کو مخاطب کر کے فرمایا' سورۃ مریم میں ہے:۔

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۙ (۳۰) وَّ جَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ ۪ وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا ۪ (۳۱)

ترجمہ:۔فرمایا (عیسیٰؑ نے) میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا ہے (۳۰) اور مجھے مبارک کیا ہے میں جہاں کہیں بھی ہوں مجھے نماز اور زکوٰۃ کی تاحیات (پابندی کی) تاکید فرمائی ہے (مریم:۳۱)

یہ کلام سنتے ہی نہ صرف اہل خانہ بلکہ حضرت مریمؑ پر کیچڑ اچھالنے والے یہودی بھی حیرت و استعجاب سے انگشت بدنداں رہ گئے۔ پھر اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے سوا کسی کے پاس چارۂ کار نہ رہا کہ یقیناً یہ مافوق الفطرت بچہ خداوند کا پیغمبر ہے۔ آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ ہم نے اس کی ماں پر جو تہمت لگائی تھی وہ سراسر کذب اور بہتان ثابت ہوئی۔ اگرچہ بہت سے یہودی اس سے مایوس ہوئے اور حضرت مریمؑ کو بدنام کرنے ہی میں دلچسپی رکھتے تھے۔ تاہم اس کے بعد حضرت مریمؑ اپنے نادر و نایاب بچے کی پرورش و نگہداشت اور خدا تعالیٰ کے شکر و ذکر میں دن رات جتی رہیں۔

بنی اسرائیل آپؑ کے پالنے ہی کی عمر سے تواتر کے ساتھ آپؑ کے گہوارے کے پاس حاضر ہوتے اور آپؑ انہیں توراۃ کی تعلیم دیا کرتے۔ یہ سلسلہ دو سال کی عمر تک تواتر سے جاری رہا تا آنکہ آپؑ اپنی والدہ کے ہمراہ ہجرت فرما کر مصر چلے گئے۔

حضرت عیسیٰؑ کے سن بلوغت کو پہنچنے پر جب آپؑ پر وحی کا نزول شروع ہو گیا تو خدا تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق آپؑ نے لوگوں کو اپنے رب کی طرف دعوت دینا شروع فرما دیا۔ جب آپؑ نے انہیں

راہِ ھدایت کی طرف بلایا اور اپنی نبوت و شریعت کو قبول کرنے کا کہا تو انہوں نے مذہب یہودیت صفحۂ ہستی سے مٹ سکنے کے اندیشہ میں آپؑ کی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا اور طعنہ دیتے ہوئے کہنے لگے ہم اپنے دین موسوی کو چھوڑ کر ایک بن باپ کی بات کو کیوں قبول کریں۔ حالانکہ یہود و نصاریٰ کو حضرت عیسٰیؑ کی خرقِ عادت پیدائش پر کسی مغالطہ کا شکار نہ ہونے کے ضمن میں حضرت مریمؑ نے تخلیق آدمؑ بغیر ماں و باپ کی مثال یوسف بخار کو بھی دی تھی جسے سورۃ آل عمران میں یوں بیان فرمایا گیا:۔

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ (۵۹) اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ فَلَا تَکُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِیْنَ (اٰلِ عمران: ۵۹/۶۰)

ترجمہ:۔ بیشک عیسٰیؑ کی مثال اللہ کے نزدیک آدمؑ کی سی ہے اسے مٹی سے بنایا پھر (جس کام کو) فرمایا ہو جا (تو) وہ فوراً ہو جاتا ہے (۵۹) اے سننے والے یہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے پھر تو شک (کرنے) والوں میں نہ ہونا (آل عمران: ۶۰)

سوتے ہوئے کو تو جگائے مگر جاگتے ہوئے کو کیونکر جگایا جائے کی مصداق دعوتِ عیسائیت پر یہودیوں کی حضرت عیسٰیؑ سے مخالفت شروع ہوگئی جو بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ گئی کہ آپؑ کو وہاں سے بھی ہجرت کرنا پڑی اور پھر اسم بامسمّٰی کے مصداق آپؑ کہیں مستقل قیام نہ فرما سکے۔ آپؑ کی تمام زندگی (تاوقتیکہ آسمانوں پر نہ اٹھا لیے گئے) قریہ بہ قریہ سفر اور تبلیغ میں گزری۔ بعض علماء نے مسیح کے معنی ایسے سیاح کے بتائے ہیں جس کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہ ہو۔

جس جگہ حضرت عیسٰیؑ کی ولادت ہوئی اس علاقے میں چرواہے رہائش پذیر تھے ان لوگوں کو ایک شب بشارت ہوئی کہ جس اولوالعزم پیغمبر کا وہ انتظار کر رہے تھے اس مشیحا (مسیحا) کی چند روز قبل ولادت ہو چکی ہے۔ جسے لوقا کی انجیل میں یوں بیان فرمایا گیا ہے:۔

''آج حضرت مسیح کی ولادت ہو چکی ہے جس کی نشانی یہ ہے کہ تم ایک بچے کو گہوارہ میں پڑا ہوا پاؤ گے۔ چنانچہ وہ صبح ہی صبح بیت اللحم میں آئے اور آپؑ کو دیکھ کر تعظیم بجالائے'' (لوقا باب ۲ ص ۸ تا ۱۸)

پیدائش کے آٹھویں روز شریعت موسوی کے مطابق آپؑ کا ختنہ ہوا اور آپکا نام عیسٰیؑ رکھا گیا جس کے بعد ضروری رسوم کی ادائیگی کیلئے آپؑ کو یروشلم لایا گیا جہاں ایک راست باز ہستی حضرت شمعونؑ بھی رہائش

پذیر تھی۔ انہیں بھی حضرت عیسیٰؑ کی ولادتِ باسعادت کی خبر پہلے ہی مل چکی تھی۔ شمعونؑ نے آپکو گود میں اٹھایا اور حمد کہی۔

اسی دوران مشرق کے ایک مُلک میں تین مجوسیوں نے آسمان پر ایک ستارہ دیکھ کر یہ گمان کیا کہ یہودیوں کا بادشاہ پیدا ہوا ہے' چنانچہ وہ اس بچے کی تلاش میں یروشلم آئے۔ آپؑ کو دیکھ کر انہوں نے وہاں کے حاکم ہیرودیس کو جب یہ اطلاع دی کہ تمہاری بادشاہی متزلزل ہونے والی ہے' تو اسے اپنے تخت وتاج کی فکر پڑ گئی۔ جسے انجیل متی نے یوں بیان فرمایا ہے:۔

''نجومیوں کے اشاروں پر اس نے اپنے آدمی یروشلم کی طرف روانہ کر دیے کہ حضرت عیسیٰؑ کو قتل کر ڈالیں'' (متی باب:۳ ص ۱ تا ۱۲)

ایسی صورتِ حال میں یوسف بخّار کو بذریعہ خواب حکم ہوا کہ وہ حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کو لیکر مصر روانہ ہو جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور جب مجوسی ہیرودیس کے پاس ناکام واپس لوٹے کہ انہیں وہ بچہ تلاش کرنے میں ناکامی ہوئی ہے' تو وہ سخت برہم ہوا۔ چونکہ اس اثناء میں قریباً دو سال کا عرصہ گزر چکا تھا' اسلئے اس نے دو سال تک کی عمر کے تمام نوزائدہ بچے قتل کروا دیئے۔ قرآن کریم میں اگرچہ اس واقعہ کے بارے کوئی واضح ذکر موجود نہیں تاہم آپؑ کی پہلی ہجرت کا واقعہ یوں بیان فرمایا گیا ہے:۔

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗۤ اٰيَةً وَّ اٰوَيْنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِيْنٍ ع (مومنون: ۵۰)

ترجمہ:۔ اور ہم نے مریم کے بیٹے اور انکی ماں کو اپنی قدرت کی نشانی بنایا اور انکو رہنے کے لائق ایک اونچی جگہ (پہنچایا) جہاں پانی جاری تھا (انہیں وہاں) پناہ دی (مومنون ۵۰)

بہت سے مفسرین نے اونچی جگہ سے مراد ملک مصر لیا ہے جیسا کہ مولانا ابوالکلام آزاد رقمطراز ہیں:۔

''غالباً اس سے مقصد وادیٔ نیل کی بالائی سطح ہے یعنی مصر کا بالائی حصہ' اناجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش کے بعد مریمؑ کے منگیتر یوسف بخار نے ماں بیٹے کو ساتھ لیا اور فلسطین سے مصر چلا گیا' چنانچہ حضرت مسیح کا بچپن اور شباب وہیں گزرا۔ جب فلسطین واپس آئے تو جوانی کی عمر کو پہنچ چکے تھے'' (ترجمان القرآن ج ۲ ص ۵۳۱)

محققین ادیان کا خیال ہے کہ آپؑ نزولِ وحی تک فرقہ الیسینی سے متعلق رہے اس گروہ میں صرف وہی لوگ رکن کی حیثیت سے داخل کیے جاتے تھے جو بڑے دل گردے کے مالک اور سخت دشوار گزار آزمائشوں سے دوچار ہوکر کامیاب وکامران ہونے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ حضرت عیسیٰؑ کی زندگی فقیرانہ طریق سے بسر ہوئی اور اس تیس برس کی عمر تک آپؑ کے ماموں حضرت یحییٰ بن زکریا علیہ السلام کا سکۂ نبوت جاری وراں رہا۔ بعد ازاں حضرت عیسیٰؑ احکامِ وحی اور مطابق شرع و دین عیسوی لوگوں کو تبلیغ وترسیل ھدایت پر متعین ہوئے اور خود بھی اس پر سختی سے عمل پیرا رہے۔ یہ سب آپکے لئے سہل تھا کیونکہ فرقہ الیسینی کے مقصد کے مطابق آپؑ خلق خدا کی خدمت میں پہلے سے مصروف رہے تھے۔ اس گروہ کے مقاصد میں لوگوں کی خدمت کرنا' بیماروں کا مفت علاج کرنا اور ناداروں کا دکھ درد بانٹنا تھا۔ اس وقت مصر اور فلسطین اس فرقہ کے لوگوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔

تبریس قیصر کی حکومت کے پندرہویں سال یعنی تقریباً ۲۸ء میں آپؑ حضرت یحییٰؑ سے ملاقات کیلئے ناصریہ سے یرون تشریف لائے جہاں حضرت یحییٰؑ دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ آپؑ نے حضرت یحییٰؑ سے بپتسمہ لیا اور تبلیغ کیلئے دور دراز علاقوں میں نکل گئے۔

بپتسمہ ممسوح سے مأخذ ایک مذہبی رسم ہے جو یہودیوں میں بھی مروج تھی۔ کیونکہ یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک زبردست ہادی اور انکا نجات دھندہ آنے والا ہے جو ہاتھ سے چھوکر بیماروں کو شفایاب کردیگا اور اسکے چھونے سے لوگوں کو خیر وبرکات کا حصول ہوگا۔ چنانچہ ان میں بھی یہ رسم مروج ہوگئی تھی کہ انکے نبی یا کاہن کسی حکمران کی نامزدگی کے موقع پر یا ضرورت مندوں کو مدد اور برکت دینے کیلئے یہ رسم ادا کرتے' جو یوں ہوتی کہ دعا دیکر اس شخص پر تیل کی مالش کردی جاتی یا اسے پانی میں بھگو دیا جاتا' یا اس پر کوئی کپڑا ڈال دیا جاتا۔ اسکے بعد وہ شخص ممسوح (ANOINTED) یا متبرک ومبارک ہوجاتا' توراۃ میں اس رسم کی بیشمار مثالیں موجود ہیں۔

بپتسمہ لینے کے بعد آپؑ شہر شہر گاؤں گاؤں جاتے' لوگوں کو اللہ کا پیغام سناتے اور جہاں رات ہوتی وہیں بسر کرلیتے۔ آپؑ نے تمام عمر شادی کی نہ اپنا کوئی گھر یا مستقل ٹھکانہ بنایا۔ تین سال تک آپکی زندگی یورپ کے تبلیغی سفر میں گزری۔ جب آپکو منصبِ نبوت کی ذمہ داریاں سونپی گئیں اور وحی کا نزول

شروع ہوا۔اس وقت تک اصل شریعتِ موسوی مسخ ہو چکی تھی اور بنی اسرائیل توراۃ کو نہ صرف تحریفات کی بھینٹ چڑھا چکے تھے بلکہ اپنی کتاب کی اصل تعلیمات کو بھی فراموش کر چکے تھے۔علماء سے لیکر عوام الناس تک میں گمراہی عام ہو چکی تھی۔گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ مفاد پرست احبار نے شریعت موسوی کو نسیان اور تحریف وتغافل کے گرد وغبار کی موٹی تہہ تلے چھپا دیا تھا۔فروعی اختلافات، نجی جھگڑوں اور آپس کی دشمنیوں نے دین اور شریعت کے معاملات میں کئی اختلافات پیدا کر دیئے تھے۔چنانچہ اس اَمر کی شدید ضرورت تھی کہ اللہ کا کوئی نبی آئے اور انہیں حق وباطل میں فرق کی تمیز کروائے۔

آپؑ کی بعثت مبارکہ کے تین اہم مقاصد یہ تھے کہ اوّل، توراۃ اور اسکی تعلیمات کی تصدیق دوم، شریعت موسوی کی تکمیل اور یہود کے مابین اختلافات کا فیصلہ۔جیسا کہ قرآن کریم نے آپؑ کے اس مشن کے ذکر کو خود عیسیٰؑ کی زبان سے یوں ادا فرمایا۔سورۃ زخرف میں ارشادِ ربانی ہے:۔

وَ لَمَّا جَآءَ عِیۡسٰی بِالۡبَیِّنٰتِ قَالَ قَدۡ جِئۡتُکُمۡ بِالۡحِکۡمَۃِ وَ لِاُبَیِّنَ لَکُمۡ بَعۡضَ الَّذِیۡ تَخۡتَلِفُوۡنَ فِیۡہِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوۡنِ (زخرف:۶۳)

ترجمہ:۔جب عیسیٰؑ نشانیاں لے کر آئے تو کہنے لگے کہ میں تمہارے پاس دانائی لے کر آیا ہوں نیز اس لئے کہ بعض باتیں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو تم کو سمجھا دوں، تو خدا سے ڈرو اور میرا کہا مانو (زخرف:۶۳)

حضرت عیسیٰؑ کی بعثت مبارکہ کا تیسرا اور اہم مقصد نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کی بشارت ومنادی تھا۔یوں تو آپؑ سے قبل بھی تمام ہادیانِ برحق نے، جو مختلف زمانوں، قوموں اور ملکوں میں مبعوث ہوئے احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ خاتم النبیّن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہورِ پُرنور کی پیش گوئی فرمائی ہوئی تھی، تاہم آپؑ چونکہ خاتم الانبیائے بنی اسرائیل تھے اور آپکے بعد سوائے خاتم الانبیاء کے کوئی نبی پیغمبر آنے والا باقی نہیں تھا، سو ضروری تھا کہ اس زمانہ فترت کے بعد آنے والے آخری پیغمبر کے ظہور کی بشارت اور اپنے پیروؤں کو انکی اطاعت ونصرت کی تاکید کی جاتی۔آپؑ کے اس اہم مقصد کو قرآن حکیم نے سورۃ الصّف میں یوں بیان فرمایا ہے:۔

وَ اِذۡ قَالَ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ اِلَیۡکُمۡ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوۡرٰىۃِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوۡلٍ یَّاۡتِیۡ مِنۡۢ بَعۡدِی اسۡمُہٗۤ اَحۡمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَہُمۡ

بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (الصف:٦)

ترجمہ:۔اور وہ وقت یاد کرو جب مریم کے بیٹے عیسیٰؑ نے کہا کہ اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف خدا کا رسول ہوں اپنے سے پہلی توراۃ کی تصدیق کرتا اور اُس رسول کی بشارت دیتا ہوں جو میرے بعد تشریف لائیں گے جن کا نام احمد ہوگا' پھر جب وہ انکے پاس کھلی نشانیاں لیکر تشریف لائے تو بولے یہ کھلا جادو ہے (الصف:٦)

حضرت عیسیٰؑ کا وعظ یہودیوں کے نزدیک زہرِ قاتل تھا' کیونکہ انہوں نے اپنی ذات میں برہمنیت کی صفات پیدا کر کے اپنے لئے خدائی مسندیں بچھا رکھی تھیں۔آپؑ کے خیالات سے انہیں اپنی بساطِ لعب ولالچ صاف الٹتی نظر آ رہی تھی' لہٰذا یہودیوں نے ڈٹ کر حضرت عیسیٰؑ کی مخالفت روا رکھی اور باوجودیکہ حضرت عیسیٰؑ نے بحکم خدا تعالیٰ انہیں بہت سے معجزات دکھائے' یہاں تک کہ مُردوں تک کو بھی زندہ کر دکھایا' لیکن وہ انکار پر مُصر رہے اور آپؑ پر ایمان نہ لائے۔ یہودیوں کی مکارانہ کج ادائیاں تو شروع ہی سے علم کائنات میں ہیں' انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کو حکومت کا باغی قرار دلوا کر انہیں صلیب پر چڑھوانے کی حکمت عملی پر عمل درآمد شروع کر دیا۔

یہودیوں کی نیاتِ بد کو بھانپتے ہوئے آپؑ نے وہاں سے بھی ہجرت فرمائی اور شہر سے نکل کر مضافات کی طرف چلے گئے۔ وہاں جا کر دیکھا کہ کچھ دھوبی کپڑے دھو رہے ہیں۔آپؑ نے فرمایا کہ تم لوگوں کے کپڑے دھو کر صاف کر رہے ہو' مگر کیا کبھی اپنے دلوں کو بھی پاک وصاف کرنے کی کوشش کی؟ وہ اس عارفانہ کلام کو سن کر کیا سمجھتے' فوراً سوال کیا کہ ہم اپنے دلوں کو کیونکر دھوئیں۔حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا دلوں کی صفائی شرک وکفر سے دلوں کا پاک وصاف کرنا ہے۔ یہ سن کر پوچھنے لگے کہ بتایئے ہمیں کیا کرنا ہوگا کہ ہمارے دل پاک وصاف ہو جائیں۔آپؑ نے فرمایا زبان ودل سے یہ کلمہ پڑھو " لاالٰہ الااللہ عیسیٰ روح اللہ " پس دھوبیوں نے حضرت عیسیٰؑ کا کلمہ پڑھ کر آپکے دین کو قبول کیا اور آپکی اُمت میں شامل ہو گئے۔ پھر وہ سب دریا کے کنارے مچھیروں کے پاس پہنچے جو مچھلی کے شکار میں مصروف تھے۔ آپؑ نے انہیں بھی اپنی نبوت پر ایمان لانے کیلئے کہا۔ وہ کہنے لگے تمام نبی اپنے نبی ہونے کی دلیل میں کچھ نہ کچھ معجزے دکھاتے ہیں آپکے نبی ہونے کی کیا دلیل ہے؟ آپؑ نے فرمایا میں مٹی سے پرندے کی مورت بناتا ہوں پھر اُس پر دم کرتا ہوں تو وہ خداوند کے حکم سے زندہ ہو کر اڑنے لگتا ہے۔ میں پیدائشی

نابینوں کو بینا' کوڑھیوں کو تندرست اور مُردوں کو حکم خدا سے زندہ کر دیتا ہوں اور بتاتا ہوں جو کچھ تم کھا کر اور جو کچھ گھروں میں ذخیرہ کر کے آئے ہو۔ میں توراۃ کی تصدیق کرتا ہوں اور خود بھی صاحب کتاب نبی ہوں۔ میں یہ نشانیاں اپنے رب کی طرف سے لے کر آیا ہوں اگر تم یقین رکھتے ہو۔ سو تم اللہ سے ڈرو اور خداوند کے جو احکام میں تمہیں تعلیم کرتا ہوں انہیں مانو۔ بیشک ہم تم سب کا ایک ہی رب ہے اسکے علاوہ ہرگز کوئی پوجا کے لائق نہیں اور یہی سیدھا راستہ ہے۔

ان مچھیروں نے فرمائش کی کہ جیسے موسیٰؑ کے کہنے پر ہمارے بڑوں پر آسمان سے کھانا اترتا تھا آپؑ بھی ہمارے لئے آسمان سے کھانے کا ایک بھرا خوان منگوائیں تا کہ ہمیں برکات کا حصول ہو اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ آپؑ واقعی خدا کے سچے نبی ہیں۔ جیسا کہ سورۃ مائدہ میں ہے:۔

اِذْ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ هَلْ یَسْتَطِیْعُ رَبُّكَ اَنْ یُّنَزِّلَ عَلَیْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ(۱۱۲) قَالُوْا نُرِیْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَ تَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَ نَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَ نَكُوْنَ عَلَیْهَا مِنَ الشّٰهِدِیْنَ (مائدۃ: ۱۱۲/۱۱۳)

ترجمہ:۔ جب حواریوں نے کہا اے عیسیٰ ابن مریم کیا آپ کا رب ایسا کریگا کہ آسمان سے ہمارے لئے خوان اتارے' کہا (عیسیٰؑ نے) اللہ سے ڈرو اگر ایمان رکھتے ہو (۱۱۲) کہنے لگے ہم چاہتے ہیں کہ ہم اس میں سے کھائیں تا کہ ہمارے دل مطمئن ہو جائیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ آپؑ نے سچ فرمایا ہے اور اس پر گواہ ہو جائیں (مائدہ:۱۱۳)

انکی یہ باتیں سن کر آپؑ ایک بڑے میدان کی جانب تشریف لے گئے اپنے سر کو ننگا کیا اور ہاتھ اٹھا کر خداوند قدوس کی بارگاہ میں التجاء کی کہ تو سب کچھ دیکھنے سننے والا دانا ہے میرے حواریوں نے جو فرمائش کی ہے اگر وہ تیری مصلحت و مرضی کے خلاف نہ ہو تو انکے لئے اپنے فضل و کرم سے ایک خوانِ نعمت بھیج دے' جسے سورۃ مائدہ میں یوں بیان فرمایا گیا:۔

قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِیْدًا لِّاَوَّلِنَا وَ اٰخِرِنَا وَ اٰیَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَ اَنْتَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ (مائدہ:۱۱۴)

ترجمہ:۔ کہا عیسٰی ابن مریم نے اے میرے اللہ ہم پر آسمان سے اتار ایک خوان بھرا ہوا کہ وہ عید ہو ہمارے اگلوں اور پچھلوں کیلئے اور نشانی ہو تیری طرف سے اور ہم کو روزی عطا فرما اور تو ہی بہتر روزی دینے والا ہے (مائدہ:۱۱۴)

اس پر خداوند تعالیٰ کی طرف سے جواب عطا ہوا کہ میں تمہاری فرمائش پر ایسا خوان نازل تو کردوں گا لیکن اس کے بعد اگر کسی نے ناشکری کی تو اسے ایسا عذاب دونگا جو کسی اور کو نہ دونگا۔ اس لئے کہ جب کوئی انبیاء سے معجزہ طلب کرتا ہے اور ظہورِ معجزہ کے بعد بھی نافرمانی و ناشکری کرتا ہے تو عذابِ الٰہی ایسوں پر لازم ہو جاتا ہے۔ اسی بات کو قرآن حکیم نے سورۃ مائدہ میں یوں بیان فرمایا:۔

قَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مُنَزِّلُهَا عَلَیْكُمْ ۚ فَمَنْ یَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّیْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ع (مائدہ:۱۱۵)

ترجمہ:۔ فرمایا اللہ نے میں اتاروں گا تم پر وہ خوان پھر جو کوئی تم میں سے ناشکری کرے (تو) میں اس کو ایسا عذاب دونگا جو سارے جہاں میں کسی کو نہ کروں گا (مائدہ/۱۱۵)

چنانچہ ایک نہایت مہتم بالشان خوان طرح طرح کے کھانوں سے بھرا ہوا نازل ہوا۔ جب ان لوگوں نے اس کا سرپوش اٹھا کر دیکھا تو اس خوان میں پانچ روٹیاں اور تلی ہوئی بغیر کانٹوں کے ایک مچھلی اور تھوڑی سے ترکاری تھی، ایک نمک دان میں نمک اور پانچ انار اور تھوڑے سے خرمے اور زیتون کا روغن موجود تھا اور چند ایک دوسری اشیاء تھیں۔

یہ حیران کن منظر دیکھ کر بھی ان لوگوں نے اس میں سے کچھ نہ کھایا اور کہنے لگے اے عیسٰیؑ اس تلی ہوئی مچھلی کو اپنے معجزے سے زندہ کرو، تب ہم تم پر ایمان لائیں گے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے کچھ پڑھ کر اس مچھلی پر دَم کیا تو بحکم الٰہی مچھلی زندہ ہو کر تڑپی اور اس خوان سے باہر جا گری۔ یہ منظر کچھ ایسا تھا کہ تمام لوگ دہشت زدہ ہو گئے اور جن لوگوں نے یہ فرمائش کی تھی ان کیلئے تو یہ دہشت اس قدر ناقابل برداشت ثابت ہوئی کہ وہ صدمہ سے وہیں ہلاک ہو گئے۔ باقی لوگ معافی مانگنے لگے اور عرض کیا کہ مچھلی کو پہلی حالت میں کر دیا جائے تا کہ ہم اسے کھا سکیں۔ آپؑ نے بارگاہ ایزدی میں دعا کی تو مچھلی اپنی پہلی حالت پر لوٹ آئی۔ یہ تمام معجزہ بنی اسرائیل نے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا۔ اس کے بعد حضرت عیسٰیؑ

نے تمام لوگوں کو دعوت دی کہ دستر خوان پر بیٹھ جائیں اور دعا کے بعد اس برکت والے خوان سے کھانا کھائیں۔اس دعوت میں امیر وغریب کی تفریق نہ تھی اسلئے جو سردار تھے یا بالحاظ مال وزر خود کو برتر گمان کرتے تھے وہ غرور کے باعث غرباء کے ساتھ بیٹھ کر کھانے پر آمادہ نہ ہوئے۔

ایک روایت کے مطابق جوں جوں اس معجزہ کی خبر پھیلتی گئی لوگ جوق در جوق اکٹھا ہو کر اس خوان کے کھانے میں شریک ہوتے گئے۔جنہوں نے اس خوان سے کھایا انہیں بے بہا خیر و برکات کا حصول ہوا۔جو بیمار تھا شفایاب ہو گیا' جو نابینا تھا بینا ہو گیا' جو تنگدست ومحتاج تھا غنی ہو گیا اور اس خوان سے کھانے کا یہ سلسلہ تمام دن چلتا رہا لیکن خوان ویسے کا ویسا بھرا رہا اور اس میں سے کوئی بھی شئے ذرا بھی کم نہ ہوئی۔حتیٰ کہ رات ہوتے ہی یہ خوان واپس اٹھا لیا گیا اور جس کسی نے اس میں سے نہ کھایا تھا وہ پچھتانے لگا کہ وہ جنت کے کھانے اور اس کی برکات سے محروم رہ گیا۔

دوسرے روز بھی حکم الٰہیہ سے یہ خوان جنت سے پھر اترا اور اس خوانِ نعمت سے کثیر لوگوں نے وہ تلی ہوئی مچھلی انار روٹی وترکاری وغیرہ جی بھر کے کھائی اور ہر کسی کو اسکی پسند کے مطابق ذائقہ میسر ہوا' جسے میٹھے سے رغبت تھی اسکے لئے میٹھا جسے ترش چیز پسند تھی اسے وہ کھانا ترشی آمیز محسوس ہوا' الغرض اسی طرح وہ خوان تین روز تک نازل ہوتا رہا اور تمام اہل شہر اس میں سے آسودہ ہو کر کھاتے رہے۔مچھلی کے زندہ ہونے اور خوان نازل ہونے کے معجزہ کو دیکھ کر بہت سے لوگ ایمان لے آئے مگر بعض لوگوں نے اسے جادو قرار دیکر ایمان لانے سے انکار کر دیا۔جو ایمان نہ لائے ان پر واقعی خداوند قدوس کا ایسا عذاب نازل ہوا جو کسی پر نازل نہ ہوا۔وہ یہ کہ ان میں سے کچھ کی شکلیں خنزیر اور کچھ کی ریچھ جیسی ہو گئیں۔ مفسرین کے مطابق اُن لوگوں کی تعداد سات سو کے قریب تھی جنہوں نے مائدہ میں سے کچھ نہ کھایا تھا۔ جو لوگ ایمان لے آئے تھے اور جنہوں نے عزت واحترام سے اس خوان سے کھانا کھا کر خدا کا شکر ادا کیا تھا' انہیں نورِ اسلام کی سعادت حاصل ہوئی اور نہ صرف ایمان نصیب ہوا بلکہ انہوں نے ہر دو جہان کی رحمتیں اور برکتیں پائیں۔

حضرت عیسیٰؑ کی حیات مقدسہ میں آپکے تین سالہ فریضہ نبوت اور دعوت وتبلیغ کے جواب میں

صرف ایک سو بیس افراد آپؑ پر حقیقی اور پختہ ایمان لائے۔ آپؑ نے تیس سال کی عمر میں باقاعدہ اعلانیہ تبلیغ و ہدایت شروع فرمائی جو صرف تین سال تک جاری رہ سکی۔ یہودیوں کی خبیث الذہنی اور اپنوں کی غداریوں اور مکاریوں کی بھینٹ چڑھ کر تختہ دار تک جا پہنچنے کی نوبت آ گئی تو خداوند تعالیٰ نے انہیں آسمان پر اٹھا لیا۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ نصرانی عیسائی بھی یہودیوں کی طرح حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب قرار دینے لگے اور اصل حقیقت بروئے قرآن سامنے آجانے کے باوجود اپنی ہٹ دھرمی پر قائم ہیں۔ اس ضمن میں قرآن حکیم نے سورۃ آل عمران میں صاف اور واضح طور پر فرما دیا:۔

وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ع (۵۴) اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ (اٰل عمران : ۵۴/۵۵)

ترجمہ:۔ اور انہوں نے خفیہ چال چلی تو اللہ نے بھی مخفی تدبیر فرمائی اور اللہ کی مخفی تدبیر سب سے بہتر ہے (۵۴) جب اللہ نے فرمایا' اے عیسٰی میں تجھے پوری عمر تک پہنچاؤں گا اور تجھے اپنی طرف اٹھالوں گا اور تجھے کافروں سے پاک کردونگا اور تیرے پیروؤں کو قیامت تک تیرے منکروں پر غلبہ دوں گا پھر تم سب میری طرف پلٹ کر آؤ گے تو میں تم میں فیصلہ فرمادوں گا جس بات میں جھگڑتے ہو (اٰل عمران: ۵۴/۵۵)

یہ اٹل حقیقت آج بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہودی عیسائیوں کے زیرِ اثر اور انکے محتاج ہیں۔ حضرت عیسٰیؑ کو یہودی اپنی ہر چالبازی و مکاری کے باوجود سولی دینے میں ناکام ہوگئے اور یہوداہ نامی شاگرد جو آپؑ کی مخبری کر کے شاہی لشکریوں سمیت ''عین اسلوک'' نامی گھر سے گرفتار کروانے آیا تھا' اسکی شکل بعین حضرت عیسٰیؑ کی سی کر دی گئی جبکہ حضرت عیسٰیؑ کو آسمان پر اٹھا لیا گیا۔ چنانچہ شاہی لشکریوں نے اسی کو گرفتار کر کے سولی پر چڑھا دیا۔ اسی بات کو قرآن نے انکے مکر کو بیان فرماتے ہوئے اپنی مخفی تدبیر کو بہتر قرار دیا۔ نیز آپؑ کو مصلوب کر دینے کے انکے دعوے کو ردّ فرماتے ہوئے سورۃ نساء میں عیسٰیؑ کو اپنی طرف اٹھا لینے کے بارے سورۃ النسآء میں فرمایا:۔

وَّ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۙ (۱۵۷) بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (۱۵۸) وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۚ (النسآء:۱۵۷تا۱۵۹)

ترجمہ:۔اوران کے اس کہنے پر کہ ہم نے مسیح عیسٰی بن مریم اللہ کے رسول کوشہید کیا(جبکہ حقیقت یہ ہے کہ)انہوں نے نہ تو اسے قتل کیا نہ صلیب دی بلکہ ان کیلئے انکی شبیہ کا ایک بنادیا گیا اور جواُس کے بارے میں اختلاف کررہے ہیں ضرور اس کی طرف سے شبہ میں پڑے ہوئے ہیں انہیں اس کی کچھ بھی خبر نہیں مگر یہی گمان کی پیروی اور بیشک انہوں نے اسکو قتل نہیں کیا(۱۵۷) بلکہ اللہ نے اُسے اپنی طرف اٹھالیا اور اللہ غالب حکمت والا ہے(۱۵۸) اور کوئی اہل کتاب میں ایسا نہیں جو اس کی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لائے اور قیامت کے دن وہ ان پر گواہ ہوگا(النسآء:۱۵۹)

قرآن حکیم کے یہ واضح فرامین ایسی اٹل حقیقت پر مبنی اطلاعات ہیں جو ایمان لانے کے خواہشمندوں کیلئے نور کا مینار اور حقائق تک پہنچ سکنے کا سیدھا راستہ دکھا رہی ہیں۔اہل کتاب یہود و نصاریٰ کو آج بھی ضد اور تعصب کو چھوڑ کر انبیائے بنی اسرائیل اور حضرت عیسٰیؑ کی اصل تعلیمات و وصایا پر عمل کر لینا چاہیے یہ انکے اپنے ہی حق میں بہتر اور مفید ہے۔یہود و نصاریٰ دونوں کو خطاب یوں فرمایا گیا کہ یہودیوں نے فخریہ ایسا اعلان کیا کہ ہم نے یسوؑع کو مصلوب کیا اور نصرانیوں نے بلا تحقیق مان لیا۔

ان آیات میں صاف واضح فرمان الٰہیہ ہے کہ حضرت عیسٰیؑ کو مصلوب نہیں کیا گیا' بلکہ انہوں نے اپنے ہی ایک مخبر ساتھی کو (جسکی شکل وصورت بعینہٖ حضرت یسوع مسیح علیہ السلام کی سی کر دی گئی تھی) پکڑ کر سولی پر چڑھا کر قتل کیا۔ایک قول ہے کہ وہ حضرت عیسٰیؑ ہی کا ساتھی اور شاگرد تھا جس کا نام یہوداہ تھا۔اس نے ''عین اسلوک'' نامی مکان پر جہاں تمام شاگردوں کا اجتماع اور دعوت کا اہتمام تھا محض تیس (روپے) سکوں کے عوض یہودیوں کو مخبری کی۔دوسرے قول کے مطابق یہ شخص جس کی شکل بعین حضرت

یسوع مسیح علیہ السلام کی سی کر دی گئی تھی وہ شیوع نامی یہودیوں کا ایک سردار تھا اور یہوداہ کی مخبری پر وہی سب سے پہلے مکان میں داخل ہوا کہ خود اپنے ہاتھوں حضرت عیسیٰؑ کو قتل کر ڈالے۔ اس نے اندر داخل ہو کر آپؑ کو بہت ڈھونڈا مگر نا کام رہا' کیونکہ انہیں اللہ تعالیٰ نے آسمان پر اٹھا لیا تھا۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد جب بقیہ یہودی اور لشکری اندر داخل ہوئے تو انہوں نے یہوداہ کو یا شیوع کو نیزہ کے زور پر گرفتار کر لیا اور (بوجہ مسیح علیہ السلام کی مماثلت کے) انکے شبہ میں یہوداہ کو تختہ دار پر چڑھا دیا۔ یوں جو مکر انہوں نے کیا تھا اللہ تعالیٰ نے الٹا انہی پر ڈال دیا اور وہ کسی کیلئے کھودے گئے کنویں میں خود ہی جا گرے۔ اس حقیقت کو آج نہیں تو کل' بہر حال سب کو تسلیم کرنا ہی ہوگا۔

اوپر گزر چکی سورۃ نسآء کی آیت (۱۵۹) اس حقیقت کا بھی علی الاعلان دعویٰ کر رہی ہے کہ بالآخر انہیں حقیقت تسلیم کرتے ہی بن پڑے گی کہ نہ تو حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کیا گیا نہ ہی انکی ابنیت کا عقیدہ درست ہے اور نہ ہی وہ شریکِ خدائی میں کسی طور حصہ دار ہیں۔ اس ضمن میں مفسرین نے جو تشریحی اقوالِ ممکنات بیان فرمائے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ میں سے جب بھی کوئی مرنے کے قریب ہوتا ہے تو وہ موت کے فرشتوں کو دیکھتے ہی حقائق کو جان لیتا ہے اور حضرت عیسیٰؑ پر انکے بشر اور پیغمبر خدا ہونے کا یقین کرتے ہوئے ان پر ایمان لے آتا ہے مگر افسوس کہ اس وقت ایمان لانا کسی کیلئے کچھ سود مند نہیں ہوتا کیونکہ ایمان لانا اس وقت تک قابل قبول ہے جب تک موت کے فرشتہ کو نہ دیکھا ہو۔

دوسرا قول یہ ہے کہ جب قربِ قیامت میں حضرت عیسیٰؑ آسمان سے نزول فرمائیں گے اس وقت تمام اہل کتاب ان پر ایمان لے آئیں گے۔ اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق حکم کریں گے اور اسی دین کے آئمہ میں سے ایک امام کی حیثیت سے نصاریٰ کے عقائد فاسدہ کا بطلان فرمائیں گے اور دین محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اشاعت فرمائیں گے۔ اس وقت یہود و نصاریٰ تمام کے تمام اسلام قبول کر لیں گے یا پھر قتل کر ڈالے جائیں گے۔ ان سے جزیہ بھی قبول نہ کیا جائیگا کیونکہ جزیہ قبول کرنے کا حکم حضرت عیسیٰؑ کے نزول فرمانے کے وقت تک ہے انکے

نزول کے بعد نہیں۔

تیسرا قول یہ ہے کہ ہر کتابی مرتے وقت موت کے فرشتوں کو دیکھ کر انبیائے بنی اسرائیل اور حضرت عیسیٰؑ کی تاکیدات کے مطابق نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئیگا' جو کہ قابل قبول نہ ہوگا جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ موت کا فرشتہ دیکھ لینے کے بعد خدا یا اسکے انبیاء پر ایمان لانا کوئی معنی نہیں رکھتا اور نہ ہی کچھ سودمند ہوگا۔

البتہ جو یہود و نصاریٰ نزولِ عیسیٰؑ کے زمانہ میں موجود ہونگے وہ ان پر ایمان لے آئیں گے اور آپکے حکم کے مطابق خدا کی وحدانیت اور نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئیں گے اور یوں وہ دنیا میں بھی قتل و رسوائی سے بچ رہیں گے اور آخرت میں بھی مسلمانوں میں اٹھائے جائیں گے۔

حضرت عیسیٰؑ کے مصلوب و مقتول ہونے کا نظریہ رکھنے والے یہود و نصاریٰ کے لئے اب بھی موقع میسر ہے کہ قرآن حکیم نے انکی غلط فہمیوں کا ابطال فرماتے ہوئے حقیقت بیان فرمادی ہے سو انہیں ہوش کے ناخن لینے کی ضرورت ہے۔

اوائل تبلیغ کے دوران جب حضرت عیسیٰؑ نے اپنے پیروکاروں کو خدا تعالیٰ کا تعارف پیش کیا تو اس میں خدا تعالیٰ کے عالم الغیب ہونے' زندہ کرنے اور مارنے اور پھر جلانے کا تذکرہ فرمایا اور انہیں بتایا کہ کس طرح حضرت آدمؑ کو انکے رب نے گوندھی مٹی کی مورت بنا کر اپنے دم سے انہیں زندہ و متحرک فرمادیا' وغیرہ وغیرہ۔ پھر بعد ازاں جب یہی معجزات خود حضرت عیسیٰؑ کے ہاتھوں سے سرزد ہوتے ہوئے ملاحظہ کیئے کہ آپؑ انہیں غیب کی خبریں دیتے کہ وہ کیا کھا کر اور گھروں میں کیا ذخیرہ کر کے آئے ہیں۔ نیز وہ اپنے ہاتھوں سے مٹی گوندھ کر چمگادڑ نما پرندے کی مورت بناتے اور دم کر کے اسے ہوا میں چھوڑتے تو وہ زندہ ہو کر اڑ جاتا۔ مُردوں کو زندہ کرنے کا اعجاز تو انہیں بدرجہ اُتم حاصل ہی تھا جیسا کہ سورۃ ال عمران میں عیسیٰؑ کا تعارف ہے:۔

وَ رَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۙ اَنِّیْ قَدْ جِئْتُکُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ ۙ اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ کَهَیْئَةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَکُوْنُ طَیْرًا م بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُبْرِئُ الْاَکْمَهَ وَ

الْاَبْرَصَ وَ اُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰہِ ۚ وَ اُنَبِّئُکُمْ بِمَا تَاْکُلُوْنَ وَ مَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِیْ بُیُوْتِکُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۚ (آل عمران: ۴۹)

ترجمہ:۔اور (مسیح) رسول ہوگا بنی اسرائیل کی طرف یہ فرماتا ہوا کہ میں تمہارے پاس ایک نشانی لایا ہوں تمہارے رب کی طرف سے کہ میں تمہارے لئے مٹی سے پرندہ کی سی مورت بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ فوراً زندہ ہو جاتی ہے اللہ کے حکم سے اور میں شفا دیتا ہوں مادرزاد اندھوں کو اور سفید داغ (کوڑھ) والوں کو اور میں مُردے زندہ کرتا ہوں اللہ کے حکم سے اور تمہیں بتاتا ہوں جو تم کھاتے اور جو اپنے گھروں میں جمع رکھتے ہو بیشک ان باتوں میں تمہارے لئے بڑی نشانی ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو (آل عمران:۴۹)

چنانچہ انہیں گمان ہوا کہ جس رب کا یہ ہمیں تعارف کرواتے ہیں ہو نہ ہو وہ ذات یہ خود ہی ہیں۔رفتہ رفتہ ان میں یہ خیال گہرا ہوتا چلا گیا اور وہ اس یقین تک پہنچ گئے کہ یہ ہی رب کائنات ہیں مگر کسی مصلحت کی بناء پر ہم سے اس بھید کو مخفی رکھے ہوئے ہیں۔

بتدریج یہ بات پھیلتی ہوئی جب اتنی عام ہونے لگی کہ حضرت عیسیٰؑ کو بھی اس کا علم ہو گیا۔تب آپنے اُن سب کو بلایا اور انکی اس غلط فہمی کی نہایت سختی سے تردید فرمائی یہاں تک کہ آپؑ نے بانگ دُہل انہیں انکے مشرک وکافر ہو چکنے کی خبر دی۔جیسا کہ سورۃ آل عمران میں فرمانِ الٰہیہ ہے:۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْھُمُ الْکُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَاشْھَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (آل عمران: ۵۲)

ترجمہ:۔اور عیسیٰؑ نے ان سے کفر پایا تو پوچھا کون ہیں جو اللہ کی طرف میرے مددگار ہوتے ہیں' حواری (جواب میں) کہنے لگے ہم دین خدا کے مددگار ہیں' ہم اللہ پر ایمان لائے اور (اے عیسیٰؑ) آپ گواہ ہو جائیں کہ ہم (اب پھر سے) مسلمان ہیں (آل عمران:۵۲)

اس بات پر وہ سخت گھبرا گئے تھے اور اپنے شرکیہ عقائد کے ازالہ کیلئے حل تلاش کرنے لگے اور خدا تعالیٰ کے حضور اپنی گمراہی پر معافی طلب کرنے لگے۔اس پر آپؑ نے انہیں نئے سرے سے ایمان لانے کا حکم فرمایا اور انہیں باور کروایا کہ رب تعالیٰ کی ذات وہ ہے جو تمہارا بھی رب ہے اور میرا بھی رب

وہی ہے۔ میں تو اسکی طرف سے پیغمبر ہوں جو اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ جو چیزیں اہل یہود پر حرام تھیں انہیں تمہارے لئے حلال کروں ۔ میں پہلی کتاب توراۃ کی تصدیق کرتا ہوں اور جو کچھ مجھ سے سرزد ہوتے دیکھتے ہو وہ میرے رب کی طرف سے مجھے عطا شدہ نشانیاں ہیں اس لئے اللہ سے ڈرو اور جس عقیدۂ راست کا میں تمہیں حکم کرتا ہوں اسے مانو۔ جیسا کہ سورۃ ال عمران میں ہے:۔

وَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۠ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ (۵۰) اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (ال عمران: ۵۰/ ۵۱)

ترجمہ:۔اور میں تصدیق کرتا ہوں اپنے سے پہلی کتاب توراۃ کی اور اس لئے کہ حلال کروں تمہارے لئے کچھ وہ چیزیں جو تم پر حرام تھیں اور میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نشانی لایا ہوں تو اللہ سے ڈرو اور میرا حکم مانو (ال عمران: ۵۰) بیشک میرا تمہارا سب کا رب اللہ ہے تو اسی کو پوجو یہی سیدھا راستہ ہے (ال عمران/۵۱)

آپکے حواریوں نے غلط فہمی کی بنیاد پر جب حضرت عیسیٰؑ کو ہی خدا تصور کر لیا تھا اور پھر آپکے سمجھانے پر خدا تعالیٰ سے معافی مانگی تو دوبارہ قبولِ اسلام کیلئے عیسیٰؑ نے بپتسمہ دیا' یوں کہ پانی میں زرد رنگ ڈال کر ان سب کو غسل دیا اور از سرِ نو کلمہ پڑھوایا۔ بعد ازاں انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کو گواہ بنایا کہ ہم نے اپنے رب کے حضور اپنے عقائد فاسدہ سے توبہ کی اور آپؑ اس پر گواہ رہیں کہ اب ہم مسلمان ہیں۔ جیسا کہ سوۃ ال عمران میں ہے:۔

رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ (ال عمران: ۵۳)

ترجمہ:۔اے ہمارے رب ہم اُس پر ایمان لائے جو تو نے نازل کیا اور رسول کے تابع ہوئے تو (اب) ہمیں حق پر گواہی دینے والوں میں لکھ لے (ال عمران: ۵۳)

عیسائیت میں مروج اسی رسم کا نام بپتسمہ ہے کہ عقائد شرکیہ سے توبہ کر کے نئے سرے سے ایمان و توحید پر عزم قائم کریں۔ مگر کس قدر دکھ اور شرم کی بات ہے کہ موجودہ عیسائی دوستوں' پادریوں

اور راہبوں نے اس سے مختلف بلکہ حقائق سے بالکل الٹ رِیت اختیار کر لی' کہ موجودہ رسم بپتسمہ بجائے اس کے کہ خداوند تعالیٰ کے وحدہٗ لاشریک ہونے پر گواہی دیجاتی' الٹا نوجوان لڑکے لڑکیوں سے حضرت عیسیٰؑ کے شریکِ خدائی اور خدا کا بیٹا ہونے کا اقرار کروا کر بپتسمہ دیا جاتا ہے اور تبھی نوجوان عیسائیوں کو داخل مذہب سمجھا جاتا اور انہیں بطورِ عیسائی مندرج کیا جاتا ہے' حالانکہ یہ ایک ہیبت ناک مغالطہ اور بہت بڑی گمراہی ہے۔ دکھ کی بات ہے کہ اس ضمن میں قرآن کی راہنمائی میسر ہونے کے باوجود بدقسمتی سے ادھر توجہ نہیں دیجاتی یا بدبختی کے باعث دانستہ اسے قبول نہیں کیا جاتا جبکہ سورۃ مائدہ میں خداوند تعالیٰ کا صاف فرمان ہے:۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (مائدہ/۱۷)

ترجمہ:۔ بلاشک وہ کافر ہو گئے جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے' تو آپ فرمائیں کہ اگر خدا مسیح ابن مریم کو ہلاک کر دے اور اسکی ماں (مریم) کو اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو (ہلاک کر دے تو اسے روکنے کیلئے) کوئی خدا کا کیا کر سکتا ہے' اور اللہ ہی کیلئے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ انکے درمیان ہے' جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے (مائدہ/۱۷)

آیت متذکرہ میں موجودہ عیسائیوں کے شرکیہ نظریات کے خلاف جلالِ کبریاء کا اندازہ لگا لینا کسی جاہل کیلئے بھی کچھ مشکل نہیں۔ سو حضرت یسوع مسیح علیہ السلام کے فرمان کے مطابق اپنے عقائد کی ترویج و اصلاح کی ضرورت ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم و تبلیغ کو قرآن نے یوں بیان فرمایا:۔

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (زخرف: ۶۴)

بیشک اللہ ہی میرا اور تمہارا رب ہے' پس اسی کی عبادت کرو' یہی سیدھا راستہ ہے (زخرف:۶۴)

نہ صرف یہی بلکہ قرآن نے ایسے نظریات کے حاملین کی عقول پر حیرت کا اظہار فرماتے

ہوئے کہا کہ کیا انہیں معلوم نہیں کہ حضرت عیسیٰؑ اور انکی والدہ حضرت مریمؑ تو کھانا کھاتے تھے جو اس بات پر دلیل ہے کہ جو بھوک کے باعث کھانے پر مجبور ہو وہ بھلا خدا کیونکر ہو سکتا ہے کیونکہ خدا مجبور نہیں اور حیرت ہے کہ ان لوگوں کو اتنی سی بات بھی سمجھ نہیں آتی۔ جسے سورۃ مائدہ میں یوں بیان فرمایا گیا ہے:۔

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (مائدہ:۷۵)

ترجمہ:۔ مسیح ابن مریم نہیں مگر ایک رسول اُس سے پہلے بہت سے رسول ہو گزرے اور اس کی ماں صدیقہ ہے دونوں کھانا کھاتے تھے دیکھو تو ہم کیسی صاف نشانیاں ان کیلئے بیان کرتے ہیں پھر بھی دیکھو وہ کیسے اوندھے جاتے ہیں (مائدہ:۷۵)

عیسائی فرقے اور انکے عقائد

ابتداً میں حضرت عیسیٰؑ کے پیروکاروں کے سات گروہ تھے۔ اریوسیہ، یونسیہ، مقدونیوسیہ، برانیہ، ملکانیہ، نسطوریہ اور یعقوبیہ۔ بعد ازاں نصاریٰ کے کئی فرقے ہو گئے تھے اور ہر کوئی حضرت عیسیٰؑ کے بارے جداگانہ مگر کفریہ عقیدہ رکھتا تھا۔ نسطوری آپؑ کو خدا کا بیٹا کہتے تھے، فرقوسی کہتے کہ وہ تین میں کے تیسرے ہیں اور انہیں کلمہ کی توجیہات میں بھی اختلاف تھا، بعض تین اقنوم مانتے تھے کہ باپ بیٹا اور روح القدس، یعنی انکے نزدیک تین خدا تھے باپ سے مراد ذات بیٹے سے مراد عیسیٰؑ اور روح القدس سے اُن میں حلول کرنے والی حیات مراد لیتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ تین الٰہ ایک ہی تھے یعنی وہ توحید فی التثلیث اور تثلیث فی التوحید کے چکر میں گرفتار تھے۔ بعض عیسائی فرقوں کا کہنا ہے کہ عیسیٰؑ ناسوتیت اور الوہیت کے جامع ہیں کہ ان میں ناسوتیت ماں کی طرف سے آئی اور الوہیت باپ کی طرف سے (نعوذ باللہ من ذٰلک) عیسائیوں میں یہ فرقہ بندی بولص نامی ایک یہودی کی پیدا کردہ ہے جبکہ اصل خرابی کی جڑ جارج سینٹ پال ہے۔ پہلے اُن چند فرقوں کے عقائد کے بارے اختصاراً عرض کرتا چلوں۔

(۱) اریوسیہ:۔ اسکندریہ کا ''اریوس قیس'' نامی ایک کاہن اس فرقہ کا بانی مبانی تھا۔ اس شخص کا زمانہ قسطنطنیہ کا عہد حکومت تھا اور قسطنطین اوّل اس کے مذہب پر قائم تھا۔ اریوس کا کہنا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ اللہ

تعالیٰ کا ایک کلمہ ہیں جن کے باعث اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کو پیدا کیا۔

(۲) بونسیہ:۔ یہ گروہ ''بونس الشمشاطی'' نامی ایک شخص کا پیروکار تھا جو توحید مجرد پر ایمان رکھتا تھا اور دیگر انبیاء کی طرح حضرت عیسیٰؑ کو بھی اللہ کا بندہ اور نبی سمجھتا تھا' نیز اس بات کا بھی قائل تھا کہ حضرت عیسیٰؑ بغیر باپ کے تولد ہوئے۔ (گویا یہ فرقہ راہِ راست پر تھا)

(۳) مقدونیوسیہ:۔ اس فرقہ کے لوگ ''مقدونیوس'' نامی شخص کے ماننے والے تھے جو توحید مجرد کا عقیدہ تو رکھتا تھا' مگر اسکے نزدیک حضرت عیسیٰؑ ہی روح القدس اور کلمۃ اللہ ہیں۔

(۴) ملکانیہ:۔ یہ گروہ اس بات کا قائل ہے کہ اللہ تعالیٰ تین اسباب پر مشتمل ہے' یعنی باپ بیٹا اور روح القدس اور یہ تینوں ازلی ہیں اس لئے عیسیٰؑ بیک وقت خدائے کامل اور مکمل انسان ہیں۔

(۵) بربرانیہ:۔ یہ گروہ حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کو دو خدا مانتا تھا۔

(۶) نسطوریہ:۔ اس کا بانی ''نسطور'' ہے جس کا عقیدہ تھا کہ مریمؑ نے خدا کو نہیں جنا بلکہ انسان کو جنا تھا اور اللہ تعالیٰ نے انسان کو نہیں خدا کو جنا تھا۔ حالانکہ اسکی وضاحت سورۃ اخلاص میں موجود ہے جیسا کہ:۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (۱) اَللّٰهُ الصَّمَدُ (۲) لَمْ يَلِدْ وَ لَمْ يُوْلَدْ (۳) وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (اخلاص:۱تا۴)

ترجمہ:۔ فرمادیجئے اللہ اکیلا ہے(۱) اللہ بے نیاز ہے(۲) نہ اس نے کسی کو جنا نہ کسی نے اس کو جنا(۳) اور نہ کوئی اسکی کنبہ برادری ہے وہ (تن تنہا ایک اور) اکیلا ہے (اخلاص:۱تا۴)

(۷) یعقوبیہ:۔ اس گروہ کے لوگوں کا کہنا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ خود ہی خدا ہے جو لوگوں کے گناہوں کے کفارہ میں مرگیا اور مصلوب ہوا نیز قتل کیا گیا۔ (نعوذ باللہ من ذٰلک)

اناجیل

حضرت عیسیٰؑ صاحب کتاب پیغمبر تھے جن پر انجیل مقدس نازل ہوئی۔ انجیل یونانی زبان کے لفظ انجیلون کا معرّب ہے اس کے بہت سے معانی ہیں۔ ابن فارس نے اس کے معنیٰ ''کسی چیز کو کھول کر بیان کرنا'' لکھے ہیں۔ انجیل ایک مختصر سی کتاب تھی جو جناب عیسیٰؑ کے غائب ہو جانے کے ساتھ ہی دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ناپید ہوگئی۔ کسی حدیث سے بھی یہ وضاحت نہیں ملتی کہ آیا روح اللہ علیہ السلام کے واپس نزول فرماتے وقت انجیل مقدس بھی ہمراہ ہوگی یا نہیں۔ امکان غالب ہے کہ انجیل ہمراہ نہ ہوگی کیونکہ آپؑ اسلام قبول فرما کر قرآن پر اکتفا فرمائیں گے۔

موجودہ اناجیل کے بارے مارٹن لوتھر نے لکھا ہے:۔

> ''جب عیسائیوں کو اپنے وجود کو یہودیوں سے الگ کر کے اپنی انفرادیت قائم کرنے کا خیال آیا تو انہوں نے انجیل کو مرتب کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ کنیسا کی مدد سے جو کچھ صحیح یا غلط مواد ملا لکھ لیا گیا۔ الغرض پانچویں صدی کے آخر میں کتاب مقدس کی یونانی زبان میں تدوین مکمل ہوئی۔ ابتداء میں اسے منزل من اللہ خیال کیا گیا۔ لیکن جب تنقید کی مشہور کونسل میں اس کو تنقید کی کسوٹی پہ پرکھا گیا تو اس کو غلط قرار دیدیا گیا۔ البتہ انجیل کے چونتیس نسخوں میں سے صرف چار موجودہ نسخوں کو منتخب کر لیا گیا۔ اگرچہ دیکھتے ہی دیکھتے ان چار اناجیل کے علاوہ بھی کئی مزید نسخے منظر عام پر آ گئے''۔ (مسلم شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا رسالہ ۲ ص ۵۴)

حضرت عیسیٰؑ اور انکے حواریوں کی زبان آرامی تھی لیکن اناجیل کے جو نسخے ترتیب دیئے گئے ان میں سے کسی کی بھی زبان آرامی نہیں اور یہ سب کے سب یونانی زبان میں تھے۔ جو حضرت عیسیٰؑ کے بعد آپؑ کے حواریوں اور شاگردوں نے ترتیب دیئے۔ یہاں تک کہ سب سے پہلا نسخہ بھی عیسیٰؑ کے رفع آسمان کے نو سال بعد تالیف ہوا۔ برناباس کو حضرت عیسیٰؑ کیساتھ مدت العمر قرب میسر رہا' مگر حیرت انگیز طور پر چار منتخب نسخوں میں انجیل برناباس شامل نہیں۔ اناجیل اربعہ کا مختصر تعارف یوں ہے:۔

(۱) انجیل متی:۔ یہ پہلی انجیل ہے جسے یسوع مسیح علیہ السلام کے ''متی الاوانی'' نامی ایک شاگرد نے

حضرت عیسیٰؑ کے اٹھالئے جانے کے نو سال بعد تالیف کیا۔اس کے باب دس کی آیت چھ میں اُن بارہ رسولوں کے نام مندرج ہیں جنہیں عیسیٰؑ نے تبلیغ کیلئے بنی اسرائیل کے گھرانوں کی طرف روانہ فرمایا۔یہ ملک شام کے شہر یہوذ میں عبرانی زبان میں لکھی گئی جو متوسط خط میں تقریباً اٹھائیس اَوراق پر مشتمل تھی۔

(۲)انجیل مرقس :۔ یہ دوسری انجیل ہے جسے انجیل متی کے تین سال بعد' شمعونؑ الصفا کے شاگرد مارقس الہارونی نے تالیف کیا' جسے انطاکیہ میں یونانی زبان میں لکھا گیا۔بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس انجیل کو خود شمعونؑ نے لکھا تھا مگر مصلحات کی بناء پر اسے اپنے شاگرد سے منسوب کر دیا۔یہ انجیل متوسط خط میں چوبیس اَوراق پر مشتمل تھی۔

(۳)انجیل لوقا:۔اس انجیل کو شمعونؑ کے شاگرد لوقا طبیب نے تالیف کیا' یہ بھی یونانی زبان میں تھی اور اسے رقایہ میں مکمل کیا گیا۔

(۴)انجیل یوحنا:۔ یہ چوتھی انجیل ہے جسے حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگرد'' یوحنا بن سیذائی نے حضرت عیسیٰؑ کے اٹھالئے جانے کے ۶۹ سال بعد تالیف کیا۔یہ انجیل اَیتھنس میں یونانی زبان میں لکھی گئی یہ بھی متوسط خط میں چوبیس صفحوں پر مشتمل تھی۔

اِن اناجیل میں بھی ابن اللہ کا عقیدہ کہیں شامل نہیں تھا اور خاص طور پر صدیوں کی گمنامی کے بعد ایک پوشیدہ انجیل ظہور پذیر ہوئی جس کا نام انجیل برناباس ہے۔اس انجیل کے مطالعہ سے بڑے بڑے پیچیدہ مسائل حل ہو جاتے اور شکوک وشبہات دُور ہو جاتے ہیں۔برناباس قبرص کا باشندہ تھا جس کا پہلا مذہب یہودیت تھا اور اس کا نام یوسس (JOSES) تھا۔حواری اسے برناباس کہتے تھے جس کا معنی ہے'' واضح نصیحت کا فرزند''۔قبولِ عیسائیت کے بعد سے وہ حضرت عیسیٰؑ کا بہت قریبی اور معتمد ساتھی رہا جس نے تمام عمر دین عیسوی کی اشاعت وترقی کیلئے سر دھڑ کی بازی لگائے رکھی۔انہی وصوف کی بناء پر اس نے اپنے حلقہ میں ایک بڑا مقام حاصل کر لیا تھا۔

ابتداء میں حضرت عیسیٰؑ کے پیروکار خود کو یہودیوں سے الگ کوئی امت تصور نہیں کرتے تھے نہ

انکی عبادت گاہیں الگ تھیں۔ حضرت عیسیٰؑ کی حیثیت وحقیقت اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ آپ کا تعلق انکے ماننے والوں کے نزدیک قطعاً وجہ تنازعہ نہ تھا اور سب آپکو انسان اور خداوند کا برگزیدہ بندہ مانتے تھے کیونکہ اُس وقت کے عیسائی یہودیوں سے بھی زیادہ توحید پرست تھے۔

ابن اللہ کا عقیدہ یا ایسا تصور ایک طویل مدت (قریباً چار صدی) کے بعد اُس زمانے میں پیدا ہوا جب سینٹ پال نامی ایک متشدد یہودی نے بظاہر اپنے ظلم وستم سے ہاتھ اٹھا کر نہ صرف عیسائیوں کو امن وامان بخشا بلکہ ان پر مہربانیوں کی بارش برسادی۔ بظاہر اس نے خود بھی عیسایت قبول کی اور پھر کچھ عرصہ بعد جب اپنا رسوخ قائم کرلیا تو رومیوں کے نام ایک خط لکھا جس میں اُس نے کہا:۔

''مسیح جسم کے اعتبار سے تو داؤد کی نسل سے ہے لیکن روح کی پاکیزگی کے اعتبار سے اور مُردوں میں سے جی اٹھنے کے بعد قدرت کے ساتھ خدا کا بیٹا ٹھہرا''۔

سینٹ پال کے عیسائیت قبول کرنے کے ساتھ ہی عیسائیت میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا کیونکہ اس سے قبل عیسائیت میں موجودہ شرکیہ نظریات کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ اسکے نظریات اور معتقدات کا منبع انجیل یا حضرت مسیح کے اقوال نہ تھے' بلکہ پال کی ذاتی سوچ اور اسکے مکر کی پیداوار تھے۔ وہ طرسوس کا باشندہ تھا اور کافی عرصہ روم میں رہا اور رُومیوں کے فلسفہ ومشرکانہ عقائد سے بہت متاثر تھا۔ عیسائیت کو بھی اس نے اِنہی عقائد کے سانچے میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی جو عوام کو بہت پسند آئی مگر حواری اور انکے راسخ العقیدہ پیروکار اسکو قبول کرنے پر تیار نہیں تھے۔ پال کو عوام الناس کی تائید کے علاوہ حکومت کی ہمدردیاں بھی حاصل تھیں اس لئے اس کے پھیلائے ہوئے عقائد کو لوگوں نے دھڑا دھڑ قبول کرنا شروع کردیا اور برناباس اور اسکے ساتھی پس منظر میں چلے گئے۔

بایں ہمہ چوتھی صدی عیسوی تک برناباس کے ہم عقیدہ لوگ کافی تعداد میں موجود تھے جو خداوند کو باپ کی حیثیت سے نہیں' واحد قادرِ مطلق کی حیثیت سے عبادت کرتے تھے۔ اُس وقت انطاکیہ کے بشپ پال کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ نہ خدا ہیں نہ فرزند خدا' بلکہ اس کے بندے اور رسول

ہیں۔انطاکیہ کا دوسرا بشپ جس کا نام لیوسین (LUCIAN) تھا وہ تقویٰ اور علم میں بڑی شہرت کا مالک تھا' وہ بھی تثلیث کے عقیدے کا سخت مخالف تھا۔اس نے اب تک تحریفات کے ذریعہ شامل کی جانے والی تثلیث کی عبارتیں انجیل سے نکال دیں۔چنانچہ اسے ۳۱۲ء میں شہید کر ڈالا گیا۔اس کے بعد اسکے ایک شاگرد (ARIUS) نے توحید کا پرچم بلند کیا اور اسکی پاداش میں اسے کئی مرتبہ کلیسا کے عہدے سے سبکدوش بھی کیا جاتا رہا۔کلیسا کی مخالفت کرنا آسان کام نہ تھا لیکن ایریس نے ایسے مشرکانہ عقائد کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جس سے لوگ جوق در جوق اس کے نظریات کو قبول کرتے چلے گئے مگر افسوس کہ وہ زیادہ دیر تک ان نظریات پر قائم نہ رہ سکے۔

دراصل نصاریٰ کا عقیدۂ ابنیت یہودیوں کا پیش کردہ وہ زہریلہ تحفہ ہے جسے نصرانیوں نے دانستہ یا نادانستہ بڑے شوق سے کھالیا۔جارج سینٹ پال ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے حضرت عیسیٰؑ کے نام کے ساتھ ابنیت' الوہیت' کفارۂ گناہ اور تثلیث جیسے لغو اور شرکیہ عقائد منسوب کر کے مذہب عیسائیت کو پامال کر ڈالا۔یہ یہودیوں کی بہت گہری سازش تھی کہ عیسائیت کو پنپنے نہ دیا جائے اور انکے عقائد میں رخنہ اندازی کر کے عیسائیوں کو آپس میں مبتلائے فساد کر کے نابود کر دیا جائے۔اسی لئے جارج سینٹ پال کو (جو کہ نصرانیوں کا سخت دشمن اور ان پر ظلم وتشدد کا مرتکب رہا تھا) اس کام کیلئے منتخب کیا گیا۔جس نے عیسائی مذہب اختیار کر کے خود کو عیسائیوں کا ہمدرد ساتھی ثابت کیا۔وہ یوں کہ اس نے اُن پر ظلم وستم ڈھانا ترک کر دیے اور بظاہر اپنے کیئے پر پچھتاتے ہوئے عیسائیوں پر مہربانیوں کی بوچھاڑ شروع کر دی اور یوں ان کا اعتماد حاصل کر کے چند ہی سالوں میں انکے دین ومذہب کو روندڈالنے کی راہ ہموار کر لی۔

اسی اثنا میں دو ایسے واقعات رُونما ہوئے جنہوں نے یورپ کی تاریخ بدل کر رکھ دی۔شاہِ قسطنطین (جس نے یورپ کے بڑے حصّے پر قبضہ کر لیا تھا) اس نے عیسائیت قبول کیئے بغیر عیسائیت کی امداد شروع کر دی۔اگرچہ عیسائی فرقوں کے باہمی اختلافات نے اسے سراسیمہ بھی کیا' تاہم اس نے حوصلہ نہ ہارا۔مذہبی نظریاتی کشمکش اب شاہی محل میں بھی زوروں پر تھی۔مادر ملکہ پال کے نظریات کی حامل تھی جبکہ بادشاہ کی بہن ایریس کی معتقد تھی۔بادشاہ کو امن وامان کی فکر لاحق ہوگئی جس کے حل کی

صرف یہ صورت تھی کہ کسی طرح تمام فرقے ایک کلیسا کو قبول کرلیں۔ چونکہ ایریس اور بشپ الیگزنڈر کی مخالفت روز بروز شدت اختیار کرتی جارہی تھی چنانچہ بادشاہ نے ۳۲۵ء میں ''نیقیا'' کے مقام پر ایک کانفرنس کا اہتمام کیا۔ متواتر کئی روز تک اس کے اجلاس ہوئے مگر کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ بلآخر بادشاہ نے امن وامان کی خاطر کلیسا کی حمایت حاصل کرنا ضروری سمجھتے ہوئے ایریس کو جلاوطن کردیا۔ اس طرح توحید کی بجائے تثلیث کا عقیدہ ملک کا رسمی مذہب بن گیا۔

اس کے بعد کلیسا کی منظور شدہ انجیل کے علاوہ کوئی انجیل اپنے پاس رکھنا جرم قرار دے دیا گیا۔ دوسو ستر مختلف انجیلوں کے نسخے نذرِ آتش کردیے گئے اور توحیدی عقائد کے خلاف سختی برتنا گویا ان کا فرض اوّلیں ٹھہر گیا۔ شہزادی قسطنطائن کیلئے یہ باتیں ناقابل قبول تھیں چنانچہ اس نے کوشش کرکے ایریس کی جلاوطنی معطل کرواکر اسے واپس بلوالیا۔ وہ فاتحانہ انداز میں قسطنطنیہ میں داخل ہو ہی رہا تھا کہ سکندریہ کے ایک بشپ نے اپنے دو ساتھیوں سمیت اسے قتل کرڈالا۔ بادشاہ نے قتل عمد کی پاداش میں اُن تین افراد کو جلاوطن کردیا اور خود ایریس کے ایک معتقد بشپ کے ہاتھوں عیسائیت قبول کرلی جس سے ایک بار پھر توحیدی مذہب سرکاری مذہب قرار پایا۔

برناباس کی انجیل ۳۲۵ء تک مستند انجیل تسلیم کی جاتی رہی۔ ایرانیس نے جب سینٹ پال کے مشرکانہ عقائد کے خلاف مہم جوئی شروع کی تو اس نے برناباس کی انجیل سے بکثرت استدلال کیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ پہلی دو صدیوں تک یہ انجیل معتبر تسلیم کی جاتی تھی اور اپنے دین کے بنیادی مسائل ثابت کرنے کیلئے اس کی عبارتوں کو بطورِ حجت پیش کیا جاتا تھا۔ لیکن ۳۲۵ء میں جو کانفرنس نیقیا میں ہوئی اس میں طے پایا کہ عبرانی زبان میں جتنی اناجیل ہیں ان سب کو ضائع کردیا جائے اور پھر جس کسی سے پابندی شدہ انجیل کا کوئی نسخہ برآمد ہو اسکی گردن اڑادی جائے۔

۳۸۳ء میں پوپ ایرانیس نے برناباس کی انجیل کا نسخہ حاصل کرلیا اور اسے اپنی پرائیویٹ لائبریری میں محفوظ کرلیا۔ زینو بادشاہ کی حکمرانی کے چوتھے سال جب برناباس کی قبر کھودی گئی تو یہ نسخہ جو اسکے اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا تھا اسکے سینے پر رکھا ہوا پایا گیا۔ اور یہ وہی نسخہ تھا جسے مغربی کلیسا متفقہ طور پر

دیگر اناجیل سمیت ردّ کر چکا تھا۔ اس انجیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کے تعلیم فرمائے گئے عقائد اور بہت سے حقائق اپنی اصلی شکل میں موجود تھے۔ جو موجودہ عیسائی نظریات اور عقائد مشرکانہ پر کاری ضرب ہیں۔ جن کا تذکرہ انشااللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر عنوان حوالہ جات میں آئیگا۔

حضرت یسوؑع کا مصلوب ہو کر جی اُٹھنے کا من گھڑت نظریہ بھی یوں وجود پایا کہ اپنے تئیں حضرت مسیح علیہ السلام کو مصلوب کر دینے کے فوراً بعد جب یہودیوں کو شک گزرا کہ شاید انہوں نے اپنے ہی ساتھی کو حضرت مسیح علیہ السلام کے شبہ میں مصلوب کر ڈالا ہے' تو تیسرے روز ہی انکے سرکردہ لوگوں نے نہایت خاموشی اور راز داری سے قبر کشائی کی اور پھر انکی حیرت کی انتہاء نہ رہی جب انہوں نے اس قبر میں اپنے ہی ساتھی کی لاش ملاحظہ کی۔ چنانچہ اس راز کے افشا ہو سکنے کے خدشہ اور منطقی طور پر بادشاہ کی ناراضگی کے خوف سے اس لاش کو نہایت مخفی اور محتاط طریقے سے کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا اور مشہور کر دیا کہ عیسیٰؑ زندہ ہو کر قبر سے غائب ہو گئے۔ بہر حال وہ یہ جان چکے تھے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ تب ہی سے انہوں نے دین عیسوی کو پامال کرنے کیلئے مکارانہ چالیں چلنا شروع کر دیں تھیں۔

حضرت عیسیٰؑ کے بالکل ابتدائی حواریوں کے عقائد شرکیہ سے توبہ کر لینے اور بپتسمہ لیکر از سرنو ایمان قبول کر لینے کے بعد سے تقریباً تین سے چار سو سال تک عیسائیت عین حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کے مطابق توحیدی عقائد پر قائم رہی۔ اسکے بعد بتدریج انکے فرقوں کے عقائد میں ہلکا ہلکا بگاڑ پیدا ہونے لگ گیا تھا۔ مگر جب یہودیوں کا یہ مکار ایجنٹ جارج سینٹ پال عیسائیت کا چولہ پہن کر ان میں آ گھسا اس وقت سے اصل فساد شروع ہو گیا اور پھر عیسائیوں کے مابین فساد و اختلاف زور پکڑتا گیا۔ عیسائی دو بڑے متحارب دھڑوں میں منقسم ہو کر ایک دوسرے کے مدمقابل ہو گئے۔ پھر یہ فساد اس قدر طول پکڑ گیا کہ خانہ جنگی کی نوبت آ گئی' یہاں تک کہ شاہی اقتدار لرزنے لگا اور شاہ کو سلطنت کے لالے پڑ گئے۔ چنانچہ اس کا حل یہ طے پایا کہ چرچ الگ اور تاج الگ کر دیا جائے۔ یعنی مذہبی معاملات میں شاہی مداخلت بین ہو گئی اور سلطنت کے معاملات میں مذہبی مداخلت ختم ہو گئی۔ یہ اصول آج تک چلا آتا ہے

اور دونوں ایک دوسرے کے معاملات میں مداخلت سے باز ہیں۔

بہر حال یہودی اپنی مکاری سے عیسائیوں کو جس نہج پر لانا چاہتے تھے کامیابی سے اس راستہ پر لے آئے اور دین عیسوی کے استحکام کیلئے لڑنے والے کچھ تو موت سے ہمکنار ہو گئے اور باقی ماندہ دوسرے عیسائیوں کی طرح موجودہ شرکیہ عقائد کی بھینٹ چڑھ گئے اور یوں عیسائیوں میں آج شاید ایک فرد بھی ایسا موجود نہیں جو حضرت عیسیٰؑ کے اصل توحیدی عقائد پر قائم ہو یا علی الاعلان اسکا اظہار کرنے کی جرأت کا حامل ہو۔ اسلئے کہا جاسکتا ہے کہ یہودیوں نے دین عیسوی کو مسخ کرنے کیلئے جو عزم کیا تھا اس میں وہ سو فیصد کامیاب رہے۔

موجودہ عیسائیت میں مروّج عقائد شرکیہ بارگاہِ خداوندی میں کس قدر غیر مقبول و ناپسندیدہ ہیں اِس کا اندازہ لگانے کیلئے سورۃ مائدہ کی مندرجہ ذیل آیات پر غور کیا جائے کہ روزِ قیامت عیسائیوں کے موجودہ عقائد شرکیہ کے بارے گمراہ عیسائیوں کی توبیخ کیلئے اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سوال فرمائے گا۔ فرمان الٰہیہ یوں ہے:۔

وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ ۗ بِحَقٍّ ؕ وقف النبی اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَ لَاۤ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ(۱۱۶) مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِیْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبَّكُمْ ۚ وَ كُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ ؕ وَ اَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ(۱۱۷) اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ(۱۱۸) قَالَ اللّٰهُ هٰذَا یَوْمُ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُهُمْ ؕ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ؕ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (مائدہ:۱۱۶تا۱۱۹)

ترجمہ:۔ اور جب (روزِ قیامت) اللہ تعالیٰ عیسیٰ ابن مریم سے پوچھے گا کیا تم نے لوگوں سے

کہا تھا کہ اللہ کے سوا مجھے اور میری ماں کو خدا بنالو' (تو عیسیٰؑ) عرض کریگا تو پاک ہے مجھے روا نہیں کہ وہ بات کہوں جو مجھے (تیری طرف سے) نہیں پہنچی' اگر میں نے ایسا کہا ہوتا تو یقیناً تجھے معلوم ہوگا۔ تو جانتا ہے جو میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے علم میں ہے بیشک تو ہی تمام غیوب کا جاننے والا ہے (۱۱۶) میں نے تو اُن سے نہ کہا مگر وہی جو تو نے مجھے حکم فرمایا تھا (کہ) اللہ کو پوجو' جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی' اور میں ان پر مطلع تھا جب تک اُن میں رہا پھر جب تو نے مجھے اٹھالیا تو تو ہی ان پر نگاہ رکھتا تھا اور ہر چیز تیرے سامنے حاضر (ظاہر) ہے (۱۱۷) اگر تو انہیں عذاب کرے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انہیں بخش دے تو بے شک تو ہی ہے غالب حکمت والا (۱۱۸) اللہ تعالیٰ فرمائیگا کہ آج وہ دن ہے جس میں سچوں کو ان کا سچ کام آئے گا اُن کیلئے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ہمیشہ ہمیشہ اُن میں رہیں گے اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی' یہ ہے بڑی کامیابی (مائدہ: ۱۱۶ تا ۱۱۹)

حضرت مسیح عیسیٰؑ کا مختصر شباہت نامہ

جدید ترین تحقیق کے مطابق سن عیسوی آپکی ولادت سے چار سال قبل سے شروع ہوتا ہے مگر عام فہمی اور آسانی کیلئے سن عیسوی آپکی پیدائش سے شروع کرلیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے حضرت عیسیٰؑ کے رفع الی السماء کی تاریخ ۳۳ء قرار پائی ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں کہ:۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شب معراج کو عیسیٰؑ سے بھی میری ملاقات ہوئی۔ حضرت عیسیٰؑ کا قد درمیانہ' رنگ سرخ تھا' بال گھنگھریالے اور سینہ چوڑا تھا"۔

حضرت عیسیٰؑ کی کل عمر مبارک تہتر (۷۳) سال کے لگ بھگ ہے جس میں سے تینتیس سال آپؑ پہلے گزار چکے ہیں اور بقیہ چالیس سال قربِ قیامت میں زمین پر نزول فرمانے کے بعد پوری کریں گے۔ جس میں شادی کریں گے' آپؑ کی اولاد ہوگی' امت مسلمہ کی امامت فرمائیں گے' دجال اور یاجوج و ماجوج کو قتل کریں گے' یہود و نصاریٰ کے موجودہ گمراہانہ نظریات و عقائد کا بطلان فرمائیں گے' صلیب توڑیں گے' خنازیر کو قتل کریں گے اور تمام رُوئے زمین کو کفر و شرک سے پاک کریں گے۔ نزولِ

زمین کے چالیس سال بعد انتقال کریں گے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آپؐ کے گنبد اقدس میں دفن ہونگے۔ اسکے بعد غالباً چند سالوں کے اندر اندر ہی قیامت وقوع پذیر ہو جائیگی۔

قرآنِ حکیم میں حضرت عیسیٰؑ کا ذکر تفصیل کے ساتھ آیا ہے جس کا جدول یہ ہے:۔

سورۃ بقرۃ: ۸۷، ۱۳۶، ۲۵۳،۔۔۔

سورۃ ال عمران ۴۵تا۶۲

سورۃ نساء: ۱۵۷تا۱۵۹، ۱۶۳، ۱۷۱، ۱۷۲

سورۃ مائدہ ۱۷، ۴۶، ۷۴، ۸۶، ۱۱۰تا۱۱۸

سورۃ انعام: ۱۸۶ سورۃ توبہ ۳۰، ۳۱

سورۃ مریم ۱۹تا۳۴

سورۃ انبیاء ۹۱

سورۃ مومنون ۵۰

سورۃ زخرف ۵۷تا۶۴

سورۃ حدید ۲۷

سورۃ صف ۶، ۱۴

عہدِ سلاطین کے انبیاء عظام

تذکرۂ انبیاء و پیغمبرانؑ کے اختتام اور سلطان الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بیانی سے قبل عہد ہائے سلاطین کے کچھ غیر معروف انبیاء جن کا تذکرہ جستہ جستہ توراۃ کے صفحات یا احادیث مبارکہ میں ہوا ہے اُن کا بھی اختصاراً ذکر کرتا چلوں جو درج ذیل ہیں:۔

حضرت حنظلہ علیہ السلام

آپؑ حضرت الیسع علیہ السلام کے بعد تشریف لائے اس وقت تک بنی اسرائیل پھر سے بت پرستی کا شکار ہو چکے تھے چنانچہ حضرت حنظلہؑ پر یہ فرض عائد فرمایا گیا کہ وہ انہیں پھر سے توحید کی دعوت دیں۔ چنانچہ حکم پاتے ہی حضرت حنظلہؑ بنی اسرائیل کے اس گروہ کے شہر کے چاروں دروازوں پر جا جا کر پکارنے اور انہیں خدا خوفی کی دعوت دینے لگے۔ یہاں تک کہ بنی اسرائیل کے شب و روز اُنکی آہ و پکار سے گونجنے لگے۔ بنی اسرائیل جواب دیتے کہ وہ جس بت کی پوجا کرتے ہیں خدا وہی ہے اور تم نے اگر ہمیں دن رات ستانا ترک نہ کیا تو ہم تمہیں قتل کر دیں گے۔

حضرت حنظلہؑ نے انہیں انکے توحید بردار بڑوں کے حوالے دیئے اور نافرمانوں پر جو عذاب نازل ہوئے وہ بھی یاد دلائے مگر وہ نافرمان کب کسی کی سننے والے تھے۔ اس شہر کے بادشاہ کا نام طیفور بن لفیانوس تھا جو بارہ ہزار غلام اور بیشمار دولت کا مالک تھا۔ اس کا لشکر بھی بہت بڑی تعداد میں تھا۔ اُس مردُود نے حکم جاری کیا کہ حضرت حنظلہ کو پکڑ کر مار ڈالو۔ ایک رات آپؑ بامِ قصر پر چڑھ کر اللہ تعالیٰ کی دعوتِ توحید پکار رہے تھے کہ بادشاہ نے بیزار ہو کر اپنے لشکر کو انہیں گرفتار کرنے کا حکم جاری کیا۔ آپؑ نے قوم کو مخاطب کر کے فرمایا تم مجھے گرفتار کر لو یا ہلاک کر ڈالو مگر اس سے پہلے یہ سن لو کہ تم سب فی الفور بت پرستی سے توبہ کر کے خدائے واحد پر ایمان لے آؤ ورنہ کل تم عذاب خداوندی کا شکار ہو کر موت سے ہمکنار ہو جاؤ گے۔ بنی اسرائیل نے حسب معمول سنی ان سنی کر دی اور حضرت حنظلہ کی بات کا یقین نہ کیا۔ انہیں گرفتار کرنے کی کوشش کی مگر حضرت حنظلہ متوقع عذاب الٰہی کے باعث ان سے بچ کر شہر سے

باہر نکل گئے ۔ دوسرے روز دوپہر کے وقت ان پر عذاب نازل ہوگیا' جس سے ہزاروں لوگ موت کی لپیٹ میں آگئے ۔ جو بچے تھے وہ بادشاہ کے پاس پہنچے اور انہیں اپنے ساتھیوں کی ہلاکت کی خبر دی۔ طیفور کہنے لگا کہ حنظلہؑ کے دن رات چیخ و پکار کرنے کے باعث یہ لوگ آرام نہ کر سکنے کے باعث بیمار ہو کر ہلاک ہوگئے ہیں اور اس میں عذاب کو کچھ دخل نہیں۔

اسی اثناء میں حضرت حنظلہؑ نے فرمایا کہ اگر تم لوگ اب بھی خدائے واحد پر ایمان نہ لائے تو بادشاہ سمیت تم سب بھی ہلاک ہو جاؤ گے۔ بات ماننے کی بجائے طیفور مرزُود نے چند روز میں ایک بلند اور مضبوط بالا خانہ بنوایا اور اسکے چاروں جانب بارہ ہزار برج بنوائے ۔ ہر برج میں ایک ایک زرہ پوش غلام ہاتھ میں ننگی تلوار لئے کھڑا کر دیا اور انہیں حکم دیا کہ جونہی موت اندر آنے لگے اسے قتل کر ڈالا جائے۔ ان برجوں کے عین بیچوں بیچ موٹی تہہ کی آہنی کوٹھڑی بنوائی جس پر سنگ مرمر جڑا گیا۔ اندر شاندار تخت لگوایا اور اپنے کھانے پینے اور دیگر سہولیات کا مکمل انتظام کر کے کوٹھڑی مکمل طور پر مقفل کر کے مطمئن ہو گیا کہ اب موت کا اس تک پہنچنا محال ہے۔ تبھی اچانک اس نے دیکھا کہ اسکے سامنے ایک ہیبت ناک مرد کھڑا ہے ۔ حیرت سے پوچھنے لگا کہ تم کون ہو اور اتنے سخت پہرے میں یہاں تک کیسے پہنچ گئے۔ جواب ملا کہ میں ملک الموت ہوں یہ کہا اور اس مرزُود اور تمام پہرے داروں کی جان قبض کر لی ۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے ساتھ ہی تمام شہر کے چشمے اور نہریں بھی خشک ہوگئیں ۔ باقی ماندہ قوم کو حضرت حنظلہؑ نے ایک بار پھر نصیحت کی کہ خدا کے خوف سے ڈرو اور ایمان قبول کر لو تا کہ یہ عذابِ الٰہی تم پر سے ٹل سکے۔ وہ بدبخت بجائے اس کے کہ نصیحت پکڑتے الٹا کہنے لگے کہ یہ سب تمہاری ہی نحوست کے باعث ہو رہا ہے اور تم جادو کے ذریعے لوگوں کو ہلاک کر رہے ہو۔ یہ کہتے ہوئے ان پر حملہ آور ہوئے کہ انہیں شہید کر ڈالیں مگر کسی طرح حضرت حنظلہؑ انکے چنگل سے بچ کر شہر سے نکل گئے ۔ انکے شہر سے باہر جاتے ہی شہر کے تمام کنوؤں' چشموں اور نہروں سے ایک مہلک دھواں نکل کر تمام شہر میں پھیلنے لگا جس سے اکثر نافرمان ہلاک ہوگئے ۔ بعد ازاں کچھ روز بعد ہی حضرت حنظلہؑ نے اس جہانِ فانی سے رخصت فرمائی۔

حضرت یسعیاہ علیہ السلام

آپؑ آموص کے بیٹے تھے آپکے ظہور کا زمانہ شاہانِ یہوداہ عزیاہ یوتام آخز اور حزقیاہ کا عہد ہے جو ۷۶۲ ق م تا ۶۵۳ ق م ہے۔ آپؑ نے بنی اسرائیل کو انکی بدکرداری پر متنبہ کیا اور بنوکدنصر کے حملوں اور پیش آنے والی تباہی و بربادی سے انہیں خبردار کیا۔

حضرت ھوسیع علیہ السلام

آپؑ کا ظہور بھی شاہانِ یہوداہ اور عزیاہ یوتام اور حزقیاہ اور شاہِ اسرائیل یربعام بن یواس کے زمانہ ۷۶۲ ق م تا ۶۵۳ ق م میں ہوا۔ آپؑ حضرت یسعیاہؑ کے ہمعصر تھے۔

حضرت عاموس علیہ السلام

آپؑ علاقہ تقوع کے چرواہے تھے۔ آپؑ بھی حضرت یسعیاہؑ اور حضرت ہوسیع علیہ السلام کے ہم عصر تھے۔ آپکا زمانہ بھی شاہِ یہوداہ عزیاہ اور شاہ اسرائیل یربعام کا زمانہ ہے جو ۷۶۲ ق م تا ۷۱۱ ق م کے دوران کا زمانہ ہے۔ اسی دوران بذریعہ وحی آپؑ پر کلام الٰہی نازل ہوا۔

حضرت میکاہ مورشی علیہ السلام

آپؑ کا ظہور شاہِ یہوداہ یوتام و آخز اور حزقیاہ کا دور ہے جو ۷۱۱ ق م تا ۶۵۳ ق م تک کا زمانہ ہے، اس لئے آپؑ بھی حضرت یسعیاہ، حضرت ہوسیع اور حضرت عاموس علیہم السلام کے ہمعصر تھے۔

حضرت صفنیاہ علیہ السلام

آپؑ کا نسب نامہ صفنیاہ بن کوشی بن جدلیاہ بن امریاہ بن حزقیاہؑ ہے۔ آپؑ کا ظہور یوسیاہ بن امون کے زمانہ ۶۴۸ ق م تا ۶۱۸ ق م میں ہوا۔ آپؑ نے بھی بنی اسرائیل کو آنے والے مصائب سے متنبہ کیا۔

حضرت یرمیاہ علیہ السلام

آپؑ خلقیاہ کے فرزند تھے اور آپؑ کا ظہور بن بمینؑ کے علاقہ میں عنتوتی کاہنوں میں ہوا۔

آپؑ پر شاہ یہوداہ یوسیاہ بن امون کے تیرہویں سال یعنی ۵۸۶ ق م تا ۵۶۸ ق م سے وحی نازل ہونا شروع ہوئی اور یہ سلسلہ صدقیاہ ۵۵۸ ق م تا ۵۴۸ ق م کے گیارہویں سال یعنی ۵۴۸ ق م تک جاری رہا۔ حضرت یرمیاہؑ نے نہایت صراحت سے شاہِ بابل کے حملے، بیت المقدس کی تباہی اور بنی اسرائیل کی اسیری کی پیش گوئیاں کیں اور اُن پیشگوئیوں کو ایک کتاب میں محفوظ کر دیا۔ بنی اسرائیل نے ایسی پیش گوئیاں کرنے کی بناء پر آپؑ کو قید کر دیا تھا۔ بنوکدنصر نے جب یہ سنا تو آپؑ کو زِندان سے نکالا۔

حضرت دانیال علیہ السلام

شاہ یہوداہ یہویقیم ۶۰۸ ق م تا ۵۹۸ ق م کی حکومت کے تیسرے سال بنوکدنصر نے حملہ کیا اور ہیکل کے ظروف لوٹ کر جب بنی اسرائیل کو قید کر کے بابل لے گیا تھا ان جنگی اسیروں میں حضرت دانیالؑ بھی تھے۔ اس سے زیادہ آپؑ کے حالات کا علم نہیں ہوسکا سوائے اس کے کہ بنوکدنصر نے آپؑ کو الطافِ شاہی سے نوازا۔ اور جو معلوماتِ مصدقہ سے حاصل ہوسکا گزشتہ اوراق میں عرض بھی کر دیا گیا۔

حضرت عزراؑ علیہ السلام

اس وقت حضرت عزراؑ کم سن ہی تھے جب بابل پہنچ کر اسیرانِ بنی اسرائیل میں سے بنوکدنصر نے حضرت عزیرؑ حضرت دانیالؑ اور آپکو دربار میں طلب کیا تو وہ حضرت عزراؑ کی دانشمندی اور حاضر جوابی سے بہت متاثر ہوا، حالانکہ آپؑ ابھی کم سن تھے، زہد و تقویٰ کے حامل تھے اس نے آپؑ کو تحائف دیئے۔

حضرت عبدیاہ علیہ السلام

آپؑ ادوم کی طرف مبعوث ہوئے اور ادومیوں کے اس جرم پر (کہ وہ بنی اسرائیل کی بربادی اور اسیری پر خوش ہوئے تھے اور دشمنوں کی مدد کی تھی) آپؑ نے اُن پر غضب الٰہی کی پیش گوئی کی تھی، جو حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ آپؑ کا ظہور بنوکدنصر کے حملہ کے بعد ہوا۔

حضرت ناحوم القدشی علیہ السلام

آپؑ بھی شہر نینوا کی طرف مبعوث ہوئے اور آپؑ نے شاہِ بابل اور نینوا کی بربادی کی پیش گوئی کی تھی۔

حضرت یوائل علیہ السلام

آپکا ظہور بنوکدنصر کے حملہ کے بعد اور بنی اسرائیل کی رہائی سے پہلے ہوا۔آپؑ نے بنی اسرائیل کی رہائی کی پیش گوئی کی تھی۔

حضرت ملاکی علیہ السلام

آپؑ کی بعثت بھی بنوکدنصر کے حملہ کے بعد ہوئی۔آپؑ نے ایک نبی موعودہ حضرت الیاسؑ کی تشریف آوری کی پیش گوئی کی تھی۔

حضرت حجی علیہ السلام

آپؑ کی بعثت بنی اسرائیل کی آزادی کے بعد شاہ فارس دارا کی حکومت کے دوسرے سال ہوئی تھی۔آپ حضرت زکریاؑ کے ہمعصر تھے۔

حضرت کالوت علیہ السلام

جامع التواریخ کے باب کتاب المنتظم میں ہے کہ آپؑ طالوت ابن یوقنا اولادِ شمعونؑ بن یعقوبؑ میں سے تھے۔حضرت کالوتؑ حضرت موسیٰؑ کی ہمشیرہ مریم کے شوہر تھے اور بہ تائید حضرت یوشع بن نونؑ پیغمبر مرسل تھے۔حضرت یوشع کی وصیت کے مطابق حضرت کالوتؑ نے جمیع مہماتِ بنی اسرائیل اپنے ذمہ لے لی تھیں۔آپؑ نہایت جری بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ امورِ شرعی کے مبلغ بھی تھے۔ بحرب کا بادشاہ بارق رعایا سمیت دین سے برگشتہ تھا اور بنی اسرائیل پر ظلم وتشدد کی یوں انتہا کرتا تھا کہ جیسے انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا کر ہی دم لے گا۔جسکی ریاست کو حضرت یوشع بن نونؑ اس سے قبل تقریباً فتح بھی کر چکے تھے،جس کا ذکر بلعم باعور کے واقعہ میں بیان ہو چکا ہے۔تاہم جو بھی ذمہ داریاں حضرت کالوتؑ کے حصے میں آئیں انہوں نے انہیں بخوبی نبھایا۔وماتوفیقی الاباللہ

نوٹ:۔ (بابِ سوئم کی آخری ذیشان ہستی یعنی حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے احسن الخالقین کی جلد دوم کا ملاحظہ فرمائیں۔)